عليكم بسُنَّتي وسُنَّةِ الخُلفاءِ الراشِدين المَهدِيين

تم میری اور میرے خلفائے راشدین مہدیین کی سنت کو لازم پکڑو (ترمذی)

مُختصر

سیرت خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم

تالیف

محترمہ اُم عدنان بُشری قمر حفظہا اللہ

تنقیح ومراجعت

فضیلۃ الشیخ مولانا محمد منیر قمر حفظہ اللہ



مکتبہ کتاب و سنت

عَلَيكُم بسُنَّتي وسُنَّةِ الخُلفاءِ الرَّاشِدينَ المَهدِيينَ

تم میری اور میرے خلفائے راشدین مہدیین کی سنت کو لازم پکڑو (ترمذی)

مُختَصر

سیرت خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم

تالیف

محترمہ اُمِّ عدنان بُشریٰ قمر حفظہا اللہ

تنقیح و مراجعت

فضیلۃ الشیخ مولانا مُحمد منیر قمر حفظہ اللہ

www.mohammedmunirqamar.com

مُختصر

سیرت خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم

تالیف
محترمہ اُمِّ عدنان بُشریٰ قمر حفظہا اللہ

تنقیح ومراجعت
فضیلۃ الشیخ ابوعدنان محمد منیر قمر حفظہ اللہ

اشاعت ——— اپریل 2022ء

کمپوزنگ ——— حسان قمر سلمہ اللہ، نبیلہ قمر، نائلہ قمر، نادیہ قمر سلمھن اللہ

سیٹنگ ——— ابوسفیان عزیزی

ناشر

مکتبہ کتاب وسُنّت
ریحان چیمہ۔ ڈسکہ

UMM UL QURA
سیالکوٹ روڈ، گوجرانوالہ 0321-6466422

بیت السلام پرنٹنگ پریس
042-37141518, 0321-7351350

www.mohammedmunirqamar.com

بسم الله الرحمن الرحيم

مُختصر

سیرتِ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم

فہرست مضامین

باب 2

سیرت سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ

باب 3

سیرت سیدنا عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ

باب 4

سیرت سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تقدیم

اِنَّ الۡحَمۡدَ لِلّٰہِ وَ الصَّلَاۃُ وَ السَّلَامُ عَلٰی رَسُوۡلِ اللّٰہِ وَعَلٰی آلِہٖ وَصَحۡبِہٖ وَمَنۡ وَالَاہُ. أَمَّا بَعۡدُ:

معزز قارئینِ کرام! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

انبیائے کرام علیہم السلام کے سلسلۂ ذہبیہ کے آخر میں مبعوث کیے گئے ہمارے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سب سے اعلیٰ وافضل مقام پر فائز ہیں، جیسا کہ اس تفضیل (فرقِ مراتب) کی طرف خود اللہ تعالیٰ نے اشارہ فرمایا ہے:

﴿ تِلۡكَ الرُّسُلُ فَضَّلۡنَا بَعۡضَهُمۡ عَلٰى بَعۡضٍ ۘ ﴾ [البقرۃ: ۲۵۳]

''ہم نے بعض رسولوں کو بعض پر فضیلت دی ہے۔''

یہ اللہ تعالیٰ کی اپنی تقسیم ہے ورنہ ہم کون ہیں ایسا کہنے والے، اور اس فضیلت کے باوجود ہم دیگر تمام انبیاء ورسل علیہم السلام پر بھی ایمان رکھتے ہیں اور اس سلسلے میں کوئی تفریق نہیں کرتے، جیسا کہ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ لَا نُفَرِّقُ بَيۡنَ اَحَدٍ مِّنۡ رُّسُلِهٖ ۟ ﴾ [البقرۃ: ۲۸۵]

''ہم اس کے رسولوں میں کوئی تفریق نہیں کرتے۔''

انبیائے کرام علیہم السلام کے مقام و مرتبہ کے تعیّن اور ان کی سیرت کے صحیح خدوخال جاننے میں مدد دینے والے جہاں اور کئی امور ہیں وہیں ایک چیز یہ بھی ہے کہ ان کے دوست واحباب اور اہلِ خانہ کے حالات بھی معلوم ہوں اور نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی اس اعتبار سے بھی نہایت ہی بلند مقام پر فائز ہے جس کا بہترین ثبوت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہلِ بیتِ کرام اور خلفائے راشدین وصحابۂ عظام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے فضائل و مناقب سے ہی مل جاتا ہے۔

زیرِ نظر کتاب ''مختصر سیرت خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم'' میں اہلِ بیتِ کرام اور دیگر صحابۂ عظام رضی اللہ عنہم سے قطع نظر صرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی مختصر سیرت کا تذکرہ ہے جن میں سے دو آپ صلی اللہ علیہ وسلم

کے سُسر (حضرت ابو بکر صدیق وحضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما) اور دوسرے دو آپ ﷺ کے داماد (حضرت عثمانِ غنی اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہما) جب کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تو آپ ﷺ کے دوہرے داماد، ذوالنورین تھے۔ ان چاروں بزرگ ہستیوں کے تفصیلی فضائل، سیرت و کردار اور احوال و کارنامے آپ اس کتاب میں پڑھیں گے، ان چاروں شخصیات میں سے ہر کسی کی سیرت مستقل کتاب کی متقاضی ہے لیکن یہاں اختصار کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے، جیسا کہ کتاب کے نام سے ہی ظاہر ہو رہا ہے۔

مؤلفہ نے جن کتب کو پیشِ نگاہ رکھا ہے، کتاب کے چاروں اجزاء میں سے ہر جزء کے آخر میں ان مصادر و مراجع کا تذکرہ بھی کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ مؤلفہ کی محنت و کاوش کو شرفِ قبول سے نوازے اور خدمتِ دین کی مزید توفیق ارزاں فرمائے، آمین یا رب العالمین۔ ہم نے ممکنہ کوشش کر کے کتاب کو مفید سے مفید تر بنانے کی کوشش کی ہے۔ تَقَبَّلَ اللّٰهُ مِنَّا وَوَفَّقَنَا لِلْخَيْرِ.

مؤلفہ کے ساتھ ہماری تین صاحبزادیوں نبیلہ قمر، نائلہ قمر، نادیہ قمر اور ہمارے ایک صاحبزادے حسان قمر۔حَفِظَهُمُ اللّٰهُ وَرَعَاهُمْ مِنْ كُلِّ شَرٍّ وَ مَكْرُوْهٍ۔ نے بھی حسبِ ضرورت و اختصاص تعاون کیا ہے۔ فَجَزَاهُمُ اللّٰهُ خَيْراً فِي الدُّنْيَا وَ الْآخِرَةِ وَوَفَّقَهُمْ لِخِدْمَةِ دِيْنِهِ الْحَنِيْفِ، آمين يا رب العالمين.

اللہ تعالیٰ کے شکر کے بعد انتہائی ناسپاسی ہوگی اگر یہاں عزیزم چوہدری محمد وقاص حفظہ اللہ (الدمام) کا شکر یہ ادا نہ کیا جائے جن کے تعاون اور انہی کے دوست جناب چوہدری شوکت علی ولد نذیر احمد حفظہ اللہ کے تعاون سے یہ کتاب آپ کے ہاتھوں تک پہنچی ہے۔ فَجَزَ اهُمَا اللّٰه خَيْراً وَ بَارَكَ فِيْ أَهْلِهِمَا وَمَالِهِمَا وَأَعْمَالِهِمَا وَأَعْمَارِهِمَا.

اللہ تعالیٰ وقاص صاحب کے والدِ محترم جناب چوہدری محمد سیف اللہ خاں ۔غَفَرَ اللّٰهُ لَهٗ وَرَحِمَهٗ۔ کے لیے یہ صدقہ جاریہ قبول فرمائے، ان کی مغفرت فرمائے، ان کی بشری کوتاہیوں کو بخش دے اور انھیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین یا غفور یا رحیم.

یہاں ہم اپنے فاضل عزیز جناب حافظ شاہد رفیق صاحب حفظہ اللہ کے لیے بھی دعا گو ہیں جو ہماری اور اپنی اور کئی دیگر مشائخ کی کتب کی تحقیق و تخریج کر کے انھیں بڑے اعلیٰ معیار پر شائع کرتے ہیں۔ جَزَاهُ اللّٰهُ خَيْراً فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَتَقَبَلَ جُهُوْدَ الْجَمِيْعِ بِفَضْلِهِ وَ كَرَمِهٖ وَمَنِّهٖ آمين يا إلٰه العالمين.

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مولفہ کی اس خدمت کو بھی شرفِ قبول سے نوازے اور اسے اس کے میزانِ حسنات کا حصہ بنائے۔ آمین یا غفور یا رحیم.

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ابوعدنان محمد منیر قمر بن حاجی نواب الدین رَحِمَہُ اللّٰہُ رَحْمَۃً وَاسِعَۃً

الخبر ،سعودی عرب

6/ربیع الثانی 1443ھ = 11/نومبر 2021ء

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

مقدمہ

إِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ، نَحْمَدُهٗ، وَنَسْتَعِيْنُهٗ، وَنَسْتَغْفِرُهٗ، وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا، وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ، وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَا هَادِيَ لَهٗ، وَأَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، أَمَّا بَعْدُ!

معزز قارئین کرام و قارئات محترمات! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت کے لیے ہزاروں انبیائے کرام علیہم السلام مبعوث فرمائے جنھوں نے اپنی اقوام کی اصلاح و ہدایت کے لیے دن رات محنت کی۔ ان انبیائے کرام علیہم السلام کو جو ساتھی عطا فرمائے گئے وہ بھی عام لوگوں کے مقابلے میں نہایت برگزیدہ شخصیات تھیں، مگر جب ہمارے نبی آخر الزماں سید الاولین والآخرین حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو مبعوث فرمایا تو آپ ﷺ کے مشن کو آگے بڑھانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے جو ساتھی آپ ﷺ کو میسر فرمائے، وہ انبیائے کرام علیہم السلام کے بعد کائنات کے بہترین انسان تھے۔

آج اگر اسلام دنیا کے کونے کونے تک پہنچا ہوا نظر آتا ہے تو اس کے پیچھے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی بے پناہ محنت، مشقت، شجاعت، سخاوت، صداقت، عزیمت، شوقِ عبادت، جانثاری، اخلاص، زہد، تقویٰ، صبر، توکّل، حسنِ اخلاق، اپنے مشن سے بے لوث وابستگی اور لوگوں کے ساتھ حسنِ معاملہ جیسی شاندار صفات نظر آتی ہیں۔ انھوں نے نبی اکرم ﷺ کی مبارک زندگی کے ایک ایک لمحے کو محفوظ فرما لیا تھا۔

آپ ﷺ کے اخلاقی معاملات کیسے تھے؟ آپ ﷺ اپنے رب کی عبادت کن طریقوں سے کرتے تھے؟ آپ ﷺ کھاتے پیتے اور سوتے جاگتے کس طرح تھے؟ آپ ﷺ لباس کیسا پہنتے تھے؟ آپ ﷺ کا دوستوں اور دشمنوں سے برتاؤ کیسا تھا؟ آپ ﷺ باپ کیسے تھے؟ آپ ﷺ تجارت اور لین دین کن طریقوں سے کرتے تھے؟ آپ ﷺ لوگوں کے درمیان فیصلے کیسے کرتے تھے؟ آپ ﷺ لوگوں کو دین کی دعوت کس طریقے سے دیتے تھے، جو لوگ آپ ﷺ کی دعوت پر لبیک کہتے ان کی تربیت کس انداز سے

فرماتے تھے؟ آپ ﷺ جنگی لشکر کی کمان کس طرح کیا کرتے تھے اور جب دشمنوں پر غلبہ حاصل کر لیتے تو شکست کھانے والوں سے آپ ﷺ کا سلوک کیسا ہوتا تھا؟

آج ان تمام سوالات کے جوابات اگر ہمیں میسر ہیں تو یہ سب صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی محنت، کوشش اور جدوجہد کا نتیجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کے ان تمام صحابۂ کرام کو اپنی رضا اور جنت کا سرٹیفکیٹ عطا فرمایا۔ قرآنِ کریم میں بہت سے مقامات پر ان کی تعریف فرمائی، ان سے راضی ہونے اور انھیں راضی کرنے کا وعدہ فرمایا۔ جیسا کہ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ﴾

''اللہ ان سب سے راضی ہوا اور وہ سب بھی اللہ سے راضی ہو گئے۔''

کلام اللہ نے گواہی دی ہے کہ اصحابِ رسول ﷺ غازی ہوں یا شہید، اللہ تعالیٰ ہر حال میں ان سے راضی ہے۔

معزز قارئینِ کرام وقارئاتِ محترمات! اس کتاب میں انہی جلیل القدر ہستیوں میں سے صرف خلفائے راشدین: حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر بن خطاب، حضرت عثمان بن عفان اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہم کی مختصر سیرت و زندگی، عہدِ خلافت، اور متعلقہ حالات و واقعات بیان کرنے کی مَیں نے ایک چھوٹی سی کوشش کی ہے۔ اللہ رب العزت کا مجھ پر یہ بہت بڑا احسان ہے کہ میری زبان اس پاک ذات کا شکر ادا کرنے سے قاصر ہے جس نے مجھ نا چیز کو یہ سعادت بخشی ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ کی توفیق کے بغیر کوئی کام ممکن نہیں۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ حَمْداً كَثِيْراً طَيِّباً مُّبَارَكاً فِيْهِ.

رب العزت کا شکر ادا کرنے کے بعد مَیں اپنے رفیقِ حیات اور استاذِ محترم ابو عدنان محمد منیر قمر صاحب حفظہ اللہ کی بھی دل کی گہرائیوں سے شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اس کتاب کو تیار کرنے میں میری بہت مدد کی، اپنے مفید مشوروں سے میری راہنمائی فرمائی، اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر عطا فرمائے۔ انھوں نے اپنی انتہائی مصروفیات کے باوجود نہ صرف یہ کہ میرے الفاظ کی نوک پلک کو سنوارا بلکہ کئی بار اس پر نظرِ ثانی فرمائی اور متعدد علمی ویب سائٹس سے حوالوں کو تلاش کرنے میں بھی میری مدد کی، اللہ رب العزت ابو عدنان قمر کو بہترین جزا عطا فرمائے، انھیں صحت والی عمر عطا فرمائے، ان کے علم وعمل میں برکت عطا فرمائے، ان کی دینی خدمات کو شرفِ قبولیت بخشے اور ان کے لیے ذریعۂ نجات بنائے۔ اَللّٰهُمَّ آمین. ان

کے ساتھ ساتھ میں اپنی لختِ جگر نبیلہ قمر، نائلہ قمر اور نادیہ قمر کی بھی تہہِ دل سے شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اس کتاب کو کمپوز کیا، اللہ تعالیٰ انھیں بھی جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین.

اسی طرح میں اپنے صاحبزادے حسان قمر کی بھی بے حد شکر گزار ہوں کہ اس نے ہمارے اس مسودے کو نہ صرف مرتب کیا، بلکہ کافی حصہ کمپوز بھی کیا ہے۔ میری ان سب کی لیے دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں توفیقِ خیر سے نوازے اور ان کے اس عمل کو ذریعۂ سعادت ونجات بنائے۔ آمین.

اس کتاب کی تالیف میں مَیں نے جن کتابوں سے استفادہ کیا ہے، اُن کا ذکر میں نے ہر خلیفہ کی سیرت کے آخر میں کر دیا ہے، ان میں سے سب سے زیادہ مَیں نے مکتبہ دار اسلام ریاض کی جن کتابوں سے استفادہ کیا ہے، وہ درجِ ذیل ہیں:

① سیرت سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ۔ تالیف: ڈاکٹر علی محمد الصلاَّبی۔ ترجمہ: مولانا محمد اجمل بھٹی۔

② سیرت سیدنا عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ۔ تالیف: الصلاَّبی۔ ترجمہ: مولانا ندیم شہباز۔

③ سیرت سیدنا عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ۔ تالیف: الصلاَّبی۔ ترجمہ: مولانا محمد عثمان منیب۔

④ سیرت سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ۔ تالیف: الصلاَّبی۔ ترجمہ: پروفیسر عبدالغفور مدنی۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مصنف اور مترجمین کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ فَجَزَاھُمُ اللّٰهُ خَیْرَ الْجَزَاءِ فِيْ الدُّنْیَا وَالْآخِرَةِ ،آمین.

اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ وہ میرے اس عمل کو خالص اپنی رضا وخوشنودی کے لیے قبول فرمائے، اور اسے مسلمانوں کے لیے نفع بخش بنائے اور مجھے اس پر اجر وثواب سے نوازئے اور اسے میری نیکیوں کے میزان میں شمار کر لے۔ اللّٰھُمَّ آمین.

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

دعاؤں کی طلب گار

ام عدنان بشریٰ قمر بنت محمد صادق ڈھلّو

الخبر ۔سعودی عرب۔

22/ربیع اول 1443ھ = 28/اکتوبر 2021ء

باب 1

سیرت

سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ

رازدانِ نبوت خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی مختصر سیرتِ مطہرہ

رفیقِ خاص، یارِ غار:

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے فضائل و مناقب اور سیرت پر اہلِ علم نے تو مستقل کتابیں لکھی ہیں، تاریخِ اسلام میں ان کا تذکرہ سو پچاس صفحات پر نہیں، بلکہ متعدد جلدیں صرف حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ذکرِ جمیل پر مشتمل ہیں۔ اور یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا اور اہلِ ایمان رفیقِ نبوت پر عقیدت کے پھول نچھاور کرتے رہیں گے، انہی میں سے ہم مختصر سے فضائل و سیرت کا تذکرہ کریں گے۔

ان کی سیرتِ مطہرہ کے متعلق تو ہم بچپن سے ہی نہایت دلچسپی سے سنتے رہے۔ پھر جب کچھ پڑھنا لکھنا شروع کیا تو اللہ کے فضل و کرم سے ان کی سیرت کا مطالعہ کرنے کا دل میں شوق پیدا ہوا اور مطالعہ کے بعد دل نے چاہا کہ کیوں نہ میں بھی اُن ہدایت یافتہ شخصیتوں کی سیرت میں چند جملے کہنے اور لکھنے کی سعادت حاصل کرلوں۔ یہ سلسلہ میں نے اپنے ویکلی درس میں شروع کیا تھا، الحمد لله، آج ایک کتاب کی صورت میں آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

مسلمانوں کے خلیفۂ اوّل:

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بلاشبہ اُن خلفاء کے سرخیل ہیں جن کی پیروی کا نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے:

"میری سنت اور میرے ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کے طریقے کو تھامے رکھو۔"[1]

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ انبیائے کرام علیہم السلام کے بعد افضل ترین فرد ہیں۔ آپ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں

[1] جامع الترمذي، رقم الحديث (٢٦٧٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٤) صحيح الترغيب والترهيب للألباني، رقم الحديث (٧٣)

سب سے افضل، علم وعمل میں بالاتر اور سب سے زیادہ عظمت و رفعت کے پیکر ہیں۔ ان کے متعلق رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

''اگر مجھے اپنی امت میں سے کسی کو خلیل بنانا ہوتا تو ابوبکر (رضی اللہ عنہ) کو خلیل بناتا لیکن وہ میرے بھائی اور ساتھی ہیں۔''[1]

ایک اور حدیث میں حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

''میرے بعد ان دو شخصیات ابوبکر اور عمر (رضی اللہ عنہما) کی پیروی کرنا۔''[2]

آپ کی عظمت کی گواہی سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ان الفاظ سے دی:

''أَنْتَ سَيِّدُنَا وَ خَيْرُنَا وَ اَحَبُّنَا اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ''[3]

''آپ ہمارے سردار، ہم سب سے بہتر اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے زیادہ عزیز ہیں۔''

سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے ان کے بیٹے حضرت محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ نے پوچھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے زیادہ افضل کون ہے؟ تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے انھیں جواب دیا: ''ابوبکر۔''[4]

تمام اہلِ ایمان کا عقیدہ ہے کہ انبیائے کرام علیہم السلام کے بعد پوری انسانیت میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا مرتبہ بلند ترین ہے، کون سا ایسا مسلمان ہے جس نے ان کا نام نامی اسمِ گرامی نہ سنا ہوگا۔ اور ان کی عالی مرتبت شخصیت کے بارے میں کچھ نہ کچھ جانتا نہ ہوگا۔ خاص کر یارِ غار کا لفظ سنتے ہی حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کا تصور ذہن میں آجاتا ہے۔ آپ کے بے شمار مناقب اور فضائل ہیں۔ قرآنِ کریم میں بھی کئی مقامات پر ان کا تذکرہ ہے۔

نام ونسب، کنیت اور القاب:

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سُسر، جلیل القدر صحابی اور پہلے خلیفۂ راشد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا نام ونسب یہ ہے: اسمِ گرامی عبداللہ بن عثمان رضی اللہ عنہما (ابوقحافہ بن عامر) بن عَمرو بن کعب بن سعد بن تیم بن مُرّہ بن کعب بن

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٦٥٧)

[2] صحيح جامع الترمذي، رقم الحديث (٣٧٩٩، ٣٨٠٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٩٧)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٦٦٨)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٦٧١)

لُوی بن غالب بن فہر القرشی التیمی تھا۔[1]

یعنی قریش کے دس معزز ترین گھرانوں میں سے ایک بنو تیم بن مُرَّہ سے آپ کا حسب ونسب ہے۔ ان کا سلسلۂ نسب نھیال اور ددھیال دونوں طرف سے چھٹی پُشت پر جا کر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلۂ نسب سے مل جاتا ہے۔[2]

آپ کی کنیت ''ابوبکر'' ہے یہ لفظ ''بکر'' سے مشتق ہے جس کے معنیٰ ہیں: ''نوجوان اونٹ'' اس کی جمع ''ابکر'' ہے۔ عرب کے ہاں (بچوں کو) ''بکر'' کے نام سے موسوم کرنا مروج ہے۔ ایک بہت بڑے قبیلے کے جدِّ اعلیٰ کا نام بھی ''بکر'' تھا۔ ان کا ایک عظیم اعزاز یہ بھی ہے کہ ان کے والد اور والدہ دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم میں شامل تھے۔

صحابیّت کا شرف:

ان کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کی چار پُشتوں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک دَور کا مشاہدہ کیا اور ان سب کو صحابیّت کا شرف نصیب ہوا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بذاتِ خود اسلام قبول کرنے والے اور شرفِ صحابیّت سے سرفراز ہونے والے مردوں میں سے سب سے پہلے نمبر پر ہیں۔ صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کے والد حضرت ابو قحافہ رضی اللہ عنہ، ان کے دو صاحب زادے محمد اور عبد الرحمٰن رضی اللہ عنہما بھی صحابی تھے اور ان کے پوتے محمد بن عبد الرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہ بھی صحابیِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ گویا یہ چاروں: دادا، باپ، بیٹا اور پوتا سب صحابیِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ اسلامی تاریخ میں غالبًا یہ منفرد شرف اور عزت کسی اور صحابی کے حصہ میں نہیں آئی۔ ان کی والدہ محترمہ حضرت ام الخیر تو قدیم الاسلام ہیں۔ انھوں نے دارِ ارقم میں اسلام قبول کیا تھا۔[3]

صدیق کا لقب:

یہ لقب بھی آپ کو نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی دیا تھا، جیسا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے ہمراہ اُحد پہاڑ پر چڑھے تو وہ حرکت کرنے لگا۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

---

[1] الإصابة (٤/ ٤٥٤٤)

[2] سيرة و حياة الصديق لمجدى فتحى السيد (ص: ٢٧)

[3] مسند أحمد (٦/ ٣٤٩)

«اُثْبُتْ اُحُدُ! فَإِنَّمَا عَلَيْكَ نَبِيٌّ وَّصِدِّيقٌ وَّشَهِيدَانِ»[1]

''اے اُحد! پُرسکون ہو جا، تجھ پر اس وقت ایک نبی، ایک صدیق اور دو شہید موجود ہیں۔''

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج کروائی گئی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو معراج کا واقعہ بتایا تو لوگوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہا: ''اپنے ساتھی کی خبر لیجیے۔ اُس کا خیال ہے کہ اُسے رات ہی رات میں بیت المقدس کی سیر کرائی گئی ہے۔'' حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: ''کیا واقعی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہے؟ لوگوں نے کہا: ''ہاں واقعی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا ہی فرمایا ہے۔''

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فوراً کہا: ''اگر یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا ارشاد ہے تو بالکل سچ ہے۔'' لوگوں نے کہا: ''واقعی آپ اس بات کی تصدیق کرتے ہیں؟'' حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''مجھے اس بات کی تصدیق کرنے میں کوئی عار نہیں بلکہ میں تو اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ ایمان رکھتا ہوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس صبح وشام آسمان کی خبریں آتی ہیں۔'' اسی شدّتِ تصدیق کی بنا پر آپ کا لقب صدیق پڑ گیا۔[2]

''آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق میں سب سے سبقت لے گئے اور ہمیشہ پیکرِ صداقت رہے، شر وفساد اور جھوٹ کبھی بھی آپ سے سرزد نہ ہوا۔''[3]

اسی لیے آپ صدیق جیسے عالی لقب سے نوازے گئے۔ انہی کے متعلق ایک شاعر کہتا ہے:

''آپ صدیق کے لقب سے مشہور ہو گئے جبکہ آپ کے سوا ہر مہاجر کو اُس کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ اللہ تعالیٰ اس بات پر شاہد ہے کہ آپ قبولِ اسلام میں بھی سبقت لے گئے ہیں اور آپ (بدر کے دن) مشہور ومعروف چھپر میں رسول اللہ کے ہم نشین تھے۔''[4]

ابن سعد کی روایت کے مطابق واقعۂ معراج کے موقع پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو صدیق کا لقب ملا چنانچہ عہدِ صحابہ میں اُن کا نام صدیق مشہور ہو گیا تھا۔[5]

لقبِ عتیق:

یہ لقب بھی آپ کو نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مرحمت فرمایا، اس کی دلیل رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشادِ گرامی ہے:

---

(1) صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٦٦٥)

(2) المستدرك للحاكم (٣/ ٣٦٢) سلسلة الأحاديث الصحيحة، رقم الحديث (٣٠٥)

(3) الطبقات لابن سعد (٢/ ٢/ ١٧)

(4) أسد الغابة (٣/ ٣١٠)

(5) صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٦٦١)

«أَنْتَ عَتِيقُ اللّٰهِ مِنَ النَّارِ»[1] ''اللہ تعالیٰ نے آپ کو جہنم سے آزاد فرما دیا ہے۔''

اسی دن سے آپ ''عتیق'' کے لقب سے مشہور ہو گئے۔

مؤرخین نے اس لقب کے متعدد اسباب بتائے ہیں کہ آپ کو یہ لقب حسن و جمال کی بدولت دیا گیا ہے، ایک قول یہ بھی ہے کہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی والدہ کے ہاں کوئی اولاد زندہ نہ رہتی تھی، جب آپ کی ولادت ہوئی تو آپ کی والدہ نے قبلہ رو ہو کر دعا مانگی:

''اے اللہ! اسے موت سے آزاد اور میرے لیے سلامت رکھ۔''

لہٰذا آپ کی والدہ کے ان الفاظ کی وجہ سے آپ کا لقب عتیق پڑ گیا۔ جبکہ ان سب مذکورہ اسباب کو ہی آپ کے لقب ''عتیق'' کی بنیاد قرار دیا جاسکتا ہے۔ ورنہ صحیح تر بات وہی ہے جو حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں وارد ہوئی ہے۔

آپ کی ولادت و عمر:

آپ عام الفیل کے تین برس بعد پیدا ہوئے آپ عمر میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ڈھائی برس چھوٹے تھے۔ اور نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلانِ نبوت سے قبل ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریبی دوست بھی تھے۔

حُلیۂ مبارکہ:

جہاں تک آپ کے حلیۂ مبارکہ کا تعلق ہے تو سیرت نگاروں نے اور مختلف راویوں نے آپ کا حلیہ مبارکہ یوں بیان کیا ہے:

''آپ سفید زردی مائل رنگت، چُست اور نحیف بدن کے مالک تھے۔ خوبصورت قد وقامت، نازک بدن، جھکتی ہوئی کمر، پتلے چہرے، چھوٹی آنکھوں، اٹھے ہوئے بانسے اور تنگ نتھنوں والی ناک، پتلی پنڈلیوں، مضبوط رانوں، ابھری ہوئی پیشانی کے مالک تھے۔ آپ کی انگلیوں کے جوڑ نمایاں تھے آپ اپنے سفید بالوں اور داڑھی کو مہندی سے رنگ دیتے تھے۔''[2]

آپ کی شخصیت:

ان کی شخصیت میں اخلاقِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کا پرتَو نظر آتا تھا، چنانچہ سیدہ خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا نے اللہ کے

---

[1] صحيح جامع الترمذي، رقم الحديث (٣٦٧٩) سلسلة الأحاديث الصحيحة (١٥٧٤)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٩١٩، ٤٩٢٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٤١)

رسول ﷺ کے جو اخلاق بیان کیے اور جن خوبیوں کا ذکر کیا، وہی اخلاق و اوصاف ابن دغنہ نے قریشِ مکہ کے سامنے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بیان کیے۔ اس نے کہا کہ: یہ شخص تو بے کسوں کی مدد کرنے والا ہے، صلہ رحمی کرتا ہے، مقروضوں کا بار اٹھاتا ہے، مہمان نوازی کرتا ہے، مصائب، مشکلات، مصیبتوں اور پریشانیوں میں حق کی حمایت کرتا ہے۔ بھلا ایسے شخص کو بھی کسی بستی سے نکالا جاتا ہے؟[1]

شراب نوشی اسلام میں حرام ہے، لیکن عرب میں جاہلیت کے دَور میں بھی بعض ایسے سلیم الفطرت لوگ موجود تھے جنھوں نے شراب نوشی کو اپنے او پر حرام قرار دے رکھا تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی انھی لوگوں میں سے تھے جنھوں نے شراب زمانۂ جاہلیت ہی میں اپنے اوپر حرام کر لی تھی۔ اللہ کے رسول ﷺ سے ان کا دوستانہ تعلق نبوت سے قبل ہی پیدا ہو گیا تھا۔ عادات وطوار کی مماثلت نے باہمی تعلقات اس قدر بڑھا دیے تھے کہ آپ ﷺ ہفتے بھر میں کئی مرتبہ ان کے مکان پر تشریف لے جایا کرتے تھے۔

اولاد:

سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اولاد میں تین بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں۔ تفصیل درج ذیل ہے:

عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما: عبدالرحمٰن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سب سے بڑے بیٹے تھے، صلح حدیبیہ کے موقع پر مشرف بہ اسلام ہوئے۔ اور ایک اچھے مسلمان ثابت ہوئے۔ آپ شجاعت و بہادری میں معروف تھے۔ اسلام لانے کے بعد کئی مواقع پر آپ نے بہترین کردار ادا کیا۔[2]

عبداللہ بن ابی بکر رضی اللہ عنہما: ہجرتِ مدینہ کے معاملے میں عبداللہ رضی اللہ عنہ کا کردار نا قابلِ فراموش ہے۔ دن کے وقت اہلِ مکہ کے درمیان رہ کر ان باتیں سنتے اور رات کے اندھیرے میں چپکے سے غارِ ثور پہنچ کر نبی اکرم ﷺ اور اپنے والد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حالات کی رفتار سے خبردار رکھتے۔ غزوۂ طائف میں انھیں ایک تیر لگا جس کا زخم تادیر باقی رہا حتیٰ کہ اسی کے نتیجہ میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے دوران مدینہ میں شہید ہوئے۔[3]

محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہما: محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہما سیدہ اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا کے بیٹے ہیں۔ حجۃ الوداع کے

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٢٩٧)

[2] البداية والنهاية (٣٤٦/٦)

[3] نسب قريش لأبي عبد الله مصعب الزبيري (ص: ٢٧٥)

سال پیدا ہوئے۔ قریش کے نامور نوجوانوں میں شمار ہوتا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی گود میں پرورش پائی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے عہدِ خلافت میں انھیں والیِ مصر بنایا اور وہیں شہید ہوئے۔[1]

اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما: اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے بڑی تھیں۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نام ذات النطاقین رکھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ انھوں نے ہجرت کے موقع پر نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اپنے والد کے لیے کھانا تیار کیا۔ جب کھانے کی پوٹلی اور مشکیزے کو باندھنے کے لیے کچھ نہ ملا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے کہنے پر اپنے کمربند کو پھاڑ کر ایک حصے سے کھانے کی پوٹلی باندھی اور دوسرے حصے مشکیزہ باندھا، اسی مناسبت سے ان کا نام ذات النطاقین پڑ گیا۔[2]

سیدہ اسماء رضی اللہ عنہا حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کی بیوی تھیں۔ ہجرتِ مدینہ کے موقع پر حاملہ تھیں، اسی حمل کے نتیجے میں حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما پیدا ہوئے جب ہجرت کے بعد اسلام کے سب سے پہلے فرزند تھے۔ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا سو سال کی عمر تک پہنچیں اس کے باوجود عقلِ سلیم کی مالک رہیں اور دانت بھی صحیح سلامت رہے۔

سیدہ اسماء رضی اللہ عنہا نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ۵۶ احادیث روایت کی ہیں آپ کے بیٹوں عبداللہ بن زبیر اور عروہ بن زبیر کے علاوہ حضرت عبد اللہ بن عباس اور عبد اللہ بن ابی ملیکہ رضی اللہ عنہم نے آپ سے احادیث کو روایت کیا۔ آپ انتہائی سخی اور جود وکرم جیسی اعلیٰ صفات کی حامل خاتون تھیں۔ آپ نے مکہ میں ۷۳ھ میں وفات پائی۔[3]

ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا: رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح کے وقت سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی عمر چھے برس اور رخصتی کے وقت ۹ برس تھی۔ صحابیات میں سب سے بڑھ کر علم وفضل کی مالک تھیں۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی کنیت ام عبداللہ رکھی۔ اُن سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت مثالی تھی۔[4]

امام شعبی بیان کرتے ہیں کے امام مسروق جب سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے کوئی حدیث روایت کرتے تو

---

[1] نسب قريش لأبي عبد الله مصعب الزبيري (ص: ٢٧٧) الاستيعاب لابن عبد البر (٣/ ١٣٦٦)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٩٧٩) أسد الغابة (٣/ ٣٠٩)

[3] سيرة أعلام النبلاء (٢/ ٢٨٧)

[4] تاريخ الدعوة إلى الإسلام للدكتور يسرى محمد هاني (ص: ٣٤)

کہتے: ''مجھے صدیقہ بنتِ صدیق، جن کی براءت اللہ تعالیٰ نے آسمان سے نازل فرمائی اور جو رسولِ اکرم ﷺ کی سب سے محبوب بیوی تھیں، نے روایت بیان کی ہے۔'' حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی احادیث کی تعداد (۲۲۱۰) ہے۔ ان میں سے (۱۷۴) احادیث بخاری ومسلم کے درمیان متفق علیہ ہیں، جبکہ صحیح بخاری میں (۵۴) احادیث اور صحیح مسلم میں (۶۹) احادیث ان کے علاوہ ہیں۔[1] سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا ۶۳ سال اور چند ماہ عمر پا کر ۵۷ھ میں فوت ہوئیں۔ آپ کی کوئی اولاد نہیں تھی۔[2]

ام کلثوم بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا: ام کلثوم کی والدہ کا نام حبیبہ بنت خارجہ تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے اپنی وفات کے وقت کہا:

''اِنَّمَا هُمَا أَخَوَاكِ وَأُخْتَاكِ''، ''میں تمھارے دو بھائی اور دو بہنیں چھوڑے جا رہا ہوں۔''

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے سوال کیا: ''اپنی بہن اسماء کو تو میں جانتی ہوں یہ دوسری کون ہے؟'' آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''ذُو بَطْنِ بِنْتِ خَارِجَةَ، قَدْأُلْقِيَ فِي خَلَدِي أَنَّهَا جَارِيَةٌ''

''یہ خارجہ کا حمل ہے اور میرے دل میں یہ بات ڈالی گئی ہے کہ وہ لڑکی پیدا ہوگی۔''

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے خیال کے عین مطابق آپ کی وفات کے بعد لڑکی پیدا ہوئی۔[3] ام کلثوم سے حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ نے شادی کی، وہ معرکۂ جمل کے دوران شہید ہو گئے۔ آپ کی عدت کے دوران سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا آپ کو مکہ مکرمہ لے گئیں اور آپ کو حج کرایا۔[4]

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے مبارک خاندان کا یہ مختصر سا تذکرہ تھا جسے اللہ تعالیٰ نے نعمتِ اسلام سے نوازا۔ علماء نے لکھا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے علاوہ کسی بھی خاندان کے نسل در نسل چار اشخاص ایسے نہیں ہیں جنھیں رسولِ اکرم ﷺ کی صحبت کا شرف حاصل ہوا ہو۔ صرف حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی کے مبارک خاندان میں شرفِ صحابیت کی یہ درخشاں مثال موجود ہے۔ عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ، آپ کی والدہ اسماء رضی اللہ عنہا، اسماء کے والد ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوبکر کے والد ابو قحافہ رضی اللہ عنہ، یہ سب شرفِ صحابیت کے رتبے پر فائز تھے،

---

[1] سيرة أعلام النبلاء (٢/ ١٣٥۔ ١٣٩)

[2] الطبقات لابن سعد (٨/ ٥٨)

[3] الطبقات لابن سعد (٣/ ١٩٥)

[4] الاصابة (٨/ ٤٦٦) نسب قريش لأبي عبد الله مصعب الزبيري (ص: ٢٧٨)

اللہ تعالیٰ سب سے راضی ہو جائے۔اسی طرح محمد اور ان کے والد عبد الرحمٰن بن ابی بکر بن ابی قحافہ رضی اللہ عنہم کو بھی شرفِ صحابیت حاصل ہے۔[1]

اسی طرح سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے علاوہ کسی اور صحابی کو یہ شرف حاصل نہیں کے اس کے والد، والدہ اور اولاد سب مسلمان ہوں اور انھیں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہو۔ یہ یگانہ شرف صرف آپ ہی کے حصے میں آیا۔ آپ کا باعظمت خاندان تھا جس میں کوئی منافق نہ تھا۔ کیونکہ ایمان اور نفاق دونوں کے الگ الگ ٹھکانے ہیں۔ مہاجرین میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور انصار میں بنونجار کا گھرانہ ایمان کا سرچشمہ تھا۔[2]

آپ کا کاروبار:

قریش کے دیگر لوگوں کی طرح حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی تجارت کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں بہت برکت دے رکھی تھی۔ یہ مکہ کے مشہور ذی اثر اور بڑے تاجروں میں سے ایک تھے۔ آپ کپڑے کا کاروبار کرتے تھے۔ آپ کی امانت ودیانت اور حسنِ معاملہ کی دُور دُور تک شہرت تھی۔ جب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلانِ نبوت فرمایا تو ان کے پاس چالیس ہزار درہم تھے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی دعوت دی تو انھوں نے بلا چون وچرا اسلام قبول کر لیا۔ صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ مکہ مکرمہ کی با اثر اور ممتاز شخصیت تھے، اس لیے اسلام کو ان کی ذات سے اخلاقی اور مادی دونوں اعتبار سے بہت مدد ملی۔

آپ کی دعوت وتبلیغ:

اُن کی تبلیغ کے نتیجے میں حضرت عثمان بن عفان، زبیر بن عوام، طلحہ بن عبید اللہ، عبد الرحمٰن بن عوف، سعد بن ابی وقاص، ابوعبیدہ بن جراح، عثمان بن مظعون، ابوسلمہ بن عبد اللہ بن اسد اور خالد بن سعید بن عاص رضی اللہ عنہم جیسی بلند پایہ شخصیات نے اسلام قبول کیا۔ اگر آپ اوپر کی فہرست کو دیکھیں گے تو عشرہ مبشرہ میں سے چھے شخصیات ایسی ہیں جو محض آپ کی دعوت سے متاثر ہو کر مسلمان ہوئیں۔

انھوں نے اپنے گھر کے افراد کو بھی بھرپور طریقے سے دعوت دی، چنانچہ ان کی بیٹی سیدہ اسماء، ان کا

---

[1] أبو بكر الصديق لمحمد رشيد رضا (ص: ٧)

[2] أبو بكر الصديق لمحمد مال الله (١/ ٢٨٠)

بیٹا عبد اللہ، ان کی والدہ ام الخیر اور ان کا غلام عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہم نہایت قدیم الاسلام ہیں۔ ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے تو مسلمان ماں باپ ہی کی آغوش میں آنکھ کھولی تھی۔[1]

حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت:

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے شدید محبت کرتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ذرا سی بھی تکلیف میں دیکھتے تو تڑپ اٹھتے۔ صحیح بخاری میں روایت ہے کہ حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کے نواسے حضرت عُمرو بن زبیر رضی اللہ عنہما نے ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن عَمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے کہا کہ مشرکینِ مکہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو سب سے زیادہ بدسلوکی کی تھی، اس کی تفصیل بتایئے۔ انھوں نے بتایا کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ حطیم کے پاس نماز پڑھ رہے تھے کہ عقبہ بن ابی معیط آ گیا۔ اس نے آتے ہی اپنا کپڑا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی گردن میں ڈال کر نہایت سختی کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا گلا گھونٹنا شروع کر دیا۔ کسی نے یہ خبر حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کو پہنچا دی۔ وہ دوڑتے ہوئے آئے، عقبہ کے دونوں کندھے پکڑ کر اسے دھکا دیا اور اسے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے دور دھکیلتے ہوئے فرمایا:

﴿ اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ ﴾ [غافر: ٢٨]

''کیا تم لوگ اس شخص کو اس لیے قتل کرنا چاہتے ہو کہ وہ اللہ کو اپنا رب مانتا ہے؟''

پھر انھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دفاع کیا۔[2]

اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ قریشِ مکہ نے اسلام کی دعوت کو روکنے کے لیے تمام حربے آزما ڈالے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر طرح سے تنگ کیا گیا۔ مگر یہاں صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کا کردار دیکھئے کہ وہ دل کی گہرائیوں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے حبِ صادق کے بڑے راسخ جذبات رکھتے تھے۔ ان کی محبت وفداکاری، جاں نثاری اور ایثار وقربانی کا یہ عالم تھا کہ انھیں یہ بھی گوارا نہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاؤں میں کوئی کانٹا چبھ جائے۔

دعوتِ اسلام کے پہلے بے باک خطیب:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ جب صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی تعداد ٣٨ ہو گئی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٧٦)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٨٥٦)

نے رسولِ اکرم ﷺ سے اصرار کیا کہ علی الاعلان دعوتِ اسلام دیجیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

«يَا أَبَا بَكْرٍ! إِنَّا قَلِيلٌ» ''اے ابوبکر (رضی اللہ عنہ)! ابھی ہماری تعداد تھوڑی ہے۔''

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مصرّ رہے حتیٰ کہ آپ ﷺ اعلانیہ تبلیغ کے لیے باہر نکل آئے۔ مسجدِ حرام کے اطراف میں ہر مسلمان اپنے قبیلے کے افراد میں جلوہ آرا ہوگیا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تقریر کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے، اس موقع پر رسولِ اکرم ﷺ بھی تشریف فرما تھے۔ اس طرح سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے دعوتِ اسلام کے پہلے بے باک خطیب ہونے کا شرف حاصل کیا۔

مشرکین حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے۔ انھوں نے آپ کو بری طرح مارا۔ عتبہ بن ربیعہ (جو غزوۂ بدر میں واصلِ جہنم ہوا) اُس نے اُن کے قریب آکر انھیں پیوند لگے ہوئے دونوں جوتوں سے مارنا شروع کر دیا۔ اُس بدبخت نے حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کے چہرے کو بطورِ خاص نشانہ بنایا، پھر وہ آپ کے پیٹ پر چڑھ بیٹھا۔ آپ کو اس قدر مارا گیا کہ منہ اور ناک سوج کر ایک ہوگئے۔ مکہ میں کہرام مچ گیا۔

ان کے قبیلہ بنو تیم کے لوگوں کو معلوم ہوا تو وہ بھاگے بھاگے آئے اور انھیں ایک کپڑے میں ڈال کر گھر لے آئے۔ قبیلے والوں کو یقین تھا کہ اب یہ بچ نہیں سکیں گے۔ چنانچہ اعلان کر دیا گیا کہ اگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو کچھ ہوگیا تو بنو تیم عتبہ کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ شام تک بے ہوش رہے۔ قبیلے والے ان کا علاج معالجہ کرتے رہے اور ان کے پاس مسلسل بیٹھے رہے کہ انھیں کب ہوش آتا ہے۔ شام کا وقت ہوا تو اُن کی زبان کھل گئی۔ اب ذرا اُلفت کی شان دیکھیے۔ محبت اسی کو کہتے ہیں کہ زبان کھلتے ہی جو سب سے پہلا سوال کیا، وہ یہ تھا کہ اللہ کے رسول ﷺ کا کیا حال ہے؟ اِس پر بنو تیم کے لوگ بہت ناراض ہوئے کہ جس کی خاطر یہ حال ہوا، پھر اُسی کا نام لے رہے ہیں۔ وہ سب خفا ہوکر چل دیے اور حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کے گھر والوں سے کہہ گئے کہ انھیں کچھ کھلا پلا دینا۔

راز داری کا تقاضا:

جب لوگ چلے گئے تو والدہ نے کھانے پینے کے لیے اصرار کیا مگر ان کا بار بار بس ایک ہی سوال تھا: مجھے اللہ کے رسول ﷺ کا حال بتلاؤ۔ ماں نے جواب دیا: بیٹا! مجھے اُن کے بارے میں کچھ خبر نہیں۔ مکہ کی فضا اُن دنوں مسلمانوں کے لیے قطعاً سازگار نہ تھی۔ حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نے اپنی والدہ سے کہا: اماں جان! آپ (حضرت) ام جمیل بنت خطاب رضی اللہ عنہا کے پاس جائیں اور اُن سے دریافت کریں۔ یہ

(حضرت) ام جمیل رضی اللہ عنہا مسلمان ہو چکی تھیں مگر تا حال اپنے اسلام کا اظہار نہیں کیا تھا۔

جب حضرت ام الخیر رضی اللہ عنہا حضرت ام جمیل رضی اللہ عنہا کے پاس گئیں اور ان سے کہا کہ میرا بیٹا (حضرت) ابوبکر (رضی اللہ عنہ) تم سے (حضرت) محمد بن عبد اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں دریافت کرنا چاہتا ہے، تو حضرت ام جمیل رضی اللہ عنہا کہنے لگیں: میں نہ (حضرت) ابوبکر (رضی اللہ عنہ) کو جانتی ہوں نہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو۔ اُس خاتون کی ذہانت اور حکمت کی داد دیجیے کہ (حضرت) ام الخیر رضی اللہ عنہا سے کہنے لگیں: اگر تم پسند کرو تو میں تمھارے ساتھ تمھارے بیٹے کے پاس جا سکتی ہوں۔

راز داری کا تقاضا یہی تھا کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ٹھکانہ حضرت ام الخیر رضی اللہ عنہا کو بھی نہ بتایا جائے۔ حضرت ام الخیر رضی اللہ عنہا کہنے لگیں: بہت اچھا۔ آؤ تم میرے ساتھ چلو۔ اس کے بعد حضرت ام جمیل رضی اللہ عنہا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے گھر آتی ہیں۔ دیکھا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ انتہائی خستہ اور نڈھال حالت میں پڑے ہوئے ہیں۔ اُن کو اِس حالت میں دیکھا تو وہ صدمے کے مارے چیخ اٹھیں اور مشرکین کو بددعائیں دینے لگیں۔ کہنے لگیں: جس قوم نے آپ جیسے بھلے آدمی سے یہ سلوک کیا ہے وہ یقیناً بڑی بدقماش اور کافر قوم ہے۔ مجھے امید ہے اللہ تعالیٰ اُن سے آپ کا بدلہ لے کر رہے گا۔ حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نے اُن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں پوچھا کہ مجھے اُن کا حال بتائیے؟ حضرت ام جمیل رضی اللہ عنہا نے کہا: آپ کی والدہ ہماری باتیں سن رہی ہیں۔ انھوں نے کہا: ان سے چھپانے کی ضرورت نہیں۔ حضرت ام جمیل رضی اللہ عنہا نے کہا: اللہ کے فضل و کرم سے وہ صحیح سالم ہیں۔ پوچھا: وہ کہاں ہیں؟ انھوں نے کہا: وہ دارِ ارقم میں ہیں۔ اب حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نے قسم کھا لی کہ اُس وقت تک نہ کچھ کھائیں گے نہ پئیں گے جب تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ انور کی زیارت نہ کر لیں، چنانچہ تھوڑی دیر تک انتظار کیا۔

جب لوگوں کی آمد و رفت بند ہو گئی اور گلیوں میں سناٹا چھا گیا تو یہ دونوں خواتین حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ساتھ لے کر دارِ ارقم پہنچیں۔ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ساتھی کو دیکھا، ان کے زخموں اور حالتِ زار کا مشاہدہ فرمایا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر رقت طاری ہو گئی۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم جھکے اور اپنے دوست کو محبت اور شفقت سے بوسہ دیا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کی: میرے ماں باپ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر قربان ہوں! مجھے زیادہ تکلیف نہیں ہے۔ اس واقعہ سے اندازہ کریں کہ حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کو نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کتنی بے پایاں محبت تھی، یہ عظیم واقعہ اپنے دامن میں ہر اُس مسلمان کے لیے نہایت قیمتی اسباق اور عبرتوں کو سموئے

ہوئے ہے جو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے نقشِ پا سے راہنمائی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس واقعے سے حاصل ہونے والے بعض اہم اسباق درجِ ذیل ہیں:

- کفار و مشرکین کے سامنے اسلام کی اعلانیہ دعوت و تبلیغ کی تمنا، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی قوتِ ایمانی اور بہادری کی بہت بڑی دلیل ہے۔ اسلام کی دعوت دینے پر آپ پر اتنا ہولناک تشدّد کیا گیا کہ آپ کی موت یقینی نظر آتی تھی۔ یقیناً اپنی جان سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت آپ کے رگ وپے میں سرایت کر چکی تھی۔ قبولِ اسلام کے بعد آپ پرچمِ توحید اور "لآ إلٰه إلا اللّٰهُ محمد رّسولُ اللّٰه" کی ندا کو نہایت بلند وبالا دیکھنا چاہتے تھے، چاہے اس کی قیمت آپ کو اپنی جان کی صورت ہی میں ادا کرنی پڑے۔ واقعہ یہ ہے کہ آپ نے توحید اور اسلام کی خاطر اپنی زندگی کا نذرانہ پیش کرنے سے بھی گریز نہیں کیا۔ علاّمہ اقبال نے کیا خوب کہا ہے:

پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول
صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کے لیے ہے بس اللہ کا رسول (صلی اللہ علیہ وسلم)

ایسی بے مثال محبت ہر مسلمان کے لیے عظیم نمونہ ہے اور اسی کا عملی جلوہ ہماری زندگی میں نظر آنا چاہیے۔

مقامِ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ:

یہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کون ہیں؟ یہ وہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں جن کی قسمت میں رفیقِ غارِ ثور ہونے کی سعادت لکھی تھی۔ حضرت ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ کا بہت مقام و مرتبہ ہے، اُن کی سب سے بڑی فضیلت اور سب سے بڑی تعریف اُن کا صدیق ہونا ہی ہے۔ اور یہ ایک اتنا بڑا وصفِ کمال ہے جس میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنی نظیر آپ تھے۔ محدّثین و مؤرخین نے آپ کے کارناموں کا الگ الگ ذکر کیا ہے۔ حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کی حیاتِ مبارکہ کے بے شمار روشن پہلو ہیں۔ ان کو بہت سے ایسے اعزازات ملے جو کسی اور صحابی کے حصہ میں نہیں آئے۔ مثلاً وہ مردوں میں سے سب سے پہلے مسلمان ہوئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ فرمایا کہ میں نے جس کسی کو اسلام پیش کیا اس نے تھوڑی بہت جھجک ضرور محسوس کی، لیکن جب (حضرت) ابوبکر (رضی اللہ عنہ) کے سامنے اسلام پیش کیا تو انھوں نے جھجک کے بغیر بلا تاخیر اس کو قبول کر لیا۔[1]

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مردوں میں سے اسلام کی پہلی صدائے توحید پر ہی لبیک کہا تھا۔ ایک

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١/ ١٥٦)

مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تشکّر و امتنان کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا:

''بلاشبہہ جان و مال کے لحاظ سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے زیادہ مجھ پر کسی اور کا احسان نہیں ہے۔''

تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ رونے لگے اور عرض کی:

''یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! یہ جان اور مال کیا کسی اور کے لیے بھی ہے۔''[1]

اور یہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ وہ ہیں جنھیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے عتیق کا لقب ملا۔[2] یہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ وہ ہیں جن کا دوسرا لقب صدیق ہے جو نبی علیہ السلام کی طرف سے آپ کو ملا تھا۔ جیسا کہ حدیث گزری ہے۔[3]

یہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ وہ ہیں جنھوں نے سب سے پہلے اللہ کی راہ میں مار کھائی۔ حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ سب سے پہلے شخص ہیں جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دفاع کیا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی سب سے پہلے شخص ہیں جنھوں نے لوگوں کو اللہ کی طرف دعوت دی۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ وہ ہیں جنھوں نے اسلام کی نصرت کے لیے اپنا مال فراخ دلی سے خرچ کیا۔ مفسرینِ کرام اس امر پر متفق ہیں کہ سورہ لیل کی یہ آیات حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ ہی کے حق میں نازل ہوئی ہیں:

﴿وَسَيُجَنَّبُهَا الْأَتْقَى ﴿١٧﴾ الَّذِي يُؤْتِي مَالَهُ يَتَزَكَّى ﴿١٨﴾ وَمَا لِأَحَدٍ عِندَهُ مِن نِّعْمَةٍ تُجْزَىٰ﴾ [اللیل: ۱۷۔ ۱۹]

''اور اس (نارِ جہنم) سے ایسا شخص دور رکھا جائے گا جو بڑا پرہیزگار ہوگا، جو اپنا مال راہِ حق میں خرچ کرتا ہے۔ اور اس پر کسی کا کوئی احسان نہیں کہ جس کا اسے بدلہ دیا جارہا ہو۔''

یعنی کسی کا بدلہ اتارنے کے لیے خرچ نہ کرتا ہو۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی امتِ محمدیہ میں سے سب سے پہلے شخص ہیں جنھوں نے قرآنِ مجید کے متفرق اوراق کو جمع کر کے اسے ایک کتاب کی شکل دی، پھر اس کتابُ اللہ کا نام مصحف رکھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی سب سے پہلے شخص ہیں جنھوں نے کفارِ قریش کے

[1] جامع الترمذي، مناقب أبي بكر الصديق.

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٦٧٩) المعجم الكبير للطبراني (١/ ٥٢۔ ٥٣) الإحسان في تقريب صحيح ابن حبان (٢٥/ ٢٨٠)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٦٦٥)

ساتھ آنحضرت ﷺ کی حمایت میں جنگ لڑی۔

نبی مکرم ﷺ کے بعد اسلام میں سب سے پہلے جس نے مسجد بنائی وہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی ہیں۔ یہ وہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں جنھیں آنحضرت ﷺ کی حیاتِ مبارکہ میں حج کی امامت کا شرف حاصل ہوا اور یہ وہی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں جنھیں آنحضرت ﷺ نے باصرار نماز کی امامت کا حکم فرمایا اور خود بھی ان کے پیچھے نماز ادا کی، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ہی سب سے پہلے بیت المال قائم کیا۔ یہی وہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں جنھیں سب سے پہلے دوزخ سے نجات کی خوشخبری نبیِ رحمت ﷺ نے دی اور عتیق کے لقب سے مشرف فرمایا۔ وہ امتِ محمدیہ ۔علیٰ صاحبھا الصلاۃ والسلام۔ میں سب سے پہلے شخص ہیں جنھوں نے رسول اللہ ﷺ کی خلافت سنبھالی اور نہایت نازک وقت میں اسلام کی ڈولتی کشتی کو سہارا دیا۔

حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ ہی پہلے شخص ہیں جنھوں نے منکرینِ ختمِ نبوت اور منکرینِ زکاۃ کے خلاف باقاعدہ جنگ لڑی۔ یہ اُن کبار صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں سے ہیں جنھوں نے پورا قرآنِ مجید حفظ کر لیا تھا۔ یہی وہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں جنھوں نے اللہ کی راہ میں ستائے جانے والے سات غلاموں کو اپنا مال خرچ کر کے کفار کے چنگل سے آزاد کرایا، اُنہی میں سے ایک حضرت بلال رضی اللہ عنہ بھی تھے۔[1]

یارِ غار:

رفیقِ خاص اور یارِ غار حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کا ایک بہت بڑا اعزاز یہ ہے کہ آپ اللہ کے رسول ﷺ کے سفرِ ہجرت میں رفیقِ خاص تھے۔ وہ سفر بے حد پُر خطر اور دشوار تھا۔ اُسی سفر سے حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کے فضائل و مناقب کا سب سے زیادہ درخشاں باب شروع ہوتا ہے۔ ہجرت کے سفر کا پروگرام ایک دینی اور ملی راز تھا جسے محفوظ رکھنا بہت ضروری تھا تاکہ کفار و مشرکین اِس پروگرام سے بے خبر رہیں۔ حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ خود اور ان کا پورا گھرانہ اس پروگرام سے آگاہ تھا مگر ان کی محبتِ رسول ﷺ، ایثار و وفاداری اور رازداری کے کیا کہنے، اللہ اکبر، دنیا کا بڑے سے بڑا خوف یا مال اُن سے یہ راز افشاء نہیں کرا سکا۔سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے ہجرت کے اس تاریخی سفر کی تفاصیل بیان کی ہیں جو صحیح بخاری اور تاریخ وسیرت کی کتابوں میں محفوظ ہیں۔ جب اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۰۲۸)

کو یہ خبر سنائی کہ مجھے مکہ چھوڑنے اور سفر کرنے کی اجازت مل چکی ہے تو حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نے فرطِ محبت سے بے قرار ہو کر سب سے پہلا سوال یہ پوچھا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کیا اِس سفر میں مجھے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمراہی کی سعادت نصیب ہو سکے گی؟

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ہمارے ماں باپ قربان ہوں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کمالِ شفقت سے ارشاد فرمایا: ہاں! ابوبکر (رضی اللہ عنہ)! تم میرے ساتھ رہو گے، تو آپ خوشی کے مارے آبدیدہ ہوگئے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ''اللہ کی قسم! جب میں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ہجرت کے دن روتے ہوئے دیکھا تو اس وقت مجھے پہلی مرتبہ اس بات کا ادراک ہوا کہ کوئی خوشی کی شدّت سے بھی روسکتا ہے۔'' بلاشبہہ خوشی کی انتہا یہ ہے کہ خوشی آنسوؤں میں ڈھل جائے۔

سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جانتے تھے کہ اِس صحبت کا مفہوم یہ ہے کہ عنقریب وہ رسولِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چند دن کے لیے ضرور رفیقِ سفر بنیں گے اور عنقریب انھیں اپنے قائد اور محبوبنبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنی جان نثار کرنے کا بھرپور موقع ملے گا۔ اس کائنات میں اس سے بڑھ کر اور کون سی کامیابی ہوسکتی ہے کہ اس مدت میں تمام اہلِ زمین اور تمام صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے صرف اکیلے حضرتِ صدیق رضی اللہ عنہ سیدِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے رفیق اور ساتھی تھے۔[1]

پھر جب اللہ کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کافروں کے سروں پر خاک ڈالتے ہوئے ہجرت کی رات اپنے گھر سے نکلے تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے گھر تشریف لے آئے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی عمدہ تیاری اور خوشی کے جذبات:

سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی ہجرت کی تیاری میں نبوی تربیت کا اثر جھلکتا ہے، چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جب مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کرنے کا ارادہ کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ سے فرمایا:

«لَا تَعْجَلْ لَعَلَّ اللّٰهَ يَجْعَلُ لَكَ صَاحِباً»

''جلدی نہ کرو، شاید اللہ تعالیٰ تمھارے لیے کوئی ہمسفر بنادے۔''[2]

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اِس فرمان کے بعد سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ہجرت کی تیاری اور اس کے متعلق

[1] التربية القياديه للغضبان (٢/ ١٩١۔١٩٢)

[2] السيرة النبوية لابن هشام (١/ ٤٨٠) و فقه السيرة للغزاني بتحقيق الألباني (ص: ١٥٨)

سوچ بچار کرنا شروع کر دیا۔ آپ نے سفرِ ہجرت کی تیاری کے لیے دو سواریاں خریدیں اور انھیں اپنے گھر ہی میں رکھ کر چارہ ڈالتے رہے۔ صحیح بخاری کی روایت میں ہے:

«عَلَفَ رَاحِلَتَيْنِ كَانَتَا عِنْدَهُ وَرَقَ السَّمُرِ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ»[1]

''حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے ہاں موجود دونوں سواریوں کو چار ماہ تک ببول کے درخت کے پتوں کا چارا کھلایا۔''

حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نے عرض کی: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! میں نے یہ دو عمدہ اونٹنیاں سفر کے لیے تیار کر رکھی ہیں، ان میں سے ایک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہے۔ مگر سخت ناموافق فضاء وجان لیوا حالات اور انتہائی شدید ضرورت کے اس موقع پر بھی رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب ملاحظہ فرمایئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ابوبکر (رضی اللہ عنہ)! میں سواری ضرور لوں گا مگر قیمت ادا کر کے لوں گا، مفت میں نہیں۔ یہی وہ اونٹنی ہے جو قصواء کے نام سے معروف ہوئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص اونٹنی کہلائی۔ حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نے اسے آٹھ سو درہم میں خریدا تھا۔ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ آٹھ سو درہم میں میری ہوئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طرزِ عمل سے یہ سبق اجاگر ہوتا ہے کہ دوستی اور تعلقات اپنی جگہ مگر انسان کو ممکن حد تک دوسرے ساتھی پر اپنا بوجھ ڈالنے سے گریز کرنا چاہیے۔ ان دونوں اونٹنیوں کو مناسب تیاری کے بعد مکہ ہی کے ایک شخص عبد اللہ بن اریقط کے حوالے کر دیا گیا۔ اس سے پہلے ہی یہ طے پا چکا تھا کہ وہ تین روز بعد جب کفار تھک ہار کر ٹھنڈے پڑ جائیں گے، یہ دونوں اونٹنیاں لے کر غارِ ثور کے قریب پہنچ جائے گا۔ وہ اگرچہ کافر تھا مگر بات کا پکا تھا، اور صحرائی و بیابانی راستوں کا ماہر تھا۔ اس سے اجرت پر یہ معاملہ طے ہوا کہ وہ مدینہ پہنچنے تک اِن مسافروں کی راہنمائی کرتا رہے گا۔[2]

واقعۂ غارِ ثور:

راہِ حق کے یہ دونوں مسافر حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کے مکان کی پچھلی کھڑکی سے نکلتے ہیں اور بظاہر یمن کا رخ اختیار کرتے ہیں تاکہ پیچھا کرنے والے ناکام رہیں۔ اور جنوب کی سمت چند میل کی مسافت پر واقع جبلِ ثور کے ایک غار تک پہنچ جاتے ہیں۔ یہ نہایت بلند اور بڑی پُر پیچ ومشکل چڑھائی والا

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٢٩٧)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٩٠٥) السيرة لابن كثير (٢٠٨، ٢٠٩)

پہاڑ ہے۔ یہاں پتھر بڑی کثرت سے ہیں۔ رسولِ کریم ﷺ کے خوبصورت نازک پاؤں اس چڑھائی کے دوران زخمی ہو گئے۔ پھر حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کی قسمت کے کیا کہنے کہ انھوں نے پہاڑ کے وسط میں پہنچ کر آپ ﷺ کو اپنے کندھوں پر اٹھا لیا اور پہاڑ کی چوٹی پر ایک غار کے پاس جا پہنچے جو تاریخ میں ''غارِ ثور'' کے نام سے معروف ہے۔ یہاں پہنچ کر وہ فوراً محبت سے بے قرار ہو کر عرض کرتے ہیں: آقا! اللہ کے لیے درخواست کرتا ہوں کہ آپ ﷺ ابھی غار میں داخل نہ ہوں۔ پہلے میں غار میں جاتا ہوں اور یہ دیکھ کر واپس آتا ہوں کہ وہاں کوئی تکلیف دینے والی چیز یا موذی جانور موجود نہ ہو۔ اگر ایسی کوئی مُضر چیز ہو اور مجھے اس سے نقصان پہنچ جائے تو مجھے یہ نقصان بصد شوق گوارا ہو گا مگر آپ ﷺ کو کوئی تکلیف پہنچے تو یہ ناقابلِ تلافی نقصان ہو گا جو مجھے ہرگز گوارا نہیں، چنانچہ حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ اندر داخل ہوئے۔ غار کو رحمۃ للعالمین ﷺ کے لیے صاف کیا اور دیکھا کہ ایک طرف چند سوراخ ہیں۔ انھوں نے اپنی چادر پھاڑ کر اس کے ٹکڑوں سے سوراخ بند کیے اور آواز دی کہ اب تشریف لے آئیں۔ کلیئرنس ملنے کے بعد آپ ﷺ اندر تشریف لے گئے۔

حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کے افرادِ خانہ:

حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بھی بڑی گہری سوجھ بوجھ والے ذہین نوجوان تھے۔ انھیں بھی راہِ ہجرت کے عظیم المرتبت مسافروں کے ٹھکانے کا بخوبی علم تھا کہ وہ تین راتوں سے غارِ ثور کی تاریکی میں روپوش ہیں۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ ہر شب غار میں ان برگزیدہ ہستیوں کی معیت میں گزارتے اور سحر ہونے سے قبل ہی قریشِ مکہ کے ساتھ یوں صبح کرتے کہ گویا رات کو وہ مکہ ہی میں تھے، پھر سارا دن قریش کی باتیں سنتے اور ان کے ناپاک ارادوں کے بارے میں جو بات بھی پلے پڑتی اسے ذہن نشین کر لیتے اور جب شام گہری ہو جاتی تو خاموشی سے جا کر غار کے پناہ گزینوں کو ساری تفاصیل سے آگاہ کر دیتے۔ یہ جرأت وہمت کی داستان تو حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کے بعض افرادِ خانہ کی ہے۔[1]

قریشِ مکہ کی سرگرمیاں:

اُدھر قریش نے رسول اللہ ﷺ اور حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ دونوں کو زندہ یا فوت شدہ حالت میں

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٩٠٥)

گرفتار کرنے والے کے لیے سو اونٹ انعام دینے کا اعلان کر دیا۔ اور مکہ کے تمام راستوں پر سخت پہرہ بٹھا دیا، چنانچہ لالچ میں بہت سے لوگ اُن مقدّس مسافروں کی تلاش میں نکل پڑے۔ صحیح بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: میں غار میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا۔ جب میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو مجھے ان لوگوں کے پاؤں نظر آئے جو ہمارے تعاقب میں نکل آئے تھے۔ میں نے عرض کی: ''اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! میرے ماں باپ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر قربان ہوں، یہ لوگ تو سر پر آپہنچے ہیں۔ اگر اِن مشرکین میں سے کسی نے اپنے پاؤں کی جانب نگاہ دوڑائی تو ہمیں بآسانی دیکھ لے گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَاظَنُّكَ يَا أَبَابَكْرٍ! بِاثْنَيْنِ، اَللّٰهُ ثَالِثُهُمَا؟»[1]

''اے ابوبکر (رضی اللہ عنہ)! ان دو شخصوں کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے جن کا تیسرا (ساتھی) خود اللہ تعالیٰ ہے؟''

جنھیں اللہ تعالیٰ کی معیّت حاصل ہو تمھارا کیا خیال ہے، کیا انھیں کوئی نقصان پہنچا سکتا ہے؟

صاحب، صحابی:

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتابِ مقدّس کی سورۃ التوبہ (آیت: ۴۰) میں اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے یارِ غار کی کیفیت کا تذکرہ یوں فرمایا ہے:

﴿ إِلَّا تَنْصُرُوهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ إِذْ أَخْرَجَهُ الَّذِينَ كَفَرُوا ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ﴾

''اگر تم اس (نبی) کی مدد نہیں کرو گے تو اللہ نے اُس کی (اُس وقت) مدد کی تھی جب کافروں نے اُس کو مکہ سے نکال دیا تھا، وہ دو میں سے دوسرا تھا، جبکہ وہ دونوں غارِ (ثور) میں تھے۔ تو (نبی) اپنے ساتھی (ابوبکر) سے کہہ رہے تھے: غم نہ کر، یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے۔''

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''یہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عظیم فضائل و مناقب میں سے ہے، اس آیت میں بالاتفاق ''صاحب'' سے مراد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں، بہت سی احادیث اس بات پر شاہد ہیں کہ غار میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٦٥٣)

کے ساتھ تھے اور اس فضیلت میں آپ کا کوئی ہمسر نہیں۔‘‘[1]

یہ لقب اللہ رب العزت نے آپ کو بذریعہ قرآنِ حکیم دیا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَسَيُجَنَّبُهَا الْأَتْقَى ﴾ ’’اور بڑا متقی اس (بھڑکتی آگ) سے ضرور دور رکھا جائے گا۔‘‘[2]

تین دن کے بعد غار سے نکل کر سفر کا اگلا مرحلہ شروع ہوا تو کفار و مشرکین میں سے کئی لوگ اب بھی ان دونوں کے تعاقب میں تھے تاکہ انھیں پکڑ کر انعام حاصل کر سکیں۔ ان حالات میں حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کو اپنی ذات کی فکر کم اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی فکر زیادہ تھی۔

نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم سفر:

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: ہم غار سے نکلنے کے بعد پوری رات اور اگلے دن دوپہر تک چلتے رہے۔ جب گرمی کی شدت کے باعث لوگوں کی آمدورفت کا خطرہ ٹل گیا تو ہم ایک چٹان کے سائے میں آرام کی غرض سے رک گئے۔ میں نے سائے والی جگہ کچھ برابر کی، اوپر چمڑے کی دری آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بچھا دی اور عرض کی: "اِضْطَجِعْ يَا رَسُولَ اللّٰهِ!،" ’’اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! آپ آرام فرمالیجیے۔‘‘

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم محوِ استراحت ہو گئے۔ پھر میں وہاں سے نکلا کہ دیکھوں کوئی ہمارا تعاقب تو نہیں کر رہا۔ اسی اثناء میں مجھے ایک چرواہا نظر آیا۔ میں نے اس سے کہا: ’’جوان! تمھارا تعلق کس سے ہے؟‘‘

اس نے کہا: ’’قریش کے ایک شخص کا غلام ہوں۔‘‘ اس نے مالک کا نام لیا تو میں پہچان گیا۔

میں نے پوچھا: ’’تھوڑا بہت دودھ ہوگا؟‘‘ اس نے کہا: ’’جی ہاں۔‘‘

میں نے کہا: ’’کیا میرے لیے دودھ (نکال لو) گے؟‘‘ اس نے ہاں میں جواب دیا۔

میں نے اس سے کہا تو اس نے ریوڑ میں سے ایک بکری کی ٹانگیں باندھیں، پھر میں نے اس سے کہا تو اُس بکری کے تھن سے گرد وغبار صاف کر، پھر میرے کہنے پر اس نے اپنی ہتھیلیاں بھی صاف کیں۔ میرے پاس ایک برتن تھا جس کے منہ پر کپڑا بندھا ہوا تھا۔ اُس نے کچھ دودھ دوھ کر مجھے دیا۔ میں نے دودھ والے برتن پر پانی انڈیلنا شروع کیا حتیٰ کہ وہ نیچے سے ٹھنڈا ہو گیا بعد ازاں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی

[1] الاصابة الأتقىٰ (٤/ ١٤٨)

[2] سورة الليل [آيت: ١٧] وكتبِ تفسير.

خدمت میں حاضری کے لیے چلا، وہاں پہنچا تو آپ ﷺ بیدار ہو چکے تھے۔ میں نے عرض کی: "اِشْرَبْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ!" "اے اللہ کے رسول ﷺ! نوش فرمائیے!" آپ ﷺ نے وہ دودھ پیا تو مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ پھر میں نے عرض کی: "کیا اب یہاں سے چلیں؟" آپ ﷺ نے چلنے کا اشارہ دیا، پھر ہم چل پڑے۔[1]

لوگ ہماری تلاش میں تھے۔ مگر ان میں سے صرف سُراقہ بن مالک بن جُعشم رضی اللہ عنہ جو گھوڑے پر سوار تھے، وہ ہم تک پہنچ سکے۔ میں نے عرض کی: "اے اللہ کے رسول ﷺ! یہ تعاقب کرنے والا ہمیں ملنے کو ہے۔" رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا» "گھبراؤ مت، اللہ ہمارے ساتھ ہے۔" اتنے میں وہ ہم سے چند نیزوں کے فاصلے پر آ گیا۔ میں نے عرض کی: "اے اللہ کے رسول ﷺ! تلاش کرنے والا ہم تک پہنچ چکا ہے۔" اور میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «لِمَ تَبْكِيْ؟» "کیوں رو رہے ہو؟" میں نے عرض کی:

"اَمَا وَ اللّٰهِ! مَا عَلٰى نَفْسِي اَبْكِيْ وَلٰكِنْ اَبْكِيْ عَلَيْكَ"

"اللہ کی قسم! میں اپنی جان کی خاطر نہیں بلکہ آپ ﷺ کی فکر میں رو رہا ہوں۔"

آپ ﷺ نے سُراقہ رضی اللہ عنہم کے خلاف بددعا فرمائی:

«اَللّٰهُمَّ اكْفِنَاهُ بِمَا شِئْتَ»

"اے اللہ! اپنی چاہت کے مطابق تو اس کے مقابلے میں ہمیں کافی ہو جا۔"

اُسی وقت سراقہ کے گھوڑے کی ٹانگیں زمین میں دھنس گئیں اور سُراقہ اس سے گر پڑا۔ اور اس نے کہا: "اے محمد! (ﷺ) مجھے یقین ہے کہ یہ آپ کا کام ہے۔ آپ اللہ سے دعا کریں، وہ مجھے اس آزمائش سے ایک دفعہ نکال لے۔ اللہ کی قسم! میں اس کے نتیجے میں آپ کے تعاقب میں اپنے پیچھے آنے والوں کو کسی اور راستے پر ڈال دوں گا۔ یہ میرا ترکش ہے، اس میں سے ایک تیر لے لیجیے کیوں کہ آپ کو قریب ہی فلاں جگہ پر میرے مال مویشی کے پاس سے گزرنا ہے۔ تو (یہ تیر بطورِ علامت دکھا کر) آپ ان میں سے اپنی ضرورت کے لیے کچھ لے سکیں گے۔"

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٦١٥، ٣٩١١)

«لَا حَاجَةَ لِيْ فِيْهَا» ''مجھے اس کی قطعاً ضرورت نہیں۔''

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لیے دعا کی تو اسے چھٹکارا ملا اور وہ اپنے ساتھیوں کی طرف پلٹ گیا۔ پھر ہم چل دیے۔[1]

راستے میں حضرت بریدہ بن حُصَیب اسلمی رضی اللہ عنہ انعام کے لالچ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو تلاش کرتے ہوئے ملے۔لیکن جب رحمتِ عالم سے آمنا سامنا ہوا اور گفتگو کا موقع ملا تو مخالفت کے سارے منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے اور یہ اپنی قوم کے اسی (۸۰) آدمیوں سمیت مسلمان ہو گئے۔ اسی سفر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ ملے۔ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں سفید کپڑے بطورِ ہدیہ پیش کیے۔[2]

اگر ہم سفر کے تمام واقعات کا مختصر تذکرہ بھی کریں گے تو بات بہت طویل ہو جائے گی۔مقصود صرف حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے کردار کو اجاگر کرنا ہے کہ انھیں نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کتنی محبت تھی۔

مدینہ والوں کا استقبال:

مدینہ کے لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مکہ سے روانگی کی خبر سن رکھی تھی، چنانچہ وہ ہر روز حرّہ کی طرف نکل کر دھوپ کی شدّت پیدا ہونے تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتظار کرتے رہتے اور پھر گھروں کو لوٹ جاتے۔ ایک روز جب وہ تھک ہار کر واپس جا رہے تھے، کہ ایک ٹیلے پر کھڑے یہودی کی نگاہ ان سفید پوش مقدّس مسافروں پر پڑی، اُس نے زور سے پکار کر کہا: اے مدینہ والو! جس مہمان کا تم انتظار کر رہے تھے وہ آ پہنچا ہے۔ یہ سنتے ہی لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا بھرپور استقبال کیا، وہ لوگ راہوں میں پلکیں بچھائے کھڑے تھے۔ اور کچھ اپنے گھروں کی چھتوں پر تھے، راستوں میں خادموں اور بچوں کا ہجوم تھا جو یہ صدا لگا رہے تھے:''اللہ اکبر! اللہ کے رسول آ گئے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم آ گئے۔''

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ۲۷ صفر کو مکہ سے روانہ ہوئے، ۸ ربیع الاول کو بارہ دن کے سفر کے بعد بروز سوموار مدینہ طیبہ پہنچے۔لوگوں کو یہ معلوم نہیں تھا کہ ان دونوں شخصیتوں میں سے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کون ہیں اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کون؟ چونکہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ لوگوں کے استقبال کا جواب دینے کے لیے

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٩٥٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٠٠٩)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٩٠٦)

کھڑے تھے اور اللہ کے رسول ﷺ خاموشی سے بیٹھے تھے، لہٰذا وہ حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ ہی کو آ کر سلام کرتے رہے، مگر جب رسولِ کریم ﷺ پر دھوپ پڑنے لگی اور حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نے ایک خادمِ رسول ﷺ کی حیثیت سے اپنی چادر اتار کر اسے رسالت مآب ﷺ کے اوپر تان دیا۔ تب لوگوں کو پتا چلا کہ یہ جو چادر کے زیرِ سایہ تشریف فرما ہیں، یہ اللہ کے رسول ﷺ ہیں۔[1]

یہ تھا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا بچپن، جوانی، حلیۂ مبارک، نام ونسب، کنیت، القاب، مقام ومرتبہ، اخلاق و کردار، قبولِ اسلام، دعوتی کردار، تاجدارِ رسالت مآب ﷺ پر جان نثاری کا مظاہرہ اور پھر نبی کریم ﷺ کے ساتھ مکہ سے مدینہ منورہ تک کی زندگی کا مختصر خاکہ۔

اب ہم ان کی مدنی زندگی کے حوالہ سے مختصر بات کریں گے۔

ہجرت کے ابتدائی ایام اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی علالت:

بلدِ امین مکہ مکرمہ سے نبیِ کریم ﷺ اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی ہجرت ایک عظیم قربانی تھی جس کی تعبیر نبیِ کریم ﷺ نے اپنے الفاظ میں یوں فرمائی:

''(اے مکہ مکرمہ!) اللہ کی قسم! تو اللہ تعالیٰ کی تمام روئے زمین سے بہتر ہے اور اللہ تعالیٰ کو اُس کی تمام زمین سے سب سے بڑھ کر محبوب ہے۔ اگر مجھے تیرے ہاں سے نکلنے پر مجبور نہ کیا جاتا تو میں یہاں سے کبھی نہ نکلتا۔''[2]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

''جب رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے تو وہاں بخار کی سخت وباء پھیلی ہوئی تھی اور اس کی وادی سے بد بودار پانی بہتا تھا، اس وجہ سے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم بیماری اور آزمائش سے دوچار ہو گئے، جبکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی اکرم ﷺ کو اس وباء سے محفوظ رکھا۔''

ام المومنین رضی اللہ عنہا مزید فرماتی ہیں: ''حضرت ابوبکر، عامر بن فہیرہ اور بلال رضی اللہ عنہم ایک ہی گھر میں مقیم تھے، چنانچہ انھیں بھی بخار نے آلیا۔ میں نے نبیِ کریم ﷺ سے ان کی عیادت کے لیے اجازت طلب کی تو آپ ﷺ نے اجازت مرحمت فرمادی۔ میں عیادت کی غرض سے اُن کے پاس چلی گئی۔ یہ ہم پر پردے کا

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٩٠٥)

[2] جامع الترمذي، رقم الحديث (٣٩٢٥) شیخ البانی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔

حکم نازل ہونے سے پہلے کا واقعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ انھیں کس قدر شدید بخار تھا۔ میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے قریب ہوئی اور کہا: ''ابا جان! آپ اپنے آپ کو کیسا محسوس کرتے ہیں؟'' انھوں نے فرمایا:

''ہر آدمی کو اپنے گھر والوں میں صبح کا سلام کیا جاتا ہے، حالانکہ موت اُس کے جوتے کے تسمے سے بھی زیادہ اُس کے قریب ہوتی ہے۔''

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے کہا: ''اللہ کی قسم! میرے والد کو معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔'' حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی مکہ مکرمہ کے ساتھ محبت اور وہاں جانے کی تڑپ کا یہ عالَم تھا کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کو جب بخار سے افاقہ ہوتا تو وہ گھر کے آنگن میں لیٹ جاتے، پھر بآواز بلند یہ اشعار پڑھتے:

''اے کاش! کیا کبھی میں اُس وادی میں رات بسر کر سکوں گا جہاں میرے اردگرد اِذخر اور جلیل نامی خوبصورت اور خوشبودار جڑی بوٹیاں ہوں۔ کیا میں کسی دن مِجنّہ کے کنویں پر جا سکوں گا اور کیا ''شامہ'' اور ''طفیل'' نامی پہاڑ مجھے نظر آئیں گے؟''

وہ فرماتی ہیں کہ میں نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس صورتِ حال سے آگاہ کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا فرمائی:

''اے اللہ! ہمارے لیے مدینہ منورہ کو بھی اسی طرح محبوب بنادے جس طرح ہمیں مکہ مکرمہ سے محبت ہے، بلکہ مکہ مکرمہ سے بھی زیادہ (مدینہ کی محبت پیدا فرما)۔ اسے بیماریوں سے پاک فرمادے، اس کے ''صاع'' اور ''مُد'' (کے پیمانوں) میں ہمارے لیے برکت فرما اور اس کا بخار جُحفہ منتقل کردے۔''[1]

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی دعا کو شرفِ قبولیت سے نوازا اور مسلمانوں کو اس دعا کے بعد اس بخار سے شفاء مل گئی اور مدینہ منورہ کرۂ ارضی کے مختلف علاقوں سے آنے والے مسلمانوں کے وفود اور مہاجرین کے لیے ایک عمدہ اور ممتاز وطن کی حیثیت اختیار کر گیا۔[2]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں سکونت اختیار کرنے کے بعد دولتِ اسلامیہ کی بنیادوں کو مضبوط و مستحکم کرنا شروع کیا۔ آپ نے انصار و مہاجرین کے مابین رشتۂ اخوت قائم کیا، پھر مسجدِ نبوی تعمیر کی اور

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٩٢٦) مسند أحمد (٦/ ٢٢١) السيرة النبوية لابن هشام (١/ ٥٨٨)

[2] التربية القياديه للغضبان (٢/ ٣١٠)

یہود کے ساتھ حتمی معاہدہ کیا۔ اس کے ساتھ ہی چھوٹے چھوٹے فوجی دستوں کے ذریعے دشمن سے جھڑپوں کا آغاز ہو گیا۔ آپ ﷺ نے اس جدید معاشرے کی اقتصادی، تعلیمی، معاشرتی اور تربیتی ترقی کا اہتمام کیا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے مخلص اور حقیقی وزیر کی حیثیت اختیار کر گئے اور ہر قسم کے حالات میں ہمیشہ آپ ﷺ کے ساتھ ساتھ رہے۔ آپ کسی خاص موقع یا کسی رزم گاہ سے پیچھے نہ رہے اور نہ کبھی آپ نے (اسلام کے فروغ کے لیے) اپنے مشورے، رائے اور مال میں بخل سے کام لیا۔[1]

حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''میں نے نبیِ کریم ﷺ کی معیّت میں سات غزوات میں شرکت کی ہے اور جو سرایا آپ ﷺ نے بھیجے اُن میں سے نو سرایا میں مجھے بھی شامل ہونے کا موقع ملا۔ ان سرایا میں کبھی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس ہماری کمان ہوتی تھی اور کبھی حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے پاس۔''[2]

جہادی زندگی:

اگر ہم حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو نبی کریم ﷺ کی معیّت میں گزاری ہوئی جہادی زندگی کے مختلف گوشوں میں تلاش کرتے ہیں تو ہمیں پتا چلتا ہے کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کے دین کی نصرت و اعانت کے لیے کس طرح اپنی ذہنی صلاحیتوں، مال اور جان کے ساتھ جہاد کیا۔

سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ اور غزوۂ بدر:

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ۲ھ کو پیش آنے والے غزوۂ بدر میں شرکت فرمائی۔ اس غزوے میں آپ کا کردار بڑی شہرت اور اہمیت کا حامل ہے۔ یہاں ہم آپ کے اُس کردار کے چند اہم پہلوؤں کا تذکرہ کرتے ہیں:

جنگ کا مشورہ:

جب نبیِ کریم ﷺ کو یہ اطلاعات ملیں کہ مکی تجارتی قافلہ بچ نکلا ہے اور مکہ مکرمہ کے بڑے بڑے سردار اور سالار مسلمانوں کے خلاف جنگ کی تیاریاں کر رہے ہیں تو رسول اللہ ﷺ نے اِس صورتِ حال

---

[1] تاريخ الدعوة إلى الإسلام للدكتور يسرى محمد هاني (ص: ١٢١)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٢٧٠)

کے بارے میں اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا۔[1] سب سے پہلے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور بڑا عمدہ اور مفید مشورہ دیا، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور انھوں نے بھی بڑی عمدہ اور موثر گفتگو فرمائی۔[2]

دورانِ جنگ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لڑائی کے لیے صفیں ترتیب دینے کے بعد قیادت کے مرکز کی طرف لوٹ گئے جو میدانِ جنگ سے علاحدہ ایک بلند ٹیلے پر چھپر کی صورت میں بنایا گیا تھا۔ اس چھپر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تھے۔ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی قیادت میں انصاری نوجوانوں کا گروپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چھپر کی حفاظت کر رہا تھا۔[3]

میدانِ جنگ میں دنیاوی اسباب اختیار کرنے سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب کی طرف متوجہ ہوئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر اللہ تعالیٰ سے مدد کے لیے دستِ سوال دراز کیا جس کا اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے وعدہ فرمایا تھا۔ آپ نے ان الفاظ میں دعا کی:

''اے اللہ! میرے ساتھ تو نے جو وعدہ کیا ہے اُسے میرے لیے پورا فرما! اے اللہ! اگر اہلِ اسلام کی یہ مختصر سی جماعت ہلاک ہوگئی تو (پھر) زمین پر کبھی تیری عبادت نہیں کی جائے گی۔''

نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسلسل اللہ تعالیٰ سے مدد کی دعا کرتے رہے حتیٰ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی چادرِ مبارک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک شانوں سے نیچے گر گئی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے چادر اٹھا کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک شانوں پر ڈال دی اور عرض کی:

''اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب سے بڑی التجائیں کر لی ہیں۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیے ہوئے وعدے کو ضرور پورا فرمائے گا۔''[4]

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دستِ مبارک تھام لیا اور عرض کی: ''حَسْبُكَ اللّٰهُ''، ''بس! اللہ تعالیٰ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کافی ہے۔'' چنانچہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم وہاں سے یہ آیت تلاوت کرتے ہوئے نکلے:

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٣٩٥٢)

[2] السیرۃ النبویۃ لابن هشام (٢/ ٤٤٧)

[3] السیرۃ النبویۃ لابن هشام (٢/ ٢٣٣)

[4] صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٧٦٣)

﴿ سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ ﴾ [القمر: ٤٥]

''عنقریب وہ جماعت شکست کھائے گی اور وہ پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے۔''[1]

سائبان کے نیچے نبیِ کریم ﷺ پر تھوڑی دیر کے لیے اونگھ کی سی کیفیت طاری ہوئی، پھر آپ ﷺ چونکے اور فرمایا:

''اے ابوبکر رضی اللہ عنہ! خوش ہو جاؤ۔ تیرے پاس اللہ تعالیٰ کی مدد پہنچ گئی ہے، یہ جبرائیل علیہ السلام ہیں جو اپنے گھوڑے کی لگام تھامے اُسے چلاتے ہوئے آرہے ہیں اور اُس کے دانتوں پر غبار ہے۔''

پھر نبیِ کریم ﷺ مجاہدینِ اسلام کے پاس تشریف لے گئے اور انھیں جہاد وقتال کی ترغیب دی۔[2]

حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نے نبیِ اکرم ﷺ کے اس طرزِ عمل سے یہ انتہائی اہم سبق سیکھا کہ اللہ تعالیٰ کی مدد کے حصول کے لیے بندے کو لوگوں سے الگ تھلگ ہو کر، نہایت خلوص کے ساتھ، اپنے آپ کو صرف اللہ تعالیٰ کے سپرد کر کے اللہ تعالیٰ ہی کے سامنے سجدہ ریز ہو جانا چاہیے۔

یہ منظر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے قلب ووجدان میں تاحیات راسخ رہا، چنانچہ آپ نے اس طرح کی کٹھن گھڑیوں میں رسول اللہ ﷺ کی اقتداء کرتے ہوئے اسے ہی اپنا معمول بنایا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ منظر اور یہ سنت ہر ایسے قائد، لیڈر، حاکم بلکہ عام آدمی کے لیے بھی ایک عمدہ وقابلِ عمل نصیحت اور سبق ہے، جو نبیِ کریم ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی اقتداء کرنے کا آرزومند ہے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس موقع پر بے مثال شجاعت و بسالت کا مظاہرہ کیا۔ آپ ہر سرکش کافر سے نبرد آزما ہونے کے لیے تُلے ہوئے تھے، خواہ مقابلے میں آپ کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔ آپ کا بیٹا عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ ابھی تک مشرف بہ اسلام نہیں ہوا تھا۔ وہ بھی اس معرکے میں مشرکینِ مکہ کے ساتھ شریکِ جنگ تھا۔ عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کا شمار عرب کے نامور بہادروں میں ہوتا تھا اور تیراندازی میں تو قریش کا کوئی آدمی ان کا ہم پلہ نہیں تھا۔ جب وہ مسلمان ہوئے تو ایک مرتبہ اپنے والدِ محترم سے کہنے لگے: ''ابا جان! جنگِ بدر کے روز کئی دفعہ آپ میرے نشانے پر آئے لیکن میں نے آپ سے اِعراض کیا اور آپ کو قتل کرنے سے اپنے ہاتھوں کو روک لیا۔'' یہ بات سن کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فوراً فرمایا:

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٩٥٣)

[2] السيرة النبوية لابن هشام (٢/ ٤٥٧)

"لٰكِنَّكَ لَوْ اَهْدَفْتَ لِيْ لَمْ اَصِفْ عَنْكَ"

"لیکن اگر تو میرے وار تلے آجاتا تو میں قطعاً تامل نہ کرتا بلکہ اُسی وقت تجھے قتل کر دیتا۔"

غزوۂ اُحد اور حمراء الاسد میں سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی شرکت:

غزوۂ اُحد میں مسلمانوں کو بڑی سنگین اور عبرتناک صورتِ حال سے دو چار ہونا پڑا۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آس پاس سے چھٹ گئے اور میدانِ کا رزار کے گوشوں اور کناروں کی طرف منتشر ہو گئے۔ پھر یہ افواہ پھیل گئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کر دیا گیا ہے۔ اس افواہ کے نتیجے میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا ردِعمل ایک دوسرے سے مختلف تھا۔ وسیع و عریض میدانِ جنگ میں ہر ایک کو اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ اس عالم میں سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہجوم توڑتے ہوئے سب سے پہلے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچے۔ اُن کے بعد حضرت ابوعبیدہ بن جراح، علی، طلحہ، زبیر، عمر بن خطاب، حارث بن صمہ، ابو دُجانہ، سعد بن ابی وقاص اور چند دیگر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم جمع ہو گئے۔ پھر وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ جبلِ اُحد کی ایک گھاٹی میں چلے گئے تاکہ وہاں سے مسلمانوں کی مادی اور روحانی قوتوں کو دوبارہ مجتمع کر سکیں۔[2]

حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ جب غزوۂ اُحد کا تذکرہ کرتے تو فرماتے:

"اُحد کا دن تو درحقیقت (حضرت) طلحہ رضی اللہ عنہ (کی جان نثاری اور بہادری) کا دن تھا۔"

غزوۂ اُحد کے بعد جب مشرکینِ مکہ نے مسلمانوں کو گھیر کر انھیں دبوچنا چاہا اور ان کی بیخ کنی کا ارادہ کیا تو نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی منصوبہ بندی اور لائحہ عمل اُن کے منصوبوں سے سبقت لے گیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی ساری چالوں کو ناکام بنا دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو، اِس کے باوجود کہ وہ شدید زخمی تھے، مشرکین کا تعاقب کرنے کا حکم دیا۔ اس کٹھن آزمائش کے لمحات میں بھی صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر لبیک کہا اور مشرکین کے تعاقب میں چل دیے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک مرتبہ سیدنا عُروہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے لیے قرآنِ پاک کی اس آیت کی تفسیر کی:

﴿ اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ۛ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴾ [آل عمران: ۱۷۲]

---

[1] تاريخ الخلفاء للسيوطي (ص: ٩٤) النهاية في غريب الحديث الأثر لابن الأثير (٥/ ٢٥١) ولابن قتيبه: جلد اول.

[2] مواقف الصديق مع النبي ﷺ في المدينه للدكتور عاطف الماضه (ص: ٢٧)

''یہی لوگ ہیں جنھوں نے جنگ میں زخم لگنے کے بعد اللہ اور اُس کے رسول کا حکم مانا، اُن میں سے جو لوگ نیکوکار اور پرہیزگار ہیں، اُن کے لیے بہت بڑا اجر ہے۔''

چنانچہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے دورانِ تفسیر فرمایا: ''میرے بھانجے! آپ کے والد زبیر اور سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہما انہی لوگوں میں سے تھے۔ جب رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو غزوۂ اُحد کے روز شدید مصائب سے دوچار ہونا پڑا اور مشرکین چلے گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں مشرکین پلٹ کر حملہ نہ کر دیں، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَنْ يَّذْهَبُ فِي اِثْرِهِمْ؟» ''تم میں سے کون ان کے تعاقب میں جائے گا؟''

اس پر ستر صحابہ رضی اللہ عنہم نے لبیک کہا جن میں سیدنا ابوبکر اور زبیر رضی اللہ عنہما بھی شامل تھے۔[1]

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے مابین ملاقات:

حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سامنے یہ مطالبہ رکھا کہ وہ معاہدے کی تجدید کرلیں اور مدتِ معاہدہ میں توسیع کریں۔ آپ نے جواباً فرمایا:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عہد و پیمان ہی میرا عہد و پیمان ہے۔ اللہ کی قسم! اگر تمھارے خلاف مجھے چیونٹیاں بھی لڑتی ہوئی مل جائیں تو میں تمھارے خلاف ان کی مدد کروں گا۔''

اس گفتگو سے سیدنا صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کی ذہانت و فطانت اور سیاسی بصیرت نمایاں ہوتی ہے۔ پھر اس سے دینِ حق پر آپ کے قوی ایمان کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ آپ بے خوف وخطر حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے سامنے اس بات کا اعلان کرتے ہیں کہ وہ ہر حالت میں قریش کے خلاف جنگ کے لیے تیار ہیں حتیٰ کہ اگر انھیں قریش کے خلاف چیونٹیاں بھی لڑتی ہوئی مل جائیں تو وہ قریش کے خلاف ان کی بھی مدد کریں گے۔[1]

حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کا مکہ مکرمہ میں داخلہ:

فتح مکہ کے موقع پر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے تو سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں موجود تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو گھوڑوں کے جبڑوں پر تھپڑ مارتے دیکھا تو مسکرا کر سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طرف متوجہ ہوئے اور ارشاد فرمایا:

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٠٧٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤١٨)

[2] تاريخ الدعوة الإسلامية للدكتور جميل عبد الله المصرى (ص: ١٤٥)

«يَا أَبَا بَكْرٍ! كَيْفَ قَالَ حَسَّانُ؟»

''ابوبکر! اس موقع ومحل کے متعلق (حضرت) حسان (رضی اللہ عنہ) نے کیا کہا ہے؟''

چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے سیدنا حسان رضی اللہ عنہ کے یہ اشعار پڑھے:

''ہم اپنے گھڑ سواروں کو گم پائیں اگر تم انھیں غبار اڑاتے ہوئے نہ دیکھو، جبکہ ان کی منزل کداء ہوگی۔ وہ جھکی ہوئی ڈھیلی مہاروں کو کھینچتے ہوں گے اور اُن کے کندھوں پر (خون کے) پیاسے تیر ہوں گے۔ ہمارے بہترین گھوڑے (فتح مکہ کے روز) ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کے لیے کوشاں ہوں گے، جن کے چہروں پر عورتیں اپنے دوپٹے مار رہی ہوں گی۔''[1]

یہ اشعار سن کر نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«اُدْخُلُوا مِنْ حَيْثُ قَالَ حَسَّانُ»[2]

''جدھر سے حسان نے مکہ مکرمہ میں داخل ہونے کا تذکرہ کیا ہے اُدھر ہی سے داخل ہونا۔''

اِسی مقدّس و پُر کیف فضا میں سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے والد حضرت ابو قحافہ رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کیا، اس طرح سیدنا صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ پر اللہ تعالیٰ کے احسان اور نعمت کی تکمیل ہوئی۔[3]

جہادی میدانوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ:

اہلِ علم نے تاریخ اور سیرت کی کتابوں میں لکھا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوۂ بدر سمیت تمام غزوات میں شریک ہوئے ہیں، اور کسی بھی غزوے سے کبھی غیر حاضر نہیں رہے۔ غزوۂ اُحد کے دن جب لوگ بھاگ کھڑے ہوئے تھے، تب بھی آپ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ثابت قدمی سے کھڑے رہے۔ غزوۂ تبوک کے موقع پر نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو اپنا سیاہ رنگ کا بڑا علَم عطا فرمایا۔[4]

امام ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''سیرت نگاروں میں سے کسی نے بھی اس بارے میں اختلاف نہیں کیا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تمام غزوات میں سے کسی بھی غزوے میں نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پیچھے نہیں رہے۔''[5]

---

[1] المستدرك للحاكم (٣/ ٧٢) اسے امام حاکم اور ذہبی نے صحیح قرار دیا ہے۔

[2] المستدرك للحاكم (٣/ ٧٢) فتح البارى (٧/ ٦٠٣) تاريخ الطبرى (٣/ ٤٢)

[3] تاريخ الدعوة الإسلامية للدكتور جميل عبد الله المصرى (ص: ١٤٧)

[4] الطبقات لابن سعد (١/ ١٢٤) صفة الصفوة لابن الجوزي (١/ ٢٤٢)

[5] أسد الغابة (٣/ ٣١٨)

امام زمخشری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''بلاشبہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہمیشہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ وابستہ رہے۔ آپ نے بچپن ہی سے نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اختیار کی۔ آپ نے اپنے مال کا ایک بہت بڑا حصہ اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت واعانت میں خرچ کیا۔ آپ ہی نے ہجرتِ مدینہ کے سلسلے میں نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اونٹنی اور زادِ راہ کا اہتمام کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ میں مسلسل آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنا مال لٹاتے رہے۔ آپ نے اپنی لختِ جگر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجیت میں دیا۔ سفر وحضر میں ہمیشہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ساتھ رہے۔''[1]

غزوۂ تبوک میں سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کا عظیم کردار:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تین ہزار مجاہدین پر مشتمل ایک بڑے لشکر کو ہمراہ لے کر غزوۂ تبوک کے لیے نکلے۔ اس مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم شام میں رومیوں سے برسرِ پیکار ہونے کا ارادہ رکھتے تھے۔ جب لشکرِ اسلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں ثنیۃ الوداع نامی مقام پر جمع ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قائدین، جرنیلوں اور کمانڈروں کو منتخب فرمایا اور انھیں عَلَم اور جھنڈے عطا کیے۔ اُس موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو لشکرِ اسلام کا سب سے بڑا عَلَم عطا فرمایا۔[1]

غزوۂ تبوک میں سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی مالی قربانی:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ تبوک کے موقع پر طویل اور کٹھن سفر اور مدِ مقابل مشرکین کی کثرت کے پیشِ نظر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کی خوب ترغیب دلائی اور انفاق فی سبیل اللہ کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجرِ عظیم کی بشارت سنائی، چنانچہ ہر صحابی نے اپنی وُسعت واستطاعت کے مطابق اس کارِ خیر میں حصہ لیا اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کیا۔ اس غزوے میں سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے سب سے زیادہ مال خرچ کیا۔[3]

سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اپنا آدھا مال اللہ کے راستے میں صدقہ کیا اور یہ گمان کیا کہ یقیناً وہ اس کارِ خیر میں سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ سے سبقت لے جائیں گے۔ یہ واقعہ ہم خود سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی زبانی بیان

---

[1] خصائص العشرة الكرام البررة (ص: ٤١)

[2] صفة الصفوة لابن الجوزي (١/ ٢٤٣)

[3] السيرة النبوية للصلابي (ص: ٦١٥)

کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن ہمیں صدقہ کرنے کا حکم دیا۔ اس موقع پر میرے پاس خوب مال موجود تھا۔ میں نے (اپنے دل میں) کہا: ''اگر میں کسی دن کسی کارِخیر میں سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ سے سبقت لے جاسکتا ہوں تو وہ آج کا دن ہے۔'' چنانچہ میں اپنا نصف مال لے کر حاضرِ خدمت ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا:

«مَا اَبْقَیْتَ لِاَهْلِكَ؟» ''آپ نے اپنے اہل وعیال کے لیے کیا چھوڑا ہے؟۔''

میں نے عرض کی: ''اِس مال کے برابر چھوڑ آیا ہوں۔''

سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس جو کچھ موجود تھا سارے کا سارا لے آئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے پوچھا: «مَا اَبْقَیْتَ لِاَهْلِكَ؟» ''آپ اپنے اہل وعیال کے لیے کیا چھوڑ آئے ہیں؟۔'' سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کی: «اَبْقَیْتُ لَهُمُ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ» ''میں ان کے لیے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ آیا ہوں۔'' تب میں نے کہا: ''میں کسی کارِخیر میں (حضرت) ابوبکر (رضی اللہ عنہ) سے کبھی بھی سبقت نہیں لے جاسکتا۔[1]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ فعل کارِخیر میں مسابقت اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے جائز رشک پر مبنی تھا لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اُن سے افضل اور بہتر حالت میں تھے کیونکہ اُن کی یہ نیکی مقابلہ بازی سے کلی طور پر خالی تھی، اس سلسلے میں آپ کی نظر کسی اور کی نیکی پر نہیں تھی۔[2]

نیکیوں میں پیش پیش:

حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ قابلِ تعریف اخلاق اور اعلیٰ صفات سے مزیّن تھے۔ ہر لمحہ نیکیوں میں پیش پیش رہتے تھے حتیٰ کہ آپ امورِ خیر میں لوگوں کے راہنما اور مکارمِ اخلاق میں ایک آئیڈیل کی حیثیت اختیار کر گئے۔ آپ خیر و بھلائی کے کاموں کی شدید ترین تڑپ رکھتے تھے۔ آپ کو کامل یقین تھا کہ آدمی جو نیک کام کر گزرنے کی آج طاقت رکھتا ہے ہوسکتا ہے کہ کل وہ کام انجام دینا اس کے لیے ناممکن ہو جائے، لہٰذا آج کا دن بہت بڑی غنیمت ہے۔ آج یومِ عمل ہے، یومِ محاسبہ نہیں اور کل یومِ محاسبہ ہوگا، یومِ عمل نہیں ہوگا۔ اُنہی کے متعلق حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا:

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٦٧٨) جامع الترمذي، رقم الحديث (٣٦٧٥)

[2] فتاویٰ لابن تیمیة (١٠/ ٧٢، ٧٣)

''کون ہے جس نے آج اللہ کی خاطر نفلی روزہ رکھا ہو؟ حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نے عرض کی: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! میں نے روزہ رکھا ہے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سوال کیا: کون ہے جس نے آج کسی مسلمان کے جنازے میں شرکت کی ہو؟ حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نے عرض کی: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! میں نے جنازے میں شرکت کی ہے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: کون ہے جس نے آج کسی مسکین کو کھانا کھلایا ہو؟ حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نے عرض کی: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! میں نے کھانا کھلایا ہے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سوال کیا: کون ہے جس نے آج کسی مریض کی عیادت کی ہوا؟ حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نے عرض کی: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! میں نے عیادت کی ہے۔ رسول اللہ، صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص میں یہ صفاتِ عالیہ جمع ہو جائیں، وہ ضرور جنت میں داخل ہوگا۔''[1]

اسی لیے آپ نیکی میں سبقت اور سُرعت دکھانے والے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں شمار ہوتے تھے۔

مظلوم مسلمانوں کی رہائی کے لیے مالی قربانی:

دعوتِ اسلام کے پھیلتے ہی رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو کفارِ قریش کی طرف سے انتہائی تکلیفوں اور آزمایشوں کا سامنا کرنا پڑا۔ خاص طور پر ضعیف مسلمانوں کو اُن کے عقیدہ و دین سے برگشتہ کرنے، انھیں دوسروں کے لیے نمونۂ عبرت بنانے اور اپنے غیظ وغضب کی آگ ٹھنڈی کرنے کے لیے کفار نے ہر طرح کے ہتھکنڈے آزمائے۔

سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کی آزادی:

حضرت بلال رضی اللہ عنہ بھی اُن افراد میں سے ایک تھے جنھیں اسلام کی خاطر اذیت ناک مراحل سے گزرنا پڑا۔ اُن کے دفاع کے لیے اُن کا کوئی قبیلہ یا سہارا نہ تھا۔ ایسے انسان کی جاہلی معاشرے میں کوئی قدر و قیمت نہ تھی۔

نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جاں نثار حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے دل میں جب ایمان کے شگوفے پھوٹے تو اِس کا علم اُن کے آقا امیہ بن خلف کو بھی ہوگیا۔ اُس نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو کبھی دھمکا کر اور کبھی حرص وطمع کا

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٩٨٦، ٦٩٢٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٢٨)

سبز باغ دکھا کر اسلام سے برگشتہ کرنے کی کوشش کی لیکن حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے عزم واستقلال میں مزید اضافہ ہوتا چلا گیا۔ بدبخت امیہ نے غیظ وغضب سے دو چار ہو کر آپ کو دردناک سزائیں دینے کی ٹھان لی، چنانچہ ایک دن اور ایک رات بھوکا پیاسا رکھنے کے بعد وہ دوپہر کے وقت سخت گرمی کے عالم میں آپ کو صحراء میں لے گیا۔ تپتی ہوئی سخت گرم ریت پر آپ کو پُشت کے بل لٹا کر اس نے آپ کے سینے پر ایک بھاری پتھر رکھوا دیا، پھر کہنے لگا:

''تمھیں ہمیشہ اسی حالت میں رکھا جائے گا حتیٰ کہ تم مر جاؤ یا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا انکار کر کے دوبارہ لات اور عُزّیٰ کی پرستش شروع کر دو۔''

لیکن صبر وعزیمت کے پہاڑ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی زبان سے صرف ایک ہی صدا سنائی دیتی تھی:

''اَحَدٌ، اَحَدٌ''، یعنی ''اللہ ایک ہے، اللہ ایک ہے۔''

ایک عرصہ تک امیہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو اسی ظالمانہ طریقے سے سزائیں دیتا رہا۔[1]

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ایک دن امیہ کے پاس اُس وقت پہنچے جب وہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو اذیت دے رہا تھا۔ آپ نے امیہ سے کہا:

''اَلَا تَتَّقِی اللّٰہَ فِیْ ھٰذَا الْمِسْکِیْنِ؟ حَتّٰی مَتٰی؟''

''اس بے چارے غریب کو اذیت دیتے ہوئے تمھیں اللہ کا خوف نہیں آتا؟ آخر کب تک اسے عذاب میں مبتلا رکھو گے؟''

امیہ نے جواب دیا کہ تمھی لوگوں نے اسے خراب کیا ہے۔ اگر تمھیں اتنا ہی احساس ہے تو اسے اس مصیبت سے آزاد کرا لو۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''اَفْعَلُ، عِنْدِی غُلَامٌ اَسْوَدُ اَجْلَدُ مِنْہُ وَ اَقْوٰی عَلٰی دِیْنِكَ اَعْطَیْتُکَهٗ بِهٖ''

''ٹھیک ہے، میرے پاس تیرے دین پر سختی سے قائم ایک سیاہ غلام ہے جو اس سے زیادہ قوی اور طاقتور ہے۔ اس کے بدلے اُسے لے لو۔''

جب یہ سودا طے پا گیا تو آپ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو امیہ کی غلامی سے چھڑا کر آزاد کر دیا۔[2]

[1] عتیق العتقاء لمحمود البغدادي (ص: ٣٩، ٤٠)
[2] السيرة النبوية لابن هشام (١/ ٣٩٤)

حضرت بلال رضی اللہ عنہ صبر و استقامت کے پہاڑ، مخلص دل کے مالک اور اسلام کے سچے پیکر تھے۔ آپ دردناک سزاؤں کے مقابلے میں سراپا استقامت رہے، آپ کا صبر وثبات ہی کفار کے لیے غیظ و غضب کا باعث تھا، کفار کے ستم کا شکار ہو کر بھی آپ کی زبان پر کلمۂ توحید جاری رہا۔ دینِ حق پر استقامت کی قیمت آپ کو اپنی جان کا نذرانہ پیش کر کے بھی چکانی پڑتی تو بھی آپ کو اس کی کوئی پروانہ تھی۔[1]

مالِ صدیقی سے آزادی پانے والے دوسرے مسلمان:

1. **عامر بن فُہیرہ رضی اللہ عنہ:** انھوں نے غزوۂ بدر اور اُحد میں شرکت کی اور معرکۂ بئرِ معونہ میں شہادت پائی۔
2. **ام عُمَیس رضی اللہ عنہا:** یہ سابقون اولون میں سے تھیں۔
3. **زِنّیرہ رضی اللہ عنہا:** اتفاق سے آزادی کے وقت اُن کی بصارت متاثر ہوئی تو قریش نے کہا کہ لات اورعُزّیٰ نے اِس کی بصارت چھین لی ہے۔ حضرت زِنّیرہ نے کہا: ''ربِ کعبہ کی قسم! یہ لوگ جھوٹے ہیں۔ لات اور عُزّیٰ کسی نفع ونقصان کے مالک نہیں۔'' ان کے اس قوی عقیدہ کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے ان کی کھوئی ہوئی بصارت لوٹا دی۔[2]

4، 5. **نہدیہ اور اس کی بیٹی رضی اللہ عنہما:** یہ دونوں بنوعبدالدار قبیلے کی ایک عورت کی لونڈیاں تھیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان کی منہ مانگی قیمت ادا کر کے انھیں آزاد کرا لیا۔

یہ تھی سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عظیم کردار کی ایک جھلک۔ آپ نے غلاموں کی اسیری کی بندشیں کھول دیں اور انھیں صعوبتوں سے آزاد کر ایا، اسی لیے آپ اپنی قوم میں صلہ رحمی، تنگدستوں اور بے کسوں کی دادرسی، مہمان نوازی اور مصیبت زدہ لوگوں کے معاون و مددگار کی حیثیت سے مشہور ومعروف تھے۔

آتشِ غضب پر قابو رکھنے کی فضیلت:

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے کہ ایک آدمی نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پر سبّ وشتم شروع کر دیا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ خاموش رہے۔ یہ ماجرا دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم محظوظ ہونے اور تبسم فرمانے لگے۔ وہ شخص سبّ وشتم میں آگے ہی بڑھتا چلا گیا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس کی بعض باتوں کا جواب دیا۔ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم غصے میں آکر اٹھ کھڑے ہوئے۔

---

[1] محنة المسلمين في العهد المكي للدكتور سليمان السويكت (ص:٩٢)

[2] السيرة النبوية لابن هشام (١/ ٣٩٣)

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچے اور عرض کی:

”يَا رَسُولَ اللّٰهِ! كَانَ يَشْتُمُنِي وَ أَنْتَ جَالِسٌ، فَلَمَّا اَكْثَرَ، رَدَدْتُّ عَلَيْهِ بَعْضَ قَوْلِهٖ غَضِبْتَ وَقُمْتَ“

”اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! وہ شخص مجھے سبّ وشتم کر رہا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھے رہے، جب وہ سبّ وشتم میں بہت بڑھ گیا تو میں نے اس کی بعض باتوں کا جواب دے دیا۔ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ناراض ہو گئے اور اٹھ کر چل دیے۔“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«اِنَّهٗ كَانَ مَعَكَ مَلَكٌ يَرُدُّ عَنْكَ، فَلَمَّا رَدَدْتَ عَلَيْهِ بَعْضَ قَوْلِهٖ وَقَعَ الشَّيْطَانُ، فَلَمْ أَكُنْ أَقْعُدَ مَعَ الشَّيْطَانِ»

”یقیناً تمھارے ساتھ ایک فرشتہ تھا جو تمھاری طرف سے اُسے جواب دے رہا تھا، لیکن جب تم نے اُس کی بعض باتوں کا جواب دیا تو شیطان نے مداخلت کر دی اور میں شیطان کے ساتھ نہیں بیٹھ سکتا تھا۔“

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«يَا أَبَا بَكْرٍ! ثَلَاثٌ كُلُّهُنَّ حَقٌّ: مَا مِنْ عَبْدٍ ظُلِمَ بِمَظْلَمَةٍ، فَيُغْضِي عَنْهَا لِلّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ اِلَّا أَعَزَّ اللّٰهُ بِهَا نَصْرَهٗ وَمَا فَتَحَ رَجُلٌ بَابَ عَطِيَّةٍ يُرِيدُ بِهَا صِلَةً اِلَّا زَادَهُ اللّٰهُ بِهَا كَثْرَةً وَمَا فَتَحَ رَجُلٌ بَابَ مَسْأَلَةٍ يُرِيدُ بِهَا كَثْرَةً اِلَّا زَادَهُ اللّٰهُ بِهَا قِلَّةً»

”ابوبکر! دیکھو! تین باتیں برحق ہیں: کسی آدمی پر جب کوئی ظلم کیا جاتا ہے اور وہ محض اللہ کی رضا کے لیے اس ظلم سے چشم پوشی کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُس کی وجہ سے اُسے اپنی نُصرت کے لیے عزیز تر بنا دیتا ہے۔ اور جو آدمی صلہ رحمی کے لیے کسی عطیے اور فیاضی کا دروازہ کھولتا ہے اللہ تعالیٰ اسے مال و دولت کی فراوانی سے نوازتا ہے۔ اور جو شخص حصولِ کثرت کی غرض سے ہاتھ پھیلاتا اور سوال کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اُس کی تنگدستی میں اضافہ کر دیتا ہے۔

[1] شرح السنة للبغوي (٣٥٨٦) وحسّنه الأرناؤوط، مجمع الزوائد للهيثمي (٨/ ١٩٠) اس حدیث کو شیخ البانی رحمہ اللہ نے صحیح قرار دیا ہے۔ (السلسلة الصحيحة (٥/ ٢٧١، رقم الحديث: ٢٢٣١)

سب وشتم کے واقعہ سے ماخوذ اسباق وعبرتیں:

حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ غصے پر بڑا کنٹرول رکھتے تھے لیکن جب وہ باز ہی نہیں آیا اور حد سے بڑھ گیا تو آپ نے اسے اِس گمان کی بنا پر جواب دیا کہ شاید وہ اس بات سے خاموش ہو جائے۔ اس پر نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو حلم، بردباری اور تحمل کی ترغیب دی اور غیظ وغضب کے مواقع پر زیورِ صبر سے آراستہ ہونے کی تلقین فرمائی کیوں کہ حلم وبربادی اور غصے پر قابو پا کر انسان لوگوں کے ہاں بلند مرتبہ حاصل کر لیتا ہے۔ یوں اس کی قدر ومنزلت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے ہاں بھی اس کا درجہ اونچا ہو جاتا ہے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مذکورہ بالا کردار سے آپ کا یہ وصف بھی اجاگر ہوتا ہے کہ آپ ہر آن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودی کے خوگر تھے۔ اگر کسی معاملے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضگی کا احتمال ہوتا تو سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا مندی کو تمام امور پر ترجیح دیتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جلدی سے جلدی راضی کرنے کوشش کرتے تھے۔ مذکورہ حدیث میں غضب اور غصے کی مذمت، اس کی ممانعت، اس سے بچنے کی ترغیب اور شیطان کی ہم نشینی والی مجالس سے انبیاء علیہم السلام کی کنارہ کشی کا تذکرہ بھی موجود ہے۔ اِس کے ساتھ ساتھ ایسے مظلوم شخص کی فضیلت کا بیان بھی ہے جو صبر کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس پر اجر وثواب کی امید بھی رکھتا ہے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حلیم، بردبار اور غصے کو پی جانے والے تھے حتیٰ کہ آپ اپنے حلم، تحمل، نرم خوئی، لچک اور حسنِ سلوک جیسی عظیم صفات کے باعث دور ونزدیک ہر جگہ معروف ہو گئے۔ اس کے معنیٰ یہ نہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو غصہ آتا ہی نہیں تھا۔ ہاں! آپ کو غصہ آتا تھا مگر آپ کا غصہ اللہ تعالیٰ کے لیے ہوتا تھا۔ جب آپ دیکھتے کہ اللہ تعالیٰ کے محارم اور ممنوعات کی خلاف ورزی کی جارہی ہے تو آپ کا غیظ وغضب انتہاء کو چھونے لگتا تھا۔[1]

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اِس فرمان پر غور وفکر اور تأمّل کرتے ہوئے اور اِسے راہِ عمل بناتے ہوئے اپنی زندگی بسر کی۔

غیرتِ صدیق رضی اللہ عنہ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے آپ کی بیوی کا تزکیہ:

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ بنو ہاشم کے چند افراد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی زوجۂ محترمہ

---

[1] سیرة وحیاة الصدیق لمجدی فتحی السید (ص: ١٤٥)

حضرت اسماء بنت عُمیس رضی اللہ عنہا کے پاس آئے، اُسی اثناء میں حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ بھی گھر تشریف لے آئے اور یہ صورتِ حال انھیں بڑی ناگوار گزری۔ آپ نے اس بات کا تذکرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا اور کہا کہ میں نے کوئی بڑی چیز نہیں دیکھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی قَدْ بَرَّاَهَا مِنْ ذٰلِكَ»

''یقیناً اللہ تعالیٰ نے اسماء (رضی اللہ عنہا) کو اس فعلِ شنیع سے دور رکھا ہے۔''

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منبر پر کھڑے ہو کر فرمایا:

«لَا يَدْخُلُ رَجُلٌ بَعْدَ يَوْمِي هٰذَا عَلٰى مُغِيْبَةٍ اِلَّا وَمَعَهُ رَجُلٌ اَوِ اثْنَانِ»[1]

''آج کے بعد کوئی شخص ایک آدمی یا دو آمیوں کی معیّت کے بغیر اکیلا کسی ایسی عورت کے پاس نہ جائے جس کا خاوند گھر پر نہ ہو۔''

خشیتِ الٰہی:

بلاشبہ اللہ تعالیٰ کا خوف وخشیت ایسی عمدہ خوبی ہے جو بندے کو گناہوں سے دور رکھنے اور جلوت و خلوت (خفیہ اور اعلانیہ) طور پر اللہ تعالیٰ کے احکام ملحوظ رکھنے کا باعث بنتی ہے۔ اِس سے آدمی کے افعال واعمال پاکیزہ اور خوشنما بن جاتے ہیں۔ قرآنِ کریم میں متعدد مقامات پر مومنوں کو خوفِ الٰہی کی پاسداری کا حکم دیا گیا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ الرحمٰن (آیت: ۴۶) میں فرمایا ہے:

﴿ وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتَانِ ﴾

''اور جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈر گیا اس کے لیے دو باغ ہیں۔''

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ ایسا خطبہ ارشاد فرمایا کہ ایسا خطبہ میں نے کبھی نہیں سنا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جو میں جانتا ہوں اگر وہ تمھیں معلوم ہو جائے تو تم بہت کم ہنسا کرو اور بہت زیادہ رویا کرو۔''

یہ سن کر اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چہرے ڈھانپ لیے اور (کثرتِ آہ وزاری کی بنا پر) ان کی ناک سے آواز نکل رہی تھی۔[2]

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢١٧٣)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٦٢١)

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ خوف ورجاء کے اعتبار سے بھی نہایت عظیم تھے۔آپ آخرت میں کامیابی، نجات اور فلاح کے متمنّی ہر مسلمان کے لیے، چاہے وہ حاکم ہو یا محکوم، آقا ہو یا غلام، سپہ سالار ہو یا عام سپاہی، ایک عملی نمونہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔[1]

امام محمد بن سیرین رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی شخص اپنی طرف سے بات کرنے میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا نہیں تھا۔''[2]

حضرت قیس رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اپنی نوکِ زبان پکڑے ہوئے دیکھا۔آپ فرما رہے تھے:

''هَذَا الَّذِيْ أَوْرَدَنِيْ الْمَوَارِدَ''[3]

''یہی وہ چیز ہے جس نے مجھے ہلاکت گاہوں تک پہنچایا ہے۔''

آپ اکثر یہ شعر پڑھا کرتے تھے:

''تم ہمیشہ اپنے کسی محبوب کی موت کی خبر دیتے رہتے ہو حتیٰ کہ تم خود بھی مردہ ہو جاؤ گے۔جوان آدمی زندگی میں بڑی امیدیں وابستہ کرتا ہے لیکن ان کی تکمیل سے پہلے ہی فوت ہو جاتا ہے۔''[4]

سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ایمان کی عظمت:

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا اللہ تعالیٰ پر ایمان نہایت محکم اور عظیم تھا۔آپ کو ایمان کی حقیقت کا گہرا ادراک تھا۔کلمۂ توحید آپ کے رگ وپے میں سرایت کر گیا تھا۔آپ کے دل و دماغ پر ایمان و یقین ہی کی حکمرانی تھی۔کلمۂ توحید کے آثار ونتائج آپ کے اعضاء وجوارح پر بھی مرتّب ہوئے اور انہی آثار کی روشنی میں آپ نے اپنی حیاتِ مستعار بسر کی۔آپ اعلیٰ اخلاق سے آراستہ اور گھٹیا اخلاق سے پاک تھے۔آپ شریعتِ الٰہیہ کو مضبوطی سے تھامنے کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت اور راہنمائی کی اقتدا، کی بڑی شدید تڑپ رکھتے تھے۔آپ کا ایمان باللہ، سرگرمی ونشاط، عزم و ہمت، جہدِ مسلسل، عملِ پیہم، مجاہدے، جہاد وتربیت،

---

[1] تاريخ الدعوة إلى الإسلام للدكتور يسرى محمد هاني (ص: ٣٩٦)

[2] شرح العقيدة الطحاوية (١/ ٣٨٦)

[3] صفة الصفوة لابن الجوزي (٢/ ٢٥٤)

[4] الزهد للإمام أحمد (ص: ١٠٦)

عزت، ترقی اور عالی مرتبے کا باعث تھا۔ آپ کے دل میں اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کے بارے میں ایسا ناقابلِ تسخیر ایمان ویقین تھا کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کوئی بھی اس معاملے میں آپ کا ہم پلہ نہیں تھا۔

حضرت ابوبکر بن عیاش رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنی نماز وروزے کی کثرت کی وجہ سے ہی دوسرے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے فائق نہیں تھے، بلکہ وہ اس چیز (قوتِ ایمان) کی بنا پر بھی ان سے سبقت لے گئے جو ان کے دل میں سرایت کرگئی تھی۔''

اسی لیے کہا جاتا ہے کہ اگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ایمان اور تمام اہلِ زمین کے ایمان کا وزن کیا جائے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ایمان کا پلڑا بھاری رہے گا۔ جیسا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے کہ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے پوچھا:

«مَنْ رَّآى مِنْكُمْ رُؤْيَا؟» ''تم میں سے کس نے خواب دیکھا ہے؟''

ایک آدمی نے کہا: ''میں نے دیکھا کہ آسمان سے ایک میزان نازل ہوئی اور اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا وزن کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے وزن میں بھاری رہے، پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا وزن کیا گیا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا پلڑا وزنی ہوا، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا وزن کیا گیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے بھاری ثابت ہوئے، پھر وہ میزان اوپر اٹھالی گئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس خواب سے کبیدہ خاطر ہوئے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«خِلَافَةُ نُبُوَّةٍ ثُمَّ يُؤْتِي اللّٰهُ الْمُلْكَ مَنْ يَّشَاءُ»[2]

''یہ نبوت کی خلافت ہے، پھر اللہ تعالیٰ جسے چاہے گا بادشاہی عطا کرے گا۔''

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازِ فجر ادا کی، پھر لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا:

''ایک آدمی نے اپنے بیل پر بوجھ لادا ہوا تھا اور اسے ہانک رہا تھا۔ بیل نے اس کی طرف دیکھا اور اس سے بات کرتے ہوئے کہا: بلاشبہ مجھے بار برداری کے لیے تو نہیں پیدا کیا گیا

---

[1] فضائل الصحابة للإمام أحمد (١/ ١٧٣)

[2] سنن أبي داوٗد، رقم الحديث (٤٦٣٤/ ٤٦٣٥) جامع الترمذي، رقم الحديث (٢٢٨٧) دیکھیے: صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٦٣٥)

بلکہ مجھے تو صرف کھیتی باڑی کا کام کرنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔'' لوگوں نے یہ سن کر اظہارِ تعجب کرتے ہوئے کہا: ''سبحان اللہ! (عجیب بات ہے) کیا بیل بھی کلام کرتا ہے؟''

اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''یقیناً مَیں اس پر ایمان لایا ہوں اور ابوبکر و عمر (رضی اللہ عنہما) بھی اس پر ایمان رکھتے ہیں۔''

حالانکہ وہ (ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما) دونوں اُس مجلس میں حاضر نہیں تھے۔[1]

سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ایمان کی محکمی، شریعتِ الٰہیہ کے التزام اور اسلام کے لیے آپ کے صدق و اخلاص کی دلیل یہ ہے کہ آپ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے زیادہ محبوب تھے۔ اور یہ محبت بڑھتے بڑھتے یہ صورت اختیار کر گئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ مبارک میں ان کی محبت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم پر مقدّم ہو گئی۔ حضرت عَمرو بن عاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور پوچھا: ''لوگوں میں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے زیادہ محبوب کون ہے؟''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «عَائِشَةُ» ''عائشہ۔''

میں نے کہا: ''مردوں میں سے کون ہے؟''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا: «اَبُوهَا» ''عائشہ کا باپ۔''

میں نے کہا: ''اُن کے بعد پھر کون ہے؟''

آپ نے فرمایا: «ثُمَّ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ» ''پھر عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ہیں۔''

بعدازاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی آدمیوں کے نام لیے۔[2]

اِسی عظیم ایمان، شریعتِ الٰہیہ کے التزام اور رب العالمین کے دین کی خاطر مساعی کی بدولت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو جنت کا مستحق قرار دیا اور ساتھ یہ بشارت بھی دی کہ آپ جنت کے تمام دروازوں سے بلائے جانے کے مستحق ہیں۔ چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ فرمایا:

''جو شخص کسی چیز کا ایک جوڑا اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرے گا وہ جنت کے دروازوں

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٦٦٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٨٨)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٦٦٢)

سے یوں بلایا جائے گا: ''اے اللہ کے بندے! (اس دروازے سے جنت میں داخل ہو جا کیونکہ) یہ دروازہ بہتر ہے۔'' جو شخص نمازی ہوگا وہ ''باب الصلاۃ'' (نماز کے دروازے) سے بلایا جائے گا، جو شخص اہلِ جہاد سے ہوگا وہ ''باب الجهاد'' سے بلایا جائے گا، جو شخص صدقہ و خیرات کرنے والوں میں سے ہوگا اُسے ''باب الصدقة'' سے بلایا جائے گا اور جو شخص روزے داروں میں سے ہوگا وہ ''باب الصيام یا باب الرّیّان'' سے پکارا جائے گا۔''

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا:

''جو شخص اُن دروازوں میں سے کسی بھی دروازے سے بلا لیا گیا اسے کوئی حاجت اور تکلیف نہیں رہے گی۔ لیکن اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کیا کوئی ایسا آدمی بھی ہو گا جسے ان سب دروازوں سے بلایا جائے گا؟''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

《نَعَمْ، وَاَرْجُوْ اَنْ تَكُوْنَ مِنْهُمْ يَا اَبَا بَكْرٍ》[1]

''ہاں! اور اے ابوبکر! امید ہے کہ تم بھی انہی میں سے ہوگے۔''

علم و معرفت:

تمام فضیلتوں کی بنیاد علم پر ہے اور اہلِ علم کا اس امر پر اتفاق ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پوری امت میں سے سب سے زیادہ شرعی مسائل کو جاننے والے اور تمام صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے سب سے بڑھ کر ذہین و فطین تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں سے سب سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اُس کا علم رکھنے والے تھے۔[2]

تمام اہلِ سنت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تمام امت میں سے سب سے بڑے عالم تھے۔ متعدد ائمہ کرام رحمہم اللہ نے اس بات پر اجماع بیان کیا ہے۔[3]

علم و فضل میں تمام صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم پر آپ کے تفوّق کا سبب نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کی دائمی وابستگی

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٦٦٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٢٧)

[2] تاريخ الخلفاء للسيوطي (ص: ٥٩)

[2] الفتاویٰ لابن تيمية (٣/ ١٢٧)

ہے۔ آپ سفر وحضر میں شب وروز ہمیشہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رہتے تھے۔۔ نمازِ عشاء کے بعد دیر تک رسول اللہ کے پاس بیٹھے باتیں کیا کرتے تھے۔ اُس مجلس میں آپ کے علاوہ کوئی دوسرا صحابی نہیں ہوتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ آپ سے مسلمانوں کے معاملات کے بارے میں گفتگو فرماتے تھے۔ جب رسول اللہ ﷺ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے کوئی مشورہ طلب کرتے تو مجلسِ شوریٰ میں سب سے پہلے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ گفتگو کا آغاز کرتے۔

نبی کریم ﷺ نے دنیائے اسلام کے پہلے حج میں سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو مدینہ منورہ سے امیر الحج بنا کر روانہ فرمایا۔ عبادات میں مناسکِ حج کا علم انتہائی دقیق ہے۔ اگر آپ کے پاس وسعتِ علم نہ ہوتی تو رسول اللہ ﷺ آپ کو کبھی امیر الحج نہ بناتے۔ اسی طرح نماز کے معاملے میں بھی آپ ﷺ نے سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی کو اپنا نائب بنایا۔[1] اگر آپ مسائلِ نماز، سے بخوبی آگاہ نہ ہوتے تو رسول اللہ ﷺ آپ کو اپنا نائب نہ بناتے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ایسا ایک بھی قول نقل نہیں کیا گیا جس میں آپ نے قرآن وسنت کی کسی نص کی مخالفت کی ہو۔ یہ چیز آپ کی انتہاء درجے کی باریک بینی، مہارت، اور اعلیٰ علم کا بیّن ثبوت ہے۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ علمِ شریعت کے کسی بھی مسئلے میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کسی خطا کا صدورمعروف نہیں، جبکہ دیگر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے بہت سے مسائل میں خطا سرزد ہونا معروف ہے۔[2]

رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد آپ کا علمی تفوّق اور زیادہ نکھر کر سامنے آیا۔ آپ کے دورِ خلافت میں امتِ اسلامیہ کا جس مسئلے پر بھی کوئی اختلاف رونما ہوا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے راسخ علم کی بدولت کتاب وسنت کے دلائل و براہین برمحل پیش کر کے اس مسئلے کا متفقہ حل پیش کر دیا۔ یہ سب کچھ حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کے علمی کمال، عدل و انصاف اورنزاع واختلاف زائل کرنے والے براہین کی ماہرانہ معرفت کی بنا پر ہوا، اسی لیے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم آپ کی مکمل اطاعت کیا کرتے تھے۔

امامت کا اعزاز:

اللہ کے رسول ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں ایک منفرد اعزاز حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو یہ بھی حاصل ہوا کہ

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٤٤٨)

[2] أبو بكر الصديق، محمد بن عبد الرحمن (ص: ٦٠)

رسول اللہ ﷺ نے انھیں اپنی زندگی ہی میں اپنے مصلّے پر مسلمانوں کی امامت کے لیے کھڑا کر دیا۔ اور آپ نے رسولِ کریم ﷺ کی حیاتِ مبارکہ میں سترہ نمازوں میں امامت کرائی۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

''اللہ بھی یہی چاہتا ہے اور مؤمنین بھی یہی چاہتے ہیں کہ ابوبکر (رضی اللہ عنہ) ہی امام بنیں۔''

ایک اور اعزاز:

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے لیے نبی مکرم ﷺ کی زبانِ مبارک سے ایک اور اعزاز بھی ثابت ہے جیسا کہ صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھیں جنت کے آٹھوں دروازوں سے داخل ہونے کی دعوت دی جائے گی۔ یعنی آٹھوں دروازوں سے پکارا جائے گا کہ اے ابوبکر! اس میں سے داخل ہو کر جنت میں تشریف لے جائیں۔ جیسا کہ ابھی باحوالہ ذکر گزرا ہے۔

خوابوں کی تعبیر:

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ خوابوں کو برحق تصوّر کرتے تھے اور ان کی نہایت عمدہ تعبیر کرتے تھے۔ جب صبح ہوتی تو آپ لوگوں سے فرمایش کرتے کہ جس نے کوئی اچھا خواب دیکھا ہے وہ ہمیں سنائے۔ آپ یہ بھی فرماتے تھے کہ کامل اور ٹھیک وضو کرنے والے مسلمان کا اچھا خواب دیکھنا مجھے فلاں چیز سے زیادہ محبوب ہے۔[1]

یہاں ہم حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے تعبیر کردہ دو خوابوں کا ذکر کریں گے:

1. حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا:

''میں نے رات کو نیند میں ایک سائبان دیکھا۔ اس سے گھی اور شہد ٹپک رہا تھا۔ پھر کچھ لوگ دکھائی دیے جو ہاتھ پھیلا کر شہد اور گھی کو لے رہے تھے، کوئی تھوڑا لیتا تھا، کوئی زیادہ۔ پھر کیا دیکھتا ہوں کہ ایک رسی زمین سے آسمان تک پہنچی ہوئی ہے۔ آپ ﷺ نے وہ رسی پکڑی اور اوپر چڑھ گئے۔ پھر ایک آدمی نے وہ رسی تھامی اور اوپر چڑھ گیا۔ پھر ایک اور آدمی نے رسی تھامی اور اسی کے ذریعے اوپر چڑھ گیا۔ آخر میں ایک اور آدمی نے یہی رسی پکڑی تو وہ ٹوٹ گئی۔ پھر اسے جوڑ دیا گیا۔''

---

[1] خطب أبي بكر الصديق للدكتور أحمد عاشور (ص: ١٥٥)

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کی: ''اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! میرے ماں باپ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر قربان ہوں! اللہ کی قسم! مجھے اجازت دیجیے کہ میں اس خواب کی تعبیر بیان کروں۔'' نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں اجازت مرحمت فرما دی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''سائبان سے مراد اسلام ہے۔ گھی اور شہد ٹپکنے کا مطلب قرآنِ کریم ہے کہ اسی کی مٹھاس ٹپک رہی ہے، پس قرآن کی یہ حلاوت کوئی تھوڑی حاصل کر رہا ہے تو کوئی زیادہ۔ رہی رسی جو آسمان سے زمین تک پہنچی ہوئی ہے تو اس سے مراد وہ حق ہے جس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم قائم ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حق کا دامن تھاما تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو بلند کر دیا۔ پھر ایک اور آدمی اسے تھامے گا تو اِس کی وجہ سے وہ بھی بلند ہو جائے گا۔ اس کے بعد ایک اور آدمی اسے تھامے گا تو وہ بھی اس کے ذریعے بلند ہو جائے گا، پھر ایک اور آدمی اسے تھامے گا تو وہ رسی ٹوٹ جائے گی مگر اسے جوڑ دیا جائے گا تو وہ آدمی بھی بلند ہو جائے گا۔ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں! اب فرمائیے کہ میں نے صحیح تعبیر کی ہے یا مجھ سے خطا ہوئی ہے؟'' نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«اَصَبْتَ بَعْضاً وَّ اَخْطَاْتَ بَعْضاً»

''کچھ تعبیر تم نے صحیح کی ہے اور بعض باتوں میں تم سے خطا سرزد ہوئی ہے۔''

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کی:

''وَاللّٰهِ! لَتُحَدِّثَنِّيْ بِالَّذِيْ اَخْطَاْتُ'' ''اللہ کی قسم! مجھے خطا ضرور بتائیے۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَا تُقْسِمْ»[1] ''قسم نہ ڈالو۔''

2 حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں: ''میں نے خواب میں دیکھا کہ میرے گھر میں تین چاند اتر آئے ہیں۔ میں نے یہ خواب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بتایا، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ لوگوں میں سے سب سے عمدہ تعبیر کرنے والے تھے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''اگر تیرا خواب سچا ہے تو اہلِ زمین میں سے تین بہترین آدمی تیرے گھر میں ضرور دفن ہوں گے۔''

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٠٤٦)

جب نبیِ کریم ﷺ فوت ہوئے تو آپ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہا:

''عائشہ! یہ تیرے چاندوں میں سب سے بہتر چاند ہے۔''

بلاشبہہ حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نبیِ کریم ﷺ کے بعد اس امت کے سب سے بڑے مُعبِّر (تعبیر کرنے والے) تھے۔[1] تمام صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں سے سب سے بڑے عالم ہونے کے باوجود آپ تکلّف، خودنمائی اور دکھلاوے سے سب سے زیادہ دور تھے۔

دعاؤں کا اہتمام اور آہ وزاری:

بلاشبہہ دعا ایک عظیم دروازہ ہے۔ جب یہ دروازہ کسی بندے کے لیے کھل جاتا ہے تو اُس پر پے در پے بھلائیوں کی برسات ہو جاتی ہے اور برکات کا نزول ہوتا ہے۔ اسی لیے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنے رب تعالیٰ سے عمدہ تعلق، بہترین رابطے اور بکثرت دعا کے انتہائی شائق تھے۔ بلاشبہہ دعا دشمنوں کے خلاف حصولِ نُصرت کے عوامل میں سے سب سے قوی اور سب سے عظیم عامل ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ البقرۃ (آیت: ١٨٦) میں فرمایا ہے:

﴿ وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ ۖ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ ۖ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ ﴾

''اور (اے میرے نبی!) جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں سوال کریں تو بے شک میں قریب ہوں، میں دعا کرنے والوں کی دعا قبول کرتا ہوں، جو بھی وہ مجھ سے دعا کرے، پس چاہیے کہ وہ بھی میرے حکموں کو مانیں اور مجھ پر ایمان لائیں تاکہ وہ ہدایت پائیں۔''

حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ ہمیشہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ساتھ رہے۔ آپ نے بغور مشاہدہ کیا کہ رسول اللہ ﷺ کس طرح اللہ تعالیٰ سے فریاد کرتے ہیں اور کس طرح مدد طلب کرتے ہیں۔ حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ اس عظیم عبادت کو رسول اللہ ﷺ سے سیکھنے کے انتہائی آرزومند تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کی: اے اللہ کے رسول ﷺ! مجھے کوئی ایسی دعا سکھا دیجیے جس کے ساتھ میں اپنی نماز میں دعا کروں۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تم یہ دعا کیا کرو:

[1] تاريخ الخلفاء للسيوطي (ص: ١٢٩۔ ١٣٠)

«اَللّٰهُمَّ ! اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ ظُلْماً كَثِيْراً وَّلَا يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ، فَاغْفِرْلِیْ مَغْفِرَةً مِّنْ عِنْدِكَ وَارْحَمْنِیْ اِنَّكَ اَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ »[1]

''اے اللہ! یقیناً میں نے اپنے نفس پر بہت زیادہ ظلم کیے ہیں اور تیرے سوا گنا ہوں کو کوئی معاف نہیں کر سکتا، لہٰذا تُو اپنی خاص مغفرت سے مجھے معاف فرما دے اور مجھ پر رحم فرما، بے شک تو معاف کرنے والا مہربان ہے۔''

اس دعا میں بندہ اپنا یہ وصف بیان کرتا ہے کہ وہ مغفرتِ الٰہی کا شدید محتاج ہے اور دوسری طرف وہ اپنے رب کا ایسا وصف بیان کرتا ہے جو اِس بات کا موجب ہے کہ اس مطلوب پر قدرت رکھنے والی ہستی سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کوئی نہیں۔ اِس دعا میں بندہ اپنی حاجت روائی کے لیے بڑی صراحت سے سوال کرتا ہے، پھر اس دعا میں قبولیتِ دعا کے آداب اور تقاضوں میں سے ایک بات کا بیان ہے اور وہ ہے ربِ تعالیٰ کو مغفرت اور رحمت سے متّصف قرار دینا، لہٰذا یہ اندازِ دعا انواعِ طلب میں سے سب سے اعلیٰ ہے۔[2]

حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سبق سیکھا کہ کسی آدمی کے لیے یہ گمان کرنا جائز نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ سے توبہ کرنے اور گنا ہوں سے استغفار کرنے سے مستغنی ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہر فرد دائمی طور پر مغفرتِ الٰہی کا محتاج ہے۔ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''کوئی شخص اپنے عمل کی بنا پر جنت میں داخل نہیں ہوگا۔''

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی نہیں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا:

''نہیں، میں بھی جنت میں داخل نہیں ہوسکوں گا مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنے فضل و کرم اور رحمت سے ڈھانپ دے۔''[3]

یہ حدیثِ مبارکہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے منافی نہیں ہے:

﴿ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔا بِمَآ اَسْلَفْتُمْ فِي الْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ ﴾ [الحاقة: ٢٤]

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٨٣٤) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٧٠٥)

[2] الفتاویٰ لابن تیمیة (٩/ ١٤٦)

[3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٥٦٧٣) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٨١٨)

''(جنتیوں سے کہا جائے گا:) مزے سے کھاؤ اور پیو اُن (اعمال) کے بدلے جو تم نے گزرے دنوں میں آگے بھیجے۔''

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہمیشہ ذکرِ الٰہی سے رطب اللسان رہنے والے، بہت زیادہ گریہ و زاری کرنے والے اور اللہ تعالیٰ کی طرف ہر آن متوجہ رہنے والے تھے۔ آپ ہر وقت اللہ تعالیٰ کے حضور مناجات اور دعاؤں میں مصروف رہتے تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنی دعاؤں میں یہ بھی کہا کرتے تھے:

''اے اللہ! میری آخری عمر کو میری بہترین عمر بنا، میرے خاتمۂ عمل کو میرا بہترین عمل بنا، اور میرا بہترین دن وہ بنا جس دن میں تجھ سے ملاقات کا شرف حاصل کروں۔''[1]

یہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی چند اہم صفات اور چند فضائل و مناقب تھے۔

اب ہم اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان اور توفیق سے سیدنا صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کی ذات پر مرتب ہونے والے نبوی تربیت کے اُن آثار کا تذکرہ کرتے ہیں جو نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سانحۂ ارتحال کے بعد نمایاں ہوئے اور یہ کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کیسے عظیم خلیفہ ثابت ہوئے؟ آپ کی موجودگی میں کوئی اور اِس مقام کا اہل کیوں نہ ہو سکا؟

وفاتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اندوہ ناک سانحے میں حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کا کردار:

بلاشبہ بعض قرآنی آیات میں واضح طور پر بیان کر دیا گیا ہے کہ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک بشر ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی دوسرے انسانوں کی طرح موت کا ذائقہ چکھیں گے۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی ایک احادیث میں اپنی وفات کے قریب ہونے کا اشارہ کر دیا تھا۔ اُن احادیث میں سے بعض تو وہ ہیں جن میں بڑی وضاحت سے وفات کا تذکرہ ہے اور بعض احادیث میں ایسی صراحت تو موجود نہیں لیکن چند جلیل القدر صحابۂ کرام جیسے سیدنا ابوبکر، سیدنا عباس اور سیدنا معاذ رضی اللہ عنہم نے اُن احادیث سے یہ نتیجہ اخذ کر لیا تھا کہ آفتابِ نبوت عنقریب غروب ہونے والا ہے۔[2]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض الموت کا آغاز:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ماہ ذوالحجہ ۱۰ھ میں حجۃ الوداع سے فراغت کے بعد واپس مدینہ منورہ تشریف لائے

---

[1] عمل اليوم والليلة لابن السني (١٢٠) معجم طبراني الأوسط (٩/ ١٥٧/ ٩٤١١) مصنف ابن أبي شيبة (٦/ ٦٥ بسند حسن، كنز العمال، رقم (٥٠٣٠)

[2] مرض النبي ﷺ ووفاته لخالد أبي صالح (ص: ٣٣)

اور ذوالحجہ کے باقی ایام، محرم اور صفر کے مہینے مدینہ منورہ ہی میں بسر کیے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم جیشِ اسامہ رضی اللہ عنہ کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس لشکر کا امیر حضرت اسامہ زید بن حارثہ رضی اللہ عنہم کو مقرر فرمایا اور انھیں بلقاء اور فلسطین کے علاقوں کی طرف پیش قدمی کا حکم دیا، چنانچہ لوگ تیار ہو گئے جن میں مہاجرین و انصار دونوں گروہوں کے افراد شامل تھے۔

لوگ ابھی جہاد کی غرض سے جیشِ اسامہ رضی اللہ عنہ میں شمولیت کی تیاری کر رہے تھے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض الموت کا آغاز ہو گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض الموت اور وفات کے مابین جو اہم واقعات رونما ہوئے وہ مندرجہ ذیل ہیں:

- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شہدائے اُحد کی قبروں کی زیارت کے لیے تشریف لے گئے اور ان کے لیے دعا فرمائی۔[1]
- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیماری شدّت اختیار کر گئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن سے بیماری کے دن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر بسر کرنے کی اجازت چاہی۔[2]
- آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایامِ علالت میں ایک خطبہ ارشاد فرمایا، جس میں ہے:

  ''اللہ تعالیٰ نے ایک بندے کو اختیار دیا ہے کہ وہ دنیا کو پسند کر لے یا جو کچھ اللہ تعالیٰ کے پاس (آخرت میں) ہے اسے پسند کر لے، چنانچہ بندے نے اسے اختیار کر لیا ہے جو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔''

یہ سن کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ زار و قطار رونے لگے۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہمیں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے رونے پر بڑا تعجب ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو کسی ایسے شخص کا تذکرہ کر رہے ہیں جسے (اپنی پسند کا) اختیار دیا گیا ہے (بھلا اس میں رونے کی کیا بات ہے؟) لیکن درحقیقت اِس ارشاد سے مراد خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی تھے جنھیں دنیا و آخرت میں سے کسی ایک کو پسند کرنے کا اختیار دیا گیا تھا۔ یقیناً حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہم سے زیادہ صاحبِ علم تھے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''مسجد میں (حضرت) ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دروازے کے علاوہ کوئی دروازہ کھلا نہ رہنے دیا جائے۔''[3]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٤٤)

[2] صحيح السيرة النبوية لإبراهيم العلي (ص: ٦٩٥)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٦٥٤)

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیماری شدّت اختیار کر گئی۔ نماز کا وقت ہوا تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اذان کہی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مُرُوا اَبَابَکْرٍ فَلْیُصَلِّ بِالنَّاسِ» ''ابوبکر (رضی اللہ عنہ) سے کہو کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں۔''

ایک دن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نماز پڑھانے آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آپ کو ہلکا پھلکا اور روبصحت محسوس کیا، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم دو آدمیوں کا سہارا لے کر گھر سے باہر تشریف لائے۔ (راوی کہتا ہے کہ) وہ منظر اب بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شدید تکلیف کی وجہ سے اپنی دونوں مبارک ٹانگوں سے گھِسٹ گھِسٹ کر تشریف لا رہے تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے پیچھے ہٹنا چاہا لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارے سے آپ کو اپنی جگہ پر کھڑا رہنے کا حکم دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو (قریب) لایا گیا حتیٰ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پہلو میں بیٹھ گئے۔ نماز سے فراغت کے بعد صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اپنے اپنے کاموں میں مشغول ہو گئے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنی بیٹی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لے گئے اور کہا:

''مَا اَرٰی رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ اِلَّا قَدْ اَقْلَعَ عَنْہُ الْوَجْعُ''

''لگتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیماری دور ہو گئی ہے۔''

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا یہ دن آپ کی بیوی حَبِیبہ بنت خارجہ رضی اللہ عنہا کی باری کا دن تھا۔ وہ ''سُنح'' نامی مقام پر رہتی تھیں، چنانچہ آپ گھوڑے پر سوار ہو کر اپنے اُس گھر کی طرف چل دیے۔[1]

وفاتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر عالمِ نزع طاری ہوا۔ موت کی سختیاں اور بے ہوشیاں شدّت اختیار کرتی چلی گئیں۔ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں نقاہت کی وجہ سے بات کرنے کی سکت بھی نہیں تھی، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بار بار اپنا مبارک ہاتھ آسمان کی طرف بلند کرتے، پھر حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ پر رکھ دیتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عمل سے یہ محسوس ہوا جیسے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے لیے دعا کر رہے ہیں۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ کلمات دہراتے رہے:

«لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ، اِنَّ لِلْمَوْتِ سَکَرَاتٍ»

''اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں۔ یقیناً موت کی بڑی سختیاں ہیں۔''

---

[1] السیرة النبویة لأبي شهبه (٢/ ٥٩٣)

پھر آپ ﷺ نے اپنا ہاتھ اٹھایا اور بار بار کہنے لگے:

« اَللّٰھُمَّ! فِی الرَّفِیْقِ الْاَعْلٰی » ''اے اللہ! بلند رفیق کی رفاقت نصیب ہو۔''

حتیٰ کہ آپ ﷺ کی روح پر واز کر گئی اور آپ ﷺ کا ہاتھ اپنی جگہ آ گیا۔[1] تاجدارِ مدینہ اور کائنات کی بے مثل و بے مثال شخصیت حضرت محمد ﷺ اس دارِ فانی سے کوچ فرما گئے، آپ ﷺ نے بروز دوشنبہ ۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ کو زوال کے بعد وفات پائی۔[2]

اُس وقت آپ ﷺ کی عمرِ مبارک ۶۳ سال تھی۔[3] رسول اللہ ﷺ کی وفات کا دن مسلمانوں کے لیے بڑا تاریک، المناک، کٹھن اور مشکل ترین دن تھا۔ آپ ﷺ کی وفات انسانیت کے لیے ایک بہت بڑی ابتلاء اور آزمایش تھی۔ امام ابن رجب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''رسول اللہ ﷺ کی وفات انتہائی الم انگیز سانحہ تھی۔ اُس کی وجہ سے مسلمان بے قرار ہو کر غیر منظّم اور پریشان ہو گئے۔ بعض مسلمانوں کے ہوش اڑ گئے۔ ان کے دماغوں کو عارضہ لاحق ہو گیا اور وہ لغو اور اول فول باتیں کرنے لگے۔ بعض ایسے تھے کہ اِس سانحے نے انھیں زمین پر پٹخ دیا اور وہ کھڑے ہونے کے قابل نہ رہے، کچھ ایسے تھے کہ اُن کی زبانوں کو تالے لگ گئے۔ اُن میں گفتگو کرنے کا دم بھی نہ رہا اور کچھ ایسے تھے جنھوں نے حتمی طور پر آپ ﷺ کی وفات ہی کا انکار کر دیا۔''[4]

ابن اسحاق رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''جب رسول اللہ ﷺ نے وفات پائی تو مسلمانوں کا درد و کرب اور مصیبت بڑی سنگین صورت اختیار کر گئی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے منقول ایک بات مجھے پہنچی ہے کہ انھوں نے فرمایا: ''جب نبیِ کریم ﷺ نے وفات پائی تو عرب مرتد ہو گئے، یہودی اور نصرانی سر اٹھانے لگے، نفاق کھل کر سامنے آ گیا۔ مسلمان اپنے نبی کریم ﷺ کی جدائی پر سرد رات میں بارش میں بھیگی ہوئی بکری کی مانند ہو گئے۔''[5]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٤٩)

[2] البداية والنهاية (٤/ ٢٢٣)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٤٨)

[4] لطائف المعارف لابن رجب الحنبلي (ص: ١١٤)

[5] السيرة النبوية لابن هشام (٤/ ٣٢٣)

رسول اللہ ﷺ کے بعد حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ ہی سب سے زیادہ بہادر شخصیت ہیں۔ قاضی ابوبکر بن العربی فرماتے ہیں: وفاتِ نبی اکرم ﷺ پر مسلمانوں کے احوال غیر منظم اور پریشان کُن ہوگئے، رسول اللہ ﷺ کی وفات کمر توڑ سانحہ تھا، حضرت علی رضی اللہ عنہ اس قدر غمگین اور پریشان ہوئے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں روپوش ہو کر بیٹھ گئے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر سکوت طاری ہوگیا، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے جری انسان مارے غم کے بے تکی باتیں کرنے لگے اور کہنے لگے کہ: رسول اللہ ﷺ فوت نہیں ہوئے، بلکہ آپ ﷺ کے رب نے آپ ﷺ سے اُسی طرح ملاقات کا وعدہ کیا ہے جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام سے وعدہ کیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ ضرور واپس آئیں گے، اور ایسی چہ میگوئیاں کرنے والے لوگوں کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیں گے۔[1]

جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس سانحہ کی خبر سنی تو فوراً گھوڑے پر سوار ہو کر ''سنح'' سے مدینہ منورہ تشریف لائے، گھوڑے سے اترے اور مسجدِ نبوی ﷺ میں داخل ہوئے۔ لوگوں سے کوئی بات نہیں کی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حُجرے میں پہنچے جہاں رسول اللہ ﷺ کا جسمِ اطہر کپڑے سے ڈھکا ہوا تھا، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کے چہرۂ مبارک سے کپڑا ہٹایا اور جھک کر آپ ﷺ کی پیشانی مبارک کا بوسہ لیا اور فرطِ غم سے رو پڑے۔ پھر فرمایا:

''میرے ماں باپ آپ ﷺ پر قربان ہوں! اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کو دو مرتبہ موت نہیں دیگا۔ جو موت آپ ﷺ کے حق میں لکھی گئی تھی وہ آچکی۔''[2]

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حجرے سے باہر نکلے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ابھی تک لوگوں سے محوِ گفتگو تھے، آپ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی باتیں سنیں، اُن کی حالت دیکھی، تو فرمایا: ''عمر (رضی اللہ عنہ)! بیٹھ جاؤ'' مگر وہ غم و کرب سے اس قدر مغلوب تھے کہ بیٹھنے سے انکار کردیا۔ اور جوش وغضب میں اپنی گفتگو جاری رکھی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کھڑے ہوگئے۔ حضرتِ صدیق رضی اللہ عنہ کو اپنے سامنے پا کر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم ان کی طرف لپک آئے۔ تب انھوں نے وفاتِ مصطفیٰ ﷺ کے اعلان کا خطبہ ارشاد فرمایا۔ جو بخاری شریف میں یوں مذکور ہے۔

اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء کے بعد فرمایا:

---

[1] العواصم من القواصم، تحقيق محب الدين الخطيب (ص: ٣٨)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٤١)

«مَنْ كَانَ مِنكُمْ يَعْبُدُ مُحَمَّداً، فَإِنَّ مُحَمَّداً قَدْ مَاتَ وَ مَنْ كَانَ مِنكُمْ يَعْبُدُ اللّٰهَ فَإِنَّ اللّٰهَ حَيٌّ لَا يَمُوتُ»

''تم میں سے جو شخص حضرت محمد ﷺ کی عبادت کیا کرتا تھا (وہ سمجھ لے کہ) وہ تو وفات پا گئے ہیں۔ اور جو کوئی اللہ کی عبادت کیا کرتا تھا، اسے یقین رکھنا چاہیے کہ اللہ زندہ ہے، اسے ہرگز موت نہیں آئے گی۔''

اوراس کے بعد آپ نے سورت آل عمران کی (۱۴۴) تلاوت فرمائی:

﴿ وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۚ أَفَإِنْ مَّاتَ أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ ۚ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا ۗ وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ﴾

''اور محمد بھی تو ایک رسول ہیں۔ ان سے پہلے بھی کتنے رسول گزر چکے ہیں۔ پھر کیا اگر وہ فوت ہو جائیں یا قتل کر دیے جائیں تو تم لوگ الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ یاد رکھو! جو کوئی الٹا پھرے گا، وہ اللہ تعالیٰ کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ البتہ جو اللہ کے شکر گزار بن کر رہیں گے، انھیں وہ اس کی اچھی جزاء دے گا۔''

یہ سن کر لوگ اس قدر روئے کہ روتے روتے ان کی ہچکی بندھ گئی۔[1] بخاری شریف میں ہی ہے کہ حضرت سعید بن مسیّب رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ حضرتِ فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''اللہ کی قسم جب میں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو یہ آیت تلاوت کرتے سنا تو میری ٹانگوں میں سکت نہ رہی، میرے پاؤں میرا بوجھ اٹھانے سے قاصر ہو گئے، میں زمین پر گر پڑا اور مجھے یقین ہوگیا کہ نبی مکرم ﷺ واقعی وفات پا چکے ہیں۔''[2]

امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''یہ آیتِ کریمہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی شجاعت، جرأت اور پامردی کی سب سے بڑی دلیل ہے، کیونکہ جرأت و شجاعت کی تعریف یہ ہے کہ مصائب کے چھا جانے پر دل مطمئن اور پرسکون رہے، مضطرب اور بے قابو نہ ہو۔ آدمی کے اوسان بحال رہیں اور بڑی سے بڑی مصیبت بھی

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٤٢، ٣٦٦٨)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٥٤)

رسول اللہ ﷺ کی وفات سے بڑھ کر سنگین نہیں ہوسکتی، چنانچہ اِس سے آپ کی شجاعت وبسالت اور علمی مقام نمایا ہوگیا۔ بعض لوگوں نے جن میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے، یہ کہنا شروع کر دیا کہ رسول اللہ ﷺ فوت نہیں ہوئے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی زبان پر مہرِ سکوت لگ گئی، حضرت علی رضی اللہ عنہ روپوش ہوگئے اور معاملات بے قابو اور غیر منظّم ہوگئے حتیٰ کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے جائے مسکن [سنح] سے آکر اس آیتِ کریمہ کی تلاوت کر کے حقیقت آشکارا کی۔"[1]

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ان مختصر کلمات اور قرآنِ کریم سے استدلال کی بدولت لوگوں پر چھائے ہوئے حیرت و وحشت کے سائے چھٹنے لگے اور لوگ حواس باختگی سے نکل کر صحیح فہم وشعور کی دنیا میں لوٹ آئے کہ اللہ وحدہٗ لا شریک کی ہی وہ یکتا ذات ہے جو الحیُّ القیّوم ہے، اس پر کبھی موت طاری نہیں ہوگی، اکیلا وہی عبادت کا مستحق ہے اور اسلام حضرت محمد ﷺ کی وفات کے بعد بھی باقی رہے گا۔[2]

خلیفۂ رسول ﷺ نے غم سے نڈھال صحابہ رضی اللہ عنہم کو ایک نیا حوصلہ عطا کیا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ہم وفاتِ رسول ﷺ کے زبردست صدمے سے نیم جاں پڑے ہوئے تھے کہ حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کے خطبہ نے ہم میں نئی روح پھونک دی اور ہم شیر بن کر اٹھ کھڑے ہوئے۔[3]

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے وفاتُ النبی ﷺ کا انتہائی الم انگیز سانحہ اتنی وضاحت سے بیان کیا کہ لوگوں کے دل ودماغ سے شکوک وشبہات کے سارے بادل چھٹ گئے اور آپ کی اسی تقریر کی بدولت صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اپنے ایمان پر ثابت قدم رہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

"اللہ کی قسم، یوں محسوس ہوتا تھا جیسے لوگ یہ جانتے ہی نہیں تھے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت بھی نازل فرمائی ہے حتیٰ کہ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس آیت کی تلاوت کی تو آپ ہی سے لوگوں نے یہ آیت سیکھی پھر جسے بھی دیکھا گیا وہ یہی آیت تلاوت کر رہا تھا۔"[4]

---

[1] للتفصيل القرطبي (٤/ ٢٢٢)

[2] استخلاف أبي بكر الصديق رضي الله عنه لجمال عبدالهادي (ص: ١٦٠)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٦٦٨)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٤١، ١٢٤٢)

خلافت کی ذمہ داری

خلافتِ صدیقی پر قرآنِ مجید کے اشارات:

قرآنِ مجید میں ایسی آیات آئی ہیں جن میں اس بات کا واضح اشارہ موجود ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا خلیفہ ہونے کا سب سے زیادہ حق حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا ہے۔ وہ آیات درجِ ذیل ہیں:

دلیل نمبر ①:

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ﴾ [الفاتحة: ٦۔ ٧]

''ہمیں سیدھا راستہ دکھا۔ اُن لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام کیا، اُن کا نہیں جن پر تیرا غضب ہوا اور نہ گمراہوں کا۔''

وجہِ استدلال:

اس آیت سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت کی دلیل اس طرح قائم ہوتی ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اُن انعام یافتہ لوگوں میں شامل ہیں جن کے راستے پر چلنے اور ان کا طریقہ اختیار کرنے کی توفیق مانگنے کا مومنوں کو حکم دیا گیا ہے۔ ان انعام یافتہ گروہوں میں سے ایک صدیقین کا گروہ بھی ہے، چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ﴾ [النساء: ٦٩]

''اور جو کوئی اللہ اور رسول کی اطاعت کرے تو وہ ایسے لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام کیا (یعنی) انبیاء، صدیقین، شہیدوں اور نیکوکاروں کے ساتھ اور یہ لوگ رفاقت کے لحاظ سے کس قدر اچھے ہوں گے۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ صدیقین میں سے ہیں۔ یہ فرمانِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ گروہِ صدیقین کے رکن ہی نہیں بلکہ ان کے سردار ہیں۔ چنانچہ جب

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ان لوگوں میں سے ہیں جن کا راستہ ہی سیدھا راستہ قرار دیا گیا ہے تو پھر کسی عقل مند کو اس امر میں قطعاً کوئی شک نہیں ہونا چاہیے کہ امتِ محمدیہ میں خلافتِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے زیادہ مستحق ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی ہیں۔[1]

آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عظیم خلیفہ ثابت ہوئے کیونکہ آپ کی موجودگی میں کوئی اور اِس مقام کا اہل ہی نہ تھا، اِس طرح حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنی عمیق تربیت، عظیم ایمان، راسخ علم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسبِ فیض کی بدولت فوجی نظام کو عمدہ بنایا۔ آپ نے اپنے رہبرِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی سی نرمی اور حسنِ سلوک کے ساتھ فوجی نظام کے تمام مراحل اور مقاصد کی تکمیل کی۔ جب آپ امتِ اسلامیہ کے خلیفہ بنے تو سفینۂ اسلام کو شدید طوفانوں، تلاطم خیز مخالف موجوں اور کٹھن فتنوں کا سامنا تھا۔ آپ ان تمام فتنوں سے نبرد آزما ہوتے ہوئے سفینۂ اسلام کو بڑی کامیابی کے ساتھ امن وسلامتی کے ساحل پر لانے میں کامیاب ہو گئے۔ اور دینِ اسلام کی ڈگمگاتی کشتی کو اپنی بے مثال ذہانت، شجاعت، علمی وُسعت و گہرائی، اللہ پر گہرے توّکل اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سچی محبت کے سہارے کنارے پر لگایا۔ انھوں نے خلافت سنبھالتے ہی لوگوں کے سامنے جو خطبہ ارشاد فرمایا، اس میں انھوں نے قیامت تک آنے والے حکمرانوں کے لیے راہنما اصول بیان کر دیے۔ اور خود اپنی خلافت کے عہد میں ان اصولوں پر سختی سے عمل کیا۔

آپ نے فرمایا: لوگو! مجھے تم پر خلیفہ بنا دیا گیا ہے، حالانکہ تم لوگوں میں مجھ سے زیادہ قابل لوگ بھی موجود تھے۔ آپ کے اس ارشاد سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ خلافت کے خواہش مند نہ تھے مگر امت کے اجتماعی مفاد کے پیشِ نظر آپ نے یہ نازک ذمہ داری قبول کر لی۔

عہدِ صدیقی میں قانون سازی کے مآخذ:

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا:

''میری اطاعت اُس وقت تک کرنا جب تک میں اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرتا رہوں۔ اگر میں اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کروں تو تم پر میری اطاعت واجب نہیں۔''[2]

کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

[1] عقيدة أهل السنة والجماعه للدكتور ناصر بن علی الشيخ (٢/ ٥٣٢)

[2] البداية والنهاية (٦/ ٣٠٦)

''معصیت ونافرمانی میں (حکمران وغیرہ کی) اطاعت جائز نہیں۔ بلاشبہ اطاعت معروف کاموں میں ہے۔''[1]

عوام کو حکمرانوں کے محاسبے کا حق حاصل ہے:

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا تھا:

''اگر میں درست کام کروں تو میری مدد کرنا اور اگر میں غلطی کروں تو میری اصلاح کرنا۔''[2]

اِس طرح حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عوام کو اپنے اعمال کی نگرانی اور محاسبے کا حق دیا بلکہ یہ حق بھی دیا کہ اگر وہ کوئی خلافِ شرع کام کرنے لگیں تو امت انھیں روک دے اور شرعی طریقۂ کار پر گامزن کرے۔[3] حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے اوّلین خطاب میں ہی اقرار کرلیا تھا کہ حکمران سے غلطی سرزد ہونا ممکن ہے، لہٰذا اس کا محاسبہ بھی ہوسکتا ہے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مطابق امتِ محمدیہ ۔علیٰ صاحبها الصلاة والسلام۔ کو ایک زندہ اور بیدار نظام دیا گیا ہے جو باہمی تعاون، ہمدردی اور اتفاق کی بنیاد پر اصلاح کی قدرت رکھتا ہے۔ رعایا پر واجب ہے کہ شرعی قانون کے مطابق حکمرانی کرنے والے حاکم کی بھرپور مدد کرے اور امورِ دین کی تکمیل اور جہاد فی سبیل اللہ میں اس کا بھرپور ساتھ دے۔ امام کی حمایت ومدد میں سے یہ بھی ہے کہ اسے ذلیل نہ کیا جائے اور اس کے تعاون میں سے یہ بھی ہے کہ اس کا احترام کیا جائے۔

نبیِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے:

«اَلدِّيْنُ النَّصِيْحَةُ» ''دین خیر خواہی کا نام ہے۔''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تین بار فرمایا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کی: ''اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کس کی خیر خواہی دین ہے؟۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اللہ کے لیے، اس کی کتاب، اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم، مسلمانوں کے ائمہ اور عام مسلمانوں کے لیے (خیر خواہی دین ہے)۔''[4]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٢٥٧)

[2] البداية والنهاية (٦/ ٣٠٥)

[3] فقه الشورىٰ و الاستشاره للدكتور توفيق الشاوي (ص: ٤٤١)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٥)

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا پختہ یقین تھا کہ امتِ محمدیہ۔علیٰ صاحبہا الصلاۃ والسلام۔کا استحکام حکمرانوں کی استقامت پر منحصر ہے، اِسی لیے رعایا کا فرض ہے کہ وہ خیر خواہی کے جذبے سے اپنے حکمرانوں کی غلطیوں کی اصلاح کرے۔

کس قدر ملال انگیز بات ہے کہ بہت سے اسلامی ممالک اس عظیم نظام سے اِعراض کیے ہوئے ہیں۔ اسی وجہ سے ان ممالک پر جابر اور ظالم حکمران مسلّط ہیں۔ بہت سے اسلامی ممالک کے تنزّل اور انحطاط کا سبب یہی قابلِ نفرت قابض حکمران یا آمر ہیں۔انھوں نے امت میں شجاعت اور باہمی خیرخواہی کے جذبات فنا کر کے بزدلی،خوف اور لالچ کے بیج بودیے ہیں۔سوائے ان کے جن پر اللہ تعالیٰ کی خصوصی رحمت ہے۔

اسلامی حکومت کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ وہ ہر شخص کے لیے مواقع فراہم کرے کہ وہ کسی مالی یا جسمانی مشقت کے بغیر اپنا حق آسانی سے وصول کر سکے، اِسی طرح اس کی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ حق دار کو اس کا حق وصول کرنے میں رکاوٹ بننے والے ذرائع کا خاتمہ کرے۔

اسلام نے حکمرانوں پر واجب قرار دیا ہے کہ وہ بلا امتیازِ رنگ ونسل، یا زبان و مکان لوگوں کو عدل و انصاف فراہم کریں۔حاکمِ وقت دو جھگڑنے والوں کے درمیان عدل وانصاف سے فیصلہ کرے۔اُسے اِس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے کہ جن کے حق میں فیصلہ ہوا ہے وہ اس کے دوست ہیں یا دشمن، وہ امیر ہیں یا غریب،مزدور ہیں یا سرمایہ دار!۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ عدل وانصاف میں بہترین قُدوہ ہیں۔آپ کے عدل وانصاف نے دلوں کو گرویدہ اور عقلوں کو خیرہ کردیا۔

حضرت عبداللہ بن عَمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جمعہ والے دن خطبے کے لیے کھڑے ہوئے تو انھوں نے اپنے پہلے ہی خطاب میں مساوات کا جو اصول بیان کیا تھا وہ اُن عمومی اصولوں میں سے ایک ہے جنھیں اسلام نے قائم کیا ہے۔ اور یہ قانون اسلامی معاشرے کی تشکیل میں بڑا اہم کردار ادا کرتا ہے۔ دورِ حاضر کے قوانین میں اسے اہم مقام حاصل ہے۔قرآنِ مجید میں مساوات کے اصول کی تاکید کی گئی ہے۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَاأَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا ۚ إِنَّ

أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ﴾ [الحجرات: ١٣]

''اے لوگو! بلاشبہ ہم نے تمھیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا۔ اور ہم نے تمھارے خاندان اور قبیلے بنائے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہنچانو، بلاشبہ اللہ کے ہاں تم میں سے زیادہ عزت والا (وہ ہے جو) تم میں سے زیادہ متقی ہے۔ بلاشبہ اللہ بہت علم والا، خوب باخبر ہے۔''

یقیناً اسلام کی نظر میں سب لوگ برابر ہیں، وہ حاکم ہو یا محکوم، مرد ہو یا عورت، عربی ہو یا عجمی، سرخ وسفید ہو یا سیاہ۔ اسلام نے جنس، رنگ ونسل اور نسب یا قبائلی وجۂ امتیاز کو یکسر مٹا دیا۔ چنانچہ حکمران اور رعایا شریعت کی نظر میں برابر ہیں۔[1]

حکمران اور عوام میں تعامل کی بنیاد سچائی ہے:

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''سچ امانت ہے اور جھوٹ خیانت ہے۔''[2]

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے امت کی قیادت کے بنیادی اصول کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا:

''حاکم اور رعایا کے درمیان تعامل کی بنیاد سچائی پر قائم ہے۔''

یہ دانش مندانہ سیاسی اصول امت کی قوت مجتمع کرنے میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ سچ ہی سے حکمران اور رعایا میں اعتماد کے تعلقات فروغ پاتے ہیں۔ یہ ایک سیاسی ضابطہ ہے جو شریعتِ اسلامی سے لیا گیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ ﴾ [التوبة: ١١٩]

''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچ بولنے والوں کے ساتھ ہو جاؤ۔''

عوام کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے اُن اداروں کی مدد سے حکمرانوں کا محاسبہ کریں جو حکمرانوں کے محاسبے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں تاکہ حکمران سچ اور امانت داری پر قائم رہیں۔ اگر عوام یہ کام کر گزریں تو حکمران عوام کے حقِ خود ارادیت، عزت وشرف، آزادی اور مال میں کبھی خیانت نہیں کر سکیں گے۔

---

[1] فقه التمكين في القرآن الكريم للصلابي (ص: ٤٥٩، ٤٦١)

[2] البداية و النهاية (٣/ ٣٠٥)

جہاد کی ترغیب:

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا قول ہے:

''جو قوم جہاد فی سبیل اللہ سے منہ موڑ لیتی ہے، اللہ تعالیٰ اُسے رسوا کر دیتا ہے۔''[1]

فواحش کے خلاف اعلانِ جنگ:

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا:

''جس قوم میں بے حیائی عام ہو جائے اللہ اُسے بیماریوں میں مبتلا کر دیتا ہے۔''[2]

دراصل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے امتِ اسلامیہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان یاد دلایا ہے:

''جس قوم میں بے حیائی پھیل جائے حتیٰ کہ لوگ علی الاعلان بے حیائی کے مرتکب ہونے لگیں تو اُن میں طاعون اور ایسی بیماریاں جنم لیں گی جو پہلے لوگوں نے سنی تک نہ ہوں گی۔''[3]

بلاشبہ بے حیائی لا علاج معاشرتی برائی ہے۔ یہ کسی بھی معاشرے کی کمزوری اور خاتمے کا سبب ہے، کیوں کہ جہاں بے حیائی عام ہو، وہاں کسی چیز کی حرمت باقی نہیں رہتی۔ بے حیا معاشرے کی غیرت وحمیّت ختم ہو جاتی ہے اور وہ بے غیرتی پر راضی ہو جاتے ہیں۔ ایسا معاشرہ شرم و حیا سے عاری اور وباؤں اور بیماریوں کی آماجگاہ بن کر زوال کا شکار ہو جاتا ہے۔ دورِ حاضر میں لوگوں کی موجودہ حالت اِس کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے امت کی اخلاقی اور دینی اقدار کی حفاظت کا بیڑا اٹھایا۔[4]

انھوں نے امت کو ہر قسم کی پوشیدہ اور ظاہری بے حیائی سے بچایا اور اُسے پاک صاف بنانے کی بھرپور کوشش کی۔ اِس طرح اُن کا مقصد یہ تھا کہ امتِ اسلامیہ مضبوط ترین ملت بنے جسے دنیاوی لذتیں گھیر سکیں نہ شیطان اسے گمراہ کر سکے۔ یوں امتِ اسلامیہ انسانیت کے لیے خیر و برکت کا باعث بنے۔

یقیناً کسی بھی مملکت کے قیام اور اس کی تہذیب کے فروغ و ترقی کا دار و مدار اخلاقی اقدار پر ہے۔ اگر اخلاقیات فاسد ہو جائیں اور ذمہ داری کا فقدان ہو تو امت ضائع ہو جاتی ہے اور اس کا فساد اور ہلاکت

---

[1] البداية والنهاية (٦/ ٣٠٥)

[2] البداية و النهاية (٦/ ٣٠٥)

[3] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٠١٩) صحيح الترغيب والترهيب (٧٦٤)

[4] أبو بكر رجل الدولة لمجدي حمدي (ص: ٦٦)

عام ہو جاتی ہے۔ گزشتہ قوموں اور ان کی تہذیب کا بغور مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان قوموں نے اخلاقی اقدار اور خالص دین پر کار بند رہنے کا کس قدر اہتمام کیا تھا، مثلاً: حضرت سلیمان اور داود علیہما السلام کے دَور کی تہذیب یا ذو القرنین کے زمانے کی تہذیب یا اُن جیسی دیگر قوموں کی تہذیب، یعنی جب تک وہ اخلاقی اقدار کی حامل رہیں مضبوط و قائم رہیں۔ لیکن جب اُن میں بے حیائی عام ہوگئی تو وہ تہذیبیں شیطان کے جال میں پھنس گئیں۔ انھوں نے اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کی۔ اِس طرح وہ قومیں ہلاکت و بربادی کی خندق میں جا گریں، ان کی قوت نابود ہوگئی اور ان کی ثقافت کے نشان تک مٹ گئے۔[1]

خلافت سنبھالنے کے بعد اِس عظیم شخصیت نے ایک اور لازوال اور شاندار مثال قائم کی۔ اور وہ یہ کہ حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ اپنا بہت سا مال اللہ کی راہ میں صدقہ کر چکے تو خلافت کی ذمہ داری ان کے کندھوں پر آن پڑی۔ آپ دنیا سے انتہائی بے رغبتی رکھنے والے شخص تھے۔ خلیفہ بنتے ہی بازار کی طرف چل دیے تاکہ کچھ خرید وفروخت کر کے اپنا اور بال بچوں کا پیٹ پال سکیں۔ راستے میں حضرت عمر بن خطاب اور حضرت علی بن ابو طالب رضی اللہ عنہما نے انھیں روک کر پوچھا: اے خلیفۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کہاں جا رہے ہیں؟ فرمایا بچوں کے لیے روزی کمانے جا رہا ہوں۔ یہ بات سن کر انھیں بڑی تشویش لاحق ہوئی اور انھوں نے کہا کہ جس شخص پر پوری امت کے مسائل کا بوجھ ہے، اُسے فکرِ معاش سے آزاد کرنا تو ہم لوگوں کی ذمے داری بنتی ہے، چنانچہ انھوں نے اس معاملے کو حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ اور دیگر مہاجرین رضی اللہ عنہم کے سامنے پیش کیا اور اس امر پر اتفاق ہوا کہ انھیں بیت المال سے روزانہ دو درہم ادا کیے جائیں گے۔

صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کی معاشرتی زندگی:

خلیفۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہونے کی حیثیت سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی زندگی اس طرح بسر ہوئی کہ آپ نے ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا۔ آپ ہر وقت مسلمانوں کو دینِ حنیف سکھاتے تھے۔ نیکی کا حکم دیتے تھے اور برائی سے روکتے نظر آتے تھے۔ آپ کے اس اہتمام سے رعایا کو ہدایت کی راہ ملتی، ایمان پختہ ہوتا تھا اور اخلاقی اقدار مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی گئی تھیں۔

بکریوں کا دودھ دوھنا:

خلافت کے منصب پر متمکن ہونے سے پہلے آپ ایک محلے کی بکریوں کا دودھ دوھیا کرتے تھے۔

[1] تاريخ الدعوة إلى الإسلام للدكتور يسرى محمد هاني (ص: ٢٥٢)

جب آپ خلیفہ بن گئے تو اس محلے کی ایک بچی کہنے لگی: ''اب تو آپ ہماری بکریوں کا دودھ نہیں دوھیا کریں گے۔'' یہ سن کر حضرت بو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اللہ کی قسم! میں یہ خدمت انجام دیتا رہوں گا، امید ہے کہ میری ذمہ داری مجھے میری گزشتہ نیکیوں سے مانع نہیں ہوگی۔'' چنانچہ آپ حسبِ سابق ان کی بکریوں کا دودھ دوھتے رہے۔ جب وہ بچیاں اپنی بکریاں لے کر آتیں تو آپ از راہِ شفقت فرماتے:

''أُرْغِيْ لَكِ اَوْ أُصَرِّحُ؟'' ''دودھ کی جھاگ بناؤں یا نہ بناؤں؟''[1]

اگر وہ کہتیں کہ جھاگ بنادیں تو برتن کو ذرا دور رکھ کر دودھ دوھتے حتیٰ کہ خوب جھاگ بن جاتی۔ اگر وہ کہتیں کہ جھاگ نہ بنائیں تو برتن تھن کے قریب کر کے دودھ دوھتے تاکہ دودھ میں جھاگ نہ بنے۔ آپ مسلسل چھ ماہ تک مقام سُنح میں یہ خدمت انجام دیتے رہے پھر آپ نے مدینہ منورہ میں رہایش اختیار کر لی۔[1]

اس واقعے میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے اخلاقِ حسنہ کی ایک نادر جھلک دیکھی جاسکتی ہے۔ یہ اعلیٰ درجے کی تواضع ایک ایسے شخص کی ہے جو عمر میں بڑا اور مقام و مرتبے میں اعلیٰ تھا۔ آپ اُس وقت خلیفۃ المسلمین تھے لیکن اس کے باوجود اپنی گزشتہ نیکیوں کو جاری رکھنے کے متمنّی تھے، چاہے اِس پر ان کا کتنا ہی وقت صَرف ہو جائے، حالانکہ انھیں وقت کی اشدّ ضرورت بھی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ واقعہ ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نیکی اور بھلائی کے کاموں کا کس قدر اہتمام کیا کرتے تھے، چاہے اس عمل میں کیسی ہی کلفت و مشقت پیش آئے۔[2]

آپ اپنی اسی خوبی کو بروئے کار لاکر کمزوروں کی خدمت اور حاجت مندوں کی ضروریات پوری فرمایا کرتے تھے۔

نابینا خاتون کی خدمت:

حضرت ابو صالح غفاری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ مدینہ منورہ میں ایک اندھی بڑھیا رہتی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ رات کے وقت اس کی خدمت کے لیے جایا کرتے تھے۔ اسے پانی وغیرہ لا کر دیتے اور دیگر ضروریات کا سامان بہم پہنچاتے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ جب وہ وہاں پہنچتے تو انھیں معلوم ہوتا کہ کوئی شخص اُن

[1] الطبقات لابن سعد (٣/ ١٨٦)

[2] التاريخ الإسلامي للحميدي (١٩/ ٨)

سے پہلے بڑھیا کی خدمت کر گیا ہے۔ کئی بار حضرت عمر رضی اللہ عنہ جلدی پہنچے تاکہ کوئی دوسرا شخص اُن سے پہلے یہ خدمت نہ کر جائے مگر وہ ایسا نہ کر پائے۔ ایک رات انھوں نے چُھپ کر اس شخص کا پتا لگایا تو وہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نکلے جو اُس بڑھیا کی خدمت کر جاتے تھے، حالانکہ وہ اُس وقت مسلمانوں کے خلیفہ تھے۔[1]

خاموش حج کرنے والی عورت کو نصیحت:

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ لوگوں کو جاہلی اعمال اور بدعات کے ارتکاب سے روکتے تھے۔ آپ صحیح اسلامی اعمال ادا کرنے اور اتباعِ سنت کی تاکید کیا کرتے تھے۔ حضرت قیس بن ابی حازم رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ احمس قبیلے کی زینب المہاجر رضی اللہ عنہا نامی ایک عورت کے پاس پہنچے۔ آپ نے دیکھا کہ وہ بالکل چپ ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا: ''اسے کیا ہوا؟ یہ باتیں کیوں نہیں کرتی؟''

حاضرین نے جواب دیا کہ اس نے خاموش حج کرنے کی نذر مانی ہے۔ آپ نے اُسے حکم دیا کہ اپنی خاموشی توڑو، ایسی نذر ماننا جائز نہیں، یہ تو جاہلیت کے کاموں میں سے ہے، لہٰذا اُس نے بات چیت شروع کر دی اور پوچھنے لگی: ''آپ کون ہیں؟'' حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''میں مہاجرین میں سے ہوں۔'' اس نے پھر پوچھا: ''کون سے مہاجرین میں سے؟'' آپ نے کہا ''قریش کے مہاجرین میں سے۔'' اس نے پوچھا: ''قریش کے کس خاندان سے'' آپ نے فرمایا: ''تو سوال بہت کرتی ہے۔ میں ابوبکر (رضی اللہ عنہ) ہوں۔''

اس پر وہ کہنے لگی: ''اے خلیفۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم! جاہلیت کے بعد اللہ تعالیٰ نے ہمیں اسلام کی وجہ سے جو نعمت عطا کی ہے ہم اس پر کب تک قائم رہیں گے؟'' آپ نے فرمایا: ''تم لوگ اِس پر اُس وقت تک قائم رہو گے جب تک تمھارے حکمران اسلام پر قائم رہیں گے۔'' وہ کہنے لگی: ''حکمرانوں سے کون لوگ مراد ہیں؟'' آپ نے فرمایا: ''کیا تمھاری قوم کے شرفاء اور سردار نہیں ہیں جو قبیلے والوں کو حکم دیتے ہیں اور وہ ان کی اطاعت کرتے ہیں؟'' اس نے عرض کی: ''بالکل ہیں؟'' آپ نے فرمایا: ''حکمران یہی لوگ تو ہیں۔''[2]

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا بھرپور اہتمام:

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نیکی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے اور لوگوں کے پیچیدہ مسائل کی وضاحت کر کے انھیں حل فرمایا کرتے تھے۔

---

[1] أبو بكر الصديق للطنطاوي (ص: ٢٩)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٨٣٤)

- حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ لوگوں کو ظلم کرنے، عہد توڑنے اور دھوکا دینے سے روکتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے: ''جس میں تین خصلتیں ہوں گی وہ اُس کے خلاف دلیل بن جائیں گی: ظلم، عہد شکنی اور دھوکا دہی۔''[1]
- آپ لوگوں کو التزام و پابندی سے وعظ و نصیحت کیا کرتے تھے۔
- آپ خطبۂ جمعہ میں لوگوں کو سچائی اور حیا کی تلقین فرمایا کرتے تھے۔ اللہ کے سامنے حاضری کی تیاری کرنے کی تاکید کیا کرتے تھے اور دنیوی دھوکے میں پڑنے سے روکتے تھے۔

اوسط بن اسماعیل رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''میں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے ایک سال بعد خطبہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا، آپ فرما رہے تھے: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کے پہلے سال اِسی جگہ خطبہ ارشاد فرمانے کے لیے کھڑے ہوئے۔''

پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اتنا روئے کہ اُن کے لیے بات کرنا دشوار ہو گیا، پھر کچھ دیر کے بعد فرمایا:

''اے لوگو! اللہ سے عافیت کا سوال کرو کیونکہ ایمان کے بعد عافیت سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں جو کسی شخص کو عطا کی گئی ہو۔ سچ بولا کرو کیونکہ سچ اور نیکی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ یہ دونوں چیزیں جنت میں لے جائیں گی۔ جھوٹ سے بچو کیونکہ جھوٹ اور برائیاں لازم و ملزوم ہیں اور یہ دونوں جہنم کا سبب ہیں۔ تعلقات مت توڑو، اپنے مسلمان بھائیوں کی مدد سے منہ نہ موڑو، آپس میں بُغض و عناد مت رکھو، حسد نہ کرو۔ اے اللہ کے بندو! بھائی بھائی بن جاؤ۔''[2]

عہدِ صدیقی کے بعض اہم فیصلے

جائز دفاع کی صورت میں عدمِ قصاص کا فیصلہ:

عبداللہ بن عبیداللہ المعروف ابن ابی ملیکہ رحمہ اللہ اپنے دادا ابوملیکہ رحمہ اللہ سے بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے لڑائی میں دوسرے آدمی کی انگلیاں چبا ڈالیں، اس نے ہاتھ کھینچا تو اُس آدمی کے سامنے والے دانت اکھڑ گئے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس مقدمے میں عدمِ قصاص کا فیصلہ سنایا۔[3]

---

[1] مجمع الامثال للميداني (٢/ ٤٥٠)

[2] صحيح التوثيق في سيرة وحياة الصديق لمجدى فتحى السيد (ص: ١٧٩)

[3] تاريخ القضاء في الإسلام للزحيلى (ص: ١٣٧)

بدکاری پر کوڑے مارنے کا حکم:

صفیہ بنت ابی عبید رحمہا اللہ بیان کرتی ہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس ایک شخص لایا گیا۔ اس نے ایک لونڈی سے زنا کیا تھا۔ وہ حاملہ ہوگئی، اس شخص نے زنا کا اعتراف کرلیا۔ وہ شادی شدہ نہیں تھا، چنانچہ آپ کا حکم پر اُسے (۱۰۰) کوڑے مارے گئے، پھر مدینہ منورہ سے فَدک کی طرف شہر بدر کر دیا گیا۔[1]

ایک روایت کے یہ الفاظ ہیں کہ آپ نے لونڈی کو کوڑوں کی سزا دی نہ جلاوطن کیا کیونکہ اس کے ساتھ جبری زیادتی کی گئی تھی، پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اسی شخص کے ساتھ اس لونڈی کی شادی کردی۔[2]

مُطلّقہ عورت کے چھوٹے بچے اسی کے پاس رہیں گے:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے عاصم رضی اللہ عنہ کی والدہ کو، جو انصاری خاتون تھیں، طلاق دے دی۔ کچھ عرصہ بعد وادیِ مُحسر (یہ مکہ اور عرفات کے درمیان واقع ہے) میں آپ کی اُن سے ملاقات ہوئی۔ وہ اپنے بیٹے کو اٹھائے ہوئی تھیں، بچہ دودھ پینا چھوڑ چکا تھا اور اب چلنے پھرنے کے قابل ہوگیا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیٹے کا ہاتھ پکڑ کر ماں سے چھیننا چاہا اور تھوڑی سختی بھی کی۔ بچہ رونے لگا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہنے لگے: ''میں اپنے بیٹے کا تمھاری نسبت زیادہ حق دار ہوں۔'' یہ جھگڑا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تک پہنچا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ماں کے حق میں فیصلہ دے دیا اور فرمایا:

''رِيحُهَا وَحِجْرُهَا وَفَرْشُهَا خَيْرٌ لَّهٗ مِنْكَ حَتّٰى يَشُبَّ وَيَخْتَارَ لِنَفْسِهٖ''

''اس بچے کے لیے ماں کی محبت وشفقت، اس کی گود اور بستر تمھاری نسبت بہتر ہے حتیٰ کہ بچہ جوان ہوجائے اور اپنا فیصلہ خود کرلے کہ وہ کس کے پاس رہنا چاہتا ہے۔''

ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں:

''ماں زیادہ مشفق و مہربان، زیادہ رحم دل، زیادہ محبت کرنے والی اور زیادہ نرم مزاج ہے اور جب تک وہ دوسری شادی نہ کرے تب تک وہ بچے کی زیادہ حق دار ہے۔''[3]

---

[1] الموطأ للامام مالك (۲/ ۳۳٦) رقم الحديث (۱۵۸۹)

[2] المصنف لعبد الرزاق (۱۲۷۹٦)

[3] المصنف لعبد الرزاق (۷/ ۵٤) رقم الحديث (۱۲٦۰۰، ۱۲٦۰۱)

فَدک کی زمین اور سیدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا اور سیدنا عباس رضی اللہ عنہ:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ حضرت فاطمہ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وراثت طلب کی۔ وہ خیبر کے باغات اور فَدک کی زمین میں سے اپنا حصہ مانگ رہے تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان دونوں سے کہا: بے شک میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے:

''ہماری (انبیائے کرام علیہم السلام کی) کوئی وراثت نہیں ہوتی۔ ہم جو چھوڑ جائیں وہ صدقہ ہے، بلاشبہ آلِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اُسی مال میں سے اپنا خرچہ پورا کرے گی۔''[1]

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''میں ایسے کسی عمل کو نہیں چھوڑ سکتا جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی زندگی میں کرتے رہے ہوں۔ میں ایسا ہر عمل ضرور کروں گا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا کرتے تھے، مجھے ڈر ہے کہ اگر میں نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی بھی عمل چھوڑ دیا تو میں حق سے منحرف ہو جاؤں گا۔''[2]

ام المؤمنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں: ''جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا گئے تو ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں اپنی وراثت طلب کرنے کے لیے بھیجنا چاہا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان سے کہا: کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا:

''ہمارا کوئی مالی وارث نہیں ہوتا، جو مال ہم چھوڑ جائیں وہ صدقہ ہے۔''[3]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''میرے ورثاء ایک دینار بھی تقسیم نہیں کریں گے، میری بیویوں کے نفقے اور عُمّال کے وظیفے کے بعد جو مال بچ جائے وہ صدقہ ہے۔''[4]

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو وراثت نہیں دی تو اِس کی وجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اِسی مذکورہ سابقہ فرمان کی پیروی تھی، اِسی لیے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا:

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٧٢٦)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٠٩٣)

[3] حوالۂ سابقه (٦٧٢٦)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٧٢٩)

''میں کوئی ایسا کام کبھی ترک نہیں کروں گا جو رسول اللہ ﷺ کیا کرتے تھے بلکہ میں اُس پر ضرور عمل کروں گا۔''[1]

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یہ بھی فرمایا تھا:

''اللہ کی قسم! میں کوئی ایسی بات باقی نہیں رہنے دوں گا جسے میں نے رسول اللہ ﷺ کو کرتے دیکھا ہے، وہی کام میں بھی ضرور کروں گا۔''[2]

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اس فرمانِ نبوی ﷺ کو سننے کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے اپنی ناراضی ختم کر دی تھی۔ اِس میں یہ دلیل ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ کا فرمان سن کر سرِتسلیم خم کر دیا تھا اورحق بات کوقبول کر لیا تھا۔

جن راویوں نے یہ بات نقل کی ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اِسی مسئلے کی بنا پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے ناراض ہوگئی تھیں اور فوت ہونے تک حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے قطع کلامی جاری رکھی تھی، یہ بات متعدد دلائل کی بنا پر صحیح نہیں ہے۔ ان دلائل میں سے چند درجِ ذیل ہیں:

❀ امام بیہقی نے امام شعبی رحمہ اللہ سے بیان کیا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی تیمار داری کے لیے گئے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے کہا: ''حضرت ابوبکر (رضی اللہ عنہ) تیمارداری کی اجازت چاہتے ہیں۔'' حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ''کیا آپ انھیں اجازت دینا پسند کرتے ہیں؟'' حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ''کیوں نہیں!'' تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے انھیں اندر آنے کی اجازت دے دی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اندر تشریف لائے اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی ناراضی دور کرنے کی کوشش کرتے رہے حتیٰ کہ وہ راضی ہوگئیں۔[3]

اس روایت سے یہ اشکال دُور ہو جاتا ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے وفات تک حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے قطع کلامی کی تھی۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے جبکہ خود حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی نے فرمایا:

''اللہ کی قسم! مجھے اپنی قرابت داری کی نسبت رسول اللہ ﷺ کے قرابت داروں کے ساتھ

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٠٩٣)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٦ ٦٧)

[3] السنن الكبرىٰ للبيهقي (٦/ ٣٠١) یہ روایت **مرسل** ہے۔ أباطيل يجب ان تمحىٰ من از تاريخ للدكتور إبراهيم على (ص: ١٠٩)

صلہ رحمی کرنا زیادہ محبوب ہے۔"[1]

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اہلِ بیت کے ساتھ نہایت محبت و احترام کا رشتہ استوار رکھا جو طرفین کے شایانِ شان تھا۔ الفت و محبت کا اظہار دونوں طرف سے ہوتا رہتا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک بیٹے کا نام ابوبکر رضی اللہ عنہ رکھا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد اُن کے بیٹے محمد رضی اللہ عنہ کی پرورش اپنے ذمے لے لی۔ پھر اپنی خلافت میں انھیں امیر بھی بنایا تھا حتیٰ کہ ان کی وجہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو لوگوں کی تنقید کا سامنا بھی کرنا پڑا۔[2]

لشکرِ اسامہ رضی اللہ عنہ کی روانگی:

۱۱ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلقاء اور فلسطین کے علاقوں میں رومیوں کے ساتھ جنگ کا اعلان کیا۔ اس لشکر میں کبار مہاجرین اور انصاری صحابہ رضی اللہ عنہم شامل تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لشکر کا امیر حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو مقرر کیا۔[3]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے لشکر کی تیاری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے دو دن پہلے ہفتے کے روز ہوئی تھی، جبکہ اس لشکر کی تشکیل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیمار ہونے سے پہلے ہی شروع ہوچکی تھی، چنانچہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم رومیوں کے خلاف معرکہ آرائی کے لیے ماہِ صفر کے آخر میں جمع ہونے لگے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو بلایا اور فرمایا:

"اپنے والد کی جائے شہادت کی طرف جاؤ اور ان کافروں کو اپنے گھوڑوں کے سموں تلے روند ڈالو۔ میں نے تمھیں اس لشکر کا قائد مقرر کر دیا ہے۔"[4]

کچھ لوگوں نے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کی امارت پر تنقید کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے اعتراضات مسترد کرتے ہوئے فرمایا:

"اگر تم اِس کی قیادت پر مُعترض ہو تو تم اِس سے پہلے اِس کے والد کی قیادت پر بھی اعتراض کر چکے ہو، اللہ کی قسم! وہ قیادت کا اہل تھا اور وہ میرے محبوب لوگوں میں سے تھا۔ اور اُس کے

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٠٣٦)
[2] المرتضىٰ لأبي الحسن الندوي (ص: ٩٨)
[3] لشکرِ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کی روانگی للدکتور فضل الٰہی (ص: ٨)
[4] فتح الباري (٨/ ١٥٢)

بعد اسامہ (رضی اللہ عنہ) بھی میرے محبوب لوگوں میں سے ہے۔‘‘[1]

اس لشکر کی تیاری کی ابتداء کے دو دن بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم شدید بیمار ہو گئے، اس لیے یہ لشکر روانہ نہ ہو سکا، بلکہ جُرف (جُرف: مدینہ منورہ سے تین میل کے فاصلے پر شام کی جانب ایک مقام ہے۔) کے مقام پر رُک گیا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مدینہ منورہ لوٹ آیا۔[2]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جب خلیفہ بنے تو خلافت سنبھالنے کے بعد انھوں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ لشکرِ اسامہ رضی اللہ عنہ کو اُس کی منزل کی طرف روانہ کر دیا۔ اور یہ اعلان کرایا کہ ’’خبر دار! لشکرِ اسامہ رضی اللہ عنہ کا کوئی سپاہی آج رات مدینہ منورہ میں نہ گزارے بلکہ وہ جُرف پہنچ کر اپنے مُعسکر میں حاضر ہو جائے۔‘‘[3]

لوگوں نے مشورہ دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مدینہ کے حالات پُر خطر ہیں اور فوج کی مدینہ میں سخت ضرورت ہے، اس لیے فی الحال یہ لشکر نہ ارسال کریں، مگر آپ نے یہ مشورہ مسترد کر دیا اور فرمایا: ابو قحافہ رضی اللہ عنہ کے بیٹے کی یہ مجال کہاں کہ جس لشکر کو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے روانگی کا حکم دیا ہو، اسے وہ روک دے۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

’’اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں ابوبکر (رضی اللہ عنہ) کی جان ہے! اگر مجھے یہ یقین ہو جائے کہ درندے مجھے اچک لیں گے تو میں پھر بھی لشکرِ اسامہ رضی اللہ عنہ ضرور روانہ کروں گا جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا تھا۔ اگر میں مدینہ منورہ میں تن تنہا بھی رہ گیا تب بھی میں لشکر بھیج کر رہوں گا۔‘‘

انصاری صحابہ رضی اللہ عنہم نے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کی جگہ بڑی عمر کے کسی تجربہ کار صحابی کو لشکر کی کمان سونپنے کا مطالبہ بھی کیا اور اس سلسلے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو گفتگو کرنے کے لیے بھیجا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حاضر ہو کر عرض کی: ’’انصاری صحابہ رضی اللہ عنہم کسی عمر رسیدہ شخص کو لشکر کا قائد بنانے کی فرمایش کر رہے ہیں۔‘‘ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ یہ کلمات سن کر فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔ انھوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ڈاڑھی پکڑ لی اور کہا:

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٦٩)

[2] السيرة النبوية الصحيحة للدكتور أكرم العمري (٢/ ٥٥٢)

[3] البداية والنهاية (٦/ ٣٠٧)

''اے عمر! تمھاری ماں تمھیں گم پائے، اسامہ (رضی اللہ عنہ) کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امیرِ لشکر مقرر کیا تھا اور تم مجھ سے یہ مطالبہ کررہے ہو کہ میں انھیں ان کے منصب سے ہٹا دوں۔''

یہ جواب لے کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ واپس پہنچے تو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے سوال کیا: ''عمر (رضی اللہ عنہ)! کیا بنا؟'' انھوں نے فرمایا: ''تمھاری مائیں تمھیں گم پائیں۔ تم چلے جاؤ، مجھے تمھاری وجہ سے خلیفۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ڈانٹ سننی پڑی۔''[1]

پھر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ لشکر کے پاس تشریف لائے اور اسے خود روانہ کیا، حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو سوار کرا کے الوداع کیا اور خود اُن کے ساتھ ساتھ پیدل چلے، جبکہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ ان کی اونٹنی کی نکیل تھامے ہوئے تھے۔ اِس پر حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے عرض کی: ''اے خلیفۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم! اللہ کی قسم! سوار ہو جائیں ورنہ میں نیچے اتر آؤں گا۔'' حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''اللہ کی قسم! تم نیچے اترو گے نہ میں سوار ہوں گا، مجھے اللہ کی راہ میں اپنے قدم غبار آلود کرنے دو، اس میں کوئی حرج نہیں۔''

پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ سے کہا: ''اگر تم میری مدد کے لیے (حضرت) عمر رضی اللہ عنہ کو چھوڑنا پسند کرو تو انھیں چھوڑ جاؤ۔'' چنانچہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے اجازت دے دی، پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے لشکریوں کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:

''اے لوگو! ٹھہرو، میں تمھیں دس نصیحتیں کرتا ہوں۔ انھیں اچھی طرح یاد کر لو! خیانت نہ کرنا، اور نہ مالِ غنیمت چرانا۔ نہ بدعہدی کرنا اور نہ لاشوں کی بے حرمتی کرنا، نہ پھل دار درخت کاٹنا اور نہ بلا ضرورت بکری، گائے اور اونٹ ذبح کرنا۔ عنقریب تم ایسے لوگوں کے پاس سے گزرو گے جو گرجا گھروں میں عبادت میں مصروف ہوں گے، اُن سے تعرّض نہ کرنا۔ تم ایسے لوگوں کے پاس جا رہے ہو جو تمھارے لیے رنگ برنگے کھانے لائیں گے۔ تم ہر کھانے سے پہلے بسم اللہ پڑھنا۔ تمھارا ایسے لوگوں سے مقابلہ ہوگا جنھوں نے اپنے سَر درمیان سے مونڈ رکھے ہوں گے اور بقیہ بالوں کی لٹوں کو پٹیوں کی مانند چھوڑ دیا ہوگا، ایسے لوگوں کو تہہِ تیغ کر دینا۔ اب اللہ

[1] الشوریٰ بین الاصالة و المعاصره لعز الدین التمیمي (ص: ٨٣)

کا نام لے کر روانہ ہو جاؤ۔‘‘[1]

سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:

’’رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل کرنا، جنگ کی ابتداء بلادِ قُضاعہ سے کرنا، پھر آبل[2] پر حملہ آور ہونا لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی حکم میں ذرہ بھر کوتاہی نہ کرنا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سے پیچھے مت ہٹنا۔‘‘

حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کا لشکر چلا گیا۔ اہلِ لشکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق قُضاعہ کے قبائل پر حملہ آوار ہوئے، آبل فتح کیا اور غنیمت و فتح کے ساتھ سرخرو ہو کر لوٹے۔‘‘[3] ان کا یہ حملہ چالیس روزہ تھا، یعنی روانگی، کارروائی اور واپسی چالیس دنوں میں مکمل ہوئی۔[4]

اِس لشکر کو بہت سی کامیابیاں نصیب ہوئیں۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ کا قاتل اِس مہم میں قتل ہوا، اور مسلمان فوج بہت سا مالِ غنیمت لے کر مدینہ لوٹی۔ اردگرد کے لوگوں پر نہایت عمدہ اثر ہوا کہ مسلمان اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بھی حسبِ سابق پُرعزم ہیں۔ اُدھر عرب قبائل کہنے لگے: ’’اگر مسلمانوں کے پاس اتنی قوت نہ ہوتی تو وہ اس لشکر کو (مدینہ منورہ سے دور) روانہ نہ کر دیتے۔‘‘ چنانچہ وہ اپنے بہت سے منفی منصوبوں پر عمل درآمد سے باز آ گئے۔[5]

حالات کی سنگینی کے باوجود دینی فرائض کی بجا آوری:

حالات کتنے سنگین اور خطرناک تھے؟ واقعات کتنی تیزی سے پلٹا کھا رہے تھے! پاک ہے وہ ذات باری تعالیٰ جو حالات کو جس طرح چاہتی ہے تبدیل کر دیتی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

﴿ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ ﴾ [البروج: ١٦] ’’وہ جو چاہے کر گزرتا ہے۔‘‘

اور ایک ارشادِ گرامی ہے:

﴿ لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُونَ ﴾ [الأنبياء: ٢٣]

[1] تاريخ الطبري (٤/ ٤٦)

[2] آبل: موجودہ اردن کے جنوب میں واقع ہے۔

[3] تاريخ الطبري (٤/ ٤٧)

[4] تاريخ الطبري (٤/ ٤٧) تاريخ خليفه بن خياط (ص: ١٠١)

[5] لشکرِ اسامہ رضی اللہ عنہ کی روانگی للدکتور فضل الٰہی (ص: ١٤) الكامل في التاريخ لابن الأثير (٢/ ٢٢٧)

''وہ جو کرتا ہے اُس کی بابت اس سے سوال نہیں کیا جا سکتا، جبکہ ان (لوگوں) سے باز پرس ہوگی۔''

ایک وقت ایسا تھا کہ عرب قبائل کے وفد جوق در جوق نہایت فرما نبرداری اور اطاعت شعاری کے ساتھ مدینہ منورہ آنے شروع ہو گئے تھے، حتیٰ کہ ۹ھ کو ''عام الوفود'' کہا جانے لگا، پھر حالات نے پلٹا کھایا تو یہ ڈر پیدا ہو گیا کہ کہیں عرب مرتدین، مسلمانوں کے دار الخلافہ مدینہ منورہ پر قابض نہ ہو جائیں، جبکہ انھوں نے اپنے گمان کے مطابق اسلام اور مسلمانوں کو مٹانے کے لیے یلغار بھی کی۔[1]

اِس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ سابقہ امتوں میں اللہ تعالیٰ کا یہی طریقہ رائج رہا ہے۔ حالات یکساں موافق نہیں رہتے بلکہ تبدیل ہوتے رہتے ہیں اور حالات کو تبدیل کرنے والے رب العالمین نے خود خبر دی ہے کہ وہ حالات بدلتا رہتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ﴾ [آل عمران: ١٤٠]

''اور ہم اِن دنوں کو لوگوں میں ادل بدل کرتے رہتے ہیں۔''

لشکرِ اسامہ رضی اللہ عنہ کی روانگی سے ایک اہم ترین سبق یہ ملتا ہے کہ مسلمان دینِ حنیف کی دعوت و تبلیغ کے لیے سازگار فضا یا کسی خاص موسم کے پابند نہیں۔ بہار ہو یا خزاں، خوشی ہو یا غم، انھیں ہر حال میں اللہ اور اُس کے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرنی چاہیے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام پر سختی سے کار بند ہیں اور وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات کی پوری تعمیل کرتے رہیں گے، چاہے حالات کیسے ہی ناساز اور پُر خطر کیوں نہ ہوں۔ اس طرح انھوں نے اپنے دلیرانہ موقف سے اللہ تعالیٰ کے اِس ارشاد کی عملی تفسیر پیش کی:

﴿ وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ۗ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ﴾ [الأحزاب: ٣٦]

''اور کسی مومن مرد اور مومن عورت کو یہ حق حاصل نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملے میں فیصلہ کر دیں تو اُن کے لیے اپنے معاملے میں ان کا کوئی اختیار (باقی) رہے۔ اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے تو وہ یقیناً کھلی گمراہی میں جا پڑا۔''

❁ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اتباعِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا اہتمام حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو روانہ کرتے وقت بھی کیا۔

---

[1] لشکرِ اسامہ رضی اللہ عنہ کی روانگی للدکتور فضل الٰہی (ص: ١٨)

آپ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ پیدل چلتے رہے، جبکہ وہ سوار تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے اس عمل سے رسولِ اکرم سید الاوّلین والآخرین صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کا نمونہ دکھلا دیا، کیونکہ رسول اللہ بھی حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو یمن بھیجتے وقت ان کی سواری کے ساتھ پیدل چلے تھے۔

اختلاف کی صورت میں کتاب وسنت کی طرف رجوع:

اس واقعے سے ایک اہم سبق یہ بھی ملتا ہے کہ بعض اوقات سچے مومنوں میں بھی اختلاف ہو جاتا ہے جیسا کہ مدینہ منورہ کے پُر خطر حالات میں حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے لشکر کی روانگی کے بارے میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی آراء مختلف ہوگئی تھیں اور لشکر کی کمانڈر کے بارے میں بھی مختلف اقوال سامنے آگئے تھے لیکن یہ اختلاف محض اختلاف ہی تھا جو مبنی بر اخلاص تھا۔ اس میں کسی طرح کے بُغض، دشمنی، مخالفت برائے مخالفت، لڑائی اور قطع تعلقی کو دخل نہ تھا۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس اختلاف کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی روشنی میں حل کر دیا اور اپنا عزم بھی ظاہر کر دیا کہ وہ سنگین ترین حالات کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم میں کسی صورت کوئی تبدیلی گوارا نہیں کریں گے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ تمام صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی حکمِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ لشکرِ اسامہ رضی اللہ عنہ کے روانہ ہو جانے سے ہمیں سبق ملتا ہے کہ اکثریت کا کسی رائے کی تائید کرنا اس کے صحیح ہونے کی دلیل نہیں۔

مرتدین کے خلاف حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا جہاد:

ارتداد کے اسباب اور اس کی مختلف اقسام: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بعض عرب قبائل کے مرتد ہو جانے کے کئی اسباب ہیں، مثلاً: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا صدمہ، کمزور دینی حالت اور شریعت کی کم فہمی، جاہلیت کا شوق، اس کی تباہ کن برائیوں کا ارتکاب، نظامِ دین سے خروج اور اسلامی نظام سے بغاوت، قبائلی عصبیّت، بادشاہی کا لالچ، دین کے بدلے دنیوی فوائد کا حصول، مالی بخیلی، باہمی حسد اور غیر اسلامی تحریکوں، مثلاً: یہودی، عیسائی اور مجوسی تحریکوں کے اثرات وغیرہ۔[2]

ارتداد کی اقسام متعدد تھیں: کچھ وہ تھے جنھوں نے مکمل طور پر اسلام ترک کر دیا اور بت پرستی کی

[1] لشکرِ اسامہ رضی اللہ عنہ کی روانگی للدکتور فضل الٰہی (ص: ۴۶)

[2] حرکة الردة للدكتور علي العتوم (ص: ۱۱۰۔ ۱۳۷)

طرف لوٹ گئے۔ کچھ نے نبوت کا دعویٰ کر دیا تھا۔ کچھ نے نماز ترک کرنے کی دعوت دی۔ کچھ ایسے بھی تھے جو اسلام پر قائم رہے، نماز ادا کرتے تھے لیکن زکاۃ دینے سے انکاری ہو گئے۔ کچھ بدبخت، رسول اللہ ﷺ کی وفات پر خوشی سے پھولے نہ سمائے۔ انھوں نے دوبارہ جاہلیت کے طور طریقے شروع کر دیے۔ کچھ حیران و پریشان تھے، کچھ اس انتظار میں بیٹھے تھے کہ فتح کس گروہ کی ہوتی ہے تاکہ وہ غالب جماعت سے جا ملیں۔ علمائے فقہ و سیرت نے ان سب کی وضاحت کی ہے۔[1]

امام خطابی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''مرتدین کی دو اقسام تھیں۔ ایک قسم وہ تھی جس نے دینِ اسلام سے مکمل لاتعلقی اختیار کر کے دوبارہ کفر اپنا لیا۔ یہ قسم پھر دو گروہوں میں بٹ گئی۔ ایک گروہ بنو حنیفہ قبیلے کا تھا جس نے مسیلمہ کذّاب کے دعوائے نبوت کی تصدیق کی اور اس کا پیروکار ہو گیا۔ اسی گروہ میں سے اہلِ یمن ہیں جو اسوَد عنسی کے پیروکار تھے۔ یہ گروہ نبیِ مکرّم حضرت محمد ﷺ کی نبوت کے منکر اور جھوٹے نبیوں کی نبوت کے اقراری تھے۔ دوسرا گروہ ان لوگوں کا تھا جنھوں نے شریعتِ اسلامیہ کا انکار کر دیا۔ نماز کے اقراری اور زکاۃ کے انکاری تھے۔ ان میں ایسے لوگ بھی شامل تھے جو زکاۃ ادا کرنا چاہتے تھے لیکن ان کے سرداروں نے انھیں زکاۃ دینے سے زبردستی روک دیا تھا۔''[2]

مرتدین کے بارے میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا موقف:

جب فتنۂ ارتداد برپا ہو گیا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ لوگوں کو خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے۔ آپ نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء بیان کی اور فرمایا:

''سب تعریفیں اُس اللہ کے لیے ہیں جس نے ہمیں ہدایت سے نوازا اور کافی ہو گیا۔ اس نے عطا کیا تو غنی کر دیا۔ بے شک علم غیر مانوس اور دین دھتکارے ہوئے مسافر کی طرح ہو چکا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کو معبوث فرمایا۔ قبل از بعثت حالت یہ تھی کہ دین کی رسی بوسیدہ ہو چکی تھی۔ اس کے ماننے والے اس سے دور جا چکے تھے۔ اس کا عہد پرانا ہو چکا تھا۔

[1] حركة الردة للدكتور علي العتوم (ص: ٢٠)

[2] شرح صحيح مسلم للنووي (١/ ٢٠٢، ٢٠٣)

اللہ تعالیٰ اہلِ کتاب سے ناراض تھا، لہٰذا وہ اُن کی کسی نیکی کی وجہ سے انھیں بھلائی نہیں پہنچاتا تھا اور ان میں موجود کسی برائی کی وجہ سے ان کی مصیبت دور نہیں کرتا تھا۔ انھوں نے اپنی کتابوں میں تحریف کردی تھی۔ ان میں اپنی طرف سے اضافے کر دیے تھے۔ عرب بے خوف تھے۔ ان کا خیال تھا کہ انھیں حفاظتِ الٰہی حاصل ہے، حالانکہ وہ اس کی عبادت کرتے تھے نہ اس سے التجائیں کرتے تھے، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ان کی گزران تنگ کردی، انھیں تنگ سالی میں مبتلا کر دیا اوران کی زمینیں بنجر بنادیں۔

پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کے ذریعے سے ان کے سرکشوں کو ختم کر دیا اور انھیں بہترین امت بنایا۔ ان کی مدد کی اور انھیں ان کے مخالفین پر فتح دی۔ حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم ﷺ کو اٹھا لیا تو شیطان اپنی سواری پر پھر سوار ہو کر ان پر اترا اور ان کے ہاتھ پکڑ کر انھیں ہلاک کرنا چاہا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۚ أَفَإِنْ مَاتَ أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ ۚ وَمَنْ يَنْقَلِبْ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَضُرَّ اللَّهَ شَيْئًا ۗ وَسَيَجْزِي اللَّهُ الشَّاكِرِينَ ﴾

[آل عمران: ١٤٤]

’’اور محمد ایک رسول ہی تو ہیں، ان سے پہلے بہت سارے رسول گزر چکے ہیں، اگر ان کا انتقال ہو جائے یا شہید ہو جائیں تو کیا تم اسلام سے اپنی ایڑیوں کے بل پھر جاؤ گے؟ اور جو کوئی اپنی ایڑیوں کے بل پھر جائے تو وہ اللہ کا کچھ بھی بگاڑ نہ سکے گا اور اللہ شکر کرنے والوں کو اچھی جزاء دے گا۔‘‘

نیز فرمایا:

﴿ وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا ۚ يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا ۚ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ﴾ [النور: ٥٥]

’’جو تم میں سے ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے، اللہ نے ان لوگوں سے وعدہ کیا ہے کہ وہ انھیں زمین میں ضرور خلافت دے گا۔ جیسے اس نے ان سے پہلے لوگوں کو خلافت دی تھی اور ان کے لیے ضرور ان کا وہ دین جمادے گا جو اس نے ان کے لیے چنا اور یقیناً ان کی

حالتِ خوف کو بدل کر وہ ضرور انھیں امن دے گا، وہ میری عبادت کریں گے، میرے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے اور جو کوئی اس کے بعد کفر کرے تو وہی لوگ فاسق ہیں۔‘‘[1]

کچھ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے جن میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی تھے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو مشورہ دیا کہ وہ فی الحال مانعینِ زکاۃ کے خلاف جہاد نہ کریں بلکہ ان کی تالیفِ قلبی کریں حتیٰ کہ ایمان ان کے دلوں میں راسخ ہو جائے اور وہ خود بخود زکاۃ ادا کرنے لگیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس رائے کو سختی سے مسترد کر دیا۔[2]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا گئے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو کچھ عرب قبائل مرتد ہو گئے۔ اس موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہا: آپ ان لوگ سے کیسے جنگ کریں گے، جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا:

’’مجھے لوگوں سے لڑائی کرنے کا حکم دیا گیا ہے جب تک کہ وہ لا الٰہ الاّ اللہ نہ کہہ لیں۔ پس جس شخص نے لا الٰہ الاّ اللہ کہہ لیا تو اس نے مجھ سے اپنا مال و جان محفوظ کر لیا، سوائے اسلام کے حق کے اور اس شخص کا حساب اللہ کے ذمے ہے۔‘‘

اس پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

’’اللہ کی قسم! میں اُس شخص سے ضرور جنگ کروں گا جو نماز اور زکاۃ میں فرق کرے گا کیونکہ زکاۃ مالی حق ہے۔ اللہ کی قسم! اگر انھوں نے مجھے بکری کا وہ میمنا دینے سے بھی انکار کیا جو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ادا کرتے تھے تو میں اس پر بھی اُن سے جنگ کروں گا۔‘‘

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

’’اللہ کی قسم! اللہ تعالیٰ نے مانعینِ زکاۃ سے جنگ کے بارے میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا سینہ کھول دیا تھا، پھر مجھے یقین ہو گیا کہ حق بات یہی ہے۔‘‘[3]

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی گہری اسلام فہمی، شدید غیرتِ دینی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منہج سے مضبوط وابستگی اُن کے ایک جملے سے عیاں ہے جو اُن کے دل کی گہرائیوں سے نکلا اور ان کی زبان سے ادا

[1] البداية والنهاية (٦/٣١٦)

[2] البداية والنهاية (٦/ ٣١٥)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٩٢٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٠) البداية و النهاية (٦/ ٣١٥)

ہوا۔ ان کا یہ ایک جملہ بڑے سے بڑے طویل و بلیغ خطاب اور ایک مفصل کتاب پر بھاری ہے۔ اس جملے سے مراد اُن کا وہ ارشاد ہے جو انھوں نے اس وقت کہا جب مختلف قبائل نے زکاۃ کی ادائیگی بند کردی تھی یا اس کی فرضیت ہی کے منکر ہو گئے تھے تو آپ نے فرمایا تھا:

''وحی کا سلسلہ منقطع ہو چکا۔ دینِ حنیف مکمل ہو گیا۔ کیا اب میری زندگی میں اس دین میں کمی کی جائے گی؟ (یہ ناممکن ہے)۔''[1]

ایک روایت میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی: ''اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ! لوگوں کی تالیفِ قلبی کا سامان کریں اور ان سے نرمی سے پیش آئیں۔'' تو انھوں نے کہا:

''تم جاہلیت میں بڑے زور آور تھے، اب اسلام لانے کے بعد بزدل ہو گئے ہو؟ یقیناً وحی منقطع ہو گئی ہے۔ دین مکمل ہو چکا ہے۔ کیا اس میں میری زندگی ہی میں کمی کی جائے گی؟ (ہرگز ممکن نہیں)۔''[2]

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مرتدین سے جنگ کے لیے تمام صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا موقف غور سے سنا۔ پھر اپنا نقطۂ نظر وضاحت سے پیش کیا اور ان سے جنگ کرنے پر تُل گئے۔ انھوں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر ایک مضبوط فیصلہ کرلیا، پھر اس پر کار بند ہو گئے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنے احباب میں سے سب سے بڑھ کر صاحبِ بصیرت تھے۔ وہ اپنے محکم ایمان کی بدولت یہ نکتہ سمجھ گئے کہ زکاۃ کا حکم شہادتَین کے حکم سے جدا نہیں ہوسکتا، لہٰذا ہر وہ شخص جو اللہ کی وحدانیّت کا قرار کرے، اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا مقرر کردہ مالی حق ''زکاۃ'' بھی ادا کرے، کیوں کہ مال دراصل اللہ تعالیٰ کا حق ہے اور زکاۃ ادا کیے بغیر لا الٰہ الاّ اللہ کا کوئی وزن اور وقعت نہیں رہتی۔ زکاۃ کی وصولی کے لیے تلوار اٹھانا اُسی طرح مشروع ہے جس طرح لا الٰہ الاّ اللہ کے دفاع کے لیے تلوار اٹھانا مشروع ہے۔ یہ دونوں فرائض برابر ہیں۔ یہی عین اسلام ہے۔ اس کے برعکس رائے اسلام کے خلاف ہے۔[3]

---

[1] المرتضىٰ لأبي الحسن الندوي (ص: ۷۰)

[2] دلائل النبوة للبيهقي (۲/ ۴۷۷) إحياء علوم الدين للغزالي (۳/ ۳۷۵)

[3] حياة ابى بكر لمحمود شلبى (ص: ۱۲۳)

کتابُ اللہ کے ایک حکم پر عمل کرنے اور دوسرے کو ترک کر دینے والوں کو اللہ تعالیٰ نے شدید وعید سنائی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ۗ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴾ [البقرة: ٨٥]

''کیا تم کتاب کے ایک حصے پر ایمان لاتے ہو اور دوسرے حصے کا انکار کرتے ہو؟ پھر تم میں سے جو شخص یہ کام کرے گا، اُس کی سزا اس کے سوا کوئی نہیں کہ رسوائی ہو دنیوی زندگی میں، اور قیامت کے دن وہ سخت ترین عذاب کی طرف دھکیلے جائیں گے۔ اور تم جو عمل کرتے ہو اللہ اس سے غافل نہیں ہے۔''

مدینہ منورہ کی حفاظت کے لیے حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کی منصوبہ بندی:

زکاۃ ادا نہ کرنے والے بعض قبائل کے وفود حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انھوں نے کوشش کی کہ آپ ان سے زکاۃ کی وصولی سے دست بردار ہو جائیں لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنے موقف پر ڈٹ گئے۔ ان کے اٹل موقف کو دیکھنے کے بعد وہ لوگ واپس چلے گئے اور ان دو نتائج پر پہنچے:

- زکاۃ کی عدم ادائیگی پر کسی قسم کے مذاکرات کی کوئی گنجایش نہیں۔ اسلام کا حکم بالکل واضح ہے، اس لیے خلیفۃ المسلمین کی رائے میں بھی کسی لچک کی امید نہیں، خصوصاً اس حالت میں کہ مسلمانوں نے بھی مدلل وضاحت کے بعد ان کا بھرپور ساتھ دیا ہے۔
- مدینہ منورہ میں مسلمانوں کی قلیل تعداد ہے۔ اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اہلِ مدینہ پر ایک تباہ کن حملہ کرنا ضروری ہے تاکہ اسلامی حکومت اور اسلام کا خاتمہ کیا جا سکے۔[1]

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اس قوم کی غداری کو بھانپ گئے۔ انھوں نے ان کی رذالت و کمینگی کو دیکھتے ہوئے اپنے ساتھیوں سے کہا:

''بے شک ان کا علاقہ کافر ہو چکا ہے۔ ان کے وفد نے تمھاری کم تعداد نوٹ کر لی ہے۔ اب معلوم نہیں کہ یہ رات کو حملہ آور ہوتے ہیں یا دن کو؟ ان کافروں کا قریب ترین لشکر تم سے

[1] تاريخ دعوة الإسلام للدكتور يسرى محمد هاني (ص: ٢٨٠)

صرف ایک برید (۲۲ کلومیٹر) کی مسافت پر ہے۔ ان لوگوں کو امید تھی کہ ہم ان کا موقف تسلیم کرلیں گے اور ان سے صلح کرلیں گے، مگر ہم نے ان کا موقف نہیں مانا اور ان کا معاہدہ توڑ ڈالا، لہٰذا تم جنگ کی تیاری کرو۔''[1]

بعد ازاں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے درجِ ذیل منصوبہ تشکیل دیا:

- اہلِ مدینہ کو حکم دیا کہ وہ رات مسجدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں بسر کریں تاکہ دفاع کے لیے مکمل طور پر تیار رہ سکیں۔
- مدینہ منورہ کے راستوں پر سیکورٹی گارڈز مقرر کیے جو رات وہاں گزاریں اور کسی بھی حملہ آور کو روک سکیں۔
- سیکورٹی فورسز پر حضرت علی، زبیر، طلحہ، سعد بن ابی وقاص، عبد الرحمٰن بن عوف اور عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم کو علاحدہ علاحدہ امیر مقرر کیا۔
- مدینہ منورہ کے اردگرد کے وہ قبائل جو اسلام پر ثابت قدم رہے تھے، انھیں پیغام بھیجا کہ وہ مدینہ منورہ کے دفاع اور مرتدین کے ساتھ جہاد کے لیے مدد بھیجیں، چنانچہ ان کے اس پیغام پر اسلم، غفار، مُزَینہ، اشجع، جُہینہ اور کعب قبیلے نے لبیک کہا حتیٰ کہ ان قبائل کے مجاہدین سے مدینہ منورہ بھر گیا۔ یہ مجاہدین اپنے ساتھ بہت سے اونٹ اور گھوڑے بھی لائے تھے جو انھوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو سونپ دیے۔ ان قبائل کی کثیر تعداد اور بھاری رسد کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ اکیلے جُہینہ قبیلے نے ۴۰۰ مجاہدین گھوڑوں اور اونٹوں کی رسد سمیت مہیا کیے۔ حضرت عَمرو بن مُرہ رضی اللہ عنہ مسلمانوں کی مدد کے لیے ۱۰۰ اونٹ لے کر حاضر ہوئے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یہ اونٹ مسلمانوں میں تقسیم کر دیے۔[2]
- جو مرتدین مدینہ منورہ سے دور تھے اور ان کا فوری خطرہ نہ تھا، ان کے بارے میں یہ طریقِ عمل اختیار کیا گیا کہ اُن علاقوں کے مسلمان امراء کو خطوط لکھے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمولِ مبارک تھا۔
- وہ قبائل جو مدینہ منورہ کے قریب تھے اور ان کا خطرہ بھی فوری اور شدید تھا جیسے بنی عبس اور ذبیان تو اُن کے ساتھ جنگ کیے بغیر کوئی چارہ نہ تھا، اگر چہ مدینۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات سخت ناسازگار تھے، آپ نے مرتدین کے اچانک حملے سے بچاؤ کے لیے عورتوں اور بچوں کو قلعوں اور پہاڑوں کی

[1] تاريخ الطبري (٤/ ٤٦)

[2] الثابتون على الإسلام ايام فتنة الردة للدكتور مهدى رزق الله (ص: ٢١)

گھاٹیوں میں پناہ گزین کر دیا اور خود اپنے لشکر سمیت مرتدین کے ساتھ جنگ کے لیے تیار ہو گئے۔[1]

مرتدین نے خیال کیا کہ مسلمان اس وقت کمزور ہیں، لہٰذا انھوں نے ذی القصہ والوں کو بھی اطلاع بھیج دی۔ وہ ان کی اطلاع پر اعتماد کرتے ہوئے آ گئے۔ جبکہ وہ اللہ کے اُس حکم کے بارے میں شعور ہی نہ رکھتے تھے جس کا اس نے ارادہ کیا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ اُسے ان میں پہنچا کرنا فذ کر دے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ رات بھر جنگ کی تیاری کرتے رہے، لوگوں کو جنگ کے لیے تیار کیا، پھر مکمل تیار ہو کر رات کے آخری حصے میں دشمن کی طرف چل پڑے۔

سورج کی کرنیں طلوع ہونے سے پہلے ہی وہ شکست کھا کر بھاگ نکلے۔ مسلمانوں نے ان کے اکثر اونٹ قبضے میں کر لیے۔ حضرت طُلَیحہ اسدی رضی اللہ عنہ کا بھائی حبال قتل ہو گیا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ذی القصہ تک ان کا پیچھا کیا۔ اس طرح مرتدین کے خلاف مسلمانوں کو یہ پہلی فتح حاصل ہوئی۔

یوں مشرکین کو بڑی ذلت ورسوائی کا سامنا کرنا پڑا۔ اور اس فتح سے بقیہ قبائل میں موجود مسلمانوں کو اپنے دین پر ثابت قدم رہنے کا حوصلہ ملا اور مشرکین کو ذلت ورسوائی اور پسپائی کا سامنا کرنا پڑا۔ پھر مختلف قبائل کی زکاۃ مدینہ منورہ پہنچنی شروع ہو گئی۔

حتیٰ کہ ایک ہی رات میں چھے قبائل کی زکاۃ مدینہ منورہ پہنچی۔ جب بھی کوئی زکاۃ کا تحصیل دار مدینہ منورہ آتا تو لوگ کہنے لگتے: ''یہ کسی حملے سے ڈرانے والا ہے۔'' لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ فرماتے:

''بَلْ بَشِيرٌ''، ''نہیں۔ یہ خوش خبری دینے والا ہے۔''

واقعتاً لوگ دیکھتے کہ آنے والا اپنی قوم کے صدقات وزکاۃ لے کر حاضر ہوتا، پھر لوگ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے عرض کرتے: ''آپ ہمیں بکثرت خوشخبریاں سناتے ہیں۔''[2]

مرتدین سے لڑائی میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی شخصیت کے اصلی جوہر خوب کھلے۔ آپ امتِ مسلمہ کے ایک ایسے نڈر لیڈر کی حیثیت سے سامنے آئے جو اپنی قوم و دینِ اسلام کے لیے جان فداء کر دیتا ہے، چنانچہ مسلمانوں کے نزدیک خلیفہ اور قائد وہی ہوسکتا ہے جو اپنے اعمال میں ان کے لیے مثالی نمونہ ہو۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے اس اسلوبِ سیاست کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان دشمنوں سے جنگ کے لیے دلیر ہو

---

[1] حركة الردة للدكتور علي العتوم (ص: ١٧٤)

[2] تاريخ الطبري (٤/ ٦٧)

گئے اور اپنے قائد کے احکام و ہدایات کی پوری مستعدی سے تعمیل کرنے لگے۔[1]

مسلمانوں نے حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کی سیرت سے یہ سبق سیکھا کہ ان کا جلیل القدر خلیفہ وامیر دین ودنیا کے کسی معاملے میں اپنی جان کو ان کی جانوں پر ترجیح نہیں دیتا بلکہ سب کے ساتھ یکساں طور پر برابر رہنا ہی پسند کرتا ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا بنفسِ نفیس تین بار مسلسل جہاد کے لیے نکلنا ایک عظیم قربانی اور جان نثاری کی شاندار مثال ہے۔ مسلمانوں نے انھیں قسم دے کر مدینہ منورہ میں روکنا چاہا اور عرض کی کہ وہ کسی اور شخص کو لشکر کا قائد بنا کر بھیج دیں لیکن انھوں نے ان کی رائے قبول نہ کی اور فرمایا:

''اللہ کی قسم! میں تمھاری یہ بات نہیں مانوں گا بلکہ میں اپنی ذات کو تمھارے شانہ بشانہ ہی رکھوں گا۔''

یہ کلمات آپ کی تواضع اور مسلمانوں کے مفاد و مصلحت کے عظیم اہتمام کی دلیل ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ اپنے آپ کو دوسروں پر ترجیح نہیں دیتے تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے فرمایا:

''غارِ ثور والی رات کے بعد کسی قسم کا کوئی رعب ود بدبہ میرے دل پر کبھی طاری نہیں ہوا کیونکہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ملال دیکھا تو فرمایا: ''ابوبکر! پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، بے شک اللہ تعالیٰ نے ہمارے معاملے کی تکمیل کا ذمہ لیا ہے۔''[2]

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے امرائے لشکر کے تقرر کے بعد جو عمومی جنگی منصوبہ تشکیل دیا تھا، اس جنگی منصوبے میں سارے لشکریوں کے درمیان تعاون کے احکام موجود تھے تاکہ کوئی لشکر خود کو جدا اور علاحدہ مستقل قیادت کے ماتحت خیال نہ کرے بلکہ وہ جغرافیائی اعتبار سے دور ہونے کے باوجود اپنے آپ کو ایک ہی مرکزی نظام کے ماتحت سمجھے جو حسبِ ضرورت کبھی اکٹھے اور کبھی الگ ہو جاتے ہیں، جبکہ خلیفۃ المسلمین مدینہ منورہ میں رہتے ہوئے مرتدین کے خلاف جہادی تحریک کو کنٹرول کر رہے تھے

- حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے دار الخلافہ مدینہ منورہ کی حفاظت کے لیے خصوصی فورس مقرر کی اور باہمی مشاورت کے لیے کبار صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو مدینہ منورہ میں روک لیا تاکہ وہ ملکی امور چلانے میں ان کی مدد کریں۔

[1] حركة الردة للدكتور علي العتوم (ص: ٣١٩)

[2] أبو بكر الصديق أفضل الصحابة لمحمد بن عبد الرحمن (ص: ٦٩)

۞ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ یہ معلوم کر چکے تھے کہ مرتدین اور باغیوں کے علاقوں میں بھی مسلمان لشکر موجود ہیں، لہٰذا انھیں مشرکین کی اذیتوں سے بچانے کی فکر بھی دامن گیر تھی، اسی لیے آپ نے اپنے امراء کو حکم دیا کہ وہ جس علاقے سے گزریں وہاں کے مسلمانوں کو اپنے لشکر میں شامل کرتے جائیں، البتہ کچھ مسلمانوں کو پیچھے رہنے کی اجازت دیں تاکہ وہ اپنے علاقے والوں کو اس فتنے سے بچانے کوشش کریں اور علاقے کی حفاظت کا بندوبست کر سکیں۔

عراق فتح کے لیے صدیقی پلان:

جیسے ہی مرتدوں کے خلاف جنگ ختم ہوئی اور جزیرۂ عرب میں حالات معمول پر آئے، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان فتوحات کا آغاز کر دیا جن کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اشارہ فرما گئے تھے۔

حضرت ابوبکر نے عراق کی فتح کے لیے دو لشکر تیار کیے:

۞ ایک لشکر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی قیادت میں تیار کیا جو ان دنوں یمامہ میں تھے۔ آپ نے انھیں خط لکھا کہ وہ عراق پر جنوب مغرب کی طرف سے حملہ آور ہوں۔ آپ نے انھیں حکم دیا کہ عراق کی طرف پیش قدمی کرو۔ عراق میں داخل ہو جاؤ اور فرجِ ہند (خلیج فارس) کے ساحل کی طرف سے حملے کی ابتداء کرو جہاں ابلہ[1] آباد ہے۔

عراق میں زیریں جانب سے داخل ہونا، لوگوں کو اپنے قریب کرنا، انھیں اللہ تعالیٰ کے دین کی دعوت دینا۔ اگر وہ یہ دعوت قبول کر لیں تو بہت بہترین ورنہ ان سے جزیہ لینا۔ اگر وہ جزیہ دینے سے بھی انکار کر دیں تو ان سے جنگ کرنا۔ آپ نے انھیں یہ حکم بھی دیا کہ کسی شخص کو اپنے ساتھ لے جانے پر مجبور نہ کریں۔ مرتد ہونے والا کوئی بھی شخص، اگرچہ دوبارہ مسلمان ہو چکا ہو، اس سے کوئی مدد نہ لینا۔ راستے میں ملنے والے ہر مسلمان کو اپنے ساتھ جانے کی دعوت دینا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مختلف فرائض انجام دینے والی جہادی ٹیمیں، لشکر اور فوجی دستے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی مدد کے لیے تیار کرنا شروع کر دیے۔[2]

۞ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے دوسرا لشکر حضرت عیاض بن غنم رضی اللہ عنہ کی قیادت میں تیار کیا۔ وہ اس وقت

---

[1] ابلہ: یہ قدیم شہر خلیج فارس کے پاس شط العرب نامی دریا کے کنارہ پر واقع تھا جہاں بعد میں بصرہ آباد ہوا۔ یہاں کسریٰ کی فوجی چھاؤنی تھی۔

[2] البدایة والنهایه (٦/ ٣٤٧)

بناج[1] اور حجاز کے درمیان موجود تھے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انھیں خط لکھا کہ وہ عراق پر شمال مشرقی جانب سے مصیخ[2] نامی جگہ سے حملہ شروع کریں۔ پھر عراق کی بالائی جانب سے داخل ہو جائیں حتیٰ کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ سے جا ملیں۔

آپ نے انھیں یہ حکم بھی دیا کہ جو فوجی واپسی کی اجازت چاہتا ہوا اسے اجازت دے دینا۔ کسی کو زبردستی ساتھ مت لے جانا۔[3]

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد اور حضرت عیاض رضی اللہ عنہما کو یہ تحریری حکم بھیجا:

''حیرہ کی طرف پیش قدمی کرو، تم میں سے جو پہلے پہنچ جائے وہ اپنے ساتھی کا امیر ہوگا۔ (مزید فرمایا): ''جب تم حیرہ میں اکٹھے ہو جاؤ اور ایرانیوں کی سرحدی چوکیاں فتح کر چکو اور تمھیں عقب سے مسلمانوں پر حملے کا کوئی اندیشہ لاحق نہ رہے تو پھر تم میں سے ایک حیرہ رک جائے تاکہ وہ اپنے ساتھی اور مسلمانوں کے لیے پشت پناہ بن سکے اور دوسرا ساتھی اللہ کے دشمن ایرانیوں کے دار الحکومت مدائن پر حملہ کر دے۔''[4]

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی جغرافیائی مہارت:

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے دونوں کمانڈروں حضرت خالد اور حضرت عیاض رضی اللہ عنہما کو جو احکام دیے وہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی جغرافیائی مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ انھوں نے اپنے کمانڈروں کو عسکری، جغرافیائی اور تکنیکی معلومات مہیا کیں۔ انھوں نے ہر کمانڈر کے لیے علاقے کا تعیّن کیا کہ اسے عراق میں کہاں سے داخل ہونا چاہیے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی ان ہدایات کو دیکھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد امتِ مسلمہ کا یہ سب سے بڑا لیڈر حجاز کے ہیڈ کوارٹر میں بیٹھ کر دور دور تک دیکھ رہا تھا، اس کے سامنے عراق کا نقشہ کھلا پڑا تھا۔ اور عراق کے طول و عرض کی ہر شاہراہ پر اس کی محتاط کڑی نگاہ کام کر رہی تھی۔ اِسی جغرافیائی مہارت کو بروئے کار لا کر انھوں نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ عراق میں جنوب مغربی شہر ابلہ کے زیریں علاقے سے داخل ہوں۔ اور دوسرے کمانڈر حضرت عیاض رضی اللہ عنہ

---

[1] بناج: بصرہ کا ایک گاؤں ہے جو مکہ اور بصرہ کے راستے پر عین وسط میں واقع ہے۔

[2] مصیخ: شام کی سرحد پر عراقی جانب ایک علاقہ ہے۔

[3] الفن العسكري الإسلامي للدكتور ياسين سويد (ص: ٨٣) تاريخ الطبرى (٤/ ١٦٢)

[4] تاريخ الطبري (٤/ ١٧٣)

کوحکم دیا کہ وہ شمال مشرقی علاقے مصیخ کی بالائی جانب سے عراق میں داخل ہوں۔ اور دونوں کوحکم دیا کہ عراق کے وسط میں جمع ہو جائیں۔ اس کے ساتھ ساتھ خلیفۃ المسلمین یہ نصیحت کرنا نہیں بھولے کہ تم دونوں کسی شخص کو زبردستی اپنے لشکر میں شامل نہ کرنا۔ نہ انھیں مجبور کر کے جنگ میں شریک کرنا۔ یعنی ان کی نظر میں اس لشکر میں بھرتی لازمی نہ تھی بلکہ اپنے اختیار اور خوش دلی پر منحصر تھی۔[1]

جہاد فی سبیل اللہ میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی احتیاط:

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد اور حضرت عیاض رضی اللہ عنہما کو خط میں لکھا تھا کہ وہ ان فوجیوں کو ساتھ لے کر جائیں جو مرتدوں کے خلاف جہاد میں شرکت کر چکے تھے یا ان مسلمانوں کو ترجیح دیں جو اس فتنے میں ثابت قدم رہے تھے اور جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مرتد ہو گئے تھے، ان میں سے کسی بھی شخص کو ساتھ لے کر نہ جائیں، حتیٰ کہ میں ان کے بارے میں کوئی فیصلہ نہ کرلوں، چنانچہ ان جنگوں کی ابتداء میں کوئی سابق مرتد شریک نہ ہوسکا، البتہ جب ان کی استقامت ثابت ہوگئی تو بعد میں وہ بھی شریک ہو گئے۔[2]

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا یہ موقف بڑی احتیاط اور دور بینی پر مبنی تھا کہ جہاد فی سبیل اللہ میں کوئی ایسا آدمی شریک نہ ہونے پائے جو دنیوی مال و متاع کا خواہش مند ہو اور مجاہدین کی صفوں میں خلل ڈال کر ان کی ناکامی کا سبب بنے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یہ تربیتی سبق نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے گراں مایہ اسباق سے حاصل کیا تھا اور یہ اقدام مجاہدین کی صفوں کو ہر قسم کے شکوک اور آلودگیوں سے پاک رکھ کر صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کے لیے اٹھایا گیا تھا۔ اس طرح کی احتیاطی تدابیر سے خطرناک ناکامیوں سے بچا جاسکتا ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس شاندار اصول کی زبردست حمایت کی، حالانکہ اُس وقت افرادی قوت کی اشد ضرورت تھی۔ مرتد ہو کر دوبارہ مسلمان ہو جانے والوں سے محتاط اور بے نیاز رہنا آپ کی مکمل قناعت کی دلیل ہونے کے علاوہ قادرِ مطلق پر آپ کے ناقابلِ تسخیر ایمان کا زبردست مظاہرہ ہے۔[3]

اہلِ یمن کو جہاد کی ترغیب:

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اہلِ یمن کو خط لکھا اور انھیں جہاد فی سبیل اللہ کی یوں دعوت دی:

---

[1] الفن العسكري الإسلامي للدكتور ياسين سويد (ص: ٨٣، ٨٤)

[2] تاريخ الطبري (٤/ ١٦٣)

[3] التاريخ الإسلامي للحميدي (٩/ ١٣١)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

''خلیفۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یمن کے ہر اس مومن اور مسلم کے نام جسے یہ خط پڑھ کر سنایا جائے، السلام علیکم، میں تمھارے ساتھ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں جس کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں۔ اما بعد! بے شک اللہ تعالیٰ نے مومنوں پر جہاد فرض کیا ہے اور انھیں حکم دیا ہے کہ وہ ہلکے ہوں یا بوجھل، جہاد کے لیے نکلیں اور اپنی جان و مال کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کریں۔ جہاد اللہ کی طرف سے فرض ہے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس کا ثواب بہت عظیم الشان ہے۔ ہم نے مسلمانوں کو رومیوں سے جنگی تیاری کا حکم دیا ہے اور وہ برق رفتاری سے تیار ہو گئے ہیں۔ ان کی نیت خالص ہے اور ان کی یہ نیکی بہت عظیم ہے، لہٰذا اے اللہ کے بندو! تم بھی اپنی نیتوں کو خالص کر لو اور اس عظیم مقصد کے لیے تیزی سے تیار ہو جاؤ جس کے لیے مسلمان تیاری کر چکے ہیں۔ یقیناً تمھیں دو خوبیوں میں سے ایک ملنے والی ہے۔ یا شہادت ملے گی یا فتح اور غنیمت حاصل ہوگی۔ بے شک اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے اقوال بغیر اعمال کے قبول نہیں کرتا۔ اور جہاد اس وقت تک جاری رہے گا جب تک اللہ کے دشمن دینِ حق کو قبول نہ کر لیں اور کتاب اللہ کے فیصلے کا اقرار نہ کر لیں۔ اللہ تعالیٰ تمھارے دین کی حفاظت فرمائے، تمھارے دلوں کو ہدایت یافتہ بنائے، تمھارے اعمال کا تزکیہ کرے اور تمھیں صبر کرنے والے مجاہدین کا اجر و ثواب عطا فرمائے۔''

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے یہ خط حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے ہاتھ روانہ کیا۔ اس خط سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طرف سے مسلمانوں کو جہاد کی ترغیب دینے اور انھیں جہاد فی سبیل اللہ کے لیے اکٹھا کرنے کے کردار اور کاوشوں کا علم ہوتا ہے۔ ان کے اس عمل کو ''جنگی تیاری'' قرار دیا جا سکتا ہے۔[2]

اہلِ یمن کے نام حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے خط سے واضح ہوتا ہے کہ جہاد کے دو بنیادی مقاصد ہیں:

1. مسلمانوں کے اسلام کی تحقیق و تصدیق، کیوں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے اعمال کے بغیر محض اقوال قبول نہیں کرتا۔

---

[1] فتوح البلدان للبلاذري (ص: ٨) تهذيب تاريخ دمشق (١/ ١٢٩)

[2] تاريخ الدعوة إلى الإسلام للدكتور يسرى محمد هان (ص: ٢٩٤)

2 غیر مسلموں سے جنگ کا اصل مقصد یہ ہے کہ وہ دینِ حق قبول کرلیں اور کتاب اللہ کے قانون کے آگے سرِ تسلیم خم کردیں۔

یہی وہ سبب تھا جس نے اہلِ یمن کو یمن کے تمام اطراف واکناف سے بھاری تعداد میں اکٹھا کر کے میدانِ جہاد میں لا کھڑا کیا۔ ہمیں معلوم نہیں کہ ان میں کوئی شخص مجبوراً جہاد کے لیے نکلا ہو بلکہ یہ سب لوگ اپنی خوشی سے جہاد فی سبیل اللہ کے لیے نکلے۔ یہ تمام قبائل اپنی عورتوں اور بچوں سمیت آگئے اور یہ لوگ جہاد کے شوق اور محبت سے سرشار تھے اور باطل کے خلاف بہت تیزی سے جمع ہو جاتے تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا خط لے کر اہلِ یمن کے پاس پہنچنے والے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے جب ایک ایک قبیلے میں جاکر یہ خط پڑھ کر لوگوں کو سنایا تو ان کا طرزِ عمل بڑا ایمان افروز تھا۔ وہ فرماتے ہیں: ''میں نے جس کو بھی یہ خط پڑھ کر سنایا وہ اسے سنتے ہی بہت اچھا جواب دیتا اور کہتا:

''بس ہم چلنے ہی والے ہیں۔ یوں سمجھیے کہ ہم جہاد کے لیے نکل چکے ہیں۔''

حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کی دعوت پر ذوالکلاع حمیری رحمہ اللہ کا کردار:

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں ذوالکلاع حمیری رحمہ اللہ کے پاس پہنچا۔ انھیں خط پڑھ کر سنایا اور جہاد کی ترغیب دی تو وہ اُسی وقت اپنا گھوڑا اور اسلحہ منگوا کر سوار ہوئے اور اپنی قوم میں جہاد کا اعلان کرنے کے لیے چلے گئے۔ انھوں نے اس کام میں ذرا بھی دیر نہیں کی اور فوری طور پر معسکر قائم کرنے کا حکم دے دیا۔ ہم ابھی اُدھر ہی تھے کہ اہلِ یمن کی بہت بڑی فوج ان کے معسکر میں جمع ہوگئی۔ انھوں نے اپنی قوم کو خطاب کرتے ہوئے کہا:

''تمھارے بھائیوں نے تمھیں مشرکوں سے جہاد کرنے اور اجرِ عظیم حاصل کرنے کی دعوت دی ہے، لہٰذا جو شخص جہاد کے لیے جانا چاہتا ہے وہ میرے ساتھ روانہ ہو جائے۔''[1]

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ ۱۱/ رجب ۱۲ھ کو واپس آئے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اہلِ یمن کی آمد کی خوشخبری سنائی اور عرض کی: ''اہلِ یمن کے بہادر شاہسوار آپ کے پاس پراگندہ حالت میں اپنے بیوی، بچوں اور اموال سمیت حاضر ہو رہے ہیں۔''

چند ہی دن بعد ۱۶/ رجب ۱۲ھ کو ذوالکلاع حمیری رحمہ اللہ اپنی قوم سمیت مدینہ منورہ پہنچ گئے۔ اہلِ حمیر

[1] الكامل في التاريخ لابن الأثير (٢/ ٤٦)

ہی فوری طور پر مدینہ منورہ نہیں پہنچے بلکہ تمام اہلِ یمن نے اسی جذبے کا مظاہرہ کیا تھا، مثلاً ہمدان قبیلہ حمزہ بن مالک ہمدانی رحمہ اللہ کی قیادت میں دو ہزار جوانوں کے ساتھ پہنچا۔[1]

جب اہلِ یمن مدینہ منورہ آگئے اور انھوں نے مسجدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں داخل ہو کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی تلاوت سنی تو خشیتِ الٰہی سے کانپ اٹھے۔ اُن کے دل دہل گئے اور وہ زار وقطار رونے لگے۔ اس پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی رو دیے۔[2]

ذو الکلاع حمیری رحمہ اللہ نے دیکھا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ایک دبلے پتلے بزرگ ہیں۔ انھوں نے سادہ ترین کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ ان پر کوئی ہیرے جواہرات نہیں جڑے ہوئے۔ ان کے خوبصورت سفید چہرے پر صرف درع اور تقویٰ چھایا ہوا تھا، جبکہ ذو الکلاع رحمہ اللہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں یمن سے اس شان سے حاضر ہوئے کہ ان کے اردگرد ایک ہزار شہسوار تھے اور ان کے سر پر تاج چمک رہا تھا۔ ان کے لباس پر جواہر لگے ہوئے تھے۔ ان کی چادر پر سنہری کڑھائی تھی اور موتی چمک رہے تھے اور یاقوت و مرجان اپنی آب وتاب دکھا رہے تھے۔ ذو الکلاع رحمہ اللہ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی سادگی، زہد اور تواضع دیکھی اور اس کے ساتھ ساتھ آپ کا وقار اور ہیبت دیکھی تو متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ذو الکلاع رحمہ اللہ اور ان کے ساتھی سرداروں نے اپنی زیب و زینت ترک کر کے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جیسی سادگی اختیار کر لی۔[3]

ذو الکلاع رحمہ اللہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جیسا لباس پہننا شروع کر دیا حتیٰ کہ ایک دن انھیں مدینہ منورہ کے بازار میں اس حال میں دیکھا گیا کہ انھوں نے اپنے کندھوں پر بکری کی کھال رکھی ہوئی تھی۔ اس پر ان کا خاندان پریشان ہو گیا اور ان سے کہا: ''آپ نے ہمیں انصار ومہاجرین کے مابین رسوا کر دیا ہے۔'' اس پر انھوں نے جواب دیا: ''تم چاہتے ہو کہ میں جاہلیت کی طرح مسلمان ہونے کے بعد بھی جبار بن کر رہوں؟ نہیں، اللہ کی قسم! اللہ کی اطاعت، تواضع اور اس دنیا میں زہد ہی سے کی جا سکتی ہے۔''[4]

یمن کے تمام سرداروں نے ذو الکلاع رحمہ اللہ کی سیرت اپنائی۔ انھوں نے جواہرات سے لدے ہوئے تاج اتار دیے، ہیرے، جواہرات، موتیوں اور سنہری دھاگوں سے بنے ملبوسات ترک کر دیے اور

---

[1] اليمن في صدر الإسلام للدكتور عبد الرحمن الشجاع (ص: ٣٠١، ٣٠٢)
[2] الصديق أول الخلفاء للشرقاوي (ص: ١١٤)
[3] مروج الذهب للمسعودي (٢/ ٣٠٥)
[4] حوالۂ سابقه.

مدینہ منورہ کے بازار سے کُھردرے لباس خرید کر زیبِ تن کر لیے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان کے قیمتی ملبوسات اور جواہرات بیت المال میں جمع کر دیے۔[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی زندگی اسلام کی بہترین عملی تصویر تھی۔ ان کی زندگی زبانِ حال سے دعوت الی اللہ دیتی تھی، اور کامیاب ترین نصیحت وہی ہوتی ہے جسے لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں اور بہترین ناصح وہ ہوتا ہے جو اپنا کردار پیش کرے نہ کہ گفتار، چنانچہ جب یمنی سرداروں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ اور جزیرۂ عرب کے حکمران کو دیکھا کہ وہ بازاروں میں تجارت کرنے میں عیب محسوس نہیں کرتا، عام لوگوں کی طرح عباء پہنتا ہے اور سر پر پگڑی رکھتا ہے تو وہ سمجھ گئے کہ سونے اور جواہرات سے مزیّن لباس سے بڑھ کر بھی ایک چیز ہے اور وہ ہے انسان کا عظیم کردار، اس لیے انھوں نے بھی یہ مزیّن لباس ترک کر کے حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کی سیرت اپنالی۔ انھیں اللہ تعالیٰ اور لوگوں سے حیا آگئی کہ وہ تو سنہرے تاج اور ہیرے موتیوں سے لدے پھرتے رہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خلیفہ سادہ سی عباء زیبِ تن کیے ہو۔ یہ دیکھ کر ان کے نفس تائب ہو گئے اور ان کی شاہانہ شان وشوکت اور امیرانہ خروش یوں ماند پڑ گیا جس طرح سورج کے آگے ننھے ننھے ستارے ماند پڑ جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پر اپنا خصوصی رحم وکرم فرمائے، وہ تواضع اور انکساری میں بہت عظیم اور طبیعت میں نہایت متواضع تھے۔[2]

اقتدار وحکومت کی شرائط واسباب اور شریعت کے آثار:

اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں سے وعدہ ہے کہ جب بھی وہ اللہ تعالیٰ کی شرائط پوری کریں گے اللہ تعالیٰ انھیں زمین میں خلافت، اپنے دین کو غلبہ اور مسلمانوں کو امن وسکون عطا فرمائے گا۔ قرآنِ مجید نے اقتدار کے حصول کی شرائط اور حکومت وغلبے کے استمرار کی شرائط بڑی صراحت سے بیان فرمائی ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ

[1] الصديق أول الخلفاء للشرقاوي (ص: ١٣٧، ١٣٨)

[2] أبو بكر الصديق للطنطاوي (ص: ٢١٩)

بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۚ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا ۚ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿55﴾ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴾

[النور: ٥٥۔ ٥٦]

’’جو تم میں سے ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے، اللہ نے ان لوگوں سے وعدہ کیا ہے کہ وہ انھیں زمین میں خلافت دے گا جیسے اس نے ان سے پہلے لوگوں کو خلافت دی تھی۔ اور ان کے لیے ضرور ان کا وہ دین مضبوط کرے گا جو اس نے ان کے لیے چنا اور یقیناً ان کی حالتِ خوف کو بدل کر ضرور انھیں امن دے گا۔ وہ میری عبادت کریں گے، میرے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے اور جو کوئی اس کے بعد کفر کرے تو وہی لوگ فاسق ہیں۔ اور تم نماز قائم کرو اور زکاۃ دو اور رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔‘‘

ان آیات میں اللہ نے اقتدار کے حصول کے لیے مندرجہ ذیل شرائط بیان کی ہیں:

- تمام ارکان اور شرائط کے مطابق ایمان لانا۔
- ہر قسم کے نیک اعمال بجالانا اور ہر طرح کی نیکی اور بھلائی کی حرص کرنا۔
- اپنے قول اور عمل سے عبودیت کا اظہار کرنا۔
- شرک کی تمام انواع واقسام کا رد کرنا۔

اور اقتدار کے حصول کے لوازم یہ ہیں:

- اقامتِ نماز۔
- ادائے زکاۃ۔
- اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت وفرمان برداری۔[1]

درجِ بالا تمام شرائط ولوازم حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور ان کے بعد والے خلفائے راشدین کے ادوار میں موجود تھے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم کے بعد یہ کریڈٹ بھی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو جاتا ہے کہ انھوں نے امتِ محمدیہ علیٰ ۔علیٰ صاحبها الصلاة والسلام۔ کو اِن شرائط کی نصیحت کی، اسی لیے انھوں نے بدویوں کا یہ مطالبہ سختی سے مسترد کر دیا کہ انھیں زکاۃ کی چھوٹ دی جائے۔

[1] فقه التمكين في القرآن الكريم للصلابي (ص: ١٥٧)

آپ نے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے لشکر کی روانگی پر بھی اصرار کیا، باوجود یکہ حالات سخت ناساز گار تھے۔ اس طرح انھوں نے مکمل شریعت کی پابندی کی اور کسی بھی چھوٹے یا بڑے حکم سے کنارہ کشی نہیں کی۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہمیں ایسے حالات کا سامنا کرنا پڑا کہ اگر اللہ تعالیٰ ہم پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ذریعے اپنا فضل وکرم نہ کرتا تو ہم ہلاک ہو جاتے۔ ہم سب کا اتفاق تھا کہ ہم بنت مخاض اور بنت لبون (ایک اور دو سال کی اونٹنیوں) کے لیے جنگ نہیں لڑیں گے۔ ہم کھائیں گے پئیں گے اور موت آنے تک اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مصروف رہیں گے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو منکرینِ زکاۃ کے ساتھ جنگ کرنے کا عزم عطا فرمایا۔ اللہ کی قسم! وہ منکرین سے ادائے زکاۃ یا کھلی جنگ کے سوا کسی شرط پر راضی نہ ہوئے۔''[1]

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فکری اور مادی ہر طرح کی مکمل تیاری کے ساتھ میدانِ عمل میں قدم رکھا تھا۔ انھوں نے مختلف لشکر تیار کیے۔ مرتدوں کے خلاف جہاد کے لیے قابل ترین قیادت کا انتخاب کیا۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو جہاد کی ترغیب دلائی، اسلحہ، گھوڑے اور اونٹوں سے فوجیوں کو لیس کیا۔ بدعت اور بری خواہشات کا قلع قمع کر کے شریعت کو نافذ کیا۔ انھوں نے وحدتِ امت اور اتحاد و اتفاق کے اصول اپنائے۔ اپنے عُمّال کو فارغ کر کے ہر شعبے کے لیے ماہر افراد کی خدمات حاصل کیں، حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو فوج کی کمان سونپی، حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو قرآن جمع کرنے کی ذمہ داری دی، حضرت ابو برزہ اسلمی رضی اللہ عنہ کو جنگی محاذوں پر اطلاعات پہنچانے اور وہاں کے تازہ ترین حالات سے دار الحکومت کو آگاہ رکھنے کی اہم ذمہ داری دی، مزید برآں آپ نے امن و امان، ذرائع ابلاغ اور اس جیسے دیگر کئی اسباب اختیار کر کے حکومت کو مضبوط بنایا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انھیں مرتدوں کے مقابلے میں اپنی خصوصی مدد و نصرت سے نوازا اور انھیں امن وامان کی نعمت سے سرفراز فرمایا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴾

[الأنعام: ٨٢]

''جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے ایمان کو ظلم (شرک) کے ساتھ خلط ملط نہیں کیا، وہی لوگ ہیں جن کے لیے امن ہے اور وہی ہدایت یافتہ ہیں۔''

---

[1] الكامل في التاريخ لابن الأثير (٢/ ٢١)

جب انھوں نے اللہ کے دین کی مدد کی تو اللہ تعالیٰ کی سنت کے مطابق انھیں بھی اللہ کی نصرت وحمایت حاصل ہوگئی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو اپنی مدد کی ضمانت دی ہے جو اس کی شریعت پر کاربند ہوتے ہیں اور اللہ کے دشمنوں سے ٹکراتے ہیں۔ چنانچہ ارشادِ ربانی ہے:

﴿ وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ۗ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۗ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ﴾ [الحج: ٤٠۔ ٤١]

''اور اللہ ضرور اس کی مدد کرے گا جو اس کے دین کی مدد کرے گا۔ بے شک اللہ بہت قوت والا غالب ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جنھیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں اور زکاۃ دیں اور نیکی کا حکم دیں اور برائی سے روکیں اور تمام امور کا انجام اللہ کے اختیار میں ہے۔''

تاریخِ عالم گواہ ہے کہ جب بھی کوئی قوم اللہ کے دین پر کاربند ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ انجامِ کار اسے قوت وغلبہ اور قیادت و سیادت عطا فرماتا ہے۔[1]

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں نیکی اور بھلائی خوب پھلی پھولی اور بدیاں مٹ گئیں۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی یہ جماعت احسان، تقویٰ اور صبر وثبات جیسی عالی صفات کی حامل تھی، اور یہی وہ صفات ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ بہت محبوب رکھتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ۗ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴾ [آل عمران: ١٣٤]

''وہ لوگ جو خوشحالی اور سختی کی حالت میں خرچ کرتے ہیں اور غصہ پی جانے والے ہیں اور لوگوں کو معاف کردینے والے ہیں۔ اور اللہ نیکوکاروں کو پسند کرتا ہے۔''

ان کی صفات کو اقبال نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے: ؎

تم ہو آپس میں غضبناک، وہ آپس میں رحیم
تم خطا کار و خطا بیں، وہ خطا پوش وکریم

[1] تفسير في ظلال القرآن لسيد قطب (٤/ ٢٧٠)

چاہتے سب ہیں کہ ہوں اَوجِ ثریا پہ مقیم
پہلے ویسا کوئی پیداتو کرے قلبِ سلیم

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی اس جماعت نے اپنے رب سے بے مثال محبت کی۔ انھوں نے اپنی جانیں اہل وعیال اور مال واسباب سب کچھ اللہ کی راہ میں بے دریغ قربان کر دیا اور انھیں ذرہ برابر بھی تردّد نہ ہوا۔ اور نہ کسی قسم کا کوئی احسان جتلایا بلکہ اسے بھی اللہ کا فضل وکرم شمار کیا کہ اس نے انھیں دینِ حنیف کے لیے ان قربانیوں کی توفیق عطا فرمائی اور ان کے لیے جہاد اور شہادت کی راہیں آسان فرمائیں جس کی وجہ سے انھوں نے اس فریضے کو کماحقہٗ ادا کیا۔[1]

حقوق اللہ ادا کرنے کا التزام:

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنے کمانڈروں کو حقوق اللہ کی ادائیگی کے التزام کا حکم دیتے تھے۔ آپ نے حضرت عَمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو ارضِ فلسطین بھیجا تو انھیں فرمایا:

''خلوت وجلوت میں اللہ سے حیا کرنا اور ڈرنا۔ وہ ہر آن تمھارا عمل دیکھ رہا ہے۔تم دیکھ رہے ہو کہ میں نے تمھیں ان لوگوں پر فوقیت دی ہے جو تم سے پہلے اسلام لائے اور تم سے زیادہ اعزاز واکرام والے ہیں۔ پس آخرت کی کامیابی والے کام کرنا۔صرف اللہ کی رضا کے لیے اعمال انجام دینا، اپنے ساتھیوں کے لیے باپ کی طرح شفیق ہو جانا۔خبر دار! نمازوں کا کامل اہتمام کرنا۔ جب نماز کا وقت ہوجائے تو اذان دینا۔ جو ایسی آواز میں ہو کہ سارا معسکر سن لے۔ دشمن سے ٹکر ہو تو اللہ سے ڈرنا۔ اپنے ساتھیوں کو قرآنِ مجید کی تلاوت کا پابند بنانا۔ انھیں ایامِ جاہلیت کے تذکرے سے منع کرنا، کیوں کہ یہ ان کے مابین عداوت کا باعث بنے گا۔ دنیا کی زیب وزینت سے دور بھاگنا حتیٰ کہ اپنے سلف سے جاملو۔ اُن ائمہ جیسے بن جاؤ جن کی تعریف اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں کی ہے۔''

اللہ تعالیٰ سورۃ الانبیاء (آیت:۷۳) میں فرماتا ہے:

﴿ وَجَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً یَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَاَوْحَیْنَاۤ اِلَیْهِمْ فِعْلَ الْخَیْرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِیْتَآءَ الزَّكٰوةِ ۚ وَكَانُوْا لَنَا عٰبِدِیْنَ ﴾

[1] الإيمان وأثره في الحياة للدكتور يوسف (ص: ٥-١٢)

''اور ہم نے انھیں امام بنایا۔ وہ ہمارے حکم سے (لوگوں کو) راہِ ہدایت بتاتے تھے۔ اور ہم نے ان پر نیکیاں کرنے، نماز قائم رکھنے اور زکاۃ دینے کی وحی کی۔ اور وہ ہمارے عبادت گزار تھے۔''[1]

یہ وہ اہم ترین حقوق اللہ اور حقوقِ امیر و رعایا ہیں جنھیں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنی نصائح اور کمانڈروں کے نام اپنے مراسلات میں بیان کیا تھا۔

رومیوں اور ایرانیوں پر مسلمانوں کی فتح اور غلبے کا راز:

اسلامی فتوحات کی تحریک کا مطالعہ کرنے سے پتا چلتا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے لشکر شام اور عراق گئے تو اللہ تعالیٰ کی توفیق سے وہ رومیوں اور ایرانیوں کی سپر پاورز کو روند کر کامیاب وکامران لوٹے۔ یہ جنگی تاریخ کی ایک نادر مثال ہے کہ مجاہدینِ اسلام نے انتہائی مستعدی اور کامیابی کے ساتھ نہایت قلیل وقت میں ان دونوں سپر پاورز کو فتح کر لیا۔ اس قدر قلیل مدت میں اتنی اعلیٰ کامیابی کے متعدد اسباب ہیں۔ کچھ اسباب فاتح مسلمانوں سے تعلق رکھتے ہیں اور کچھ کا تعلق ان مفتوحہ اقوام سے ہے جن کے علاقے مسلمانوں نے فتح کیے۔ مسلمانوں سے متعلقہ اسبابِ کامرانی درج ذیل ہیں:

- مسلمانوں کا دینِ حق پر ناقابلِ تسخیر ایمان جس کے لیے وہ جنگ لڑ رہے تھے۔
- مسلمانوں کا رزق، موت، قضاء اور قدر کے بارے میں اپنے رب پر کامل یقین۔
- مسلمانوں کی جنگی مہارت و تجربہ۔
- دیگر اقوام کے ساتھ مسلمانوں کا عمدہ اخلاق، فیاضانہ سلوک اور عادلانہ رویہ۔
- مفتوحہ اقوام سے جزیہ اور خَراج کی وصولی میں مسلمانوں کی رحمدلی اور ان کے ساتھ عہد و پیمان کی پاسداری۔
- مسلمانوں کے عظیم قائدین اور کثیر مجاہدین کا لشکر۔
- مضبوط و مربوط جدید جنگی پلاننگ۔[2]

مفتوحہ اقوام کے زوال اور شکست کے اہم ترین اسباب یہ ہیں:

- رومیوں اور ایرانیوں کا داخلی ضُعف انتہاء کو پہنچ گیا تھا۔ یہ دونوں اقوام اندرونی طور پر کمزور ہو چکی

---

[1] الإدارة العسكرية في الدولة الإسلامية للدكتور سليمان بن صالح (١/ ٢٥١)

[2] تاريخ الدعوة إلى الإسلام للدكتور يسرى محمد هاني (ص: ٢٢٢-٢٢٧)

تھیں۔ جگہ جگہ ظلم وستم کے الاؤ بھڑک رہے تھے۔ فتنہ وفساد کی گرم بازاری تھی۔ بدکاری عام ہو چکی تھی۔ ان کی تہذیب کھوکھلی اور بوسیدہ ہوگئی تھی۔ اس پر مستزاد یہ کہ ان کے حکمرانوں کی عیش پرستی نے ان کی تہذیب کو تباہ کر دیا تھا۔

- یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے منہج سے ہٹے ہوئے تھے اور ان پر اللہ کا وہ قانون مکافاتِ عمل لاگو ہو چکا تھا جو کسی پر رحم نہیں کرتا۔ اس کے مقابلے میں مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنے منہج پر چلنے کی وجہ سے عزت سے نوازا۔ انھوں نے فتح وغلبہ کے اسباب اختیار کیے اور اس کی شرائط پر عمل کیا۔ انھوں نے دیگر اقوام کے ساتھ سننِ الٰہی کے مطابق رویہ اختیار کیا۔ انھوں نے نئے شہر اور نئی بستیاں آباد کیں۔ معاشرے کی اصلاح کے لیے طریقۂ الٰہی کو اپنایا، اس لیے وہ کامیاب رہے۔ یہ ان کی کامیاب قیادت کا ثمرہ تھا کہ اہلِ مدینہ میں سے کوئی ایک شخص بھی مرتد نہیں ہوا۔ اس کے بعد خلیفۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے مرتدین اور جھوٹے مدعیانِ نبوت کے خلاف بڑے زور دار معرکے برپا کیے۔ مسیلمہ کذّاب لعنتی واصل جہنم ہوا۔ اور اس کے قبیلہ بنوحنیفہ کو زبردست، ہزیمت اٹھانی پڑی۔

حالانکہ ان کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ تھی۔ اسی طرح آپ نے طلیحہ اسدی سے جنگ کی اور اس کے متبعین بنواسد اور بنوغطفان کو شکست فاش دی۔ اسی طرح ایک عورت سجاح بھی نبوت کی دعویدار بن کر کھڑی ہوگئی۔ اس نے مسیلمہ کذّاب سے شادی بھی کر لی تھی۔ اس کو بھی خلافتِ صدیق رضی اللہ عنہ ہی میں شکست دی گئی۔ اگلا مرحلہ منکرینِ زکاۃ کے خلاف جہاد کا تھا۔ ان کے خلاف لڑنے میں بعض مسلمان متردّد تھے، مگر حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نے فتویٰ دیا کہ جو اونٹ کی ایک رسی بھی دینے سے انکار کرے گا، اس سے بھی لڑائی کی جائے گی، چنانچہ اس مشن میں بھی اللہ نے انھیں کامیابی نصیب فرمائی۔

اندرونی مسائل سے نمٹنے اور ریاست کو استحکام بخشنے کے بعد آپ نے کفار ومشرکین کی طرف توجہ فرمائی اور روم و فارس کی حکومتوں پر حملے کیے۔ آپ کے عہدِ مبارک میں شام، عراق، مغرب، خراسان اور بہت سے دیگر علاقے فتح ہوئے۔ بالآخر یہ عظیم شخصیت کے مالک دو سال چار ماہ حکومت کرنے کے بعد تریسٹھ برس کی عمر پا کر سن تیرہ ہجری کے جمادی الآخرہ میں بیمار پڑ گئے۔ رفتہ رفتہ ان کی بیماری شدید ہوگئی۔[1]

جب انھیں اپنی بیماری کی شدّت کا احساس ہوا تو انھوں نے لوگوں کو اپنے پاس جمع کیا اور فرمایا:

[1] البداية والنهاية (٧/ ١٨)

''میری بیماری تو تم دیکھ ہی رہے ہو۔ میرا خیال ہے کہ میں اپنی اسی بیماری میں فوت ہو جاؤں گا۔ اللہ تعالیٰ نے میری بیعت سے تمھارے ہاتھ کھول دیے ہیں۔ میری خلافت کی ذمہ داری بھی اب ختم ہی سمجھو۔ اب تمھارا معاملہ تمھارے سپرد ہے، تم جسے پسند کرو اپنا امیر مقرر کر لو۔ اگر تم میری زندگی میں اپنا امیر مقرر کر لو گے تو میرے بعد اختلافات سے بچ جاؤ گے۔''[1]

خلیفہ کے چناؤ کے لیے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے اقدامات:

- حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی کبار مہاجرین اور انصار صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے طویل مشاورت ہوئی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا تو ہر شخص نے خلافت کی ذمہ داری سنبھالنے سے معذرت کی اور کسی دوسرے شخص کو مقرر کرنے کا مشورہ دیا کہ فلاں شخص میں مجھ سے زیادہ اہلیت و صلاحیت ہے۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر تمام صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی: ''اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ! ہماری رائے یہ ہے کہ آپ خود ہی کسی کو مقرر کر دیں۔'' حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''اچھا! تو پھر مجھے مہلت دو کہ میں اللہ، اس کے دین اور اس کے بندوں کے لیے بہترین آدمی منتخب کر سکوں۔''

پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کو بلایا اور ان سے پوچھا:

''مجھے (حضرت) عمر بن خطاب (رضی اللہ عنہ) کے بارے میں بتاؤ کہ وہ کیسے رہیں گے؟''

انھوں نے عرض کی: ''آپ اس بارے میں مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔''

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''وَاِنْ'' ''ہر چند ایسا ہی ہے لیکن تم پھر بھی بتاؤ۔''

اس پر حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے عرض کی: ''اللہ کی قسم! آپ کا انتخاب بہترین انتخاب ہے۔''

پھر حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو بلا کر فرمایا:

''مجھے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے بارے میں مشورہ دو۔''

انھوں نے عرض کی: ''آپ ان کے متعلق ہم سے بہتر جانتے ہیں۔''

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''اے ابوعبداللہ (رضی اللہ عنہ)! کیا واقعی تمھاری یہی رائے ہے؟'' حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے عرض کی:

---

[1] التاريخ الإسلامي للحميدي (٩/ ٢٥٨)

’’بلاشبہہ میرے علم میں ان کا باطن ان کے ظاہر سے بہت بہتر ہے اور ہمارے مابین ان جیسا کوئی نہیں۔‘‘

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

’’اللہ آپ پر رحم فرمائے۔ اللہ کی قسم! اگر آپ یہ بات نہ کرتے تب بھی میں آپ سے مزید کچھ نہ پوچھتا۔‘‘

پھر حضرت اُسید بن حُضیر رضی اللہ عنہ کو بلا کر مشورہ کیا تو انھوں نے عرض کی:

’’یقیناً میرے علم کے مطابق آپ کے بعد وہی بہترین منتخب کردہ ہیں۔ وہ اللہ ہی کے لیے راضی اور اللہ ہی کے لیے ناراض ہونے والے ہیں۔ جو عمل وہ خفیہ کرتے ہیں وہ ان کے ظاہری اعمال سے بھی بہتر ہیں۔ وہ خلافت کے لیے نہایت موزوں اور مضبوط شخصیت ہیں۔ ان سے بڑھ کر کوئی نہیں جو اس ذمہ داری کو بخوبی نبھا سکے۔‘‘

اس طرح حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے سعید بن زید رضی اللہ عنہ اور دیگر انصار اور مہاجر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا۔ تقریباً سبھی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں انھی سے ملتے جلتے خیالات کا اظہار کیا۔ البتہ حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سخت مزاجی سے ڈر گئے۔ انھوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہا:

’’آپ کو (حضرت) عمر (رضی اللہ عنہ) کی سخت مزاجی کا علم ہے۔ جب (حضرت) عمر (رضی اللہ عنہ) کو جانشین بنانے کے متعلق آپ کا پروردگار آپ سے پوچھے گا تو آپ کیا جواب دیں گے؟‘‘

اس پر حضرت ابوبکر نے فرمایا:

’’أَجْلِسُونِي، أَبِاللّٰهِ تُخَوِّفُونِي؟ خَابَ مَنْ تَزَوَّدَ مِنْ أَمْرِكُمْ بِظُلْمٍ، أَقُولُ: اَللّٰهُمَّ! اِسْتَخْلَفْتُ عَلَيْهِمْ خَيْرَ أَهْلِكَ‘‘

’’مجھے بٹھادو۔ کیا تم مجھے اللہ کا خوف دلاتے ہو؟ وہ شخص نامراد ہو گیا جس نے تمھارے معاملات میں ادنیٰ سا بھی ظلم کیا۔ میں اللہ تعالیٰ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں: ’’اے اللہ! میں نے مسلمانوں پر تیرا بہترین بندہ مقرر کیا ہے۔‘‘

آپ نے حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سختی کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرمایا:

’’(حضرت) عمر (رضی اللہ عنہ) سخت اس لیے تھے کہ وہ مجھے نرم مزاج پاتے تھے۔ اگر ان پر خلافت کا

بوجھ پڑا تو وہ بڑی حد تک سختی چھوڑ دیں گے۔"[1]

بعد ازاں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنی وصیت لکھوائی جو مدینہ منورہ کے باشندوں اور انصار تک لشکر کے امراء کے ذریعے پہنچائی گئی۔ آپ کی وصیت یہ ہے، جو حضرت ابوبکر بن ابی قحافہ رضی اللہ عنہما نے اس دنیا سے رخصت ہوتے وقت آخرت کی زندگی میں پہلا قدم رکھتے ہوئے لکھوائی:

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ بے شک میں نے اپنے بعد تمھارا خلیفہ (حضرت) عمر بن خطاب (رضی اللہ عنہ) کو مقرر کیا ہے۔ تم اس کی فرماں برداری اور اطاعت کرنا، یقیناً میں نے اللہ، اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم، اس کے دین، اپنی جان اور تمھاری خیر خواہی میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ اگر اس نے عدل و انصاف کیا تو میرا اس بارے میں یہی علم و یقین ہے اور اگر وہ بدل گیا تو ہر شخص اپنی ہی کمائی پائے گا۔ میں نے خیر کا ارادہ کیا ہے اور میں علمِ غیب نہیں رکھتا۔"[2]

جبکہ یہ (حضرت) عمر فاروق (رضی اللہ عنہ) کی ہی ہستی ہے جس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: "اے ابن خطاب (رضی اللہ عنہ)! اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! جس گلی میں تم چل رہے ہوتے ہو شیطان اس گلی سے بھاگ کر دوسری گلی میں چلا جاتا ہے۔"[3]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ وہ مضبوط بندے تھے جو امتِ محمدیہ ۔علیٰ صاحبہا الصلاۃ والسلام۔ اور فتنوں کی منہ زور موجوں کے درمیان حائل تھے۔[4]

❁ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے چاہا کہ وہ مکمل ہوش و حواس کے ساتھ لوگوں کو یہ فیصلہ سنا دیں تاکہ کوئی التباس واختلاف واقع نہ ہو، لہٰذا آپ نے لوگوں کو جمع کر کے فرمایا:

"میں جسے تمھارا خلیفہ مقرر کردوں تم اس پر راضی ہو گے؟ اللہ کی قسم! میں نے اس انتخاب کے لیے پوری محنت کی ہے۔ میں نے اپنے کسی رشتہ دار کو جانشین نہیں بنایا۔ بلاشبہہ میں نے (حضرت) عمر بن خطاب (رضی اللہ عنہ) کو تمھارا خلیفہ مقرر کیا ہے۔ تم ان کی اطاعت وفرماں برداری کرنا۔"

---

[1] الكامل في تاريخ لابن الأثير (٢/ ٧٩) التاريخ الإسلامي لمحمود شاكر (ص: ١٠١)

[2] مجمع الزوائد للهيثمي (١٠/ ١٦٨)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٦٨٣)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٠٩٦)

سب نے کہا: ''ہم نے آپ کا فیصلہ سن لیا اور آپ کی اطاعت کی۔''[1]

- حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے دل کی گہرائیوں سے دعا کی اور اللہ تعالیٰ سے مناجات کیں۔ آپ نے اللہ رب العزت کی بارگاہ میں عرض کی:

''اے اللہ! میں نے انھیں والی (خلیفہ) بنا دیا ہے، اگر چہ تیرے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے والی مقرر نہیں کیا تھا۔ میرا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور خیر خواہی ہے۔ میں ان کے فتنے میں مبتلا ہونے سے ڈرا۔ میں نے اپنی سوچ کے مطابق پوری دیانتداری سے ان میں سے بہترین شخص کو ان کا امیر مقرر کیا ہے، جو ان کی بھلائی کا سب سے بڑھ کر حریص ہے۔ اے اللہ! میرے پاس تیرا فیصلہ آنے والا ہے۔ پس تو ہی ان میں میرا خلیفہ ہو جا۔ بے شک یہ تیرے ہی بندے ہیں۔''[2]

- سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یہ وصیت نامہ پڑھ کر لوگوں کو سنانے کی ذمہ داری حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو سونپی اور انھوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وفات سے پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لیے بیعت لے لی۔ انھوں نے اس فیصلے کے نفاذ سے پہلے مزید توثیق کرائی تاکہ بعد میں کوئی منفی پہلو سامنے نہ آئے، لہٰذا انھوں نے لوگوں سے کہا: ''اس خط میں جس شخص کا نام ہے، کیا تم اس کی بیعت کرتے ہو؟''

سب نے کہا: ''جی ہاں۔'' اس طرح تمام لوگوں نے متفقہ طور پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی جانشینی کا اقرار کیا اور اس پر اپنی رضا مندی ظاہر کی۔[3]

- حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے وفات سے پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بیعت کا انعقاد کیا۔ جب لوگوں کو وصیت نامہ پڑھ کر سنایا گیا اور وہ اس پر راضی ہو گئے تو وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف لپکے اور ان کی بیعت کرنے لگے۔ ان کی بیعت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد نہیں ہوئی بلکہ پہلے ہی ہو گئی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وفات کے فوراً بعد خلیفۃ المسلمین کی ذمہ داریاں سنبھال لی تھیں۔[4]

اس طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی امارت وخلافت شوریٰ کے فیصلے اور کامل اتفاق سے طے ہوئی۔ تاریخ

---

[1] تاريخ الطبري (٤/ ٢٤٨)

[2] الطبقات لابن سعد (٣/ ١٩٩) تاريخ المدينه لابن شبه (٢/ ٦٦٥۔ ٦٦٦)

[3] الطبقات لابن سعد (٣/ ٢٠٠)

[4] دراسات في عهد النبوة و الخلافة الراشدة للدكتور عبد الرحمن الشجاع (ص: ٢٧٢)

میں ایسی کوئی بات موجود نہیں جو ان کی خلافت کے بارے میں کوئی اختلاف بیان کرتی ہو۔ نہ ان کے طویل عہدِ خلافت میں ان کے خلاف کوئی امیدوار کھڑا ہوا بلکہ ان کے عہدِ خلافت میں سب کا اتفاق تھا۔ سب ان کے فرمانبردار تھے اور پوری امت متحد و متفق تھی۔[1]

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو نصیحت:

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو تنہائی میں متعدد نصیحتیں کیں تاکہ وہ ہر قسم کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو کر اپنے رب کے پاس جا سکیں، جبکہ وہ امت کی خدمت اور خیر خواہی کے لیے بھرپور محنت کر چکے تھے۔ آپ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:

''اے عمر (رضی اللہ عنہ)! اللہ سے ڈرنا۔ خوب جان لو! اللہ تعالیٰ نے کچھ اعمال رات کے مقرر کیے ہیں جو وہ دن کو قبول نہیں کرتا۔ وہ نفل اس وقت تک قبول نہیں کرتا جب تک فرائض ادا نہ کیے جائیں۔ قیامت کے دن اسی شخص کی میزان وزنی ہوگی جس نے دنیا کی زندگی میں حق کی اتباع کی اور حق کو لوگوں پر لاگو کیا۔ اور جس میزان میں حق رکھا گیا اس پر لازم ہے کہ قیامت کے دن بھاری ہو جائے۔ یقیناً کل قیامت کے دن ہلکی میزان اس شخص کی ہوگی جس نے دنیا میں باطل کی اتباع کی اور جس میزان میں باطل ڈالا جائے ضروری ہے کہ وہ ہلکی ہو جائے۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے اہلِ جنت کا تذکرہ کیا تو انھیں ان کے نیک اعمال کے ساتھ یاد فرمایا اور ان کے گناہوں کی مغفرت کی نوید دیتے ہوئے ان کا تذکرہ کیا۔

میں جب انھیں یاد کرتا ہوں تو دل میں کہتا ہوں: مجھے ڈر ہے کہ میں ان لوگوں ساتھ نہ مل پاؤں گا۔ میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ میں اس کی رحمت کا امیدوار اور اس کے عذاب سے خوفزدہ ہونے والا بندہ بن جاؤں، وہ اللہ کا بندہ جو اللہ تعالیٰ سے نہ غلط امیدیں باندھے، نہ اس کی رحمت سے مایوس ہو۔ پس اگر تم نے میری نصیحت پلے باندھ لی تو موت تمھیں محبوب ہوگی اور وہ آکر ہی رہے گی۔ اگر تم نے میری وصیت پر عمل نہ کیا تو موت سے زیادہ کوئی چیز تمھیں ناپسند نہیں ہوگی، جبکہ تم اس سے کوئی راہِ فرار نہیں پا سکتے۔''[2]

---

[1] النظرية السياسية الإسلامية لضياء الريس (ص:١٨١)

[2] صفة الصفوة لابن الجوزي (١/ ٢٦٥٢٦٤)

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا وقتِ رحلت:

جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا اس دنیا سے رحلت کا وقت آیا تو انھوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہا: ''جب سے میں خلیفہ بنا ہوں، اس دوران میرا جتنا مال بڑھا ہے وہ میرے بعد والے خلیفہ کو پہنچا دینا۔'' یعنی میری وفات کے بعد گھر میں جو کچھ موجود ہے وہ بیت المال میں جمع کر ادیا جائے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے دیکھا کہ ایک چادر جو پانچ درہم سے بھی کم قیمت کی تھی، ایک حبشی لونڈی جو ان کے بچے کو دودھ پلاتی تھی، ایک کالا غلام اور ایک پانی لادنے والا اونٹ گھر میں موجود تھا۔ یہی ان کی کُل کائنات تھی۔

ام المومنین رضی اللہ عنہا نے یہ سارا سامان نئے خلیفہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی خدمت میں بھجوا دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سامان کی قیمت بیت المال کو بذاتِ خود ادا کر دی اور سامان حضرتِ صدیق رضی اللہ عنہ کے اہلِ خانہ کو واپس بھجوا دیا۔ اور ساتھ ہی رو پڑے، روتے روتے فرمایا: ابوبکر (رضی اللہ عنہ)! اللہ تم پر رحم کرے، تم نے اپنے بعد آنے والے حکمرانوں کو سخت امتحان میں ڈال دیا ہے۔[1]

پھر حضرتِ صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''اے عائشہ (رضی اللہ عنہا)! اپنی اولاد میں سے تم مجھے سب سے زیادہ پیاری ہو۔ میں نے تمھیں ایک باغ تحفہ میں دیا تھا۔ میرے دل میں اس کے متعلق خلش سی ہے، لہٰذا تم وہ باغ میری وراثت میں واپس کردو۔''

میں نے عرض کی: ''جی ہاں! وہ میں نے آپ کو واپس کیا۔''

آپ نے فرمایا:

''آگاہ رہو! جب سے میں مسلمانوں کا خلیفہ بنا ہوں، میں نے ان کا کوئی دینار یا درہم نہیں کھایا، البتہ میں نے ان کے مال سے روکھا سوکھا کھا کر گزارہ کیا اور کُھردرے لباس پہنے۔ اس وقت میرے پاس مسلمانوں کے مال میں سے صرف ایک حبشی غلام اور پانی لانے والا اونٹ اور اس پر رکھا جانے والا گدا ہے۔ جب میں فوت ہوجاؤں تو تم یہ چیزیں (حضرت) عمر (رضی اللہ عنہ) کے حوالے کر دینا اور اِن سے آزاد ہو جانا۔''

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: میں نے ان کے حکم کی تعمیل کی۔ جب قاصد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس

---

[1] صفة الصفوة لابن الجوزي (١/ ٢٦٥)

یہ چیزیں لے کر گیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس قدر روئے کہ ان کے آنسوؤں سے زمین تر ہوگئی۔ وہ کہنے لگے:

''اللہ (حضرت) ابوبکر (رضی اللہ عنہ) پر رحم فرمائے، انھوں نے اپنے بعد والوں کو بڑی مشکل میں ڈال دیا ہے۔ اللہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پر رحمتیں نازل فرمائے! انھوں نے اپنے خلفاء کو سخت آزمایش میں ڈال دیا ہے۔ اللہ (حضرت) ابوبکر (رضی اللہ عنہ) پر رحم کرے انھوں نے اپنے بعد والوں کو شدید امتحان میں ڈال دیا ہے۔''[1]

ایک اور روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں: حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنی وفات کے وقت فرمایا:

''(حضرت) عمر (رضی اللہ عنہ) نے وظیفہ لینے کے لیے مجھے اس وقت تک نہیں چھوڑا جب تک میں نے دورانِ خلافت بیت المال سے چھ ہزار درہم نہ لے لیے۔ میرا فلاں مقام والا باغ اس کے بدلے بیت المال میں جمع کرا دینا۔''

جب آپ فوت ہو گئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ بات بتادی گئی۔ وہ کہنے لگے:

''اللہ تعالیٰ (حضرت) ابوبکر رضی اللہ عنہ پر رحم فرمائے! یقیناً انھوں نے یہ کام اس لیے کرنا پسند کیا کہ کسی کو کسی طرح کی تنقید کا موقع نہ ملے۔''[2]

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ان واقعات سے بیت المال کی امانت داری میں ان کے خوفِ الٰہی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس عظیم خلیفہ نے مسلمانوں کے امور کی نگہبانی کے لیے اپنے ذرائع آمدنی تجارت وغیرہ موقوف کر دیے اور خلافت کی ذمہ داریوں میں منہمک ہو گئے، اس لیے بیت المال سے اپنی ضرورت کے بقدر لینے پر مجبور ہوگئے۔ وہ صرف اس قدر لیتے تھے جس سے رگِ جان بحال رہے۔ ستر پوشی کا سامان ہو جائے، جبکہ وہ مسلمانوں کے لیے جو عظیم خدمات سرانجام دے رہے تھے ان کا حق تو ساری دنیا کے خزانے بھی ادا کرنے سے قاصر تھے، پھر جب ان کی موت قریب آئی تو انھوں نے مسلمانوں کا باقی ماندہ حقیر سامال بھی واپس کر دیا تاکہ وہ اپنے رب کے پاس پوری طرح مطمئن ہو کر جائیں، ان کا دل صاف ہو اور نفس پاکیزہ ہو۔ تقویٰ کے علاوہ ان کے کندھوں پر کوئی بوجھ نہ ہو۔ ان کے ہاتھ ایمان کے علاوہ ہر چیز سے خالی ہوں۔ بلاشبہ اس میں عقل والوں کے لیے زبردست تبلیغ اور نصیحت ہے۔[3]

---

[1] الطبقات لابن سعد (٣/ ١٤٦، ١٤٧)

[2] المنتظم لابن الجوزي (٤/ ١٢٧) أصحاب الرسول ﷺ لمحمود المصري (١/ ١٠٥)

[3] أشهر مشاهير الإسلام لرفيق العظم (١/ ٩٤)

اسی طرح بیت المال سے لیے گئے وظیفے کے بدلے میں اپنا باغ مسلمانوں کو دے دینا بھی آپ کے کمالِ ورع اور زہد کی دلیل ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کا عمل خالص اللہ کی رضا کے لیے ہو جائے اور وہ دنیوی آسائشوں میں سے کوئی حقیر سی چیز بھی حاصل نہ کریں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ''حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا مرض پندرہ دن جاری رہا حتیٰ کہ جب ۱۳ ھ، ۲۲ جمادی الآخرہ کو سوموار کا دن ہوا تو انھوں نے مجھ سے پوچھا: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کس دن فوت ہوئے تھے؟'' میں نے جواب دیا: ''سوموار کے دن۔'' تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''مجھے امید ہے کہ میں آج دن کو یا رات کو کسی وقت فوت ہو جاؤں گا۔'' پھر پوچھا: ''تم نے نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کتنی چادروں میں کفن دیا تھا؟'' انھوں نے جواب دیا: ''یمن کی دھاری دار تین چادروں میں۔ اس میں قمیص اور عمامہ نہیں تھا۔''

کفن کے لیے وصیت:

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''میری چادر میں زعفران یا گیرو کا نشان ہے۔ اسے دھو دینا اور دیگر دو چادریں ملا کر میرا کفن بنا دینا۔''[1]

اُن سے عرض کی گئی: ''اللہ تعالیٰ نے ہمیں بہت کچھ عطا کیا ہے۔ خوب احسان فرمایا ہے، ہم آپ کو نئی چادروں میں کفن دیں گے۔'' انھوں نے فرمایا:

''زندہ شخص کو نئے لباس کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے تاکہ اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکے، جبکہ میت کا انجام تو گلنا سڑنا اور لباس کا بوسیدہ ہونا ہے۔''[3]

غسل کے لیے وصیّت:

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے وصیت کی کہ انھیں ان کی بیوی حضرت اسماء بنت عُمیس رضی اللہ عنہا غسل دیں اور انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں دفن کیا جائے۔ اس دنیا سے رخصت ہوتے وقت حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کی زبان سے جو آخری صدا نکلی، وہ قرآنِ پاک کی یہ آیتِ مبارکہ تھی:

﴿ رَبِّ قَدْ اٰتَیْتَنِیْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِیْ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ ۚ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

[1] أصحاب الرسول ﷺ لمحمود المصری (١/ ١٠٦)

[2] التاريخ الإسلامي لمحمود شاكر (ص: ١٠٤)

اَنْتَ وَلِيّٖ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ﴾ [یوسف: ۱۰۱]

''مالک میرے تو نے مجھے حکومت میں سے کچھ دیا اور خوابوں کی تعبیر بھی کچھ سکھلائی۔ اے آسمانوں اور زمین کے بنانے والے تو ہی میرا والی ہے (سب کاموں کا بنانے والا کریم کارساز) دنیا اور آخرت دونوں میں مجھے اپنا تابعدار رکھ کر دنیا سے اٹھالے اور نیک بندوں سے مجھے ملا دے۔''

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وفات پر اہلِ مدینہ بہت غمگین ہوئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد آپ کی وفات اہلِ مدینہ کے لیے نہایت حُزن و ملال کا باعث بنی۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ بہت روئے۔ تیزی سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے گھر آئے اور آپ کے قریب کھڑے ہو کر فرمایا: ''اے ابوبکر (رضی اللہ عنہ)! اللہ آپ پر رحم فرمائے، آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب دوست، ثقہ رازداں اور مشیرِ خاص تھے۔ آپ نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا اور سب سے زیادہ یقین وایمان والے تھے۔ سب سے زیادہ اللہ کا خوف کھانے والے، اللہ کے دین میں سب سے زیادہ مضبوط اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے بڑھ کر محافظ تھے۔ اسلام کے سب سے بڑھ کر شیدائی تھے اور سب سے بہترین ساتھی تھے۔ آپ کے مناقب سب سے اعلیٰ ہیں۔ ہر نیک کام میں سب سے آگے رہے۔ آپ کا درجہ سب سے بلند ہے۔ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت وکردار کے سب سے زیادہ مشابہ تھے۔ آپ سب سے افضل مقام ومرتبے والے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے زیادہ مکرّم تھے۔ اللہ آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کی طرف سے افضل ترین جزاء عطا فرمائے۔ آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق اُس وقت کی جب لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلا رہے تھے۔ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کان اور آنکھوں کی حیثیت رکھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنی کتاب میں صدیق قرار دیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَالَّذِيْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴾ [الزمر: ۳۳]

''اور جو شخص سچائی (دینِ حق) لے کر آیا اور جس نے اس کی تصدیق کی، وہی لوگ متقی ہیں۔''

آپ نے اُس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کی جب لوگوں نے بخل کیا۔ جب مشکلات میں لوگ پیچھے ہٹ گئے تو آپ نے نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دیا اور سب سے اعلیٰ ساتھ مشکلات کے وقت کا ساتھ ہے۔ آپ غار میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے اور اللہ نے آپ کو ''ثانی اثنین'' کے لقب سے پکارا ہے۔

آپ نبیِ مکرم ﷺ کو تسلی دینے والے تھے۔ ہجرت میں آپ ﷺ کے ساتھ تھے۔ جب لوگ مرتد ہوئے تو آپ نے اللہ کے دین اور نبیِ اکرم ﷺ کی امت میں بہترین جانشینی کی۔ آپ نے وہ کردار ادا کیا کہ کسی نبی کے ساتھی نے ایسا کردار ادا نہیں کیا ہوگا۔

آپ رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے عین مطابق بدنی طور پر کمزور مگر اللہ کے معاملے میں نہایت طاقتور تھے۔ اللہ کی قسم! آپ بہت آگے نکل گئے اور آپ نے پیچھے والوں کو تھکا دیا۔ اور آپ شاندار کامیابی سے ہمکنار ہو گئے۔ ہم آپ کی وفاتِ حسرت آیات پر "إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ" پڑھتے ہیں۔ ہم اللہ کی قضا پر راضی ہیں۔ اللہ کی قسم! رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد آپ کی وفات جتنا صدمہ مسلمانوں کو کبھی نہ ہو گا۔ آپ دین کے لیے عزت، حفاظت اور حمایت کا سبب تھے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے نبی حضرت محمد ﷺ کے ساتھ ملائے اور ہمیں آپ کے اجر و ثواب سے محروم نہ کرے، نہ آپ کے بعد گمراہ کرے۔'' (آمین) حضرت علی رضی اللہ عنہ کا کلام پورا ہونے تک لوگ خاموش رہے، پھر وہ زار و قطار رونے لگے اور بآواز بلند کہنے لگے: ''آپ نے بالکل سچ کہا ہے۔''[1]

ایک اور روایت میں ہے کہ جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو کفن دے دیا گیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ فرمانے لگے:

''مجھے اس کفن میں لپٹے ہوئے شخص سے بڑھ کر کوئی شخص محبوب نہیں جو اپنے درخشاں نامۂ اعمال کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے پاس جا رہا ہے۔''[2]

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تریسٹھ برس کی عمر میں فوت ہوئے۔[3] تمام روایات اس پر متفق ہیں۔ انھوں نے رسول اللہ ﷺ جتنی عمر پائی۔ آپ کی وصیّت کے مطابق آپ کی بیوی حضرت اسماء بنت عُمیس رضی اللہ عنہا نے آپ کو غسل دیا اور آپ کو رسول اللہ ﷺ کے پہلو میں دفن کیا گیا اور آپ کا سر رسول اللہ ﷺ کے کندھوں کے برابر رکھا گیا۔[4]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ کی نماز جنازہ پڑھائی۔ آپ کو قبر میں اتارنے کے لیے حضرت عمر، عثمان،

---

[1] التبصره لابن الجوزي (١/ ٤٧٧_٤٧٩) بحواله أصحاب رسول اللّٰه ﷺ لمحمود المصري (١/ ١٠٨)

[2] تاريخ الإسلام للذهبي (٣/ ١٢٠)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٥٢)

[4] الطبقات لابن سعد (٣/ ٢٠٣_٢٠٤) تاريخ الإسلام للذهبي (٣/ ١٢٠)

طلحہ اور آپ کا بیٹا عبد الرحمٰن رضی اللہ عنہم قبر میں اترے۔ آپ کی لحد کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کے ساتھ ملا دیا گیا۔[1] اللہ تعالیٰ نے وفات کے بعد بھی انھیں یہ اعزاز بخشا کہ وہ جس طرح زندگی میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے، وفات کے بعد بھی روضۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں انہی کے ساتھ ہیں۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ آفاقِ عالم میں دینِ الٰہی کی نشر و اشاعت کے لیے عظیم جہاد کرنے کے بعد دنیا سے اس طرح رخصت ہوئے کہ انسانی تاریخ اس عظیم ہستی کو ہمیشہ یاد رکھے گی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا پرچم ہر طرف لہرایا اور آپ کے لگائے ہوئے پودے کی آبیاری کی۔

تاریخِ انسانی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ہمیشہ شاندار الفاظ میں یاد کرتی رہے گی کیوں کہ انھوں نے اپنے شاندار جہاد اور عظیم صبر و ثبات کے ذریعے سے دورِ ارتداد میں دینِ اسلام کی حفاظت کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعے مسلمانوں کو عظیم اور مثالی فتوحات سے نوازا جن کی بدولت دعوتِ اسلام قریہ قریہ، نگر نگر، شہر شہر اکنافِ عالم میں پھیلتی چلی گئی۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم خیر الانبیاء علیہم السلام ہیں۔ زمین پر چلنے والوں میں سے سب سے اعلیٰ و برتر ہیں۔ رسولوں کے صحابہ میں سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم سب سے عظیم ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما سب سے افضل ہیں۔ وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کے لیے پیدا کیے گئے۔ یہی وہ دو احباب ہیں جو ہمارے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت کے لیے میدان میں نکل آئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کی۔ وہ دونوں نبیِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سُسر ہیں۔ ان دونوں کی بیٹیاں وحیِ الٰہی کی روشنی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوب بیویاں ہیں۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے والد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا کے والد حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلیٰ ترین صحابہ ہیں۔

یہ دونوں والد اور دونوں بیٹیاں کیسے خوش نصیب لوگ ہیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ آپ کے ایسے وزیر ہیں جو ہر فضیلت والے عمل میں باہم مقابلہ کرتے ہیں۔ وہ دونوں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھیں اور کان ہیں۔ دونوں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبرِ مبارک کے پاس محوِ استراحت ہیں۔ وہ دونوں مسلمانوں کے لیے نہایت مشفق اور دینِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مضبوط پہاڑ تھے۔

[1] أصحاب رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم لمحمود المصري (١/ ١٠٦)

ان دونوں میں سے زیادہ پاکیزہ، زیادہ قوی، زیادہ اللہ سے ڈرنے والے، ظاہر اور باطن میں زیادہ متقی، دونوں میں سے زیادہ بلند کردار و مقام، تزکیے کے اعلیٰ منصب پر فائز، دونوں میں سے زیادہ نیک اور اعمال صالحہ میں برتر حضرتِ صدیق رضی اللہ عنہ ہیں جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے یارِ غار ہیں۔ ان کے فضائل و اکرام کے بارے میں کسی سچے اور کھرے انسان کو کبھی کوئی شک نہیں گزرا۔ وہ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم کے سردار، ان میں سے بہترین اور حقیقی طور پر امام ہیں۔ وہ حضرت عائشہ صدیقہ طاہرہ مطہّرہ رضی اللہ عنہا کے والد ہیں جن کی پاکیزگی اور طہارت کا بیان فرقانِ حمید کی سورۂ نور میں چمک رہا ہے۔[1]

خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی شاندار تاریخ اور سیرت و کردار، ایمان اور صحیح اسلامی تعلیمات کے وہ مضبوط ترین مصادر ہیں جن سے امتِ مسلمہ تاحال ایمانی حرارت پا رہی ہے اور دعوتِ اسلامی کا سبق لے رہی ہے۔ اس سے لوگوں کے دلوں میں حق کے چراغ اس حقیقت کے باوجود روشن ہیں کہ اعدائے اسلام اس دعوت و کردار کو مٹانے کے لیے شام و سحر کوشاں ہیں۔

- بلاشبہہ مسلمان بلکہ پوری انسانیت آج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم کے فضائل کی معرفت کی شدید محتاج ہے۔ انھیں یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے فضائل و اکرام کا سبب کیا تھا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت نے ان پر کیا اثرات مرتب کیے؟ اور انھیں وہ کون سا عالی مقام حاصل ہوا جس کی بدولت یہ لوگ انسانی تاریخ کے انتہائی محترم و ممتاز انسان بن گئے۔
- تاریخِ اسلام عموماً اور ابتدائے اسلام کی تاریخ خصوصاً رافضیوں، مستشرقین، یہود و نصاریٰ اور سیکولر مؤرخین کی غلط تاویلوں، قطع و برید، تحریف و تبدیل اور شکوک و شبہات کے لیے تختۂ مشق بنی ہوئی ہے۔ اس لیے امتِ مسلمہ کے ہر فرد پر فرضِ کفایہ ہے کہ وہ حقائق کی تصحیح کا فریضہ انجام دے۔ ہر وہ شخص جو صدرِ اسلام کی تاریخ کی تصحیح کی طاقت رکھتا ہے اس پر فرض ہے کہ وہ اس کام کو افضل ترین عبادت سمجھ کر کرے۔ اور اس کام میں پوری تندہی سے فوراً مصروف ہو جائے تاکہ امت کے جوانوں کو اپنے سلف صالحین کی بہترین مثال مل سکے جن کی وہ اقتداء کریں، تاریخِ اسلام کا روشن دَور واپس لائیں اور سلف کی سیرت اپنا کر اپنی سیرت کا جوہر چمکائیں۔
- حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی سیرت انتہائی عظیم الشان اسباق اور عبرتوں سے بھرپور ہے۔ وہ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم

[1] النونیه، القحطاني (ص: ۲۱۔۲۲)

کے بعد عظیم ترین اسلامی شخصیت ہیں۔ آپ اعلیٰ ترین اخلاق اور صفاتِ حمیدہ سے زمانۂ جاہلیت ہی سے متّصف تھے۔ آپ نے کبھی کسی بت کو سجدہ نہیں کیا اور نہ کبھی شراب نوشی کی۔

- حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نسب ناموں کے ماہر عالم تھے۔ ان کی اس خوبی کی بناء پر وہ عربوں میں بڑے ہر دلعزیز تھے، وہ کسی کو نسب کی وجہ سے طعن اور عام لوگوں کے بر خلاف کسی قوم کے عیوب بیان نہیں کرتے تھے۔ وہ قریش کے سب سے بڑے ماہرِ انساب تھے۔ قریش کے سب سے بڑے عالم تھے، اوران کی برائیوں اور بھلائیوں سے بخوبی واقف تھے۔ وہ بطورِ تاجر مشہور ہوئے۔ وہ زمانۂ جاہلیت ہی سے اپنا مال خرچ کرنے کی وجہ سے جود وسخاوت میں معروف تھے۔
- حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اللہ تعالیٰ کے خزانوں میں سے ایک خزانہ تھے جنھیں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مختص کر رکھا تھا۔ وہ قریش کے محبوب ترین شخص تھے۔ عفو و درگزر کی خوبی نے انھیں ہر دلعزیز بنا دیا تھا۔ آپ لوگوں سے اور لوگ آپ سے محبت کرتے تھے۔
- حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کمزور اور ستائے جانے والے مسلمانوں کو آزاد کرانے میں بھی بار بار نہایت فیاضی سے حصہ لیا حتیٰ کہ مسلمان قیادت نے باقاعدہ طور پر کمزور مسلمانوں کو ظالموں کے پنجۂ استبداد سے چھڑانے کی پالیسی کا اجراء کیا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اسلامی دعوت کو اپنے مال اور افراد سے مدد دی۔ آپ مومن غلاموں اور لونڈیوں کو خریدتے اور اللہ کی رضا کے لیے آزاد کر دیتے تھے۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو بھی آپ ہی نے غلامی کے استبدادی شکنجے سے آزاد کرایا تھا۔
- حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تمام غزوات میں شریک رہے۔ غزوۂ اُحد والے دن جب لوگ شکست کھا گئے تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ثابت قدم رہے۔ غزوۂ تبوک والے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا مرکزی سیاہ جھنڈا انہی کے حوالے کیا تھا۔
- حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی زندگی مدنی معاشرے میں بھی انتہائی رفیع الشان اسباق سے مزیّن ہے۔ آپ کے عہدِ خلافت نے ہمارے لیے اسلام کے فہم اور تطبیق ونفاذ کی بہترین مثال چھوڑی ہے۔ آپ کی شخصیت عظیم صفات کی وجہ سے دوسرے لوگوں سے ممتاز تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد احادیث میں ان کی تعریف و توصیف اور فضائل بیان فرمائے ہیں اور انھیں تمام صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم پر فوقیت دی ہے۔

- حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا اللہ تعالیٰ پر ایمان نا قابلِ تسخیر تھا۔ انھوں نے ایمان کی حقیقت کو پرکھا اور کلمۂ توحید اُن کی رگِ جاں میں پیوست ہو گیا۔ انھوں نے ساری زندگی ایمانی اثرات کے تحت گزاری۔ آپ نے اخلاقِ حسنہ اپنائے اور اخلاقِ سیّئہ سے اجتناب کیا۔ آپ اللہ کی شریعت پر گامزن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء کے متوالے تھے۔ آپ کے دل میں عظیم ایمان تھا جس میں کوئی صحابی آپ کے برابر نہ تھا۔
- حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تمام لوگوں سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس کا خوف رکھتے تھے۔ امتِ مسلمہ کا اتفاق ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ امت کے سب سے بڑے عالم ہیں۔ آپ کی فوقیت کی وجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طویل صحبت ہے۔ آپ دن رات، سفر و حضر میں ہمیشہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہتے تھے اور رات کو عشاء کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مسلمانوں کے معاملات و مسائل پر گفتگو کیا کرتے تھے۔
- مدینہ منورہ سے اوّلین حج میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں امیرِ حج مقرر کیا تھا۔ عبادات میں مناسکِ حج سب سے مشکل ہیں۔ اگر ان کا علم وسیع نہ ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم انھیں امیرِ حج مقرر نہ کرتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو نماز میں اپنا جانشین بھی بنایا تھا۔ اگر نماز کے مسائل کا علم نہ ہوتا تو آپ انھیں امام مقرر نہ کرتے لیکن آپ نے ان کے علاوہ کسی اور کو حج کا امیر یا نماز کا امام مقرر نہیں کیا۔ یہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی علمی عظمت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔
- جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہوئے تو لوگ مضطرب ہو گئے۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ذریعے امت کو ثابت قدم رکھا۔ آپ نے عظیم کردار ادا کرتے ہوئے فرمایا:

  ’’جو شخص حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کرتا تھا تو بے شک حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہو گئے ہیں اور جو شخص اللہ کی عبادت کرتا تھا تو بے شک اللہ زندہ ہے اور اسے کبھی موت نہیں آئے گی۔‘‘

  اسی طرح حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے سقیفہ بنی ساعدہ میں بھی اہم کردار ادا کیا، جبکہ انھوں نے انصار کو اپنے حقیقی موقف پر مطمئن کر دیا اور مسلمانوں کے درمیان کوئی فتنہ پیدا نہیں ہونے دیا۔ انھوں نے کتاب وسنت سے انصار کے فضائل بیان کر کے ان کی تعریف کی۔
- سقیفہ بنی ساعدہ کے مکالمے کے بعد حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی

تھی اور وہ اپنی امارت کے حق دار ہونے کے سابقہ مؤقف سے دستبردار ہو گئے تھے۔ انھوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کو تسلیم کر لیا۔

اس موقع پر ان کے چچا زاد بھائی حضرت بشیر بن سعد رضی اللہ عنہ نے سب سے پہلے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کی تھی، چنانچہ اس بیعت کے متعلق کوئی چھوٹا یا بڑا بحران صحیح روایات سے ثابت نہیں۔ اسی طرح کسی قسم کی تقسیم اور گروہ بندی بھی ثابت نہیں کہ ان میں سے ہر ایک خلافت کا دعوایدار ہو جیسا کہ بعض مؤرخین نے باور کرانے کی ناکام کوشش کی ہے۔ اس کے برعکس اسلامی اخوت ومودّت پہلے کی طرح قائم تھی بلکہ پہلے سے زیادہ بڑھ گئی تھی جیسا کہ صحیح روایات سے ثابت ہے۔

- قرآنی آیات اور احادیثِ نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے اشارے موجود ہیں۔ اہلِ سنت و الجماعت کے سلف و خلف کا اجماع ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنی فضیلت، سبقتِ اسلام اور نمازوں میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر امام بننے کی وجہ سے نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلافت کے سب سے زیادہ مستحق تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو نمازوں کی امامت سونپی تو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم بھی نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد سمجھ گئے تھے، اسی لیے تمام صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے بالاتفاق انھیں اپنا خلیفہ چن لیا۔
- امتِ مسلمہ نے سلطنت کے امور کی نگرانی کے لیے خلافتِ اسلامی کا منہج وطریقہ اپنایا اور اسی پر اتفاق ہے۔ خلافت کی ابتداء امت کی ضرورت سے ہوئی اور پھر امت نے اسے قبول کر لیا، اسی لیے انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ کے چناؤ میں جلدی کی، چنانچہ خلافت ہی مسلمانوں کا اصل نظامِ حکومت ہے جس کا آئین قرآن وسنت سے لیا گیا ہے۔

فقہائے کرام نے خلافتِ اسلامیہ کی بنیادوں پر گفتگو کرتے ہوئے شوریٰ اور بیعت کو بنیاد قرار دیا ہے اور ان دو اصولوں کی دلیل قرآن مجید میں موجود ہے۔

- علّامہ ابو الحسن ندوی رحمہ اللہ نے خلافت کی شرائط اور تقاضوں پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ انھوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی سیرت و کردار کی روشنی میں دلائل و براہین سے ثابت کیا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ میں خلافتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام شرائط موجود تھیں۔
- حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ دنیا بھر میں اللہ کے دین کی نشر وشاعت کے لیے عظیم جہاد کرنے کے بعد

اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ تاریخِ انسانی اس عظیم المرتبت خلیفہ کو ہمیشہ یاد رکھے گی جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اسلامی دعوت کا پرچم تھاما۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لگائے ہوئے پودے کی حفاظت کی، عدل وانصاف اور حریت کے بیج بوئے اور شہداء کے پاکیزہ خون سے انھیں سیراب کیا۔ انھوں نے تاریخ میں علوم وثقافت اور فکر ونظر میں عظیم سبقت حاصل کی۔

تاریخِ انسانی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو کبھی بھلا نہ پائے گی کیوں کہ انھوں نے اپنے شاندار جہاد اور عظیم صبر وثبات کے ذریعے سے فتنۂ ارتداد کے دوران اللہ کے دین کی حفاظت کی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعے دینِ اسلام کو اقوامِ عالَم، ملکوں اور قبیلوں میں پہنچایا اور یہ کام عظیم فتوحات کے ذریعے سے انجام پایا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی آواز باطل کے خلاف ایک للکار تھی۔ یہ آواز خاموش ہوگئی لیکن اس کی گونج قیامت تک باقی رہے گی اور رفیقِ نبوت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ مسلمانوں کے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی قربانیوں اور وفاداریوں سے تاریخ بھری پڑی ہے۔ اسی طرح باقی تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کا بہت ہی مقام ومرتبہ ہے، ان کے لیے یہی شرف کیا کم ہے کہ انھوں نے حالتِ ایمان واسلام میں نبیٔ آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کے رُخِ انور کو دیکھنے کی سعادت حاصل کی، وہ چہرۂ انور، رخِ زیبا کہ جس کا ایمان کی حالت میں دیکھ لینا فوز وفلاح اور فتح ونصرت کا ضامن ہے، قدسی نفوس صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

«خَيْرُ أُمَّتِي قَرْنِي ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ»[1]

''میری امت کے بہترین لوگ میرے زمانہ کے لوگ [صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم] ہیں، پھر وہ لوگ جو ان کے بعد والے [تابعین رحمہم اللہ] ہیں، پھر وہ لوگ جو ان کے بعد والے [تبع تابعین رحمہم اللہ] ہیں۔''

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: جس نے میرے کسی ولی سے دشمنی رکھی، اس سے میرا اعلانِ جنگ ہے۔''[2]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٦٥٠) صحيح مسلم مع شرح النووي (٨/ ١٦/ ٨٤ تا ٨٨)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٥٠٢)

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''میرے صحابہ کو گالی نہ دو۔قسم اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اگر تم سے کوئی اُحد پہاڑ کے برابر بھی سونا خرچ کر لے تو ان (صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین) میں سے (ثواب کے لحاظ سے) کسی کے ایک مُد (مُٹھی بھر) یا نصف مُد کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔''[1]

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جس نے میرے صحابہ کو گالی دی، اس پر اللہ تعالیٰ کی، فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی لعنت ہے۔''[2]

سیدنا علی رضی اللہ عنہ اللہ کی قسم اٹھا کر بیان فرماتے ہیں کہ نبیِ کریم ﷺ کا مجھ سے یہ عہد ہے کہ مجھ سے مومن ہی محبت کرے گا اور صرف منافق ہی مجھ سے بُغض رکھے گا۔[3]

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''انصارِ مدینہ سے محبت ایمان کی علامت ہے اور ان سے بُغض رکھنا نفاق کی علامت ہے۔''[4]

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''انصار سے صرف مومن ہی محبت کرتا ہے اور ان سے صرف منافق ہی بُغض رکھتا ہے۔جس نے ان سے محبت کی اللہ اس سے محبت کرے گا اور جو ان سے بُغض رکھے گا اللہ اس سے بُغض رکھے گا۔''[5]

اختتام:

اللہ تعالیٰ کے مذکورۂ سابقہ ارشادات اور نبیِ اکرم ﷺ کی یہ احادیث دیکھ لینے کے بعد کسی کو یہ حق نہیں کہ وہ کسی بھی صحابی کے بارے میں کوئی ایسی بات کرے جس سے بے ادبی و گستاخی کا پہلو نکلتا ہو، کیونکہ یہ ایمان کی بربادی کے مترادف ہے، ہمیں رسولِ اکرم ﷺ کی فرمانبرداری کرنی ہے۔ اور آپ ﷺ کی اطاعت اور فرمانبرداری کا تقاضا یہی ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے باہمی اختلافات پر بحث کرنے کے بجائے مکمل طور پر خاموشی اختیار کی جائے۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٦٧٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٤١)

[2] صحيح الجامع، رقم الحديث (٦٢٨٥)

[3] صحيح مسلم، الايمان، الدليل على ان حب الانصار وعلي رضي الله عنه من الإيمان، رقم الحديث (٧٨)

[4] صحيح البخاري، الإيمان، علامة الإيمان حب الأنصار، رقم الحديث (١٧) صحيح مسلم، الايمان، حب الانصار وعلي رضي الله عنه من الإيمان، رقم الحديث (٧٤)

[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٧٨٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٧٥)

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارکہ کے بعد صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم ہی وہ پاکباز اور مقدس ہستیاں ہیں جو انتہائی خوف اور دہشت کے ماحول میں سخت ترین آزمایشوں کے باوجود ایمان لائے اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت کا حق ادا کیا۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اس اعتبار سے پوری امت کے مُحسن ہیں کہ انھوں نے قرآنِ مجید کی حفاظت فرمائی۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتِ مطہرہ کو محفوظ کیا اور دنیا میں اسلام کی نشر و اشاعت کے لیے اپنے گھر بار چھوڑے، ہر طرح کی سختیاں اور تکلیفیں برداشت کیں، اللہ تعالیٰ کا دین دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پہنچایا۔ اور یہ وہی دینِ اسلامی ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے پسند فرمایا ہے۔ اس دینِ اسلام پر اللہ ہمیں ثابت قدم رکھے۔ آمین۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے اس احسان کا تقاضا یہ ہے کہ ان میں سے کسی ایک کے بارے میں بھی زبان پر کوئی ناشائستہ کلمہ لانے کی جسارت نہ کی جائے بلکہ دل کی گہرائیوں سے سب کا ایک جیسا ادب و احترام کیا جائے، ہمارے دل ان کے لیے جذبۂ تشکّر سے معمور رہنے چاہئیں اور زبانوں پر ان کے لیے دعائے مغفرت رہنی چاہیے۔ اللہ کے ولیوں میں سے سب سے پہلے نمبر پر صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ہیں جن سے اللہ کے راضی ہونے کا سرٹیفکیٹ قرآنِ کریم میں موجود ہے۔

لہٰذا اگر کوئی کسی کی پیروی کرنا چاہتا ہے تو وہ ان کی پیروی کرے جو فوت ہو چکے ہیں، یعنی صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی کیوں کہ زندہ لوگوں کے بارے میں اندیشہ ہے کہ وہ کسی فتنے میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ اللہ کی قسم! رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اس امت کے افضل ترین افراد تھے، دلوں کے سچے، علم میں پختہ اور تکلّف سے بے نیاز تھے، ایسے لوگ جنھیں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مخلص جان نثار کی حیثیت اور اپنے دین کی مضبوطی اور نفاذ کے لیے منتخب فرمالیا۔ اور ہمیں انھی کے نقشِ قدم پر چلنا ہے، بلاشبہ وہ صراطِ مستقیم پر گامزن تھے۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم دعوت و عمل کے عظیم پیکر تھے۔ خیر القرون میں جنم لینے والے انھی لوگوں نے امت کو قرآنِ کریم کی تعلیم دی، حدیث کو روایت کیا اور علم کی کرنوں سے زمین کو منور کیا۔

اللہ ان پر اپنی بے شمار رحمتیں برسائے۔ جنھوں نے ایمان میں ہم سے پہل کی، اے اللہ! ہمارے دلوں میں اہلِ ایمان کے لیے کوئی کینہ نہ رکھ۔ اے ہمارے رب! بے شک تو بہت نرمی والا نہایت رحم فرمانے والا ہے۔ اے اللہ! ہمارے دلوں میں ان کے لیے پیار و محبت اور احترام کا مزید جذبہ پیدا فرما دے، اور قیامت کے دن ہمیں ان کے ساتھ ملا دینا۔ آمین ثم آمین

مصادر ومراجع

سیرت سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ

- تفسیر ابن کثیر، تفسیر حافظ صلاح الدین یوسف
- صحیح بخاری
- صحیح مسلم
- جامع الترمذی
- سنن ابن ماجہ
- سیرتِ نبوی، تالیف: ڈاکٹر مہدی رزق اللہ احمد۔ ترجمہ: شیخ الحدیث حافظ محمد امین
- سیرت امام الانبیاء، تالیف: شیخ ابوعدنان محمد منیر قمر
- سیرت ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ، تالیف: ڈاکٹر علی محمد الصلابی۔ ترجمہ: مولانا محمد اجمل بھٹی
- صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ، تالیف: مولانا سعید احمد اکبر آبادی
- روشنی کے مینار، تالیف: مولانا عبدالمالک مجاہد
- تاریخِ اسلام، تالیف: محمد اکبر شاہ نجیب آبادی رحمہ اللہ
- لشکرِ اسامہ کی روانگی، تالیف: ڈاکٹر فضل الٰہی
- متعدد علمی ویب سائٹس

باب 2

سیرت

سیدنا عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ

خلیفۂ ثانی امیر المومنین حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ کی مختصر سیرت

حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ کی سیرت، چند جھلکیاں:

مسلمانوں کے خلیفۂ ثانی، عادِل حکمران، فاتحِ روم و فارس، شہیدِ محراب، امیر المومنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ جن کا شمار عشرہ مبشرہ میں ہوتا ہے، انھیں متعدد مواقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت کی بشارت سنائی تھی۔ ان کے متعلق نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جس راستے پر عمر (رضی اللہ عنہ) چلتے ہیں شیطان اُس راستے سے ہٹ جاتا ہے۔''[1]

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے متعلق ہی نبیِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے:

«لَوْ كَانَ نَبِيٌّ بَعْدِيْ لَكَانَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ»[2]

''اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو وہ عمر بن خطاب (رضی اللہ عنہ) ہوتا۔''

خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی تاریخ نہایت قیمتی نصائح اور قابلِ اتباع امور سے لبریز ہے۔ یہ تمام قیمتی باتیں تاریخ، حدیث، فقہ، ادب، تفسیر، تراجم اور جرح و تعدیل کی کتابوں میں بکھری ہوئی ہیں، خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کا دور نہایت قیمتی اسباق اور قابلِ اتباع واقعات سے مالا مال ہے، انھی کے متعلق سورۃ التوبہ (آیت: ۱۰۰) میں خود اللہ تعالیٰ کا ارشادِ گرامی ہے:

﴿ وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴾

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٦٨٣)

[2] صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٦٨٦) مسند أحمد (٧٤٠٥) السلسلة الأحاديث الصحيحة، رقم الحديث (٣٢٧)

''اور سبقت لے جانے والے مہاجرین و انصار میں سے پہلے لوگ اور وہ لوگ جو نیکی کے ساتھ اُن کے پیچھے آئے، اللہ اُن سے راضی ہوگیا اور وہ اس سے راضی ہوگئے اور اس نے اُن کے لیے ایسے باغات تیار کیے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، اُن میں ہمیشہ ہمیش رہنے والے ہیں، یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔''

نیز سورۃ الفتح (آیت: ۲۹) میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

﴿ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ۡ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ۚ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ۚ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ ۚ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْـَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ۚ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ﴾

''محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کافروں پر بہت سخت ہیں، آپس میں نہایت رحم دل ہیں، آپ انھیں اسی حال میں دیکھیں گے کہ رکوع کرنے والے ہیں، سجدے کرنے والے ہیں، اللہ کے فضل اور رضا مندی کی جستجو میں ہیں، اُن کی یہی مثال تورات میں ہے اور انجیل میں اُس کھیتی کی مثل جس نے اپنی کونپل نکالی پھر اُسے مضبوط کیا اور وہ موٹا ہوگیا پھر اپنے تنے پر سیدھا کھڑا ہوگیا اور کیسانوں کو خوش کرنے لگا تا کہ اُن کی وجہ سے کافروں کو چڑائے، ان ایمان والوں اور نیک اعمال والوں سے اللہ نے بخشش کا اور بہت مڑے ثواب کا وعدہ کیا ہے۔''

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے اسلامی احکام کے نفاذ اور اِس کرۂ ارض کے طول وعرض میں انھیں پھیلانے کا بیڑا اٹھایا۔ ان کا زمانہ بہترین زمانہ تھا۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا یہ دور اتنا مبارک تھا جس سے اہلِ ایمان کو روحانی غذاء، اخلاقی تربیت، عقل کو روشنی اور ہمتوں کو مہمیز مل سکتی ہے اور افکار میں پختگی آسکتی ہے۔ اُن کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''میرے سب سے بہترین امتی وہ ہیں جن کے دور میں مَیں مبعوث ہوا۔''[1]

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۵۳٤)

سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ دوسرے خلیفۂ راشد تھے جو سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بعد سب سے بلند مقام پر فائز ہوئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ان خلفاء کی اتباع کرنے اور ان کی سیرت اپنانے کا حکم دیا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

«عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ مِنْ بَعْدِي»[1]

''تم میری اور میرے بعد میرے ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کی سنت کی پیروی التزام کے ساتھ کرو۔''

حضرات انبیاء و رسل علیہم السلام اور سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بعد سیدنا عمر رضی اللہ عنہ دنیا کے سب سے بہترین آدمی تھے۔ ان کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:

«اِقْتَدُوا بِالَّذَيْنِ مِنْ بَعْدِي، اَبِي بَكْرٍ وَّ عُمَرَ»[2]

''میرے بعد ان دو افراد ابوبکر اور عمر (رضی اللہ عنہما) کی پیروی کرو۔''

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے فضائل و مناقب میں بہت سی احادیث وارد ہوئی ہیں۔ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

''یقیناً تم سے پہلی امتوں میں کچھ لوگ الہام یافتہ ہوتے تھے، اگر میری امت میں کوئی ہے تو وہ عمر (رضی اللہ عنہ) ہے۔''[3]

ایک موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''میں نے نیند میں دیکھا کہ ایک کنویں پر چرخی سے ڈول کھینچ رہا ہوں، اتنے میں (حضرت) ابوبکر (رضی اللہ عنہ) آ گئے، انھوں نے ایک یا دو ڈول پانی نکالا، ان کے نکالنے میں کمزوری کے آثار تھے۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے! پھر (حضرت) عمر بن خطاب (رضی اللہ عنہ) آئے اور پانی نکالنا شروع کیا تو وہ ڈول ایک بڑے ڈول میں تبدیل ہو گیا۔ میں نے ان جیسا قوی آدمی نہیں دیکھا جو ان جیسا کام کرتا ہو۔ انھوں نے پانی کے ڈول نکالے، یہاں تک کہ لوگ سیراب

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٦٠٧) جامع الترمذي، رقم الحديث (٢٦٧٦) المستدرك للحاكم (١/ ١٩٦) صحيح الترغيب والتهذيب (٣٧)

[2] جامع الترمذي، رقم الحديث (٣٦٦٢) صحيح سنن الترمذي للألباني (٣/ ٥٠٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٩٧) مسند أحمد (٢٣٢٩٤)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٦٨٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٩٨)

ہو گئے اور انھوں نے اونٹوں کو پانی پلا کر آرام کی جگہ بٹھایا۔"[1]

بلاشبہہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حیاتِ طیبہ اسلامی تاریخ کا وہ روشن باب ہے جس سے ساری اسلامی تاریخ جگمگا رہی ہے۔ عزت، بزرگی، اخلاص، جہاد اور دعوت فی سبیل اللہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جو بلند درجہ حاصل ہوا وہ تاریخِ عالَم میں کسی کو حاصل نہ ہو سکا۔

نام، نسب، کنیّت اور القاب:

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا نسب نامہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کعب بن لوی بن غالب پر پہنچ کر ایک ہو جاتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی کنیت ابوحفص اور لقب فاروق تھا۔ انھوں نے مکہ مکرمہ میں سب کے سامنے اسلام کا اعلان کیا اور اللہ تعالیٰ نے ان کی وجہ سے کفر اور ایمان کے درمیان نمایاں فرق اور امتیاز پیدا کر دیا۔[2]

ولادت اور شکل وشباہت:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ عام الفیل کے تیرہ سال بعد پیدا ہوئے۔[3] حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا رنگ انتہائی سرخ و سفید تھا۔ رخسار، ناک اور آنکھیں نہایت خوبصورت، ہاتھ اور پاؤں بھاری تھے۔ بدن مضبوط، قد لمبا اور سر کے بال سامنے سے جھڑے ہوئے تھے، وہ لوگوں پر اس طرح فائق نظر آتے تھے جیسے وہ سوار ہوں اور لوگ پیدل چل رہے ہوں۔ وہ ایک طاقتور اور مضبوط انسان تھے۔ ان میں کسی کمزوری کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔[4] وہ اپنی ڈاڑھی کو مہندی لگاتے تھے۔ ان کی مونچھیں لمبی تھیں۔ چلتے تھے تو تیز تیز قدم اٹھاتے تھے۔ بلند آواز سے گفتگو کرتے تھے۔ کسی کو مارتے تھے تو پوری قوت سے مارتے تھے۔[5]

آپ کی بیویوں کی تعداد:

جن سے انھوں نے نکاح کیا وہ تیرہ تھیں۔ اُن میں وہ سب عورتیں شامل ہیں جن سے انھوں نے دورِ جاہلیت میں شادی کی یا دورِ اسلام میں، اسی طرح وہ تمام عورتیں بھی شامل ہیں جنھیں آپ نے طلاق

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٩٣)

[2] محض الصواب لابن عبد الهادي (١/ ١٣١) صحيح التوثيق في سيرة وحياة الفاروق عمر بن الخطاب (ص: ١٥)

[3] تاريخ الخلفاء للسيوطي (ص: ١٣٣)

[4] الخليفه فاروق عمر بن الخطاب للهاني (ص: ١٥)

[5] تهذيب الأسماء للنووي (٢/ ١٤)

دی یا جو شہادت کے وقت موجود تھیں۔[1]

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیٹی حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کو بھی نکاح کا پیغام بھیجا۔ حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کی عمر اس وقت چھوٹی تھی۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اس سلسلے میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو نمایندہ مقرر کیا۔ حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا نے جواب بھیجا کہ مجھے شادی کی ضرورت نہیں۔ یہ بات حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے سنی تو تعجب سے کہا: کیا تو امیر المومنین کا پیغام مسترد کرتی ہے؟

حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا نے جواب دیا: کیونکہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سخت زندگی بسر کرنے والے شخص ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس بات کا تذکرہ حضرت عَمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے کیا۔ حضرت عَمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو اس شادی سے روک دیا اور کہا کہ آپ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی بیٹی حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا سے نکاح کرلیں۔ اس طرح آپ کی آلِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے رشتہ داری بھی ہو جائے گی۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے یہ تجویز منظور کر لی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی صاحبزادی حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا نکاح سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے کر دیا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے چالیس ہزار درہم بطورِ حق مہر ادا کیے، حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کے بطن سے زید اور رقیہ رضی اللہ عنہا پیدا ہوئے۔[1]

آپ کی اولاد:

آپ کے بیٹوں اور بیٹیوں کی تعداد تیرہ تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حصولِ اولاد کے لیے شادی کرتے تھے۔ وہ خود فرماتے ہیں: مَیں اپنی بیویوں سے جماع اس لیے کرتا ہوں تاکہ اللہ تعالیٰ مجھے اولاد عطا فرمائے۔ مجھے شہوت رانی کا شوق نہیں ہے۔ حصولِ اولاد کا مقصد پیشِ نظر نہ ہو تو مجھے کسی عورت کو دیکھنے کی بھی پروا نہیں۔[3]

جاہلی دَور:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی زندگی کا بہت سا حصہ جاہلی دَور میں بسر کیا اور دیگر قریشیوں کی طرح ہی نشوونما پائی۔ ان کی ایک نمایاں خوبی یہ تھی کہ وہ پڑھنا لکھنا جانتے تھے اور ایسے افراد اہلِ مکہ میں گنے چنے ہی تھے۔[4]

---

[1] البداية والنهاية (٧/ ١٤٤)

[2] الكامل في التاريخ (٢/ ٢١٢)

[3] الشيخان أبوبكر وعمر برواية البلاذري تحقيق الدكتور احسان صدقى (ص: ٢٢٧)

[4] الإدارة الإسلامية في عهد عمر بن الخطاب، فاروق مجد لاوى، ص ٩٠)

وہ بچپن ہی سے ذمہ دار فرد کی حیثیت اختیار کر گئے تھے۔ انھوں نے کٹھن حالات میں نشو ونما پائی۔ ان کے گھر میں خوشحالی کا دور دور تک نشان نہیں ملتا تھا۔ ان کے باپ خطاب نے انھیں بچپن ہی سے سختی کے ساتھ اونٹ چرانے پر مامور کردیا۔ یہی وہ زندگی کا سخت ترین مرحلہ تھا جس نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شخصیت پر بڑا گہرا اثر چھوڑا اور اُس دَور کو وہ زندگی بھر یاد کرتے رہے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نہ صرف اپنے باپ کے لیے اونٹ چراتے تھے بلکہ اپنی خالہ کی بکریاں بھی چرایا کرتے تھے۔

اس میں شک نہیں کہ جاہلی دَور میں اونٹ چرانے کی وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ میں بہت سی خوبیاں، مثلاً: تحمل، طاقت، زور آزمائی اور جنگجوئی پیدا ہوگئی تھیں۔ یہاں یہ بھی جان لینا چاہیے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ زمانۂ جاہلیت میں صرف اونٹ یا بکریاں ہی نہیں چراتے تھے۔ بلکہ وہ عنفوانِ شباب میں فنونِ حرب وضرب کے ماہر ہو گئے تھے۔ وہ کُشتیاں لڑتے تھے۔ گُھڑ سواری کے ماہر تھے اور شعر وادب میں طاق ہو گئے تھے۔[1]

وہ اپنی قوم کی تاریخ اور اس کے تاریخی کردار کو خوب جانتے تھے۔ وہ جاہلیت کے دَور میں عرب کی بڑی بڑی منڈیوں عکاظ، مجنّہ اور ذو المجاز کا دورہ کیا کرتے تھے، اور وہاں سے تجارتی فوائد کے ساتھ ساتھ تاریخِ عرب کی معرفت بھی حاصل کیا کرتے تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک کامیاب تاجر بھی تھے، انھوں نے دورِ جاہلیت ہی میں مکی معاشرے میں اپنا ایک خاص مقام پیدا کر لیا تھا۔ وہ پیش آمدہ مسائل میں فیصلہ کن کردار ادا کرتے تھے۔ انھیں سرداری کی عظمت اپنے آباء و اجداد سے وراثت میں ملی تھی۔ قریش ان کے دادا نفیل بن عبد العزّیٰ کو اپنے معاملات میں ثالث مانتے تھے۔ ابن سعد کہتے ہیں: بلاشبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسلام سے قبل عرب والوں کے جھگڑے چکاتے تھے۔[3]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ دانا، فصیح و بلیغ، عمدہ رائے رکھنے والے، طاقتور، بردبار، شریف النفس، سردار اور اپنی حجت ودلیل میں طاقت اور وزن رکھنے والی شخصیت تھے۔ یہی وجہ تھی کہ قریش نے انھیں اپنا سفیر مقرر کررکھا تھا اور جب کسی قبیلے سے مفاخر بیان کرنے کا مقابلہ ہوتا تھا تو اس کام کے لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی کو منتخب کیا جاتا تھا۔[1]

---

[1] التاريخ الإسلامي العام لعلي حسن إبراهيم (ص: ٢٢٦) الإدارة الإسلامية في عهد عمر بن الخطاب (ص: ٩٠)

[2] الخليفة الفاروق عمر بن الخطاب للدكتور ماجد العاني (ص: ١٦)

[3] الخليفة الفاروق عمر بن الخطاب للدكتور ماجد العانى (ص: ١٦)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دورِ جاہلیت میں ایک لمبی زندگی گزاری تھی۔ انھوں نے جاہلیت کا دَور بڑی گہرائی سے دیکھا تھا۔ اس کی حقیقت کو سمجھا اور عادات واطوار کو جانا تھا اور اُس دَور کی ہر روایت اور رسوم ورواج کا پوری قوت سے دفاع کیا تھا۔ اسی لیے جب وہ مسلمان ہوئے اور انھیں اسلام کے جمالِ حقیقت سے آشنائی نصیب ہوئی تو ہدایت اور گمراہی اور کفر و ایمان کے درمیان بڑا واضح فرق نمایاں کردیا۔ اسی طرح حق و باطل کو جدا جدا کر کے رکھ دیا۔ انہی کا ایک مشہور قول ہے:

''بلاشبہہ اُس وقت اسلام کے کڑے ایک ایک کر کے توڑ دیے جائیں گے جب اسلام میں ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو جاہلیت کو نہ جانتے ہوں۔''[1]

قبولِ اسلام اور ہجرت:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دل میں سب سے پہلے ایمان کی کِرن اس وقت پھوٹی جب ہجرتِ حبشہ کا موقع آیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ قریش کی چند عورتیں مکہ مکرمہ سے ہجرت کی تیاری کررہی ہیں۔ وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور ان جیسے دوسرے افراد کی اذیت رسانیوں سے بہت پریشان تھیں اور اپنے آبائی شہر سے بہت دور جارہی تھی۔ انھیں دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دل نرم پڑ گیا۔ انھیں ان عورتوں پر رحم آیا۔ انھیں ان کے ضمیر نے ملامت کی۔ اور ان عورتوں سے ایسی ہمدردانہ باتیں کیں کہ یہ خواتین حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ایسے سلوک کی ہرگز امید نہیں رکھتی تھیں۔[2]

حضرت ام عبداللہ بنت ابوحثمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب ہم نے ہجرتِ حبشہ کا ارادہ کیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ میرے پاس آئے۔ ہم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف سے بڑی تنگی، تکلیف اور ظلم برداشت کر چکی تھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مجھ سے کہا: کیا کوچ کرنے کا ارادہ ہے؟ اے ام عبد اللہ! میں نے کہا: ہاں، اللہ کی قسم! ہم اللہ کی زمین میں نکل جائیں گی، یہاں تک کہ اللہ ہمارے لیے کشادگی کا سامان فراہم فرمادے۔ تم نے ہمیں بہت تکلیف دی ہے، ہم پر ظلم کے پہاڑ توڑے ہیں۔ میری بات سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دعائیہ کلمات کہے کہ اللہ تمھارا نگہبان ہو۔ میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اُس دن ایسی رقت آمیز حالت میں دیکھا کہ اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ حضرت عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ کسی ضروری کام کے لیے کہیں گئے ہوئے تھے، جب

[1] الفتاویٰ (١٥/ ٣٦) فرائد الكلام لخلفاء الكرام (ص: ١٤٤)

[2] الطنطاویات (ص: ١٢)

وہ واپس آئے تو میں نے سارا قصہ کہہ سنایا۔ حضرت عامر رضی اللہ عنہ نے کہا: شاید تیرا خیال ہے کہ عمر مسلمان ہو جائے گا؟ میں نے کہا: ہاں، میرا یہی خیال ہے۔ اس نے کہا: یہ اس وقت تک مسلمان نہیں ہو گا جب تک خطاب کا گدھا مسلمان نہ ہو جائے۔[1]

اس واقعے سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دل پر بڑا گہرا اثر پڑا۔ وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ میرا سینہ بلا وجہ ہی تنگ اور بند ہو چکا ہے۔ آخر وہ کون سی سختی، اذیت اور آزمایش ہے جسے ان لوگوں نے چپ چاپ برداشت نہ کیا ہو لیکن پھر بھی یہ لوگ اپنے نئے دین پر ڈٹے ہوئے ہیں۔ آخر یہ کیسی زبردست خرقِ عادت قوت ہے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ باتیں سوچتے سوچتے غمگین ہو گئے اور ان کے دل میں بے قراری کی لہر دوڑ گئی۔[2]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس واقعے کے کچھ دن بعد ہی مسلمان ہو گئے۔ ان کے اسلام لانے میں بنیادی طور پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اُس دعا کا اثر تھا، جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:

''اے اللہ! ابوجہل بن ہشام یا عمر بن خطاب میں سے جو تجھے زیادہ محبوب ہے، اسے اسلام کی توفیق دے کر اسلام کو قوت عطا فرما۔''

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اللہ تعالیٰ کے زیادہ محبوب تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے قبولِ اسلام کے اسباب فراہم فرما دیے۔[3] سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کے بارے میں بہت سی روایات وارد ہیں لیکن سند کے اعتبار سے اکثر روایات میں کلام ہے اور وہ صحت کے درجے تک نہیں پہنچتیں۔[4]

سیرت کی کتابوں اور تاریخ سے لی جانے والی روایات کو سامنے رکھتے ہوئے ہم سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے اور پھر اسلام کا اعلان کرنے کے بارے میں مندرجہ ذیل عناوین قائم کر سکتے ہیں:

سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا ارادہ:

ایک دفعہ قریش ایک مجلس میں جمع ہوئے۔ انھوں نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں غور و فکر کیا اور کہنے لگے: کون ہے جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کرنے کی ذمہ داری لے؟ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: میں یہ ذمہ داری قبول کرتا ہوں۔ سب اس پر متفق ہو گئے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سخت گرمی میں دوپہر کو تلوار سونت کر گھر سے نکل

[1] صحيح السيرة النبوية للألباني، سیرت ابن هشام (١/ ٢١٦) فضائل الصحابة للإمام أحمد (١/ ٣٤١)

[2] سیرت ابن هشام (١/ ٢١٦) فضائل الصحابة للإمام أحمد (١/ ٣٤١)

[3] جامع الترمذي، رقم الحديث (٣٦٨١)

[4] صحيح التوثيق في سيرة و حياة الفاروق (ص: ٢٣)

پڑے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جانثاروں کا رخ کیا جن میں حضرت ابوبکر، علی اور حمزہ رضی اللہ عنہم جیسے جلیل القدر حضرات شامل تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو حبشہ کی طرف ہجرت نہ کر سکے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو کسی نے خبر دی کہ یہ سب صفا کے نشیب میں واقع دارِارقم میں جمع ہیں۔

راستے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ملاقات نعیم بن عبد اللہ النّحّام سے ہوئی۔ اس نے پوچھا: عمر! کہاں جا رہے ہو؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: میں اُس بے دین کو قتل کرنے جا رہا ہوں جس نے قریش میں تفرقہ ڈالنے کی کوشش کی ہے، ان کی عقلوں کو ناقص گردانا ہے، ان کے دین میں عیب نکالے ہیں اور ان کے معبودوں کو گالی دی ہے۔ یہ سن کر نعیم نے کہا: آپ بہت غلط راستے پر چل رہے ہیں۔ آپ نے جان کو دھوکے میں ڈالا ہے۔ غور کریں، آپ تمام بنو عدی کو ہلاکت میں ڈال رہے ہیں۔ کیا آپ کو علم نہیں کہ بنو عبد مناف آپ کو زندہ نہیں چھوڑیں گے؟ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کہنے لگے: مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ تو بھی بے دین ہو گیا ہے! اگر مجھے یقین ہو جائے کہ تو بے دین ہو گیا ہے تو میں پہلے تیری گردن اتار دوں۔

جب نعیم بن عبد اللہ نے دیکھا کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اپنے ارادے سے باز آنے والے نہیں تو انھوں نے کہا: اے عمر (رضی اللہ عنہ)! میں آپ کو یہ خبر دیتا ہوں کہ آپ کے بہنوئی اور اُن کے تمام اہلِ خانہ مسلمان ہو چکے ہیں اور آپ بدستور اپنی گمراہی پر اڑے ہوئے ہیں۔ یہ بات سن کر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فوراً کہا: مجھے ان کے نام بتاؤ۔ نعیم نے کہا: وہ آپ کے چچا زاد سعید رضی اللہ عنہ اور آپ کی بہن فاطمہ رضی اللہ عنہا ہیں۔[1]

حضرت فاطمہ بنت خطاب رضی اللہ عنہا کی استقامت:

جب سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے یہ سنا کہ اُن کی بہن اور بہنوئی بھی مسلمان ہو گئے ہیں تو وہ آگ بگولا ہو گئے۔ اور فوراً ان کے دروازے پہ پہنچے، دستک دی۔ اندر سے پوچھا گیا: کون ہے؟ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: خطاب کا بیٹا! اس وقت گھر کے اندر موجود افراد قرآن کی تلاوت میں مصروف تھے۔ حضرت خباب رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے۔ انھوں نے جب سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی آواز سنی تو جلدی سے سب چھپ گئے اور صحیفہ اُسی طرح پڑا رہ گیا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے گھر میں قدم رکھا۔ بہن نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے تیور دیکھے تو جلدی سے اُسے چھپا لیا۔

[1] سیرت ابن هشام (۱/ ۳۴۳) اس روایت میں انقطاع ہے، الطبقات لابن سعد (۳/ ۲٦٧) علامہ ابن سعد نے یہ روایت قاسم کے حوالے سے ذکر کی ہے اور وہ ضعیف ہے، ڈاکٹر وصی اللہ محمد عباس نے امام احمد بن حنبل کی کتاب "فضائل الصحابة" میں اِن روایات کی تحقیق کی ہے۔ دیکھیے (۱/ ۳۴۲)

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: یہ بھنبھناہٹ کیسی تھی جو میں نے ابھی سنی ہے؟ اہلِ خانہ اُس وقت سورۂ طٰہٰ پڑھ رہے تھے۔ انھوں نے کہا: کیا آپ کوئی اور بات نہیں کر سکتے؟ تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فوراً کہا مجھے محسوس ہوتا ہے تم بے دین ہو چکے ہو۔ یہ سن کر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے بہنوئی سعید رضی اللہ عنہ نے کہا: اے عمر (رضی اللہ عنہ)! ہوسکتا ہے کہ حق آپ کے ساتھ نہ ہو۔ یہ سننا تھا کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی جگہ سے چھلانگ لگائی اور اپنے بہنوئی کو داڑھی سے پکڑ لیا۔ دونوں آپس میں گتھم گتھا ہو گئے۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ طاقتور تھے۔ انھوں نے اپنے بہنوئی سعید رضی اللہ عنہ کو پکڑ کر زمین پر دے مارا، پاؤں سے روندا اور سینے پر چڑھ کر بیٹھ گئے۔ اسی اثناء میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی بہن فاطمہ رضی اللہ عنہا آ گئیں تا کہ اپنے خاوند کو بچا سکیں۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے انھیں یکبارگی دور دھکیل دیا۔ وہ گر پڑیں اور زخمی ہو گئیں، پھر بہن نے غصے کی حالت میں کہا: اے اللہ کے دشمن! کیا تو ہمیں اس لیے مارتا ہے کہ ہم صرف ایک اللہ کو معبود مانتے ہیں؟ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ہاں، تو وہ بولیں کہ جو جی چاہے کر لے میں تو یہی گواہی دیتی ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ ہم تیری مرضی کے برعکس مسلمان ہیں۔

جب سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی بہن کی جرأت مندانہ باتیں سنیں تو حضرت سعید رضی اللہ عنہ کے سینے سے اٹھ کھڑے ہوئے اور سیدھے ہو کر بیٹھ گئے، پھر نرمی سے کہا: مجھے وہ صحیفہ دکھاؤ جسے تم لوگ پڑھ رہے تھے۔ بہن نے صحیفہ دینے سے انکار کر دیا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: تیری خرابی ہو! دراصل تیری باتیں میرے دل میں گھر کر گئی ہیں۔ میں اُسے دیکھنا چاہتا ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ میں اُس کی توہین نہیں کروں گا۔ بہن بولی: تم پلید ہو۔

﴿ لَا يَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ﴾ [الواقعة: ۷۹] ''اسے صرف پاکیزہ لوگ ہی چھو سکتے ہیں۔''

جاؤ غسل کرو یا وضو کرو۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اُسی وقت گئے، غسل کیا اور بہن کے پاس آئے تو انھوں نے صحیفہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں دے دیا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اس صحیفے میں سورۂ طٰہٰ اور دیگر کئی سورتیں پڑھیں۔ آغاز میں ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' پڑھی، ''الرحمٰن الرحیم'' ہی کہا تھا کہ دہشت زدہ سے ہو گئے، صحیفہ ہاتھ سے چھوٹ گیا، دوبارہ ہمت کی، اسے اٹھایا اور پڑھنے لگے:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿ طٰهٰ ﴿۱﴾ مَاۤ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰۤى ﴿۲﴾ اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ﴿۳﴾ تَنْزِيْلًا مِّمَّنْ

خَلَقَ الْاَرْضَ وَالسَّمٰوٰتِ الْعُلٰى ﴿٤﴾ اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ﴿٥﴾ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَمَا تَحْتَ الثَّرٰى ﴿٦﴾ وَاِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ فَاِنَّهٗ يَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰى ﴿٧﴾ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ﴾ [طٰهٰ: ١-٨]

''شروع اللہ کے نام سے جو بڑا ہی مہربان نہایت رحم والا ہے۔''طٰہٰ۔ہم نے (اے پیغمبر) قرآن تجھ پر اس لیے نہیں اتارا کہ تو تکلیف اٹھائے۔مگر (ہم نے تو قرآن اس لیے اتارا کہ ڈرنے والے کے لیے نصیحت ہو (جو اللہ سے ڈرتا ہے۔ وہ قرآن سے نصیحت لے) (یہ قرآن) اس کا اتارا ہوا ہے۔جس نے زمین کو اور اونچے اونچے آسمانوں کو بنایا۔ (آسمان اور زمین بنانے کے بعد) وہ بڑے رحم والا عرش پر چڑھا۔اس کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور جو ان دونوں کے بیچ میں ہے اور جو سیلی زمین کے تلے ہے۔ اور اگر تو پکار کر بات کرے (تو اس کو تیرے پکارنے کے احتیاج نہیں) وہ تو بھید کو جانتا ہے اور اس سے زیادہ چھپے ہوئے کو۔''

اِن آیات کی تلاوت کے بعد سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے تعجب سے کہا: کیا قریش اِس کلام سے بھاگے تھے؟ پھر مسلسل پڑھتے رہے۔ جب اللہ کے اس فرمانِ عالی پر پہنچے:

﴿ اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ ۙ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ﴿١٤﴾ اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا تَسْعٰى ﴿١٥﴾ فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ فَتَرْدٰى ﴾ [طٰهٰ: ١٤-١٦]

''(تو جو حکم ہو اُس کو (دل لگا کر) سنتا رہ) بے شک میں ہی اللہ ہوں، میرے سوا کوئی سچا اللہ نہیں تو میری ہی عبادت اور میری ہی یاد کے لیے نماز درستی سے پڑھا کر۔بے شک قیامت (ایک دن ضرور) آنے والی ہے، میں اُس کو چھپایا چاہتا ہوں (یعنی اس کے وقت کو) اس لیے کہ ہر شخص کو اُس کے کام کا بدلہ ملے۔تو اس (پر ایمان لانے) سے تجھ کو وہ شخص (کہیں) روک نہ دے جو (خود) اِس پر ایمان نہیں رکھتا اور اپنی خواہش پر چلتا ہے پھر تُو تباہ ہو جائے گا۔''

تو ایک دَم بول اٹھے: جس کا یہ کلام ہے لازم ہے کہ اُس کے علاوہ کسی اور کی عبادت نہ کی جائے۔ مجھے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے چلو۔[1]

[1] فضائل الصحابة للإمام أحمد (١/ ٣٤٤)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری:

جوں ہی حضرت خباب رضی اللہ عنہ نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی زبان سے یہ الفاظ سنے وہ پردے سے باہر آگئے، وہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی دستک سنتے ہی چھپ گئے تھے۔ انھوں نے کہا: اے عمر رضی اللہ عنہ! خوش ہوجایئے! میرا خیال ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سوموار کے دن جو دعا فرمائی تھی وہ آپ کے حق میں قبول ہوگئی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا کی تھی:

«اَللّٰھُمَّ أَعِزَّ الْإِسْلَامَ بِأَحَبِّ هٰذَيْنِ الرَّجُلَيْنِ اِلَيْكَ: بِأَبِيْ جَهلِ بْنِ هِشَامٍ، أَوْ بِعُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ فَكَانَ أَحَبَّهُمَا اِلَى اللّٰهِ عُمَرُ بْنَ الْخَطَّابِ»[1]

''اے اللہ! ابوجہل بن ہشام یا عمر بن خطاب میں سے جو تیرا محبوب ہو، اُس کے ذریعے سے اسلام کو تقویت عطا فرما، ان دونوں میں سے اللہ کے زیادہ محبوب عمر بن خطاب تھے۔''

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: بس اب مجھے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے چلو۔ جب ان کی بہن، بہنوئی اور حضرت خباب رضی اللہ عنہم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لہجے کی سچائی پہچان لی تو کہا: حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کوہِ صفا کی نچلی جانب تشریف فرما ہیں۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی تلوار سونتی۔ دارِارقم پہنچے اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہاں موجود لوگوں نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی آواز سنی تو گھبرا گئے۔ کوئی بھی آگے بڑھ کر دروازہ کھولنے کی جرأت نہ کرسکا، کیونکہ سب جانتے تھے کہ (حضرت) عمر (رضی اللہ عنہ) اسلام اور پیغمبرِ صلی اللہ علیہ وسلم کے کس قدر خلاف ہے۔ لوگوں کو خوف زدہ دیکھ کر سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ آگے بڑھے۔ پوچھا: کون ہے؟ انھوں نے کہا: عمر آیا ہے۔

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: دروازہ کھول دو۔ اگر اللہ کی طرف سے اس کے نصیب میں بھلائی لکھی ہے تو وہ مسلمان ہوجائے گا وگرنہ اُسے قتل کرنا کوئی مشکل کام نہ ہوگا۔ لوگوں نے دروازہ کھول دیا تو حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اور ایک اور صحابی نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے دونوں کندھے جکڑ لیے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں چھوڑنے کا حکم دیا اور بنفسِ نفیس اٹھ کر آگے بڑھے اور اپنے دستِ مبارک سے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی کمر اور چادر پکڑ کر جھنجوڑا اور دریافت فرمایا:

«مَا جَاءَ بِكَ؟ يَا ابْنَ الْخَطَّابِ؟ وَاللّٰهِ! مَا أَرٰى أَنْ تَنْتَهِيَ حَتّٰى يُنْزِلَ اللّٰهُ بِكَ قَارِعَةٌ»

''اے ابن خطاب! کس ارادے سے آئے ہو؟ اللہ کی قسم! مجھے محسوس ہوتا ہے کہ تم اُس وقت

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٦٦٨) مسند أحمد (٨٥٦٩٦/ ٦٠) وصححه أحمد شاكر، الطنطاويات (ص: ١٧)

تک اپنی حرکتوں سے باز نہ آؤ گے جب تک کہ اُس اللہ کی طرف سے تم پر کوئی بڑی آفت نہ آن پڑے۔''

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کہنے لگے: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! میں تو اللہ، اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اللہ کی کتاب پر ایمان لانے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ یہ سن کر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ''اللہ اکبر'' کہا۔ اب سب سمجھ گئے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ بھی دائرۂ اسلام میں داخل ہوگئے ہیں۔[1]

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے ایمان لانے کے بعد سب مسلمانوں کو یقین ہوگیا کہ سیدنا حمزہ اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہما کی معیت میں اب وہ مضبوط ہوگئے ہیں، اور اب وہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا دفاع بھی کر سکتے ہیں اور ہر قسم کے دشمن سے بدلہ بھی لے سکتے ہیں۔ لہٰذا دارِ ارقم رضی اللہ عنہ سے سب نکل کھڑے ہوئے۔[2]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ انتہائی بہادر تھے، عرب کے نہایت سمجھ دار اور ذہین لوگوں میں ان کا شمار ہوتا تھا اور یہی وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہیں جن کے متعلق صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے یہ خیالات تھے کہ ''جب سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسلام لائے ہم عزت اور طاقت میں بڑھتے ہی گئے۔''[3]

حضرت ابوعبیدہ بن جرّاح رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے آپ کا بے تکلّفانہ انداز دیکھ کر کچھ عرض کی۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ خود اپنے متعلق فرمانے لگے:

''ہم تو ادنیٰ ترین لوگ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اسلام کی بدولت عزت بخشی مگر ہم جب کبھی اسلام کو چھوڑ کر کسی اور ذریعے سے عزت چاہیں گے تو اللہ تعالیٰ ہمیں رسوا کر دے گا۔''[4]

اللہ کے حکم سے آفتابِ رسالت کی کرنیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر کچھ اس انداز سے پڑیں کہ وہ شاہکارِ رسالت بن کر ابھرے اور اسلام کے دامن سے انھوں نے ایسے گوہر والماس سمیٹے کہ وہ مسلمانوں کے لیے عزت، وقار، شان وشوکت، عظمت، عروج اور طاقت کا نشان بن گئے۔ نگاہِ رسالت نے آپ کا انتخاب کیا اور بارگاہِ الٰہی میں اسلام کو عمر بن خطاب یا عَمر و بن ہشام کی بدولت عزت بخشنے کی دعا کی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کو شرفِ قبولیت بخشا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دینِ اسلام سے نوازا۔

---

[1] الطنطاويات (ص: ١٨)

[2] فضائل الصحابة للإمام أحمد (١/ ٣٤٤)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٦٨٤)

[4] المستدرك (١/ ١٦٢)

قبولِ اسلام اور مشکلات کا سامنا:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ دل کی گہرائیوں سے دائرہ اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ اب وہ اپنی پوری قوت اسلام کی ترقی کے لیے صرف کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے پوچھا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کیا ہم حق پر نہیں ہیں؟ کیا ہماری موت اور زندگی حق سے وابستہ نہیں ہے؟ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا:

''کیوں نہیں، اللہ کی قسم! بلاشبہہ تم زندہ رہو یا موت آجائے تم حق پر ہو۔''

اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: تو پھر چُھپ کر رہنے کا کیا مطلب؟ اللہ کی قسم، جس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حق کے ساتھ بھیجا ہے! آج آپ صلی اللہ علیہ وسلم کھل کر سامنے آجائیں۔ دوسری طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہی خیال فرما رہے تھے کہ کھل کر سامنے آنے کا وقت آن پہنچا ہے۔ اب اسلامی دعوت مضبوط ہوچکی ہے اور ایمان والے اپنا دفاع کر سکتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دارِ ارقم رضی اللہ عنہ سے نکلنے کا اعلان فرمادیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے جاں نثاروں کی دو قطاروں کے درمیان وہاں سے نکلے۔

ایک قطار میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور دوسری میں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ تھے اور اس قافلے کے چلنے سے غُبار اُڑ رہا تھا۔ اِسی طرح چلتے چلتے سب مسجدِ حرام میں داخل ہوگئے۔ قریش کی نظریں حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ پر جم کر رہ گئیں۔ وہ اتنے رنجیدہ ہوئے کہ پہلے کبھی نہ ہوئے تھے۔ اُس دن نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو فاروق کا لقب عطا فرمایا۔[1]

اللہ تعالیٰ نے اسلام اور اہلِ اسلام کو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے ذریعے سے شان و شوکت عطا فرمادی۔ ایک ایسا شخص جس میں تکبر اور ظلم وستم بھرا ہوا تھا، جسے کوئی زیر نہ کر سکا، اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے اس کے اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے ذریعے سے تمام اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے تحفّظ کا انتظام فرمادیا۔[2]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب اپنے اس قافلے کے ساتھ مشرکین کے پاس پہنچے تو انھیں چیلنج کیا، ان سے لڑائی لڑی اور تمام مسلمانوں کے لیے بیت اللہ کے سامنے نماز پڑھنے کا موقع فراہم کیا۔[3]

مسلمان ہونے کا دن اور اُس دن مسلمانوں کی تعداد:

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نبوت کے چھٹے سال ذوالحجہ کے مہینے میں ۲۷ سال کی عمر میں دائرہ اسلام

[1] حلية الأولياء (١/ ٤٠) صفة الصفوة (١/ ١٠٣ـ ١٠٤)

[2] الخليفة الفاروق عمر بن الخطاب (ص: ٢٦ـ ٢٧)

[3] الرياض النضره لمحب الطبرى (١/ ٢٥٧)

میں داخل ہوئے، وہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے تین دن بعد مسلمان ہوئے۔ ان دنوں مسلمانوں کی تعداد ۳۹ تھی۔[1] حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جس دن میں مسلمان ہوا تو مسلمانوں کی تعداد ۳۹ تھی، میں نے مسلمان ہوکر ان کی تعداد ۴۰ کر دی۔ اللہ تعالیٰ نے دین کو تقویت بخشی اور دینِ اسلام کھل کر سامنے آ گیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام کا اسلامی دعوت پر اثر:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''جب (حضرت) عمر (رضی اللہ عنہ) مسلمان ہوئے تو ہم طاقتور ہو گئے، ان سے پہلے ہم نہ بیت اللہ کا طواف کر سکتے تھے، نہ ہی ہمیں وہاں نماز پڑھنے کی اجازت تھی۔ جب (حضرت) عمر (رضی اللہ عنہ) مسلمان ہوئے تو انھوں نے مشرکین سے لڑائی کی، پھر ہم نے مسجدِ حرام میں نماز بھی پڑھی (اور بیت اللہ کا طواف بھی کیا)۔''[2]

مزید فرماتے ہیں:

''(حضرت) عمر (رضی اللہ عنہ) کا اسلام لانا عظیم فتح تھی اور ان کی ہجرت فتح کی نوید اور ان کی خلافت باعثِ رحمت تھی۔ مجھے یاد ہے کہ (حضرت) عمر (رضی اللہ عنہ) کے اسلام لانے سے پہلے ہم بیت اللہ کا طواف کر سکتے تھے نہ اس کے قریب نماز پڑھ سکتے تھے۔ جب (حضرت) عمر (رضی اللہ عنہ) مسلمان ہو گئے تو ہم نے مشرکین سے لڑائی کی یہاں تک کہ انھوں نے ہمارا راستہ چھوڑ دیا اور ہم نے حرم میں نماز ادا کی۔''[3]

ایک شاعر کا قول حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زندگی کی کس قدر سچی ترجمانی کرتا ہے:

''اسلام مخفی تھا، اس شخص نے ظاہر کر دیا۔ اندھیروں کو ختم کیا اور رو پوشی کی حالت بھی ختم کر دی۔ میری مراد اس شخص سے فاروق رضی اللہ عنہ ہیں جنھوں نے بزورِ شمشیر کفر اور ایمان کے درمیان واضح فرق کر دیا۔''[4]

---

[1] تاريخ الخلفاء (ص: ۳۷) الطنطاويات (ص: ۲۲)

[2] فضائل الصحابة للإمام أحمد (۱/ ۳٤٤)

[3] فضائل الصحابة للإمام أحمد (۱/ ۳٤٤) الشيخان ابوبكر وعمر برواية البلاذری (ص: ۱٤۱)

[4] نونية القحطاني (ص: ۲۲)

ہجرتِ مدینہ:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے علانیہ ہجرت فرمائی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: مجھے (حضرت) علی (رضی اللہ عنہ) نے بتایا کہ (حضرت) عمر بن خطاب (رضی اللہ عنہ) وہ شخص ہیں جنھوں نے علانیہ ہجرت فرمائی، جبکہ باقی تمام مہاجرین نے خفیہ ہجرت کی۔ (حضرت) عمر (رضی اللہ عنہ) نے جب ہجرت کا ارادہ فرمایا تو تلوار گلے میں ڈالی، کندھے پر کمان رکھی، ہاتھ میں تیر تھامے اور نیزہ پہلو میں رکھا اور سیدھے بیت اللہ کے پاس پہنچے۔ لوگ مسجدِ حرام کے صحن میں بیٹھے تھے۔ انھوں نے سب کی موجودگی میں بیت اللہ کے گرد اطمینان سے سات چکر مکمل فرمائے، پھر مقامِ ابراہیم علیہ السلام پر پہنچے اور تسلی سے نماز ادا کی، پھر باری باری ہر مجلس میں پہنچے اور کہا: چہرے بدشکل ہو جائیں، اللہ تعالیٰ صرف تم جیسے لوگوں کی ناک خاک آلودہ کریں گے۔ جو چاہتا ہے کہ اس کی ماں اسے گم پائے، اس کے بچے یتیم ہو جائیں اور اس کی بیوی بیوہ ہو جائے، وہ مجھے حرم سے باہر وادی میں ملے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: چند کمزور مسلمانوں کے سوا وہاں کوئی نہ آیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انھیں تسلی دی اور پھر عازمِ سفر ہو گئے۔[1]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے پہلے ہی مدینہ طیبہ جا پہنچے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے افعال کے ذریعے سے دینِ اسلام اور عقیدۂ توحید کی خدمت میں مصروف ہو گئے۔ وہ اللہ کے راستے میں کسی ملامت گر کی پروانہ کرتے تھے۔ وہ اسلام کے مددگار اور کمزور مسلمانوں کا آسرا بن گئے۔ وہ بہت سے مسلمانوں کو ساتھ لے کر مکہ سے مدینہ پہنچے اور اُن کے ساتھ ان کے اہلِ خانہ اور حلفاء کی کثیر تعداد بھی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بہت سے ایسے افراد کی ہجرت میں مدد فرمائی جو ہجرت تو کرنا چاہتے تھے لیکن کسی انجانی آزمایش اور فتنے کے ڈر سے رکے ہوئے تھے۔[2]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ مدینہ طیبہ پہنچ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے وزیر بنے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حضرت عویم بن ساعدہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ اور ایک روایت کے مطابق حضرت عتبان بن مالک رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھائی چارہ قائم فرمادیا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا بھائی چارہ حضرت معاذ بن عفراء رضی اللہ عنہ کے ساتھ قائم ہوا۔[3]

---

[1] صحيح التوثيق في سيرة و حياة الفاروق (ص:٣٠)

[2] صحيح التوثيق في سيرة وحياة الفاروق (ص:٣٠)

[3] الطبقات لابن سعد (٣/ ٢٧٢) مناقب امير المومنين عمر بن الخطاب لابن الجوزي (ص:٣١)

قرآنی عقائد کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زندگی پر اثر:

وہ آیات جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ اطہر سے بلا واسطہ سنیں، ان کا ان کی شخصیت پر بڑا گہرا اثر نظر آتا تھا۔ اُن آیات نے ان کے دل کی طہارت، روح کی پاکیزگی اور کردار کی عظمت میں اہم رول ادا کیا۔ ان کی کایا ہی پلٹ گئی۔ ان کی اقدار، احساسات، مقاصد، کردار اور علم وہنر کا کوئی ثانی نہیں تھا۔[1]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قرآنِ کریم ہی کی روشنی میں پہچانا کہ کون سا اِلٰہ صرف اور صرف عبادت کے لائق ہوسکتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے دل میں قرآنی آیات کے مفاہیم کوٹ کوٹ کر بھر رہے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی انتہائی کوشش یہی تھی کہ تمام صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اپنے رب کا صحیح صحیح تصوّر حاصل کرلیں اور اس کا حق ادا کریں تا کہ ان کا دل صاف اور فطرت مستقیم ہو جائے۔ اللہ پر اٹل ایمان اور یقینِ کامل صرف اسی صورت میں حاصل ہوسکتا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سوچ اللہ کی طرف ہی متوجہ رہتی تھی۔ ان کا کائنات، زندگی، جنت، جہنم، قضاء وقدر پر ایمان، انسان کی حقیقت اور شیطان سے جنگ سب کچھ قرآنِ کریم اور ارشاداتِ نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مرہونِ منت تھا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کائنات کے بارے میں جو عقیدہ قائم کیا تھا، اس کا مرکز و مصدر قرآنِ کریم تھا۔ زندگی کا فلسفہ بھی انھوں نے قرآنِ کریم ہی سے سمجھا کہ یہ زندگی چاہے بہت لمبی ہو جائے، تب بھی آخر کار ختم ہونے والی ہے اور اس کا فائدہ چاہے بہت زیادہ ہو آخرت کے مقابلے میں نہایت قلیل و حقیر ہے، جیسا کہ سورۃ یونس (آیت: ۲۴) میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ إِنَّمَا مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ أَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْأَرْضِ مِمَّا يَأْكُلُ النَّاسُ وَالْأَنْعٰمُ حَتّٰىٓ إِذَآ أَخَذَتِ الْأَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ وَظَنَّ أَهْلُهَآ أَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَيْهَآ أَتٰىهَآ أَمْرُنَا لَيْلًا أَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا حَصِيْدًا كَأَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْأَمْسِ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴾

''بے شک دنیاوی زندگی کی مثال تو اُس پانی کی سی ہے جسے ہم نے آسمان سے اتارا، پھر اس کے ساتھ زمین کی نباتات مل جل گئیں جس میں سے انسان اور چوپائے کھاتے ہیں، حتیٰ کہ

[1] السيرة النبوية للصلابي (١/ ١٤٥)

جب زمین نے اپنی رونق پکڑی اور مزیّن ہوگئی اور زمین والوں نے سمجھا کہ بے شک وہ اس کی (فصل کاٹنے) پر قادر ہیں تو ہمارا حکم (عذاب) رات یا دن کو (اچانک) آ گیا، چنانچہ ہم نے اسے کٹی ہوئی کھیتی کی طرح کردیا، گویا کل وہ تھی ہی نہیں، اسی طرح ہم (اپنی) آیتیں کھول کر بیان کرتے ہیں اُن لوگوں کے لیے جو غور وفکر کرتے ہیں۔‘‘

جنت کے بارے میں بھی اُن کا عقیدہ قرآنِ کریم ہی سے اخذ کردہ تھا۔ وہ آیات جن میں جنت کا تذکرہ ملتا ہے، ان آیات کی وجہ سے جنت کے حصول کا شوق ان کے رگ وریشے میں سما چکا تھا، ان کا حال ایسا ہوگیا تھا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ السجدہ (آیت: ۱۶۔ ۱۷) میں ارشاد فرمایا ہے:

﴿ تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝١٦ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴾

’’اُن کے پہلو بستروں سے الگ رہتے ہیں (اور) وہ اپنے رب کو خوف اور امید سے پکارتے ہیں اور جو ہم نے انھیں رزق دیا ہے اس میں سے وہ خرچ کرتے ہیں۔ کوئی شخص نہیں جانتا کہ ان کے اعمال کے بدلے میں ان کے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک کی کون کون سی چیزیں پوشیدہ رکھی گئی ہیں۔‘‘

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آگ اور جہنم کے بارے میں جو نظریہ قائم کیا تھا وہ بھی قرآنِ کریم ہی سے حاصل کیا تھا۔ اسی تصوّر کی بدولت وہ اللہ کی شریعت سے سرِ مو انحراف نہیں کرتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سیرت کا مطالعہ کرنے والا شخص واضح طور پر یہ محسوس کرسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہونے کا انھیں کتنی شدّت سے احساس تھا۔

اور اللہ تعالیٰ کے عذاب سے وہ کس قدر خائف رہتے تھے۔ وہ اپنے دورِ خلافت میں ایک دفعہ رات کو گشت پر نکلے۔ ایک گھر سے قرآن پڑھنے کی آواز سنی، وہیں ٹھہر گئے۔ کوئی نماز پڑھ رہا تھا اور قرآنِ کریم کی تلاوت میں مصروف تھا۔ آپ وہیں جم کر کھڑے ہو گئے اور تلاوتِ قرآن سننے لگے۔ صاحبِ خانہ سورہ طور کی تلاوت کر رہا تھا:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿ وَالطُّوْرِ ۝١ وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ ۝٢ فِيْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ ۝٣ وَّالْبَيْتِ الْمَعْمُوْرِ ۝٤ وَالسَّقْفِ الْمَرْفُوْعِ ۝٥

﴿وَالْبَحْرِ الْمَسْجُوْرِ ۝ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ﴾ [الطور: ۱۔ ۷]

''شروع اللہ کے نام سے جو بڑا ہی مہربان نہایت رحم والا ہے۔''

''قسم ہے طور (پہاڑ) کی اور ایک کتاب کی (قسم) جو لکھی ہوئی ہے کھلے کاغذ میں اور بیتِ معمور کی (قسم) اور اونچی چھت کی (قسم) اور بھڑکائے ہوئے سمندر کی (قسم) بے شک آپ کے رب کا عذاب ضرور واقع ہونے والا ہے۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ آیات سن کر فوراً بول اٹھے: ''قَسَمٌ وَّ رَبِّ الْكَعْبَةِ حَقٌّ'' ''ربِ کعبہ کی قسم! یہ قسم برحق ہے'' وہ جس گدھے پر سوار تھے اس سے نیچے اتر آئے اور ایک باغ کی طرف چل دیے۔ وہاں دیر تک رُکے رہے، پھر واپس گھر تشریف لائے۔ بعد ازاں ایک مہینے تک ان کی طبیعت نہ سنبھل سکی۔ لوگ ان کی عیادت کے لیے آتے تھے لیکن کسی کو علم نہ ہو سکا کہ انھیں کون سا روگ لاحق ہوا ہے۔[1]

اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کلامِ الٰہی ہی کے مطالعے سے انسان اور شیطان کے درمیان پائی جانے والی جنگ کی حقیقت کو بھی سمجھا اور جان لیا کہ یہ ازلی وابدی دشمن انسان پر آگے پیچھے، دائیں اور بائیں ہر طرف سے حملہ آور ہوتا ہے۔ شیطان ہی ہے جو برائی کے وسوسے ڈالتا ہے اور چُھپی ہوئی شہوات کو بھڑکاتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اپنے دشمن ابلیس کے خلاف منجانب اللہ خصوصی مدد حاصل تھی۔ ان کی سیرت بتاتی ہے کہ وہ ازلی دشمن پر غالب آگئے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر اپنا خاص کرم فرمایا۔ ایسے دین کی طرف ان کی راہنمائی فرمائی جس میں بڑا سچا، کھرا اور صاف ستھرا عقیدہ پایا جاتا ہے، جس نے ان کے سابقہ عقیدے کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔ اس کی جگہ ایک ایسے پاک صاف عقیدے نے لے لی جو شرک سے پاک اور خالص توحید پر مبنی ہے۔ یہ دینِ حنیف ان کی رگ وپے میں سرایت کر گیا۔ اور یہ حقیقت اُن کے دل میں ثبت ہوگئی کہ مرنے کے بعد دوبارہ جی اٹھنا ہے اور اپنے اپنے کیے ہوئے اعمال کی جزاء یا سزا پانا ہے۔ جاہلیت کی لاحاصل زندگی کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ وہ مکمل طور پر دینِ اسلام میں داخل ہو چکے تھے۔ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ان کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب تھے۔ وہ اپنے اللہ کی اس طرح عبادت کرتے تھے جیسے وہ اپنے اللہ کو اپنے سامنے دیکھ رہے ہوں۔

[1] الرقة و البكاء لعبد الله بن احمد المقدسی (ص: ١٦٦)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مکمل طور پر قرآنی اصولوں کے مطابق تربیت پائی اور اس مقدّس کتاب میں بتائے گئے آداب اور فرائض دل وجان سے اپنائے۔ یہ سب اللہ تعالیٰ ہی کی نوازش اور توفیق تھی کہ وہ ہر آن، ہر گھڑی قرآن ہی کو اپنا امام مانتے تھے۔ قرآن نے ان کی عقل، دل، روح اور جان پر بڑے گہرے اور انمٹ اثرات مرتب کیے۔ حق کا پرتو اُن کی پوری زندگی میں جھلکتا رہا۔ ان تمام تبدیلیوں کا باعث یہ تھا کہ انھوں نے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بیٹھ کر دین کی تربیت پائی تھی۔[1]

قرآنِ کریم سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی موافقت:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم سے زیادہ جرأت مند اور بہادر انسان تھے۔ بعض اوقات وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسے امور کے بارے میں سوالات کرتے جن کا حکم ابھی نازل نہ ہوا ہوتا۔ وہ ان معاملات میں خلوصِ دل اور سچائی کے جذبے سے اپنی رائے کا اظہار بھی فرما دیتے تھے۔ ان کی فراست اور قرآنِ کریم کے مقاصد بالاستیعاب جاننے کی وجہ سے قرآن بھی ان کی رائے کے مطابق نازل ہو جاتا تھا۔

①، ②، ③ مقامِ ابراہیم، پردہ اور امہات المومنین رضی اللہ عنہن کے بارے میں موافقت:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ ارشاد فرماتے ہیں: ''میں نے اپنے رب سے تین امور میں موافقت اختیار کی:

١ میں نے کہا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کاش ہم مقامِ ابراہیم علیہ السلام کو جائے نماز بنا لیں تو اللہ تعالیٰ نے اسی طرح کا حکم نازل فرما دیا۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ﴾ [البقرة: ١٢٥]

''اور تم مقامِ ابراہیم کو جائے نماز مقرر کر لو۔''

٢ میں نے عرض کی: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! آپ کے پاس نیک اور بد ہر طرح کے لوگوں کی آمد و رفت رہتی ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ آپ امہات المومنین رضی اللہ عنہن کو پردے کا حکم دے دیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے پردے کی آیات نازل فرما دیں۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿ وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْـَٔلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ﴾ [الأحزاب: ٥٣]

''اور جب تم نبی کی بیویوں سے کوئی چیز طلب کرو تو پردے کے پیچھے سے طلب کرو۔''

---

[1] عمر بن خطاب، حیاتهٗ، علمهٗ، ادبهٗ (ص: ٥١۔ ٥٢)

③ ایک دفعہ مجھے خبر ملی کہ اللہ کے رسول ﷺ اپنی بعض بیویوں سے ناراض ہو گئے ہیں۔ میں ان کے پاس گیا اور کہا: تم اللہ کے رسول ﷺ کو ناراض کرنے سے باز آجاؤ کیوں کہ اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر ﷺ کو تم سے بہتر بیویاں عطا کرنے پر قادر ہے حتیٰ کہ ایک بیوی نے کہہ دیا: اے عمر! اللہ کے رسول ﷺ تو اپنی بیویوں کو اس طرح سختی سے تنبیہ نہیں کرتے۔ بھلا تم نے یہ کام کب سے اپنے ذمے لے لیا ہے؟''[1]

اس پر سورۃ التحریم کی آیت (۵) نازل ہوئی:

﴿ عَسٰی رَبُّهٗۤ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ یُّبْدِلَهٗۤ اَزْوَاجًا خَیْرًا مِّنْكُنَّ مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓئِبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰٓئِحٰتٍ ثَیِّبٰتٍ وَّاَبْكَارًا ﴾

''بعید نہیں اگر وہ (نبی) تمھیں طلاق دے دیں تو ان کا رب انھیں تم سے بہتر بیویاں بدلے میں دے، مسلمان، مومن، فرمانبردار، توبہ کرنے والی، عبادت گزار، روزہ دار، شوہر دیدہ اور کنواری عورتیں۔''

④، ⑤ اسی طرح اسیرانِ بدر اور منافقین کی نمازِ جنازہ کا معاملہ بھی ہے اور یہ دونوں بھی صحیح بخاری میں موجود ہیں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ۱۵ مقامات و امور پر حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ کی موافقت فرمائی۔[2]

⑥ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اور شراب کی حرمت:

جب اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان نازل ہوا:

﴿ یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ ﴾ [البقرة: ۲۱۹]

''لوگ آپ سے شراب اور جوئے کے بارے میں دریافت کرتے ہیں۔''

اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اے اللہ! شراب کی حرمت کے بارے میں کوئی تسلی بخش حکم نازل فرمادے، تو سورۃ النساء کی آیت (۴۳) نازل ہوئی:

﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰی ﴾

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٨٣)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٠٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٩٩) فتح الباري (١/ ٥٠٥)

''اے ایمان والو! نماز کے قریب نہ جاؤ، اس حال میں کہ تم نشے میں ہو۔''

اس کے بعد ہوتا یہ تھا کہ نماز سے پہلے ایک آدمی آواز لگاتا تھا کہ کوئی نشہ کرنے والا نماز کے قریب نہ آئے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ آیت سنائی گئی تو انھوں نے عرض کی: اے اللہ! ہمارے لیے شراب کے بارے میں کوئی تسلی بخش حکم نازل فرما، چنانچہ سورۃ المائدہ کی آیت (۹۰۔ ۹۱) نازل ہوئیں۔ یہ آیات حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو سنائی گئیں اور (جب آیت: ۹۲ کے اختتام) ﴿ فَهَلْ أَنْتُمْ مُنْتَهُونَ ﴾ ''کیا تم اس سے باز آنے والے ہو؟'' تک پہنچے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ بول اٹھے: ''ہم باز آئے، ہم باز آئے۔''[1] بعض روایات میں ہے کہ یہ الفاظ تمام موجود صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہے تھے۔[2]

شراب کی حرمت بتدریج عمل میں آئی۔ آیت کے ان اختتامی کلمات سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ شراب کی حرمت سمجھ گئے، کیوں کہ عربی قاعدے کے مطابق استفہام انکاری عموماً نہی سے بھی زیادہ حرمت پر دلالت کرنے والا ہوتا ہے۔

بعض خصوصیاتِ حضرت عمر رضی اللہ عنہ:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مکی اور مدنی دونوں ادوار میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا بہت قرب اور اعتماد پایا۔ مدینہ طیبہ میں ان کی رہائش عوالی مدینہ میں تھی جو مدینہ سے باہر کھلی جگہ پر واقع تھی اور آج کل مدینہ میں شامل ہو چکی ہے بلکہ مسجدِ نبوی کے ساتھ متصل ہے کیوں کہ مدینہ منورہ کی آبادی بڑھ گئی اور حدودِ مدینہ میں وسعت آ گئی ہے، یوں آہستہ آہستہ مدینہ تمام عوالی مدینہ تک پھیل گیا ہے، نتیجتاً اردگرد کے سب علاقے مسجدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں شامل ہو گئے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عوالی مدینہ ہی میں رہائش اختیار کی۔ وہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد میں قائم درسگاہ سے مختلف علوم ومعارف کا درس حاصل کرنے کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حلقاتِ دروس میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ بلاشبہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی وہ عظیم ہستی ہیں جن کے اخلاق وسیرت خود اللہ نے سنوارے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ قرآن و حدیث کی تعلیم، خیر خواہی، راہنمائی یا کسی بھی علم کے حصول کے موقع پر کبھی کسی سے پیچھے نہ رہے۔

معلوم ہوا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جس چشمۂ رواں سے علم وتربیت اور تہذیب وثقافت کے موتی سمیٹتے

[1] مسند أحمد (١/ ٥٣)

[2] العجاب في معرفة الأسباب لابن حجر (١/ ٥٤٥) و قال: في رجاله ابو المعشر المدنی وهو ضعيف وله شاهد.

تھے وہ اللہ کی کتاب قرآنِ حکیم تھی جو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر حسبِ موقع تھوڑی تھوڑی نازل ہوتی تھی، پھر نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کلامِ ربانی صحابہ رضی اللہ عنہم کو پڑھ کر سناتے تھے اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اس کے معانی پر غور وفکر کرتے، قرآنی الفاظ کی گہرائی ماپتے اور اس کے قوانین پر عمل کرتے تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے دل، عقلیں، ارواح اور جسم قرآنِ کریم کی تعلیمات سے منور ومعمور ہو چکے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تاریخ وسیرت کا مطالعہ کرنے والے کے لیے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جاری اِس خالص ربانی چشمے سے ضرور سیراب ہو، کیوں کہ یہی وہ سر چشمہ ہے جس نے لوگوں میں خوبیاں بھر دیں۔ ان کی صلاحیتوں کو اجاگر کیا۔ مسلمانوں کو مخصوص ثقافت عطا فرمائی۔ یہی سر چشمہ ہے جسے ہم قرآنِ کریم، یعنی اللہ کا کلام کہتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قرآنِ کریم کی تفسیر کے بارے میں ایک خاص منہج تھا۔ وہ سب سے پہلے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے قرآنی مطالب تلاش کرتے تھے۔ نہ ملنے پر بعض مخصوص صحابہ، مثلاً: حضرت ابن عباس، ابی ّابن کعب، عبد اللہ بن مسعود اور معاذ رضی اللہ عنہم وغیرہ سے مفاہیمِ قرآن سمجھنے کی کوشش فرماتے تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب سے مسلمان ہوئے، قرآنِ کریم کے حفظ، اس کی سمجھ اور اس کے معانی میں غور وفکر کے لیے کوشاں رہے اور انھیں ہمیشہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ نصیب ہوا۔ جیسے ہی کسی آیت کا نزول ہوتا وہ فوراً اسے یاد کر لیتے حتیٰ کہ بعض آیات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں خود یاد کرائیں۔ ان کی ہمیشہ خواہش اور کوشش ہوتی تھی کہ اُن آیات کو اُسی لہجے اور قراءت کے مطابق پڑھیں جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں پڑھایا تھا۔[1]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قرآنی منہج کے مطابق تربیت پائی۔ اُن کے مربی خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ اُن کی تربیت کا پہلا قدم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مصاحبت وملازمت تھی جس سے ان کی شخصیت میں انوکھی شان پیدا ہوگئی۔ وہ ہدایت کی بلندیوں پر فائز ہو گئے۔ وہ اندھیروں سے نکل کر روشنی کے دائرے میں آ گئے۔ انھوں نے ایمان اپنایا اور کفر کو یک قلم ترک کر دیا۔ وہ دینِ حنیف کے لیے تمام سختیاں اور مصائب جھیلنے کے لیے تیار ہو گئے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی شخصیت تھی جس نے سب سے پہلے انھیں اسلام کی طرف کھینچا کیوں کہ

[1] عمر بن الخطاب للدكتور محمد أحمد أبو النصر (ص: ٨٨)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت ہر کسی کو اپنی طرف کھینچے چلی جاتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے خود اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت فرمائی تھی۔ انھیں ساری انسانیت کے لیے کامل اسوۂ حسنہ بنایا تھا۔ انھیں ایسی عظمت سے نواز تھا کہ لوگ اس عظمت کے سبب ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرتے رہیں گے اور حیرت زدہ بھی رہیں گے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کی کشش کے باعث تعجب سے لپکتے چلے آئیں گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بے پایاں عظمت اور قدر و منزلت لوگوں کے دل و دماغ میں جاگزین ہوگئی تھی۔ وہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس طرح رسمی عزت نہیں کرتے تھے جس طرح اُس دور کے دوسرے سرداروں کی عزت کی جاتی تھی بلکہ وہ تو اس ربانی خوشبو کے جھونکوں پر فدا ہوئے چلے جاتے تھے جو اللہ رب العزت کی طرف سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا ہوئے تھے۔ اور یہ خوشبو ہر وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوتی تھی۔ لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیک وقت ایک عظیم بشر بھی تھے اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زبردست خواہش ہوتی تھی کہ وہ حضر و سفر دونوں میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سے باخبر رہیں۔ اس وجہ سے ان کے پاس وسیع علم اور سنتِ مطہرہ کا وافر ذخیرہ جمع ہوگیا جس نے آپ کی شخصیت اور سمجھ بوجھ پر گہرے اثرات مرتّب کیے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے درمیان انتہائی محبت کا تعلق تھا۔ یہی وہ محبت ہے جس کے سبب استاد اور شاگرد کے درمیان ممتاز علمی مقام پیدا ہوتا ہے جس سے بہتر علمی اور ثقافتی نتائج سامنے آتے ہیں کیوں کہ اس علمی مقام کو ایک نئی جہت عطا ہوتی ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اعلیٰ درجے کی محبت رکھتے تھے۔ ان کا دل ہمیشہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ بابرکات سے وابستہ رہتا تھا۔ وہ ہر وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قربان ہونے کے لیے تیار اور اسلامی دعوت کے میدان میں قربانیاں پیش کرنے کے لیے موقع کے منتظر رہتے تھے۔ حدیثِ شریف میں آیا ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''تم میں سے کوئی اس وقت تک ایمان والا نہیں ہوسکتا جب تک مَیں اُسے اس کے ماں باپ اور اولاد حتیٰ کہ تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! آپ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے میری جان کے علاوہ ہر چیز سے زیادہ عزیز ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نہیں، اُس ذات کی قسم جس کی ہاتھ میں میری جان ہے! (اے عمر!) جب تک میں تجھے تیری جان سے بھی زیادہ عزیز نہ ہو جاؤں تیرا ایمان کامل نہیں ہوسکتا۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہیں، تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اے عمر! اب بات بنی ہے۔''[1]

یہی وہ ناقابلِ شکست محبت تھی جس نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو تمام غزوات میں نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ساتھ رہنے پر مجبور کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جنگی امور کے تجربہ کار اور فنونِ حرب کے ماہر بھی تھے۔ وہ لوگوں کی طبائع سے بخوبی واقف تھے۔ حضرت عمر کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب رہنے اور گفتگو کرنے کا یہ فائدہ بھی ہوا کہ وہ عربی کے ایک فصیح و بلیغ اور ماہر زبان دان بن گئے۔[2]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جہاد کے میدانوں میں:

تمام علمائے کرام کا اتفاق ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوۂ بدر، اُحد اور دیگر تمام غزوات میں شریک ہوئے اور کسی غزوے سے کبھی پیچھے نہ رہے۔[3]

غزوۂ بدر:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ غزوۂ بدر میں شریک ہوئے، جب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے معرکہ سے پہلے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ فرمایا تو پہلے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے گفتگو فرمائی اور بہت اچھی باتیں کیں اور کفار کے ساتھ قتال کی دعوت دی۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عمدہ گفتگو کی اور قتال کی طرف بلایا۔[4]

اُس معرکے میں سب سے پہلے شہید ہونے والے شخص حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے غلام حضرت مہجع رضی اللہ عنہ تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عقیدۂ توحید سے وفاداری کرتے ہوئے رشتہ داری کی حمیت کو دیوار پر دے مارا اور اپنے ماموں عاص بن ہشام کو تہہِ تیغ کیا، وہ اس پر فخر کیا کرتے تھے۔ انھوں نے بدر کے قیدیوں کو قتل کرنے کا مشورہ بھی دیا تھا۔[5]

جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا عباس رضی اللہ عنہ قید ہوئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انھیں اسلام لانے کی ترغیب دی اور فرمایا: اے عباس (رضی اللہ عنہ)! مسلمان ہو جاؤ، تمھارا مسلمان ہونا اللہ کی قسم! مجھے اپنے باپ کے اسلام لانے سے بھی زیادہ عزیز ہے، صرف اس لیے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کا اسلام لانا بے حد عزیز ہے۔[6]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٦٣٢)

[2] عمر بن الخطاب للدكتور محمد أحمد ابو النصر (ص: ٩٤)

[3] ابن الجوزي (ص: ٨٩)

[4] الفاروق مع النبي ﷺ للدكتور عاطف (ص: ٣٢)

[5] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٩٩) الطبقات لابن سعد (٣/ ٣٩١_٣٩٢)

[6] البداية و النهاية (٢٩٨٣)

غزوۂ اُحد:

حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ کی ایک نمایاں خوبی یہ تھی کہ وہ جہاد کے میدانوں میں ہمت نہیں ہارتے تھے۔ غزوۂ بنو مصطلق میں بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا کردار امتیازی تھا۔ وہ نہایت بلند ہمت تھے۔ ذلت ورسوائی کا راستہ ہرگز اختیار نہیں کرتے تھے، چاہے انھیں شکست کے واضح آثار ہی نظر آنے لگیں، اس کے باوجود وہ ثابت قدم رہتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے قائد صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام پر دل وجان سے ظاہری اور باطنی آداب کے ساتھ مکمل طور پر عمل کرنے والے تھے۔ وہ اپنے فقید المثال قائد صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے سرِ مُو انحراف نہیں کرتے تھے۔

غزوۂ خندق:

غزوۂ خندق کے بارے میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: حضرت عمر بن خطاب (رضی اللہ عنہ) خندق کے دن سوج غروب ہونے کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پاس حاضر ہوئے اور کفارِ قریش کو برا بھلا کہنے لگے اور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض پرداز ہوئے: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! سورج غروب ہونے کے قریب تھا، تب میں نے نمازِ عصر پڑھی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«وَاللّٰهِ! مَا صَلَّيْتُهَا» ''اللہ کی قسم! میں نے تو ابھی تک ادا ہی نہیں کی۔''

پھر ہم وادیٔ بطحان میں اترے۔ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ہم سب نے وضو کیا، پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے عصر اور پھر مغرب کی نماز ادا فرمائی۔[1]

غزوۂ ہوازن:

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے ساتویں سال شعبان میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو تیس (۳۰) آدمیوں کی معیت میں ہوازن کی پُشت کی جانب تربۃ کی طرف روانہ فرمایا جو قبلاء کی طرف مکہ سے چار مراحل پر واقع تھا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ بنو ہلال قبیلہ سے تعلق رکھنے والے راستوں کی جان پہچان کے ایک ماہر کو ساتھ لے کر روانہ ہوئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ عنہ رات کو سفر کرتے تھے اور دن کو چھپے رہتے تھے۔ ہوازن والوں کو جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اچانک آمد کی خبر ملی تو وہ سب بھاگ نکلے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ آگے بڑھتے

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٩٦)

ہوئے ان کے گھروں تک جا پہنچے۔ مگر جب وہاں کسی کو نہ پایا تو واپس مدینہ چلے آئے۔[1]

اس لشکر کشی سے تین نتائج ہمارے سامنے آتے ہیں:

1 حضرت عمر رضی اللہ عنہ قیادت کے اہل تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم انھیں مسلمانوں کے لشکر کا قائد بنا کر اتنے خطرناک علاقے اور ایسے سخت قبیلے کی طرف ہرگز نہ بھیجتے جو بہت طاقتور، ظالم اور متکبر سمجھا جاتا تھا۔

2 حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے رات کو سفر اور دن کو پڑاؤ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اچانک حملے کو بہترین جنگی حکمت عملی سمجھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اچانک دشمن کے سر پر جا پہنچے اور دشمن ہیبت زدہ ہو کر فرار ہو گیا۔ اس طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے مختصر دستے کے ساتھ مشرکین کے بہت بڑے لشکر کو شکست دینے میں کامیاب ہو گئے۔

3 حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے قائد صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام پر دل وجان سے ظاہری اور باطنی آداب کے ساتھ مکمل طور پر عمل کرنے والے تھے۔ وہ اپنے فقید المثال قائد کے حکم سے سرِ مُو انحراف نہیں کرتے تھے۔

فتحِ مکہ:

قریشِ مکہ نے مسلمانوں سے غداری کی۔ حدیبیہ کا صلح نامہ توڑ دیا۔ اس کے بعد انھیں یہ خوف لاحق ہو گیا کہ اب مدینہ سے اس کا ردعمل سامنے آئے گا۔ انھوں نے حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کو مدینہ روانہ کیا تاکہ وہ اس معاہدے کی تجدید اور اس میں مزید توسیع کرا سکیں۔

حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ مدینہ میں اپنی بیٹی حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے گھر پہنچے لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنی گزارشات پیش کیں لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا، پھر وہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سفارش کی درخواست کی۔ انھوں نے صاف انکار کر دیا، پھر وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تعجب سے کہا: کیا تم مجھ سے سفارش کی امید رکھتے ہو؟ میرے پاس تو اگر چیونٹیوں کی ایک جماعت بھی ہو تب بھی میں تمھارے خلاف جہاد کروں۔[2]

---

[1] الطبقات لابن سعد (٣/ ٢٧٢)

[2] السيرة النبوية لابن هشام (٢/ ٢٦٥) أخبار عمر (ص: ٣٧)

غزوۂ حُنَین:

غزوۂ حنین میں مشرکین نے مسلمانوں پر اچانک حملہ کر دیا۔ لوگ تیزی سے پلٹے۔ کسی کو کسی کا ہوش نہ رہا۔ نبی اکرم ﷺ دائیں جانب ہٹے اور پکارا: اے لوگو! تم کہاں ہو؟ میری طرف آؤ۔

«أَنَا النَّبِيُّ لَا كَذِبُ .... أَنَا ابْنُ عَبْدُ الْمُطَّلِب»

''میں اللہ کا رسول ہوں اس میں کوئی جھوٹ نہیں۔ اور میں محمد (ﷺ) ابنِ عبدالمطلب ہوں۔''

یہ صدائے مقدّس کوئی نہ سن سکا؟ اونٹ آپس میں گُتھم گُتھا ہو گئے۔ لوگ بکھر گئے۔ صرف انصار اور مہاجرین کے چند افراد اور آپ ﷺ کے اہلِ بیت آپ ﷺ کے ساتھ رہ گئے۔[1]

حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ اس غزوے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا کردار بیان فرماتے ہیں:

ہم حنین کے دن اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ نکلے۔ معرکہ شروع ہوا۔ مسلمانوں پر پریشانی کے آثار دکھائی دیے۔ میں نے ایک مشرک کو ایک مسلمان پر چڑھائی کرتے دیکھا۔ میں نے پیچھے سے اس کے کندھے پر وار کیا۔ اس کی زرہ کٹ گئی۔ اسی اثناء میں وہ مڑا۔ اس نے مجھے پکڑ کر دبایا، مجھے موت نظر آنے لگی۔ پھر آہستہ آہستہ اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور اس نے مجھے چھوڑ دیا۔ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ملا۔ میں نے دریافت کیا: لوگ کس حالت میں ہیں؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: اللہ کا حکم !.....، پھر وہ واپس چلے گئے۔[2]

اللہ تعالیٰ نے اس غزوے کو یوں بیان فرمایا:

﴿ لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْـًٔا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ ﴾

[التوبة: ٢٥]

''یقیناً اللہ نے بہت سے مواقع پر تمھاری مدد کی ہے اور حنین کے دن (بھی) جبکہ تمھاری کثرت نے تمھیں خوش فہمی میں ڈال دیا تھا، تو وہ تمھارے کچھ بھی کام نہ آئی اور زمین فراخی کے باوجود تم پر تنگ ہوگئی، پھر تم پیٹھ پھیر کر پلٹے۔''

---

[1] السيرة النبوية لابن هشام (٢/ ٢٨٩)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٣٢١ ـ ٤٣٢٢)

اسی عارضی شکست کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر مہربانی فرمائی۔ اپنے اولیاء کی مدد فرمائی۔ لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پلٹے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد جمع ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر سکینت نازل فرمائی اور اپنے لشکروں سے مدد فرمائی۔[1]

غزوۂ تبوک:

غزوۂ تبوک کے موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنا نصف مال اللہ کی راہ میں دے دیا اور جس وقت لوگوں کو بھوک لگی تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے برکت کی دعا کی درخواست کی۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''غزوۂ تبوک کے دن خوراک کی قِلت ہوگئی۔ لوگوں نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سواری اور بار برداری والی اونٹنیوں کو ذبح کرنے کی اجازت چاہی اور کہا کہ ہم ان کا گوشت بھی کھا سکیں گے۔ اور چربی بھی استعمال کرلیں گے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دے دی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی: اگر یہ لوگ ایسا کریں گے تو سواریاں کم پڑ جائیں گی۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ سب لوگ اپنی باقی ماندہ خوراک یکجا کرلیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم برکت کی دعا فرمائیں، چنانچہ لوگ مٹھی بھر گندم، کھجور یا روٹی کا ایک ایک ٹکڑا لانے لگے۔ اس طرح دستر خوان پر تھوڑا سا کھانا جمع ہوگیا۔ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے برکت کی دعا فرمائی، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«خُذُوا أَوْعِيَتَكُمْ» ''اپنے برتن بھر لو۔''

سب نے اپنے برتن بھر لیے۔ پورے لشکر میں کوئی برتن خالی نہ رہا، پھر انھوں نے کھایا اور خوب سیر ہوگئے مگر کھانا پھر بھی باقی بچ گیا۔ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں۔ جو بندہ صدقِ دل سے اس کا قرار کرے گا، اللہ اسے ضرور جنت میں داخل فرمائے گا اور کوئی رکاوٹ نہ ہوگی۔''[2]

یہ وہ چند کردار تھے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہ کر ادا کیے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوات میں شرکت کر کے بہت سے نصائح

[1] دیکھیں: سورة التوبة (٢٦)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧)

اور فوائد حاصل کیے۔ انھی فوائد کے ذریعے وہ اپنے دورِ خلافت میں اللہ کے حکموں کی روشنی لوگوں تک پہنچاتے رہے۔

رسول اللہ ﷺ سے کسبِ فیض کا والہانہ شوق اور اس کی اشاعت:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر باشی کا انتہائی شوق رکھتے تھے۔ جب تک مجلس برخاست نہ ہو جاتی، وہ مجلس سے ہرگز نہ اٹھتے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اُن گنے چنے افراد میں سے تھے جنھوں نے نبی اکرم ﷺ کی مصاحبت اس وقت بھی ترک نہ کی جب لوگ مدینہ میں تجارتی قافلے کی آمد کی خبر سن کر آپ ﷺ کو خطبہ دیتے ہوئے ہی چھوڑ گئے تھے۔[1]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نبی مکرم ﷺ کی مجلس میں بڑے ادب اور دھیان سے بیٹھتے تھے۔ مسائل کی وضاحت طلب فرماتے اور ہر خاص وعام معاملات کی اچھی طرح تحقیق کرتے تھے۔ انھوں نے نبی کریم ﷺ سے پانچ سو انتالیس (۵۳۹) احادیث روایت فرمائیں۔ ایک روایت کے مطابق پانچ سو سینتیس (۵۳۷) احادیث روایت فرمائیں۔[2] ان میں سے چھبیس (۲۶) روایات پر امام بخاری و مسلم رحمہما اللہ کا اتفاق ہے، جبکہ بخاری میں چونتیس (۳۴) اور مسلم میں اکیس (۲۱) روایات موجود ہیں۔[3] اور بقیہ روایات دیگر کتبِ احادیث میں موجود ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایسی احادیث روایت کی ہیں جن کا تعلق ایمان، اسلام، احسان اور قضاء وقدر جیسے اہم موضوعات سے ہے۔

ایمانیات کے علاوہ انھوں نے علم، ذکر، دعا، طہارت، نمازِ جنازہ، زکاۃ، صدقات، صیام، حج، طلاق، نسب، فرائض، وصیّت، معاشرت، معاملات، حدود، لباس، اکل وشرب، ذبائح، اخلاق، زہد، رِقاق، مناقب، فِتن، قیامت، خلافت واَمارت اور قضاء جیسے امور میں اللہ کے رسول ﷺ کے فرامین نقل فرمائے ہیں۔ ان تمام احادیث کا علومِ اسلامیہ میں ایک خاص مقام ہے جو ہمیشہ علومِ اسلامیہ کی بنیاد اور سند تصوّر کی جاتی رہیں گی۔[4] حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مدنی معاشرے میں نبی کریم ﷺ کی معیّت میں بہت سی تعلیمی، تربیتی اور معاشرتی خدمات تھیں۔

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٨٦٣) صحیح ابن حبان (١٥/ ٥٠٠)

[2] تاریخ الخلفاء للسیوطي (ص: ١٣٣)

[3] دلیل الفالحین لطرق ریاض الصالحین (١/ ٦٠)

[4] عمر بن الخطاب للدکتور علی الخطیب (ص: ١١٢)

رسول اللہ ﷺ کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مسائل کے بارے میں سوال:

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ مجھ سے میرے والد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا:

''ایک دن وہ نبی اکرم ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ خوبصورت سیاہ بالوں والا ایک خوبصورت شخص آیا۔ اس نے سفید رنگ کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ لوگوں نے تعجب سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ہم نے اسے نہیں پہچانا۔ وہ شکل وصورت سے کوئی مسافر بھی معلوم نہ ہوتا تھا۔ اس نے نبی مکرم ﷺ سے اجازت طلب کی، اجازت عطا کی گئی تو وہ آگے بڑھا۔ اس نے اپنے گھٹنے نبی کریم ﷺ کے گھٹنوں کے ساتھ ملا دیے اور اپنے دونوں ہاتھ رانوں پر رکھ لیے، پھر سوال کیا: اسلام کیا ہے؟ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''یہ گواہی دینا کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبودِ برحق نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ مزید یہ کہ تو نماز قائم کرے، زکاۃ ادا کرے، روزے رکھے اور بیت اللہ کا حج کرے۔''

اس نے دوسرا سوال کیا: ایمان کیا ہے؟ نبی کریم ﷺ نے جواب دیا: ''تو اللہ، فرشتوں، جنت، جہنم، موت کے بعد جی اٹھنے اور قضاء وقدر پر ایمان لائے۔'' پھر اس نے سوال کیا: احسان کیا ہے؟ نبی مکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تو اللہ کے لیے اس طرح عبادت کرے گویا اپنے رب کو دیکھ رہا ہے، ورنہ کم ازکم یہ خیال کرے کہ وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔''

پھر اس نے سوال کیا: قیامت کب قائم ہو گی؟ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''اس سلسلے میں مسؤل (مَیں) سائل (تجھ) سے زیادہ نہیں جانتا۔'' اس نے سوال کیا: قیامت کی نشانیاں بتا دیجیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جس وقت ننگے بدن، ننگے پاؤں، فقیر لوگ جو بکریوں کے چرواہے ہوں گے عمارتیں بنانے کا باہم مقابلہ کریں گے اور لونڈیاں اپنے ہی مالکوں کو جنم دیں گی۔''

جب وہ آدمی چلا گیا تو نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: اسے تلاش کرو لیکن وہ نہ مل سکا۔ دو یا تین دن کے بعد نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''اے خطاب کے بیٹے! کیا تجھے علم ہے کہ وہ کون تھا جو یہ یہ باتیں پوچھ رہا تھا؟'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: اللہ اور اس کا رسول ﷺ ہی خوب جانتے ہیں۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

''یہ جبرائیل علیہ السلام تھے جو تمھیں تمھارا دین سکھلانے آئے تھے۔''[1]

---

[1] مسند أحمد (١/ ٢٧) رقم الحديث (١٨٤) صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٧٧٧) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦١٠) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٩٩٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٥٣)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سید الرسل صلی اللہ علیہ وسلم اور سید الملائکہ علیہ السلام کے سوال و جواب کی روشنی میں اسلام، ایمان اور احسان کے مطالب انتہائی بہترین اسلوب میں سیکھے تھے۔

اتباعِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی پر اکتفا کا درس:

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں تورات کا ایک ورق دیکھا تو فرمایا:

''اے خطاب کے بیٹے! کیا تم اس کی وجہ سے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال رہے ہو؟ قسم اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! تحقیق میں تمھارے پاس صاف ستھرا اور روشن دین لے کر آیا ہوں۔ اگر صاحبِ کتاب (حضرت) موسیٰ (علیہ السلام) بھی (آج) زندہ ہوتے تو میری اتباع کیے بغیر ان کی نجات ممکن نہ ہوتی۔''[1]

صدقہ واپس لینے کا حکم؟

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''میں نے ایک دفعہ ایک گھوڑا اللہ کے راستے میں صدقہ کیا۔ اس کے مالک نے اسے بے کار بنا دیا۔ میں نے اسے خرید نے کا ارادہ کر لیا اور اس بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت طلب کی تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اسے مت خریدو۔ خواہ وہ اسے تمھارے ہاتھ ایک درہم میں بیچ ڈالے۔ بلاشبہ جو شخص اپنے کیے ہوئے صدقہ کو دوبارہ حاصل کرتا ہے وہ اس کتے کی مانند ہے جو اپنی ہی قے کو چاٹ لیتا ہے۔''[2]

صدقات وخیرات اور وقفِ املاک:

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ''حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں اپنی ''ثمغ'' نامی جگہ صدقہ کرنے کا ارادہ کیا۔ اس میں کھجور کے درخت بھی تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! میرے پاس عمدہ قسم کا مال ہے، میں اسے صدقہ کرنا چاہتا ہوں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

---

[1] مسند أحمد (٣/ ٣٨٧)

[2] مسند أحمد (١/ ٤٠، رقم: ٢٨١) إسناده صحيح علىٰ شرط الشيخين، سنن أبي داود، رقم الحديث (١٥٩٣)

''(اے عمر!) اسے اس طرح وقف کرو کہ نہ اسے بیچا جائے، نہ ہبہ کیا جائے اور نہ بطورِ وراثت کسی کو دیا جائے۔صرف اس کی پیداوار (مستحقین پر) خرچ کی جائے۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایسا ہی کیا اور اسے مساکین، غرباء، غلاموں، مسافروں اور رشتہ داروں کے لیے وقف کر دیا۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے نگران کو معروف طریقے سے اس کا میوہ کھانے کی اجازت بھی دی۔ اس کی بھی اجازت دی کہ وہ اپنے کسی دوست کو کھلائے لیکن اس کے لیے اسے سرمایہ بنانا یا ذخیرہ کرنا درست نہیں۔[1]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس کردار سے ان کی فضیلت کے ساتھ ساتھ بھلائی کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ بھی پتا چلتا ہے کہ وہ دنیائے فانی پر آخرت کو ترجیح دیتے تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خود داری:

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے سنا: ''نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ مجھے مال عطا فرمایا۔ میں نے عرض کی: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! مجھ سے زیادہ جو محتاج ہو اُسے عطا کیجیے۔ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہ مال لے لو۔ اسی طرح جو مال خود بخود بغیر طمع اور سوال کے حاصل ہو اس کا انکار نہ کرو۔ اور ایسی صورت نہ ہو تو اس کے پیچھے نہ پڑو۔''[2]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا:

نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بدن پر قمیص یا ایک روایت کے مطابق کوئی لباس دیکھا تو فرمایا: ''تیرا یہ لباس نیا ہے یا دھویا ہوا (پرانا) ہے؟'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: یہ تو دھویا ہوا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«اِلْبَسْ جَدِيْداً وَ عِشْ حَمِيْداً وَمُتْ شَهِيْداً»[3]

''تو نیا کپڑا پہنے، عزت کی زندگی گزارے اور تجھے شہادت کی موت نصیب ہو۔''

حضرت حفصہ بنت عمر رضی اللہ عنہما کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٧٦٤)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٤٥)

[3] حسنه الألباني في السلسلة الصحيحة (٣٥٢) صحيح الجامع، رقم الحديث (١٢٣٤)

''جب (حضرت) حفصہ (رضی اللہ عنہا) کے خاوند خُنیس بن حُذافہ سہمی رضی اللہ عنہ مدینہ میں فوت ہو گئے تو میں (حضرت) عثمان بن عفان (رضی اللہ عنہ) کے پاس آیا اور انھیں (حضرت) حفصہ (رضی اللہ عنہا) سے نکاح کرنے کا کہا: (حضرت) عثمان (رضی اللہ عنہ) نے سوچنے کا وقت مانگا۔ چند دنوں کے بعد دوبارہ (حضرت) عثمان (رضی اللہ عنہ) سے میری ملاقات ہوئی۔ انھوں نے معذرت کر لی اور کہا میں ان دنوں نکاح کا خواہش مند نہیں، پھر میں (حضرت) ابوبکر (رضی اللہ عنہ) سے ملا اور کہا: اگر آپ چاہیں تو میں (حضرت) حفصہ (رضی اللہ عنہا) کا نکاح آپ سے کر دوں؟ وہ خاموش رہے۔ مجھے (حضرت) عثمان (رضی اللہ عنہ) سے زیادہ حضرت ابوبکر (رضی اللہ عنہ) پر رنج ہوا۔

چند دنوں کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (حضرت) حفصہ (رضی اللہ عنہا) سے نکاح کا پیغام بھیجا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کا نکاح آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کر دیا، پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا: عمر! جس دن میں نے (حضرت) حفصہ (رضی اللہ عنہا) کے بارے میں تمھیں کوئی جواب نہیں دیا تھا، شاید تمھیں مجھ پر رنج ہوا ہو گا؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: بے شک! حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: عمر! ایسی بات اس لیے تھی کہ مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (اپنے لیے) (حضرت) حفصہ (رضی اللہ عنہا) کے بارے میں بات کی تھی۔ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا راز افشاء نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم انکار فرماتے تو میں ضرور (حضرت) حفصہ (رضی اللہ عنہا) سے نکاح کر لیتا۔''[1]

ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اختلاف اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا کردار:

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ''میری کوشش تھی کہ میں (حضرت) عمر (رضی اللہ عنہ) کی زبانی ان دو ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کا قصہ سنوں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا تھا:

﴿ اِنْ تَتُوْبَآ اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا ﴾ [التحريم: ٤]

''اگر تم دونوں اللہ کی طرف توبہ کرو (تو تمھارے لیے بہتر ہے) پس یقیناً تمھارے دل (حق سے) ہٹ گئے ہیں۔''

چنانچہ حج کا موسم آ گیا۔ میں نے (حضرت) عمر (رضی اللہ عنہ) کے ساتھ حج کیا۔ راستے میں ایک جگہ

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥١٢٢)

(حضرت) عمر (رضی اللہ عنہ) قضائے حاجت کے لیے مڑ گئے۔ میں بھی ہاتھ میں پانی کا برتن لیے مڑ گیا۔ وہ قضائے حاجت سے فراغت کے بعد آئے تو میں نے ان کے ہاتھوں پر پانی ڈالا۔ انھوں نے وضو کیا۔ میں نے عرض کی: اے امیر المومنین! ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن میں سے وہ کون سی دو خواتین تھیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

﴿ اِنْ تَتُوْبَآ اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا ﴾

(حضرت) عمر (رضی اللہ عنہ) نے فرمایا: تعجب کی بات ہے اے ابن عباس رضی اللہ عنہما!... علّامہ زہری فرماتے ہیں: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کچھ ناگواری کا اظہار فرمایا لیکن ان سے کوئی سوال کیا نہ کچھ چھپایا اور فرمایا: وہ (حضرت) حفصہ اور (حضرت) عائشہ (رضی اللہ عنہا) تھیں، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سارا قصہ کہہ سنایا اور فرمایا: ہم قریش اپنی عورتوں پر رعب وغلبہ رکھتے تھے۔ جب مدینہ آئے تو دیکھا کہ عورتیں مردوں پر حاوی ہیں۔ ہماری عورتیں بھی یہی رنگ پکڑنے لگیں۔ میرا گھر بنو امیہ بن زید کے محلے میں عوالی میں تھا۔ میں ایک دن اپنی بیوی سے ناراض ہو گیا۔ اس نے مجھ سے تکرار کی۔ میں نے اس سے وجہ پوچھی تو اس نے کہا: اللہ کی قسم! نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں بھی ایسا ہی کرتی ہیں حتیٰ کہ سارا سارا دن قطع کلامی کیے رہتی ہیں۔

میں فوراً (حضرت) حفصہ (رضی اللہ عنہا) کے پاس پہنچا اور پوچھا: کیا تو اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تکرار اور بحث کرتی ہے؟ انھوں نے کہا: ہاں! میں نے پوچھا: کیا تم ان سے دن بھر قطع تعلقی بھی کرتی ہو؟ حضرت حفصہ نے کہا: ہاں! تو میں نے کہا: تم میں سے جو بھی اس طرح کرے وہ ناکام ہوئی اور گھاٹے میں رہی۔ کیا تمھیں احساس نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضگی کے سبب اللہ تعالیٰ تم پر ناراض ہو سکتا ہے۔ آئندہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بحث و تکرار اور قطع تعلقی نہ کرنا، نہ اُن سے کچھ طلب کرنا۔ اگر کوئی ضرورت ہو تو مجھ سے مانگ لینا۔ تمھیں اس بات کا احساس ہونا چاہیے کہ تمھاری سوکن تم سے زیادہ خوبصورت ہے اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو زیادہ محبوب ہے۔ اُن کا ارشارہ (حضرت) عائشہ (رضی اللہ عنہا) کی طرف تھا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میرا ایک انصاری پڑوسی تھا۔ ہم باری باری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ ایک دن وہ جاتے اور ایک دن میں جاتا۔ اور وحی کا علم حاصل کرتے اور ایک دوسرے کو بتایا کرتے تھے۔ ہم ان دنوں شاہِ غسان کے بارے میں باتیں کیا کرتے تھے کہ وہ ہم سے جنگ کی تیاری کر رہا ہے۔ ایک دن میرے انصاری بھائی کی باری تھی۔ اس نے واپسی پر شام کے وقت میرا

دروازہ کھٹکھٹایا اور مجھے آواز دی۔ میں باہر نکلا تو اس نے کہا: بہت بڑا حادثہ پیش آ گیا ہے۔ میں نے پوچھا: کیا غسان نے حملہ کر دیا؟ اس نے کہا: نہیں، بلکہ اس سے بھی بڑا حادثہ رُونما ہوا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی بیویوں کو طلاق دے دی ہے۔ میں نے کہا: (حضرت) حفصہ (رضی اللہ عنہا) ناکام اور گھاٹے میں رہی۔ مجھے یہی ڈر تھا۔ میں نے صبح کی نماز پڑھی۔ تیاری کی اور (حضرت) حفصہ (رضی اللہ عنہا) کے گھر جا پہنچا۔ وہ بیٹھی رو رہی تھی۔ میں نے پوچھا: کیا رسول اللہ ﷺ نے تمھیں طلاق دے دی ہے؟ اس نے کہا: مجھے علم نہیں۔ وہ ہم سے الگ ہیں اور بالا خانے میں تشریف فرما ہیں۔ میں نے آپ ﷺ کے ایک سیاہ فام غلام سے حاضری کی اجازت کے لیے کہا۔ غلام گیا، اس نے واپس آ کر بتایا کہ میں نے خبر دی ہے مگر آپ ﷺ خاموش رہے۔ کوئی جواب مرحمت نہیں فرمایا۔ میں منبر کے پاس آ گیا۔ وہاں کچھ لوگ افسردہ بیٹھے تھے۔ بعض تو رو بھی رہے تھے۔ میں تھوڑی دیر وہاں رکا، پھر بے تاب ہو گیا۔

اُس سیاہ فام کے پاس دوبارہ آیا اور اجازت طلب کرنے کے لیے اندر بھیجا۔ وہ پھر واپس آیا تو بتایا کہ اللہ کے رسول ﷺ خاموش ہیں۔ کوئی جواب مرحمت نہیں فرمایا تو میں جلدی سے پلٹا۔ اچانک غلام کی آواز آئی کہ آپ اندر جا سکتے ہیں۔ میں نے پوچھا: کیا اجازت مل گئی ہے؟ اُس نے کہا: ہاں، میں اندر داخل ہوا۔ سلام عرض کی۔ نبی اکرم ﷺ ایک باریک بُنی ہوئی چٹائی پر ٹیک لگا کر تشریف فرما تھے۔ چٹائی کے نشان نبی مکرم ﷺ کے جسمِ مبارک پر صاف نظر آ رہے تھے۔ میں نے عرض کی: آپ ﷺ نے اپنی بیویوں کو طلاق دے دی؟ آپ ﷺ نے سر اٹھایا اور فرمایا: نہیں، میں نے اللہ اکبر کہا اور عرض کی: اللہ کے رسول ﷺ! ہم قریشی لوگ عورتوں پر غالب رہتے تھے۔ اب ہم مدینہ میں ایسے لوگوں کے پاس آئے ہیں جن پر عورتوں کا غلبہ ہے۔ ہماری عورتیں بھی ان سے یہی کچھ سیکھ رہی ہیں۔ میں ایک دن اپنی بیوی سے ناراض ہوا تو وہ مجھ سے بحث و تکرار کرنے لگی۔ مجھے اچھا نہ لگا۔ اس نے کہا: کیا میری تکرار پسند نہیں؟ اللہ کی قسم! ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن بھی نبی کریم ﷺ سے تکرار کرتی ہیں۔ بسا اوقات سارا سارا دن قطع تعلقی بھی کر لیتی ہیں۔ میں نے کہا: ایسا کرنے والی ناکام اور خسارے میں ہے۔ کیا انھیں ڈر نہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی ناراضی کے باعث ان سے اللہ تعالیٰ ناراض ہو جائے گا۔ ایسا ہوا تو وہ ہلاک ہو گئیں۔ نبی اکرم ﷺ یہ گفتگو سن کر مسکرائے۔ میں نے کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ! میں (حضرت) حفصہ (رضی اللہ عنہا) کے پاس گیا اور اسے بتایا کہ تجھے کسی غلط فہمی میں نہیں رہنا چاہیے، تیری سوکن تجھ سے زیادہ خوبصورت اور رسول اللہ ﷺ

کو تجھ سے زیادہ محبوب ہے۔ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم پھر مسکرائے۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت طلب کی کہ کیا میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دل بہلانے کے لیے یہاں ٹھہر سکتا ہوں؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں'' میں وہاں بیٹھ گیا۔ میں نے سارے گھر میں نظر دوڑائی۔ مجھے سوائے چمڑے کے تین ٹکڑوں کے کچھ نظر نہیں آیا۔ میں نے عرض کی: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! اللہ تعالیٰ سے دعا کیجیے کہ اللہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت پر آسانیاں فرمائے۔ فارس اور روم والوں کو دیکھیے کس قدر آسودہ حال لوگ ہیں، حالانکہ وہ مشرک ہیں۔ یہ سن کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سیدھے ہو کر بیٹھ گئے، پھر فرمایا:

«اَفِيْ شَكٍّ أَنْتَ يَا ابْنَ الْخَطَّابِ؟ أُولٰئِكَ قَوْمٌ عُجِّلَتْ لَهُمْ طَيِّبَاتُهُمْ فِيْ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا»

''اے ابنِ خطاب! کیا تو کسی شک میں مبتلا ہے؟ یہ تو وہ لوگ ہیں جنھیں ان کی عمدہ چیزیں دنیا ہی میں دے دی گئی ہیں۔''

میں نے عرض کی: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! میرے لیے مغفرت کی دعا فرمائیے۔ اصل بات یہ تھی کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قسم اٹھائی تھی کہ اپنی بیویوں کے پاس ایک مہینے تک نہیں جائیں گے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ازواجِ مطہرات (رضی اللہ عنہن) کی طرف سے کچھ رنج پہنچا تھا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں تنبیہ فرمائی۔"[1]

یہ وہ کردار تھا جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسلامی معاشرے میں ادا کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت سے تمغے حاصل کیے جن سے ان کا فضل وکمال، دین اور علم کی گہرائی عیاں ہو کر سامنے آتی ہے۔

فضائل ومناقب:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فضیلت ومنقبت میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بعد دوسرا نمبر ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بعد وہ مطلق طور پر سب صحابہ رضی اللہ عنہم سے افضل ہیں۔ اور ہر مسلمان کا یہی عقیدہ ہونا چاہیے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں بہت سی احادیث وارد ہوئی ہیں جو ان کے فضل وکمال پر دلالت کرتی ہیں۔

ایمان، علم اور دین:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے علم کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

[1] الموسوعة الحديثية مسند أحمد (١/ ٣٣) إسناده صحيح علىٰ شرط الشيخين.

''میں ایک دفعہ سویا ہوا تھا کہ میں نے خواب دیکھا۔ بحالتِ خواب میں نے دودھ پیا حتیٰ کہ میں نے اپنے ناخنوں تک سیرابی محسوس کی، پھر باقی دودھ میں نے (حضرت) عمر (رضی اللہ عنہ) کو دے دیا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کی: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خواب کی کیا تعبیر فرمائی؟ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''(اس کی تعبیر) علم کے ساتھ (ہے)۔''[1]

دودھ کو علم سے تشبیہ دینے میں بہت سی وجوہ کارفرما ہیں۔ علم اور دودھ دونوں صلاحیت کے اعتبار سے ایک جیسے ہیں۔ دودھ جسم کی اور علم روح کی غذا ہے، بہرحال اس حدیث میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی انتہائی منقبت اور فضیلت پائی جاتی ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دین کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''ایک دفعہ میں سویا ہوا تھا۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ لوگ میرے سامنے پیش کیے گئے۔ اور ان (کے بدن) پر قمیصیں تھیں۔ بعض لوگوں کی قمیصیں صرف سینے تک تھیں اور بعض کی اس سے بڑی تھیں۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ گزرے تو ان کی قمیص زمین پر گھسٹ رہی تھی۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کی: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خواب کی کیا تعبیر فرمائی؟ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''(اس کی تعبیر) دین کے ساتھ (ہے)۔''[2]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا رُعب اور شیطان کی مرعوبیّت:

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''ایک دفعہ (حضرت) عمر (رضی اللہ عنہ) نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اندر آنے کی اجازت طلب کی۔ اس وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ قریشی عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ اتنی اونچی آواز میں گفتگو کر رہی تھیں کہ ان کی آواز نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سے بلند ہو رہی تھی۔ جب ان عورتوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی آواز سنی تو وہ جلدی سے حجاب میں چلی گئیں۔ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حاضری کی اجازت عطا فرمائی۔ وہ آئے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسکرا رہے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی: اللہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طرح خوش وخرم رکھے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''مجھے ان عورتوں پر تعجب ہے جو ابھی میرے پاس بیٹھی تھیں۔ جب انھوں نے تمھاری آواز سنی

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٦٨١)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٩٠)

تو جلدی سے پردے میں چلی گئیں۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! آپ صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ مستحق ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ڈراجائے، پھر وہ عورتوں سے مخاطب ہوئے اور کہا: کیا تم مجھ سے ڈرتی ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں ڈرتی؟ عورتوں نے جواب دیا: ہاں، اس لیے کہ آپ تُند خو اور سخت غصے والے ہیں۔ یہ سن کر نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''خطّاب کے بیٹے! کوئی اور بات کرو۔ اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! شیطان اس راستے پر ہرگز نہیں چلتا جس راستے پر تم چلتے ہو۔'' (تمھیں دیکھ کر شیطان اپنا راستہ بدل لیتا ہے)۔''[1]

اس حدیث میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی فضیلت بیان کی گئی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مبنی بر حق اقدامات کی وجہ سے شیطان بھی ان تک رسائی میں ناکام رہتا تھا۔ طبرانی اوسط کی ایک روایت میں ام المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا ارشاد فرماتی ہیں:

''بلاشبہہ جب سے (حضرت) عمر (رضی اللہ عنہ) مسلمان ہوئے شیطان انھیں دیکھ کر بے اختیار گر پڑتا تھا۔''[2]

معلوم ہوا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ دین کے معاملے میں بڑے مضبوط تھے اور ہمیشہ خالص حق پر کاربند رہتے تھے۔ علاّمہ نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ حدیث اپنے ظاہر پر محمول ہے۔ شیطان حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دیکھ کر واقعی بھاگ جاتا تھا۔

زبانِ نبوت سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لیے ''عبقریّت'' کا اعزاز:

نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''میں نے خواب میں دیکھا کہ میں بغیر منڈیر کے ایک کنویں سے چرخی کے ذریعے سے پانی کے ڈول نکال رہا ہوں، پھر (حضرت) ابوبکر (رضی اللہ عنہ) آئے۔ ایک یا دو ڈول نکالے۔ ان کے پانی کھینچنے میں کچھ کمزوری تھی۔ اللہ انھیں معاف فرمائے، پھر (حضرت) عمر (رضی اللہ عنہ) آگئے،

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٣٦٨٣) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٣٩٦)

[2] عقیدة أهل السنة والجماعة (١/ ٣٤٨) المعجم الأوسط للطبراني (٣/ ٨٦١) رقم الحدیث (٣٩٤٣)

انھوں نے پانی نکالا تو وہی ڈول ایک بڑے ڈول میں تبدیل ہوگیا۔ میں نے کسی ایسے قوی شخص کو نہیں دیکھا جو (حضرت) عمر (رضی اللہ عنہ) جیسا عمل کرتا ہو۔ (حضرت) عمر (رضی اللہ عنہ) نے اتنے ڈول نکالے کہ لوگ سیراب ہو گئے اور لوگوں نے اپنے جانور سیراب کر کے باڑے میں بند کر دیے۔"[1]

اِس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمانِ عالی سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی فضیلت صاف ظاہر ہوتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس خوابِ مبارک میں معاشرے پر اس کا اثر بیان کرنے کے علاوہ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ عوام الناس حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے دورِ خلافت سے بہت مستفید ہوں گے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دور میں مرتدّین سے جہاد ہوا۔ ان کا قلع قمع ہوا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کی مدت بہت تھوڑی تھی۔ اس کے باوجود اسلام اطراف واکنافِ عالَم میں پھیل گیا۔ ان کی مدتِ خلافت صرف دو سال اور چند مہینے تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اسی میں برکت ڈال دی۔ اس سے مسلمانوں کو بہت فائدہ ہوا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو اسلامی حدود میں بڑی وسعت ہوئی اور ایسے جدید اور مفید قوانین بنے جو پہلے کبھی نہ بنے تھے۔ اس دورِ خلافت میں لوگ آسودہ حال ہوئے۔ آپ کی خلافت طویل ہونے کے سبب اس میں بہت سے نئے شہر بسائے گئے۔ سرکاری ادارے قائم ہوئے، فتوحات اور اموالِ غنیمت حاصل ہوئے۔

عادل ایسے کہ عمر کہہ لیں یا عدل، ایک ہی بات ہے۔ کفار کے لیے ایسے قہرِ ذوالجلال کہ قیصر و کسریٰ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نام سن کر تھر تھرائیں۔ غیّور ایسے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جنت میں ان کا محل اور جنتی خاتون دیکھ کر ان کی غیرت یاد آ گئی۔[2]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جنت کے محل کی خوشخبری:

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"میں نے خواب میں دیکھا کہ میں جنت میں داخل ہوا۔ اچانک میری ملاقات (حضرت) ابو طلحہ (رضی اللہ عنہ) کی بیوی (حضرت) رمیصاء (رضی اللہ عنہا) سے ہوئی، پھر میں نے پاؤں کی آواز سنی۔ میں

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٩٣)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٠٢٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٦٨٨) سنن النسائي الكبرىٰ (٨١٢٧) موارد الظمآن (٢١٨٩) مسند أحمد، رقم الحديث (١٢٠٦٥)

نے کہا: یہ کون ہے؟ مجھے کہا گیا: یہ (حضرت) بلال (رضی اللہ عنہ) ہیں، پھر میں نے ایک محل دیکھا۔ اس کے صحن میں ایک لڑکی تھی۔ میں نے پوچھا: یہ کس کا ہے؟ اس نے جواب دیا: یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا محل ہے۔ میں نے اس محل کو دیکھنے کے لیے اندر جانے کا ارادہ کیا لیکن اے عمر! تیری غیرت نے میرے قدم روک لیے۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر میرے ماں باپ قربان! کیا میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں غیرت کا اظہار کرسکتا ہوں؟[1]

یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی کتنی بڑی خوش نصیبی تھی کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا جنت میں محل دیکھا۔ اس سے اللہ تعالیٰ کے ہاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مرتبہ بھی عیاں ہوجاتا ہے۔[2]

وفات الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کے دن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا موقف:

جب نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر لوگوں تک پہنچی تو بڑا شوروغل برپا ہوا۔ یہ بہت بڑا صدمہ تھا، خصوصاً حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے لیے تو یہ انتہائی دل دوز سانحہ تھا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں: جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا گئے تو (حضرت) عمر بن الخطاب (رضی اللہ عنہ) کھڑے ہو گئے اور کہا: کچھ منافقین یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے جاچکے ہیں۔ نہیں، وہ فوت نہیں ہوئے، وہ تو حضرت موسیٰ بن عمران علیہ السلام کی طرح اپنے رب کے پاس گئے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام چالیس (۴۰) دن اپنی قوم سے غائب رہے تھے تو لوگوں نے کہنا شروع کر دیا تھا کہ وہ فوت ہو گئے ہیں لیکن وہ آ گئے تھے۔ اسی طرح اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح واپس تشریف لائیں گے اور جن لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ گمان کیا ہے کہ وہ فوت ہوگئے ہیں، ان کی گردنیں اڑا دیں گے۔[3]

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر ہوئی تو فوراً مسجدِ نبوی پہنچے اور دیکھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ لوگوں سے گفتگو کر رہے ہیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو آواز دی کہ رک جاؤ لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خاموش ہونے سے انکار کر دیا۔ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بے قابو ہو

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٣٦٧٩) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٣٩٤) حوالہ جات سابقہ.

[2] عقیدة أهل السنة والجماعة في الصحابة (١/ ٢٤٥)

[3] السیرة النبویة لأبي شهبه (٢/ ٥٩٤)

رہے ہیں تو وہ لوگوں کے سامنے کھڑے ہوگئے۔ جب لوگوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو کھڑے دیکھا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو چھوڑ کر وہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طرف متوجہ ہو گئے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء بیان کرنے کے بعد فرمایا:

''لوگو! جو آدمی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کیا کرتا تھا تو وہ سن لے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہو گئے ہیں اور جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کیا کرتا تھا تو وہ جان لے کہ اللہ حیّ وقیّوم ہے، اسے کبھی موت نہ آئے گی۔''

پھر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشادِ عالی تلاوت فرمایا:

﴿ وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۚ أَفَإِنْ مَاتَ أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ ۚ وَمَنْ يَنْقَلِبْ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَضُرَّ اللَّهَ شَيْئًا ۗ وَسَيَجْزِي اللَّهُ الشَّاكِرِينَ ﴾

[آل عمران: ١٤٤]

''اور محمد ایک رسول ہی تو ہیں۔ ان سے پہلے بہت سے رسول گزر چکے ہیں۔ اگر ان کا انتقال ہو جائے یا شہید ہو جائیں تو کیا تم اسلام سے اپنی ایڑیوں کے بل پھر جاؤ گے؟ اور جو کوئی اپنی ایڑیوں کے بل پھر جائے تو وہ اللہ کا کچھ بھی بگاڑ نہ سکے گا۔ اور اللہ شکر ادا کرنے والوں کو اچھی جزاء دے گا۔''

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: اللہ کی قسم! ایسا لگا گویا لوگوں کو اس آیت کے بارے میں کوئی علم ہی نہ تھا یہاں تک کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جب تلاوت کی تو پھر معلوم ہوا۔

وہ فرماتے ہیں: لوگوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی زبان سے یہ آیت سنی تو اسے پڑھنے لگے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ کی قسم! جب میں نے (حضرت) ابوبکر (رضی اللہ عنہ) کی زبان سے یہ آیت سنی تو دہشت زدہ ہو گیا۔ میرے قدموں نے مجھے اٹھانے سے انکار کر دیا۔ میں لڑکھڑا کر زمین پر گر گیا اور مجھے یقین ہو گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہو گئے ہیں۔[1]

سقیفۂ بنو ساعدہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا کردار:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد انصار سقیفۂ بنو ساعدہ میں جمع ہوئے۔ حضرت ابوبکر، عمر اور ابوعبیدہ رضی اللہ عنہم

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٥٤)

بھی وہاں پہنچ گئے۔ انصار نے کہا: ایک امیر ہم میں سے اور ایک امیر تم میں سے ہونا چاہیے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے گفتگو کرنی چاہی لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انھیں خاموش رہنے کی تاکید کی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے: اس وقت میں نے اپنے دل میں اس موقع کے لیے بہت عمدہ گفتگو سوچ رکھی تھی اور میں چاہتا تھا کہ مجھ سے پہلے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ گفتگو نہ کریں تاکہ میں اپنی بات کہہ دوں۔

پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بہت عمدہ باتیں ارشاد فرمائیں کہ اے انصار! ہم امراء کا منصب سنبھالتے ہیں اور تم وزراء کا منصب سنبھالو۔ یہ سن کر حضرت حباب بن منذر رضی اللہ عنہ نے کہا: نہیں، اللہ کی قسم! ہم ایسا نہیں کریں گے، بلکہ ایک امیر ہم میں سے اور ایک تم میں سے ہوگا، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے دوبارہ فرمایا: نہیں، ایسا نہیں ہوگا بلکہ خلیفہ ہم مہاجرین میں سے ہی ہوگا۔ اور تم منصبِ وزارت پر فائز رہو گے کیونکہ مہاجرین علاقے کے اعتبار سے بھی سب سے اچھے اور حسب ونسب کے لحاظ سے بھی اعلیٰ ترین لوگ ہیں، اس لیے تم حضرت عمر رضی اللہ عنہ یا حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ میں سے کسی ایک کے ہاتھ پر بیعت کرلو۔ اس حضرت پر عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

«بَلْ نُبَايِعُكَ أَنْتَ، أَنْتَ سَيِّدُنَا وَخَيْرُنَا وَأَحَبُّنَا إِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ»

”نہیں، ہم تو آپ ہی کی بیعت کریں گے۔ آپ ہمارے سردار ہیں، ہم میں سے افضل ترین ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ نبی اکرم ﷺ کے سب سے زیادہ محبوب تھے۔“

یہ کہہ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑا اور بیعت کی، پھر سب حاضرین نے بیعت کرلی۔[1] حضرت عمر رضی اللہ عنہ انصار سے مخاطب ہوئے: اے انصاریو! کیا اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اپنی جگہ امام مقرر نہیں کیا تھا؟ اب ایسا کون ہے جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے مقدّم ہوسکے؟ یہ سن کر انصار نے جواب دیا: ہم اللہ کی پناہ پکڑتے ہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے آگے بڑھنے کی کوشش کریں۔[2]

بعد ازاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ جلدی سے آگے بڑھے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے گزارش کی کہ اپنا ہاتھ آگے بڑھائیے، پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کرلی۔ اس کے بعد مہاجرین اور انصار نے بھی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کی۔[3]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ لوگوں کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کی ترغیب دیتے رہے یہاں تک کہ سب لوگ

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٦٦٨)

[2] محض الصواب في فضائل أمير المؤمنين عمر بن الخطاب (١/ ٢٨٠)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٦٦٨)

متفقہ طور پر خلافتِ صدیق رضی اللہ عنہ پر جمع ہوگئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان سب کو فتنہ، فساد اور انتشار سے محفوظ کر دیا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد لوگوں کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اَمارت و خلافت پر جمع کرنا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا وہ لافانی کارنامہ ہے کہ اسے سونے کے پانی سے لکھا جاسکتا ہے۔[1]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کو یکجا رکھا اور فتنوں کی آگ بھڑکنے سے پہلے ہی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کرنے میں جلدی کی اور پھر عمومی بیعت میں بھی بہت اہم کردار ادا کیا۔ اس طرح امتِ مسلمہ انتشار و اختلاف کے ہر المیے سے محفوظ رہی۔ یہ سب کچھ حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر اللہ کے فضل کے بعد ان کے خداداد فہم وفراست کا نتیجہ تھا۔[2]

شہداء کی دیت کے بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مشورہ:

مرتدّین کے خلاف جنگوں میں شہید ہونے والوں کی دیت قبول نہ کرنے کی رائے یوں بیان کی جاتی ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس اسد اور غطفان قبائل سے ایک وفد بُزاخہ (حائل کے قریب ایک مقام ہے) حاضر ہوا اور صلح کی پیشکش کی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انھیں دو باتوں میں سے ایک کا اختیار دیا کہ یا تو ایسی جنگ اختیار کرلو جس میں جلاوطنی ہوگی یا ایسی صلح اختیار کرلو جس میں رسوائی ہوگی۔ انھوں نے پوچھا: جنگ کو تو ہم جانتے ہیں لیکن رسوائی والی صلح کیا چیز ہوتی ہے؟ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تم سے تمھارے گھر بار اور جانور چھین لیے جائیں گے اور سب کچھ مالِ غنیمت ہوگا۔ تمھارے پاس ہمارا جو مال ہے وہ واپس کرنا پڑے گا۔ تم ہمارے مقتولین کی دیت دو گے، تمھارے مقتولین آگ میں جائیں گے اور جب تک خلیفۃ المسلمین اور مہاجرین تمھارے بارے میں کوئی اور فیصلہ نہ کریں، تمھیں کھیتی باڑی کرنی پڑے گی۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنی یہ رائے سب لوگوں کے سامنے پیش کی۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور کہا: میرے خیال میں آپ نے جو جلا وطنی والی جنگ یا رسوائی والی صلح کی بات کی ہے، وہ درست ہے۔ غنیمت کا مال اور اپنا مال واپس لینا بھی ٹھیک ہے مگر یہ جو آپ نے شہیدوں کی دیت مانگی ہے، وہ درست معلوم نہیں ہوتی، کیونکہ ہمارے مقتولین اللہ کی راہ میں شہید ہوئے۔ وہ اپنے اللہ سے اجر پائیں گے۔ یہ سن کر سب لوگوں نے تائید کی۔[3]

---

[1] الحكمة في الدعوة إلى الله (ص: ٢٢٧)

[2] الخلفاء الراشدون لعبد الوهاب النجار (ص: ١٢٣)

[3] أخبار عمر (ص: ٣٦٢) نقلًا عن الرياض النضرة ونيل الأوطار (٨/ ٢٢)

ایک دن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں ایک آدمی حاضر ہوا۔ اس نے سب کے سامنے ڈنکے کی چوٹ پر کہا: اے عمر (رضی اللہ عنہ) ! اللہ سے ڈر جا ... کچھ لوگ اس کی سرِ عام یہ بات سن کر اس پر غضب ناک ہوئے اور اسے خاموش کرنے کی کوشش کی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے لوگو! اگر تم اس جیسی بات نہ کہو تو تمھارے اندر کوئی خیر خواہی نہیں اور ہم حکمران ایسی باتیں نہ سنیں تو پھر ہم میں بھی کوئی بھلائی نہیں۔[1]

اسلامی معاشرے میں آزادی ایک اساسی ستون کی حیثیت رکھتی ہے۔ خلفائے راشدین کے عہد میں آزادی کی نعمت نہایت احسن شکل میں نافذ نظر آتی تھی۔[2]

اسی طرح حضرت عمر بن خطّاب رضی اللہ عنہ وہ پہلی شخصیت ہیں جو امیر المومنین کے لقب سے مشرّف ہوئے۔ سیرتِ خلفاء رضی اللہ عنہم کا مطالعہ کرنے والا صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے کلام پر غور وفکر کرے گا تو اس نتیجے پر پہنچے گا کہ وہ سب اس لقب پر متفق تھے اور پوری اسلامی مملکت میں خلیفہ کے لیے یہی لقب شہرت پا گیا۔[3]

مسئولیت کا ایسا ڈر کہ دریائے فرات کے کنارے ایک بکری یا اونٹ بھی پیاسا مر جائے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اس کے متعلق بھی سوال ہوگا۔ (یہ اثر پانچ طُرق سے مروی ہے اور سبھی میں ضُعف ہے، الّا یہ کہ یہ سب مل کر تقویت اختیار کر جاتے ہیں۔)[4]

زہد:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ قرآنِ کریم سے نہایت گہرے لگاؤ، نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مصاحبت اور اس کائنات میں غور وفکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ یہ دنیا آزمایش کا گھر ہے۔ یہ آخرت کی کھیتی ہے۔ یہی وجہ تھی وہ دنیا کی تمام رنگینیوں، زیب وزینت اور چمک دمک کو ہیچ اور ناقابلِ توجہ سمجھتے تھے۔ وہ دنیا کی دلفریبیوں سے آزاد ہو کر دل ودماغ کی گہرائیوں سے اپنے رب کے کامل اطاعت گزار بن کر اُس کے آگے جھک چکے تھے۔ ان کے دل کے ایک ایک ریشے میں ایسے حقائق جاگزین ہو چکے تھے کہ ان کے زیرِ اثر وہ زہد اور عاجزی کے پیکر نظر آتے تھے۔ ذرا یہ حقائق ملاحظہ فرمائیے:

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: اللہ کی قسم! (حضرت) عمر (رضی اللہ عنہ) ہجرت کے معاملے

---

[1] نظام الحكم في عهد الخلفاء الراشدين (ص: ٢٠٠)

[2] المجتمع الإسلامي للدكتور محمد أبي عجوة (ص: ٢٤٥)

[3] محض الصواب (١/ ٣١٣)

[4] الإسلام سوال وجواب للشيخ المنجد.

میں ہم سے مقدّم نہ تھے بلکہ وہ دنیا سے بے رغبتی کے اعتبار سے ہم سے افضل تھے۔[1]

امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی یہی خواہش تھی کہ وہ سب لوگوں کے ساتھ مل کر کھانا کھائیں کیونکہ اس میں بہت سے معاشرتی فوائد مضمر تھے۔ وہ قطعاً نہیں چاہتے تھے کہ بیت المال یا مسلمانوں کی کمائی سے تیار کھانا کھائیں۔ وہ صرف اپنے ہی خالص مال سے تیار شدہ کھانا منگواتے تھے اور سب کے ساتھ مل کر کھاتے تھے۔

یہ بے داغ زندگی اور پرہیز گاری کی عمدہ ترین مثال تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیت المال کا کھانا کھانے کے پوری طرح مجاز تھے۔ اُس کھانے میں کوئی حرج یا حرمت کا شبہ تک نہ تھا کیونکہ وہ بھی تو مسلمانوں کے ایک فرد تھے۔ اس کے باوجود انھوں نے خود کو بیت المال یا عام مسلمانوں کے کھانے سے دور رکھا، صرف اس لیے کہ وہ ہر ممکن طور پر اللہ کی رضا کے طلب گار تھے۔ خوفِ الٰہی کی شدّت کی وجہ سے وہ ادنیٰ شُبہ والی چیز سے بھی اپنے آپ کو بچا کر رکھتے تھے۔[2]

اہلِ بیت رضی اللہ عنہم کا احترام اور اُن سے محبت:

بلاشبہہ حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ بلکہ سارے ہی اہلُ الایمان کے ہاں اہلِ بیت رضی اللہ عنہم انتہائی مکرم ومحترم اور بلند ترین درجے کے حامل افراد ہیں۔ اُن کے حقوق کا، جو اللہ تعالیٰ نے انھیں عطا فرمائے ہیں، تحفّظ کرتے آئے ہیں۔ وہ ان سے محبت کرتے ہیں، ان کا خیال رکھتے ہیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس وصیّت کے مطابق عمل کرتے ہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غدیرِ خُم کے دن ارشاد فرمائی تھی:

«اُذَكِّرُكُمُ اللّٰهَ فِي اَهْلِ بَيْتِي»[3]

''میں تمھیں اپنے اہلِ بیت (رضی اللہ عنہم) کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈراتا ہوں۔''

ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن سے حسنِ سلوک:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کی خبر گیری فرمایا کرتے تھے۔ ان کے لیے وقتاً فوقتاً عطیات ارسال فرماتے تھے۔ کوئی پھل یا عمدہ چیز اس وقت تک نہ کھاتے جب تک کہ اس سے ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن

[1] المصنف لابن أبي شيبة (٨/ ١٤٩) ابن عساكر (٢٥/ ٢٤٤) وإسناده جيد.

[2] تاريخ الإسلام (١٩/ ٣٧)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٠٨)

کا حصہ نہ نکال لیتے۔ وہ اپنی بیٹی زوجۂ رسول ﷺ (حضرت) حفصہ (رضی اللہ عنہا) کا حصہ آخر میں نکالتے تاکہ اگر کمی ہو تو اس میں ہو۔ وہ مطلوبہ اشیاء ایک تھیلے میں ڈالتے اور ازواجِ مطہراتِ رضی اللہ عنہن کی خدمت میں ارسال فرماتے تھے۔[1]

ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کی عزت و اکرام کے بارے میں خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: (حضرت) عمر (رضی اللہ عنہ) ہمارے حصے کے سری پائے تک ہمیں بھجوادیا کرتے تھے۔[2]

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور ان کی اولاد کی عزت و توقیر:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ آلِ رسول ﷺ کا انتہائی احترام فرماتے تھے حتیٰ کہ انھیں اپنے حقیقی بیٹوں اور رشتہ داروں سے بھی زیادہ محبوب رکھتے تھے۔ امام ابن سعد حضرت جعفر بن محمد باقر رحمہ اللہ سے اور وہ اپنے باپ علی بن حسین رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس ایک دفعہ یمن سے بہت سے قیمتی جوڑے آئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وہ جوڑے سب لوگوں میں تقسیم کر دیے۔ لوگ بہت خوش ہوئے۔ وہ ریاض الجنہ میں بیٹھے تھے۔ لوگ آتے، سلام کہتے اور دعائیں دے کر چلے جاتے تھے۔ اسی اثناء میں حضرت حسن اور حسین رضی اللہ عنہما اپنی ماں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے گھر سے نکلے۔ وہ لوگوں کو بھلا لگتے ہوئے آگے آرہے تھے۔ اور دونوں صاحبزادوں کو کوئی جوڑا انھیں ملا تھا۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا چہرہ شکن آلود ہو گیا۔ فرمایا: ان جوڑوں کی تقسیم سے مجھے خوشی نہیں ہوئی۔ لوگوں نے عرض کی: اے امیر المومنین! آپ نے لوگوں کو پہنایا، ان سے اچھا سلوک کیا! حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں ان دو بچوں کی وجہ سے پریشان ہو گیا ہوں۔ پھر یمن کے حاکم کی طرف لکھا کہ حضرات حسن اور حسین رضی اللہ عنہما کے لیے دو بہترین جوڑے فوراً رسال کیے جائیں۔ جب وہ جوڑے پہنچ گئے تو حضراتِ حسنین رضی اللہ عنہما کو بلا کر انھیں عطا فرمائے۔[3]

حضرت ابوجعفر رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس جب فتوحات کا سامان آیا اور انھوں نے اسے تقسیم کرنے کا ارادہ فرمایا تو اصحابِ رسول ﷺ کو جمع فرمایا۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ

[1] الزهد للإمام أحمد (ص: ١٦٦) من طريق مالك وإسناده صحيح.

[2] الطبقات لابن سعد (٣/ ٣٠٣) صحيح.

[3] المرتضیٰ للندوی (ص: ١١٨) نقلًا عن الإصابة (١/ ١٠٦)

نے عرض کی: تقسیم کا کام اپنے آپ سے شروع فرمایئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: نہیں۔ اللہ کی قسم! میں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ داروں سے شروع کروں گا، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قبیلہ بنو ہاشم کو دوں گا، چنانچہ انھوں نے سب سے پہلے حضرت عباس رضی اللہ عنہ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو عطا فرمایا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کسی بھی اہم معاملے میں اپنی رائے اُس وقت تک قائم نہ فرماتے جب تک کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مشورہ نہ فرما لیتے۔ وہ انھیں انتہائی خیر خواہی اور اخلاص کی بنیاد پر مشورہ عطا فرماتے اور جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیت المقدس کی طرف سفر کیا تو تمام امورِ خلافت پر مدینہ میں انہی کو اپنا نائب بنایا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے درمیان مکمل ہم آہنگی اور یکجہتی پائی جاتی تھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی بیٹی حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا، جو سیدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کے بطن سے تھیں، ان کا نکاح بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کر دیا تھا۔[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے محبت کی وجہ سے اپنے ایک بیٹے کا نام عمر رکھا جیسا کہ ایک کا ابوبکر رکھا اور تیسرے کا عثمان رکھا۔ رضي الله عنهم.[2] بلاشبہ جو آدمی اپنے بچوں کے نام کسی کے نام پر رکھتا ہے تو اس کی بنا محبت پر ہی ہوتی ہے۔[3]

حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مشیرِ اوّل تھے۔ وہ ان سے اپنے تمام قضایا اور مشکلات میں مشورہ لیتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جو مشورہ بھی دیتے، وہ پورے اعتماد اور اطمینان سے اس پر عمل فرماتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے تمام معاملات اور حالات میں ان کی مکمل خیر خواہی فرماتے تھے۔

یہ بڑے غور وفکر کا مقام ہے کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعد خلافت کی وصیّت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حق میں فرمائی ہوتی تو کیا حضرت علی رضی اللہ عنہ وصیّتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے روگردانی کی جسارت کر سکتے تھے؟ کیا وہ حق دلانے والوں کی آواز پر لبیک نہ کہتے؟ کیا وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ امورِ خلافت میں اخلاص اور خیر خواہی سے شریک ہوتے؟ دوسری طرف کیا تمام صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم جن میں خود حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی صفِ اول میں موجود تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیّت کے نفاذ سے پہلو تہی کرتے؟ پس لازم ہے کہ ہم بدیہی طور

[1] المرتضىٰ للندوي (ص: ١١٩)

[2] البداية والنهاية (٧/ ٣٣١_ ٣٣٢)

[3] المرتضىٰ للندوي (ص: ١١٩)

پر یہ حقیقت خوب سمجھ لیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت کے آخر تک پوری امت ایک ہی جماعت رہی۔ کسی کے دل و دماغ میں خلافت کے بارے میں کوئی اشکال ہی نہ تھا۔ نہ یہ سوال پیدا ہوا تھا کہ خلافت کا زیادہ حق دار کون ہے؟[1]

حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور ان کے صاحبزادے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کا احترام:

حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی فضیلت سے آگاہ کیا۔اور انھیں احساس دلایا کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کتنے محترم، متواضع اور کس قدر بلند رتبہ انسان ہیں۔ یہ نظارہ اُس وقت دکھائی دیا جب ''عام الرمادہ'' میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بارش کے لیے حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے اللہ کے حضور دعا کرائی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حلفاً کہا کرتے تھے کہ مجھے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا مسلمان ہونا اپنے باپ کے مسلمان ہونے سے زیادہ عزیز ہے کیوں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا مسلمان ہونا بہت محبوب تھا۔[2]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو بلاتے تھے، اپنے قریب جگہ دیتے تھے اور فرماتے تھے: میں نے ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس عالم میں دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو بلایا، آپ کے سر پر ہاتھ پھیرا اور فرمایا:

«اَللّٰهُمَّ! فَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ وَ عَلِّمْهُ التَّأْوِيْلَ»[3]

''اے اللہ! اسے دین کی سمجھ اور تفسیر کا علم عطا فرما۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کے اِکرام اور قدر و منزلت کو مزید بلند، مُحکم اور اجاگر کرنے کے لیے نشاندہی کرتے تھے اور بتاتے تھے کہ علم اور فہم کے اعتبار سے ان کا کتنا بڑا درجہ ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے: قرآنِ کریم کے بہترین ترجمان حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ہیں، جب وہ آتے تو فرماتے تھے: مشائخ و علماء کا نوجوان، زیادہ سوال کرنے والی زبان والا اور سمجھدار دل کا حامل فرد آیا ہے۔[4]

---

[1] فقه السيرة النبوية (ص: ٥٢٩)

[2] العقيدة في أهل البيت بين الأفراط والتفريط (ص: ٢١٠)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٤٥) مسند أحمد (٢٣٩٧) فتح الباري (١/ ١٧٠)

[4] البداية والنهاية (٨/ ٣٠٣)

قصہ مختصر، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور اہلِ بیت رضی اللہ عنہم باہم ایک دوسرے کا بڑا احترام کرتے تھے اور فریقین ایک دوسرے سے زبردست محبت کرتے تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بہت محبت تھی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ایک حدیث بیان کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ یہ حدیث میں نے بہت سے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے سنی ہے۔ ان میں (حضرت) عمر (رضی اللہ عنہ) بھی شامل ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم میرے نزدیک تمام صحابہ رضی اللہ عنہم سے محبوب ترین تھے۔[1]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا معاشرتی کردار

عورتوں سے حُسنِ سلوک:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ معاشرے کی تمام عورتوں، مسلمانوں کی بیویوں، بیٹیوں اور بوڑھی خواتین کے حقوق کا خاص خیال رکھتے تھے۔ انھیں ہر قسم کے ظلم سے بچاتے تھے۔ ان کے گھروں کی خبر گیری فرماتے تھے۔ جن کے مرد حضرات جہاد کے لیے گھر سے چلے جاتے تھے، ان کی عیال داری فرماتے، وہ بیواؤں کے حقوق ان کی دہلیز پر پہنچاتے تھے۔ ان کا مشہور مقولہ ہے: اللہ کی قسم! اگر اللہ تعالیٰ مجھے فراخی عطا فرمائے تو میں اہلِ عراق کی کسی بیوہ عورت کو اس حال میں نہ رہنے دوں کہ وہ میرے بعد کسی چیز کی محتاج رہے۔[2]

تُو! حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی لغزشیں ڈھونڈ رہا ہے!

ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ رات کے اندھیرے میں باہر نکلے۔ انھیں حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ نے دیکھ لیا۔ وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پیچھے ہو لیے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک گھر میں داخل ہوئے، پھر اسی طرح دوسرے گھر میں داخل ہوئے۔ صبح ہوتے ہی حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اُسی گھر کی طرف گئے۔ دیکھا کہ ایک بوڑھی عورت بیٹھی ہے۔ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے اس عورت سے پوچھا: یہ رات کو آنے والا آدمی یہاں کیوں آتا ہے؟ بڑھیا نے کہا: یہ آدمی مدت سے میرے پاس آتا ہے۔ میری ضرورتوں کا خیال رکھتا ہے اور گھر کی صفائی بھی کر دیتا ہے۔ یہ سن کر حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ دم بخود رہ گئے، پھر انھوں نے خود کلامی شروع کر دی اور کہا: اے طلحہ (رضی اللہ عنہ)! تجھے تیری ماں گم پائے تُو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی لغزشیں ڈھونڈنے نکلا تھا؟[3]

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٢٦)

[2] صحيح التوثيق في سيرة وحياة الفاروق عمر بن الخطاب (ص: ٣٧٣)

[3] أخبار عمر (ص: ٣٤٤) ومحض الصواب.

سرِراہ عورت سے گفتگو پر سرزنش:

ایک دفعہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ راستے سے گزر رہے تھے۔ اچانک انھوں نے دیکھا کہ ایک آدمی راستے ہی میں ایک عورت سے گفتگو کر رہا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے کوڑا امارا۔ اس نے عرض کی: اے امیر المومنین! یہ میری بیوی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تُو اپنی بیوی کے ساتھ راستے میں کیوں کھڑا ہے؟ اور لوگوں کو اپنی ذاتی گفتگو کی طرف کیوں متوجہ کر رہا ہے؟ اس نے عرض کی: اے امیر المومنین! ہم ابھی ابھی مدینہ میں داخل ہوئے ہیں اور سوچ رہے ہیں کہ کہاں قیام کریں؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ سن کر کوڑا اس کی طرف بڑھا دیا اور فرمایا: اے اللہ کے بندے! مجھ سے قصاص لے لے۔ اس آدمی نے کہا: میں آپ کی رضا کے لیے قصاص چھوڑتا ہوں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ کوڑا پکڑ اور قصاص لے۔ تیسری دفعہ کہنے پر اس آدمی نے کہا: میں نے اللہ کے لیے معاف کیا۔ اب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تیرے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ کوڑا ثواب کا سبب بن گیا۔[1]

حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ کے یہاں عورت کا مقام:

خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے عہدِ زرّیں میں عورت بڑے بلند درجے پر فائز تھی۔ اسلام نے عورت کو نہایت معزز اور عالی مرتبہ بنا دیا، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ خلافتِ راشدہ کے عہدِ مبارک میں بہت سی خواتین فکری، ادبی اور تجارتی میدانوں میں سرگرمِ عمل تھیں۔ حضرت عائشہ، ام سلمہ، حبیبہ بنت ام حبیبہ، اروىٰ بنت کریز بن عبدشمس اور اسماء بنت سلمہ تمیمیہ رضی اللہ عنہن جیسی بلند پایہ خواتین نے قرآنِ کریم، حدیث، فقہ، ادب اور فتووں میں بلند مقام حاصل کیا۔ ان کے مقابلے میں حضرت ہند اور خنساء رضی اللہ عنہما جیسی عورتوں نے شعر گوئی میں مہارت حاصل کی۔[1]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ عورت کی بڑی تعظیم کرتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ خواتین انسانیت کا حسّاس اور باشعور طبقہ ہیں اور ان میں غور وفکر کی صلاحیتیں موجود ہیں۔ وہ جس طرح مرد حضرات سے مشورہ طلب فرماتے، اُسی طرح عورتوں سے بھی مشورہ طلب کرتے تھے۔ وہ حضرت شفاء بنت عبد اللہ عدوی رضی اللہ عنہا کی

[1] أخبار عمر (ص: ١٩٠) نقلًا عن الرياض النضرة.

[2] تطور تاريخ العرب السياسي و الحضاري للدكتوره فاطمه الشامي (ص: ١٧٥)

رائے کو بڑی اہمیت دیتے تھے اور اسے مقدّم رکھتے تھے۔[1]

جب امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسا عالی مرتبت آدمی خواتین سے بعض ریاستی معاملات تک میں مشورہ لیتا تھا اور ان کی رائے کو اختیار بھی کرتا تھا، اور اسلام نے انھیں مشورہ دینے کا حق بھی دیا ہے تو عورتوں کے لیے اس امر کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا کہ وہ اپنے حقوق کے لیے کوئی غیر اسلامی طریقہ تلاش کریں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہمیشہ احساسِ ذمہ داری سے سرشار رہتے تھے۔ وہ اپنے آپ کو اپنی رعایا کا سرپرست سمجھتے تھے۔ وہ ان عورتوں کے دروازوں تک پہنچتے تھے جن کے خاوند جہاد پر جانے کی وجہ سے گھروں میں موجود نہ ہوتے۔ وہ دریافت فرماتے کہ کیا تمھاری کوئی ضرورت ہے؟ یا تم میں سے کوئی کچھ خریدنا چاہتی ہے؟ فرماتے تھے کہ مجھے ڈر ہے کہ کہیں تم خرید وفروخت میں دھوکے کا شکار نہ ہو جاؤ۔ عورتیں اپنی لونڈیوں کو ساتھ کر دیتیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بازار تشریف لے جاتے تو ان کے پیچھے بہت سے غلام اور لونڈیاں ہوتیں۔ وہ سب کے لیے ان کا ضروری سامان خرید لیتے۔ اگر کسی کے پاس پیسے نہ ہوتے تو اپنی جیب سے اُس کے لیے خریداری کر لیتے تھے۔

قبولِ اسلام میں سبقت کرنے والوں کو ترجیح:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے نزدیک کسی شخص کا دوسرے پر فضیلت پانے کا معیار حسنِ عمل تھا۔ ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دروازے پر بہت سے قریشی سردار آگئے۔ ان میں حضرت سہیل بن عَمرو بن حارث رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوسفیان بن حرب رضی اللہ عنہ سرِفہرست تھے۔ عین اسی وقت حضرت بلال رضی اللہ عنہ اور حضرت صہیب رضی اللہ عنہ جیسے کچھ ایسے آزاد کردہ غلام بھی حاضر ہوئے جنھیں اسلام لانے میں سبقت کا شرف حاصل تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سب سے پہلے ان فقیر غلاموں کو باریابی کی اجازت دی اور قریشی سرداروں کو بعد میں شرفِ ملاقات بخشا۔ قریشی سردار حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس طرزِ عمل پر بڑے ناراض ہوئے۔ ابوسفیان نے اپنے ساتھیوں سے کہا: آج کے دن جیسا رُسواکن دن میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ (حضرت) عمر (رضی اللہ عنہ) نے غلاموں کو شرف بخشا ہے اور ہمیں دروازے پر کھڑا چھوڑ دیا ہے۔ حضرت سہیل رضی اللہ عنہ نے کہا: اے لوگو! اللہ کی قسم! میں تمھارے چہروں پر ناراضی کے آثار دیکھ رہا ہوں۔ اگر تم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس عمل پر ناراض ہو تو پھر تمھیں اپنے اس فعل پر بھی نادم ہونا چاہیے، جب ان غلاموں کو اور تمھیں اکٹھے اسلام لانے کی دعوت دی

---

[1] شهيد المحراب (ص: ٢٠٥)

گئی تھی تو انھوں نے فوراً اسلام قبول کر لیا تھا لیکن تم لوگوں نے تاخیر کی۔ اب تم وہ دن یاد کرو جب قیامت کے دن ان سب کو تم سے پہلے آواز دی جائے گی۔[1]

معاشرے کے قد آور افراد کی تربیّت:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پورے دورِ خلافت میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ انھوں نے کسی قد آور شخصیت کا غریب عوام پر تسلّط بر داشت کیا ہو یا کسی طاقتور شخص کو کسی غریب پر کوئی ظلم ڈھانے یا کسی قسم کی طبقاتی اونچ نیچ کا مظاہرہ کرنے کی اجازت دی ہو۔

اپنی صحت کا خیال نہ رکھنے پر تنقید:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ عوام کی صحت کا خاص خیال رکھتے تھے۔ وہ انھیں موٹاپے کے خطرناک نتائج سے آگاہ فرماتے اور انھیں اپنا وزن کم رکھنے کی رغبت دلاتے تاکہ اس طرح وہ اپنا کام طاقت اور ہمت سے انجام دے سکیں اور اپنی ڈیوٹی بہتر طریقے سے پوری کر سکیں۔ وہ فرمایا کرتے تھے: اے لوگو! زیادہ پیٹ بھر کے کھانا نہ کھایا کرو کیونکہ یہ نماز سے سستی، جسم کے لیے فساد اور طرح طرح کی بیماریوں کا سبب ہے۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ موٹے آدمی کو پسند نہیں فرماتا۔ تم اپنی خوراک میں میانہ روی اختیار کرو، اس سے فضول خرچی بھی نہ ہوگی، صلاحیتیں بھی برقرار رہیں گی اور اللہ عزّ وجل کی بندگی ہمت وطاقت سے بجا لائی جاسکے گی۔ کوئی بندہ اُس وقت تک ہلاکت کا شکار نہیں ہوتا جب تک اس کی خواہشات اس کے دین پر غالب نہ آجائیں۔[2]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی آرزو:

منتظم ایسے کہ محاذِ جنگ سے لمحے لمحے کی رپورٹیں لے کر راہنمائی کرتے اور ہر ایک گورنر کی رپورٹ لیتے۔ ایک دن سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ایک ساتھی نے آپ سے کہا: عمر (رضی اللہ عنہ)! اسلام لانے سے پہلے میں نے آپ سے پوچھا تھا کہ آپ کی سب سے بڑی آرزو کیا ہے تو آپ نے کہا تھا کہ میری سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ میرے پاس سو اونٹوں کا ریوڑ ہو جائے۔ میں ان کو چراؤں، اونٹنیوں کا دودھ پیوں، ان کی اون سے خیمے بناؤں اور آرام کی زندگی گزاروں، آج آپ مسلمانوں کے خلیفہ ہیں، امیر المؤمنین ہیں، آج آپ کی سب سے بڑی تمنا کیا ہے؟

---

[1] مناقب عمر لابن الجوزي (ص: ١٢٩) من الحكم (ص: ٣٦٧)

[2] الخليفة الفاروق للدكتور عبد الرحمن العاني (ص: ١٢٤)

ارشاد فرمایا: آج میری سب سے بڑی آرزو یہ ہے کہ کائنات کا کوئی حصہ ایسا باقی نہ رہے جہاں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا پرچم نہ لہرا رہا ہو۔ اور دنیا میں کوئی ایک ایسی جگہ باقی نہ رہے جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دین نہ پہنچ جائے۔ واقعی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسلام کی اشاعت میں ایسا کردار ادا کیا کہ اغیار بھی یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ ایک عمر (رضی اللہ عنہ) اور ہوتا تو آج پوری دنیا پر اسلام کا پھریرا لہرا رہا ہوتا۔ کتاب اللہ کا اس قدر ادب واحترام تھا کہ (کتاب اللہ کا حکم سن کر فوراً ٹھہر جانے والے ہونے) کی شہادتیں ملیں، سادگی اس قدر کہ بیرونی سفیر امیر المومنین ہی سے امیر المؤمنین کے متعلق پوچھ رہے ہوتے۔ محتسب ایسے کہ اپنا اور اولاد کا بھرپور محاسبہ کرتے۔ اور عقیدۂ توحید میں اس قدر پختہ کہ حجرِ اسود سے کہنے لگے کہ میں جانتا ہوں تو نفع ونقصان کا مالک نہیں۔ اگر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے تجھے بوسہ نہ دیا ہوتا تو میں تمھیں کبھی بوسہ نہ دیتا۔[1] حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ظاہری اور معنوی اتباع کا کتنا حسین نمونہ ہے۔

بیعتِ رضوان والے درخت کی کٹائی:

ابن سعد رحمہ اللہ صحیح سند سے روایت کرتے ہیں کہ نافع رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اطلاع ملی کہ کچھ لوگ بیعتِ رضوان والے درخت کے پاس آتے ہیں اور وہاں نماز پڑھتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پہلے تو ایسے لوگوں کو ڈانٹ پلائی اور پھر اس درخت کو جڑ سے کٹوا دیا۔[2]

عبادات کا اہتمام

حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کتاب اللہ اور سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حقیقت اچھی طرح سمجھ چکے تھے کہ ہمارا سارے کا سارا دین دراصل عبادت ہی عبادت ہے۔

نماز:

نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کو نماز کا حکم فرماتے اور جماعت سے پیچھے رہ جانے والوں کی سخت گوشمالی فرمایا کرتے تھے۔ جب حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو انھوں نے بھی نماز جیسی اہم عبادت کی طرف خصوصی توجہ فرمائی، نماز کی ترغیب دلائی اور تارکِ نماز کا تعاقب فرمایا۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٥٩٧)

[2] التاريخ الإسلامي (١٩، ٢٠/ ٢٦٠) الطبقات لابن سعد (٢/ ١٠٠)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ انتہائی خشوع وخضوع سے نماز ادا کرتے تھے۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز ادا کی۔ ان کے رونے کی آواز آرہی تھی جو تیسری صف میں بھی سنی جا سکتی تھی۔[1]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کا انتہائی ادب کرتے تھے۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''جب تم میں سے کسی کی بیوی مسجد جانے کی اجازت طلب کرے تو وہ اسے نہ روکے۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بیوی مسجد میں نماز ادا کرتی تھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تو جانتی ہے کہ میں کیا چاہتا ہوں؟ بیوی نے عرض کی: اللہ کی قسم! میں اس وقت تک مسجد جانے سے نہ رکوں گی تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم منع نہ کریں اور جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت کا واقعہ پیش آیا تو وہ اس وقت مسجد ہی میں تھیں۔[2]

یہ واقعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی امورِ شریعت کی قدر دانی اور کتاب وسنت پر عمل پیرا ہونے کی درخشندہ دلیل ہے۔ انھوں نے سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خاطر اپنی چاہت کو مغلوب کرلیا۔[3]

زکاۃ، حج اور روزے:

حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے ادائے فریضۂ زکاۃ کا نہایت توجہ سے اہتمام فرمایا۔ انھوں نے زکاۃ کی وصولی کے نظام کو منظم کیا۔ اِس کے نتیجے میں اسلامی ریاست کی آمدنی میں بڑا اضافہ ہوگیا۔ حج کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے پورے دورِ خلافت میں مسلسل ہر سال حج کرتے رہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ انھوں نے دس (۱۰) حج کیے۔ بعض روایات کے مطابق انھوں نے نو (۹) حج کیے۔[4]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حج کے خصوصی انتظامات پر خاص توجہ دی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ لوگوں کو اولاً حج کی ترغیب دیتے تھے۔ صحیح سند سے ثابت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیت اللہ کا غلاف ہر سال صدقہ کر کے لوگوں میں تقسیم کر دیتے تھے۔[5] روزے کے بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک طریقہ پر عمل پیرا رہتے۔

---

[1] حلية الأولياء (١/ ٢٥)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٢٣٨) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے علاوہ بقیہ حصہ کے لیے دیکھیں: فتح الباری (٢/ ٣٨٣: ٩٠٠ کے تحت)

[3] التاريخ الإسلامي (١٩،٢٠/ ٤٠)

[4] السلطة التنفيذيه (١/ ٣٨٢)

[4] الفتاوىٰ (١٣/ ١٤)

علاّمہ حافظ ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت قتادہ رحمہ اللہ نے فرمایا: حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ ہونے کے باوجود بے حد سادہ مزاج تھے۔ وہ اون کا لمبا کرتا پہنتے تھے۔ اس میں چمڑے کے پیوند لگے ہوتے تھے۔ وہ اپنا کوڑا کندھے پر رکھے بازاروں کی خبر گیری فرماتے تھے۔ جہاں بھی ضرورت ہوتی اس کے مطابق لوگوں کی اصلاح فرماتے تھے۔[1]

رات کے گشت کی صورت میں رعایا کی خبر گیری:

بلاشبہہ چوکیداری کا نظام محکمہ پولیس کی خشتِ اول ہے۔ بعض مؤرخین فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دور میں چوکیداری نظام کے نگران اعلیٰ تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ ذمہ داری خود سنبھالی۔ کبھی وہ اپنے ساتھ اپنے غلام حضرت اسلم رضی اللہ عنہ کو رکھتے اور کبھی حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کو!

درحقیقت چوکیداری کا مقصد چوروں، فسادیوں اور شر پھیلانے والوں کا تعاقب کرنا ہے۔ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ خود مسلمانوں کی نگہبانی فرماتے تھے۔ ان کے اس عمل نے اسلامی معاشرے کی تشکیل میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ اُن دنوں مدینہ طیبہ اسلامی ریاست کا دار الخلافہ ہونے کے ساتھ ساتھ فرزندانِ اسلام کا گہوارہ اور احکامِ ریاست جاری ہونے کا مرکز تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ رات کے وقت مدینہ طیبہ کے راستوں میں گشت فرمایا کرتے تھے تاکہ اپنے عمّال کی طرف سے کی جانے والی کوئی کوتاہی یا پوشیدہ رکھا گیا کوئی معاملہ خود دیکھ سکیں اور اس کا مداوا کرسکیں۔ انھوں نے بہت سے ایسے قواعد وضوابط وضع فرمائے جن کی ضرورت تھی اور بہت سے ایسے اصول وضوابط ختم کردیے جن کی کوئی ضرورت باقی نہ تھی۔

فوجیوں کی گھروں سے دور رہنے کی زیادہ سے زیادہ مدت:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ حسبِ معمول ایک رات چوکیداری کا فرض انجام دے رہے تھے کہ ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ وہ گشت کرتے کرتے مدینے کی ایک بستی سے گزرے۔ وہاں ایک مکان سے ایک عورت کی انتہائی درد انگیز صدا سنائی دی۔ وہ اشعار کی زبان میں کہہ رہی تھی:

''آج کی رات لمبی ہوگئی۔ ستارے گردش میں ہیں۔ میں جاگ رہی ہوں۔''

---

[1] تاریخ الإسلام في عهد الخلفاء الراشدين (ص: ٢٦٨)

اس واقعہ کی بعض دیگر تفصیلات بھی کتبِ حدیث میں وارد ہوئی ہیں۔[1]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ تجھ پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس خاتون کو ملبوسات اور کچھ خرچہ مرحمت فرمایا اور محاذِ جنگ کے سالار کو حکم بھیجا کہ اس کے شوہر کو فوراً واپس بھیج دیا جائے۔[2]

ایک روایت کے مطابق پھر وہ اپنی صاحبزادی حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے دروازے پر گئے۔ انھوں نے کہا: اے امیر المومنین! آپ اس وقت کیسے تشریف لائے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: پیاری بیٹی! یہ تو بتاؤ کہ عورت اپنے خاوند سے (دوری پر) کتنی مدت تک صبر کر سکتی ہے؟ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے جواب دیا: ایک، دو اور تین مہینے تک صبر کر سکتی ہے جب چوتھا مہینہ ختم ہو جائے تو اس کا صبر جواب دے جاتا ہے۔ یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حکم نامہ جاری فرمایا:

''چار (۴) مہینے سے زیادہ دیر تک کسی فوجی کو محاذِ جنگ پر نہ رکھا جائے۔''[3]

بعض روایات میں ۵ یا ۶ کا ذکر بھی آیا ہے۔[4] کسی بھی مجاہد کے اپنی بیوی سے دور رہنے کی یہ مدت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بصیرت وحکمت کی آئینہ دار ہے، لہٰذا اس حکم پر سب متفق ہو گئے۔[5]

امانت ودیانت کا ایسا معیاری نظام کہ قیصر وکسریٰ کے خزانے اتنا لمبا سفر کر کے مختلف ہاتھوں سے ہوتے ہوئے مدینہ منورہ آتے مگر ان میں سے معمولی سی چیز بھی آگے پیچھے نہ ہوتی۔ عجز وانکسار اور اللہ کے حضور پیشی کا ڈر ایسا کہ فرماتے: ''کاش! میں برابر برابر ہی چھوڑ دیا جاؤں۔'' امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ایسا اہتمام کہ آخری لمحات میں بھی اس سے غافل نہ ہوئے۔

کوفی مدرسہ:

کوفہ میں تین سو کے قریب اصحابِ شجرہ (بیعتِ رضوان والے) اور ستر (۷۰) کے قریب بدری

[1] دیکھیں: سنن سعيد بن منصور (٢/ ٢١٠) رقم الحديث (٢٤٦٣) تاريخ المدينه لعمر بن شبية (١/ ٤٠٣) مصنف عبد الرزاق (٧/ ١٥١۔ ١٥٢) رقم الحديث (١٢٥٩٣۔ ١٢٥٩٤) سنن الكبرىٰ للبيهقي (٩/ ٢٩) و المغنى لابن قدامه أيضاً (١٠/ ٢٤)

[2] مناقب أمير المومنين لابن الجوزي (ص: ٨٩)

[3] مناقب أمير المومنين لابن الجوزي (ص: ٨٩) أوليات الفاروق (ص: ٢٨٩)

[4] کتبِ حدیث مذکورہ سابقہ.

[5] أوليات الفاروق (ص: ٢٨٩)

صحابہ رضی اللہ عنہم تشریف لائے اور وہاں قیام فرمایا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اہلِ کوفہ کو لکھا: اے اہلِ کوفہ! تم عرب کی اصل اور چوٹی کی حیثیت رکھتے ہو۔ میں نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو تمھاری طرف بھیجا ہے اور تمھارے لیے پسند کیا ہے۔ انھیں اپنے ساتھ رکھنے کا خواہش مند تھا مگر میں نے اپنی ذات پر تمھیں ترجیح دی ہے۔[1]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کوفہ کو نمایاں اہمیت دی۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو کوفہ روانہ فرمایا اور انھیں لکھا: قرآنِ کریم قریش کے لہجے میں نازل ہوا ہے۔ آپ انھیں اسی لہجے میں پڑھائیں۔ قبیلۂ ہُذَیل کے لہجے میں نہ پڑھائیں۔[2]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ دین کی تعلیم عام کرنا اپنا سب سے اہم فرض سمجھتے تھے، اسی لیے وہ شہروں اور دیہات میں دینی مُعلم بڑی کثرت سے بھیجا کرتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں قائم ہونے والے مراکزِ تعلیم لوگوں کو تعلیم کے علاوہ فنی تربیت بھی دیتے تھے اور ان کی عادتیں سنوارنے میں نہایت اہم کردار ادا کرتے تھے، پھر جب محسوس کیا گیا کہ مسجد سے الگ بچوں کی تعلیم کے لیے علاحدہ تدریسی مراکز ہونے چاہییں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جداگانہ درسگاہیں تعمیر کروائیں اور بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے خصوصی اساتذہ مقرر فرمائے۔[3]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اشعار کو دل کی کشادگی اور انسان میں اچھے احساسات بیدار کرنے کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ وہ اچھے اشعار کی فضیلت اور نفع مندی کے بارے میں فرماتے تھے: انسان کا سب سے بہترین فن شعر کہنا ہے۔ اچھے اشعار کی بدولت انسان کسی اچھے آدمی کا دل موم اور برے کا دل حق کی طرف مائل کر لیتا ہے۔[4]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ بچوں کی تربیت کے سلسلے میں لوگوں کو توجہ دلایا کرتے تھے کہ انھیں شعر گوئی کا سلیقہ سکھاؤ۔ فرماتے تھے: اپنے بچوں کو تیراکی اور تیر اندازی سکھاؤ۔ انھیں حکم دو کہ چھلانگ لگا کر گھوڑے پر سوار ہونا سیکھیں اور انھیں بہترین معانی والے دانشمندانہ اشعار یاد کراؤ۔[5]

---

[1] مجمع الزوائد (۹/ ۲۹۱) تمام رجال سوائے حارثہ کے صحیح کے ہیں۔ حارثہ بھی ثقہ ہے۔
[2] فتح الباري (۸/ ٦٢٥) الخلافة الراشدة للدكتور يحيىٰ اليحيىٰ (ص: ۳۰۹)
[3] السلطة التنفيذيه (۲/ ۷٦۸)
[4] الأدب في الإسلام للدكتور نايف معروف (ص: ۱۷۱)
[5] الكامل في الأدب (۱/ ۲۲۷)

عربی زبان کی صحت وسلامتی:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ذوقِ سلیم کی بنیاد اعلیٰ فصاحت اور عربی زبان کی صحت وسلامتی پر تھی، وہ لفظی غلطیوں سے متنفّر تھے، اور ان سے دور بھاگتے تھے۔ جب کسی عبارت میں لفظی غلطی پاتے تو بیزار ہوجاتے تھے۔ اسے نہ صرف پرے رکھ دیتے تھے بلکہ اس کے قائل یا لکھنے والے کی بھی خوب خبر لیتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کلام میں تکلّفات اور گہرے مطالب پسند نہیں فرماتے تھے۔[1]

تعمیر وترقی اور عہدِ فاروقی میں رونما ہونے والے واقعات

① مسجدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی توسیع:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مسجدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں توسیع کرائی۔ انھوں نے حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ کا گھر مسجدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں شامل کردیا۔ مسجدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم دس (۱۰) ہاتھ قبلہ کی جانب، بیس (۲۰) ہاتھ مغربی جانب اور ستر (۷۰) ہاتھ شمالی جانب وسیع کردی گئی۔ ساری مسجد کی تعمیر دوبارہ اینٹوں اور کھجور کی ٹہنیوں سے کی گئی، لکڑی کے ستون لگائے گئے، چھتیں ٹہنیوں سے تیار کی گئیں اور اسے اوپر سے ڈھانپ دیا گیا تاکہ لوگ بارش سے محفوظ رہ سکیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مسجد کو سرخ یا زرد رنگ کرنے سے منع کردیا، مبادا نمازیوں کی توجہ میں خلل انداز ہو۔[2]

مسجد مٹی سے بنائی گئی۔ اور کنکریاں بچھا کر اس کا فرش تیار کیا گیا تاکہ یہ فرش نمازیوں کے لیے صاف ستھرا رہے اور چلنے والوں کو بھی سہولت رہے۔[3] حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حرمِ مکی میں بھی چند تبدیلیاں کیں۔ انھوں نے بیت اللہ کے ساتھ ملا ہوا مقامِ ابراہیم علیہ السلام دیوار سے ذرا دور ہٹا دیا اور وہاں نصب کرایا جہاں وہ آج کل موجود ہے، تاکہ طواف کرنے اور نماز پڑھنے والوں کو آسانی رہے، پھر اس پر ایک مضبوط اور محفوظ شیشہ نما گنبد بنا دیا۔[4]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں سرزمینِ عراق میں ایک نہر کھدوائی، اس کی لمبائی تین

---

[1] عمر بن الخطاب للدكتور محمد أبي النصر (ص: ۲٤۸ـ ۲٥۱)

[2] عصر الخلافة الراشدة (ص: ۲۲۷) فتح الباری (٤/ ۸۹)

[3] اخبار عمر (ص: ۱۲٦)

[4] عصر الخلافة الراشدة (ص: ۲۲۷) فتح الباری (۸/ ۱٦۹)

فرسخ (نومیل) تھی۔ یہ نہر (خور) سے بصرہ تک چلی گئی۔ اس سے دریائے دجلہ کا پانی بصرہ تک پہنچ گیا۔ نہروں کی کھدائی، خلیجوں کی بحالی، ڈیموں اور پُلوں کی تعمیر اور راستوں کی نگہداشت کے انتظامات، یہ وہ فلاحی اور ترقیاتی کارنامے ہیں جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ترجیحی بنیاد پر انجام دیے اور اسلامی ریاست کے بجٹ کا ایک بہت بڑا حصہ انہی فلاحی اور ترقیاتی کاموں پہ صرف ہوا۔[1]

② شہروں اور چھاؤنیوں کی تعمیر:

فوجی چھاؤنیوں کی طرز پر سرحدوں کی آبادی، نئے شہروں کی تعمیر اور ان شہروں کا ترقیاتی کام عہدِ فاروقی کا اہم کارنامہ ہے۔ عہدِ فاروقی میں مسلمانوں کی فتوحات بہت بڑھ گئیں، چنانچہ سرحدوں کے قریب بہت سے شہر بسائے گئے، باہمی رابطہ کے لیے راستے ہموار اور آسان بنائے گئے، وسیع پیمانے پر زمینیں زیرِ کاشت لائی گئیں، مسلمانوں کو جہادی مراکز اور جدید مفتوحہ علاقوں کی طرف ہجرت کرنے کی ترغیب دی گئی تاکہ ان علاقوں میں اسلام پھیلے اور وہاں موجود مجاہدین کو افرادی قوت اور سامانِ جنگ میسر آتا رہے۔[2]

سب سے اہم جو شہر بسائے گئے ان میں بصرہ، کوفہ، موصل، فسطاط، جزیرہ اور سرت قابلِ ذکر ہیں۔ یہ تمام شہر قبائل اور ان کے پرچموں کی بنیاد پر تمام فوج کے مابین تقسیم کیے گئے، پھر ان شہروں میں فلاحِ عامہ کی تمام سہولتیں فراہم کی گئیں۔ بازار بنائے گئے۔ مساجد تعمیر کی گئیں۔ مجاہدین کے گھوڑوں اور اونٹوں کے لیے چراگاہیں بھی مخصوص کی گئیں۔ حجاز اور جزیرۂ عرب کے دیگر علاقوں اور شہروں کے لوگوں کو اُن شہروں میں سکونت اختیار کرنے کی ترغیب دی گئی تاکہ یہ علاقے مستقل اور مضبوط فوجی مرکز بن جائیں۔ اور وہاں سے دشمنوں کی سرزمین میں پہنچنے کے لیے فوجوں کی تیاری کے سلسلے میں مدد حاصل ہو سکے اور اسلام کی دعوت کو دور دور تک پہنچا دیا جائے۔ اس کے لیے عرب سرزمین کی سرحدوں سے قریبی علاقوں کا انتخاب کیا تاکہ یہ شہر عرب اور عجم کے درمیان مضبوط قلعوں کی حیثیت اختیار کر جائیں اور دشمن ان مضبوط قلعوں کو عبور نہ کر سکے۔

شہر بساتے وقت آبادیوں کے لیے ایسی منصوبہ بندی بھی کی گئی جن میں فوجیوں کی قبائلی حیثیت پیشِ نظر رکھی گئی۔ ہر قبیلے کے گھر ایک دوسرے کے پڑوس میں بنائے گئے۔[3]

---

[1] عصر الخلافة الراشده (ص: ٢٣٠)

[2] اقتصاديات الحرب في الإسلام للدكتور غازى بن سالم (ص: ٢٤٥)

[3] تاريخ الدعوة الإسلامية للدكتور جميل المصرى (ص: ٣٣٣ ـ ٣٣٤) دراسة في تاريخ المدن العربية الإسلامية للدكتور عبد الجبار ناجى (ص: ١٨٣)

بصرہ اور کوفہ کی آباد کاری کے بعد ان دونوں شہروں نے بڑی شہرت حاصل کی۔ ساری ریاست میں خصوصاً فوجی مہارت اور علم و ادب میں برتری کے حوالے سے ان کا خوب چرچا ہوا۔ ایک دور ایسا آیا کہ دار الخلافہ ہی کوفہ میں منتقل ہو گیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اُس وقت جبکہ امتِ اسلامیہ کی طاقت ان شہروں میں منتقل ہو چکی تھی، کوفہ کو دار الخلافہ منتخب فرمایا۔[1]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ لوگوں کو خیموں میں رہنے کی ترغیب دیتے تھے کیونکہ رہایش کا یہ اندازِ مجاہدانہ بروقت اقدام کے لیے موزوں اور دشمن پر رعب طاری کرنے کے لیے بہت مناسب تھا مگر وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ لوگوں نے وہاں پکی اینٹ سے عمارتیں بنا لیں۔[2]

③ دنیاوی خوشحالی میں مگن ہونے کا ڈر:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس امر سے بڑے خائف رہتے تھے مبادا مسلمان دنیاوی خوشحالی میں مگن ہو جائیں کیونکہ وہ دنیا میں رغبت کو دنیا اور آخرت دونوں کے لیے نہایت نقصان دہ سمجھتے تھے۔ جب اہلِ کوفہ اپنے شہر میں آباد ہو گئے اور اہلِ کوفہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اینٹوں سے عمارتیں بنانے کی اجازت مانگی تو اہلِ بصرہ نے بھی ایسی ہی اجازت طلب کی۔ اُس موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اینٹ کے مکان بنانے کی اجازت دے دی اور فرمایا: تم میں سے کوئی بھی تین (۳) سے زیادہ کمروں پر مشتمل گھر تعمیر نہ کرے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ بھی طے کیا کہ عمارتوں کو میانہ روی سے زیادہ اونچا نہ کیا جائے۔ لوگوں نے پوچھا کہ میانہ روی کیا چیز ہے؟ تو انھوں نے فرمایا: جس میں نہ فضول خرچی ہو اور نہ تم حدِ اعتدال سے باہر نکلو۔[3] ہمارے آج کے زمانے میں عمرِ عزیز کے بہت سے سال عمارتیں بنانے ہی میں صرف ہو جاتے ہیں۔ بسا اوقات تو اس کام میں اتنی وسعت آجاتی ہے کہ آدمی اپنا بہت سا قیمتی مال عمارت کو بہتر بنانے ہی میں صرف کر دیتا ہے۔ اپنی عمارات کو جمال و کمال کا اعلیٰ نمونہ دیکھنے ہی کی فکر میں رہتے ہیں تاکہ وہ اپنے اعلیٰ معیارِ زندگی کا فخریہ مظاہرہ کر سکیں۔

④ فضول خرچی اور بخل سے بچنے کی نصیحت:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اہلِ بصرہ کو تاکید فرمائی تھی کہ تم فضول خرچی کے قریب مت جانا اور حدِ اعتدال

[1] تاريخ الدعوة الإسلامية (ص: ٣٣٨)
[2] الخلفاء الراشدون (ص: ١٨٢)
[3] تاريخ الطبري (٥/ ١٦)

سے تجاوز نہ کرنا۔ ان کے ارشاد سے واضح ہوتا ہے کہ شرعی عمارت وہ ہے جس کا بنانے والا فضول خرچ نہ ہو، یعنی وہ شرعی حد سے تجاوز نہ کرے اور اعتدال کی حد سے باہر نہ نکلے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی دنیا سے بے رغبتی کی ایک مثال یہ بھی ہے کہ ان کے عہدِ مبارک میں باوجودیکہ تمام مسلمان زاہدانہ زندگی بسر کرتے تھے، پھر بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی دور اندیش نظریں مستقبل پر پڑ رہی تھیں۔ وہ چاہتے تھے کہ امتِ مسلمہ کی آنے والی نسلیں بھی سادگی اور تقوے کی زندگی بسر کریں اور دنیاوی زینت کے دھوکے میں آکر ہلاک نہ ہوں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے دَور میں حاصل ہونے والی فتوحات کے نتیجے میں، جبکہ ایران اور روم کے کچھ علاقے فتح ہو چکے تھے۔ ان سے حاصل ہونے والے اموالِ غنیمت اور اموالِ فَے کی کثرت سے بھی خائف تھے مبادا دولت کی کثرت سے مسلمان لوگ دنیاوی عیش وعشرت میں مبتلا ہو جائیں۔ انھوں نے اس سلسلے میں ایک بلیغ خطبہ ارشاد فرمایا۔ اس میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا اور مسلمانوں کو بہتر رویہ اپنانے کی رغبت دلائی۔

عہدِ فاروقی میں رونما ہونے والے سانحات

① قحط سالی اور اقتصادی بحران:

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے دورِ حکومت میں اسلامی مملکت ایک بہت بڑی آفت سے دوچار ہوگئی۔ دنیا کی تمام قوموں، ملکوں اور معاشروں میں اس قسم کی قدرتی آفات عموماً آتی رہتی ہیں۔ اس کائنات میں اللہ تعالیٰ کے جاری کردہ قوانین سب کے لیے یکساں ہیں۔ ان میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں سب سے بڑی آفتیں عامُ الرمادہ، یعنی ''خاک اڑنے کا سال'' اور ''طاعونِ عمواس'' تھیں۔

اٹھارہ (۱۸) ہجری میں جزیرۂ عرب میں سخت قحط سالی برپا ہوئی۔ اس قدر بھوک اور فاقہ کشی پھیل گئی کہ جنگلوں کے درندوں تک نے شہروں کا رخ کر لیا۔ آدمی بکری ذبح کرتا مگر اس کی بگڑی ہوئی سوکھی سڑی شکل دیکھنے سے جی چراتا۔ بہت سے جانور بھوک سے مرگئے۔ اس سال کو ''عامُ الرمادہ'' یعنی خاک

[1] التاریخ الإسلامي (۱۹/ ۲۰، ۲۳)

اڑنے کا سال قرار دیا گیا کیوں کہ قحط سالی کی وجہ سے ہواؤں کے جھکّڑ گرد اڑا رہے تھے۔ قحط سنگین شکل اختیار کر گیا۔ ایک ایک لقمہ بھی نہایت گراں قیمت ہوگیا۔ لوگ اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ دور دراز دیہات سے لوگ بھاگ کر شہروں میں آئے اور شہروں والے مضافات کی طرف نکل گئے۔ بہت سے لوگ امیر المومنین کی خدمت میں آئے۔ وہ اس آفت کا حل تلاش کرنا چاہتے تھے۔ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ خود اس سلسلے میں سب سے زیادہ حسّاس اور اس آفت کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مسائل کے بارے میں سخت تناؤ کا شکار تھے۔[1]

② بُحران میں خلیفۂ وقت کا مثالی کردار:

عامُ الرمادہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں گھی اور روٹی کا چُورا بنا کر لایا گیا۔ انھوں نے ایک بدوی کو بھی اپنے ساتھ کھانے کی دعوت دی۔ بدوی روٹی کے ساتھ پیالے کے کناروں سے چکنائی حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: شاید تو نے عرصۂ دراز سے چکنائی نہیں چکھی۔ اُس نے کہا: جی ہاں! ہم نے مُدت سے گھی اور تیل نہیں دیکھا۔ نہ کسی کو گھی اور تیل کھاتے دیکھا ہے، یہ سُن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قسم کھائی کہ جب تک سب لوگ خوشحال نہ ہو جائیں گے، میں گوشت اور گھی نہیں کھاؤں گا۔ سب راوی اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی قسم پوری کر دکھائی۔

غور فرمایئے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس روشن جملے میں کتنا بڑا سبق چمک رہا ہے۔ انھوں نے عام لوگوں کی حالت کا صحیح صحیح اندازہ لگانے کے لیے جو کچھ فرما دیا ہے وہ حالاتِ عامہ کے انعکاس کا بڑا جامع اصول ہے جس سے ساری دنیا کے دانشور ہمیشہ مستفید ہوتے رہیں گے۔[2]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اُس آفت سے اس قدر متاثر ہوئے کہ ان کا رنگ ہی بدل گیا۔ حضرت عیاض بن خلیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں نے عامُ الرمادہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دیکھا ان کا رنگ سیاہ پڑ گیا تھا، حالانکہ وہ عربی النسل تھے، دودھ پیتے اور گھی کھاتے تھے مگر جب لوگ قحط میں مبتلا ہوئے تو انھوں نے گھی اور دودھ خود پر منع کر لیا۔ وہ مسلسل زیتون کا تیل کھاتے رہے اور بھوک برداشت کرتے رہے، اس طرح ان کی صحت بُری طرح متاثر ہوئی۔[3]

---

[1] فن الحکم (ص: ٦٨) البدایة والنهایة (٧/ ٨٩) تاریخ الطبری (٥/ ٧٥)

[2] فن الحکم (ص: ١٧)

[3] الطبقات (٣/ ٣١٤)

حضرت اسلم رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: اگر اللہ تعالیٰ اس آفت کو دُور نہ فرماتا تو ممکن تھا حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسلمانوں کے دکھ کی تاب نہ لاکر ہلاک ہوجاتے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کثرت سے روزے رکھتے تھے۔ یہ تھے فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ جنھوں نے اسلامی حکمرانی کی بے نظیر مثال قائم فرمادی۔

عامُ الرمادہ میں ایک دن انھوں نے اپنے کسی بچے کے ہاتھ میں تربوز دیکھ لیا۔ فوراً فرمایا: تجھ پر تعجب ہے اے امیر المومنین کے بیٹے! تو پھل کھا رہا ہے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت تنگی کا شکار ہے! بچہ روپڑا اور وہاں سے بھاگ گیا مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ چین سے نہ بیٹھے۔ وہ تحقیق فرماتے رہے کہ بچے کے پاس تربوز کہاں سے آیا؟ بالآخر انھیں اس وقت قرار آیا جب یہ پتا چلا کہ بچے نے یہ تربوز ایک مٹھی گٹھلیوں کے بدلے خریدا ہے۔[1]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونے کا زبردست احساس تھا۔ اِس احساس نے انھیں چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ انھوں نے قحط سالی اور بھوک وافلاس دور کرنے کے لیے دینی اور دنیاوی دونوں طریقے اختیار فرمائے۔ وہ ہمیشہ نماز پڑھنے والے، استغفار کرنے والے اور ہر دم مسلمانوں کی روزی روٹی کی فکر میں لگے رہنے والے مردِ مجاہد تھے۔ وہ آفت کے دنوں میں ہر دم رعایا کی فکر میں لگے رہے۔ جو لوگ مدینہ آئے یا دیہات ہی میں مقیم رہے انھیں ان سب کی فکر دامن گیر رہتی تھی۔ وہ عوام کے ساتھ ساتھ رہے اور انہی کی طرح ہر مشقت جھیلتے رہے۔[2]

③ رمادہ کے سال میں پناہ گزینوں کے ہجوم:

حضرت اسلم رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ جب عامُ الرمادہ، یعنی قحط سالی کا زمانہ تھا تو جزیرۂ عرب کے ہر کونے سے لوگوں نے مدینہ کا رخ کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ہنگامی بنیادوں پر کام کیا۔ بہت سے لوگوں پر مشتمل عملہ ان کی خبر گیری کے لیے مقرر کردیا۔ میں نے ایک دن انھیں فرماتے ہوئے سنا: ان لوگوں کی گنتی کرو جو آج شام یہاں کھانا کھائیں گے۔ معلوم ہوا کہ ان کی تعداد ۷ ہزار ہے، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیمار اور مجبور لوگوں کی فہرست تیار کرائی تو ان کی تعداد ۴۰ ہزار نکلی جو بعد ازاں ۶۰ ہزار تک پہنچ گئی۔ یہ نظام اسی طرح چلتا رہا حتیٰ کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے بارش نازل فرمائی، پھر میں نے دیکھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بہت

[1] الطبقات (۳/ ۳۱۵) محض الصواب (۱/ ۳۶۲)

[2] فن الحکم (ص: ۱۷) الطبقات (۳/ ۳۱۵)

سے لوگوں کو نواحی قصبات و دیہات میں جانے اور وہاں کے باشندوں کو غذائی ضروریات کا سامان فراہم کرنے کا حکم دیا۔ قصبات و دیہات میں اتنی کثرت سے ہلاکتیں ہوئی تھیں کہ تقریباً دو تہائی افراد لقمۂ اجل بن گئے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مامور کردہ لوگ فجر دم ہی لنگر پکانا شروع کر دیتے تھے۔ وہ گاڑھے دودھ کا گھی اور آٹے کا پکوان تیار کرتے اور لوگوں کو کھلاتے تھے۔ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے کام کرنے والے کارکنوں کی ڈیوٹیاں لگا رکھی تھیں۔ انھوں نے پناہ گزینوں کے لیے ایک مستقل جداگانہ شعبہ قائم کر دیا تھا۔ ہر عامل اپنی ڈیوٹی سے باخبر تھا۔ اپنی ڈیوٹی میں کوئی کسی قسم کی کوتاہی نہیں کرتا تھا، نہ کسی دوسرے کے کام میں دخل دیتا تھا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بہت سے ایسے کارکن بھی تعینات کیے جنھیں مدینے کے اردگرد سے آنے والے قحط زدہ لوگوں کا جائزہ لینے کا حکم تھا۔ خوراک کی تلاش میں مدینہ پہنچنے والے لوگوں کی فوری خبر گیری کی جاتی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ لوگوں میں تقسیم ہونے ولے کھانے کی خود نگرانی فرماتے تھے حتیٰ کہ سالن بھی چکھ کر جانچتے تھے۔ شام کے وقت سب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سب کی دن بھر کی کارروائی تفصیل سے سنتے اور اس دوران حسبِ ضرورت مزید احکام و ہدایات بھی جاری فرماتے۔ [1]

مصر، شام اور عراق سے مدد آنے تک حضرت عمر رضی اللہ عنہ قحط زدہ لوگوں کو آٹے کے سرکاری گوداموں سے کھانا کھلاتے رہے۔ غذائی گودام بہت بڑے اقتصادی ادارے کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان گوداموں سے مدینہ آنے والوں کو آٹا، ستو، کھجور اور منقّیٰ تقسیم کیے جاتے تھے۔ یہ ادارہ اتنا وسیع تھا کہ نو مہینے تک مسلسل ہزاروں لوگوں کو خوراک فراہم کرتا رہا یہاں تک کہ بارش ہوئی اور قحط سالی ختم ہوگئی۔ [2]

غذائی کفالت کا یہ نظام حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زبردست ذہانت کا آئینہ دار ہے کہ انھوں نے اسلامی ریاست میں جہاں بہت سے ادارے بنائے وہاں خاص طور پر خوراک کے بڑے بڑے گودام بھی تعمیر کرائے جو قحط سالی میں کام آئے۔ غرض حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسلسل ایسے لوگوں کی خدمت اور خبر گیری میں مصروف رہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ لوگوں کو عشاء کی نماز پڑھاتے، پھر گھر تشریف لے جاتے اور مسلسل نماز میں

---

[1] الكفاءة الإداريه للدكتور عبد الله قادری (ص: ۱۰۷ ـ ۱۱۵)

[2] المدينة النبوية فجر الإسلام (۲/ ۳۷ ـ ۳۸)

مصروف رہتے۔ جب رات کا آخری حصہ شروع ہو جاتا تو پہاڑی راستوں کی طرف نکل جاتے اور (لوگوں کی ممکنہ آمد کے پیشِ نظر) وہاں چکر لگاتے رہتے تھے۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: میں نے ایک دفعہ سحری کے وقت سنا، وہ کہہ رہے تھے:

''اے اللہ! امتِ محمد ﷺ کی ہلاکت میرے ہاتھوں نہ کر۔ اے اللہ! ہمیں قحط سالی سے ہلاک نہ کر۔ اے ربِ کریم! ہماری اس آفت کو دور فرما دے ......'' وہ مسلسل یہی دعا کرتے رہے۔''

دیگر شہروں سے مدد کا حصول:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قحط سالی کی وباء پر قابو پانے کے لیے نہایت تیزی سے ہنگامی اقدامات کیے۔ انھوں نے ان شہروں سے فوراً غذائی امداد طلب کی جو قحط کی زد سے محفوظ اور خوش حال تھے۔ انھوں نے حضرت عَمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو، جو اُس وقت مصر کے گورنر تھے، لکھا:

اللہ کے بندے عمر بن خطاب (رضی اللہ عنہ) امیر المومنین کی طرف سے (حضرت) عَمرو بن عاص (رضی اللہ عنہ) کی طرف: ''تجھ پر سلامتی ہو، اما بعد: کیا تم مجھے اور میرے ساتھ دیگر افرادِ امت کو ہلاکت میں اور خود اپنے آپ کو اور اپنے ہاں کے باشندوں کو خوشحال دیکھنا چاہتے ہو؟ جلد از جلد کمک بھیجو۔''

چنانچہ حضرت عَمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے ایک ہزار اونٹوں پر آٹا لاد کر بری راستے سے روانہ کیا۔ اس کے علاوہ بحری بیڑے بھیجے جن پر آٹا اور گھی لدا ہوا تھا۔ مزید برآں پانچ ہزار چادریں بھی ارسال فرمائیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شام کے علاقے میں بھی اپنے ہر عامل کو حکم دیا کہ ہماری طرف اتنا غلہ ارسال کرو جو یہاں ہمارے لیے کافی ہو۔ بلاشبہ ہمارے ہاں قحط زدہ لوگ ....سوائے اس کے جس پر اللہ اپنی رحمت فرمائے ....موت کی آغوش میں جا سکتے ہیں۔

اسی طرح کے احکام عراق اور ایران کے گورنروں کے نام بھی ارسال فرمائے جن کی تعمیل میں سب نے غلہ بھیج دیا۔ حضرت معاویہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہما نے غلے سے لدا ہوا تین ہزار اونٹوں کا قافلہ ارسال فرمایا۔ عراق سے بھی ایک ہزار اونٹوں کا قافلہ پہنچا جس پر آٹا لدا ہو تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ ساری خوراک اہلِ مدینہ اور آنے والے پناہ گزینوں میں تقسیم فرمائی اور اس میں سے بادیہ نشینوں کا حصہ بھی نکالا، پھر عرب کے سارے علاقوں میں غذائی اجناس تقسیم کر دیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اعلان کرا دیا کہ اگر اللہ نہ کرے یہ قحط سالی ختم نہ ہوئی تو ہم ہر گھرانے کے

ساتھ ضرورت مند افراد کا اضافہ کریں گے اور حسبِ استطاعت ان سب کی خوراک کا انتظام کریں گے لیکن اگر فراہمیِ خوراک میں دشواری پیش آئی تو ہم اُس گھرانے کے ساتھ، جس کے پاس کھانے کو کچھ ہے، ان لوگوں کو متصل کر دیں گے جو غذا سے یکسر محروم ہیں۔ یہ انتظام اس وقت تک برقرار رہے گا جب تک اللہ تعالیٰ ہمیں بارانِ رحمت سے نہ نوازے۔[1]

بارش طلبی اور نمازِ استسقاء:

سلیمان بن یسار رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں: عامُ الرمادہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ خطبہ ارشاد فرمایا: اے لوگو! تم اپنے بارے میں اللہ سے ڈرو اور جو تمھارے پوشیدہ اعمال ہیں ان کی جانچ پڑ تال کرو۔ تم میرے ذریعے سے اور میں تمھارے ذریعے سے آزمائش میں ہوں۔

معلوم نہیں کہ ربِ ذوالجلال کی ناراضگی میری وجہ سے ہوئی یا تمھاری وجہ سے یا ہمارا پروردگار ہم سبھی سے ناراض ہے؟ آؤ ہم سب اپنے اللہ تعالیٰ کے آگے ہاتھ پھیلائیں کہ وہ ہمارے دلوں کی اصلاح فرمائے، ہم پر رحمت فرمائے اور قحط سالی کا خاتمہ فرمادے۔ اُس دن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بلند ہاتھوں سے دعا کرتے ہوئے زار و قطار روتے دیکھا گیا۔ لوگوں نے بھی خوب رو رو کر دعائیں کیں، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ منبر سے نیچے اُتر آئے۔[2]

حضرت اسلم رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ سب نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ فرماتے سنا:

> ''اے لوگو! میرا خیال ہے کہ ہمارا مالکِ حقیقی ہم سب سے روٹھ گیا ہے، پس گناہوں سے باز آجاؤ۔ اپنے رب کے سامنے اپنی صفائی پیش کرو، توبہ کرو اور اچھے اعمال انجام دو۔''[3]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب ایک اور مرتبہ دعائے استسقاء کے لیے نکلے تو انھوں نے اپنے شانوں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چادرِ مبارک آویزاں کر رکھی تھی۔ وہ عید گاہ پہنچے، لوگوں کو خطبہ دیا اور اللہ تعالیٰ کے حضور بہت آہ وزاری کی۔ عورتوں نے بھی خوب خشوع وخضوع سے دعائیں کیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کثرت سے استغفار کرتے رہے۔ واپس آنے لگے تو اپنے ہاتھ بلند فرمائے۔ چادر کے پلو تبدیل کیے۔ دائیں حصے کو بائیں

---

[1] الفاروق عمر (ص: ١١٥، ٢٦٢، ٢٦٣)

[2] الطبقات (٣/ ٣٢٢) والشیخان من روایه البلاذری (ص: ٢٣٢)

[3] الطبقات (٣/ ٣٢٢) واخبار عمر (ص: ١١٦)

طرف اور بائیں حصے کو دائیں طرف کر لیا، پھر ہاتھ پھیلائے۔ بہت روئے، خوب آہ وزاری سے دعائیں کیں، پھر اس قدر روئے کہ داڑھی مبارک آنسوؤں سے بھیگ گئی۔[1]

صحیح بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے بارش کے لیے دعا کرائی اور اللہ تعالیٰ کے حضور عرض کی:

''اے اللہ! ہم پہلے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے تجھ سے بارش کے طلبگار ہوتے تھے اور تُو ہمیں بارش عطا فرماتا تھا۔ اب ہم اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا کے ذریعے سے تجھ سے بارش کے خواستگار ہیں۔ یا اللہ! بارش عطا فرما۔''[2]

ایک روایت میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب استسقاء کا ارادہ کیا تو اس طرح عرض کی: اے اللہ! میں اِس آفت کے مقابلے سے عاجز آ گیا ہوں۔ جو کچھ تیرے پاس ہے وہ بہت وسیع ہے، پھر حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑا اور فرمایا: اے اللہ! ہم تیرے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے دیگر بڑے عزیزوں کے ذریعے سے تیرا قرب چاہتے ہیں۔

اس موقع پر حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ وہ فرما رہے تھے: اے اللہ! بے شک جو آفت بھی آتی ہے، وہ گناہوں کی وجہ ہی سے آتی ہے اور جو مصیبت بھی ٹلتی ہے وہ توبہ کی بدولت ٹلتی ہے۔ اے ربِ کریم! مجھے امتِ مسلمہ کے لوگ تیرے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ہونے کی نسبت سے یہاں لے آئے ہیں۔ یہ ہمارے گناہگار ہاتھ تیرے سامنے پھیلے ہوئے ہیں اور ہماری پیشانیاں توبہ کے لیے جھکی ہوئی ہیں۔ ہمیں بارش عطا فرما۔ اے ارحم الراحمین! ہمیں مایوس نہ کر۔ اے اللہ! تو نگہبان ہے۔ تو کسی گمراہ کی طرف سے بھی بے توجہ نہیں ہوتا۔ تو اس دنیا کے عارضی گھر میں بے کس کو اکیلا نہیں چھوڑتا۔ اب حالت یہ ہے کہ بچہ بھی بلبلا رہا ہے، بڑا بھی گھبرا رہا ہے اور ہر طرف سے یہ شور بلند ہو رہا ہے۔ تو ہمارے ظاہر اور باطن کو خوب جانتا ہے۔ اے اللہ! اس سے پہلے کہ لوگ مایوس ہو جائیں اور ہلاک ہو جائیں، انھیں بارش عطا فرما۔ تیری رحمت سے کافر قوم کے علاوہ کوئی ناامید نہیں ہوتا۔[3]

---

[1] الطبقات (۳/ ۳۲۰ ـ ۳۲۱) تاريخ المدينة المنورة لابن شبه (۲/ ۲۴۷)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (۱۰۱۰)

[3] الفاروق عمربن خطاب لمحمد رشيد رضا (ص: ۲۱۷)

اسی دوران جب کہ ابھی دعا جاری تھی، بادل کا ایک ٹکڑا ظاہر ہوا۔ لوگوں نے ایک دوسرے سے کہنا شروع کر دیا: ارے! کیا تم آسمان کا منظر دیکھ رہے ہو؟ پھر ہر طرف سے بادل امنڈ آئے۔ وہ آپس میں مل گئے۔ ہوا چلی اور تھم گئی اور پھر ایسی موسلا دھار بارش ہوئی کہ اللہ کی قسم! ابھی دعا ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ لوگوں نے بھیگ جانے کے خوف سے اپنے تہبند اونچے کر لیے اور دیواروں کی آڑ لینے لگے۔ لوگوں نے بے ساختہ فرطِ مسرّت سے کہا:

«هَنِيئًا لَّكَ يَا سَاقِيَ الْحَرَمَيْنِ»

''اے عباس (رضی اللہ عنہ)! اے حرمین شریفین کے لوگوں کو پانی پلانے والے! تجھے مبارک ہو!۔''

''وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے والد کی جگہ تھے۔'' ''اللہ تعالیٰ نے ان کی برکت سے تمام شہروں کو زندہ کر دیا، ناامیدی کے بعد تمام شہروں میں ہر طرف ہریالی پھیل گئی۔''[1]

طاعون عمواس:

ہجرت کے اٹھارھویں سال عمواس میں طاعون پھوٹ پڑا۔ یہ بڑی خوفناک وباء تھی۔ تاریخ اسے ''طاعون عمواس'' کے نام سے یاد کرتی ہے۔ اُس وقت کو عمواس کے نام سے اس لیے موسوم کیا جاتا ہے کہ عمواس قدس اور رملہ کے درمیان واقع ایک بستی کا نام ہے۔ وہاں سے یہ وباء پھوٹی اور پھر شام کے تمام علاقوں میں پھیل گئی۔[2]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حجاز اور شام کی سرحد سے واپسی:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ۱۷ ہجری میں دوسری مرتبہ شام کے علاقوں کا دَورہ کرنے کی غرض سے سفر شروع کیا، بہت سے مہاجرین اور انصار آپ کے ہمراہ تھے۔ جب وہ حجاز اور شام کی سرحد ''سرغ'' میں پہنچے تو فوجی کمانڈروں نے انھیں اطلاع دی کہ شام کے علاقے میں طاعون پھیلا ہوا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے احباب سے مشورہ فرمایا اور فیصلہ ہوا کہ واپس مدینہ کا رخ کیا جائے۔[3]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے واپس آنے کے بعد ''طاعون عمواس'' کا سخت تباہ کن حملہ ہوا جو شام کے علاقوں

[1] الفاروق عمر بن خطاب (ص: ٢١٧)
[2] تاريخ القضاعي (ص: ٢٩٤) خلاصة تاريخ ابن كثير لمحمد كنعان (ص: ٢٣٦)
[3] الخلفاء الراشدون للنجار (ص: ٢٢٢۔ ٢٢٣)

تک پھیل گیا۔ بہت سے لوگ لقمۂ اجل بن گئے۔ جن میں حضرت ابوعبیدہ بن جراح، معاذ بن جبل، یزید بن ابی سفیان اور حارث بن ہشام رضی اللہ عنہم جیسے جلیل القدر اصحاب بھی شامل تھے۔

طاعون کی وجہ سے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی وفات:

طاعون پوری شدّت سے پھیل گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوعبیدہ بن جرّاح رضی اللہ عنہ کو اُس آفت سے بچانے کی کوشش کی۔ انھوں نے لکھا: اے ابوعبیدہ (رضی اللہ عنہ)! تم پر سلامتی ہو، اما بعد: تمھیں ایک ایسی مصیبت نے آن گھیرا ہے کہ میں بھی آپ کے قریب ہوں، میں تم پر لازم کرتا ہوں کہ جیسے ہی میرا یہ خط ملے، اپنے ہاتھ سے اُس وقت تک جدا نہ کرو جب تک فوراً میرے پاس نہ پہنچ جاؤ۔ انھوں نے جواب لکھا: اے امیر المومنین! مجھے اِدھر مجاہدین کی سپاہ میں رہنے دیجیے۔

جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کا یہ مراسلہ پڑھا تو رو پڑے۔ لوگوں نے پوچھا: اے امیر المومنین! کیا حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ انتقال کر گئے ہیں؟ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: گویا انتقال ہی کر گئے ہیں، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انھیں لکھا کہ آپ نے لوگوں کو ایک نشیبی زمین میں ٹھہرا رکھا ہے۔ انھیں کسی اونچی جگہ لے جائیں۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوموسی رضی اللہ عنہ کو بلایا اور فرمایا: اے (حضرت) ابو موسیٰ (رضی اللہ عنہ)! آپ امیر المومنین کا خط دیکھ رہے ہیں۔ آپ جائیں، لوگوں کے لیے کوئی بلند جگہ تلاش کریں تاکہ میں لوگوں کو لیے آپ کے پیچھے آسکوں۔ حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ اپنے گھر تشریف لے گئے۔ وہاں دیکھا کہ ان کی بیوی طاعون میں مبتلا ہوگئی ہیں۔ وہ دوبارہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور انھیں اپنی بیوی کے بارے میں اطلاع دی۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے اپنا اونٹ منگوایا۔ انھوں نے اونٹ کی رکاب میں اپنا پاؤں رکھا ہی تھا کہ بیماری کا حملہ ہوگیا۔ فرمایا: اللہ کی قسم! مجھے بھی طاعون نے آلیا ہے۔[1]

جب حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ طاعون میں مبتلا ہوئے تو انھوں نے مسلمانوں کو بلایا اور فرمایا: میں تمھیں ایک وصیت کرنا چاہتا ہوں، اگر تم اسے قبول کر لو تو زندگی اور موت کے بعد یکساں خیر اور بھلائی سے رہو گے۔ نماز قائم کرو، زکاۃ ادا کرو، روزہ رکھو، صدقہ و خیرات کرو، حج کرو، عمرہ کرو، صلہ رحمی کرو، آپس میں محبت کرو، اپنے حاکموں کے وفادار رہو اور ان کی خیانت نہ کرو۔ دیکھو! تمھیں دنیا غافل نہ کر دے۔ اگر کسی کو ایک ہزار سال کی زندگی بھی مل جائے تو آخر کار سبھی موت کی آغوش میں جانے والے ہیں۔ پھر حضرت

[1] تاریخ الطبري (٥/ ٣٥)

معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

اے معاذ (رضی اللہ عنہ)! لوگوں کو نماز پڑھاؤ۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے لوگوں کی امامت فرمائی۔ اسی دوران میں حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ انتقال کر گئے۔ اللہ تعالیٰ انھیں اپنی رحمتوں اور رضا سے سرخرو فرمائے۔ آمین.

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو لکھا:

اما بعد: میں نے آپ کی خدمت میں یہ خط آپ کی آگاہی کے لیے لکھا ہے۔ یہاں یہ حالت ہے کہ ہر طرف موت پھیلی ہوئی ہے۔ یہ وباء عام ہوتی جارہی ہے۔ ہر شخص کی موت اس تک پہنچ رہی ہے۔ جو ابھی تک نہیں مرا، وہ عنقریب مر جائے گا۔ جو کچھ اللہ تعالیٰ کے پاس ہے، وہ ہر مرنے والے کے لیے دنیا سے بہتر بنائے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں زندہ رکھے یا ہلاک کردے ہم بہر حال اس کے کرم کے ملتجی ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو تمام اہلِ اسلام کی طرف سے بہتر سے بہتر جزاء عطا فرمائے۔ ہم آپ کے لیے اللہ تعالیٰ کی مغفرت و رضا مندی اور جنت کی دُعا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ پر سلامتی، رحمت اور برکات نازل فرمائے۔

یہ خط حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو موصول ہوا تو وہ بہت روئے اور اپنے پاس بیٹھے ہوئے سب لوگوں کو حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کی وفات کی خبر سنائی۔ اگر چہ سب لوگ اللہ تعالیٰ کی قضاء وقدر پر راضی تھے۔ اس کے باوجود وہ بے حد غمگین ہوئے اور زار وقطار روتے رہے۔[1]

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی وفات:

حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی وفات حسرت آیات کے بعد حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے کچھ دن لوگوں کی امامت فرمائی۔ طاعون شدّت اختیار کرنے لگا۔ لوگ کثرت سے مرنے لگے۔ پھر ان کا بیٹا عبد الرحمٰن رضی اللہ عنہ بھی اس مرض میں مبتلا ہو گیا اور والد سے بھی پہلے وفات پا گیا۔[2] اور پھر حضرت معاذ رضی اللہ عنہ رحلت فرما گئے۔ اُس وقت ان کی عمر ۳۸ سال تھی۔[3]

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت عَمرو بن عاص رضی اللہ عنہ والی بنے۔ انھوں نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی نمازِ جنازہ پڑھائی۔ حضرت عَمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو لکھا: آپ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے سلامتی نازل ہو، اما بعد: (حضرت) معاذ بن جبل (رضی اللہ عنہ) انتقال کر گئے ہیں۔

---

[1] الاكتفاء (ص: ۳۰٤، ۳۰۹، ۳۱۰)

[2] تاريخ الطبري (٥/ ٣٦)

[3] حلية الأولياء (١/ ٢٢٨_ ٢٤٤)

جب یہ خط حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو موصول ہوا تو حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی موت کی خبر پا کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نہایت افسردہ اور دلگیر ہو گئے۔ کیونکہ حضرت معاذ اور حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہما دونوں کی اموات یکے بعد دیگرے واقع ہوئی تھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور تمام لوگ اس المناک خبر پر ہچکیاں لے لے کر روئے اور انتہائی غم زدہ ہو گئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ پر رحمت فرمائے، اللہ کی قسم! ان کی موت کی وجہ سے اِس امت کی صفوں سے علم کا بہت بڑا خزانہ اٹھ گیا ہے۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے بہت سے بے لاگ اور صائب مشوروں سے ہم بہت مستفید ہوئے اور بڑی خیر و برکت پائی، حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے ہمیں بڑا علم دیا اور بہت سی بھلائیوں کی طرف رہبری فرمائی۔ اللہ تعالیٰ انھیں نیک لوگوں والی جزاء عطا فرمائے۔[1]

یہ خطبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی اذان کے بعد اور نماز سے پہلے ارشاد فرمایا تھا۔ ''طاعون عمواس'' مسلمانوں پر آنے والی وہ آفت تھی جس کی زد میں آکر بیس ہزار (۲۰،۰۰۰) سے زیادہ لوگ لقمۂ اجل بن گئے تھے۔ یہ تعداد شام کی آبادی کے نصف سے زیادہ تھی۔

طاعون زدہ علاقے میں جانے کی ممانعت:

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

''اگر تم اس وباء کے بارے میں سنو کہ وہ کسی جگہ پھوٹ پڑی ہے تو وہاں مت جاؤ اور اگر یہ وبا، تمھارے علاقے میں پھوٹ پڑے تو اِس سے بھاگنے کی کوشش میں اپنے علاقے سے مت نکلو۔''[2]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دَور میں آمدنی کے ذرائع:

خلافتِ راشدہ کے عہد زرّیں میں مسلمان مال کی تمام انواع واشکال کو اِس نظر سے دیکھتے کہ سارا مال اللہ تعالیٰ ہی کا ہے، انسان اسے نیابتاً استعمال کرتا ہے۔ اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ شرائط کے مطابق ہی مال خرچ کرنا چاہیے۔ قرآنِ کریم ہر مالی معاملے میں اِسی حقیقت کی تائید کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشادِ گرامی ہے:

﴿ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ ﴾ [الحديد: ۷]

''اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ، اور اُس (مال) میں سے خرچ کرو جس میں اس نے تمھیں جانشین بنایا ہے۔''

---

[1] الاكتفاء (۳/ ۳۱۰)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (۵۷۲۹) صحيح مسلم، رقم الحديث (۲۲۱۹)

مزید فرمایا:

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ ﴾ [البقرة: ٢٥٤]

''اے ایمان والو! ہم نے تمھیں جو کچھ دیا، اس میں سے خرچ کرو۔''

بندے کو اللہ تعالیٰ ہی نے پیدا فرمایا ہے، اس لیے بندے کے اس اعتراف سے کہ یہ سب مال اللہ کا دیا ہوا ہے، ساری مخلوق سے نیکی کے جذبات ابھرتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اموالِ ریاست کو اسی ایمانی جذبے سے دیکھا۔ آمدنی کے وسائل وسیع ہو چکے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں، چاہے آمدنی ہو یا خرچ، لوگوں کے حقوق کی بات ہو یا اس سلسلہ میں کسی سرکاری بندوبست کا معاملہ، مالیات کا شعبہ نہایت منظّم بنا دیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں ریاست کی آمدنی کے ذرائع انتہائی وسیع ہو گئے تھے۔ مالی آمدنی کے ذرائع زکاۃ، غنائم، مالِ فَے، جزیہ، خَراج اور تجارتی ٹیکس تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آمدنی کے یہ تمام ذرائع منظّم کیے اور امت کی بہتری کے لیے اس نظام میں ایسے قوانین مرتب کیے جو شریعت کے بنیادی مقاصد سے ہم آہنگ تھے۔ کیونکہ اُس وقت ایسے نت نئے حالات سامنے آرہے تھے جو اُن سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں موجود نہیں تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کتاب و سنت کے نفاذ کے لیے انتہائی مؤثر اور متحرّک شخصیّت کے مالک تھے۔ وہ مسلمانوں کے معاملات کو کبھی پسِ پُشت نہیں ڈالتے تھے۔ اپنے ہر معاملے میں دوسروں سے مشورہ کرتے تھے۔ اپنی رائے نہیں ٹھونستے تھے۔ جیسے ہی کوئی نیا معاملہ پیش آتا، وہ سب سے مشورہ کیا کرتے تھے اور پھر متفقہ رائے پر عمل کرتے۔[2]

زکاۃ:

یہ اسلام کا اہم رکن ہے۔ اس کا تعلق پورے معاشرے سے ہے۔ یہ آسمان سے نازل ہونے والا اسلامی حکم ہے۔ اِس میں بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے طریقے پر چلے۔ انھوں نے زکاۃ کے لیے علاحدہ ادارہ قائم فرمایا۔ اس کی تنظیمِ نو کی، زکاۃ کی وصولی کے لیے عمّال مقرر

[1] دراسات في الحضارة الإسلامية لأحمد إبرهيم الشريف (ص: ٢٤٣۔ ٢٤٥)

[2] مبادئ النظام الاقتصادی الإسلامی للدکتورہ سعاد ابراهیم صالح (ص: ٢١٣)

فرمائے اور انھیں اُن نئے علاقوں کی طرف بھیجا جو اسلامی ریاست میں شامل ہو گئے تھے۔

خلافتِ راشدہ کی یہ خوبی بھی نمایاں ہے کہ اُس مبارک زمانے میں کسی کی حق تلفی نہیں کی گئی۔ بیت المال میں نہایت دیانتداری سے اموال جمع کیے گئے اور انتہائی عدل سے کام لیا گیا۔

جزیہ:

جزیہ اُس ٹیکس کو کہا جاتا ہے جو مسلمانوں کی ذمہ داری میں آئے ہوئے اہلِ کتاب اور دیگر کفار پر لاگو ہوتا ہے۔[1] اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ قَٰتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ﴾ [التوبة: ٢٩]

’’ان لوگوں سے لڑو جو اللہ پر اور یومِ آخرت پر ایمان نہیں لاتے اور اس چیز کو حرام نہیں ٹھہراتے جسے اللہ نے اور اس کے رسول نے حرام ٹھہرایا ہے اور دینِ حق کو قبول نہیں کرتے، وہ جو اہلِ کتاب میں سے ہیں، (ان سے لڑو) یہاں تک کہ وہ ذلیل ہوکر اپنے ہاتھوں سے جزیہ دیں۔‘‘

جزیہ اہلِ کتاب اور شبیہ اہلِ کتاب، یعنی مجوس سے لیا جاتا ہے اور اس پر اجماع ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ابتداء میں مجوسیوں کے بارے میں متذبذب تھے کہ ان سے جزیہ لیا جائے یا نہ لیا جائے۔ ان کی یہ پریشانی حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے دور کردی، انھوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا:

’’نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہَجَر کی مجوسیوں سے جزیہ وصول فرمایا تھا۔‘‘[2]

جزیہ آزاد و عاقل مرد پر واجب ہوتا ہے۔ عورت، بچے، دیوانے اور غلام پر جزیہ لاگو نہیں ہوتا کیونکہ یہ سب کسی کی اولاد یا کسی اور کے تابع ہیں۔

جزیے کی شرائط اور وصولی کا وقت:

فقہائے کرام نے خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے عہدِ زرّیں کو سامنے رکھتے ہوئے اہلِ جزیہ کے لیے

[1] السياسة الشرعية لابن تيمية (ص: ١١٣- ١١٤) معاهدات في الشريعه للدكتور الديك (ص: ٣١٣)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣١٥٦ - ٣١٥٧)

بہت سی شرائط مستنبط فرمائی ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

1. کتاب اللہ کی شان کے منافی کوئی بات نہ کی جائے۔ نہ ہی اس میں کسی قسم کی تحریف کی جائے۔
2. رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کی تکذیب اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ اقدس میں بے ادبی کی جسارت نہ کی جائے۔
3. دینِ اسلام کے بارے میں کسی قسم کی جرح یا کوئی مذموم بات نہ کی جائے۔
4. مسلمان عورتوں سے زنا ہرگز برداشت نہیں کیا جائے گا۔
5. کسی مسلمان کو اس کے دین سے برگشتہ کیا جائے نہ کسی مسلمان کے مال اور دین کو کوئی نقصان پہنچایا جائے۔
6. اہلِ حرب سے تعلقات قائم کیے جائیں نہ ان کے امیر لوگوں سے کوئی دوستانہ رابطہ رکھا جائے۔

جزیے کی وصولی کے لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پیداواری سال کا آخری وقت مقرر فرمایا۔ لیکن جب حالات سازگار ہوئے اور تمام امور ایک نہج پر چل پڑے تو تنظیمِ نو کے تحت جزیے کی وصولی کے اوقات اور اِسی سلسلے میں نگرانی کے انتظامات میں کچھ مفید تبدیلیاں اور سہولتیں فراہم کی گئیں۔ بعض وجوہ کی بنا پر غور کیا گیا کہ فصلوں کی پیداوار کے موقع پر فوراً جزیہ وصول کرنا باعثِ مشقت ہے، لہٰذا جزیہ ادا کرنے اور وصول کرنے والوں کے لیے آسان اوقاتِ کار مقرر کیے گئے۔[1]

خَراج:

خَراج کا اطلاق دو مفاہیم پر ہوتا ہے۔ پہلا اطلاق عموم کے اعتبار سے ہے کہ ہر وہ مال جو مسلمانوں کے بیت المال میں پہنچے اور اس کا زکاۃ سے تعلق نہ ہو تو اسے خَراج کہا جاتا ہے۔ ان عمومی معنوں میں مال فَے، جزیہ اور عُشر سب شامل ہیں۔ اس کا دوسرا اطلاق یہ ہے کہ خَراج کا لفظ صرف ان زمینوں کے لیے بولا جائے جنھیں مسلمانوں نے فتح کیا ہو اور امامِ وقت نے ان زمینوں کو ہمیشہ کے لیے سب لوگوں کے مصالح کے لیے وقف کر دیا ہو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عراق اور شام کی وسیع اراضی کے سلسلے میں یہی معاملہ فرمایا۔[2]

شروع شروع میں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان زمینوں کو تقسیم کرنے کا ارادہ فرما لیا تھا لیکن حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے ان زمینوں کی تقسیم کی مخالفت کی، پھر حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے بھی یہی مشورہ

---

[1] سياسة المال في الإسلام في عهد عمر (ص: ٧٦)

[2] خَراج لأبي يوسف (ص: ٢٤۔ ٢٥) اقتصاديات الحرب (ص: ٢١٥)

دیا، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان زمینوں کی تقسیم سے رک گئے۔[1]

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اللہ کی قسم! اگر آپ اس طرح زمینیں تقسیم کریں گے تو ایسے حالات پیدا ہوسکتے ہیں جو آپ کے لیے ناپسند یدہ ثابت ہوں۔ آپ بہترین زمینیں لوگوں کے ہاتھوں میں دے دیں گے، جب وہ فوت یا ہلاک ہوجائیں گے تو عین ممکن ہے کہ ان کا مالک کوئی فردِ واحد مرد یا عورت بن جائے، پھر ایسے لوگ آجائیں جو انھی زمینوں کے توسّط سے اسلام میں رکاوٹ کا ذریعہ تلاش کریں۔ آپ ایسا قدم اٹھائیں جو پہلے اور بعد میں آنے والوں کے لیے یکساں مفید ہو۔''[2]

یہ خبر سب لوگوں میں پھیل گئی، چنانچہ اس ضمن میں ان کے اور بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کے مابین اختلاف بھی رونما ہوا، کیونکہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم تقسیم کے حق میں تھے۔ لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تقسیمِ اراضی سے انکار کر دیا اور ان لوگوں کو یکے بعد دیگرے سورۃ حشر کی پانچ آیات سنائیں، چنانچہ پہلے یہ آیت پڑھی:

﴿ وَمَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّلَا رِكَابٍ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴾ [الحشر: ٦]

''اور اللہ نے اُن سے اپنے رسول کی طرف جو مال لوٹایا تو اس کے لیے تم نے گھوڑے اور اونٹ نہیں دوڑائے، لیکن اللہ اپنے رسولوں کو جس پر چاہتا ہے غلبہ دیتا ہے۔ اور اللہ ہر چیز پر خوب قادر ہے۔''

یہ آیت بنونضیر سے متعلقہ تھی، پھر پڑھا:

﴿ مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ ۚ وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۗ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴾ [الحشر: ٧]

''اللہ اپنے رسول کی طرف بستیوں والوں (کے مال) سے جو کچھ لوٹا دے، تو وہ اللہ کے لیے اور اس کے رسول کے لیے اور (اس کے) قرابت داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں

[1] سياسة المال في الإسلام (ص: ١٠٣)

[2] الأموال لأبي عبيد (ص: ٧٥) سياسة المال (ص: ١٠٣)

کے لیے ہے، تاکہ وہ (مال) تمھارے دولت مندوں ہی کے درمیان گردش نہ کرتا رہے۔ اور اللہ کا رسول تمھیں جو کچھ دے تو وہ لے لو اور جس سے منع کرے تو اس سے رک جاؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔''

یہ آیت تمام بستیوں کے بارے میں ہے، پھر پڑھا:

﴿ لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيٰرِهِمْ وَ اَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ﴾ [الحشر: ٨]

''(مالِ فےَ) اُن مہاجر فقراء کے لیے ہے جو اپنے گھروں اور اپنی جائیدادوں سے نکالے گئے، وہ اللہ کا فضل اور اس کی رضا ڈھونڈتے ہیں، اللہ اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں، یہی لوگ سچے ہیں۔''

پھر اللہ تعالیٰ نے اِسی پر اکتفاء نہیں فرمایا بلکہ کچھ اور لوگوں کو بھی اس میں شامل فرمایا۔ چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ وَالَّذِيْنَ تَبَوَّءُو الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴾ [الحشر: ٩]

''اور (ان کے لیے ہے) جنھوں نے (مدینہ کو) گھر بنا لیا تھا اور ان (مہاجرین) سے پہلے ایمان لا چکے تھے، وہ (انصار) ان سے محبت کرتے ہیں جو ان کی طرف ہجرت کرے اور وہ اپنے دلوں میں اُس (مال) کی کوئی حاجت نہیں پاتے جو ان (مہاجرین) کو دیا جائے اور اپنی ذات پر (ان کو) ترجیح دیتے ہیں اگر چہ خود انھیں سخت ضرورت ہو اور جو کوئی اپنے نفس کے لالچ سے بچا لیا گیا، تو وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔''

یہ انصار کے بارے میں خاص تھیں، پھر اللہ تعالیٰ نے انہی پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ فرمایا:

﴿ وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴾

[الحشر: ١٠]

''اور (فےَ اُن کے لیے ہے) جو اِن (مہاجرین وانصار) کے بعد آئے، وہ کہتے ہیں: اے

ہمارے رب! ہمیں اور ہمارے اُن بھائیوں کو بخش دے جنھوں نے ایمان میں ہم سے پہل کی اور ہمارے دلوں میں اہلِ ایمان کے لیے کوئی کینہ نہ رکھ۔ اے ہمارے رب! بے شک تو بہت نرمی والا نہایت رحم کرنے والا ہے۔''

یہ ان سب کے لیے عام تھی جو بعد میں آنے والے لوگ تھے، چنانچہ مالِ فَے میں تمام مسلمانوں کا حق ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ کی قسم! اگر میں زندہ رہا تو صنعاء میں بسنے والا چرواہا بھی مالِ فَے سے اپنا حصہ وصول کرے گا، جبکہ اس کا خون اس کے چہرے میں ہوگا (اُس نے اِس کے لیے کوئی جنگ ہی نہ کی ہوگی)۔[1]

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا: اگر یہ زمینیں اور عجمی غلام سب تقسیم کر دیے جائیں تو سرحدوں کی حفاظت کیسے ہوگی؟ اور بیواؤں اور یتیموں کے لیے شام اور عراق کے علاقوں سے کیا ملے گا؟ لوگوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے کے خلاف گفتگو کی اور عرض کی: آپ ہماری تلواروں سے حاصل کیا گیا مال اُن لوگوں کے لیے وقف کرنا چاہتے ہیں جو اِن فتوحات میں شریک ہوئے نہ انھوں نے جنگ میں حصہ لیا، پھر ان کے بعد کی اولاد کے لیے جن کا ان سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سب کی یہ باتیں توجہ سے سنیں اور فرمایا: یہ ایک رائے ہے۔ لوگوں نے کہا: آپ مشورہ کیجیے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اَوس اور خزرج کے دس بڑے عمائدین کو بلایا اور ارشاد فرمایا: بلاشبہ میں بھی تم میں سے ایک ہوں۔ تم حق کا اقرار کرنے والے ہو۔ جس نے چاہا میری مخالفت کی اور جس نے چاہا مجھ سے موافقت کی۔ میں نہیں چاہتا کہ تم میری خواہشات کی پیروی کرو، پھر فرمایا: دیکھو! تم نے لوگوں کی باتیں سُنی ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ شاید میں کسی پر طعن کر رہا ہوں۔ لیکن یاد رہے کہ کِسریٰ کی سرزمین کے بعد کوئی بڑی فتح ہمارے سامنے نہیں۔ اللہ نے ہمیں ان کے اموال، زمینوں اور عجمی غلاموں سے نوازا ہے۔ میں نے ان اموال میں سے خُمس نکال کر اس کے مصرف میں صرف کر دیا ہے۔ بقیہ مال مجاہدین میں تقسیم کر دیا ہے۔ اور زمینوں اور عجمیوں کے بارے میں میرا خیال ہے کہ ان پر خَراج اور جزیہ مقرر کر دیا جائے تاکہ یہ مسلمانوں کے لیے مستقل آمدنی کا ذریعہ بن جائے۔ اس سے مجاہدین، ان کی اولادیں اور جو بھی ان کے بعد مسلمان آئیں، وہ مستفید ہوں۔ کیا تمھیں معلوم نہیں ہے کہ ان سرحدوں کے لیے ایسے افراد کی ضرورت

---

[1] الخراج لأبي يوسف (ص: ٦٧) واقتصاديات الحرب (ص: ٢١٧)

ہے جو ان کی نگرانی کریں؟ کیا تم نہیں سمجھتے کہ بڑے بڑے شہروں میں مسلمان افواج کی ضرورت ہے۔ آخران سب پر اٹھنے والے اخراجات کہاں سے آئیں گے؟ اگر یہ عجمی غلام اور زمینیں تقسیم کردی جائیں تو پھر مال کہاں سے آئے گا؟ یہ سن کر سب نے بیک آواز کہا: اے امیر المومنین! آپ کی رائے درست ہے، اگر یہ سرحدیں اور یہ بڑے بڑے شہر اسلامی افواج سے خالی ہو گئے اور اہلِ بلد پر ایسے حالات آ گئے کہ وہ اپنی طاقت کھو بیٹھیں تو ممکن ہے کہ اہلِ کفران شہروں کو دوبارہ حاصل کرلیں۔[1]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ارضِ سواد کے بارے میں جو گفتگو کی وہ بامقصد اور مدلل گفتگو کی بہترین مثال ہے۔ بڑے بڑے ماہرِ لسان اور منجھے ہوئے پارلیمانی مقرر بھی اپنے ماتحتوں کو کسی منصوبے کے لیے قائل کرنا چاہیں تو وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بہتر اندازِ گفتگو کہیں نہ پاسکیں گے۔[2]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اِنھی صفاتِ جلیلہ سے متاثر ہو کر مولانا ظفر علی خان رحمہ اللہ نے بے ساختہ یہ شعر کہا تھا:

جو چمک نگاہِ عمر میں ہے نہ وہ برق میں نہ شرر میں ہے
اسے پائمال نہ جانیے جو عمر کی راہ گزر میں ہے

خَراجی زمینیں تقسیم نہ کرنے کی حکمتیں:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی دور اندیشی اور بالغ نظری نے مستقبل کے تحفّظات کے پیشِ نظر مفتوحہ اراضی تقسیم نہ کرنے کا جو دلیرانہ فیصلہ کیا تھا، آخر کار لوگ اس پر متفق ہو گئے تھے۔

- حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس اقدام سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ بیرونی خطرات سے نمٹنا آسان ہو گیا۔ مسلمانوں کی پہلی اور فوری ضرورت یہ تھی کہ انھیں سرحدی علاقوں کی نگہداشت کے لیے وافر سامان میسر آئے۔ مفتوحہ علاقوں کے اس حاصل شدہ خَراج سے افواج، ان کی خوراک اور لشکروں کی تیاری میں مدد مل سکتی تھی۔ فوجیوں کو معقول تنخواہیں اور اضافی عطیات بھی حاصل ہوتے اور بہت سا اسلحہ اور دیگر سامانِ جنگ بھی تیار ہوتا، تاکہ اسلامی ریاست کی حدود اور زمینوں کا دفاع ممکن ہوتا۔
- اس موقع پر خلیفۂ وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اس دور اندیشی کی داد دینی چاہیے کہ انھوں نے سیاسی طور

---

[1] الخراج لأبي يوسف (ص: ٥٦) اقتصاديات الحرب (ص: ٢١٧)

[2] أخبار عمر (ص: ٢١٠)

پر اسلامی معاشرے میں نہ صرف اپنے عہد کے لیے بلکہ بعد والے زمانوں کے لیے بھی امنِ عامہ کے مضبوط ستون قائم کر دیے۔

- خلیفۂ وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا سابقین کبار صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے فقہی احکام اور مصادرِ شریعت کے بارے میں مشورہ کرنا اور ان کبار صحابہ رضی اللہ عنہم کا خیر خواہانہ مشورہ دینا اس امر کا ثبوت ہے کہ اہلِ شوریٰ میں خاص اور امتیازی خصوصیات ہوتی ہیں اور جن سے مشورہ لیا جاتا ہے وہ صاحبِ شعور، دین کی سوجھ بوجھ رکھنے والے، پرہیزگار اور معاملات کے تجزیئے کے ماہر ہوتے ہیں، اور اپنی ذمہ داریاں نبھاتے ہیں۔ مختصر الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ وہ چاپلوسی کرنے والے نہیں ہوتے بلکہ حق بات کہنے اور حق کو قبول کرنے میں نہایت مضبوط ارادوں کے مالک ہوتے ہیں اور اعلانِ حق میں کسی ملامت گر حاکم یا کسی اور کی کوئی پروا نہیں کرتے۔

فیصلے کے اہم فکری آثار

① جاگیرداری نظام کا خاتمہ:

اس فیصلے کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ جاگیردارانہ نظام کا خاتمہ ہوا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جاگیردارانہ نظام کے وہ سب راستے بند کر دیے جن کی بنیاد ظلم پر تھی۔ اُس نظام نے ساری زمینوں پر قبضہ اور غلبہ حاصل کر رکھا تھا اور تمام کسانوں کو غلام بنا رکھا تھا۔ ان سے بغیر اجرت محنت اور مشقت لی جاتی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عراق کی زمینیں کسانوں ہی کے پاس رہنے دیں تاکہ وہ خود ان کی کاشت کریں اور اس کے عوض مناسب سالانہ خَراج ادا کریں۔ کسانوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس فیصلے پر انتہائی رشک اور مسرّت کا اظہار کیا کہ انھوں نے انھیں زمینوں کا مالک بنائے رکھا تاکہ وہ ان زمینوں میں کاشتکاری کریں اور مناسب خَراج ادا کریں۔ اس طرح انھیں زندگی میں پہلی دفعہ محسوس ہوا کہ وہ خود ان زمینوں کے مالک ہیں، وہ کسی جاگیردارانہ نظام کے تحت محنت پر مجبور نہیں ہیں۔

اس سے پہلے یہ جاگیردار اللہ کی زمین کے زبردستی مالک بن بیٹھے تھے اور یہ ظالم لوگ ان کسانوں کو معمولی معاوضے کے علاوہ اور کچھ نہیں دیتے تھے۔[1]

[1] الدعوة الإسلامية في عهد عمر بن الخطاب لحسني غيطاس (ص:١٣٠)

② رومی اور ایرانی لشکروں کی روک تھام:

حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی یہ ایسی سیاست تھی کہ انھوں نے کسانوں کو زمینیں دے کر بزورِ شمشیر فتح کیے گئے اُن علاقوں میں زبردست سیاسی و سماجی شعور بیدار کر دیا، چنانچہ وہ اپنے ایرانی اور رومی حکّام سے نفرت کرنے لگے اور ان کے سارے چندے بند کر دیے۔ بلکہ اب وہ اس کے برعکس مسلمانوں کو ان کے خلاف چندے اور اپنا خوش دلانہ تعاون پیش کرنے لگے۔ قائدِ فارس رستم نے اہلِ حیرہ سے کہا تھا: اے اللہ کے دشمنو! تم عربوں کو ہمارے علاقوں میں داخل کر کے خوش ہو رہے ہو۔ تم ان کی خاطر ہماری جاسوسی کرتے ہو اور تم نے اپنے اموال دے کر انھیں طاقتور بنا دیا ہے۔[1]

③ مفتوحہ علاقوں کے لوگوں کا اسلام قبول کرنا:

مفتوحہ علاقوں کے لوگوں کو زمینیں عطا کرنے کا سب سے زبردست فائدہ یہ ہوا کہ تمام مقامی کسان جلد از جلد اسلام قبول کرنے لگے اور اسلام اتنی تیزی سے پھیلا کہ ماضی میں اس جیسی کوئی مثال نہیں ملتی۔ مقامی لوگوں نے مسلمانوں کا عدل وانصاف دیکھا، اسلام کی حقانیت کو پہچانا اور اہلِ اسلام کے اعلیٰ برتاؤ سے انھیں مسلم انسانی اقدار کا احساس ہوا۔[2]

④ سرحدوں کی حفاظت کے لیے ذریعۂ آمدنی:

اسلامی ریاست کے اس ابتدائی دَور ہی میں ریاست کا ارضی حدودِ اربعہ پھیلتا چلا گیا اور ریاست کی سرحدیں جزیرۂ عرب سے آگے نکل گئیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سرحدوں کی مستقل حفاظت کے لیے گھوڑ سواروں کے خصوصی دستے متعین کر رکھے تھے۔ اس طریقے سے ترتیب دیے جانے والے لشکروں کی تعداد ۳۰ ہزار تک پہنچ چکی تھی۔ پیدل یا اونٹ سوار مجاہدین کی تعداد اس کے علاوہ ہوتی تھی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عراقی کسانوں کو جس وقار کے ساتھ ان کی زمینوں پر قائم رکھا، اُس سے اُن میں ایک نیا جوش اور ولولہ پیدا ہو گیا۔ اس موقع کو وہ اپنی بہت بڑی خوش قسمتی سمجھنے لگے۔ انھوں نے یہ سوچ کر اطمینان کا سانس لیا کہ اب وہ بھی کچھ پس انداز کر سکیں گے اور اپنی پیداوار سے قابلِ قدر فائدہ اٹھا سکیں گے کیونکہ مسلمانوں کے غلبے سے پہلے وہ اپنے سابقہ ظالم مالکان کی طرف سے ٹیکس کی مد میں اپنی

[1] الدعوة الإسلامية في عهد عمر بن الخطاب لحسنى غيطاس (ص:١٣١)

[2] الدعوة الإسلامية في عهد عمر بن الخطاب لحسنى غيطاس (ص:١٣٢)

طاقت سے زیادہ بوجھ برداشت کر رہے تھے۔[1]

عشور (تجارتی ٹیکس):

عشور اُس تجارتی ٹیکس کا نام ہے جو اسلامی ریاست کے علاقوں میں داخل یا خارج ہونے والے تاجروں سے وصول کیا جاتا ہے۔ دورِ حاضر میں اس کی جدید شکل ''چونگی کا نظام'' ہے۔ عشور کی وصولی کے لیے سرکاری طور پر جو شخص مقرر ہوتا تھا اسے عاشر کہا جاتا تھا۔[2]

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانۂ مبارک میں عشور کا وجود نہ تھا کیونکہ وہ زمانہ اسلامی دعوت، جہاد فی سبیل اللہ اور اسلامی ریاست کے قیام کا ابتدائی دَور تھا، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں اسلامی مملکت کا حدودِ اربعہ انتہائی وسعت اختیار کر گیا اور مشرق ومغرب دونوں جانب تیزی سے فتوحات حاصل ہوتی چلی گئیں۔ بہت سے پڑوسی ملکوں سے تجارتی سطح پر بھی تعلقات بڑھے، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مصلحتِ عامہ کے پیشِ نظر اسلامی ریاست کے شہروں میں آنے والے تاجروں پر اُسی طرح ٹیکس عائد کر دیا جس طرح کفار مسلمان تاجروں سے وصول کیا کرتے تھے۔

تمام مؤرخین کا اتفاق ہے کہ اسلام میں سب سے پہلے تجارت پر عشور نافذ کرنے والے حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی تھے۔[3]

تجارتی ٹیکس لاگو کرنے سے پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مسلمان تاجروں سے باقاعدہ مذاکرات کیے۔ آپ نے ان سے دریافت فرمایا کہ جب تم ان کے علاقوں میں جاتے ہو تو وہ تم سے کیا وصول کرتے ہیں؟ مثلاً: تم حبشہ جاتے ہو تو وہ تم سے کس نسبت اور کس شرح سے تجارتی ٹیکس وصول کرتے ہیں؟ مسلمان تاجروں نے کہا: وہ ہم سے ہمارے مال کا عُشر (دسواں حصہ) لیتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''فَخُذُوا مِنْهُمْ مِثْلَ مَا يَأْخُذُونَ مِنْكُمْ''[4]

''ٹھیک ہے۔ تم بھی اُن سے اُسی طرح عُشر وصول کیا کرو جس طرح وہ تم سے وصول کیا کرتے ہیں۔''

---

[1] أهل الذمة في الحضارة الإسلامية (ص: ٦٣)

[2] الخراج لأبي يوسف (ص: ٢٧١) اقتصاديات الحرب (ص: ٢٢٣)

[3] سياسة المال في لاسلام (ص: ١٢٨)

[4] موسوعة فقه عمر بن الخطاب (ص: ٦٥١)

بیت المال اور سرکاری امور کا ریکارڈ:

بیت المال کا اطلاق اُس جگہ پر ہوتا ہے جہاں ریاست کی ساری آمدنی جمع ہوتی ہے اور پھر وہیں سے تمام سرکاری اخراجات، یعنی خلیفہ، فوج اور عمّال کی تنخواہیں ادا کی جاتی ہیں اور عوامی فلاح و بہبود کے پروگراموں کے مصارف پورے کیے جاتے ہیں۔[1]

دیوان:

دیوان سے مراد وہ رجسٹر اور کاغذات ہیں جن میں ریاست کے امور کا اندراج کیا جاتا ہے۔ ایرانیوں کے ہاں دیوان کا اطلاق اُس جگہ پر کیا جاتا تھا جہاں کاتب اور سرکاری ملازم جمع ہو کر کاغذات میں سرکاری امور کا اندراج کرتے تھے۔[2] حضرت عمر رضی اللہ عنہ وہ پہلے خلیفہ تھے جنھوں نے اسلامی دورِ خلافت میں سب سے پہلے سرکاری سطح پر دیوان، یعنی سرکاری ریکارڈ اور حساب کتاب کا شعبہ قائم کیا۔[3]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا تقسیمِ اموال کا طریقۂ کار:

1. اسلام میں پہل کرنے والوں کو ترجیح، جن کے سبب اموال کا حصول ممکن ہوا۔
2. دین اور دنیا کے اعتبار سے مسلمانوں کو نفع پہنچانے والے، جس طرح علماء اور ذمہ داران ہیں۔
3. وہ لوگ جنھوں نے مسلمانوں کی تکالیف دور کرنے کے لیے سخت مشکلات کا مقابلہ کیا، مثلاً: مجاہدین، دشمنانِ اسلام کی جاسوسی کرنے والے اور دیگر خیر خواہ۔
4. ضرورت مند افراد۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اموال میں تقسیم کی حکمتِ عملی اُن کے اُس فرمان میں موجود ہے جس میں انھوں نے فرمایا ہے: اِس مال میں کوئی کسی دوسرے سے زیادہ حق دار نہیں، سوائے اُس شخص کے جو پیش قدمی و مسابقت اختیار کرنے والا ہو، مسلمانوں کو نفع پہنچانے والا ہو، مصائب برداشت کرنے والا ہو یا انتہائی ضرورت مند ہو۔[4]

---

[1] سياسة المال في الإسلام (ص: ١٥٥)

[2] مقدمه ابن خلدون (ص: ٢٤٣) سياسة المال في الإسلام (ص: ١٥٥)

[3] سياسة المال في الإسلام (ص: ١٥٧)

[4] جامع الأصول (٢/ ٧١) اخبار عمر (ص: ٩٤)

حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے حضرت عقیل بن ابی طالب، مخرمہ بن نوفل اور جُبیر بن مُطعِم رضی اللہ عنہم جو قریشی نوجوان تھے، اُن کی ڈیوٹی لگائی کہ وہ تمام لوگوں کے اُن کے مراتب کے لحاظ سے کوائف تحریر کریں۔ انھوں نے سب سے پہلے بنو ہاشم کے نام لکھے، پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور ان کے رشتہ دار پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور ان کے عزیز و اقارب کے نام اور کوائف تحریر کیے۔ انھوں نے خلافت کی ترتیب پیشِ نظر رکھ کر فہرستیں تیار کیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں پیش کیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ فہرستیں دیکھیں تو فرمایا: میں ان فہرستوں سے مطمئن نہیں ہوں۔ تم سب سے پہلے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے زیادہ قریبی عزیز و اقارب کے کوائف کا اندراج کرو، پھر ان کے بعد جو زیادہ قریب ہوں، ان کے کوائف لکھو اور (حضرت) عمر (رضی اللہ عنہ) کا نام وہاں درج کرو جہاں اللہ نے انھیں رکھا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دیوان کی بنیاد رکھی۔ اس میں وظائف حاصل کرنے والوں کے نام اور ان کے وظائف کی تفصیلات درج کرائیں، پھر ایک فوجی دیوان مقرر کیا۔ تمام مسلمانوں کے لیے الگ الگ وظیفے مقرر فرمائے۔ انھوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن حتیٰ کہ لونڈیوں کے وظیفے بھی مقرر فرما دیے۔ انھوں نے تمام مسلمان مردوں اور عورتوں کے علاوہ بچوں کے بھی وقتِ پیدایش ہی سے وظائف مقرر فرمائے، نیز غلاموں کے لیے خاص طور پر مختلف وظیفے مقرر فرمائے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں فقراء اور مساکین کو اموالِ زکاۃ سے اس قدر مال دے دیا جاتا تھا جس کے سبب ان کی محتاجی ختم ہو جاتی تھی اور وہ خوش حال ہو جاتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ جب تم کسی کو عطاء کرو تو اسے اچھی طرح خوشحال کرو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسلمانوں کے علاوہ اہلِ کتاب کے اُن مساکین کو بھی وظیفے عطاء فرمایا کرتے تھے جن پر اُن کے فقر وفاقہ کے سبب جزیہ معاف کر دیا گیا تھا۔[1]

فوج کے اخراجات:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسلامی افواج کی طرف خصوصی توجہ فرمائی۔ ان کا علاحدہ دیوان اور محکمہ تشکیل فرمایا اور ان میں وظائف کی تقسیم نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے قریبی نسب اور قبولیتِ اسلام میں سبقت کی بنیاد پر کی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مجاہدینِ اسلام کی بیویوں اور نو مولود بچوں کے لیے بھی خصوصی وظائف مقرر فرمائے۔ انھوں نے نوعمر لڑکوں اور لاوارث بچوں کے لیے بھی سالانہ وظائف مقرر فرمائے۔ ہر وظیفے

[1] النظام الإسلامي المقارن (ص: ۱۱۲) سياسة المال في الإسلام (ص: ۱۷۱) الأموال لأبي عبيد (٤/ ٦٧٦)

کی کم از کم مقدار ۱۰۰ درہم ہوتی تھی اور بچوں کی بلوغت کے وقت ان کے وظیفوں کی رقم بڑھا دی جاتی تھی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت کے آخری ایام میں فرمایا: اگر مزید مال آگیا تو میں ہر آدمی کے لیے ۴ ہزار درہم وظیفہ مقرر کروں گا۔ ایک ہزار اس کے سفر کے لیے، ایک ہزار اسلحہ کے لیے، ایک ہزار اس کے اہلِ خانہ کے لیے، جبکہ ایک ہزار درہم اس کے گھوڑے اور خچر کے لیے ہوں گے۔[1]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا خیال تھا کہ مملکتِ اسلامیہ کے مال میں ہر مسلمان کا ولادت سے وفات تک حق ہے۔ انھوں نے اس قانون کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا: مجھے اُس ذات کی قسم جس کے علاوہ کوئی معبودِ بر حق نہیں! (یہ قسم تین دفعہ اٹھائی) کوئی ایسا شخص نہیں جس کا اِس مال میں حصہ نہ ہو۔ اسے دیا جائے یا نہ دیا جائے، یہ الگ بات ہے۔ تم سب کے حصے برابر ہیں سوائے غلام کے۔ میرا بھی اس مال میں ایک عام آدمی جیسا حق ہے۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فارس کی فتح کے بعد بیت المال میں زبردست فراوانی کے ساتھ بھاری مال آتے دیکھا تو بے اختیار رو پڑے۔ حضرت عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یہ تو شکر کا مقام ہے اور خوشی کا موقع ہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہرگز نہیں، یہ دنیا کا مال ہے۔ اِس کے سبب قوموں کے درمیان دشمنی اور بُغض کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔

پھر دعا فرمائی: اے اللہ! جو تُو نے ہمارے لیے مزیّن فرمایا ہے ہم اسے دیکھ کر یقیناً خوش ہو سکتے ہیں، اے اللہ! مجھے توفیق عطا فرما کہ میں اسے صحیح جگہ خرچ کروں اور میں اِس مال کی برائیوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت کی مالی پالیسی کے بارے میں یہی وہ نمایاں اصول ہیں۔

اموال کے سلسلے میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ انتہائی پرہیز گار اور بے حد محتاط شخصیت تھے۔ انھوں نے فرمایا: اے لوگو! میں تمھیں صاف صاف بتاتا ہوں کہ اللہ کے مال میں سے میرے لیے کیا حلال ہے؟ ایک جوڑا سردیوں کا اور اور ایک جوڑا گرمیوں کا، حج و عمرہ کے لیے ایک سواری، میرے اہلِ خانہ کی خوراک جو ایک ایسے قریشی کے برابر ہو جو زیادہ غنی بھی نہ ہو اور نہ زیادہ فقیر ہو۔ میں مسلمانوں ہی کا ایک فرد ہوں، میری بھی وہی ضروریات ہیں جو سب مسلمانوں کی ہیں۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے:

"اَللّٰهُمَّ اِنَّكَ تَعْلَمُ أَنِّيْ لَا آكُلُ اِلَّا وَجْبَتِيْ وَلَا أَلْبَسُ اِلَّا حُلَّتِيْ وَلَا آخُذُ اِلَّا حَقِّيْ"

[1] الأحكام السلطانية (ص: ٢٢٧) سياسة المال في الإسلام (ص: ٢٠٣) و الطبقات الكبرىٰ (٣/ ٢٩٨۔٣٠١)

''اے اللہ! تُو خوب جانتا ہے، بلاشبہہ میں ایک وقت کے کھانے سے زیادہ کھانا نہیں کھاتا، اپنا جوڑا پہنتا ہوں اور صرف اپنا ہی حق لیتا ہوں۔''

مزید فرماتے:

''اِنِّيْ أَنْزَلْتُ مَالَ اللّٰهِ مِنِّيْ بِمَنْزِلَةِ مَالِ الْيَتِيْمِ، ﴿مَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ﴾''

''بلاشبہہ میں نے اللہ کے مال کے سلسلہ میں اپنی ذمہ داری اُسی طرح نبھائی ہے جس طرح ایک یتیم کے مال کی ذمہ داری نبھائی جاتی ہے، یعنی ''یتیم کے مال کا نگران مال دار ہو تو مالِ یتیم میں سے کچھ نہ لے اور فقیر ہو تو اس مال میں سے انصاف کے ساتھ کھائے۔''

اسلامی کرنسی کا اجراء:

کسی بھی ملک کی کرنسی سونے اور چاندی جیسی قیمتی دھات کے عوض استعمال ہوتی ہے۔ کرنسی کا استعمال معاشرتی زندگی کے انتہائی ضروری لوازم میں سے ایک ہے، خاص طور پر عالمی سطح پر مختلف اقوام اور ملکوں کے مابین تجارتی معاملات کرنسی کے تبادلے کے بغیر ناممکن ہوتے ہیں۔

تاریخی حوالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ابتدائی دَور میں وہی کرنسی جاری رکھی جو اسلام سے پہلے مروج تھی۔ اُسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بھی جاری رکھا۔ اس کرنسی کے سِکے پر ہرقلی، کِسروی اور مسیحی تہذیب کے نقش و نگار ثبت تھے۔ درمیان میں آگ کا گھر بھی بنا ہوا تھا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے بھی یہ سِکہ اُسی طرح جاری رکھا جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دورِ حکومت میں جاری تھا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اس پر صرف لفظ ''جائز'' کا اضافہ کرادیا تاکہ کھوٹے اور کھرے سِکے کی پہچان ہو سکے۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ ہی وہ پہلی شخصیت ہیں جنھوں نے سب سے پہلے سونے اور چاندی کے سِکے تیار کرائے، شرعی درہم کی قیمت مقرر کی اور پھر اُنھی سِکوں کو سِکۂ رائج الوقت بنادیا۔ علّامہ ماوردی نے لکھا ہے: بلاشبہہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ ہی وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے شرعی درہم کی مقدار مقرر فرمائی۔

علّامہ مقریزی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: سب سے پہلے جس نے اسلامی کرنسی جاری کی وہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ تھے۔ انھوں نے اٹھارہ ہجری میں کِسروی طرز کی کرنسی تیار کرائی اور بعض سِکوں میں ''الحمد للہ''

اور بعض میں ''لا الٰہ الا اللہ'' کے حروف مبارک نقش کرائے۔ سِکوں کے ایک کنارے پر خلیفۂ وقت سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا نام بھی لکھوایا۔

یوں حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ مملکتِ اسلامیہ کے وہ پہلے سربراہ تھے جنھوں نے مسلمانوں کی معاشرتی اور اقتصادی زندگی کی انتہائی اہم ضرورت کی طرف توجہ فرمائی، پھر بعد میں آنے والے دیگر خلفاء اور امراء اسلامی کرنسی میں اپنے دَور کی ضرورت کے مطابق تبدیلیاں کیا کرتے تھے۔

محکمۂ قضاء کا قیام:

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں اسلام پھیلا، اسلامی ریاست کا رقبہ وسیع ہوا اور مسلمانوں کے دوسری قوموں سے تعلقات بڑھے تو اُن ترقی یافتہ حالات میں ایک عدالتی ادارے کا قیام ضروری ہوگیا۔ خلیفۂ وقت انتہائی مصروف ہوگئے۔ نئے قائم ہونے والے مختلف صوبوں اور شہروں میں مقرر کردہ گورنروں کی مصروفیات میں بھی بہت اضافہ ہوگیا۔ وسیع مملکت اور بڑھتی ہوئی آبادی میں باہمی تنازعات بھی بڑھنے لگے۔ ان حالات میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے بعض شعبوں کو بعض محکموں سے الگ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ چنانچہ انھوں نے عدلیہ کی حیثیت مستقل طور پر جداگانہ کردی۔ آپ کا مقصد یہ تھا کہ خلیفۂ وقت کو امورِ ریاست کے لیے بھرپور وقت مل سکے۔ انھوں نے عدلیہ کو الگ کرنے کے ساتھ ساتھ مستقل بنیاد پر قاضیوں کا تقرر بھی کیا۔ ان کا کسی دوسرے ادارے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اسلامی حکومت کے پہلے فرمانروا تھے جنھوں نے عدلیہ کو انتظامیہ سے الگ کر کے اُسے مستقل بنیاد پر قائم فرمایا۔ انھوں نے کوفہ، بصرہ، شام اور مصر کے علاقوں میں بھی قاضی مقرر فرمائے۔ یہ محکمہ براہِ راست خلیفہ کے تحت کام کرتا تھا۔ قُضاۃ خلیفہ کے سامنے جوابدہ ہوتے تھے۔

آج دنیا بھر کی ریاستوں میں عدلیہ ایک جداگانہ محکمہ کی حیثیت سے کام کر رہی ہے۔ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے یہی کام ۱۴ سو برس قبل کر دکھایا تھا۔ حق یہ ہے کہ وہ امتِ مسلمہ کے حقیقی اور عبقری لیڈر تھے۔ وہ بدلتے ہوئے حالات کو فوراً بھانپ لیتے تھے، اس لیے جدید قوانین وضع کرنے، امورِ ریاست کو منظّم کرنے اور ہر محکمے کے حدود واختیارات متعیّن کرنے کی حیرت انگیز صلاحیتیں رکھتے تھے۔ اہلِ یورپ نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ جیسے قوانین وقواعد اٹھارہویں صدی عیسوی میں جدید نظریئے کے عنوان سے پیش کیے اور انھیں عوامی بھلائی کا ضامن قرار دیا۔ اسلام نے آزاد اور بے لاگ عدل کا نظریہ چودہ سو سال قبل پیش کیا اور

اسے اپنا ایک اہم اساسی اور انتظامی اصول قرار دیا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں عدلیہ اور اس کے ساتھ متعلقہ امور کو بہتر سے بہتر بنانے کی طرف خصوصی توجہ دی۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے بعض ایسے والی بھی مقرر فرمائے جنھیں عدالتی اور انتظامی دونوں طرح کے اختیارات حاصل تھے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ عدالتی معاملات میں ان سے مسلسل خط و کتابت جاری رکھتے تھے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ قاضیوں سے مسلسل رابطہ رکھتے تھے اور بوقتِ ضرورت مقرر شُدہ قاضیوں کی موجودگی کے باوجود مدینہ منورہ میں بعض مقدمات کا فیصلہ خود صادر کر دیتے تھے۔ وہ قاضی جنھیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مستقل طور پر صرف قاضی ہی مقرر فرمایا تھا وہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ تھے۔ انھیں کوفہ کا چیف جسٹس بنا کر بھیجا گیا تھا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے مدینہ طیبہ میں حضرت علی بن ابی طالب اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہما کو منصبِ قضاء تفویض فرمایا۔ اور ان کے لیے تنخواہ بھی مقرر فرمائی۔

قاضیوں کے نام بعض اہم خطوط

حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے قضاء اور عدالتی کاروائی کا جو مضبوط اور مربوط نظام قائم فرمایا تھا، فقہِ اسلامی کے اجلّ علماء نے اُس نظام کی تشریح کی ہے اور اس کے حاشیے بھی لکھے ہیں۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے اُس نظام اور دستور کی جھلک اُس خط میں دیکھی جاسکتی ہے جو حضرت ابوموسی الاشعری رضی اللہ عنہ کے نام لکھا گیا تھا۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ کے بندے امیر المومنین عمر بن الخطاب (رضی اللہ عنہ) کی طرف سے (حضرت) عبداللہ بن قیس (رضی اللہ عنہ) ابوموسی اشعری (رضی اللہ عنہ) کی طرف۔ آپ پر سلامتی ہو۔ اما بعد:

بلاشبہہ محکمۂ قضاء انتہائی اہم ذمہ داری ہے۔ یہ ایک مسلسل عمل کا نام ہے۔ اچھی طرح سمجھ لو جب کسی دعوے کی دلیل پیش کی جائے تو اس پر خوب غور کرو۔ دعوے دار پر حق ثابت ہو تو اسے فوری انصاف فراہم کرو، ورنہ اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ اپنی مجلس میں لوگوں کے مابین کامل مساوات قائم رکھو تاکہ کوئی بڑا سردار تم سے ظلم کا ارتکاب نہ کرا سکے نہ کوئی کمزور شخص انصاف سے محروم رہے۔ دعوے دار کو لامحالہ ثبوت پیش کرنا چاہیے۔ اور مدعی علیہ پر قسم لازم ہے۔ مسلمانوں کے مابین ہر ممکن طور پر صلح جائز ہے۔ ہاں، وہ صلح ہرگز جائز نہیں جو حلال کو حرام اور حرام کو حلال کر دے۔ تم نے کسی مقدمے کا فیصلہ کر دیا ہو تو اگلے دن اس پر پھر غور کرو اور تنقیدی جائزہ لو۔ اگر تمھیں حق کی طرف راہنمائی مل جائے تو فوراً حق کی طرف پلٹ آؤ،

اس لیے کہ حق ہر اعتبار سے ہر چیز پر مقدّم ہے۔ حق ہی کی طرف ہمیشہ رجوع کرنا چاہیے۔ باطل پر اَڑ جانا ہٹ دھرمی ہے۔ ہر مسئلے کا حل قرآن و سنت میں تلاش کرو۔ ہر معاملے کا ثبوت قرآن و سنت ہی میں ڈھونڈو۔ ثبوت نہ ملے اور متعلقہ مسئلہ تمھارے سینے میں کھٹک رہا ہو تو اس کی کوئی اور نظیر تلاش کرو۔ مل جائے تو پیش آمدہ مسائل کو ان پر قیاس کرو۔ جو بات اللہ تعالیٰ کے زیادہ قریب اور حق سے زیادہ مشابہت رکھتی ہو اس پر اعتماد کرلو۔

کوئی مدعی ثبوتِ حق پیش کرنے کے لیے مہلت مانگے تو اسے مہلت ضرور دو۔ وہ ثبوت فراہم کردے تو اسے اس کا حق مہیا کرو۔ ثبوت نہ دے سکے تو اس کا دعویٰ خارج کردو۔ یہ طریق کار رفعِ شک اور اُلجھے ہوئے مسائل حل کرنے میں مفید ثابت ہوگا۔

تمام مسلمان عادل اور منصف مزاج ہیں۔ البتہ ایسا کوئی مسلمان جسے کسی شرعی حد کے لاگو ہونے پر کوڑے لگے ہوں یا جس نے جھوٹی گواہی دی ہو یا وہ بسلسلۂ وِلاء یا نسب متّہم ہو تو وہ قابلِ اعتماد نہیں۔ یقیناً اللہ تعالیٰ تمھارے باطن کا حال خوب جانتا ہے۔ اس نے تمھارے معاملات میں بذریعۂ ثبوت اور بذریعۂ قسم اپنے دفاع کا حق مرحمت فرمایا ہے۔ تمھیں اپنی طبیعت کی تنگی، اُکتاہٹ اور مقدمے کے کسی فریق سے کبھی نفرت کا اظہار نہیں کرنا چاہیے۔

جھگڑوں کا فیصلہ کرتے ہوئے ناگواری یا ناپسندیدگی کا مظاہرہ ہرگز نہ کرنا، کیونکہ حق دار کو اس کا حق پہنچانا اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اجر کا باعث ہے۔ اس عمل سے تمھاری حسنات میں اضافہ ہوگا۔ جس کی نیت کھری ہو اور وہ بے لاگ انصاف کرنے پر ڈٹا رہے، اللہ تعالیٰ اس کی اس طرح کفایت فرماتا ہے کہ اپنے سوا کسی کی کفایت کا محتاج نہیں رکھتا۔ جو قاضی لوگوں کا دباؤ پیشِ نظر رکھ کر ایسا فیصلہ کرے جو اس کے ضمیر کی آواز کے خلاف ہو، اللہ تعالیٰ اسے اسی دنیا ہی میں رسوا کردے گا اور اللہ کی رحمت اور رزق کے خزانے ایسے شخص کی رسائی سے بہت دور رہیں گے۔ والسلام‘‘

غور فرمائیے کہ یہ الفاظ آج سے چودہ سو سال پہلے لکھ دیئے گئے تھے۔ یہ الفاظ انھوں نے کسی کتاب سے نقل نہیں کیے، وہ انھیں قلم بند کرنے کے لیے کسی کی مدد کے محتاج نہیں ہوئے۔ یہ تحریر اُن کے اپنے تخلیقی ذہن کی آئینہ دار ہے جس نے ہزاروں فوائد یکجا کردیئے۔ دراصل یہ سب کچھ اُن ملفوظاتِ مبارکہ کی برکت ہے جو حضرت محمد ﷺ نے دار الارقم میں ان کے دل میں اتار دیئے تھے اور انھوں نے

جواباً کہا تھا:

"أَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنَّ مُحَمَّداً رَّسُوْلُ اللّٰهِ"[1]

''میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبودِ (برحق) نہیں ہے، اور بلاشبہہ حضرت **محمد** صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔''

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے مکاتیبِ گرامی میں سے ایک اہم مکتوب حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے نام بھی ارسال کیا گیا تھا۔ اُس میں انھوں نے تحریر فرمایا:

''یہ خط جو میں تمھیں تحریر کر رہا ہوں صرف بھلائی اور خیر خواہی پر مبنی ہے، میں نے اپنے اور تمھارے لیے خیر خواہی کی جستجو میں تمھاری طرف یہ خط لکھا ہے جس میں مَیں نے تمھارے اور اپنے لیے کوئی کوتاہی نہیں کی۔ پانچ عادتیں مضبوطی سے اپنا لو، تمھارا دین محفوظ ہو جائے گا اور تمھارا مقدّر جگمگا اٹھے گا۔

1 جب تمھارے پاس دو جھگڑنے والے آئیں تو انصاف پر مبنی دلائل پر توجہ دو اور مضبوط قسموں کو لازم پکڑو۔

2 کمزور آدمی کو اتنا قریب کر لو کہ اس کی زبان کی بندش کھل جائے اور وہ اطمینان سے کھل کر بات کرے اور دل کی ڈھارس پا کر مضبوط ہو جائے۔

3 اجنبی کا خیال رکھو، ایسا نہ ہو کہ اُس کا مقدمہ طوالت اختیار کر جائے اور وہ اپنا حق چھوڑ کر واپس چلا جائے۔

4 جو شخص اپنے حق کے لیے مقدمہ ہی دائر نہ کرے وہ یقیناً اپنا حق ضائع کر لے گا۔

5 اگر تم کسی مقدمے میں کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکو تو فریقین میں صلح کرانے کی کوشش کرو۔ والسلام۔''

اور جہاں جہاں قاضی تھے سب کے نام ایک ایک مکتوب لکھا۔

سیرتِ خلفاء رضی اللہ عنہم کا مطالعہ کرنے والا حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی حیاتِ طیبہ، ان کے خطوط، عدلیہ کے بارے میں اُن کے احکام، قاضیوں کے لیے وظائف، اُن کی معزولی، فیصلے کرنے کے طریقے، قاضی کی صفات، اُن کے واجبات، فیصلہ کرنے کے مصادر اور خود سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی بحیثیت جج انصاف کی ذمہ داری پوری کرنے کے طریقوں کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کر سکتا ہے۔

---

[1] أخبار عمر (ص: ۱۷٤)

قاضی کی صفات اور فرائض:

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی سیرتِ طیبہ کے مطالعے کی روشنی میں یہ بات بخوبی معلوم ہوجاتی ہے کہ جب سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کسی قاضی کا تقرر فرماتے تھے تو وہ ان کی کون کون سی خوبیوں کو پیشِ نظر رکھتے تھے۔

- احکامِ شرعیہ کا علم۔
- تقویٰ۔
- قناعت۔
- ذہانت۔
- سختی اور نرمی کا امتزاج۔
- بارعب شخصیت۔
- مال داری اور حسب ونسب۔

قاضی کے فرائض:

- اخلاص۔
- مقدمے کا باریک بینی سے جائزہ۔
- اسلامی شریعت کے مطابق فیصلہ۔
- مشورہ۔
- مساوات کا برتاؤ۔
- کمزور کی حوصلہ افزائی۔
- دور سے آنے والے کا فیصلہ جلدی سے نمٹانا۔
- فیصلے پر اثر انداز ہونے والے امور سے اجتناب۔
- عالی ظرفی۔
- ظاہر پر فیصلہ کرنا۔
- حتی الامکان صلح کی کوشش کرنا۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کسی بھی مقدمے کا حتمی فیصلہ کرنے سے پہلے دونوں فریقوں کو صلح کا موقع دو کیونکہ حتمی فیصلے بعض اوقات بعد میں باہمی دشمنی، بُغض اور کینے کا سبب بنتے ہیں۔

- حق کی طرف رجوع۔
- جرم ثابت نہ ہونے تک ملزم کو بَری سمجھنا۔
- نص کے مقابلے میں اجتہاد نہ ہو۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ایک قاضی کو تاکید فرمائی: جب تمھارے پاس کوئی مقدمہ آئے تو اس پر بار بار غور کرو، اگر قرآن وسنت سے کوئی واضح نص نہ ملے تو پھر قیاس سے کام لو۔ یہ قاضیوں کی ذمہ داری میں شامل تھا کہ جو بھی انصاف کی دہلیز پر آئے، اپنا حق ضرور پائے۔ یہ وہ صفات ہیں جن کا التزام قاضی کے لیے بہت ضروری ہے۔

عدالتی احکام کی نگرانی:

رسالت مآب ﷺ ہی کے عہدِ مبارک سے دینی احکام و قوانین اور عدالتی فیصلوں کی پابندی کا اہتمام و التزام پوری لفظی و معنوی شان و شوکت کے ساتھ کرنا، مسلمانوں کی فطرتِ ثانیہ بن گیا تھا۔ خاص طور پر عمّال و حکّام سب سے پہلے اور سب سے زیادہ خود اُن فیصلوں پر عمل کرتے تھے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ امیر المومنین تھے۔ اس حوالے سے وہ سب سے زیادہ اسلامی احکام وقوانین کی پابندی فرماتے تھے۔ دل و جان سے عدالتی فیصلے تسلیم کرتے تھے۔ وہ ہر برحق فیصلے پر بہت خوش ہوتے تھے اور فیصلہ کرنے والے قاضی کی تعریف فرمایا کرتے تھے، چاہے فیصلہ خود اُنھی کے خلاف ہوتا، وہ اسے خوش دلی سے مان لیتے تھے اور فیصلہ کرنے والے کو انتہائی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

عدالتی فیصلوں کے مصادر:

خلفائے راشدین کے عہدِ زرّیں میں عدالتی فیصلوں کے لیے بنیادی مصادر، یعنی کتاب اللہ، سنت رسول ﷺ اور اجتہاد کی طرف ٹھیک اُسی طرح رجوع کیا جاتا تھا جس طرح رسول اللہ ﷺ کے مبارک زمانے میں معمول تھا لیکن خلفائے راشدین کے عہد میں دو نئی باتیں سامنے آئیں: اجتہاد کے امکانات بڑھ گئے اور اس کے مطابق عمل کرنے کا طریقۂ کار بھی ترقی کر گیا۔

اجتہادی مسئلے میں کسی فیصلے تک پہنچنے کے لیے سب سے پہلے تمہیدات قائم کی جاتی تھیں۔ تمہیدات کے مختلف مراتب پر غور ہوتا اور پھر نتائج پر پہنچنا پڑتا تھا۔ خلافتِ راشدہ میں مجلسِ شوریٰ (باہمی مشورے کا عمل) کے علاوہ اجماع، رائے اور قیاس جیسے جدید مصادر معرضِ وجود میں آئے۔ یہ عہدِ نبوی ﷺ میں نہیں تھے۔ یہ وہ مصادر تھے جو ایک خلیفۂ راشد کے عہد سے دوسرے خلیفہ کے زمانۂ مبارک تک بتدریج معرضِ وجود میں آئے، یوں خلافتِ راشدہ میں مصادر کی ترتیب یہ قرار پائی:

1. قرآن۔
2. سنتِ رسول ﷺ۔
3. اجماع۔
4. اجتہاد۔
5. قیاس۔
6. وہ فیصلے جو ابتدائی دور میں کیے گئے۔

مختلف مسائل اور طرح طرح کے مقدمات کے فیصلوں کے لیے باہمی مشورے سے انھی مصادر کی طرف رجوع کیا جاتا تھا۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا اپنے گورنروں سے سلوک

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں ریاست کی حدود دُور دُور تک پھیل گئیں تو انھوں نے نظامِ خلافت کو بہتر طریقے سے چلانے اور ذرائع آمدنی کی مؤثر نگرانی کے لیے مملکت کو بڑے بڑے انتظامی حصوں میں تقسیم کر دیا اور تمام دور افتادہ علاقوں میں اپنے گورنر مقرر کیے۔

صوبہ جات:

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں ریاست کے مختلف صوبوں کی تقسیم اُسی طرح تھی جس طرح حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں تھی۔ اُن میں صرف اتنا فرق پیدا ہوگیا کہ یہ علاقے پہلے سے زیادہ پھیل گئے اور وقتاً فوقتاً اُن علاقوں کے قائدین کے عُہدوں میں تبدیلیاں کی گئیں۔

مکہ مکرّمہ:

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں مکہ مکرمہ کو ریاست کے اہم ترین صوبوں میں سے انتہائی اہم صوبہ شمار کیا جاتا تھا۔ اس صوبے کا اسلامی ریاست میں سب سے بلند مقام تھا۔

مدینہ منورہ:

مدینہ منورہ کا بلا واسطہ گورنر خود خلیفۂ وقت ہوتا تھا کیونکہ خلیفہ کی رہایش مدینہ میں تھی۔ جب سیدنا عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو مدینہ سے باہر کے دَوروں کے وقت وہ مدینہ منورہ کے امور کی نگرانی کے لیے اپنا نائب مقرر فرما دیتے تھے۔ انھوں نے کئی دفعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھی اپنا نائب مقرر فرمایا۔[1]

طائف:

سیدنا عمر کے دورِ خلافت میں طائف کو ریاست کا بہت اہم صوبہ ہونے کا درجہ حاصل تھا۔ اہلِ طائف نے اسلام کے طاقتور دشمنوں کے خلاف جہادی تحریک میں بڑا اہم کردار ادا کیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے زمانۂ مبارک سے طائف کی گورنری پر حضرت عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ مامور تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو عُمان اور بحرین کے علاقوں میں اہم ذمہ داری سونپ دی۔[2]

---

[1] تاريخ اليعقوبي (٢/ ١٤٧)

[2] تاريخ خليفه بن خياط (ص: ١٣٤)

یمن:

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ مسندِ خلافت پر متمکن ہوئے تو اُس وقت یمن کا علاقہ انتہائی پرسکون تھا۔ یمن کا انتظام زیادہ خوش اسلوبی سے چلانے کے لیے یمن کو کئی حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا اور ہر علاقے کا الگ الگ مستقل ذمہ دار ہوتا تھا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے وہاں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی کے مقرر کردہ عمّال کو برقرار رکھا۔[1] یمن سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں اسلامی ریاست کا بہت اہم صوبہ تھا۔ اُس دور میں دوسرے صوبوں کی نسبت یمن کا کردار قابلِ ستایش رہا۔[2]

بحرین:

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ جب مسندِ خلافت پر بیٹھے تو اُس وقت بحرین کے گورنر حضرت علاء بن حضرمی رضی اللہ عنہ تھے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے انھیں اپنے منصب پر بدستور بحال رکھا۔ راجح قول کے مطابق وہ ۱۴ ہجری تک بحرین کے گورنر رہے۔[3]

بصرہ کے امیر:

بصرہ شہر کی آباد کاری سے پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت شُریح بن عامر رحمہ اللہ کو ان علاقوں کی طرف بھیجا۔ حضرت شُریح رحمہ اللہ کا تعلق بنوسعد بن بکر سے تھا۔ انھیں حضرت قطبہ بن قتادہ رحمہ اللہ کی مدد کے لیے روانہ کیا گیا تھا۔ پھر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے انھیں بصرہ کے علاقوں کا والی مقرر کر دیا۔ حضرت شُریح رحمہ اللہ بعد ازاں ایک معرکے میں شہید ہو گئے۔[4]

کوفہ کے امیر:

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ وہ پہلے شخص تھے جو کوفہ شہر کی تعمیر کے بعد کوفہ کے اولین گورنر بنے۔ انھوں نے ہی کوفہ شہر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے حکم سے بسایا تھا۔ اُن کی گورنری کوفہ اور اُس کے اردگرد علاقوں پر محیط تھی۔ جب کوفہ شہر با قاعدہ تعمیر ہو گیا تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ ہی کوفہ کے والی مقرر ہوئے۔ انھوں نے اپنی ذمہ داری

---

[1] غاية الأماني في أخبار القطر اليماني ليحيىٰ بن الحسين (١/ ٨٣)

[2] الولاية على البلدان، د. عبد العزيز العمرى (١/ ٧١)

[3] الولاية على البلدان (١/ ٧٥)

[4] تاريخ خليفه بن خياط (ص: ١٥٥)

بحسن وخوبی نبھائی۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے کوفہ میں مقیم ہونے کے بعد بہت سے ایرانی علاقوں میں فتوحات حاصل ہوئیں۔[1]

مدائن کے امیر:

مدائن کسریٰ کا دار الحکومت تھا، اسے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے فتح کیا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ وہاں کچھ مدت ٹھہرے۔ اور جب کوفہ کا قیام عمل میں آیا تو وہاں تشریف لے گئے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی فوج میں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ وہ ایرانیوں کے خلاف بہت سی جنگوں میں شریک رہے۔ قتال سے پہلے اہلِ ایران کو اسلام کی دعوت دینے میں ان کا کردار انتہائی اہم تھا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کو مدائن کی گورنری عطا فرمائی۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے اہلِ مدائن کے ساتھ مثالی حسنِ سلوک کا مظاہرہ کیا۔ وہ معاشرے میں اسلامی شعائر کی اصلی اور عملی تعبیر تھے۔

ذکر کیا جاتا ہے کہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ مدائن کی گورنری قبول کرنے سے بار بار انکار کرتے رہے، استعفاء بھی پیش کیا لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قبول نہ فرمایا۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ زہد و قناعت کا مجسّمہ تھے۔ صوف (اون) کے کپڑے زیب تن فرماتے تھے۔ اپنے گدھے پر بغیر پالان کے صرف ایک کملی رکھ کر سوار ہو جاتے تھے۔ جَو کی روٹی تناول فرماتے تھے۔ انتہائی عابد و زاہد تھے۔[2]

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ مسلسل مدائن ہی میں مقیم رہے حتیٰ کہ راجح قول کے مطابق ۳۲ ہجری کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں رحلت فرما گئے۔

گورنر مقرر کرنے کے لیے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے قواعد اور شرائط

① علم:

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ فوج کے سپہ سالاروں کے تقرر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی سنت پر عمل کرتے تھے۔ علّامہ طبری روایت بیان فرماتے ہیں: بلاشبہ امیر المؤمنین کے روبرو جب اہلِ ایمان مجاہدین کے لشکر جمع ہوتے تو وہ علم و فقہ میں فوقیت رکھنے والے فرد ہی کو سپہ سالار مقرر فرماتے تھے۔[3]

---

[1] فتوح البلدان (ص: ۱۳۹)

[2] مروج الذهب (۲/ ۳۰٦)

[3] نظام الحكم في الشريعة والتاريخ الإسلامي (۱/ ٤۷۹)

② بصیرت:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایسے لوگوں کو عامل مقرر فرماتے تھے جو مطلوبہ سرکاری اور عوامی امور میں سب سے زیادہ صاحبِ بصیرت ہوتے تھے۔ اس سلسلے میں وہ اصحابِ فضیلت کی پروا نہ کرتے تھے۔[1]

③ دیہاتی اور شہری کا فرق:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ عامل کا چناؤ کرتے وقت جن امور کا بطورِ خاص خیال رکھتے تھے، اُن میں سے ایک امر یہ بھی تھا کہ وہ دیہی فرد کو شہری امور کی ذمہ داری نہیں سونپتے تھے۔[2]

④ رعایا پر شفقت اور مہربانی:

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سرکاری عہدوں پر موزوں اور مناسب افراد کا تقرر کرتے ہوئے ان میں مہربانی کا جذبہ بھی تلاش کرتے تھے۔ انھوں نے متعدد مرتبہ جہادی سپہ سالاروں کو حکم دیا کہ وہ انتہائی احتیاط اور سوجھ بوجھ سے کام لیں۔ مسلمان سپاہ کو کسی خطرناک اور تباہ کن راستے پر نہ چلائیں اور نہ کسی ایسی جگہ پڑاؤ کا حکم دیں جہاں ہلاکت کا خطرہ ہو۔

⑤ اقرباء پروری سے اجتناب:

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے اپنے قریبی عزیزوں اور رشتہ داروں میں بہت سے ایسے افراد موجود تھے جو اعلیٰ مناصب وعہدوں کو سنبھالنے کی بھرپور اہلیت رکھتے تھے، مزید برآں انھیں اسلام میں مسابقت کا اعزاز بھی حاصل تھا۔ اس کے باوجود سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی انتہائی کوشش ہوتی تھی کہ وہ اپنے کسی رشتہ دار کے بجائے کسی غیر کو ہی والی مقرر کریں۔ اُن کے چچا زاد حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ اور بیٹے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کوئی بھی ریاستی ذمہ داری نبھانے کے پوری طرح اہل تھے لیکن انھوں نے اپنے عزیزوں میں سے کسی کو کوئی سرکاری ذمہ داری سونپنی گوارا نہ کی۔

⑥ غیر مسلموں سے سرکاری کام لینے سے گریز:

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے پاس شام کے علاقے سے فتح کی خوش خبری آئی۔ انھوں نے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ

[1] المدينة النبويه، فجر الإسلام (٢/ ٥٦)

[2] نظام الحكم في الشريعه والتاريخ الإسلامي (١/ ٢٨٢)

کو حکم دیا: ''اپنے کاتب کو حکم دو کہ اس (خوشی کے) پیغام کو مسجد میں سب کے سامنے پڑھ کر سنائے۔'' حضرت ابو موسی رضی اللہ عنہ نے عرض کی: کاتب مسجد میں داخل نہیں ہوسکتا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کیوں؟ کیا وہ جنبی ہے؟ حضرت ابو موسی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: نہیں، وہ نصرانی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو موسی رضی اللہ عنہ کو ڈانٹا اور فرمایا: نصرانیوں کو قریب نہ کرو، جبکہ اللہ تعالیٰ نے انھیں دور کر دیا ہے۔ انھیں عزت نہ بخشو، جبکہ اللہ نے انھیں ذلیل کر دیا ہے اور انھیں امانت دار مت سمجھو، جبکہ اللہ نے انھیں خائن قرار دے دیا ہے۔ میں نے تمھیں اہلِ کتاب کو کوئی ذمہ داری سونپنے کی اس لیے ممانعت کر رکھی ہے کہ یہ لوگ رشوت کو حلال سمجھتے ہیں۔[1]

حکّام کے فرائض

① اسلامی احکام کا نفاذ:

اسلامی احکام کے نفاذ میں نماز کا قیام، دین اور اصولِ دین کی حفاظت، مساجد کی تعمیر، امورِ حج میں آسانیاں پیدا کرنا، اسلامی روایات کو فروغ دینا اور شرعی حدود کا نفاذ سرِفہرست تھے۔

اسلامی تعلیمات کا فروغ:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دورِ خلافت عظیم فتوحات کا دَور تھا۔ اُن فتوحات کی بدولت بہت سے وسیع علاقے اسلامی مملکت میں شامل ہوگئے۔ وہاں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم کو گورنر مقرر فرمایا۔ مفتوحہ علاقوں کے حکّام اور وہاں موجود دیگر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے شدّت سے یہ ضرورت محسوس فرمائی کہ ان مفتوحہ علاقوں کے باشندوں کو اسلامی تعلیمات سے روشناس کرانا بے حد ضروری ہے۔

شام کے والی حضرت یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو لکھا: شام کے علاقوں میں لوگ بکثرت مسلمان ہورہے ہیں۔ آبادیاں گنجان ہورہی ہیں۔ اُن لوگوں کو قرآنِ کریم کی تعلیم اور دینی مسائل سے آگاہ کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ آپ ایسے افراد روانہ فرما کر میری مدد کریں جو اُن لوگوں کو قرآنِ کریم پڑھائیں اور دینی مسائل کی تعلیم دیں۔ یہ مکتوب پڑھ کر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے پانچ فقہاء صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو شام روانہ کر دیا۔[2]

---

[1] بدائع السالك (٢/ ٢٧)

[2] سير أعلام النبلاء (٢/ ٢٤٧)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بہت سے معلّم صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اسلامی مملکت کے مختلف علاقوں میں بھیجے اور انھوں نے ان علاقوں میں مشہور علمی مدارس قائم کیے۔

② نماز کے قیام کا باقاعدہ نظام بنایا۔

③ دین اور اصولِ دین کی حفاظت کا مکمل اہتمام کیا۔

④ مساجد کی تعمیر کی۔

⑤ حج کے لیے آسانیاں:

خلافتِ راشدہ کے دور میں عمّال و حکّام امورِ حج میں آسانیاں پیدا کرنے، مطلوبہ سہولتیں فراہم کرنے اور حُجّاج کی سلامتی کو یقینی بنانے کے ذمہ دار ہوتے تھے۔ عمّال اپنی طرف سے حج کے امیر مقرر کرتے تھے۔ خود سیدنا عمر رضی اللہ عنہ لوگوں کے لیے سفرِ حج کے اوقات متعیّن فرماتے تھے اور حکم دیتے تھے کہ حُجّاج اپنے علاقے کے عامل کے حکم کے بغیر کوچ نہ کریں۔

⑥ شرعی حدود کا نفاذ کیا جاتا تھا۔

⑦ امن وامان کا استحکام بنیادی ضرورت قرار دیا گیا۔

⑧ جہاد فی سبیل اللہ کو واقعی اسلام کی چوٹی بنایا گیا۔

⑨ قلعوں کی تعمیر کی گئی۔

⑩ دشمن کی جاسوسی کا نظام طے کیا۔

⑪ گھوڑوں کی فراہمی کا سلسلہ مقرر ہوا۔

⑫ افواج کی مسلسل رجسٹریشن کی جاتی تھی۔

⑬ معاہدوں کی پاسداری پر پوری طرح عمل کیا جاتا تھا۔

⑭ بروقت وظائف کی فراہمی:

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا: اگر اللہ مجھے سلامت رکھے تو ان شاء اللہ میں عراق کی سرزمین میں بسنے والی بیواؤں کو اتنا خود کفیل بنادوں گا کہ میرے بعد وہ کسی کی محتاج نہیں رہیں گی۔

⑮ عمّال اور سرکاری ملازمین کا تقرر عمل میں آیا۔

⑯ اقلیتوں کے حقوق کی مکمل پاسداری ہوا کرتی تھی۔

⑰ ذی شعور افراد سے مشورہ اور قوم کے نمائندہ افراد کی دادرسی کی جاتی تھی۔

⑱ علاقائی آبادکاری کی ضرورت پر نظر رکھی جاتی تھی۔

⑲ معاشرتی ظروف واحوال کی رعایت کی جاتی تھی۔

⑳ مساوات پر عمل کیا جاتا تھا۔

㉑ اسلامی ممالک میں ترجمانوں کی ضرورت پوری کی جاتی اور گورنروں کے اوقاتِ کار تقرر کیا جاتا تھا۔

㉒ حکّام کی کڑی نگرانی کے اقدامات کیے گئے تھے:

❁ **مدینے میں دن کے وقت داخلے کا حکم:** سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا اپنے عمّال و حکّام کو حکم تھا کہ جب وہ مدینہ میں آئیں تو رات کو نہ آئیں تاکہ معلوم ہو سکے کہ وہ اپنے ساتھ کس قدر مال و متاع اور غنائم لے کر آئے ہیں۔ اس طرح وہ ان کا آسانی سے محاسبہ کر لیتے تھے۔[1]

❁ **محکمۂ ڈاک:** سیدنا عمر رضی اللہ عنہ مختلف شہروں کے عمّال کی طرف ڈاکیے بھیجتے تھے۔ ڈاکیوں کو حکم تھا کہ جب تم میرے پاس واپس آنے لگو تو ہرکاروں کے ذریعے سے عوام الناس میں بابانگِ دہل اعلان کراؤ کہ جو شخص امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کی خدمت میں اپنا پیغام بھیجنا چاہے تو اپنا مکتوب ہمارے حوالے کر دے۔

❁ **انسپکٹر جنرل کا تقرر:** حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حکّام کے محاسبے کے لیے حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کو انسپکٹر جنرل مقرر فرمایا تھا۔ وہ اُن سے حکّام کی نگرانی کا کام لینے کے ساتھ ساتھ ان شکایات کی تحقیق بھی فرماتے جو حکّام کے خلاف ان تک پہنچتی تھیں۔

❁ **موسمِ حج میں گورنروں کا احتساب:** سیدنا عمر رضی اللہ عنہ حکّام کے احتساب اور رعایا کے حالات کی خبر گیری کے لیے موسمِ حج کو نہایت اہم موقع سمجھتے تھے۔

❁ **صوبوں کا تفتیشی دَورہ:** سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اپنی شہادت سے چند دن پہلے یہ ارادہ ظاہر فرما رہے تھے کہ وہ پوری مملکتِ اسلامیہ کے ہر علاقے کا ذاتی طور پر تفتیشی دورہ کریں گے اور ہر علاقے کے حکّام اور عوام کے احوال اور معاملات و مسائل کا خود جائزہ لیں گے۔ خاص طور پر انتظامی اور سرکاری امور کے طریقِ کار کے بارے میں خود اطمینان حاصل کریں گے۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے مزید فرمایا تھا: اگر میں زندہ رہا تو ان شاء اللہ ایک سال میں مَیں اسلامی مملکت

[1] فن الحکم (ص: ١٧٤)

کے علاقوں کا چکر لگاؤں گا۔ مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ بہت سے لوگوں کی حاجات و شکایات مجھ تک نہیں پہنچ پاتیں۔ وہ لوگ خود میرے پاس آسکتے ہیں نہ ان کے حکّام ان کی درخواستیں مجھ تک پہنچاتے ہیں۔ میں شام میں دو مہینے، کوفہ میں دو مہینے اور آخر میں بصرہ میں دو مہینے قیام کروں گا۔ اللہ کی قسم! پھر یہ سال میرے لیے کتنا خوشگوار ثابت ہوگا۔[1]

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے اس پروگرام کو کسی حد تک عملی جامہ پہنادیا۔ وہ کئی مرتبہ شامی علاقوں میں گئے۔ وہاں کے احوال کا جائزہ لیا اور متعلقہ عمّال و حکّام کے گھروں کا دورہ فرمایا تاکہ وہ اُن عمّال کا قریب سے گہرا جائزہ لے سکیں۔[2]

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ ہنگامی دورہ کرتے تھے۔ وہ اچانک مطلوبہ لوگوں تک پہنچ جاتے تھے۔ ان کے ساتھ ہمیشہ ایک آدمی رہتا تھا۔ وہ مطلوبہ گھر کا دروازہ کھٹکھٹاتا تھا اور گھر کے مالک سے کہتا تھا کہ مجھے اور میرے ہمراہی کو اپنے گھر آنے کی اجازت دیجئے۔ وہ یہ نہیں بتاتا تھا کہ میرے ساتھ امیر المؤمنین آئے ہیں۔ اجازت ملنے پر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ گھر میں داخل ہوجاتے اور ناقدانہ نگاہوں سے پورے گھر اور اس میں موجودہ سامان کا جائزہ لیتے تھے۔[3]

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ ذاتی نگرانی کے علاوہ حکّام و عمّال کو پرکھنے کے کئی اور طریقے بھی استعمال فرماتے تھے۔ اس طرح سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے شام کے سفر کے دوران میں دوسرے عمّال سے بھی ایسا ہی سلوک کیا اور ان کا امتحان لیتے رہے۔

سرکاری امور کا ریکارڈ:

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ عمومی طور پر پوری ریاستِ اسلامیہ کا ضروری سرکاری ریکارڈ محفوظ کرنا چاہتے تھے۔ وہ ان معاہدوں کے مسودے خاص طور پر محفوظ رکھنا چاہتے تھے جو متعلقہ علاقوں کے عمّال اور مفتوحہ علاقوں کے لوگوں کے مابین طے پاتے تھے تاکہ کسی پر کوئی ظلم نہ ہو۔

تاریخ بتاتی ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اس سلسلہ میں بڑا صندوق رکھا ہوا تھا۔ اس میں طے پانے

[1] تاريخ الطبري (٥/ ١٨) الولاية على البلدان (١/ ١٦١)

[2] الولاية على البلدان (١/ ١٦١)

[3] تاريخ المدينة (٣/ ٨٣٧)

والے تمام معاہدوں کے مسودے محفوظ کیے جاتے تھے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی طرح صوبائی حکام و عمال مختلف دستاویزات اور معاہدوں کو محفوظ رکھتے تھے تاکہ بوقتِ ضرورت ان کی طرف رجوع کیا جاسکے اور سرکاری امور میں کوئی گڑبڑ نہ ہو۔[1]

گورنروں کے بارے میں رعایا کی شکایات:

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اپنے عمال کے خلاف کی گئی شکایتوں کی بنفسِ نفیس تحقیق فرماتے تھے۔ وہ مکمل طور پر معاملے کی تہہ تک پہنچنے کے خوگر تھے۔ اس سلسلے میں اصحابِ رائے اور اپنے اردگرد موجود افراد سے مشورہ کرتے تھے۔ معاملے کا باریک بینی سے جائزہ لیتے تھے، پھر کسی نتیجے پر پہنچتے تھے اور قصوروار کو چاہے وہ عامل ہو یا عام آدمی سزا دیتے تھے۔[2]

حضرت عَمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے خلاف اہلِ مصر کی شکایت:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت عَمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی انتہائی دور اندیشی سے نہایت کڑی نگرانی کرتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مصر کے بہت سے معاملات میں دخل اندازی کرتے تھے۔ جب حضرت عَمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے ایک منبر بنوایا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انھیں لکھا: مجھے اطلاع ملی ہے کہ تم نے ایک منبر بنوایا ہے، اس پر چڑھ کر تم لوگوں کی گردنوں سے بلند ہونا چاہتے ہو، کیا تمھارے لیے اتنا کافی نہیں کہ تم کھڑے ہوکر خطاب کرو اور لوگ تمھاری ایڑی کے پاس ہوں؟ میں حکم دیتا ہوں کہ منبر فوراً توڑ ڈالو۔[3]

حضرت سعید بن عامر رضی اللہ عنہ کے خلاف اہلِ حمص کی شکایت:

حضرت خالد بن معدان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حمص میں حضرت سعید بن عامر جُمَحی رضی اللہ عنہ کو ہمارا گورنر مقرر فرمایا۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ حمص تشریف لائے تو دریافت فرمایا: اے حمص والو! تمھارے گورنر کا کیا حال ہے؟ یہ سنتے ہی حمص والوں نے حضرت سعید بن عامر رضی اللہ عنہ کے خلاف شکایات شروع کر دیں۔ شکایات کے معاملے میں حمص کو چھوٹا کوفہ کہا جاتا تھا۔ اہلِ حمص نے کہا: ہمیں ان سے چار شکایات ہیں:

---

[1] الولاية على البلدان (١/ ١٦٣)

[2] الإدارة الإسلامية في عهد عمر بن الخطاب (ص: ٢٢٣)

[3] فتوح مصر وأخبارها أبو القاسم ابن عبد الحَكم (ص: ٩٢)

(۱) ان میں سے ایک یہ ہے کہ سعید رضی اللہ عنہ ہمارے پاس دن چڑھے پہنچتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ تو بہت ہی بڑی کوتاہی ہے۔

(۲) دوسری کون سی شکایت ہے؟ انھوں نے کہا کہ یہ رات کو کسی کی بات نہیں سنتے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ بھی بڑی کوتاہی کی بات ہے۔

(۳) تیسری کونسی شکایت ہے؟ انھوں نے کہا: یہ مہینے میں ایک دن ہمارے پاس بالکل نہیں آتے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ بھی بڑی کوتاہی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پھر پوچھا:

(۴) علاوہ ازیں چوتھی کونسی شکایت ہے؟ انھوں نے کہا: ان پر غشی کا دورہ پڑ جاتا ہے اور یہ اپنے حواس کھو بیٹھتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت سعید رضی اللہ عنہ اور شکایت کرنے والوں کو ایک جگہ اکٹھا کیا اور فرمایا: اے اللہ! آج کے دن حضرت سعید رضی اللہ عنہ کے بارے میں میری رائے غلط ثابت نہ ہونے دے، پھر مقدمے کی سماعت شروع ہوئی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شکایت کرنے والوں سے حضرت سعید رضی اللہ عنہ کے رُوبرو فرمایا: تمھاری سعید رضی اللہ عنہ کے بارے میں کیا شکایات تھیں؟ انھوں نے کہا: یہ دن چڑھے ہمارے پاس پہنچتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت سعید رضی اللہ عنہ سے فرمایا: تمھارا کیا جواب ہے؟ حضرت سعید رضی اللہ عنہ نے عرض کی: اللہ کی قسم! میں اس کا سبب بتانا پسند نہیں کرتا تھا۔ درحقیقت میری اہلیہ کا کوئی خادم نہیں ہے۔ میں خود آٹا گوندھتا ہوں، جب اس میں خمیر آجاتا ہے تو روٹی پکاتا ہوں، پھر وضو کرتا ہوں اور ان کے پاس آجاتا ہوں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شکایت کرنے والوں سے دوبارہ فرمایا: بتاؤ اور کیا شکایت تھی؟ انھوں نے کہا: یہ رات کو ہماری بات نہیں سنتے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت سعید رضی اللہ عنہ سے فرمایا: بتاؤ، کیا جواب ہے؟ انھوں نے فرمایا: میں اس کا سبب بتانا بھی پسند نہیں کرتا تھا۔ درحقیقت میں نے اپنا دن ان لوگوں کے لیے اور رات اپنے اللہ کے لیے وقف کر رکھی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ پھر لوگوں سے مخاطب ہوئے، فرمایا: تمھیں مزید کیا شکایت تھی؟ انھوں نے کہا: یہ مہینے میں ایک دن ہمارے پاس نہیں آتے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت سعید رضی اللہ عنہ سے جواب طلب فرمایا تو انھوں نے عرض کی: میرا کوئی خادم نہیں جو میرے کپڑے دھوئے، نہ میرے پاس موجودہ کپڑوں کے علاوہ اور کپڑے ہیں۔ مَیں خود ہی کپڑا دھوتا ہوں، سوکھنے کا انتظار کرتا ہوں، پھر شام کے وقت ان کے پاس آتا ہوں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں سے مزید شکایت دریافت

فرمائی۔انھوں نے کہا کہ یہ اچانک بے ہوش ہوجاتے ہیں اور حواس کھو بیٹھتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت سعید رضی اللہ عنہ سے اس بات کی بھی جواب طلبی کی۔تو انھوں نے کہا: دراصل میں حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کو مکہ میں سولی دیتے وقت وہاں موجود تھا۔مشرکین نے حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کے جسم کے ٹکڑے کر دیئے تھے۔ اور جب انھیں سولی پر بلند کیا تھا تو کہا تھا: اے خبیب! کیا تجھے پسند ہے کہ اس وقت تیری جگہ (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہوتے۔حضرت خبیب رضی اللہ عنہ نے فوراً فرمایا تھا: اللہ کی قسم! میں تو یہ بھی گوارا نہیں کرتا کہ مَیں اپنے گھر میں اپنے بال بچوں کے ساتھ خوش رہوں جبکہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پائے مقدّس میں ایک کانٹا بھی چُبھے، پھر انھوں نے بلند آہنگ نعرہ لگایا: اے ہمارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے جب بھی وہ دن یاد آتا ہے میں کانپ اٹھتا ہوں، حالانکہ اُن دِنوں میں مشرک تھا اور اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں رکھتا تھا لیکن بحیثیت انسان میں نے حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کی کوئی مدد نہیں کی۔ اس بے حِسّی پر مجھے یہ گمان گزرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ میرے اُس گناہ کو کبھی معاف نہیں فرمائے گا۔اس کے نتیجے میں مجھ پر بے ہوشی طاری ہوجاتی ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تمام تعریفیں اُس معبودِ برحق کے لیے ہیں جس نے (حضرت) سعید رضی اللہ عنہ کے بارے میں میری رائے کو غلط ثابت نہیں کیا، پھر حضرت سعید رضی اللہ عنہ کی خدمت میں ایک ہزار (۱۰۰۰) دینار ارسال فرمائے اور تاکید کی کہ اپنے حالات کو بہتر بنانے میں اس رقم سے مدد لو۔حضرت سعید رضی اللہ عنہ نے وہ تمام دینار فی سبیل اللہ خرچ کر دیے۔

عہدِ عمر رضی اللہ عنہ میں حکّام کو دی جانے والی سزائیں

حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی اپنے عمّال کی کڑی نگرانی کے نتیجے میں عمّال کی بہت سی کوتاہیاں سامنے آئیں۔

قصاص اور دیت:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اکثر فرمایا کرتے تھے: خبردار! میں نے اپنے عمّال کو لوگوں کی جان و مال کا دشمن بنا کر نہیں بھیجا بلکہ اس لیے بھیجا ہے کہ یہ لوگوں کو دین اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سکھلائیں۔ اگر کوئی عامل اس فرض سے ہٹ کر کوئی غلط اقدام یا ناروا سلوک کرے تو متاثرہ آدمی میرے پاس آجائے، مَیں اُسے اس عامل سے قصاص لے کر دوں گا۔[1]

[1] السنن الكبرىٰ للبيهقي (٨/ ٤٨) الولاية على البلدان (٢/ ١٢٧) الاموال لأبي عبيد قاسم بن سلام (٤٣ـ ٦٤)

کوڑے مارنا:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کوڑا ہمیشہ ساتھ رکھتے تھے۔ وہ اِس سے لوگوں کو ادب سکھانے کے لیے مشہور تھے۔ انھوں نے اس کوڑے سے بعض خطا وار عُمّال کو بھی مارا۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ شام گئے تو ایک عامل کے گھر پہنچے۔ وہاں انھوں نے بڑی مقدار میں ساز و سامان پایا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سخت ناراض ہوئے اور اس عامل کی کوڑے سے پٹائی کردی۔

مالی احتساب:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں مالی احتساب احتیاطی تدابیر کے طور پر کیا جاتا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے چند عُمّال کے پاس مال میں اضافہ ہوتے دیکھا تو وہ بہت گھبرائے۔ انھیں اندیشہ ہوا کہ مبادا یہ مال عُمّال نے اپنے منصب کی وجہ سے حاصل کیا ہو۔

سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی معزولی:

اسلام کے دشمن نہایت کینہ پرور تھے۔ مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ انھوں نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے مابین پیش آمدہ وقائع کو بیان کرنے والی روایات کا غلط مطلب نکالا اور ان کے کردار کو داغ دار کرنے کی کوشش کی۔ جب وہ اپنے اس مذموم مقصد میں کامیاب نہ ہوئے تو انھوں نے کئی روایات خود گھڑ لیں تاکہ ایسی من گھڑت روایات کو بنیاد بنا کر پڑھنے والوں کے ذہنوں میں غلط فکر داخل کی جائے اور راویوں کی منقولات اور مؤلفین کی کتب سے پیدا ہونے والے اشکالات کو ایک بنیاد فراہم کردی جائے۔

اسلام کے دشمنوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی پاکیزہ تاریخ و کردار کو داغدار کرنے کے لیے خود ساختہ روایات پھیلائیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف سے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو معزول کرنے کے اسباب کا غلط مطلب نکالا، اُن دونوں ہستیوں پر بے بنیاد الزامات لگائے اور اس سلسلے میں ایسی روایات کا سہارا لیا جن کا سرے سے کوئی وجود ہی نہ تھا۔ ایسی روایات اُن دونوں عظیم ہستیوں کے بارے میں پاکیزہ علمی تحقیق کے مقابلے میں کوئی وقعت نہیں رکھتیں۔[1]

[1] أباطيل يجب ان تُمحىٰ من التاريخ لإبراهيم شعوط (ص: ١٢٣)

اب ہم آپ کے سامنے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی معزولی کا پورا واقعہ بے کم و کاست پیش کرتے تھے۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی معزولی دو دفعہ ہوئی اور اس معزولی کے بڑے معقول اسباب تھے۔

پہلی دفعہ معزولی:

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے پہلی مرتبہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو ۱۳ھ ہجری میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد خلافت کا منصب سنبھالتے ہی معزول کر دیا۔ اس معزولی کا اطلاق فوج کی قیادت اور شام کی گورنری دونوں عہدوں پر کیا گیا۔ اس معزولی کا اصل سبب یہ تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو مشورہ دیا کہ آپ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو پابند کریں کہ وہ آپ کی مرضی اور مشورہ کے بغیر کسی کو کوئی بکری، اونٹ یا کوئی بھی چیز عطا کرنے کے مجاز نہیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یہ حکم نامہ لکھ کر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو ارسال کر دیا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: یا تو آپ مجھے بااختیار رہنے دیجیے ورنہ میری جگہ کسی اور کو اپنا والی مقرر فرما لیجیے۔ اس جواب پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی معزولی کا مشورہ دیا۔ لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو ان کے منصب پر برقرار رکھا۔[1]

جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ منتخب ہوئے تو ان کی یہ سوچ تھی کہ وہ اپنے تمام امراء اور حکّام کے لیے فرائض و ادائیگی کا ایک طریقِ کار خود وضع کریں اور ان پر لازم ٹھہرائیں کہ جو بھی نیا واقعہ پیش آئے اس کی خبر خلیفۂ وقت کو دی جائے۔ خلیفۂ وقت ہی اس کا حتمی فیصلہ کرے اور ہر علاقے کا والی خلیفۂ وقت کی طرف سے جاری ہونے والے احکام نافذ کرنے کا پابند ہو۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب منصبِ خلافت پر فائز ہوئے تو انھوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مقرر کردہ عمّال کو اپنے طریقۂ کار کے مطابق چلانے کی کوشش کی۔ اُن میں سے بعض تو راضی ہوگئے لیکن بعض حضرات نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس طریقِ کار سے اختلاف کیا۔ اختلاف کرنے والوں میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ بھی تھے۔[2]

امام مالک بن انس رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں: حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ مقرر ہوئے تو انھوں نے حضرت

---

[1] البداية والنهاية (٧/ ١١٥) التاريخ الإسلامي (١١/ ١٤٦)

[2] خالد بن الوليد لصادق عرجون (ص: ٣٣٢)

خالد رضی اللہ عنہ کو لکھا: آپ میرے حکم کے بغیر کسی کو ایک بکری یا اونٹ دینے کے بھی مجاز نہیں۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بھی وہی جواب دیا جو انھوں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو دیا تھا کہ یا تو آپ مجھے با اختیار رہنے دیں، ورنہ میری جگہ کسی اور کو عامل مقرر فرمائیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ایک مشورہ دیا تھا۔ اگر میں خود اس پر عمل نہ کروں تو اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ میں نے اللہ کے حضور جھوٹ بولا، پھر انھوں نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو معزول کر دیا۔[1]

بعد ازاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو دوبارہ گورنری کی پیش کش کی لیکن انھوں نے پھر با اختیار ہونے کا مطالبہ کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس بات پر راضی نہ ہوئے۔[2]

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف سے معزولی کے حکم کو بسر و چشم قبول فرمایا اور بلا حیل و حجت حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے زیرِ کمان ایک عام فوجی کی حیثیت سے جہاد میں حصہ لیا۔ اللہ تعالیٰ نے قنسرین کا علاقہ فتح کرا دیا۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو اپنی طرف سے اس علاقے کا حاکم مقرر کر دیا۔ بعد ازاں انھوں نے امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس فتح کی تفصیلات لکھیں اور اس میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے کردار کی بھی پوری تفصیل لکھ بھیجی۔ اس موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنا وہ مشہور جملہ ارشاد فرمایا:

"أَمَّرَ خَالِدٌ نَّفْسَهٗ رَحِمَ اللّٰهُ أَبَا بَكْرٍ هُوَ كَانَ أَعْلَمُ مِنِّيْ بِالرِّجَالِ"

"(حضرت) خالد (رضی اللہ عنہ) نے خود کو امیر منوالیا۔ اللہ (حضرت) ابوبکر (رضی اللہ عنہ) پر اپنی رحمت نازل فرمائے۔ وہ لوگوں کو مجھ سے زیادہ جانتے تھے۔"[3]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس مشہور مقولے کا مطلب یہ تھا کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے شجاعت اور جوانمردی کی داستان رقم کی اور اپنی جان کو ان خطرناک معرکوں میں جھونک دیا جن کی انھیں عادت تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد کا ایک مطلب یہ بھی تھا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان کے مشورہ دینے اور اس پر اصرار کرنے کے باوجود حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو ان کے منصب پر برقرار رکھا کیونکہ وہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی خوبیوں اور جنگی لیاقت سے خوب واقف تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ایسے افراد قوموں میں خال خال

[1] البداية والنهاية (٧/ ١١٥)

[2] خالد بن الوليد لصادق عرجون (ص: ٣٣٢)

[3] خالد بن الوليد لصادق عرجون (ص: ٣٢١)

ہی پیدا ہوتے ہیں۔[1]

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے زیرِ امارت تقریباً ۴ سال تک جہاد کیا۔ ایک دفعہ بھی ثابت نہیں کہ انھوں نے کبھی حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ سے اس سلسلے میں کوئی اختلاف کیا ہو۔ نہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی معزولی کے بعد حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے اُن کے بارے میں کوئی شکایت یا ان کے خلاف کوئی اقدام منقول ہے۔ تاریخ نے ہمارے لیے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے وہ الفاظ محفوظ کر دیے ہیں جو انھوں نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو ان کی معزولی کے وقت کہے تھے: میں دنیا کی بادشاہت کا طلبگار نہیں ہوں۔ نہ دنیا کے حصول کے لیے محنت کرتا ہوں۔ بلاشبہہ جو کچھ تم دیکھ رہے ہو وہ عنقریب ختم ہونے والا ہے۔ ہم سب آپس میں بھائی بھائی ہیں اور اللہ کے احکام بجا لانے والے ہیں، کسی آدمی کو اس امر سے نقصان نہیں پہنچنا چاہیے کہ اس کا دینی بھائی اس کے دین اور دنیا میں اس کا والی ہے۔ والی کو تو ہر وقت یہ خطرہ لاحق رہتا ہے کہ وہ کسی بھی وقت فتنے میں مبتلا ہو سکتا ہے اور غلطی کر سکتا ہے جس کا نتیجہ ہلاکت ہوتا ہے، سوائے اُس والی کے جسے اللہ تعالیٰ محفوظ فرمائے اور ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں۔[2]

جب حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ ان کے زیرِ امارت جہادی خدمات انجام دیں تو حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے فوراً جواب دیا: ان شاء اللہ میں ضرور یہ خدمات انجام دوں گا۔ میں تو انتظار میں تھا کہ کب آپ مجھے حکم دیں اور میں تعمیل کروں۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے ابوسلیمان! دراصل مجھے آپ سے حیا دامن گیر تھی۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے کہا: اللہ کی قسم! اگر مجھ پر ایک چھوٹا سا بچہ بھی امیر بنا دیا جائے تو میں اس کا بھی اطاعت گزار رہوں گا۔ آپ تو مجھ سے پہلے ایمان لانے والے اور اسلام قبول کرنے والے ہیں، پھر فرمایا: آپ کی عظمت مسلّم ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو ”أمین هذه الأمة“ کا لقب عطا فرمایا تھا۔ میں آپ کی مخالفت کس طرح کر سکتا ہوں۔ میں آپ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں نے اپنے آپ کو اللہ کے راستے میں وقف کر دیا ہے۔ میں آپ کی کبھی مخالفت نہیں کروں گا، نہ آیندہ زندگی میں کوئی منصب قبول کروں گا۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے خالی الفاظ پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ وہ اپنی بات پر عمل کرتے ہوئے فوراً اپنے ذمّے لگائی گئی مہم کے لیے سرگرم عمل ہو گئے۔[3]

---

[1] خالد بن الوليد لصادق عرجون (ص: ٣٢١)

[2] خالد بن الوليد لصادق عرجون (ص: ٣٢٣)

[3] نظام الحكم في عهد الخلفاء الراشدين (ص: ٨٤)

حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے قول وفعل سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ حضرت خالد اور حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہما کے معاملات پر ہمیشہ دینی اور اخلاقی سوچ حاوی رہتی تھی۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو اسلامی افواج کی سربراہی سے سبکدوش کر دیا گیا تھا۔ وہ حاکم سے محکوم بن چکے تھے لیکن وہ خلیفۂ وقت کی اطاعت کے اصول پر مضبوطی سے کاربند رہے۔[1]

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی اس معزولی میں ان کے اور خلیفۂ وقت حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے درمیان کسی شک یا جاہلی کینے کا کوئی عمل دخل نہ تھا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے کوئی شرعی حرمت پامال نہیں کی تھی۔ ان کے عدل، انصاف اور تقوے میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ بات صرف اتنی تھی کہ ان دونوں عظیم شخصیتوں کا اپنا اپنا خاص مزاج اور اپنا اپنا جداگانہ اندازِ فکر تھا اور دونوں اپنے اپنے اصول پر چلنا چاہتے تھے۔ جب یہ صورت حال پیش آگئی تو یہ بات بھی ناگزیر ہوگئی کہ حکمرانِ وقت کے بجائے فوج کا کمانڈر ہنسی خوشی فوج کی سپہ سالاری سے سبکدوش ہو جائے، چنانچہ وہ سبکدوش ہو گئے۔[2]

دوسری دفعہ معزولی:

قنسرین کے علاقے میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف سے معزولی کا دوسرا حکمنامہ موصول ہوا۔ یہ ۱۷ ہجری کا واقعہ ہے۔[3]

امیر المومنین رضی اللہ عنہ کو خبر ملی کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ اور حضرت عیاض بن غنم رضی اللہ عنہ نے رومی شہروں پر چڑھائی کر دی ہے اور ان علاقوں کے گلی کوچوں میں داخل ہو گئے ہیں۔ انھیں وہاں سے بہت سے غنائم حاصل ہوئے۔ مختلف علاقوں سے لوگ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے پاس آئے۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ اشعث بن قیس کندی رضی اللہ عنہ کو خوب جانتے تھے۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے اسے اپنی طرف سے دس ہزار (۱۰۰۰۰) درہم عطاء فرما دیے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اپنے عمّال کی کوئی بات چھپی نہیں رہتی تھی۔[4]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ وہ اس مال کے بارے میں تحقیق کریں جو حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے اشعث رضی اللہ عنہ کو دیا ہے۔ یہ مال خالد رضی اللہ عنہ کے پاس کہاں سے آیا؟ انھوں نے خالد رضی اللہ عنہ

---

[1] نظام الحكم في عهد الخلفاء الراشدين (ص: ٨٤)

[2] أباطيل يجب ان تمحىٰ من التاريخ (ص: ١٣٢)

[3] عبقرية خالد للعقاد (ص: ١٥٤۔ ١٥٦)

[4] تاريخ الطبري (٥/ ٤٢)

کو جواب طلبی کے لیے مدینہ طلب فرمالیا۔ حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے بھی حضرت خالد رضی اللہ عنہ سے جواب طلبی کی۔ سرکاری پیغام رساں کو معاملے کی تحقیق کا کام سونپا گیا جبکہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے غلام کو اس مقدمہ میں فیصلے کی تنفیذ کا اختیار دیا گیا۔ آخرکار نتیجہ یہ سامنے آیا کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ مسلمانوں کے مالِ غنیمت سے دس ہزار (۱۰۰۰۰) کا عطیہ دینے سے بری ہیں۔[1]

جب حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو اپنی معزولی کا علم ہوا تو انھوں نے شام کو الوداع کہا۔ انھوں نے اپنی اس معزولی پر اظہارِ افسوس کیا اور فرمایا: بلاشبہ امیر المومنین نے مجھے شام کا عامل مقرر کیا۔ جب وہاں سے عمدہ گندم اور شہد وصول ہونے لگا تو مجھے معزول کر دیا۔ ایک آدمی کھڑا ہوا اور کہنے لگا: اے امیر محترم! صبر کیجیے یہ واقعہ ایک فتنہ بن جائے گا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''أَمَّا وَابْنُ الْخَطَّابِ حَيٌّ فَلَا'' ''ایسا نہیں ہوسکتا کہ خطاب کا بیٹا زندہ ہو اور فتنے سر اٹھائیں۔''[2]

یہ ایک ایمانی رنگ تھا جو ان پر ہمیشہ غالب رہتا۔ ایسا رنگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم جیسے عظیم افراد ہی کا حصہ تھا۔ مقامِ غور ہے کہ وہ کون سی روحانی طاقت تھی جو اس اہم ترین موڑ پر ان کے اعصاب پر حکمران تھی اور وہ کونسا الہام تھا جس نے اس قدر دانائی سے لبریز اور پرسکون جواب حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی زبان پر جاری کر دیا؟ یہ صرف رسالت مآب کی تربیت کا فیضان تھا۔

جب لوگوں نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی زبان سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے اصولوں کی مضبوطی اور نفاذ کا تذکرہ سنا تو سب مطمئن ہوگئے۔ انھیں یقین ہوگیا کہ ان کا معزول شدہ لیڈر ان لوگوں سے نہیں ہے جو اپنی عظمت کے محلات فتنوں اور تخریبی بغاوتوں پر قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں بلکہ ایسے لوگ تو تعمیری اندازِ فکر کے حامل ہوتے ہیں اور اسلامی ریاست کے لیے مضبوطی کا ذریعہ بنتے ہیں۔ اگر کبھی دنیاوی زندگانی ان کے تعمیراتی کام کو منہدم کرنا چاہے تو اپنے آپ کو اتنا عظیم بنا لیتے ہیں کہ کوئی فتنہ پرداز اور دھوکے باز انھیں اپنے دامِ فریب میں انھیں لاسکتا۔[3]

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ جب مدینہ طیبہ تشریف لائے اور امیر المؤمنین سے ملاقات ہوئی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی اس طرح تصویر کشی فرمائی:

[1] خالد بن الوليد لصادق عرجون (ص: ٣٢٤)

[2] خالد بن الوليد لصادق عرجون (ص: ٣٤٧) الكامل في التاريخ (٢/ ١٥٦)

[3] خالد بن الوليد لصادق عرجون (ص: ٣٤٧)

''آپ نے ایسے کارنامے سرانجام دیئے کہ کوئی دوسرا ایسا نہ کرسکا، درحقیقت لوگ نہیں بلکہ اللہ ہی سب کارنامے انجام دیتا ہے۔''[1]

حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہوکر کہا: میں نے لوگوں کے رُوبرو آپ کا شکوہ کیا اور اللہ کی قسم! میرے معاملے سے آپ بے خبر نہیں ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تمھارے پاس اتنی دولت کہاں سے آئی؟ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: یہ مجھے مالِ غنیمت سے ملنے والے حصوں کا نتیجہ ہے جو ساٹھ ہزار (۶۰۰۰۰) درہم سے اوپر ہے، وہ آپ کو لینے کا حق ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے ساتھ سامان کا تخمینہ لگایا۔ اس میں بیس ہزار (۲۰۰۰۰) درہم ان کی طرف نکلے۔ وہ انھوں نے بیت المال میں جمع کرلیے، پھر فرمایا: اے خالد! اللہ کی قسم! بلاشبہہ تو میرے لیے انتہائی معزز اور محبوب ہے، اور آج کے بعد تو مجھ سے کبھی خفا نہیں ہوگا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تمام شہروں کی طرف لکھا:

''بلاشبہہ میں نے (حضرت) خالد (رضی اللہ عنہ) کو کسی ناراضی یا خیانت کے سبب معزول نہیں کیا، در اصل لوگ اس کی وجہ سے فتنہ میں مبتلا ہو رہے تھے۔ میں ڈرگ کہ لوگ (حضرت) خالد (رضی اللہ عنہ) ہی پر توکل کر بیٹھیں گے اور آزمایش میں مبتلا ہو جائیں گے۔ میری خواہش تھی کہ لوگوں کو بتاؤں کہ ہر کام انجام دینے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے تاکہ لوگ کسی بھی فتنے سے محفوظ رہ سکیں۔''[2]

عقیدۂ توحید کی حفاظت:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد: ''لوگ (حضرت) خالد (رضی اللہ عنہ) کے بارے میں فتنے کا شکار ہو سکتے تھے، میں ڈرا کہ مبادا لوگ صرف (حضرت) خالد (رضی اللہ عنہ) پر توکل کرلیں اور آزمایش کا شکار ہو جائیں'' سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس بات سے خائف تھے کہ لوگ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی وجہ سے بڑے فتنہ میں مبتلا ہو جائیں۔ وہ گمان کر بیٹھیں کہ جہاں حضرت خالد رضی اللہ عنہ ہوں وہاں فتح یقینی ہوتی ہے۔ اس طرح لوگوں کا اللہ تعالیٰ پر یقین کمزور ہوسکتا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ لوگوں کو بتانا چاہتے تھے کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ

[1] تاريخ الطبري (٥/ ٤٣)

[2] تاريخ الطبري (٥/ ٤٣)

لشکر میں ہوں یا نہ ہوں، مدد اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہوتی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اس سوچ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خالص اسلامی عقیدے کی بنیاد پر اسلامی ریاست کی قیادت کر رہے تھے۔ انھوں نے اسلام دشمنوں کے خلاف تباہ کن جنگیں اس عقیدے کی طاقت کے بل بوتے پر لڑیں اور منصور و مظفر رہے۔

اس بات کا امکان تھا کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ جیسے عظیم سپہ سالار اپنی رعایا کے بارے میں کسی فتنے کا شکار ہو جاتے۔ وہ اپنے آپ کو قوت کے ایسے مرتبے پر فائز سمجھتے جیسے کوئی اور ان کا ہمسر ہی نہیں ہے۔ خاص طور پر اس لحاظ سے بھی کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ بڑے فیاض تھے۔ مال خوب خرچ کرتے تھے اور جنگی مہارات میں لاجواب تھے۔ اس حوالے سے ان کی سوچ ان کی اپنی ذات بلکہ پوری اسلامی ریاست کے لیے باعثِ نقصان ثابت ہو سکتی تھی۔[1]

سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی وفات اور بسترِ مرگ پر ان کی گفتگو:

حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے پاس گئے۔ اُس وقت حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ بسترِ مرگ تھے۔ اُن سے حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

”يَا أَبَا الدَّرْدَاءِ لَئِنْ مَّاتَ عُمَرُ لَتَرَيَنَّ أُمُوراً تُنْكِرُهَا“

”اے ابو الدرداء! (رضی اللہ عنہ) اگر (حضرت) عمر (رضی اللہ عنہ) فوت ہو گئے تو ایسے ایسے فتنے دیکھ لو گے جنھیں تم شدت سے ناپسند کرو گے۔“

حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ نے کہا: اللہ کی قسم! میرا بھی یہی خیال ہے، حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میرے دل میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں بہت اشکال تھے۔ اب جبکہ میں مرض الموت میں مبتلا ہوں اور اللہ کا حکم آنے والا ہے، میں نے بہت سے امور پر غور کیا تو اِس نتیجے پر پہنچا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ہر معاملے میں صرف اللہ تعالیٰ کی رضا مطلوب ہوتی ہے۔ جب انھوں نے میرا مالی احتساب کیا تھا تو مجھے بڑا رنج ہوا تھا حتیٰ کہ یہ نوبت آ گئی کہ شاید ہم ایک دوسرے سے لڑ پڑتے لیکن انھوں نے یہ سلوک صرف مجھی سے نہیں کیا۔ میرے علاوہ بھی اسلام میں سبقت رکھنے والے کئی افراد کے ساتھ ایسا ہی برتاؤ کیا حتیٰ کہ ان کے محاسبے سے بدری صحابہ رضی اللہ عنہم بھی نہ بچ سکے۔ وہ مجھ پر سختی فرماتے تھے مگر وہ میرے علاوہ میرے جیسے دوسرے افراد پر بھی سختی کرتے تھے۔ میں ان کا قریبی رشتہ دار تھا لیکن میں نے دیکھا کہ وہ کسی قریبی رشتے ناتے کی

[1] الدولة الإسلامية في عصر الخلفاء الراشدين لحمدى شاهين (ص: ١٤٩)

پروا کرتے تھے نہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں کسی ملامت گر کو کوئی اہمیت دیتے ہیں۔ یہ سب باتیں سوچ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں میرے سب شکوے ختم ہوگئے ہیں۔

وفات کا وقت قریب آپہنچا تو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ رو دیے۔ فرمایا: اے لوگو! جہاد کو لازم پکڑو، میں بہت سی جنگوں میں شریک ہوا۔ میرے جسم میں ایک بالشت جگہ بھی ایسی نہیں جو تیر، تلوار یا نیزے کے زخم سے خالی ہو۔ اب میں اپنے بستر پر ایک بیمار اونٹ کی طرح مر رہا ہوں۔ بزدل لوگوں کی آنکھوں کو نیند نصیب نہ ہو۔ میں بڑے بڑے معرکوں میں شہادت کا متمنّی رہا لیکن آج یہاں اپنے بستر پر مر رہا ہوں۔[1]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی موت کا بڑا رنج ہوا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی چچا زاد بہنیں بھی رونے لگیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا گیا: انھیں منع کیا جائے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: انھیں مت روکو جب تک نوحہ و بَین نہ کریں۔ انھیں (حضرت) ابوسلیمان (رضی اللہ عنہ) کی موت پر رو لینے دو۔ ایسے عظیم افراد پر رونے والیاں روتی ہی ہیں۔[2]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اب اسلام میں ایسا سوراخ ہوا ہے جو بند نہ ہو سکے گا۔ مزید فرمایا: جب تک وہ زندہ رہے۔ میں نے اُنہیں حجر کے علاقوں کا نگران مقرر کیا۔ اللہ کی قسم! وہ دشمن کے سینوں سے ٹکرانے والے اور مثالی قیادت کرنے والے آدمی تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے دیکھا کہ زمانے نے اُن جیسے افراد سے بھی کوئی رعایت نہیں کی۔ سب دنیا سے چلے گئے۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے ۲۱ ہجری میں شام کے علاقے حمص میں وفات پائی، اور وہیں دفن ہوئے۔[3]

عراق اور بلادِ مشرق کی فتوحات

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی زیرِ قیادت مشرقی علاقوں کی فتوحات کا پہلا دَور مکمل ہوگیا تھا۔ سیّدنا عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں ان علاقوں کی فتوحات کا دوسرا دَور مختلف مراحل میں مکمل ہوا۔

---

[1] سير أعلام النبلاء (١/ ٣٨٢) الطريق إلى المدائن (ص: ٣٦٧)

[2] الطريق إلى المدائن (ص: ٣٦٦)

[3] خالد بن وليد لصادق عرجون (ص: ٣٤٨) تاريخ الطبرى (٥/ ١٣٠) القيادة العسكرية (ص: ٥٨٩)

حضرت ابو عبیدہ ثقفی رضی اللہ عنہ کا بطورِ سپہ سالار تقرر اور مختلف معرکے:

جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ وفات پا گئے اور انھیں ۱۳ ہجری ۲۲ جمادیٰ الآخرہ بروز منگل دفن کر دیا گیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ منتخب ہوئے۔ انھوں نے لوگوں کو اہلِ عراق کے خلاف جہاد میں شرکت کرنے کی ترغیب دی، لیکن اہلِ عراق کے خلاف جہاد کے لیے کوئی آمادہ نہ ہوا۔ لوگ اہلِ فارس کے اثر و رسوخ اور اُن کی جنگی قوت سے خائف تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دوسرے دن، پھر تیسرے دن بھی لوگوں کو جہاد کے لیے آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تائید میں حضرت مثنّٰی بن حارثہ رضی اللہ عنہ نے بھی گفتگو کی اور بہت اچھی باتیں کہیں۔ انھوں نے لوگوں کو بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ذریعے سے بہت سے عراقی علاقے فتح کرا دیے ہیں۔ وہاں غنیمت میں بہت سا مال، جائیدادیں، ساز و سامان اور کھانے پینے کی اشیاء میسر ہیں لیکن پھر بھی کوئی تیار نہ ہوا۔ چوتھے دن سب سے پہلے حضرت ابو عبید بن مسعود ثقفی رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی آواز پر لبیک کہا۔ بعد ازاں لوگ پے درپے جہاد میں شرکت کے لیے تیار ہونے لگے۔[1]

حضرت ابو عبید رضی اللہ عنہ کے بعد پہلے شخص جنھوں نے سیّدنا عمر رضی اللہ عنہ کی آواز پر لبیک کہا حضرت سُلَیط بن قیس انصاری رضی اللہ عنہ تھے۔ انھوں نے کہا: اے امیر المؤمنین! اہلِ فارس آج تک شیطانی انداز سے بلبلاتے رہے ہیں۔ میں نے اپنے آپ کو اور اُن تمام افراد کو جو میرے قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے وقف کر دیا ہے۔[2]

پھر سیّدنا عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو عبید رضی اللہ عنہ کو بلایا، انھیں تقویٰ اختیار کرنے اور مسلمانوں کے لیے بھلائی اور خیر خواہی کی وصیت فرمائی اور حکم دیا کہ وہ ہر دم اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور خصوصاً حضرت سُلَیط رضی اللہ عنہ سے مشورہ جاری رکھیں۔ حضرت سُلَیط بن قیس رضی اللہ عنہ کو جنگی امور کا تجربہ ہے۔[3]

سیّدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تم ایسی سرزمین کی طرف جا رہے ہو جہاں مکر و فریب، دھوکا، خیانت اور تکبر پایا جاتا ہے۔ تم ایسی قوم کی طرف جا رہے ہو جو برائیاں کرنے پر دلیر ہے۔ انھیں صرف برائیاں کرنا آتی

[1] البداية والنهاية (٧/ ٢٦)

[2] الفتوح لابن اعثم (١/ ١٦٤) الأنصار في العصر الراشدي (ص: ٢١٦)

[3] البداية والنهاية (٧/ ٢٦)

ہیں۔ وہ لوگ خیر اور بھلائی سے ناواقف ہیں۔ تم غور وفکر کرلو کہ وہاں کیا رُخ اختیار کروگے؟ اپنی زبان کی حفاظت کرو۔ راز افشاء نہ کرو۔ رازدان وہ ہوتا ہے جو ہر حالت میں راز کو راز ہی رکھے، بصورتِ دیگر وہ رازدان نہیں ہوسکتا۔[1]

معرکۂ نمارق (۱۳ھ):

یہ معرکہ حضرت ابو عبید بن مسعود ثقفی رضی اللہ عنہ کے محاذِ جنگ پر پہنچنے اور اسلامی لشکروں کی قیادت سنبھالنے کے بعد پیش آیا۔ اسی طرح معرکۂ باروسما (۱۳ھ) اور معرکۂ جسر (۱۳ھ) بھی عہدِ فاروقی میں سر ہوئے۔

معرکۂ بویب (۱۳ھ):

حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے لشکروں کو از سرِ نو مرتّب کیا اور مختلف قبائل کے لوگوں کو اسلامی لشکر میں شمولیت کے لیے جمع فرمایا۔

معرکۂ بویب کی افادیت صرف معرکۂ جسر کا بدلہ چکانے تک ہی محدود نہ تھی۔ بلکہ مسلمان سوادِ عراق کے تمام علاقے پر قابض ہو چکے تھے۔ اس سے پہلے تو وہ دریائے فرات بھی عبور نہ کر پائے تھے۔ حالانکہ انھوں نے دجلہ اور فرات کے درمیان میدانوں کی کئی لڑائیاں لڑیں لیکن معرکۂ بویب کے بعد وہ دجلہ اور فرات کے مابین واقع تمام علاقوں پر قابض ہو چکے تھے۔ وہ ان علاقوں میں آزادی سے گھومتے تھے۔ انھیں کسی کے مکر وفریب کا ڈر نہ تھا نہ انھیں کسی قسم کی کوئی رکاوٹ پیش آتی تھی۔[1]

معرکۂ بویب کی اہمیت بعینہٖ وہی تھی جو شام میں معرکۂ یرموک کی تھی۔

دشمن کی منڈیوں کے خلاف کاروائی:

معرکۂ بویب کے بعد حالات مسلمانوں کے قابو میں آچکے تھے۔ سوادِ عراق کا سارا علاقہ زیرِ نگیں ہو چکا تھا۔ حضرت مثنّٰی رضی اللہ عنہ بڑی آزادی سے ہر طرف حرکت کر رہے تھے۔ انھوں نے اپنے فوجی کمانڈروں کو از سرِ نو منظّم کیا۔ اسلحہ کو بہتر بنایا۔ دفاعی چوکیوں کو مضبوط کیا۔ اور جہاں جہاں فارسی اور عرب لوگ جمع ہوتے تھے یہ ان پر حملہ کرتے۔ انھوں نے خنافس پر حملہ کیا۔ خنافس ایک بازار تھا۔ وہاں پر لوگ بکثرت

---

1. إتمام الوفاء في سيرة الخلفاء (ص: ٦٥)
2. تاريخ الطبري (٤/ ٢٩٣)
3. ترتيب و تهذيب البداية و النهاية، خلافه عمر رضي الله عنه (ص: ٩٣)

آتے تھے۔ ربیعہ اور مُضر قبیلے کے لوگ بھی وہاں آتے تھے اور ایک دوسرے کی مدد و بچاؤ کرتے تھے۔ حضرت مثنّیٰ رضی اللہ عنہ نے اس بازار پر حملہ کیا اور وہاں موجود ہر چیز کو تباہ کر دیا۔ اور اسباب و سامان اپنے قبضے میں کر لیا۔[1]

اہلِ فارس کا ردِعمل:

اہلِ فارس کے خلاف اہلِ عرب کو حاصل ہونے والی فتوحات ردِعمل سے خالی نہیں رہ سکتی تھیں، لہٰذا اہلِ فارس کے سردار سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ انھوں نے رستم اور فیرزان سے کہا: تمھارے باہمی اختلافات نے اہلِ فارس کو انتہائی کمزور کر دیا ہے۔ اور دشمنوں کو اہلِ فارس پر غالب آنے کا طمع اور امید دلائی ہے۔ اے سپہ سالارو! اللہ کی قسم! یہ سب کچھ تمھاری وجہ سے ہوا ہے۔ تم نے اہلِ فارس کو تقسیم کر رکھا ہے۔ انھیں دشمن کے مقابلے میں کمزور کر دیا ہے۔ اب تمھیں اہلِ فارس تمھاری موجودہ سوچ پر کاربند نہیں رہنے دیں گے۔ وہ ہلاکت کو گلے نہیں لگائیں گے۔ اللہ کی قسم! تم صرف یہ چاہتے ہو کہ ہم پر مصیبت نازل ہو اور ہم سب ختم ہو جائیں۔

سیّدنا عمر رضی اللہ عنہ انتہائی محتاط شخصیت تھے۔ انھوں نے فوراً ہدایات لکھوائیں اور حضرت مثنّیٰ رضی اللہ عنہ کی طرف ارسال کر دیں۔ انھوں نے لکھا: تم عجمی علاقوں سے جلد نکل جاؤ۔ خشکی کی طرف چلے جاؤ اور عرب و عجم کی سرحدوں پر جہاں جہاں پانی موجود ہو وہاں پھیل جاؤ۔ ربیعہ اور مُضر قبیلے اور ان کے حلیف مددگاروں کے ہنگامی دستوں کو یکجا کر لو، پھر ایک ایک شہسوار کو بلاؤ۔ کوئی خوشی سے آئے تو ٹھیک ہے ورنہ انھیں زبردستی اپنے ساتھ شامل نہ کرو۔ اہلِ عرب کو عجم کے خلاف پوری طرح تیار کرو۔ ان کی تیاری کا موازنہ اپنی تیاری سے کرو۔ اسلامی لشکروں کو اپنی اور عجم کی سرحدوں پر روکے رکھو اور میرے اگلے حکم کا انتظار کرو۔[2]

اسلامی فوج کے سپہ سالار سیّدنا عمر رضی اللہ عنہ کے مکتوب اور مدد کے انتظار میں تھے اور ہر قسم کی پیش قدمی سے رُکے ہوئے تھے۔ یہ ذوالقعدہ ۱۳ ہجری بمطابق جنوری ۶۳۵ء کی بات ہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"وَاللّٰهِ لَأَضْرِبَنَّ مُلُوْكَ الْعَجَمِ بِمُلُوْكِ الْعَرَبِ"

"اللہ کی قسم! میں عرب کے بادشاہوں کو عجم کے بادشاہوں سے ٹکرا دوں گا۔"

---

[1] تاريخ الطبري (٤/ ٢٩٦)

[2] تاريخ الطبري (٤/ ٣٠١)

انھوں نے سب سے پہلے یہ قدم اٹھایا کہ مختلف علاقوں اور قبائل میں متعیّن اپنے عمّال کو فوری امداد کے لیے خطوط لکھے۔ یہ کام انھوں نے ذوالحجہ کے مہینے میں حُجاج کے گھروں سے نکلنے کے وقت کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مکہ اور مدینہ حتیٰ کہ وہ لوگ جو عراق کے راستے پر تھے اور مدینہ کے قریب تھے وہ سب حج ختم ہونے کے بعد سیّدنا عمر رضی اللہ عنہ کے کہنے پر لبیک کہتے ہوئے مدینے پہنچ گئے۔ وہاں انھوں نے خبر دی کہ ان کے پیچھے بہت سے افراد آ رہے ہیں۔ وہ افراد عراق کی سرزمین کے قریب تھے، وہ فوراً حضرت مثنّی رضی اللہ عنہ سے جا ملے۔ سیّدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کوئی سردار، صاحبِ شعور، صاحبِ عزت، طاقتور شخص، خطیب اور شاعر نہیں چھوڑا، سب کو محاذِ جنگ پر بھیج دیا۔ انھوں نے منتخب ترین، بہترین، روشن دماغ افراد عراق روانہ فرما دیے۔[1]

معرکۂ قادسیہ:

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو جب علم ہوا کہ اہلِ فارس نئے سرے سے جنگی تیاریوں میں مصروف ہیں اور وہ عراق میں مسلمانوں کی بچ جانے والی مختصر سی فوجی قوت کو کچلنے کے لیے بھاری لشکر تیار کر رہے ہیں تو انھوں نے ان نازک حالات میں فوری طور پر لازمی فوجی بھرتی کا حکم دے دیا۔ انھوں نے حضرت مثنّیٰ رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ اپنے اردگرد قبائل پر نظر دوڑاؤ اور جو آدمی جنگ میں حصہ لینے کی صلاحیت رکھتا ہے اسے لازماً بہر صورت فوج میں شامل کر لو۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ تاریخ کے وہ پہلے فرد ہیں جنھوں نے فوج میں لازمی بھرتی کا قانون جاری کیا (لازمی فوجی بھرتی کا یہ قانون آج امریکہ اور برطانیہ کے علاوہ متعدد ترقی یافتہ ملکوں میں رائج ہے)۔

"العسكرية الإسلامية" کے مصنّف محمد فرج کا یہ قول قرینِ قیاس معلوم نہیں ہوتا کہ سب سے پہلے فوج میں لازمی بھرتی اُموی دور میں شروع ہوئی کیونکہ سیّدنا عمر رضی اللہ عنہ اُن سے پہلے ہی یہ قانون نافذ کر چکے تھے۔ اُن کے حکم کی فوراً تعمیل کی گئی۔

سیّدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عمّال کو حکم دیا کہ وہ لوگوں کو لازمی فوجی بھرتی کے قانون کے تحت سپاہِ جہاد میں شامل کریں، کسی کے پاس کوئی ہتھیار، گھوڑا یا کسی قسم کا مفید حربی سامان ہو یا کوئی ماہرانہ جنگی سوجھ بوجھ رکھتا ہو تو اسے فوراً مدینہ روانہ کریں تاکہ انھیں فوجی دستوں میں شامل کر کے عراق بھیجا جا سکے۔[2]

---

[1] الطريق إلى المدائن (ص: ٤٣٠ ـ ٤٧١)

[2] اتمام الوفاء (ص: ٧٠)

اُدھر سلطنتِ فارس کے علاقوں میں یزدگرد کے برسرِ حکومت آجانے کی وجہ سے حالات سدھر گئے تھے۔ تمام اہلِ فارس داخلی طور پر پُر امن ہو چکے تھے کیونکہ وہ سب یزدگرد پر متفق تھے اور اس پر مکمل اعتماد رکھتے تھے۔ تمام ایرانی سردار یزدگرد کی فرمانبرداری اور اس سے ہر ممکن تعاون کرنے پر تیار تھے۔ تمام ضروری سامانِ جنگ تیار کیا جا چکا تھا۔ مسلمانوں نے جو علاقے فتح کر رکھے تھے، اُن علاقوں میں سپاہِ فارس کے لشکر پہنچ چکے تھے اور مقامی لوگوں کو مسلمانوں کے خلاف اُکسا رہے تھے، چنانچہ انھوں نے مسلمانوں سے کیے ہوئے عہد توڑ ڈالے اور ان کے خلاف اہلِ فارس کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوئے۔[1]

دوسری طرف مسلمانوں کے حالات بھی بدل گئے تھے۔ حضرت مثنّیٰ رضی اللہ عنہ پسپائی اختیار کرتے ہوئے اپنے محافظ دستوں کے ساتھ فتح کیے گئے عجمی علاقوں سے واپس آگئے تھے۔ وہ عرب اور فارس کے درمیان سرحدوں پر مختلف مقامات میں منتشر ہو چکے تھے۔ حضرت مثنّیٰ رضی اللہ عنہ خود ذی قار میں تھے، جبکہ باقی لشکر طف میں جاگزین تھا۔ انھوں نے عراق کی سرزمین میں مختلف جگہوں پر مورچے بنا رکھے تھے جو ایک دوسرے کی نگاہ میں بھی تھے اور بوقتِ ضرورت ایک دوسرے کی مدد بھی کر سکتے تھے۔

اب حالات یہ تھے کہ اہلِ فارس زبردستی لوگوں کو اپنے لشکروں میں شامل کر رہے تھے۔ ادھر سیّدنا عمر رضی اللہ عنہ بھی لوگوں کو دھڑا دھڑ فوج میں بھرتی کر رہے تھے۔[2]

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا تقرر اور معرکہ کے واقعات:

عراقی سرزمین میں فتوحات کا تیسرا دَور اس وقت شروع ہوا جب حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ افواج کے سالارِ اعلیٰ مقرر ہوئے۔ ان کا تقرر ۱۴ ہجری میں عمل میں آیا۔ چودھویں ہجری کی ابتداء تھی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ لوگوں کو اہلِ فارس کے خلاف جہاد کے لیے مستعد کر رہے تھے۔ وہ یکم محرم کو لشکرِ جرار کے ساتھ مدینہ سے نکلے اور مقامِ صرار کے چشموں کے پاس خیمہ زن ہوئے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارادہ تھا کہ وہ خود عراق جائیں اور اسلامی لشکر کی قیادت کریں۔ انھوں نے مدینہ میں حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو اپنا نائب مقرر کیا۔ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ اور دیگر کبار صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو اپنے ساتھ لیا۔ مجلسِ شوریٰ کا اجلاس طلب کیا اور اپنے ارادے کا اظہار فرمایا۔ اور ''الصلاۃُ جامعہ''

---

[1] حركة الفتح الإسلامي (ص: ٨٠)

[2] حركة الفتح الإسلامي (ص: ٨٠)

کی ندا دی گئی۔ بعد ازاں مدینہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھی بلا لیا گیا۔ اب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان تمام حضرات سے مشورہ طلب کیا۔ سب نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روانگی سے اتفاق کیا لیکن حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کی رائے مختلف تھی۔ انھوں نے فرمایا: مجھے خدشہ ہے کہ اگر آپ شہید ہوگئے تو مسلمان تمام علاقوں میں کمزور ہوجائیں گے۔

میری رائے یہ ہے کہ آپ کسی اور معتبر آدمی کو اس مہم کے لیے روانہ فرمائیں اور خود واپس مدینہ تشریف لے جائیں۔ دیگر کئی افراد نے بھی اس رائے کی حمایت کی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس رائے کو قبول فرما لیا، پھر انھوں نے دریافت فرمایا کہ اس مہم کے لیے کس شخص کو روانہ کیا جائے؟ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے عرض کی: وہ شخص آپ کے پاس ہی موجود ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: وہ کون ہے؟ انھوں نے جواب دیا: وہ ایک شیر ہے جو (حضرت) سعد بن مالک زُہری المشہور سعد بن ابی وقاص (رضی اللہ عنہ) کہلاتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس مشورے کو پسند فرمایا۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی طرف حکم نامہ بھیجا اور انھیں عراقی مہم کا سالارِ اعلیٰ مقرر فرما دیا۔[1]

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وصیّت:

حضرت سعد رضی اللہ عنہ مدینہ تشریف لائے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انھیں عراقی جنگی مہم کا سالارِ اعلیٰ مقرر کرنے کا اعلان کیا اور فرمایا: اے سعد (رضی اللہ عنہ)! تجھے اِس بات سے دھوکے نہیں کھانا چاہیے کہ تُو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابی اور ان کا ماموں ہے۔ بلاشبہ اللہ عزّ وجل برائی کو برائی سے نہیں بلکہ برائی کو اچھائی سے ختم فرماتا ہے۔ بلاشبہ اللہ اور بندے کے درمیان اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کے سوا اور کوئی قریبی رشتہ نہیں ہے۔ سب لوگ چاہے وہ بڑے مرتبے والے لوگ ہوں یا کم حیثیت والے، اللہ تعالیٰ کے ہاں برابر ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہی اُن کا رب اور وہ اُس کے بندے ہیں۔ وہ عافیت کی بنیاد پر ایک دوسرے پر فضیلت حاصل کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے اس کی فرمانبرداری کے سبب اس کے خزانوں سے اپنے مطلوبات حاصل کرتے ہیں۔ تُو اُنھی حالات و ایام پر نظر رکھ جو تُو نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے لے کر وفات تک بسر کیے ہیں۔ ہمیشہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر عمل پیرا رہنا۔ یہی میرا حکم ہے اور یہی میری نصیحت ہے۔ اگر تُو نے اس سے اعراض کیا تو خسارے میں رہے گا۔[2]

[1] ترتیب و تهذیب البدایة والنهایة (ص: ٩٦)

[2] تاریخ الطبري (٤/ ٣٠٦)

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی اِس نصیحت میں بہت سی سبق آموز باتیں پائی جاتی ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ حق سے وابستگی کا التزام ہی انسان کو مشکلات سے نکال سکتا ہے کیونکہ جس نے حق کا التزام کیا اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ ہوگا اور جو اللہ کے ساتھ ہوگا، اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ ہوگا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ ایسے خوش بخت انسان تھے جنھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت کی بشارت دی تھی۔ اِس کے باوجود وہ سیّدنا عمر رضی اللہ عنہ کی نصیحت کے ضرورت مند تھے تو ہم جیسے گناہگاروں کو اس نصیحت کی کس قدر ضرورت ہوگی؟ جبکہ ہم اسلام کی سمجھ اور اس پر عمل کرنے میں انتہائی کوتاہی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔[1]

سیّدنا سعد رضی اللہ عنہ کی عراق روانگی اور سیّدنا عمر رضی اللہ عنہ کی وصیّت:

سیّدنا عمر رضی اللہ عنہ کی طرف سے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو مقام ''زرود'' سے کوچ کرنے کا حکم ملا۔ انھیں تاکید کی گئی کہ وہ اہلِ فارس کے خلاف فیصلہ کُن معرکہ آرائی کریں۔ مزید برآں سیّدنا عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو چند اہم نصیحتیں کیں۔ انھوں نے فرمایا:

امّا بعد! میں تمھیں اور تمھارے ساتھ موجود سارے لشکر کو ہر حال میں اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کی تلقین کرتا ہوں، بلاشبہہ دشمن کے خلاف سب سے بڑا ہتھیار تقویٰ ہے۔ میں تمھیں اور تمام لشکر کو دشمن سے کہیں زیادہ گناہوں سے بچنے اور بہت زیادہ محتاط رہنے کی تاکید کرتا ہوں۔ اسلامی لشکر میں گناہوں کی موجودگی دشمن سے کہیں زیادہ خطرناک اور مہلک ہوسکتی ہے۔ بلاشبہہ ہمارے دشمن اللہ تعالیٰ کی نافرمانیاں کرتے ہیں۔ اِسی وجہ سے اللہ تعالیٰ اُن کے خلاف مسلمانوں کو فتح سے نواز دیتا ہے، ورنہ ہم اپنی تعداد اور تیاری میں کمی کی وجہ سے اُن کے مقابلے میں بے حد کمزور ہیں۔

اے سعد (رضی اللہ عنہ)! اہلِ لشکر کو ہر جمعہ کے بعد ایک دن اور ایک رات آرام کرنے کا موقع فراہم کرو تاکہ انھیں راحت میسّر آئے اور وہ اپنے آپ کو مستعد اور اپنے اسلحے اور دیگر سامان کو ٹھیک ٹھاک کرسکیں۔ انھیں اہلِ صلح اور ذِمّیوں کے علاقوں سے دور رکھنا۔

اے سعد (رضی اللہ عنہ)! جب تم دشمن کی سرزمین کے قریب پہنچو تو اپنے اور اُن کے مابین جاسوسوں کا جال بچھا دو۔ دشمن کے معاملات تم سے ہرگز پوشیدہ نہیں رہنے چاہییں۔ تمھارا قریبی شخص وہ ہونا چاہیے جو عرب ہو یا پورے کرۂ ارض میں سب سے زیادہ سچا، خیر خواہ اور قابلِ اعتماد ہو۔

---

[1] التاريخ الإسلامي (١٠/ ٣٦٥)

اے سعد (رضی اللہ عنہ) ! کوئی جاسوسی دستہ یا لشکر کسی ایسے علاقے کی طرف نہ بھیجنا جہاں انھیں کوئی نقصان پہنچے یا ضائع ہونے کا خطرہ ہو۔ جب تم دشمن کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ لو تو دُور دُور سے اپنے لشکر اور ہراول دستوں کو بلا کر یکجا کرلو، پھر پوری طرح جنگی چال اور طاقت استعمال کرو۔

سیّدنا عمر رضی اللہ عنہ کا یہ خطاب نہایت عظیم الشان اور نفع مند احکام پر مبنی ہے۔ اُن کے ارشادات اُن کی عظمت اور جنگی منصوبہ بندی میں اُن کی مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ اُن کے اِن تمام احکام اور ارشادات میں للّٰہیت کا غلبہ نظر آتا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مادی اسباب اختیار کرنے کے ساتھ ساتھ مجاہدین کے حوصلوں کو بھی بلند رکھا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا حال یہ تھا کہ وہ اپنے وجدان اور احساسات کے ذریعے سے گویا اسلامی لشکر کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ بظاہر وہ مدینہ میں تھے لیکن ان کے خیالات اُن کی انگلی پکڑ کر انھیں قادسیہ میں لیے پھر رہے تھے۔ قادسیہ کی صورتِ حال کی وجہ سے وہ اس قدر متفکّر تھے کہ ان کی زندگی بے کیف ہوگئی۔ وہ جب تک محاذِ جنگ کی خبریں نہ سن لیتے انھیں قرار نہ آتا۔

شاہِ فارس کی طرف وفد ارسال کرنے کا حکم:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو یہ بھی لکھا کہ وہ اطلاعِ احوال کے لیے انھیں روزانہ خط لکھیں۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے سمجھدار، معاملہ فہم اور طاقتور جسم کے افراد کا انتخاب شروع کیا۔

رُستم کو دعوت دینے کے لیے وفد کی روانگی:

رُستم اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ حیرہ سے چلتا ہوا مسلمانوں کے بالمقابل قادسیہ کے پُل کے قریبی علاقہ عتیق میں ٹھہرا۔ دونوں لشکروں کے درمیان ایک نہر حائل تھی۔ سپاہِ فارس کے پاس تینتیس (۳۳) ہاتھی بھی تھے۔ رستم نے پڑاؤ ڈالا تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی طرف پیغام بھیجا کہ اپنا کوئی نمائندہ بھیجو، ہم اس سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے حضرت رِبعی بن عامر رضی اللہ عنہ کو بھیجا۔ جب حضرت رِبعی رضی اللہ عنہ وہاں پہنچے تو دیکھا کہ رُستم ایک سونے کے تخت پر براجمان ہے۔ تکیے اور گدے سونے کے تاروں سے بُنے ہوئے تھے۔ حضرت رِبعی رضی اللہ عنہ وہاں پہنچے تو وہ اپنے گھوڑے پر سوار تھے۔ اُن کی تلوار ایک پرانے کپڑے میں لپٹی ہوئی تھی اور نیزا کپڑے کے ٹکڑوں سے بندھا ہوا تھا۔ انھوں نے رُستم کے خیمے میں ایک شاندار قالین بچھا دیکھا، وہ اس قالین کو اپنے گھوڑوں کے سموں تلے روندتے ہوئے آگے بڑھے۔ پھر انھوں نے اپنا کھوڑا

دو گاؤ تکیوں کے کناروں سے باندھ دیا اور باگیں ان دونوں تکیوں کے درمیان چھوڑ دیں، پھر اپنے اونٹ پر بچھائی جانے والی چادر اوڑھ لی۔ وہاں موجود لوگوں نے انھیں اپنے ہتھیار اتارنے کو کہا تو حضرت رِبعی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر میں اپنی مرضی سے آیا ہوتا تو ایسا ہی کرتا مگر اِس وقت تو تم نے مجھے بلایا ہے۔ لہٰذا میں اپنے ہتھیار نہیں اتار سکتا، پھر وہ اپنے نیزے کو قالین پر ٹیکتے ہوئے آگے بڑھے۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا رہے تھے اور قالین میں سوراخ کر رہے تھے۔ پھر وہ رُستم کے قریب ہوئے۔

زمین پر بیٹھ گئے اور اپنا نیزا قالین میں گاڑ دیا اور فرمایا: ہم تمھاری زینت پر نہیں بیٹھتے۔ رُستم نے سوال کیا: تم کس لیے (فوجیں لے کر) آئے ہوئے ہو؟ حضرت رِبعی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"اَللّٰهُ جَاءَ بِنَا وَهُوَ بَعَثَنَا لِنُخْرِجَ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ مِنْ ضِيقِ الدُّنْيَا اِلٰى سَعَتِهَا وَمِنْ جَوْرِ الْاَدْيَانِ اِلٰى عَدْلِ الْاِسْلَامِ فَأَرْسَلَنَا بِدِيْنِهٖ اِلٰى خَلْقِهٖ فَمَنْ قَبِلَهٗ قَبِلْنَا مِنْهُ وَرَجَعْنَا عَنْهُ وَتَرَكْنَاهُ وَ أَرْضَهٗ، وَمَنْ أَبٰى قَاتَلْنَاهُ حَتّٰى نُفْضِيَ اِلَى الْجَنَّةِ أَوِ الظَّفَرِ"

''ہمیں اللہ تعالیٰ یہاں لایا ہے۔ اُس نے ہمیں بھیجا تا کہ ہم اُس کے بندوں میں سے جنھیں وہ چاہے دنیا کی تنگی سے نکال کر آخرت کی خوش حالی کا راستہ دکھائیں اور تمام ادیانِ باطلہ کے ظلم سے نجات دلا کر انھیں اسلام کے عدل و انصاف سے آگاہ کریں۔ انھوں نے مزید فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ہمیں اپنے دین کے ساتھ اپنی مخلوق کی طرف بھیجا ہے، جو اِس دین کو قبول کر لے گا ہم اس پر اعتبار کریں گے اور واپس چلے جائیں گے اور اس کی سرزمین اُسی کے ہاتھ میں رہنے دیں گے۔ جو انکار کرے گا ہم اس سے جنگ کریں گے تا آنکہ جنت یا کامیابی حاصل کر لیں۔''[1]

رُستم نے کہا: ہم نے تمھاری باتیں سن لی ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ تم جنگ کچھ دیر کے لیے مؤخر کر دو اور ہمیں سوچنے کا موقع دو؟ حضرت رِبعی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہاں! بلاشبہہ ہمارے پیارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی طریقۂ کار تھا کہ وہ دشمن کو تین دن کی مہلت عطا فرماتے تھے۔ ہم تین دن تک تمھارے جواب کے منتظر رہیں گے۔ تم درپیش معاملے پر خوب غور و فکر کر لو۔ مہلت گزرنے کے بعد تین باتوں میں سے ایک اختیار کر لو۔ پہلی بات یہ ہے کہ مسلمان ہو جاؤ، ہم تم سے اور تمھاری زمین سے کوئی تعرّض نہیں کریں گے۔

[1] الكامل في التاريخ (٢/ ١٠٦)

دوسری بات جزیہ ادا کرنے کی ہے، اگر تم اسلام کی دعوت قبول نہ کرو تو پھر تمھیں جزیہ ادا کرنا ہوگا۔ ہم تمھاری حفاظت کا حق ادا کریں گے اور بوقتِ ضرورت مدد بھی کریں گے۔ اگر یہ بات بھی نہ قبول ہو تو چوتھے دن بھرپور جنگ ہوگی اور اُس دن بھی ابتداء آپ ہی کی طرف سے ہوگی۔ میں اپنے تمام ساتھیوں کا ضامن ہوں۔

رُستم نے کہا: کیا تم اُن کے سردار ہو؟ حضرت رِبعی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: نہیں، لیکن سب مسلمان ایک جسم کی طرح ہوتے ہیں۔ وہ سب ایک دوسرے سے جُڑے ہوئے ہوتے ہیں، ان کا ادنیٰ فرد بھی اعلیٰ فرد کی ضمانت دے سکتا ہے، پھر حضرت رِبعی رضی اللہ عنہ واپس آگئے۔ رُستم نے اپنے مصاحبین سے مشورہ کیا اور کہا: کیا تم نے اس آدمی جیسی باتیں کبھی سنی ہیں؟ مصاحبین نے حضرت رِبعی رضی اللہ عنہ کو بے وقعت بنانے کی کوشش کی۔ رُستم نے کہا: تم ہلاک ہو جاؤ، میں اُس کی سوچ، کلام اور کردار کو دیکھ رہا تھا۔ یہ عرب لباس سادہ پہنتے ہیں لیکن حسب ونسب کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔

دوسرے دن رُستم نے حضرت سعد کو پیغام بھیجا کہ (حضرت) رِبعی (رضی اللہ عنہ) کو دوبارہ بھیجو، حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے حضرت رِبعی رضی اللہ عنہ کے بجائے حضرت حُذیفہ بن محصن غطفانی رضی اللہ عنہ کو روانہ فرمایا۔ انھوں نے بھی حضرت رِبعی رضی اللہ عنہ جیسی گفتگو کی اور ان کے جوابات اور جملہ گفتگو میں حضرت رِبعی رضی اللہ عنہ سے مطابقت تھی۔

تیسرے دن رُستم نے پھر ایک آدمی کو بلایا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے اِس دفعہ حضرت مُغیرہ بن شُعبہ رضی اللہ عنہ کو بھیج دیا۔ حضرت مُغیرہ رضی اللہ عنہ وہاں پہنچے تو سونے کے تخت پر اُس کے پاس جا بیٹھے۔ محافظوں نے حضرت مُغیرہ رضی اللہ عنہ کو کھینچ کر وہاں سے اٹھانے کی کوشش کی۔ حضرت مُغیرہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ہمیں تمھارے بارے میں عقل کی کمی کی خبریں ملتی تھیں۔ مجھے تم سے بڑی بے وقوف قوم کہیں نظر نہیں آئی۔ ہم عرب لوگ ایک دوسرے کو اُس وقت تک غلام نہیں بناتے جب تک کہ وہ اُس کے نظریئے کے خلاف نہ ہو۔ میرا گمان تھا کہ تم بھی ہماری طرح ایک دوسرے کے غم گُسار ہوگے۔ یہ طریقہ تمھارے لیے انتہائی بہتر تھا لیکن مجھے خبر ملی ہے کہ تم آپس میں ایک دوسرے کو رب مانتے ہو۔ اس طرح تمھاری یہ بادشاہت قائم نہ رہ سکے گی، کیونکہ ایسا طریقہ اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں، نہ ایسی سوچ کا کوئی فائدہ ہے۔

حضرت مُغیرہ رضی اللہ عنہ کی باتیں سن کر وہاں موجود لوگوں نے کہا: اللہ کی قسم! یہ عربی سچ کہتا ہے۔ کسانوں کے سرداروں نے کہا: اِس نے ایسی باتیں کی ہیں کہ ہمارے غلام اس کی طرف کھنچے چلے جائیں

گے۔ ہمارے بڑوں کا برا ہو جنھوں نے اِن لوگوں کی طرف توجہ نہ کی، پھر رُستم نے گفتگو کی، اُس نے عربوں کو انتہائی حقیر قرار دیا۔ اہلِ فارس کو بہت بڑھا چڑھا کر بیان کیا۔ اور عرب والوں کی خستہ حالی اور تنگ دلی کا تذکرہ کیا۔

حضرت مُغیرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تم نے جو ہماری بدحالی اور تنگدستی کا ذکر کیا ہے ہمیں اس کا اعتراف ہے، ہم اسے خوب جانتے ہیں۔ یہ دنیا پلٹے کھانے والی ہے۔ ہر تنگی کے بعد آسانی ہوتی ہے۔ پھر حضرت مُغیرہ رضی اللہ عنہ نے وہی باتیں کیں جو اُن سے پہلے حضرت رِبعی رضی اللہ عنہ اور حضرت حُذیفہ رضی اللہ عنہ نے کی تھیں۔ انھوں نے رُستم کو قبولِ اسلام، جزیہ یا جنگ میں سے کسی ایک بات کو اختیار کرنے پر زور دیا اور اپنی بات ختم کردی۔[1]

رُستم نے علاحدگی میں اہلِ فارس سے مشورہ کیا اور کہا: اِن لوگوں کا تمھارے ساتھ یہ کیسا رویہ ہے؟ پہلے دو عربی آئے۔ انھوں نے دلیری سے سر چڑھ کر گفتگو کی اور تمھیں چند باتوں کا اختیار دیا، پھر یہ شخص آیا تو اس نے بھی ویسی ہی گفتگو کی۔ یہ سب ایک ہی نہج پر چلتے ہیں اور ایک ہی منشور کے قائل ہیں۔ یہ لوگ سچے ہیں یا جھوٹے، اس سے قطع نظر سچ یہ ہے کہ یہ لوگ ہیں بہت دلیر۔ اللہ کی قسم! اگر ان لوگوں کی یہی سیرت رہی اور یہ لوگ اپنے آپ کو داغدار ہونے سے بچاتے رہے تو اِن میں اختلاف نہ ہوگا۔ ایسے متحد لوگ اپنے ارادوں کی تکمیل میں کوئی رکاوٹ نہیں پائیں گے، اگر یہ اپنے قول میں سچے ہیں تو اِن کے سامنے کوئی نہیں ٹھہر سکتا۔

دوسری طرف مسلمان بھی تیاری مکمل کر چکے تھے۔ انھوں نے جنگ کے لیے اچھی تیاری کی۔ وہ پھر پوری تیاری سے قادسیہ کے میدان میں اترے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے اسلامی لشکر کو خطبہ دیتے ہوئے یہ آیت تلاوت فرمائی:

﴿ وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ ﴾

[الأنبياء: ١٠٥]

''اور بلاشبہہ ہم زبور میں نصیحت کے بعد یہ لکھ چکے ہیں کہ بے شک میرے نیک بندے زمین کے وارث ہوں گے۔''

حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے تمام قاریوں کو حکم دیا کہ وہ سورۃ الانفال کی تلاوت کریں۔ انھوں نے سورۃ الانفال کی تلاوت کی۔ تلاوت ختم ہوئی تو اہلِ لشکر کے حوصلے اور ولولے بیدار اور روحیں شاداب

[1] الكامل في التاريخ (٢/ ١٠٨)

ہوچکی تھیں۔ آنکھیں اور سینے کھل چکے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے سکینت نازل ہورہی تھی۔ اِس کے بعد حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے خطبہ دیا۔ اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء بیان کی اور فرمایا: اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ ﴾

''اور بلاشبہ ہم زبور میں نصیحت کے بعد یہ لکھ چکے ہیں کہ بے شک میرے نیک بندے زمین کے وارث ہوں گے۔''

اے لوگو! یہ سب تمھاری میراث ہے۔ مسلسل تمھارے رب کی طرف سے کیا گیا وعدہ ہے۔

اذان سن کر رُستم کی بوکھلاہٹ:

رستم نجف کے علاقے میں اُترا تو اس نے اپنا ایک جاسوس اسلامی لشکر میں بھیجا۔ یہ جاسوس بھیس بدل کر اسلامی لشکر میں گُھس گیا۔ اس نے دیکھا کہ مسلمان ہر نماز کے لیے مسواک کرتے ہیں۔ نماز پڑھتے ہیں، پھر اپنے اپنے مورچے پر جا پہنچتے ہیں۔ یہ جاسوس واپس آیا اور رُستم کو مکمل حالات سے آگاہ کیا۔ رُستم نے سوال کیا: یہ لوگ کیا کھاتے ہیں؟ جاسوس نے جواب دیا: میں نے ان لوگوں کے درمیان ایک رات گزاری ہے۔ اللہ کی قسم! میں نے انھیں کوئی خاص چیز کھاتے نہیں دیکھا۔ صرف یہ دیکھا کہ ان کے پاس چھوٹی چھوٹی ٹہنیاں ہوتی ہیں انھیں یہ صبح وشام چوستے ہیں۔

رُستم وہاں سے آگے بڑھا۔ اس نے مقامِ عتیق اور مقامِ حصن کے درمیان پڑاؤ ڈالا، یہ صبح کا وقت تھا اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ کا مؤذن نمازِ فجر کے لیے اذان دے رہا تھا۔ رُستم نے دیکھا کہ سب مجاہدین جلدی جلدی اُٹھ رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر اس نے اپنے لشکر میں اعلان کرادیا کہ فوراً اپنی سواریوں پر سوار ہوجاؤ۔ اس کے فوجیوں نے سوال کیا: کیوں؟ اس نے کہا: کیا تم دیکھتے نہیں کہ تمھارے دشمن کے لشکر میں اعلان ہوچکا ہے اور وہ حرکت میں آگئے ہیں۔ یہ سن کر رُستم کے جاسوس نے کہا: ان کی یہ نقل وحرکت صرف نماز کے لیے ہے۔ رُستم نے فارسی زبان میں کہا کہ میرے کان میں صبح سویرے ایک آواز آئی تھی۔ یہ آواز (حضرت) عمر (رضی اللہ عنہ) کی تھی۔ وہی (استغفر اللہ) کتوں سے گفتگو کرتا ہے اور انھیں عقل وشعور عطا کرتا ہے (معاذ اللہ)۔ جب رُستم نہر پار کرکے مدِ مقابل آپہنچا تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے مؤذن نے ظہر کی نماز کے لیے اذان دی۔ رُستم پھر بولا: ''أَكَلَ عُمَرُ كَبِدِيْ''، ''عمر نے میرے جگر کو چھلنی کر دیا ہے۔''[1]

---

[1] تاریخ الطبري (٤/ ٣٥٨)

جنگی ہسپتال:

جنگ کے زخمیوں کے لیے مقامِ عذیب میں ایک عارضی ہسپتال قائم کیا گیا۔ ان کی نگرانی کے لیے مجاہدین کی صابر و شاکر اور اللہ سے اجر کی امیدوار عورتیں مقرر تھیں۔ وہ زخمیوں کی نگہداشت، علاج اور عیادت کرتی رہیں اور جنگ کے اختتام تک اپنے فرائض انجام دیتی رہیں۔ ہسپتال کی نگرانی کے علاوہ یہ عظیم خواتین شہداء کے لیے گورکنی کا کام بھی کر رہی تھیں۔ اس کام میں اُن کے بچے بھی شریک تھے۔

زخمیوں کی دیکھ بھال اور مرہم پٹی کا کام تو عورتوں کے لیے زیادہ دشوار نہ تھا لیکن سنگلاخ زمین کھودنا اور شہیدوں کے لیے قبریں تیار کرنا ان کی زبردست قوتِ ارادی اور عالی ہمتی کی نشانی تھی۔

دراصل تمام مرد جہادی سرگرمیوں میں انتہائی مصروف تھے، لہٰذا بوقتِ ضرورت عورتوں نے ان کی بعض ذمہ داریاں سنبھالیں اور بے حد مشکل فریضہ انجام دے کر انھوں نے اپنے مضبوط ایمان اور صبرِ جمیل کا ثبوت دیا۔ تمام شہداء کو عذیب اور وادیٔ عین الشّمس کے درمیان واقع اونچے میدان میں دفن کیا گیا۔ اسلامی لشکر اور سپاہِ فارس کے درمیان رات کے وقت لڑائی موقوف ہونے کی وجہ سے مجاہدین کو مقامِ عذیب میں موجود اپنے اہلِ خانہ کی خبر گیری کا موقع ملا۔[1]

جنگ کے دوران میں عظیم شاعرہ حضرت خنساء بنت عَمرو رضی اللہ عنہا کا بے مثال کردار:

مقامِ عذیب میں مسلمان عورتوں کے خیمے میں بنوسلیم قبیلے کی شاعرہ حضرت خنساء رضی اللہ عنہا نے اپنے چار بیٹوں کو نصیحت فرماتے ہوئے کہا: بلاشبہ تم اپنی مرضی سے مسلمان ہوئے ہو۔ تم نے کسی جبر کے بغیر ہجرت کی۔ تمھیں خوب یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لیے کافروں کے خلاف قتال میں کیسا زبردست اجر تیار کر رکھا ہے، خوب جان لو! باقی رہنے والا گھر فنا ہونے والے گھر سے بہتر ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ يَٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴾

[آل عمران: ۲۰۰]

’’اے لوگو جو ایمان لائے ہو! صبر سے کام لو، ثابت قدم رہو اور کمر بستہ رہو اور اللہ سے ڈرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔‘‘

جب تم صبح کے وقت اللہ کی مشیّت کے ساتھ سلامتی سے بیدار ہو جاؤ تو انعاماتِ ربانیہ کو سامنے

[1] التاريخ الإسلامي (١٠/ ٤٥١ ـ ٤٥٢)

رکھو۔ دشمن کے خلاف اللہ تعالیٰ سے مدد کی امید رکھو۔ دشمن کی طرف بڑھو۔ جب تم دیکھو کہ لڑائی زوروں پر ہے اور جنگ کے شُعلے بھڑک اٹھے ہیں اور مختلف اطراف سے ہمارے مجاہدوں پر گر رہے ہیں تو تم فوراً جنگ کے شُعلوں میں کود پڑو۔ جب پورا لشکر دشمن سے ٹکرا چکا ہو تو تم تلواریں سونت کر گُھمسان کی جنگ میں گُھس جاؤ۔ اس طرح تم دنیا میں غنیمت اور عزت، جبکہ آخرت میں ہمیشہ کی زندگی اور بہت بلند درجہ پاؤ گے۔ حضرت خنساء رضی اللہ عنہا کے بیٹے اپنی ماں کی نصیحت کے بعد عزمِ مصمّم لے کر رخصت ہوئے اور علی الصباح اپنے مورچوں پر جا پہنچے۔[1]

یومِ اغواث:

جنگِ قادسیہ کے دوسرے دن کو یومِ اغواث کہا جاتا ہے۔ اور اغواث مدد کے معنوں میں ہے، اس دن کو یومِ اغواث اس لیے کہا گیا کہ اُس روز رات کے وقت شام کی طرف سے آنے والے ایک لشکر کا امدادی ہراول دستہ حضرت قعقاع بن عَمرو تمیمی رضی اللہ عنہ کی زیرِ کمان وہاں پہنچا تھا۔ امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شام کے گورنر حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کو حکم دیا تھا کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے لشکر کو قادسیہ میں مسلمانوں کی مدد کے لیے عراق کی طرف واپس بھیج دو۔

حضرت خنساء رضی اللہ عنہا کے چاروں بیٹوں کی جانبازی:

اُس دن حضرت خنساء رضی اللہ عنہا کے چاروں بیٹوں نے جانبازی کا بے مثال مظاہرہ کیا۔ وہ سب بڑی دلیری سے میدانِ کارزار میں آئے۔ ان میں سے ہر ایک نے بڑھ چڑھ کر حملہ کرتے ہوئے شہادت پائی۔

یومِ عماس:

یومِ عماس قادسیہ کے تیسرے دن کو کہا جاتا ہے۔ عماس کا معنیٰ شدید جنگ ہے اور دورانِ جنگ میدانِ کارزار میں کام آنے والے جوانوں کی تدفین کے موقع کو بھی عماس کہا جاتا ہے۔

حضرت طلیحہ بن خویلد اسدی رضی اللہ عنہ کا کردار:

تیسرے دن رات تک لڑائی ہوتی رہی، پھر اچانک حضرت طلیحہ رضی اللہ عنہ کی آواز سب کے درمیان

[1] الإصابة في تمييز الصحابة (٨/ ١١١) الاستيعاب، رقم الترجمه (٢٨٧) نساء، والقادسية لاحمد عادل كمال (ص: ١٤٦ـ ١٤٧)

حائل ہوگئی۔ حضرت طلیحہ رضی اللہ عنہ دشمن کے عقب سے بول رہے تھے۔ اہلِ فارس اپنے عقب میں حضرت طلیحہ رضی اللہ عنہ کی آواز سن کر گھبرا گئے۔ اُدھر مسلمانوں کو بھی انتہائی تعجب ہوا۔ وہ ایک دوسرے کو روک کر حضرت طلیحہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں پوچھنے لگے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے حضرت طلیحہ رضی اللہ عنہ کو مسلمانوں کے لیے خطرناک ثابت ہونے والی جگہ کی حفاظت پر مامور فرمایا تھا۔ حضرت طلیحہ رضی اللہ عنہ نے اپنی مہم سے تجاوز کیا۔ وہ عقب میں جا پہنچے۔ پھر سپاہِ فارس کی عقب سے گھوم نکلے اور تین دفعہ نعرۂ تکبیر بلند کیا۔[1]

ان کے اس عمل سے نفسیاتی طور پر مسلمانوں کو یہ فائدہ ہوا کہ لڑائی تھم گئی۔ اس طرح انھیں اپنی صفوں کی تنظیمِ نو اور رات کی جنگ کے لیے مزید تیاری کا موقع مل گیا۔

لیلۃ الہریر:

قادسیہ کی جنگ چار دن جاری رہی، چوتھے دن سے پہلے رات ہی کو جنگ شروع ہوگئی۔ اس رات کو لیلۃ الہریر کہا گیا۔ کیونکہ اُس رات اہلِ فارس اور مسلمانوں کے مابین سلسلۂ کلام منقطع ہوگیا تھا، صرف آوازیں سنائی دیتی تھیں، جبکہ ہریر کا لغوی معنیٰ کتے کے بھونکنے کے بجائے محض غرّانے کا ہے۔

یومِ القادسیہ:

جنگ جاری رہی۔ چوتھا دن آپہنچا۔ اس دن کی صبح ہوتے ہی حضرت قعقاع رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے، بلند آواز میں مسلمانوں کو مخاطب کیا۔ فرمایا: بلاشبہ شکست عنقریب اس کا مقدّر ہوگی جس پر فوری حملہ ہوگا۔ تم تھوڑی دیر صبر کرو اور حملہ کر دو۔ صبر کرنے ہی سے مدد حاصل ہوتی ہے۔ تم صبر کو بے صبری پر ترجیح دو۔ یہ سن کر بہت سے مسلمان زعماء ان کے ساتھ ہولیے اور علی الصباح ہی رُستم کے لشکر پر حملہ کر دیا۔ یہ دیکھ کر بہت سے بہادر مسلمان آگے بڑھے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے اولیاء کی اپنے خاص لشکر کے ذریعے مدد فرمائی۔ سمتِ مغرب سے دبّور نامی بڑی تیز و تند آندھی چلی جس میں رُستم کے تخت کے اوپر تنا ہوا چھپر اُڑ کر نہرِ عتیق میں جا گرا۔ اور چاروں طرف سے لشکرِ فارس پر زبردست گرد و غبار برسنے لگا۔ اس طرح انھیں اپنا دفاع کرنے کا موقع ہی نہ ملا۔[2]

[1] تاريخ الطبري (٤/ ٣٨٢)

[2] التاريخ الإسلامي (١٠/ ٤٧٦)

رستم کی ہلاکت:

حضرت قعقاع رضی اللہ عنہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ آگے بڑھے اور رُستم کے تخت کے قریب جا پہنچے۔ رُستم اپنے تخت کو چھوڑ کر بھاگا اور ایک خچر کے پیچھے چُھپ گیا۔ وہ خچر رُستم پر گر پڑا۔ جس کی ضرب سے اس کی ریڑھ کی ہڈی کے مُہرے ٹوٹ گئے۔ وہ اسی حالت میں بھاگا۔ وہ نہرِ عتیق میں چھلانگ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اسے ایک مجاہد حضرت ہلال رضی اللہ عنہ نے دیکھ لیا۔ اس نے رُستم کا پاؤں پکڑ کر اُسے نہر سے گھسیٹ لیا اور قتل کر ڈالا۔ پھر اُس کے تخت پر چڑھ کر اعلان کیا: ربِ کعبہ کی قسم! میں نے رُستم کو ہلاک کر دیا ہے۔ میری طرف آؤ۔ لوگ فوراً اس کے طرف مڑے۔ انھوں نے رُستم کا تخت دیکھا تو اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا، پھر وہ ایک دوسرے کو آوازیں دینے لگے۔ اب اہلِ فارس کا لشکر شکست کھا چکا تھا۔ حضرت قعقاع رضی اللہ عنہ کے علاوہ کئی دوسرے کمانڈر بھی آگے آگئے۔ انھوں اپنے مقابل دشمن کو زیر کرتے ہوئے اتنی تیزی سے پیش قدمی کی کہ دشمن کے پاؤں اکھڑ گئے۔

اُدھر جب جالینوس نے رُستم کی ہلاکت کی خبر سنی تو وہ نہر پر قائم ایک دیوار پر چڑھ گیا اور بآوازِ بلند اپنے لشکر کو نہر عبور کر کے نکل بھاگنے کا حکم دیا۔ لشکرِ فارس میں بڑی بڑی زنجیروں میں ایک دوسرے سے بندھے ہوئے سارے فوجی نہرِ عتیق میں گر گئے۔ اُن کی تعداد تقریباً تیس ہزار (۳۰۰۰۰) تھی۔ مسلمانوں نے انھیں اپنے نیزوں سے مار ڈالا۔ ایک فوجی بھی زندہ بچ کر نہ جا سکا۔[1]

معرکے کا خاتمہ:

اللہ تعالیٰ کی توفیق کے بعد اسلامی سپاہ کی جاں فشانی اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی حکمتِ عملی کی بدولت یہ معرکہ فتح مندی سے ختم ہوگیا۔ یہ انتہائی ہولناک جنگ تھی۔ اس میں دشمن مسلمانوں کے سامنے تین دن تک ڈٹا رہا۔ چوتھے دن اللہ نے اُسے شکست سے دوچار فرمایا، جبکہ عمومی طور پر مسلمان اپنے دشمن کو ایک ہی دن میں زیر کر لیتے تھے۔

اہلِ فارس کی ثابت قدمی سے محسوس ہوتا تھا کہ وہ اِس معرکے کے نتائج کو خوب سمجھتے تھے کہ یا تو وہ فتح یاب ہوں گے اور اُن کی سلطنت باقی رہے گی، یا شکست کی وجہ سے اُن کی سلطنت اِس طرح ختم

[1] تاريخ الطبري (٤/ ٣٨٨)

ہوجائے گی کہ اس کا ایک ستون بھی نہیں بچے گا۔ رُستم اور اس کے عظیم جرنیلوں کی وہاں موجودگی نے بھی انھیں حوصلہ مند رکھا۔ رستم اتنا ماہر سپہ سالار تھا کہ اُس کی زیرِ کمان سپاہِ فارس نے اپنے دشمنوں پر بہت سی کامیابیاں حاصل کی تھیں جن سے تاریخ بھری پڑی ہے۔

متذکّرہ بالا اسباب کے علاوہ سپاہِ فارس کی ثابت قدمی کی ایک وجہ اُن کی بھاری تعداد اور جنگی تیاری میں فوقیت بھی ہوسکتی ہے۔ اُن کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار (۱۲۰۰۰۰) تھی۔ یہ تعداد صرف ان کے لڑاکا سپاہیوں کی تھی۔ دیگر شعبوں کے افراد اِن کے علاوہ تھے، اور یزدگرد کی طرف سے روزانہ آنے والی کُمک بھی اِس کے علاوہ تھی، جبکہ مسلمانوں کی تعداد صرف تیس ہزار (۳۰۰۰۰) سے کچھ اوپر تھی۔ مسلمانوں کے آٹھ ہزار پانچ سو (۸۵۰۰) مجاہد شہید ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے انھیں تاریخی فتح سے ہمکنار فرمایا۔[1]

ابتدائی جنگوں میں شہید ہونے والے مجاہدوں کے مقابلے میں یہ مسلمانوں کی شہید ہونے والی سب سے بڑی تعداد تھی جو اِس معرکے کی شدت اور مسلمانوں کی پامردی کا ثبوت ہے کہ وہ کس قدر دلیر اور شہادت کے کتنے متمنّی تھے۔[2]

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی طرف فتح کی نوید اور اس سے ماخوذ اسباق:

حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے امیر المؤمنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حضرت سعد بن عمیلہ فزاری رضی اللہ عنہ کے ہاتھ فتح کی خوش خبری کا پیغام ارسال فرمایا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے اُس مکتوب میں نہایت قیمتی سبق چمک رہے ہیں۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے اس مکتوب میں اللہ تعالیٰ کی توحید اور یگانہ عظمت بیان کی اور لوگوں کی طاقت اور قربانی سے فتح کے حصول کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب فرمایا، حالانکہ تمام مسلمانوں نے اس جہاد میں انتہائی تھکا دینے والی جد و جہد اور عظیم قربانیاں پیش کی تھیں۔

دشمن کی مضبوط قوت کو ختم کرنا کسی بشر کے بس کی بات نہیں، یہ تو اُسی مالک و خالق کے ہاتھ میں تھا جس نے دشمنوں کو اپنی قوت سے کوئی فائدہ حاصل نہ کرنے دیا۔ یہ نعمت اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو عطا فرمائی اور انسان تو محض ایسے اسباب ہیں جن کے ذریعے سے اللہ نفع یا نقصان پہنچاتا ہے۔ تنہا وہی اکیلی ذات ہے جو نفع عطا کرنے اور نقصان سے محفوظ رکھنے کی طاقت رکھتی ہے۔

---

[1] تاريخ الطبري (٤/ ٣٨٨)

[2] التاريخ الإسلامي (١٠/ ٤٧٩)

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ مدینہ طیبہ آنے والے ہر قافلے سے محاذِ قادسیہ کے بارے میں تازہ ترین خبریں ضرور معلوم کرتے تھے اور صبح سے نصف النہار تک مدینہ سے باہر اسی تگ و دَو میں بیٹھے رہتے تھے۔ دوپہر کے وقت وہ اپنے گھر تشریف لے آتے۔ جس دن فتحِ قادسیہ کی خوشخبری دینے والا ایلچی آیا، اُس کی ملاقات سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے ہوئی۔ وہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے براہِ راست متعارف نہیں تھا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اُس سے دریافت فرمایا: تم کہاں سے آئے ہو؟ اس نے جواب دیا کہ قادسیہ سے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: پورا واقعہ بیان کرو۔ اُس نے کہا: اللہ تعالیٰ نے دشمن کو شکست دی۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اُس کے ساتھ ساتھ پیدل چل رہے تھے اور اُس سے فتح کی باتیں سن رہے تھے اور آنے والا اونٹنی پر سوار چلا آ رہا تھا۔ جب سیدنا عمر رضی اللہ عنہ مدینہ کی گلیوں میں داخل ہوئے تو لوگوں نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو امیر المؤمنین کہہ کر سلام کرنا شروع کیا۔ اُس شخص نے عرض کی: اللہ تعالیٰ آپ پر رحمت فرمائے، آپ نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا کہ آپ امیر المؤمنین ہیں؟ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"لَا عَلَيْكَ يَا أَخِي"[1] "میرے بھائی! اس میں کوئی حرج کی بات نہیں۔"

اس واقعے میں بھی بہت سبق آموز اور قابلِ توجہ باتیں جھلملا رہی ہیں:

1. سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا جنگ کے حالات دریافت کرنے کے لیے مکمل اہتمام کرنا اور روزانہ مدینہ سے باہر نکل کر عراق سے آنے والے ہر سوار سے مسلمانوں اور اہلِ فارس کی خبریں دریافت کرنا۔ اُن کے تجسّس اور احساسِ ذمہ داری کا ثبوت ہے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ اس کام کے لیے کسی اور شخص کو مقرر فرما دیتے۔ اس طرح جیسے ہی کوئی اطلاع پہنچتی وہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو اس کی اطلاع دے دیتا۔ لیکن اُن کی بے قراری اور معاملے کی زبردست اہمیت انھیں اِس کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ اُن کا یہ عمل اُن کے احساسِ ذمہ داری کی نادر مثال ہے۔

2. اس واقعے سے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی انتہائی عاجزی کا اظہار بھی ہو رہا ہے کہ وہ خوش خبری دینے والے کے ساتھ ساتھ پیدل چل رہے ہیں اور اُس سے معرکے کی تفصیلات سنتے جا رہے ہیں۔ اِدھر یہ آنے والا شخص انھیں مکمل خبر دینے سے اس لیے گریز کرتا ہے کہ وہ سب سے پہلے امیر المؤمنین کو مکمل تفصیلات سے آگاہ کرنے کا آرزومند تھا۔ اُسے یہ علم ہی نہ تھا کہ اُس کے ساتھ ساتھ پیدل چلنے والا

[1] تاريخ الطبري (٤/ ٤٠٨)

شخص ہی امیر المؤمنین ہے۔ مدینہ میں داخل ہوکر اسے معلوم ہوا کہ یہ امیر المؤمنین ہیں۔

یہ وہ بلند ترین اخلاق ہیں جو تمام مسلمانوں کو اپنانے چاہئیں۔ اپنے اسلافِ کرام کی ایسی درخشاں سیرت پر فخر کرنا چاہیے۔ اس سیرت سے، دینِ اسلام کی عظمت، دور اندیشی اور عاجزی جیسے اوصافِ حمیدہ سے متّصف ہوکر حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے فقید المثال انسان پیدا ہوئے۔[1]

معرکۂ قادسیہ کے اثرات ونتائج:

معرکۂ قادسیہ یقیناً تاریخِ عالَم کے فیصلہ کن معرکوں میں سرِفہرست ہے۔ یہ معرکہ سچے اہلِ ایمان کی ثابت قدمی کے مختلف نمونوں کا حامل ہے۔ اِسی معرکہ کے اثرات تھے کہ مسلمانوں کے لیے عراق کے دروازے کھل گئے۔ عراق کے بعد پورا علاقۂ فارس مسلمانوں کے زیرِنگیں آگیا۔ یہی وہ فتح تھی جس کے سبب مستقبل کی کامیابیاں مسلمانوں کے قدم چومتی رہیں اور ساسانی اقوام جنگی اور سیاسی دونوں میدانوں میں ناکام ہوتی رہیں۔ دین اور عقیدے کی رُو سے ایک مجوسی قوم اسلام کے مقابلے میں نیست و نابود ہوگئی۔ یہاں سے اسلام ایران اور اس سے آگے بڑھ کر تمام علاقوں میں پھیلتا چلا گیا۔

قادسیہ میں مسلمانوں نے مجوسیوں کی شان وشوکت اِس طرح ختم کردی کہ اُس کے بعد بھی وہ کبھی نہ سنبھل سکے۔ اِس طرح معرکۂ قادسیہ انسانی تاریخ کے فیصلہ کن معرکوں میں سرِفہرست ٹھہرا۔

فتحِ قادسیہ کے بعد سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا خطبہ:

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے پاس فتح کی خوشخبری پہنچی تو انھوں نے لوگوں کو حضرت سعد رضی اللہ عنہ کا مکتوب پڑھ کر سنایا اور فرمایا: میری یہی دلی خواہش ہے کہ کثرتِ افراد کے باوجود میں ہر شخص کی ضرورت پوری کرنے کا سامان مہیا کرسکوں۔ اگر ایسا نہ ہو سکے تو کم از کم ہم سب ایک دوسرے کی غمخواری کریں۔ اپنی بساط کے مطابق مساویانہ زندگی گزاریں۔ میری خواہش ہے کہ تم میرے ظاہر کو دیکھ کر میرے دل کی کیفیت جان سکو۔ میں تمھیں اپنے عمل سے تعلیم دینا چاہتا ہوں۔ اللہ کی قسم! میں کوئی بادشاہ نہیں ہوں کہ تمھیں اپنا غلام بنالوں۔ میں تو صرف اللہ تعالیٰ کا عاجز بندہ ہوں۔ مجھ پر امانت کا بوجھ ہے۔ اگر میں لوگوں کے مال سے تعرّض نہ کروں اور وہ سب تمھیں عطا کردوں اور تمھاری خبر گیری کروں تا آنکہ تم سب اپنے گھروں میں

---

[1] التاريخ الإسلامي (١٠/ ٤٨٨)

[2] الطريق إلى المدائن (ص: ٤٧٣-٤٧٤)

اچھی طرح سے سیر اور سیراب ہو جاؤ تو یہ میری خوش قسمتی ہوگی اور اگر میں یہ سارا مال اپنے گھر لے جاؤں تو یہ میرے لیے بدبختی ہے۔ اِس طرح میں وقتی طور پر تو تھوڑی دیر کے لیے خوش ہوجاؤں گا مگر پھر مستقل لمبے عرصے کے لیے دُکھوں میں مبتلا ہوجاؤں گا۔[1]

مجاہدین اور نمایاں کارنامے انجام دینے والوں کے لیے خُمس اور انعام:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ قادسیہ کا خُمس معرکۂ قادسیہ میں شریک مجاہدین کو دے دیا جائے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے اس فیصلے پر عمل درآمد کیا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا یہ فیصلہ نہایت رفیع الشان اجتہاد تھا۔ جس طرح انھوں نے عراق کی زمینیں وہاں کے مکینوں کے قبضے میں رہنے دینے کا فیصلہ کیا تھا، اُسی طرح انھوں نے اسلامی ریاست کی مصلحت اسی میں دیکھی کہ اس جنگ کا خُمس بھی اسی معرکے کے مجاہدین کی عظیم قربانیوں کے اعتراف میں انہی کی حوصلہ افزائی اور خوش حالی کے لیے صَرف کیا جائے۔[2]

اس معرکے میں ستر (۷۰) سے زیادہ بدری، تین سو دس (۳۱۰) سے زیادہ بیعتِ رضوان میں شامل ہونے والے، تین سو (۳۰۰) فتحِ مکہ میں شامل ہونے والے اور دیگر سات سو (۷۰۰) سے زیادہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے حصہ لیا۔ اِس معرکے کی اس قدر تیاری ہوئی کہ اِس کی مثال اِس سے پہلے کسی دور میں نہیں ملتی۔

دریا کے پار مدائن کی فتح:

حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے دریا عبور کرنے کا اعلان فرما دیا اور مجاہدین سے دریافت فرمایا: کون دریا عبور کرنے میں پہل کرے گا اور دریا کے پار جا کر دریا کے مشرقی ساحل پر قبضہ کرے گا تاکہ اس کے بعد لوگ وہاں پہنچ سکیں اور دشمن کو بھاگنے سے روکیں؟ حضرت عاصم بن عَمرو تمیمی رضی اللہ عنہ نے چیلنج قبول کرلیا۔ وہ انتہائی دلیر اور جنگجو مجاہد تھے۔ اُن کے بعد انتہائی تیز رفتار دستوں پر مشتمل چھ سو (۶۰۰) مزید مجاہدین ان کے ساتھ دریا پار کرنے کے لیے تیار ہوگئے۔ اور دجلہ کی موجوں میں کود پڑے، پھر باقی افراد ان کے پیچھے دجلہ میں اُتر گئے، اس طرح مسلمانوں کا ایک فِدائی دستہ تیار ہوا۔ اس میں چھ سو (۶۰۰) مجاہدین شامل تھے جس کا نام "كتيبة الأهوال"، یعنی ''مشکلات میں کودنے والا دستہ'' رکھا گیا۔ اُن میں سے ساٹھ چیدہ چیدہ افراد کو اپنی زیرِ قیادت لے کر حضرت عاصم رضی اللہ عنہ نے دجلہ میں گھوڑے ڈال دیے تاکہ یہ ساٹھ افراد دیگر

[1] تاريخ الطبري (٤/ ٤٠٩)

[2] أمير المؤمنين عمر بن الخطاب الخليفة المجتهد للعمراني ص: ١٦٣)

مجاہدین کے لیے مقدمۃ الجیش کی حیثیت اختیار کر جائیں۔

حضرت عاصم رضی اللہ عنہ نے ساٹھ افراد کی معیت میں گھوڑوں پر سوار ہوکر دریائے دجلہ عبور کرلیا۔ بعد ازاں باقی چھے سو (٦٠٠) مجاہدین بھی وہاں پہنچے اور مشرقی ساحل کا کنٹرول مکمل طور پر سنبھال لیا۔[1]

اسلامی لشکر دریائے دجلہ میں:

جب حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ حضرت عاصم رضی اللہ عنہ ساحل پر اتر کر اسے محفوظ بنا چکے ہیں تو انھوں نے فوراً لشکر کو دریا میں اترنے کا حکم دے دیا اور فرمایا: لوگو! ہم اللہ سے مدد طلب کرتے ہیں اور اُسی پر توکّل کرتے ہیں: ”حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ“ اور ”لَا حَوْلَ وَ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ“ پڑھتے ہوئے دریا میں کود جاؤ، لشکر کا بڑا حصہ باہم مل کر گہرے دریا میں کود پڑا۔ اُس وقت دریائے دجلہ طُغیانی پر تھا، خوب جھاگ پیدا ہو رہا تھا اور پانی کالا ہوگیا تھا۔ مجاہدین دریا عبور کرتے ہوئے باہم اس طرح گفتگو کرتے جا رہے تھے جیسے وہ زمین پر چل رہے ہوں۔[2]

حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے ساتھ ساتھ جو شخص پانی میں سفر کر رہا تھا وہ حضرت سلمان الفارسی رضی اللہ عنہ تھے۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اسلام ہمیشہ زندہ رہے گا۔ جس طرح اللہ نے مسلمانوں کے لیے یہ زمین مسخّر فرمائی ہے اُسی طرح اِس دریا کو بھی مسخّر فرمائے گا۔

”اَمَّا وَالَّذِيْ نَفْسُ سَلْمَانَ بِيَدِهٖ! لَيَخْرُجُنَّ مِنْهُ أَفْوَاجاً كَمَا دَخَلُوْهُ أَفْوَاجاً“[3]

”خبردار! قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں سلمان (رضی اللہ عنہ) کی جان ہے! اس دریا سے یہ لوگ فوج درفوج نکلیں گے جس طرح فوج درفوج داخل ہوئے تھے۔“

مسلمانوں کی امانت داری کے مظاہرے:

مسلمان مدائن میں داخل ہوئے، انھوں نے مالِ غنیمت یکجا کرنا شروع کیا۔ یکا یک ایک آدمی بہت سا قیمتی سامان اٹھائے ہوئے آیا اور غنیمت جمع کرنے والے افسر کے پاس جمع کرا دیا۔ وہاں موجود لوگوں نے کہا: ہم نے اس جیسا آدمی نہیں دیکھا۔ جتنا قیمتی سامان یہ شخص لایا ہے، ہمارے پاس تو اتنا زیادہ

[1] تاریخ الطبري (٤/ ٤٥٦، ٤٥٧)

[2] التاریخ الإسلامي (١١/ ١٦٩)

[3] تاریخ الطبري (٤/ ٤٥٩)

اور قیمتی مقدار کا سامان نہیں ہے۔ اب انھوں نے سامان لانے والے سے پوچھا: کیا تو نے اس سے کچھ سامان لیا ہے؟ اس نے کہا: اللہ کی قسم! اگر اللہ تعالیٰ کا ڈر نہ ہوتا تو میں یہ گراں قدر سامان تمھارے پاس ہرگز نہ لاتا۔ یہ جواب سن کر انھوں نے اندازہ لگایا کہ یہ انتہائی برگزیدہ آدمی ہے۔ انھوں نے اُس سے پوچھا: تم کون ہو؟ اس نے جواب دیا: اللہ کی قسم! میں تمھیں ہرگز نہیں بتاؤں گا کیونکہ تم مجھے اچھا کہو گے۔ نہ میں کسی اور کو بتاؤں گا مبادا وہ میری مدح سرائی کرے، پھر اس نے کہا:

"لَكِنَّنِي أَحْمَدُ اللّٰهَ وَ أَرْضَىٰ بِثَوَابِهِ"

''میں تو صرف اپنے اللہ رب العزت کی تعریف کرتا ہوں اور اُسی کے ثواب پر راضی ہوں۔''

لوگوں نے ایک آدمی اس کے پیچھے روانہ کیا۔ اُس نے اُس کے ساتھیوں سے اُس کے بارے میں پوچھا تو پتا چلا کہ وہ حضرت عامر بن عبد قیس رضی اللہ عنہ تھے۔[1]

نوادرِ غنیمت اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا موقف:

حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے سیّدنا عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں کسریٰ کی قبا، اس کی تلوار، کنگن، شلوار، قمیص، تاج اور موزے ارسال فرمائے۔ یہ سب چیزیں ریشم، سونا اور جواہرات سے بھی بڑھ کر نہایت قیمتی نوادر تھے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"اَللّٰهُمَّ اِنَّكَ مَنَعْتَ رَسُوْلَكَ وَ نَبِيَّكَ وَكَانَ أَحَبَّ اِلَيْكَ مِنِّي وَأَكْرَمَ عَلَيْكَ مِنِّيْ وَمَنَعْتَهُ أَبَابَكْرٍ وَكَانَ أَحَبَّ اِلَيْكَ مِنِّيْ وَأَكْرَمَ عَلَيْكَ مِنِّيْ وَأَعْطَيْتَنِيْهِ فَأَعُوْذُ بِكَ أَنْ تَكُوْنَ أَعْطَيْتَنِيْهِ لِتَمْكُرَ بِيْ"

''اے اللہ! بلاشبہ تُو نے یہ سب کچھ اپنے محبوب رسول اور نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مرحمت نہیں فرمایا، حالانکہ وہ تجھے مجھ سے زیادہ محبوب ومکرّم تھے۔ اسی طرح تُو نے یہ سب کچھ (حضرت) ابوبکر (رضی اللہ عنہ) کو بھی نہیں دیا، حالانکہ وہ تجھے مجھ سے زیادہ محبوب ومکرّم تھے۔ تو نے مجھے یہ سب کچھ عطا کر دیا ہے۔ اے اللہ! میں تیری پناہ پکڑتا ہوں اس سے کہ تُو مجھے کسی فتنے میں مبتلا کر دے۔''

پھر وہ اس قدر روئے کہ قریب بیٹھے افراد کی آنکھیں بھی بھیگ گئیں اور انھیں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ پر بڑا ترس آیا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ شام ہونے سے پہلے پہلے یہ تمام نوادر بیچ کر حاصل ہونے والی رقم مسلمانوں میں تقسیم کر دو۔

[1] تاريخ الطبري (٤/ ٤٦٨)

جلولاء کے اموالِ غنیمت کے بارے میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا موقف:

اسی طرح معرکۂ جلولاء میں فتح نے مسلمانوں کے قدم چومے۔ انھیں اُس معرکے میں بڑی بہتات سے مالِ غنیمت ہاتھ آیا۔ اُس کا خُمس سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں بھیجا گیا۔ آپ نے اتنا کثیر مال دیکھا تو فرمایا: میں یہ مال کہیں محفوظ نہیں کروں گا بلکہ سارا کا سارا تقسیم کر دوں گا۔

اُس رات حضرت عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ اور حضرت عبد اللہ بن ارقم رضی اللہ عنہ نے مسجد کے صحن میں اُس مال کی نگرانی کی۔ صبح سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کچھ لوگوں کے ساتھ وہاں پہنچے۔ انھوں نے سامان پر ڈالی ہوئی چمڑے کی چادریں ہٹائیں تو انتہائی قیمتی چمکتے ہوئے یاقوت، جواہر اور زبرجد دیکھے اور رونے لگے۔ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے عرض کی: اے امیر المؤمنین! آپ کیوں روتے ہیں؟ یہ تو شکر کا مقام ہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"تَاللّٰهِ !مَا أَعْطَى اللّٰهُ هٰذَا قَوْماً اِلَّا تَحَاسَدُوْا وَ تَبَاغَضُوْا وَلَا تَحَاسَدُوْا اِلَّا أُلْقِيَ بَأْسُهُمْ بَيْنَهُمْ"[1]

''اللہ کی قسم! (میرے رونے کا سبب یہ ہے کہ) اللہ نے جس قوم کے لوگوں کو بھی ایسے اموال عطا فرمائے وہ باہم حسد اور بُغض رکھنے والے بن گئے۔ اور اس کی وجہ سے آپس میں لڑنے لگے۔''

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا یہ کلام اُن کے زبردست ایمان کی نشانی ہے۔ مومن مستقبل میں پیش آنے والے حالات قبل از وقت یوں محسوس کر لیتا ہے کہ کسی اور دل میں ایسے وقائع کا گمان بھی نہیں گزرتا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو خدشہ لاحق ہوا کہ ایسا نہ ہو کہ آئندہ مسلمانوں کے باہمی تعلقات دنیاوی آلائشوں سے مکدّر ہو جائیں۔ جس کے نتیجے میں دلوں میں دوریاں پیدا ہو جائیں۔ یہی وہ شدید احساس تھا جس کے زیرِ اثر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ لوگوں کی موجودگی میں سرِ عام رو پڑے۔

رامہرمز کی فتح اور تستّر کی فتح بھی حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں ہوئی۔

معرکۂ نہاوند کی عظیم الشان فتح (۲۱ھ):

مسلمان افواج قومِ فارس کے خلاف مختلف معرکوں میں مسلسل بہت سی فتح مندیوں سے ہمکنار ہو چکی تھیں۔ وہ دشمن کو اپنے شکست خوردہ فرار ہونے والے افراد کو یکجا ہونے کا موقع دیے بغیر اُن کا

[1] تاريخ الطبري (٤/ ٤٨٠)

تعاقب کرتے رہے اور انھیں تہہِ تیغ کرتے رہے۔ جنگِ قادسیہ کے فیصلہ کُن معرکے سے لے کر معرکۂ نہاوند تک چار سال بیت چکے تھے۔ اور اِس عرصے میں پے در پے فتوحات حاصل کرتے رہے اور اسلامی لشکر مسلسل پیش قدمی کرتا رہا تا کہ ایک سسکتی بادشاہت کے باقی ماندہ شکست خوردہ افراد کا صفایا بھی کر دیا جائے۔ اِسی دوران میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسلامی لشکروں کو زاغروس کے پہاڑوں سے آگے بڑھنے سے روک دیا۔ اب وہ مسلسل جہاد میں مصروف اسلامی لشکروں کو آرام کا موقع فراہم کرنا چاہتے تھے اور مفتوحہ علاقوں کی تنظیمِ نو کی طرف توجہ فرمانے کے خواہشمند تھے۔[1]

بلادِ عجم پر یُورش:

نہاوند کی فتح کے بعد مسلمانوں نے عجمی علاقوں پر یُورش کر دی۔ اب اہلِ فارس میں مقابلے کی سکت نہیں رہی تھی۔ مسلمان حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکم کے مطابق آگے بڑھے اور خون ریز معرکے کے بعد اصفہان کا شہر ''جَيّ''، فتح کرلیا۔ وہاں کے حکّام نے مسلمانوں سے مصالحت کرلی۔ حضرت عبداللہ بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے صلح نامہ لکھا اور انھیں امان دی۔ وہاں کے مقامی لوگوں میں سے تقریباً تیس آدمی کِرمان بھاگ گئے۔ انھوں نے مصالحت نہیں کی۔ ۲۱ ہجری میں حضرت ابوموسی رضی اللہ عنہ نے ''قُم'' اور ''قاشان'' کے علاقے بھی فتح کر لیے۔ بعد ازاں حضرت سہیل بن عدی رضی اللہ عنہ نے کِرمان فتح کرلیا۔

- ہمدان کی فتح (۲۲ھ)
- رَے کی فتح (۲۲ھ)
- قُومس اور جُرجان کی فتح (۲۲ھ)
- آذربائیجان کی فتح (۲۲ھ)
- الباب کی فتح (۲۲ھ) بھی عہدِ فاروقی میں ہوئی۔
- ترکوں کے خلاف پہلا جہاد
- معرکۂ خراسان (۲۲ھ) اور یزدگرد کا فرار بھی اُسی عہدِ مبارک میں ہوا۔
- اصطخر کی فتح (۲۳ھ): مسلمانوں نے دوسری مرتبہ ۲۳ ہجری میں اصطخر فتح کیا۔
- دارابجرد (فسا) کی فتح (۲۳ھ)

[1] الفن العسكري الإسلامي (ص: ٢٨٠ ـ ٢٩٠)

- کِرمان اور سجستان کی فتح (۲۳ھ) بھی اُسی دورِ میمون میں ہوئی۔ کرمان ۲۳ ہجری کو حضرت سہیل بن عدی رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں فتح ہوا۔
- مکران کی فتح (۲۳ھ): بھی حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ کی خلافت میں ہوئی، ۲۳ ہجری میں حضرت حَکم بن عَمرو رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر مکران فتح ہوا۔
- کُردوں کے خلاف جنگ بھی خلافتِ فاروقی میں ہوئی۔

دمشق کی فتح:

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں شامی علاقوں کی فتوحات کا پہلا دَور شروع ہو چکا تھا۔ اب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں اس محاذ پر فتوحات کا دوسرا مرحلہ شروع ہوا۔

القدس کی فتح اور معرکۂ اجنادین:

رومیوں کی طرف سے فلسطینیوں کا جو حاکم مقرر کیا جاتا تھا وہ ''ارطبون'' کہلاتا تھا۔ وہ عظیم روحانی قائد اور یونانی شہنشاہیّت کا عظیم ستون سمجھا جاتا تھا۔ ارطبون رومیوں کے انتہائی سمجھدار، معاملہ فہم اور کامیاب چال چلنے والے فرد کو کہا جاتا تھا۔ اس نے اپنے دفاع کے لیے ایک لشکرِ جرّار رملہ میں اور دوسرا ایلیاء (بیت المقدس) میں تعینات کر رکھا تھا۔[1]

حضرت عَمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مفصّل حالات لکھ بھیجے اور ان سے فلسطین کی مہم کے بارے میں حکم اور ہدایات طلب کیں۔ اُسی موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ مشہورِ زمانہ قول ارشاد فرمایا:

''قَدْ رَمَيْنَا أَرْطَبُونَ الرُّوْمِ بِأَرْطَبُوْنَ الْعَرَبِ، فَانْظُرُوْا عَمَّا تَنْفَرِجُ''[2]

''ہم نے رومی ارطبون کے مقابلے میں عربی ارطبون مقرر کر دیا ہے، اب دیکھو فتح کس کا مقدّر رہے۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ دونوں ہی قائد اپنی اپنی قوم میں انتہائی ذہین اور معاملہ فہم افراد سمجھے جاتے ہیں۔ ۱۵ ہجری میں پیش آنے والا دوسرا معرکہ (اجنادین) فلسطین کی طرف پیش قدمی کا سبب بن گیا۔ اجنادین حضرت عَمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں فتح ہوا۔ وہاں رومیوں کے لشکر کو شکست فاش ہوئی۔[3]

---

[1] حروب القدس في التاريخ الإسلامي و العربي للدكتور ياسين سويد (ص: ٣٥)

[2] تاريخ الطبري (٤/ ٤٣١)

[3] حروب القدس في التاريخ الإسلامي و العربي للدكتور ياسين سويد (ص: ٣٥)

اللہ نے تمھیں اسلام کی بدولت عزت عطا فرمائی:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ شام کی طرف روانہ ہوئے، گدھے پر سوار تھے۔ ان کی دونوں ٹانگیں ایک طرف تھیں۔ ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے عرض کی: اے امیر المؤمنین! اب وقت آ گیا ہے کہ بڑے بڑے سردار آپ سے ملاقات کے لیے آئیں گے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"أَعَزَّكُمُ اللّٰهُ بِالْإِسْلَامِ فَمَهْمَا تَطْلُبُوا الْعِزَّةَ بِغَيْرِهٖ يُذِلُّكُمُ اللّٰهُ"[1]

''بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے تمھیں اسلام کے باعث عزت سے نوازا ہے، اگر تم نے اسلام کے علاوہ کہیں اور عزت تلاش کی تو اللہ تعالیٰ تمھیں رسوا کر دے گا۔''

الجزیرہ کی فتح (۱۷ھ):

وہاں کے باشندے بھی مصالحت پر آمادہ ہو گئے۔ اس طرح الجزیرہ کا وسیع علاقہ بغیر کسی جنگ کے مطیع ہو گیا اور اس کی فتح سب سے زیادہ آسان ثابت ہوئی۔[2]

مصر اور لیبیا کی فتوحات:

مصر کی فتوحات بڑی ترتیب سے عمل میں آئیں۔

بُرقہ اور طرابلس کی فتح:

حضرت عَمرو بن عاص رضی اللہ عنہ جب مصر کی فتح مکمل کر چکے اور اس پر مضبوطی سے کنٹرول قائم کر لیا تو غربی جانب سے ممکنہ خطرات سے نپٹنے کے لیے غربی جانب متوجہ ہوئے کیونکہ وہاں بُرقہ اور طرابلس کے علاقوں میں رومی لشکر قلعہ بند رہتے تھے اور یہ خدشہ موجود تھا کہ رومی موقع پا کر وہاں سے مصر کے مسلمانوں پر حملہ نہ کر دیں۔

حضرت عَمرو بن عاص رضی اللہ عنہ ۲۲ ہجری میں اپنے لشکر کے ہمراہ بُرقہ کی طرف بڑھے۔ اُن دنوں بُرقہ اور اسکندریہ کے درمیان ہریالی اور آبادی موجود تھی لیکن وہ راستے میں کسی قسم کی پریشانی کا سامنا کیے بغیر آسانی سے بُرقہ پہنچ گئے۔ وہاں پہنچتے ہی اہلِ بُرقہ نے جزیہ ادا کرنے کی شرط پر صلح کر لی۔

[1] محض الصواب (۲/ ۵۹۰) اس کی سند صحیح ہے، مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: المستدرك للحاكم (۱/۶۱) رقم الحديث (۲۰۷)

[2] تاريخ الطبري (۵/ ۲۶-۳۰)

بُرقہ کی فتح کے بعد اہلِ بُرقہ پابندی کے ساتھ پورا خراج والیِ مصر کو روانہ کرتے رہے۔ مغربی علاقوں میں اہلِ بُرقہ انتہائی فرماں بردار ثابت ہوئے اور کسی قسم کے فتنے میں نہیں پڑے۔

اُن فتوحات کے بعد سیدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے عہدِ زرّیں میں اسلامی ریاست کی حدود مشرق میں دریائے جیحون اور سندھ تک، مغرب میں افریقہ اور صحرائے اعظم تک، شمال میں ایشیائے کوچک اور سرزمین آرمینیا تک اور جنوب میں نوبہ (سوڈان) تک وسیع ہوگئیں۔ یوں تاریخِ عالَم میں پہلی دفعہ ایک ایسی زبردست عالمی قوّت معرضِ وجود میں آئی جس میں طرح طرح کے رنگ ونسل، ادیان، اقوام اور جداگانہ عادات کے بھانت بھانت کے لوگ پائے جاتے تھے۔ سب لوگ اسلام کے عادلانہ بلکہ کریمانہ نظام سے پوری طرح مطمئن تھے۔ اس دینِ حنیف نے مختلف عقائد، عادات اور طرح طرح کے ادیان کی موجودگی کے باوجود اپنی ریاست کے تمام باشندوں کے جملہ حقوق بلا امتیاز محفوظ کر دیے تھے۔[1]

امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف فتح کی خوشخبری:

حضرت عَمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ بن حُدَیج رضی اللہ عنہ کو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی خدمت میں فتح کی خوشخبری سنانے کے لیے روانہ ہونے کا حکم دیا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے کہا: کیا آپ یہ پیغام مجھے لکھ کر نہیں دیں گے؟ حضرت عَمرو رضی اللہ عنہ نے فرمایا: لکھنے کی کیا ضرورت ہے؟ کیا تم عربی نہیں ہو کہ یہ پیغام نہیں پہنچا سکتے؟ اور کیا تم نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا؟[2]

حضرت معاویہ بن حُدَیج رضی اللہ عنہ روانہ ہوگئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں پہنچے۔ اسکندریہ کی فتح کی خوشخبری سنائی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ خوشخبری سن کر سجدے میں گر گئے اور فرمایا: اللہ تعالیٰ کا شکر ہے۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی سادگی:

حضرت عَمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کو پیغام بھیجا کہ ہم نے آپ کے لیے مصر کی جامع مسجد کے پاس ایک گھر تیار کیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب میں لکھا کہ میں حجاز کا رہنے والا آدمی ہوں تم نے مصر میں میرا گھر کیوں بنایا؟ پھر حکم دیا کہ اسے مسلمانوں کی منڈی کا حصہ بنا دیا جائے۔[3]

[1] الدولة الإسلامية في عصر الخلفاء الراشدين (ص: ٢٣١)

[2] فتوح مصر و المغرب (ص: ١٠٤ـ١٠٥)

[3] فتوح مصر (ص: ٦٩)

یہ واقعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی کمال درجہ پرہیزگاری کا نمونہ ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کس قدر محتاط اور قناعت پسند تھے اور دنیاوی جاہ و جلال سے کس قدر بے اعتنائی برتتے تھے۔ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ اپنی شخصی صفاتِ عالیہ کے باعث ہی جلالت مآب تھے اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی صف میں نہایت ممتاز درجے پر فائز تھے، پھر جب وہ دنیا کی سب سے بڑی مملکت کے سربراہ بن گئے۔ تب بھی اُن کی شانِ زہد و قناعت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ جب اتنی بڑی مقتدر شخصیت دنیاوی آلودگیوں سے اتنی محتاط تھی تو ان سے نچلے درجے کے لوگوں کو تو دنیاوی وجاہتوں سے بہت زیادہ احتیاط برتنی چاہیے۔[1]

اسلامی فتوحات کا بنیادی سبب اور مقصد:

بعض عیسائی اور مستشرق مؤرخین نے خلفائے راشدین کے عہدِ زرّیں میں ہونے والی فتوحات کو دھندلانے اور مَیلا کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ یہ جنگیں دینی تعصب کی بنیاد پر لڑی گئیں۔ مسلمان ایک خاص عقیدہ رکھتے تھے۔ وہ اندھے تعصّب میں ڈوبے ہوئے تھے۔ وہ آگے بڑھے۔ انھوں نے لوگوں کو ان کی مرضی کے خلاف زبردستی اسلامی قوانین کا پابند بنالیا۔ اپنے اس مقصد کے حصول میں انھوں نے سنگدلی سے کام لیا۔ خون کے سمندر سے بھی گزرنا پڑا تو گوارا کرلیا۔ وہ ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے ہاتھ میں قرآن تھامے ہوئے تھے۔[2]

اس نظریئے کو پھیلانے میں سیڈیو، میور اور نیور نے اہم کردار ادا کیا۔ میور، نیور سے نقل کرتا ہے کہ اسلام کو ہمیشہ قائم رکھنے کی لیے ضروری تھا کہ دشمنی پر مبنی منصوبہ بندی کی جائے اور لوگوں کو بزورِ شمشیر اسلام میں داخل کرلیا جائے، یا کم سے کم پوری دنیا پر قبضہ کرلیا جائے۔ تلوار کے آگے لوگ آخر کار گھٹنے ٹیک ہی دیتے ہیں۔

عیسائی مستشرقین کی اس قسم کی باتیں انتہائی غلط، بے بنیاد اور گمراہ کُن ہیں۔ اسلام ایک دینِ حق ہے، یہ گمان کرنا کہ مسلمانوں نے اسلامی دعوت پھیلانے میں قوت کا سہارا لیا، یا وہ غیر مسلمانوں سے دشمنی پر اُتر آئے تھے، یہ ایسا گمراہ کُن الزام ہے کہ جس کی بڑی شدّت سے تردید اور انکار لازم ہے۔[3]

---

[1] التاريخ الإسلامي (١٢/ ٣٥٦)

[2] تاريخ العرب العام لسيديو (ص: ١٣٣)

[3] فتح مصر بَين الرؤية الإسلامية و الرؤية النصرانية (ص: ١٢٦)

بعض دیانتدار مستشرقین نے ان الزامات کی تردید بھی کی ہے اور کہا ہے کہ اسلامی فتوحات صاف شفاف، مثالی اور کریمانہ اخلاق سے مزیّن تھیں۔ الفرڈ فون کریمر کہتا ہے: عرب مسلمان جنگوں میں نہایت کریمانہ اخلاق کا ثبوت دیتے تھے۔ اُن کے گرامی رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) نے انھیں درویشوں، بوڑھوں، عورتوں، بچوں اور نابینا افراد کو قتل کرنے سے روک رکھا تھا۔ اِسی طرح ان کی کھیتیاں برباد کرنا اور درخت کاٹنا بھی حرام قرار دے رکھا تھا۔ مسلمانوں نے فتوحات کے دوران میں اِن احکام کی سختی سے پابندی کی۔ انھوں نے کسی کی عزت پامال نہیں کی۔ کسی کو ناجائز طور پر قتل نہیں کیا۔ نہ کھیتیوں کو نقصان پہنچایا، جبکہ رومی زہریلے تیروں کی بارش کرتے تھے۔ مگر مسلمانوں نے برائی کا جواب برائی سے نہیں دیا۔ رومی جب بھی یلغار کرتے تھے تو بستیاں لوٹ لیتے تھے یا جنگ میں ہزیمت اٹھا کر پیچھے ہٹتے تھے تو بستیوں کو نذرِ آتش کر دیا کرتے تھے، جبکہ مسلمان نہایت بلند اخلاق سے مزیّن تھے۔ انھوں نے کبھی اِس قسم کی کوئی حرکت نہیں کی۔ [1]

ذہانت و فطانت اور احساسِ ذمہ داری:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

”وَلَكُمْ عَلَيَّ أَنْ لَّا أُلْقِيَكُمْ فِي الْمَهَالِكِ وَلَا أَحْجُزَكُمْ فِي ثُغُورِكُمْ“ [2]

”اے لوگو! مجھ پر لازم ہے کہ میں تمھیں کسی بربادی یا ہلاکت گاہ میں نہ پڑنے دوں اور نہ تمھیں ہر وقت سرحدی چوکیوں پر مقرر کیے رکھوں۔“

ریاست کی حدود کا تعیّن:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسلامی ریاست وسیع ہوجانے کی پیشِ نظر اسلامی ریاست کی حدود اور مسلمانوں کے بارے میں فکر مند رہتے تھے۔ جب اُن کے سامنے رومیوں سے مزید قتال کی تجویز رکھی گئی تو انھوں نے اسے پسند نہیں کیا اور فرمایا:

”وَ اللّٰهِ لَوَدِدْتُّ أَنَّ الدَّرْبَ جَمْرَةٌ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ لَنَا مَا دُوْنَهٗ وَلِلرُّوْمِ مَا وَرَاءَهٗ“ [3]

”اللہ کی قسم! میری خواہش یہ ہے کہ ہمارے اور ان کے درمیان آگ کا ایک پہاڑ ہو۔ ہم پہاڑ کے اِس طرف اور وہ اُس طرف ہی رہیں۔“

---

[1] الإسلام و حركة التاريخ لأنور الجندى (ص: ٨٣)
[2] موسوعة فقه عمر (ص: ١٠٩)
[3] تاريخ اليعقوبي (٢/ ١٥٥)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایسے ہی جذبات کا اظہار اہلِ فارس کے بارے میں بھی کیا۔ فرمایا: میری تمنا ہے کہ پہاڑ اور ارضِ سواد کے درمیان ایک دیوار حائل ہو۔ نہ ہم اُس طرف جاسکیں نہ وہ اِس طرف آسکیں۔ ہمیں آسودہ زندگی کے لیے ارضِ سواد ہی کافی ہے۔ مجھے مسلمانوں کی سلامتی اموالِ غنیمت سے زیادہ عزیز ہے۔[1]

چھاؤنیوں کا قیام:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسلامی فوجی چھاؤنیاں قائم کرنے کا حکم دیا اور اُن چھاؤنیوں کے مختلف اہداف و مقاصد بھی مقرر فرمائے۔ یہ چھاؤنیاں فوجی نقطۂ نظر سے اسلامی ریاست کی سرحدوں پر قائم کی گئیں۔ انھیں اسلامی عرب علاقوں اور مفتوحہ سرزمین کے کنارے کنارے قائم کیا گیا تاکہ کسی بھی ممکنہ حملے کا فوری جواب اور اپنا بچاؤ کیا جاسکے، نیز یہ چھاؤنیاں مزید لشکر بندی اور اسلامی دعوت عام کرنے کی لیے بھی اہم مراکز کا کام دے سکیں۔ سلطنتِ فارس کی طرف کوفہ، بصرہ اور مصر کی جانب فُسطاط میں نہایت محکم چھاؤنیاں قائم کی گئیں۔[2]

اُن چھاؤنیوں کے علاوہ ساحلِ سمندر پر بھی سرحدوں کی نشاندہی کی گئی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شامی ساحلوں پر سمندر کی جانب سے ممکنہ حملوں سے بچاؤ کے پیشِ نظر سرحدی قلعہ بندی کا انتظام فرمایا۔ دفاعی چھاؤنیوں کا قیام اور سرحدی علاقوں میں قلعہ بندی کا یہ اقدام حفاظتی نقطۂ نظر سے کیا گیا۔

اس کے ساتھ ساتھ ایک اہم حکمتِ عملی یہ بھی اختیار کی گئی کہ لشکرِ مجاہدین کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ اُس کا ایک حصہ لشکرِ غازی کہلاتا تھا اور دوسرے حصے کو وقتاً فوقتاً حسبِ ضرورت نقل وحمل میں مصروف رکھا جاتا تھا۔ نقل وحمل کی ذمہ داری باری باری سب پر ڈالی جاتی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شام کے ساحلی علاقے کا پورا فوجی نظام مربوط کر دیا تھا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب بیت المقدس کی فتح کے سلسلے میں شام پہنچے تو انھوں نے شامی سرحدوں کا خود جائزہ لیا۔ وہاں حفاظتی فوجی دستے اور پولیس چوکیاں قائم کرائیں۔ انھوں نے خبر رسانی کا ادارہ بھی بنایا اور اس کے قائدین کا تقرر کیا۔ انھوں نے تمام سرحدوں کا بنفسِ نفیس دورہ فرمایا اور ممکنہ ضروریات کا خود اندازہ لگا کر سرحدیں محفوظ کرنے کے جامع انتظامات فرمائے۔[3]

---

[1] تاريخ الطبري، الإدارة العسكرية (١/ ٣٥٢)

[2] الإدارة العسكرية (١/ ٤٥٢)

[3] الإدارة العسكرية (١/ ٤٥٧)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیت المقدس سے واپس مدینہ پہنچے تو لوگوں سے خطاب فرمایا۔ آپ نے کہا:

''خبر دار اے لوگو! مجھے تم پر خلیفہ مقرر کیا گیا۔ مجھے اللہ تعالیٰ نے تمھارے جن امور کا ذمہ دار بنایا تھا وہ میں نے پورے کر دیے۔ تمھارے مابین انصاف کے ساتھ مالِ فَے تقسیم کیا گیا۔ تمھیں رہایش گاہیں دی گئیں۔ تمھارے جنگی محاذوں کی تشکیل کر دی گئی۔ تمھارے لیے لشکروں کو منظّم کر دیا گیا۔ سرحدوں کا تعیّن کیا گیا۔ تمھیں محفوظ بنایا گیا۔ مالِ فَے سے تمھارے حالات بہتر کر دیے گئے۔ شامی فتوحات سے حاصل ہونے والی آمدنی تم میں تقسیم کر دی گئی۔ تمھاری خواہشات کی تکمیل کی گئی۔ تمھارے لیے عطیات اور روزینوں کا اہتمام کیا گیا۔ اب اگر کسی کے پاس کوئی قابلِ عمل مشورہ ہو تو مطلع کرے۔ ہم ان شاء اللہ اس پر عمل کریں گے۔ اور اللہ تعالیٰ کی توفیق کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔''[1]

حضرت عَمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے جب اسکندریہ فتح کیا تو اُس کے سرحدی علاقہ میں اُس کی حفاظت کے لیے ایک ہزار نفری پر مشتمل مسلّح دستے مقرر کیے لیکن یہ تعداد مطلوبہ مقاصد کے لیے انتہائی کم تھی۔ اِس سے رومیوں نے فائدہ اٹھایا اور سمندری راستے سے اِس پر حملہ کر دیا۔ انھوں نے بہت سے افراد کو شہید کر دیا اور تھوڑے لوگ ہی بچ جانے میں کامیاب ہوئے۔ حضرت عَمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے اس صورتِ حال کے پیشِ نظر اس سرحدی مرکز کو دوبارہ فتح کیا اور پھر اپنا چوتھائی لشکر اسکندریہ کی حفاظت کے لیے مامور کر دیا۔ کچھ فوجی دستے دیگر ساحلی علاقوں میں بھیجے، جبکہ آدھا لشکر اُن کے پاس فُسطاط ہی میں رہا۔[2]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہر سال مدینہ منورہ سے بسلسلہ نگرانی ایک دستہ اسکندریہ کی طرف بھیجا کرتے تھے اور اُسے نصیحت کی جاتی کہ اس کی حفاظت سے ہرگز غافل نہ ہونا، سخت نگرانی کرنا۔ یہ دستہ اُس فوج کے علاوہ ہوتا تھا جسے حضرت عَمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے وہاں تعینات کر رکھا تھا۔[3]

اس طرح سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی انتہائی ذہانت و فطانت سے عراقی، شامی اور مصری تینوں محاذوں پر اسلامی سرحدوں کو محفوظ بنا دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مستقل قائم ہونے والے سرحدی مراکز کے علاوہ دفاعی نقطۂ نظر سے سردیوں اور گرمیوں کے جدا جدا لشکر بھی ترتیب دیے۔ یہ وہ دستے تھے جو سردیوں اور گرمیوں

[1] تاريخ الطبري (٤/ ٤٠)

[2] البحرية في مصر الإسلامية و آثارها الباقيه لسعاد ماهر (ص: ٧٧)

[3] فتوح مصر (ص: ١٩٢)

کے اعتبار سے پوری ریاست کا سالانہ دورہ کرتے تھے، نگرانی کے کام کام کا جائزہ لیتے تھے اور دشمن کی طرف پیش قدمی کرتے تھے۔[1]

یہ مقرر شدہ دستے نہ صرف شامی علاقوں میں متعیّن تھے بلکہ اسلامی ریاست کے ہر علاقے میں موجود تھے۔ اُن کی نگرانی حضرت ابوعبیدہ بن جرّاح، معاویہ بن ابی سفیان اور نعمان بن مقرن رضی اللہ عنہم وغیرہ جیسے کبار قائدین فرماتے تھے۔[2]

حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ سرحدوں پر متعیّن فوجیوں کی تنخواہوں اور دیگر عطیات و مراعات میں مسلسل اضافہ فرماتے رہتے تھے تاکہ اُن کی وطن سے دوری کا احساس شدّت اختیار نہ کرے۔ وہ اُن کے لیے خصوصی قطعۂ اراضی بھی مرحمت فرماتے تھے۔[3]

حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے تمام حفاظتی مراکز پر مامور مختلف نوعیت کی خدمات انجام دینے والے کمانڈروں اور ماتحت فوجیوں کو مالِ فَے سے اُسی طرح اُن کا حصہ دیا جس طرح سب لوگوں کو دیا جاتا تھا۔ یہ اُن کی اُس خدمتِ جلیلہ کا اعتراف تھا کہ یہ مجاہدین دشمن کے سامنے ڈٹ کر مسلمانوں کی پُشت پناہی کرتے تھے اور مسلمان رعایا کو دشمن کی گزند سے محفوظ رکھنے کے لیے سرحدوں پر پہرا دیتے تھے۔[4]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں وصیّت فرمائی تھی کہ میں اپنے بعد آنے والے خلیفے کو نئے قائم کیے جانے والے شہروں کے باشندوں سے بھلائی کی وصیّت کرتا ہوں۔ یہ لوگ اسلام کے پُشت پناہ ہیں، اموال کو جمع کرنے والے ہیں، دشمن کے لیے غیظ و غضب کا سبب ہیں۔ اور اس بات کے ضامن ہیں کہ کوئی اُن سے اُن کے فاضل اموال اُن کی رضا مندی کے بغیر نہ لے۔[5]

عہدِ فاروقی کی فتوحات کے نتائج:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد کی فتوحات کے بڑے دُور رس انقلابی نتائج مرتّب ہوئے۔ ایک طرف سرزمینِ فارس سے ساسانی مملکت کا جڑ سے خاتمہ ہوگیا اور دوسری طرف رومی بازنطینی سلطنت سے ٹکراؤ

---

[1] الإدارة العسكرية (١/ ٤٦٤)

[2] فتوح البلدان للبلاذري (١/ ١٩٤،١٩٥)

[3] الفن الحربي في صدر الإسلام لعبد الرؤوف عون (ص:٢٠١)

[4] الادارة العسكرية (٢/ ٤٦٥) تاريخ الطبري (٤/ ١٣٤)

[5] مناقب أمير المؤمنين عمر لابن الجوزي (ص: ٢١٩-٢٢٠)

ہوا۔ اِس طرح جاہلی دَور میں سلطنتِ فارس اور رومیوں کے مابین جاری رہنے والی اس مہلک کشمکش کا خاتمہ ہوا جس کی وجہ سے متعلقہ علاقوں کے عوام کے مابَین خونریز جنگیں ہوئیں جن میں بے شمار لوگ مارے گئے اور دونوں مملکتوں کا شدید نقصان ہوا۔ اُن دونوں بڑی سلطنتوں کا مقصد صرف اپنی سرداری قائم رکھنا اور اپنا سِکہ جمانا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور کی فتوحات کی وجہ سے ایران اور روم کی باہمی جنگوں کا باب ہمیشہ کے لیے بند ہوگیا۔ اِس طرح عہدِ فاروقی کے مجاہدینِ اسلام اُن سلطنتوں کے غریب لوگوں کے لیے ابرِ رحمت اور پیامِ امن ثابت ہوئے۔

فتوحاتِ فاروقی نے مفتوحہ علاقوں کے عوام پر کسی قسم کے دباؤ یا اُن کے عقائد ونظریات کو تبدیل کیے بغیر انھیں ایک ربانی منہج کا پابند کردیا۔ کالے، سرخ، سفید اور زرد کے نظریات کی تمیز ختم کردی۔ سب اللہ تعالیٰ کے حضور یکساں قرار دے دیے گئے۔ فضیلت کا معیار صرف تقویٰ قرار پایا۔ مخلوق نے اللہ تعالیٰ کے اِس قانون کے سائے میں امن، استحکام، برکات، کشادگی اور فراخیِ رزق جیسے انعامات حاصل کیے۔

ملتِ اسلامیہ دنیا بھر میں ابھر کر سامنے آئی جو عقیدۂ توحید اور شریعتِ الٰہی کی بنیاد پر متحد ومنظّم تھی۔ وہ موروثی، نسبی اور دیگر زمینی امتیازات سے ماوراء تھی۔ امتِ محمدیہ -علیٰ صاحبها الصلاة والسلام- کے افراد اسلام کی ڈوری سے بندھے ہوئے تھے۔ اس امت میں سے بہت سی عظیم اور مخلص قیادتیں ابھر کر سامنے آئیں۔ انھیں اس امت میں انتہائی بلند مقام حاصل تھا۔ کوئی ایسا کردار سامنے نہ آیا جو ان کے اُجلے دامن کو مَیلا کردے یا ان کا مرتبہ گھٹا دے، اسی لیے وہ اپنے مقابلے میں لڑنے والوں سے کہتے تھے: اگر تم ہمارے دین کو قبول کرلو تو ہم تمھارے مابین کتاب اللہ نافذ کریں گے۔ تمھیں کتاب اللہ کے احکام ماننے کی برکات سے روشناس کرائیں گے اور تمھارا ملک تمھی کو سونپ کر واپس چلے جائیں گے۔[1]

فتوحاتِ فاروقی کی برکت سے ایک انتہائی شائستہ، مہذب، متوازن اور متناسب ربانی ثقافت کا ظہور ونفوذ ہوا جس نے اللہ تعالیٰ کی شریعت کے دائرے میں رہتے ہوئے تمام قوموں اور عوام کی طبائع کو اپنے اندر سمولیا اور ساری دنیا کو اپنا حصہ بنالیا۔ کالے، گورے اور زرد، سبھی رنگ ونسل کے لوگ ربانی منہج اور حکمِ الٰہی کے تحت ایک ہوگئے۔

حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ اپنے زمانے کی ترقی یافتہ انسانیت کے سب سے بڑے اور فقید المثال

[1] دراسات في عهد النبوة للشجاع ص: ٣٧٠)

لیڈر قرار پائے۔ انھوں نے ہمیں ایک ایسے طاقتور، ایمان دار، بالیدہ کردار اور صاحبِ علم انسان کے درخشندہ تصوّر سے روشناس کرایا جو اللہ تعالیٰ کے قانون کے نفاذ، اس کے دین کے اقتدار، انسانیت کی بے لوث خدمت، کلمۃ اللہ بلند کرنے، لوگوں کو اندھیروں سے نکالنے اور انسان کو انسانوں کی غلامی اور دنیاوی مظاہر کی عبادت سے نکال کر ایک اللہ کی عبادت کا راستہ دکھانے پر مامور تھا۔ اور ریاست کے تمام شعبوں خصوصاً افواج میں اتباعِ علوم ووسائل اور اسباب میں ایک مؤثر ترین عامل کی حیثیت رکھتا تھا اور اس نے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی عملی تطبیق ممکن بنادی تھی:

﴿ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۗ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ﴾ [الحج: ٤١]

''یہ (مسلمان) ایسے ہیں کہ اگر ہم ان کو ملک میں جما دیں (ان کی حکومت قائم کر دیں) تو نماز کو درستی سے پڑھیں گے اور زکاۃ دیں گے اور اچھی بات کا حکم کریں گے اور بُری بات سے منع کریں گے، اور سب کاموں کا انجام اللہ کے اختیار میں ہے۔''

فی الجملہ اسلامی فتوحات کے زیرِ اثر اسلام کے سائے میں نہایت بلند پایہ اور ترقی یافتہ انسانی تہذیب قائم ہوئی۔ ہم ربانی تہذیب کی تعریف اس طرح کر سکتے ہیں:

''زمین پر اللہ تعالیٰ کی خلافت کے قیام کی خاطر زندگی، کائنات اور انسان کے بارے میں اسلامی تصوّرات کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے مختلف انسانی سرگرمیوں کو ایک جماعت کے ماتحت کر دینے کا نام ربانی تہذیب ہے۔''[1]

فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی حیاتِ طیبہ کے آخری ایام:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی کی خلافت میں جزیرۂ عرب کے گرد تمام علاقوں میں اسلام پہنچا۔ اُن کی خلافت فتنوں کے مقابلے میں نہایت مضبوط بند کی حیثیت رکھتی تھی۔ وہ بجائے خود ایک ایسا بند دروازہ تھے کہ اُن کی زندگی میں کوئی فتنہ پرور جماعت اسے کھول سکی نہ اُس میں داخل ہوسکی۔ اُن کے عہد میں کوئی فتنہ سر نہ اٹھا سکا۔

---

[1] الإسلام و الحضارة للندوة العالميه للشباب (١/ ٩٠)

فتنوں کے بارے میں سیدنا عمر اور حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہما کے مابین گفتگو:

حضرت حُذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک دن ہم حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی خدمت میں بیٹھے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: تم میں سے کون فتنوں کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کو جانتا ہے؟ میں نے عرض کی: جس طرح نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا، مَیں ان کا فرمان اُسی طرح جانتا ہوں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بیان کرو، بلاشبہہ تم ایک دلیر آدمی ہو۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے بتایا کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے:

«فِتْنَةُ الرَّجُلِ فِيْ أَهْلِهِ وَمَالِهِ وَ نَفْسِهِ وَ وَلَدِهِ وَ جَارِهِ تُكَفِّرُهَا الصَّلَاةُ وَ الصِّيَامُ وَ الصَّدَقَةُ وَ الْأَمْرُ بِالْمَعْرُوْفِ وَ النَّهْيُ عَنِ الْمُنْكَرِ» [1]

''آدمی کا فتنہ جو اُس کے اہلِ خانہ، مال، جان، اولاد اور پڑوسی کے بارے میں ہوگا، اُسے اس کا روزہ، نماز، صدقہ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا عمل مٹادے گا۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے اس فتنے کے بارے میں سوال نہیں کیا، میری مراد وہ فتنہ ہے جو سمندر کی طرح جوش مارے گا۔ میں نے عرض کی: بھلا آپ کو اُس فتنے سے کیا واسطہ؟ بلاشبہہ آپ کے اور اُس فتنے کے درمیان ایک بند دروازہ موجود ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دریافت فرمایا: کیا وہ دروازہ ٹوٹ جائے گا یا اُسے کھول دیا جائے گا؟ میں نے عرض کی: وہ دروازہ ٹوٹ جائے گا، انھوں نے فرمایا: جب یہ دروازہ ٹوٹ گیا تو ممکن ہے کہ قیامت تک بند نہ ہو سکے۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرنے والے راوی حضرت ابو وائل رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا: کیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ اُس دروازے کے بارے میں جانتے تھے؟ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہاں، وہ اِس طرح جانتے تھے جس طرح آج کے بعد کل کا آنا یقینی ہے، میں نے انھیں ایسی احادیث سنائیں جن میں کسی قسم کا شک وشبہ نہ تھا۔

حضرت ابو وائل رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ہم اس بات سے ڈرے کہ آپ سے اُس دروازے کے بارے میں کچھ پوچھیں۔ ہم نے حضرت مسروق رحمہ اللہ سے گزارش کی کہ آپ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے اُس دروازے کے بارے میں پوچھیے۔ حضرت مسروق رحمہ اللہ نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے عرض کی: وہ دروازہ کون تھا؟

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٨٩٥، ٧٠٩٦)

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تھے۔[1]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو پورا یقین تھا کہ وہ شہادت کی موت مریں گے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جبلِ اُحد پر چڑھے۔ ان کے ساتھ حضرت ابوبکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم بھی تھے۔ پہاڑ لرزنے لگا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہاڑ پر اپنا پائے اقدس مار کر فرمایا:

«اُثْبُتْ أُحُدُ!فَاِنَّمَا عَلَيْكَ نَبِيٌّ وَصِدِّيْقٌ وَ شَهِيْدَانِ»[2]

''اے اُحد! ٹھہر جا۔ تجھ پر اِس وقت ایک نبی، ایک صدیق اور دو شہید موجود ہیں۔''

آخری حج کے موقع پر دعا (۲۳ھ):

حضرت سعید بن مسیّب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ منیٰ سے چلے اور وادیِ ابطح میں ٹھہرے۔ وہاں پتھروں کا ایک ڈھیر جمع کیا۔ اس پر کپڑا ڈالا اور لیٹ گئے، پھر اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف بلند کر دیے اور عرض کی: اے اللہ! میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ میری طاقت جواب دے رہی ہے۔ میری رعایا خوب پھیل گئی ہے، تُو مجھے اس حالت میں اپنے پاس بلا لے کہ میں نے کوئی کوتاہی کی ہو اور نہ کسی پر زیادتی، پھر حج کے باقی ارکان مکمل کرنے کے بعد مدینہ طیبہ تشریف لے آئے۔[3]

شہادت کی تمنّا:

حضرت زید بن اسلم رحمہ اللہ ورضی عنہ اپنے باپ سے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ دعا کی:

''اے اللہ! مجھے اپنے راستے میں شہادت نصیب فرما۔ مجھے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے شہر میں موت نصیب فرما۔''[4]

ایک روایت میں ہے:

''اے اللہ! تیرے راستے میں کٹ مرنے کی درخواست ہے۔ تیرے پیارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے شہر میں مرنا چاہتا ہوں۔''

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (۷۰۹٦)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (۳٦۷۵) تاريخ المدينة (۳/ ۸۷۲) اس روایت کی سند سعید بن مسیّب تک متصل ہے۔

[3] الخلفاء الراشدون للخالدي (ص: ۷۹)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (۱۸۹۰)

اس پر حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے کہا: اے ابا جان! یہ کیسے ممکن ہوگا؟ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''اگر اللہ چاہے گا تو اس کے اسباب فراہم کر دے گا۔''

شہادت کی آرزو اِس قدر صادق تھی کہ اللہ تعالیٰ نے صرف مدینہ ہی میں نہیں بلکہ مسجدِ نبوی اور خالص محرابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں شہادت نصیب فرمائی اور ''شہیدِ محراب'' کہلائے۔[1]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بارے میں حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کا خواب:

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: مَیں نے خواب دیکھا کہ میں بہت سے راستے دیکھ رہا ہوں۔ دیکھتے ہی دیکھتے سب راستے ختم ہو گئے، صرف ایک باقی رہ گیا۔ میں اُس پر چل پڑا۔ ایک پہاڑ پر پہنچا۔ اُس پہاڑ پر پھسلن تھی۔ اچانک میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا۔ اُن کے ساتھ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ وہ (حضرت) عمر (رضی اللہ عنہ) کو اشارے سے بلا رہے تھے۔ میں نے عرض کی: آپ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو لکھ کر پیغام کیوں نہیں بھیج دیتے؟ انھوں نے کہا: ''میں انھیں اُن کی موت کی خبر نہیں دے سکتا۔''[2]

مدینہ میں قیدی نہ رکھنے کا حکم:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ مفتوحہ علاقوں سے قید ہو کر آنے والے افراد کو مدینے میں قیام کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ وہ عراق کے مجوسیوں اور شام و مصر کے عیسائیوں کو اسلامی دار الخلافہ میں رکھنا گوارا نہ فرماتے تھے۔ وہاں تو ان کے لیے ایک ہی صورت میں رہایش ممکن ہوسکتی تھی کہ وہ سچے دل سے مسلمان ہوجائیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ فیصلہ اُن کی انتہائی دانائی اور دور اندیشی کا بیّن ثبوت تھا کیونکہ یہ شکست خوردہ افراد اسلام سے بُغض اور کینہ رکھتے تھے۔ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہر دم سازشوں اور مکر و فریب کے جال بنتے رہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کو اُن کے ممکنہ شر سے بچانے کے لیے یہ اصول وضع فرمایا لیکن بعض صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے پاس مجوسی اور عیسائی نسل کے کئی قیدی بطورِ غلام رہ رہے تھے۔ وہ اُن غلاموں کو مدینے ہی میں رہنے دینے کے لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر دباؤ ڈالتے تھے تاکہ وہ اپنے روز مرہ اُمور میں ان سے کام لے سکیں۔ اس لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بعض غلاموں کو مدینہ طیبہ میں اقامت کی اجازت دے رکھی تھی، حالانکہ وہ خود اِس کے حامی نہ تھے۔ آخر کار وہی ہوا جس کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ڈر تھا۔[3]

---

[1] الطبقات الكبرىٰ لابن سعد (٣/ ٣٣١) و تاريخ المدينة (٣/ ٨٧٢)

[2] الطبقات الكبرىٰ لابن سعد (٣/ ٢٣٣) اس روایت کی سند صحیح ہے۔

[3] الخلفاء الراشدون للخالدي (ص: ٨٣)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت:

حضرت عَمر و بن میمون رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جس دن حضرت عمر رضی اللہ عنہ شہید ہوئے، مَیں نمازِ فجر کے لیے صف میں موجود تھا۔ میں نماز کے انتظار میں کھڑا تھا، میرے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے درمیان صرف حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ہی تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی عادت تھی کہ جب صفوں کے درمیان سے گزرتے تو فرماتے تھے: برابر ہو جاؤ، جب وہ دیکھتے کہ صفوں میں کوئی خلاء نہیں رہا تو آگے بڑھتے اور تکبیرِ تحریمہ کہتے۔ وہ صبح کی نماز میں کبھی سورہ یوسف، کبھی سورہ نحل اور کبھی کوئی اور سورت تلاوت فرماتے۔ وہ پہلی رکعت میں لمبی قراءت فرماتے تھے تاکہ لوگ جماعت میں شامل ہو جائیں۔ اُس دن حسبِ معمول انھوں نے ابھی تکبیرِ تحریمہ ہی کہی تھی۔ کہ ایک مجوسی غلام دو دھاری خنجر سے ان پر حملہ آور ہوا، پھر وہ دائیں بائیں وار کرتا ہوا آگے بڑھا یہاں تک کہ اس نے تیرہ افراد کو زخمی کر دیا۔ ان میں سے سات افراد شہید ہو گئے۔ ایک آدمی نے جب یہ سانحہ دیکھا تو فوراً اُس پر چادر ڈال کر اُسے جکڑ لیا۔ جب مجوسی کو یقین ہو گیا کہ اب وہ قابو آ چکا ہے تو اس نے خود کشی کر لی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑا اور امامت کے لیے مصلّے پر کھڑا کر دیا۔ جو لوگ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قریب تھے، انھوں نے وہ سب کچھ دیکھا جو میں نے دیکھا، مسجد کے اطرف میں موجود نمازی اس سانحے سے بے خبر تھے۔

انھوں نے نماز پڑھانے کے لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی آواز نہ سنی تو ''سبحان اللہ'' کہنے لگے۔ حضرت عبد الرحمٰن رضی اللہ عنہ نے مختصر نماز پڑھائی۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے فرمایا: دیکھو مجھ پر کس نے حملہ کیا ہے؟ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما تھوڑی دیر کے بعد واپس آئے اور عرض کی: حضرت مُغیرہ بن شُعبہ رضی اللہ عنہ کے غلام نے حملہ کیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: وہی جو لوہار ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے عرض کی: جی ہاں! حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اسے برباد کرے۔ میں نے تو اُس کے لیے بھلائی کا حکم دیا تھا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اٹھا کر اُن کے گھر منتقل کر دیا گیا۔ ہم سب وہاں پہنچے۔ یہ اتنا الم ناک دن تھا کہ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے آج سے پہلے کبھی کوئی مصیبت اور دکھ نہیں آیا تھا۔ نبیذ لائی گئی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پی لی لیکن ساری نبیذ پیٹ کے زخم سے باہر نکل گئی، پھر دودھ لایا گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پی لیا تو وہ بھی نکل گیا۔ یہ دیکھ کر لوگوں کو یقین ہو گیا کہ اب حضرت عمر رضی اللہ عنہ جانبر نہ ہو سکیں گے۔ لوگ آنے شروع ہو

گئے۔ ہر آنے والا فرد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تعریف کر رہا تھا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ کو حکم دیا: دیکھو میرے ذمے کتنا قرضہ ہے؟ حساب لگایا گیا تو کل قرضہ تقریباً ۸۶ ہزار درہم تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر یہ قرضہ (حضرت) عمر (رضی اللہ عنہ) کے خاندان کے مال سے ادا ہو جائے تو بہتر ہے ورنہ بنو عدی بن کعب سے سوال کرنا، اگر پھر بھی ادا نہ ہوسکے تو قریش سے سوال کرنا، ان کے علاوہ کسی اور کے پاس نہ جانا۔ تم میری طرف سے یہ قرضہ لازماً ادا کر دینا۔

پھر فرمایا کہ اب ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں جاؤ۔ انھیں میرا سلام پہنچاؤ۔ میرا حوالہ ''امیر المومنین'' کہہ کر نہ دینا کیوں کہ میں آج مومنوں کا امیر نہیں ہوں۔ اُن سے عرض کرنا کہ (حضرت) عمر بن خطاب (رضی اللہ عنہ) اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ آپ کے حُجرے میں دفن ہونے کی اجازت مانگتا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اجازت طلب کی۔ حُجرے میں داخل ہوئے۔ دیکھا کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیٹھی رو رہی تھیں۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے عرض کی۔ ''(حضرت) عمر بن خطاب (رضی اللہ عنہ) آپ کو سلام کہتے ہیں۔ انھوں نے اپنے دونوں ساتھیوں کے ساتھ آپ کے حُجرے میں دفن ہونے کی اجازت مانگی ہے۔''

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہے: ''میں نے تو یہ جگہ اپنے لیے خاص کر رکھی تھی مگر آج میں (حضرت) عمر (رضی اللہ عنہ) کو اپنے آپ پر ترجیح دیتی ہوں۔''

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما واپس گھر پہنچے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انھیں دیکھ کر فرمایا: مجھے اٹھا کر بٹھاؤ۔ ایک آدمی نے سہارا دے کر ان کا سر اونچا کر دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے دریافت فرمایا: کیا خبر لائے ہو؟ حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے عرض کی: اے امیر المومنین! جو آپ چاہتے تھے وہ بات طے ہو گئی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے برضا و رغبت اجازت دے دی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا شکر ہے، میرے لیے سب سے اہم معاملہ یہی تھا۔ دیکھو، جب میں فوت ہوجاؤں تو دروزے پر رک کر ایک دفعہ پھر اُن سے عرض کرنا کہ (حضرت) عمر بن خطاب (رضی اللہ عنہ) یہاں دفن ہونے کی اجازت مانگتے ہیں۔ اگر اجازت دیں تو دفن کرنا، ورنہ مسلمانوں کے عام قبرستان میں دفن کر دینا۔

راوی فرماتے ہیں: بعض کتبِ تاریخ کے اعتبار سے پتا چلتا ہے کہ یکم محرم کو اور بعض روایات کے

اعتبار سے ۲۶ یا ۲۷ ذوالحج کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو شہید کیا گیا تھا۔ جب آپ کا انتقال ہوگیا تو ہم آپ کی میت لے کر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے دروازے پر گئے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو سلام کیا اور عرض کی کہ (حضرت) عمر بن خطاب (رضی اللہ عنہ) دفن ہونے کی اجازت طلب کرتے ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: انھیں اندر لے آؤ، پھر انھیں اندر لے جا کر دونوں ساتھیوں، نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ دفن کر دیا گیا۔ إنا لله وإنا إليه راجعون.[1]

موت اس کی ہے کرے جس کا زمانہ افسوس
ورنہ دنیا میں سبھی آئے ہیں مرنے کے لیے

امیر المؤمنین حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نہایت عدل پسند، سچے ایمان دار، مجاہد، دل کے کھرے، پرہیز گار، طاقتور، امانت دار، عقیدۂ توحید کا مضبوطی سے دفاع کرنے والے اور مثالی اسلامی خلیفہ تھے۔ انھوں نے زندگی بھر دین، عقیدۂ توحید اور امتِ مسلمہ کی بے مثال خدمت کی۔ الغرض یہ اوصاف ایسے تھے کہ اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی ہونا ہوتا تو امیر المؤمنین عمر رضی اللہ عنہ ہی ہوتے۔ اللہ تعالیٰ امیر المؤمنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ عنہ کو اسلام اور ملتِ اسلامیہ کی طرف سے زیادہ سے زیادہ اور بہتر سے بہتر جزاء عطا فرمائے۔ آمین!

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت کا سبب:

حضرت مُغیرہ بن شُعبہ رضی اللہ عنہ کا مجوسی غلام ابولؤلؤ فیروز تھا۔ جو چکیاں بنانے کا کام کرتا تھا۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ اس سے روزانہ چار درہم وصول کیا کرتے تھے۔

ایک دن ابولؤلؤ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں آیا اور عرض کی: اے امیر المومنین! مغیرہ (رضی اللہ عنہ) نے میری آمدنی تنگ کر رکھی ہے۔ آپ اس سے میری سفارش کر دیجیے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ سے ڈر، اپنے مالک سے اچھا سلوک کر۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نیت یہ تھی کہ وہ مغیرہ رضی اللہ عنہ سے اس بارے میں سفارش کر دیں گے لیکن انھوں نے اپنے دل کی بات غلام سے نہیں کہی، چنانچہ غلام طیش میں آ گیا اور بولا: ''(حضرت) عمر (رضی اللہ عنہ) کا عدل وانصاف میرے علاوہ ہر شخص کو پہنچ چکا ہے؟۔'' اُس نے اُسی وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے کا ارادہ کر لیا۔ اُس نے ایک خنجر تیار کیا۔ اُس کے ۲ سِرے تھے۔ اسے تیز کیا۔ زہر میں

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٨٩٠)

بجھایا، پھر ہُرمزان کے پاس آیا اور کہا: تمھارا اس خنجر کے بارے میں کیا خیال ہے؟ اس نے کہا: اگر تُو کسی کو یہ خنجر مارے گا تو وہ بچ نہیں سکے گا۔ لہٰذا اُس وقت سے ابولؤلؤ موقع کی تلاش میں رہنے لگا۔

ایک دن وہ فجر کی نماز میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عین پیچھے صف میں کھڑا ہو گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی عادتِ مبارکہ تھی کہ جب اقامت ہو جاتی تھی تو فرماتے تھے: اپنی صفوں کو درست کر لو۔ انھوں نے اپنی عادت کے مطابق صفیں درست کرائیں اور تکبیرِ تحریمہ کہہ کر نماز شروع کی۔ ابولؤلؤ نے فوراً حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے کندھے پر وار کر دیا اور دوسرا اُن کے پہلو میں کیا۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ زمین پر گر پڑے۔[1]

حضرت عَمرو بن میمون رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر حملہ ہوا تو میں نے ان کی زبان سے تلاوت سنی، وہ یہ آیت پڑھ رہے تھے:

﴿ وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ قَدَرًا مَّقْدُورًا ﴾ [الأحزاب: ٣٨]

''اور اللہ کا حکم ایک طے شدہ فیصلہ ہے۔''

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پھیپھڑے پر وار کیا گیا تھا۔ وار کرنے والا حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کا مجوسی غلام ابولؤلؤ تھا۔[2]

حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے جذبات:

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد انھیں چار پائی پر لٹایا گیا تو لوگ اُن کی چارپائی کے گرد جمع ہو گئے۔ وہ اُن کے لیے دعائیں کرنے لگے اور کلماتِ خیر کہنے لگے۔ اچانک مجھے ایک آدمی نے کندھے سے پکڑ لیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ تھے۔ انھوں نے اللہ تعالیٰ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لیے رحمت کی دعا کی اور نہایت دردناک لہجے میں فرمایا: آپ نے اپنے پیچھے کوئی ایسا شخص نہیں چھوڑا جسے دیکھ کر مجھ میں یہ خواہش پیدا ہو کہ میں بھی اُس شخص کے اعمال جیسے اعمال کروں۔ اللہ کی قسم! مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے سابقہ دونوں ساتھیوں کی معیّت نصیب فرمائے گا۔ مجھے یاد ہے کہ میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے اکثر اوقات یہی جملے سنا کرتا تھا:

[1] صحيح التو ثيق في سيرة وحياة الفاروق (ص: ٣٧٠)

[2] صحيح التوثيق في سيرة و حياة الفاروق (ص: ٢٦٩)

’’مَیں، ابو بکر اور عمر (رضی اللہ عنہما) گئے، مَیں، ابو بکر اور عمر (رضی اللہ عنہما) داخل ہوئے اور مَیں، ابو بکر اور عمر (رضی اللہ عنہما) باہر نکلے۔‘‘[1]

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا خراجِ تحسین:

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے کہ اگر حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا علم ایک پلڑے میں اور باقی ساری دنیا کا علم دوسرے پلڑے میں رکھ دیا جائے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا علم بھاری نکلے گا۔[2]

حضرت ابو طلحہ انصاری رضی اللہ عنہ کا اظہارِ خیال:

حضرت ابو طلحہ انصاری رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ کی قسم! حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد مسلمانوں کے ہر گھر کے دینی اور دنیاوی معاملات میں نقص پیدا ہو گیا ہے۔[3]

حضرت حُذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کے جذبات:

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

’’حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں اسلام ہمیشہ آگے ہی بڑھتا رہا۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے تو اسلام مسلسل پیچھے کی طرف ہٹنے لگا۔‘‘[4]

تاریخِ وفات اور عمرِ مبارک:

علّامہ ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: حضرت عمر رضی اللہ عنہ ۲۳ ہجری ۲۶ یا ۲۷ ذو الحجہ بروز بدھ شہادت سے سرفراز ہوئے۔ صحیح قول کے مطابق ان کی عمر ۶۳ برس تھی۔ جبکہ بعض روایات میں یکم محرم بھی آیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مدتِ خلافت ۱۰ سال، ۶ ماہ اور کچھ دن تھی۔

تاریخ ابی زرعہ میں حضرت جریر بن عبد اللہ بَجَلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ تینوں حضرات ۶۳، ۶۳ برس کی عمر میں فوت ہوئے۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٦٨٥)

[2] مصنف ابن أبي شيبة (١٢/ ٢٣)

[3] الطبقات الكبرىٰ لابن سعد (٣/ ٣٧٤)

[4] الطبقات الكبرىٰ لابن سعد (٣/ ٣٧٣) اس روایت کی سند صحیح ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے مسلمانوں پر اثرت اور اُن کے تاثرات:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا سانحۂ شہادت مسلمانوں کے لیے انتہائی الم انگیز واقعہ تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اس سانحے کے بعد لوگوں کے جذبات جاننے کے لیے نکلے تو انھوں نے دیکھا کہ سب لوگ اِس طرح رو رہے تھے جیسے اُن کی جوان اولاد فوت ہوگئی ہے۔ بلاشبہ حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ مینارۂ ہدایت تھے۔ وہ حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والے تھے۔ یہ ایک قدرتی بات تھی کہ لوگ اُن کی وفات سے اس قدر متاثر ہوئے۔[1]

مسلمانوں کے خلاف کافروں کے دلوں میں موجود کینے کا ثبوت:

مسلمانوں کے خلاف کافروں کے دلوں میں ہمیشہ کینہ رہتا ہے۔ اس کا ثبوت مجوسی ابو لؤ لؤ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو شہید کر کے مہیا کر دیا۔ تمام کفار کی ہر دور میں ہر جگہ یہی فطرت رہی ہے۔ اُن کے دلوں میں مسلمانوں کے لیے کینہ، حسد اور بُغض کے سوا کچھ نہیں۔ وہ اہلِ ایمان کے خلاف ہر آن شر، ہلاکت اور بربادی کی آس لگائے رہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ مسلمان اپنے دین سے برگشتہ ہو کر مرتد ہو جائیں۔[2]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے واقعۂ شہادت کا گہری نظر سے جائزہ لیا جائے تو کینے اور بُغض کے مارے ابو لؤلؤ مجوسی کے اس سفاکانہ فعل سے دو باتیں سامنے آتی ہیں جو اُس عجمی کافر کے دل میں موجود حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور مسلمانوں کے خلاف کینے کی نشاندہی کرتی ہیں۔

ایک تو یہ ہے کہ اس نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ تیرہ دیگر صحابیوں کو بھی زخمی کیا جن میں سے سات شہید ہو گئے۔ صحیح بخاری کی روایت میں ہے کہ عجمی کافر دو دھاری چُھری لے کر حملہ آور ہوا۔ وہ جہاں سے بھی گزرا دائیں بائیں لوگوں کو زخمی کرتا گیا یہاں تک (۱۳) افراد زخمی کر دیے جن میں سے سات شہید ہو گئے۔[1] بالفرض اگر اس سفاک مجوسی کے نزدیک حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس پر کوئی زیادتی کی تھی تو ان دیگر افراد کا کیا قصور تھا؟ اور اللہ کی پناہ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس پر ظلم کیا ہو۔ صحیح بخاری کی اُسی روایت میں ہے کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر حملہ ہوا تو انھوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے فرمایا: دیکھو مجھے کس نے مارا ہے؟ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما تھوڑی دیر میں صورتِ حال معلوم کر کے واپس آئے اور عرض کی: حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ کے غلام نے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ کا شکر ہے کہ اُس نے میری موت کسی ایسے فرد کے

[1] العشرة المبشّرون بالجنة لمحمد صالح عوض (ص: ٤٤)

[2] سير الشهداء دروس و عبر لعبد الحميد السحيباني (ص: ٣٦)

ہاتھ سے نہیں لکھی جو اسلام کا دعویدار ہو۔[1]

دشمنانِ اسلام نے اپنے محبوب ابو لؤلؤ کی گمنام مجاہد کے طور پر ایران میں ایک یادگار تعمیر کر رکھی ہے۔ نجف کے ایک عالمِ دین سید حسین موسوی لکھتے ہیں: خوب جان لو! ایرانی شہر کاشان نامی محلّہ کے باغ فین میں ایک گمنام مجاہد کی یادگار تعمیر کی گئی ہے۔ اس میں ایک فرضی قبر بھی بنائی گئی ہے۔ اسے ابو لؤلؤ فیروز مجوسی کی قبر ظاہر کیا جاتا ہے جس نے خلیفۂ ثانی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا تھا۔ وہ ''مرقدِ بابا شجاع الدین'' کے نام سے موسوم ہے۔ اس کے معنیٰ ہیں: ''دین کا انتہائی دلیر آدمی۔'' اسلام اور مسلمانوں کے دشمنوں نے اسے یہ لقب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے پر دے رکھا ہے۔ اُس آستانے پر فارسی زبان میں یہ جملہ لکھا ہوا ہے: مرگ برابوبکر، مرگ بر عمر، مرگ بر عثمان، جس کے معنیٰ ہیں: (حضرت) ابوبکر (رضی اللہ عنہ) کے لیے موت، (حضرت) عمر (رضی اللہ عنہ) کے لیے موت اور (حضرت) عثمان (رضی اللہ عنہ) کے لیے موت..... استغفر اللہ! اللہ برباد کرے دین کے دشمنوں کو، آمین۔

اب حکومتِ ایران نے اسے از سرِنو نہایت کشادہ اور وسیع بنانے کا حکم دیا ہے۔ ایرانی شیعوں نے اس آستانے کی یادگار کی تصویر ڈاک کے ٹکٹوں اور پوسٹ کارڈز پر بھی شائع کر رکھی ہے۔[2] آپ گوگل پر ابو لؤلؤ المجوسی لکھ کر اُس آستانے کی تصویر دیکھ سکتے ہیں۔ اسلام اور مسلمانوں کے دشمنوں کی چال کو محسوس کر سکتے ہیں۔

اللہ سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اُن کی چالوں سے محفوظ فرمائے اور دینِ اسلام کی حفاظت فرمائے۔ آمین۔

اختتام:

خلیفۂ راشد حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا عہدِ زریں گزرنے کے ساتھ ہی اسلامی ریاست کے بانی دوم کا دور ختم ہو گیا۔ انھوں نے اس ریاست کو چہار سو وسعت دی اور اس کے ستون مضبوط سے مضبوط تر کر دیے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نہایت ذمہ دار لیڈر، دور اندیش فرمانروا، بڑے دانا اور چوکس نگاہبان، طاقتور اور انصاف پسند حکمران، نرم دل اور مہربان پیشوا تھے۔ اتنے وسیع اختیارات اور دنیا کے طول وعرض میں پھیلی ہوئی خلافت کی طاقت نے انھیں صراطِ مستقیم سے پھسلنے نہیں دیا۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٧٠٠)

[2] للّٰه ثم للتاريخ، كشف الأسرار و تبرئة الأئمة الاطهار (ص: ٩٤)

امتِ اسلامیہ کا شیرازہ متحد رکھنے اور مستقبل محفوظ کرنے کی بھرپور جدوجہد جاری رکھی حتیٰ کہ اپنی زندگی کے آخری لمحات میں بھی اپنے فرائضِ منصبی ادا کرتے ہوئے نماز کی امامت کے دوران شدید زخمی کیے گئے جس سے وہ اللہ تعالیٰ کو پیارے ہو گئے۔ یقیناً وہ سچے شہید تھے۔ بلاشبہہ ان کا درجہ اللہ کے نہایت نیک اور بلند پایہ مقرب بندوں میں سے ہیں۔

ان کی ہر وقت یہی آرزو رہتی تھی کہ اسلام غالب ہو جائے اور شریعت کی حکمرانی قائم ہو جائے۔ وہ لوگوں کے درمیان ہر وقت عدل وانصاف قائم کرنے کی فکر میں رہتے تھے۔اللہ تعالیٰ کی توفیق اور مہربانی سے وہ اپنے مشن میں سرخرو بھی ہوئے، یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ زندگی کے ہر شعبہ میں انقلابی اصلاحات برپا کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہی ان کی کامیابی کی معراج تھی۔ عمر رضی اللہ عنہ اور عدل ایک ہی چیز کے دو نام اور ایک ہی حقیقت کے دو جلوے بن گئے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی یہ مثالی حیاتِ طیبہ تمام آنے والی نسلوں کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اُن عزائم اور فتح مندیوں سے آگاہ کرے گی، جن سے بیتے ہوئے دنوں کی خوبصورت یادیں تازہ ہو جائیں گی۔ یہ لمحات ہمیں پیغام دیں گے کہ اس امت کا آخری زمانہ اس وقت تک خیر وبرکات کا باعث نہ بن سکے گا جب تک کہ وہی قوانین نافذ نہ ہوں جو اس امت کے ابتدائی دور میں نافذ تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا عہدِ زریں علماء ومبلّغین کو اس عہدِ راشد کے اصول اپنانے اور لوگوں کی زندگی میں اس دور کا منہج، خد وخال اور اوصاف سمونے کے لیے ان کی سیرت کی ورق گردانی کی دعوت دیتا رہے گا۔ اسی طرح امتِ اسلامیہ کی زندگی میں ایک نئے دور کا آغاز ہوسکتا ہے۔ کیونکہ سیرتِ فاروقی کا سورج افقِ مکہ سے طلوع ہوا تھا وہ کبھی غروب نہیں ہوگا، اس کی کرنیں حق وصداقت کے ہر متلاشی کو منزل کا نشان دکھاتی رہیں گی۔

آخر میں مَیں اپنے اللہ تعالیٰ کے حضور انتہائی عاجزی اور خشوع خضوع کے ساتھ اس کے فضل وکرم کا اعتراف کرتی ہوں۔ اور اسی پاک پروردگار کے حضور دعا گو ہوں کہ وہ میری اس چھوٹی سی کاوش کو اپنی بارگاہِ عالی میں شرفِ قبولیت سے نوازے۔اور مسلمانوں کے لیے اسے نفع مند بنائے اور اس عاجزانہ کوشش میں جس کسی نے بھی اور جس طرح کا بھی تعاون فرمایا ہے وہ بھی اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ اجر وثواب پائیں۔ آخر میں میری التجا ہے کہ آپ سب میرے لیے مغفرت اور اللہ کی رحمت کی دعا فرمائیں۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا ۚ وَمَا يُمْسِكْ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾ [فاطر:۲]

''اللہ جو لوگوں کے لیے (اپنی) رحمت کھول دے تو کوئی اسے بند کرنے والا نہیں اور جسے وہ بند کر دے تو اس کے بعد اُس کو کوئی جاری کرنے والا نہیں، اور وہی غالب حکمت والا ہے۔''

اے میرے رب تو پاک ہے میں تیری ہی حمد بیان کرتی ہوں تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔ میں صرف تجھی سے تیری رحمت، بخشش، درگزری اور رضا مندی کی طلبگار ہوں، آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

مصادر ومراجع

سیرت سیدنا عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ

- تفسیر ابن کثیر، تفسیر حافظ صلاح الدین یوسف
- صحیح بخاری
- صحیح مسلم
- جامع الترمذی
- سنن ابن ماجہ
- سیرتِ نبوی، تالیف: ڈاکٹر مہدی رزق اللہ احمد
- سیرت امام الانبیاء، تالیف: ابوعدنان محمد منیر قمر۔ ترجمہ: شیخ الحدیث حافظ محمد امین
- سیرتِ عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ، تالیف: ڈاکٹر علی محمد الصلابی۔ ترجمہ: مولانا ندیم شہباز
- فضائلِ صحابہ، تالیف: مولانا اقبال کیلانی
- تاریخِ اسلام، تالیف: محمد اکبر شاہ نجیب آبادی رحمہ اللہ
- روشنی کے مینار، تالیف: مولانا عبدالمالک مجاہد

باب 3

سیرت

سیدنا عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ

خلیفۂ ثالث، دامادِ رسول ﷺ حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کی مختصر سیرت

خلفائے راشدین کے عہد کی تاریخ نہایت سبق آموز اور عبرتوں سے بھری ہوئی ہے۔ ایک مسلمان کے لیے اُن کی پہچان نہایت ضروری ہے۔ کیونکہ رسولِ اکرم ﷺ کا فرمان ہے:

«عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ الْمَهْدِيِّينَ مِنْ بَعْدِي»[1]

''میری سنت کو لازم پکڑو اور میرے بعد میرے خلفائے راشدین کی سنت کو بھی مشعلِ راہ بناؤ۔''

اُن خلفائے راشدین میں سے ہی حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ ہیں جن کا شمار عشرہ مبشّرہ میں سے ہوتا ہے۔ یہ مسلمانوں کے تیسرے خلیفہ تھے۔

نام ونسب:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بن عفان بن ابو العاص بن امیہ بن عبد شمس بن عبد مناف بن قُصَیّ بن کلاب۔[2] عبد مناف پر جا کر آپ کا نسب رسولِ اکرم ﷺ کے عالی نسب سے مل جاتا ہے۔ آپ کی والدہ ماجدہ کا نام اَرویٰ بنت کریز بن ربیعہ بن حبیب بن عبد شمس بن عبد مناف بن قُصَیّ تھا۔[3]

آپ کی نانی ام حکیم بیضاء بنت عبد المطلب تھیں، یعنی وہ رسولِ اکرم ﷺ کے والدِ بزرگوار کی حقیقی بہن تھیں۔ زبیر بن بکار کا بیان ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ کے والدِ ماجد اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی نانی جڑواں پیدا ہوئے تھے۔ اس طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ گویا نبیِ کریم ﷺ کی پھوپھی زاد بہن کے فرزند تھے۔ اور نبیِ اکرم ﷺ آپ کی والدہ کے ماموں زاد بھائی تھے۔ آپ کی والدہ نے اسلام قبول کیا اور آپ ہی کے دورِ خلافت میں

[1] صحیح أبي داود، رقم الحديث (٤٦٠٧) مسند أحمد (١٧١٨٥) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٧٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٤)

[2] الطبقات لابن سعد (٣/ ٥٣) الاصابة (٤/ ٣٧٧)

[3] التمهيد والبيان لمحمد يحىٰ الأندلسى (ص: ١٩)

وفات پائی۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے خود کفن دفن کا انتظام کیا۔ آپ کے والد ظہورِ اسلام سے پہلے ہی فوت ہو چکے تھے۔[1]

کنیّت:

قبل از اسلام آپ کو ''ابو عَمرو'' کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مصاہرت میں آنے کے بعد آپ کی بیوی حضرت رقیہ بنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بطن سے عبد اللہ رضی اللہ عنہ کی ولادت ہوئی تو آپ نے اپنی کنیت ''ابوعبداللہ'' رکھی۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم آپ کو ابوعبد اللہ کہہ کر ہی پکارا کرتے تھے۔[2]

لقب:

آپ کا لقب ''ذو النورَین'' تھا۔ علاّمہ بدرالدین عینی شرح صحیح بخاری میں فرماتے ہیں کہ حضرت مہلب بن ابوصفرہ رحمہ اللہ سے پوچھا گیا کہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کو ذوالنورَین کیوں کہا جاتا ہے؟ انھوں نے فرمایا: اس لیے کہ ان کے علاوہ (تاریخ میں) کسی ایسے شخص کا ذکر نہیں ملتا جس نے کسی نبی کی دو بیٹیوں سے شادی کی ہو۔[3]

حضرت عبداللہ بن عمر بن ابان جُعفی رحمہ اللہ کا بیان ہے کہ مجھ سے میرے ماموں حضرت حسین جعفی رحمہ اللہ نے پوچھا: بیٹے! تمھیں معلوم ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ذوالنورَین کیوں کہتے ہیں؟ میں نے جواب دیا: مجھے تو علم نہیں۔ انھوں نے کہا: حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آج تک سوائے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے کوئی شخص ایسا نہیں گزرا جس نے نبی کی دو بیٹیوں سے شادی کی ہو۔ اس لیے آپ کو ذوالنورَین کہا جاتا ہے۔[4]

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آپ رات کی نماز میں قرآن کی بہت زیادہ تلاوت کیا کرتے تھے اور قرآن اور رات کا قیام دونوں نور ہیں: اس لیے آپ کو ذوالنورَین، یعنی دونوروں والا کہا جاتا ہے۔[5] لیکن پہلی بات ہی زیادہ صحیح اور معروف ہے۔

---

[1] الخلافة الراشدة والدولة الأمويه للدكتور يحىٰ اليحىٰ (ص: ٣٨٨)
[2] التمهيد و البيان لمحمد يحيىٰ الأندلسي (ص: ١٩)
[3] عمدة القاري شرح صحيح البخاري (١٦/ ٢٠١)
[4] السنن الكبرىٰ للبيهقي (٧/ ٧٣) المعجم الكبير للطبراني (١/ ٨٩)
[5] عثمان بن عفان ذو النورَين لعباس العقاد (ص: ٧٩)

ولادت:

صحیح قول کے مطابق آپ عام الفیل کے چھٹے سال بعد مکہ مکرمہ میں پیدا ہوئے۔[1] ایک روایت کے مطابق حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی ولادت طائف میں ہوئی۔ آپ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے تقریباً پانچ سال چھوٹے تھے۔[2]

حلیہ مبارک:

آپ کا قد درمیانہ تھا۔ یعنی نہ چھوٹے تھے اور نہ زیادہ لمبے۔ جلد ملائم تھی، داڑھی گھنی اور لمبی تھی۔ اُسے خضاب لگاتے تھے۔ سر کے بال بھی گھنے تھے۔ جسم کے جوڑ بڑے بڑے تھے اور کندھوں کا درمیانی فاصلہ زیادہ تھا، یعنی چوڑے کندھوں اور چوڑے سینے والے تھے۔ امام زہری رحمہ اللہ کا بیان ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ درمیانے قد کے آدمی تھے۔۔ نہایت خوبصورت نورانی چہرہ، چمکتے دانت، گھنگر یالے لمبے بال، سفید رنگ، باریک تلوار جیسی ناک، کشادہ ٹانگیں اور لمبے خوبصورت بازو، جنھیں ڈھانپ کر رکھتے تھے۔ اگر چہ سَر کے اگلے حصے کے بال قدرے گرے ہوئے تھے لیکن کندھوں کو چھوتے ہوئے لمبے اور خوبصورت دکھائی دیتے تھے۔ صحیح بات یہی ہے کہ آپ کا رنگ سفید تھا، تاہم یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آپ کی رنگت گندم گوں تھی۔[3]

خاندان:

بیویاں اور اولاد: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے آٹھ شادیاں کیں اور تمام نکاح قبولِ اسلام کے بعد کیے، آپ کی بیویوں کے اسمائے گرامی درجِ ذیل ہیں:

1. حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا بنتِ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)۔ ان کے بطن سے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے۔
2. حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا بنتِ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)۔ سیدہ رقیہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد ان سے نکاح کیا۔ ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔
3. حضرت فاختہ بنت غزوان رضی اللہ عنہا۔ یہ حضرت عتبہ بن غزوان رضی اللہ عنہ کی بہن تھیں۔ ان کے بطن سے حضرت عبداللہ اصغر رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے۔

---

[1] الإصابة (٤/ ٣٧٧)

[2] عثمان بن عفان لصادق عرجون (ص: ٤٥)

[3] تاريخ الطبري (٥/ ٤٤٠)

4 حضرت ام عَمرو بنت جندب الازدیہ رضی اللہ عنہا۔ ان سے آپ کے چار بیٹے: حضرت عَمرو، خالد، ابان اور عمر رضی اللہ عنہم اور ایک بیٹی مریم رضی اللہ عنہا پیدا ہوئی۔

5 فاطمہ بنت ولید بن عبدشمس بن مغیرہ مخزومیہ رضی اللہ عنہا۔ ان سے آپ کے تین بچے: حضرت ولید و سعد رضی اللہ عنہما اور حضرت ام سعد رضی اللہ عنہا پیدا ہوئیں۔

6 حضرت ام البنین بنت عُیَینہ بن حصن فزاریہ رضی اللہ عنہا۔ ان سے حضرت عبدالملک رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے۔

7 حضرت رملہ بنت شیبہ بن ربیعہ امویہ رضی اللہ عنہا۔ ان سے تین بیٹیاں: حضرت عائشہ، ام ابان اور ام عَمرو رضی اللہ عنہن پیدا ہوئیں۔

8 حضرت نائلہ بنت فرافصہ کُلبیہ رضی اللہ عنہا۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے بطن سے بھی آپ کا ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا نام عَبَسہ تھا۔[1]

شہاتِ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے وقت اُن کا دفاع کرتے ہوئے انہی کے ہاتھوں کی انگلیاں کٹ گئی تھیں۔ آپ کے ہاں پانچ بیویوں سے نو بیٹے پیدا ہوئے۔ انہی میں سے نواسۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ یہ حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا بنتِ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بطن سے ہجرت سے دو سال پہلے پیدا ہوئے۔ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا نے مدینہ کی طرف ہجرت کی تو انھیں بھی ساتھ لے گئے۔ مدینہ منورہ میں ابھی تھوڑا عرصہ ہی گزرا تھا کہ ان کے چہرے پر آنکھ کے قریب مرغ نے چونچ مار دی۔ معمولی سازخم چند روز میں پھیل گیا اور اُن کا چہرہ ورم آلود ہوگیا حتیٰ کہ اسی زخم کی وجہ سے ۴ھ کو چھے سال کی عمر میں فوت ہو گئے۔[2]

آپ کے والد: عفان بن ابی العاص بن امیہ مکہ کے معروف دولت مند تاجر تھے۔ تجارت کے لیے مکہ سے باہر گئے ہوئے تھے کہ راستے ہی میں ان کا انتقال ہوگیا۔ انھوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے لیے وافر مقدار میں دولت چھوڑی تھی۔

ایامِ جاہلیت میں آپ کا مقام ومرتبہ:

ایامِ جاہلیت میں آپ کا شمار قوم کے برگزیدہ لوگوں میں ہوتا تھا۔ آپ بلند مرتبہ، مالدار، شیریں

[1] الأمي ذو النورين لحمود شاك.

[2] الأمين ذو النورَين لمحمود شاكر (ص: ٣٦٥) التمهيد و البيان لمحمد يحيٰ الاندلسى (ص: ١٩)

کلام اور شرم و حیا کے پیکر تھے۔ آپ کی قوم آپ کو نہایت محبت اور عزت کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔ قبل از اسلام ظاہری و باطنی پاکدامنی کا یہ حال تھا کہ آپ نے کبھی کسی بت کو سجدہ نہیں کیا، نہ بے حیائی کے مرتکب ہوئے، نہ کبھی شراب پی بلکہ اس کی مذمت کرتے تھے۔ فرماتے تھے کہ یہ عقل کو زائل کر دیتی ہے۔ اللہ کی عطا کردہ نعمتوں میں سے عقل ہی سب سے اعلیٰ اور قیمتی چیز ہے۔ انسان کو چاہیے کہ عقل کے ذریعے بلندی حاصل کرے نہ کہ اپنے آپ کو تباہ و برباد کرے۔ زمانۂ جاہلیت میں بھی آپ کو نوجوانوں کی محفلوں کی رنگینیاں اپنی طرف مائل نہ کر سکیں اور نہ بے حیائی اور لہو و لعب کی مجلسیں آپ کو فریفتہ بنا سکیں۔[1]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ زمانۂ جاہلیت میں عرب کے مروجہ علوم، انساب، امثال اور تاریخ پر بڑا عبور رکھتے تھے۔ شام، حبشہ اور دوسرے علاقوں کی طرف کثرت سے سفر کرتے تھے۔ اِس وجہ سے آپ غیر عرب قوموں کے اطوار، کلچر اور طرزِ بود و باش سے دوسرے لوگوں کی نسبت زیادہ واقف تھے۔[2]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے والد کے پیشے تجارت کو اپنایا اور اسے خوب ترقی دی حتیٰ کہ آپ کا شمار بنو امیہ کے ان مالداروں میں ہونے لگا جن کی قریش کے نزدیک بڑی قدر و منزلت تھی۔ مکہ کے جاہلی معاشرے میں شرف و عزت کا معیار دولت تھی۔ اور افسوس کہ آج بھی لوگوں کا یہی حال ہے۔ دولت ہی کی بنا پر لوگوں کی تعظیم کی جاتی تھی۔ جس خاندان کے بیٹے اور بھائی زیادہ ہوتے تھے وہ خاندان مضبوط مانا جاتا تھا۔ لوگ مرعوب رہتے تھے۔ آپ کو اپنی قوم میں بڑی عزت حاصل تھی۔

لوگ آپ کو محبت اور قدر و منزلت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ آپ کی عظیم خوبیوں نے آپ کو سب کا محبوب بنا دیا تھا۔ آپ کی محبت لوگوں کے دل و دماغ میں کس قدر راسخ ہوگئی تھی؟ اس کا اندازہ اس انوکھے واقعہ سے لگائیے کہ ایک مرتبہ آپ کے دَور کی ایک عرب خاتون اپنے بچے کو لوری دیتے ہوئے کہہ رہی تھی:

> ''رحمٰن کی قسم! میں تجھ سے اسی طرح محبت کرتی ہوں جس طرح قریش (حضرت) عثمان (رضی اللہ عنہ) سے محبت کرتے ہیں۔''[3]

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کا شمار اُن چند لوگوں میں ہوتا ہے جنھوں نے زمانۂ جاہلیت ہی میں

---

[1] موسوعة التاريخ الإسلامي لأحمد شلبي (١/ ٦١٨)

[2] عبقرية عثمان للعقاد (ص: ٢٧)

[3] موسوعة التاريخ الإسلامي لأحمد شلبي (١/ ٦١٨)

لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تھا۔ شرافت اُن میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ زمانۂ جاہلیت میں بھی زنا کے مرتکب نہ ہوئے، نہ کبھی شراب کو ہاتھ لگایا۔[1]

«اَلَا اَسْتَحِیْ مِنْ رَجُلٍ تَسْتَحِیْ مِنْهُ الْمَلَائِكَةُ»[2]

''کیا میں اس شخص سے حیا نہ کروں جس سے فرشتے بھی حیا کرتے ہیں۔''

اتنے حیا دار تھے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ان کے بارے میں فرمایا تھا:

«اَصْدَقُهُمْ حَيَاءً عُثْمَانُ»[3]

''میری امت میں سب سے زیادہ سچے حیا دار شخص (حضرت) عثمان بن عفان (رضی اللہ عنہ) ہیں۔''

دیگر معززینِ قریش کی طرح انھوں نے بھی تجارت کو بطورِ پیشہ اختیار کیا۔ اپنی صداقت، دیانت، امانت اور راست بازی کی بدولت تجارت میں غیر معمولی کامیابی حاصل کی۔ مکے کے معاشرے میں ایک ممتاز اور دولت مند تاجر کی حیثیت سے مشہور و معروف ہوئے اور غنی کے لقب سے پکارے جانے لگے۔

جب سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آپ کو اسلام کی دعوت دی۔ اس وقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی عمر چونتیس (۳۴) برس تھی۔ آپ نے بلا حیل و حجت کسی پس و پیش کے بغیر فوراً اسلام قبول کر لیا اور سابقین اوّلین میں شامل ہو گئے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام پر مسلمان نہایت خوش ہوئے۔

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ عشرہ مبشّرہ میں سے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے گہرے دوست تھے۔ انہی کی تحریک پر اسلام قبول کیا۔ اسلام لانے والے مردوں میں ان کا چوتھا نمبر تھا۔ جبکہ اس وقت تک اسلام لانے والوں میں سے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا پہلا نمبر تھا۔[3]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے پہلے مردوں سے حضرت ابوبکر صدیق، حضرت علی اور حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہم اسلام لا چکے تھے۔

قبولِ اسلام:

جب انھوں نے اسلام قبول کیا تو دیگر مسلمانوں کی طرح ان کو بھی اعدائے اسلام کی ایذا رسانی کا

---

[1] صحیح مسلم (٢٤٨١)

[2] صحیح مسلم (٢٤٠١) صحیح ابن حبان (٦٩٠٧)

[3] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٣١٠)

[4] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٣٠٩)

شکار ہونا پڑا۔ ان کے چچا حکم بن ابی العاص نے ان کو رسیوں سے جکڑ دیا اور کہنے لگا: کیا تم اس نئے دین کو اپنے باپ دادا کے دین پر ترجیح دیتے ہو؟ اللہ کی قسم! میں تمھیں اُس وقت تک نہیں چھوڑوں گا جب تک تم اِس دین کو چھوڑ نہیں دیتے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا جواب ایک پُرعزیمت شخص کا جواب تھا، فرمایا: چچا تم جو چاہو کر گزرو، اللہ کی قسم! میں کبھی اس دین کو چھوڑنے والا نہیں۔ ان کا چچا ان پر مسلسل ظلم اور زیادتی کرتا رہا مگر ان کے پائے استقلال میں کبھی لغزش نہ آئی۔ وہ اسلام پر ثابت قدم رہے۔ چچا نے جب دیکھا کہ یہ ماننے والا نہیں تو بالآخر اس نے آپ کا راستہ چھوڑ دیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی سیدہ رقیہ رضی اللہ عنہا سے شادی:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے پر اہلِ اسلام نہایت خوش ہوئے۔ مسلمان ہونے کے بعد آپ کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اخوت، ایمان اور محبت کی کڑیاں نہایت مضبوط ہوگئیں، پھر اللہ تعالیٰ نے سیدہ رقیہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کے اسباب پیدا فرما کر آپ کو بہت بڑے اعزاز سے نواز دیا۔ اس معاملے کی تفصیل یہ ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دونوں صاحبزادیوں حضرت رقیہ اور ام کلثوم رضی اللہ عنہما کا نکاح ابولہب کے بیٹوں عتبہ اور عتیبہ سے کر دیا تھا لیکن ابھی رخصتی کی نوبت نہیں آئی تھی کہ سورۂ لہب نازل ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ نے ابو لہب اور اس کی بیوی کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

”شروع اللہ کے نام سے جو بہت مہربان ہے رحم والا“

﴿ تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ ۝ مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ ۝ سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ۝ وَّامْرَاَتُهٗ ۭ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ۝ فِيْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ۝ ﴾ [سورة اللهب]

”ٹوٹ جائیں دونوں ہاتھ ابولہب کے اور وہ ہلاک ہوگیا۔ نہ اس کے مال نے اسے کوئی فائدہ دیا اور نہ اس کی کمائی نے۔ عنقریب وہ ضرور بھڑکتی آگ میں داخل ہوگا اور اس کی بیوی بھی جو لکڑیاں ڈھونے والی ہے، اس کی گردن میں چھال کی بٹی ہوئی رسی ہوگی۔“

چنانچہ ابولہب اور اس کی بیوی نے اپنے دونوں بیٹوں سے کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بیٹیوں کو طلاق دے دو، چنانچہ انھوں نے رخصتی سے پہلے ہی طلاق دے دی۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کی دونوں بیٹیوں کی عزت ابولہب کے بیٹوں کی ذلت کا اعلان ہوگئی۔[1]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جونہی سیدہ رقیہ رضی اللہ عنہا کی طلاق کی خبر سنی، فوراً رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیغام بھیج کر حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا سے شادی کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ رشتہ منظور فرما لیا اور سیدہ رقیہ رضی اللہ عنہا کا نکاح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کر دیا۔ خود ام المومنین سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا نے انھیں رخصت کیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خوبصورت شخصیت کے مالک تھے اور سیدہ رقیہ رضی اللہ عنہا بھی حُسنِ سیرت اور حسنِ صورت میں بے مثل تھیں۔ رخصتی کے وقت اس مبارک جوڑے کو یہ خراجِ تحسین پیش کیا گیا:

''انسانی آنکھ نے جو خوبصورت ترین جوڑا دیکھا ہے وہ سیدہ رقیہ اور ان کے شوہر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا جوڑا ہے۔''[2]

ابولہب اور اس کی بیوی اُم جمیل دونوں یہ سمجھتے تھے کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹیوں کو طلاق دلوا کر آپ کے گھر صفِ ماتم بچھوا دیں گے یا کم از کم آپ کو کمزور کر دیں گے لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت رقیہ اور ام کلثوم رضی اللہ عنہما کے لیے اس سے کہیں بہتر انتظام کر دیا اور دشمنانِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ناکام و نامراد کر دیا اور وہ ہمیشہ کے لیے خیر سے محروم ہو گئے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کو اللہ تعالیٰ نے ان کے شر سے محفوظ رکھا اور اللہ کا فیصلہ پہلے سے طے شدہ ہے۔[3]

ہجرتِ حبشہ:

ابتلاء و آزمایش سنتِ ربانی ہے۔ اللہ تعالیٰ افراد، جماعتوں، معاشروں، قوموں اور سلطنتوں کو مختلف طریقوں سے آزماتا ہے۔ ابتلاء کے کڑے دور سے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی گزرنا پڑا۔ انھوں نے ایسے مصائب جھیلے جو بڑے بڑے پہاڑوں کو بھی ہلا کر رکھ دیتے ہیں۔ انھوں نے اپنا مال اور اپنا خون اللہ کے راستے میں پیش کر دیا۔ اللہ کے راستے میں پہنچنے والی ہر تکلیف خندہ پیشانی سے برداشت کی۔ اس آزمایش سے کمزور لوگوں کے ساتھ ساتھ بااثر مسلمانوں کو بھی گزرنا پڑا۔

تمام مسلمان سخت مصیبتیں جھیل رہے تھے۔ آزمائشیں آئے دن بڑھتی جا رہی تھیں اور اس وقت تو

---

[1] ذو النورَین عثمان بن عفان لمحمد رشید رضا (ص: ١٢)

[2] أنساب الأشراف (ص: ٨٩)

[3] دماء علی قمیص عثمان للدکتور إبراهیم المنشاوي (ص: ٤٨)

ان کی انتہاء ہوگئی جب حضرت یاسر رضی اللہ عنہ اور ان کی بیوی حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا کو بہیمانہ طور پر شہید کر دیا گیا۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس الم انگیز سانحے پر بے حد قلق ہوا۔ آپ اس فکر میں مبتلا ہو گئے کہ مسلمان کہاں جائیں؟ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حبشہ کی سرزمین میں خیر نظر آئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں سے فرمایا:

«لَوْ خَرَجْتُمْ اِلَى الْحَبَشَةِ، فَاِنَّ بِهَا مَلِكاً صَالِحاً لَا يُظْلَمُ عِنْدَهٗ اَحَدٌ»[1]

''اگر تم حبشہ چلے جاؤ تو وہاں ایسا نیک حاکم ہے کہ اُس کی سلطنت میں کسی پر ظلم نہیں کیا جاتا۔''

اللہ کی رحمت سے قافلۂ توحید کے شہسواروں میں بتدریج اضافہ ہوتا چلا گیا۔ قریش کا غصہ بھی بڑھتا چلا گیا۔ اُن کے ظلم وزیادتی میں بھی مسلسل اضافہ ہوتا گیا۔ جب ہمارے نبی رؤف ورحیم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ اُن کے ساتھیوں کا جینا دوبھر کر دیا گیا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو ہجرت کی اجازت دے دی۔ اللہ کی راہ میں گھر بار چھوڑنے والے اِس پہلے گروہ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور ان کی اہلیہ محترمہ حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا بنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی شامل تھیں۔

اِس قافلے نے سفر جاری رکھتے ہوئے حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کو اپنا امیر بنا لیا۔ تقدیرِ الٰہی نے ساتھ دیا۔ انھیں سمندر پر جاتے ہی دو بحری جہاز مل گئے۔ ہر آدمی کا کرایہ نصف دینار طے ہوا۔ جہاز سمندر کی موجوں سے کھیلتے ہوئے سفر شروع کر چکے تھے کہ اُسی دوران مشرکینِ مکہ بھی ان کے تعاقب میں ساحل تک آپہنچے لیکن انھیں منہ کی کھانی پڑی۔[2]

ان داعیانِ حق میں، جنھوں نے حبشہ کی طرف پہلی اور دوسری ہجرت کی اور انھیں دین ہی سب سے بڑھ کر عزیز تھا، سرِ فہرست حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور اُن کی بیوی سیدہ رقیہ رضی اللہ عنہا تھے۔ رجب ۵ نبوی کو یہ قافلہ حبشہ پہنچا تو انھوں نے سکون کا سانس لیا۔ آزادی سے ربِ تعالیٰ کی عبادت کا موقع ملا اور امن وسکون سے رہنے لگے۔ قرآن مجید نے اُن کی اُس ہجرت کا تذکرہ یوں کیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۭ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ﴾ [النحل:٤١]

[1] سنن الكبرىٰ للبيهقي (٩/ ١٦) فتح الباري، تحت حديث (٣٦٥٩) الهجرة في القرآن الكريم للدكتور احزمی (ص: ٢٩٠) السيرة النبوية لابن هشام (١/ ٤١٣)

[2] الطبقات لابن سعد (١/ ٢٠٤) تاريخ الطبرى (٢/ ٦٩)

''اور جن لوگوں نے ظلم وستم سہنے کے بعد اللہ کی راہ میں ہجرت کی تو ہم انھیں دنیا میں اچھا ٹھکانا دیں گے اور یقیناً آخرت کا اجر تو بہت بڑا ہے کاش کہ وہ جانتے ہوتے۔''

امام قرطبی رحمہ اللہ نے حضرت قتادہ رحمہ اللہ کا قول نقل کیا ہے کہ اِس سے مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم ہیں جن پر مشرکینِ مکہ نے ظلم ڈھائے اور انھیں مکہ سے نکال دیا۔ ان میں سے ایک گروہ حبشہ چلا گیا، پھر اللہ تعالیٰ نے انھیں دار الہجرت (مدینہ منورہ) میں ٹھکانا دیا اور ان کے مومن مددگار پیدا کر دیے۔[1]

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ يٰعِبَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۚ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ۗ وَاَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةٌ ۗ اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ [الزمر: ١٠]

''کہہ دیجیے: اے میرے مومن بندو! اپنے رب سے ڈرو، جنھوں نے اس دنیا میں اچھے عمل کیے اُن کے لیے بھلائی ہے اور اللہ کی زمین وسیع ہے، بلاشبہ صبر کرنے والوں کو اُن کا پورا پورا اجر بے حساب دیا جائے گا۔''

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

''اس سے مراد حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھ حبشہ ہجرت کرنے والے صحابہ رضی اللہ عنہم ہیں۔''[2]

بیٹیوں سے محبت فطری تقاضا ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی بیٹی اور داماد کے وطن چھوڑنے کے بعد ان کے حالات کے بارے میں کوئی اطلاع نہ تھی۔ ایک دن حبشہ سے ایک قریشی عورت آئی۔ اس نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا کہ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی اور داماد کو دیکھا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا: کس حال میں دیکھا ہے؟ اُس نے بتایا: میں نے دیکھا! آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی گدھے پر سوار تھیں اور اُن کا خاوند اُس کی رسی پکڑے ہوئے تھا۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ سن کر بے حد خوشی ہوئی، ارشاد فرمایا:

''اللہ اُن دونوں کی حفاظت فرمائے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ حضرت لوط علیہ السلام کے بعد پہلے شخص ہیں جنھوں نے اپنی اہلیہ کے ساتھ ہجرت کی ہے۔ اور ایک دوسری روایت کے مطابق وہ دونوں

---

[1] الجامع لأحكام القرآن (١٠/ ١٠٧)

[2] الجامع لأحكام القرآن (١٥/ ٢٤٠)

حضرت لوط اور حضرت ابراہیم علیہما السلام کے بعد پہلے میاں بیوی ہیں، جنھوں نے ہجرت کی۔[1]

اس طرح چھے ہزار سال کے بعد ایمان کو بچانے کی خاطر سب سے پہلے جس نے سنتِ ابراہیمی کی پیروی کرتے ہوئے ہجرت کی وہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اُس مبارک سفرِ ہجرت سے کئی سبق سیکھے۔ اُن کے تجربات و مشاہدات کا ماحصل یہ ہے:

مومنوں کا ظلم واستبداد کے خلاف ایمان پر ڈٹ جانا اور اپنے عقیدے کے لیے سب کچھ قربان کر دینا اُن کے مخلص اور سچے مسلمان ہونے کی واضح دلیل ہے۔ انھوں نے اپنے آپ کو اتنا بلند اور اپنی ارواح کو اتنا پاکیزہ بنا لیا تھا کہ اُن کے نزدیک اللہ کی رضا مندی اتنی بڑی متاعِ عزیز تھی کہ اس کے آگے وہ شدید ترین جسمانی تشدد اور بڑے سے بڑے ظلم وستم کو بھی ہیچ اور ناقابلِ توجہ سمجھتے تھے۔ وہ نہایت مطمئن تھے۔ انھیں کوئی ملال نہ تھا، کیوں کہ سچے مومنوں اور مخلص داعیوں کے نزدیک حقیقی غلبہ روح کا ہے، جسم کو ثانوی حیثیت حاصل ہے۔ جسمانی لذت اور آسایش وآرام کی پروا کیے بغیر انھیں جہاں بھی روح کی غذا ملتی ہے وہ فوراً اس کی طرف لپکتے ہیں۔ یہی چیز تحریکوں کو جلا بخشتی ہے اور اسی جذبے سے بیشتر لوگ ظلم و جہالت کے اندھیروں سے چھٹکارا حاصل کرتے ہیں۔[2]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سے نرمی اور امت کے ساتھ شفقت اور پیار ومحبت کا سبق سیکھا۔ یہ نرمی آپ کی زندگی کا بہت نمایاں اخلاق تھا لیکن خلافت کا بوجھ پڑنے کے بعد تو آپ بے حد نرم ہو گئے۔ آپ نے عرصۂ دراز تک نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ محبت اور شفقت کا مشاہدہ کیا تھا، آپ خوب جانتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے سکون وآرام کے لیے کتنی تڑپ اور کیسی شدید خواہش رکھتے تھے۔ آپ یہ بھی جانتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابہ رضی اللہ عنہم کو حبشہ بھیجنا صرف اس بنا پر تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اُن پر ظلم وستم برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اور واقعی اُسی طرح ہوا جیسا کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا، حبشہ پہنچ کر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو اپنے دین پر بے خوفی سے عمل کرنے کی آزادی نصیب ہوئی اور حبشہ کے بادشاہ نے انھیں بہت عزت دی۔[3]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٩١١)

[2] السيرة النبوية دكتور مصطفى سباعى (ص: ٥٧)

[3] الهجرة في القرآن الكريم للدكتور احزمى (ص: ٣١٢)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات بھی سیکھی کہ تکالیف اور مصائب قائد کے رشتہ داروں اور قریبی دوستوں ہی کو برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ جس سربراہِ حکومت کے رشتے دار اور دوست و احباب ہر قسم کی پریشانیوں سے محفوظ ہوں لیکن عوام طرح طرح کی مشکلات اور آزمائشوں کا سامنا کررہے ہوں، ایسی حکومت نبوی منہج کے خلاف ہے۔[1]

کچھ عرصہ بعد قریش نے ایک افواہ اڑا دی کہ قریش کا رویہ پہلے سے بہت بہتر ہو گیا ہے، چنانچہ مسلمانوں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کے لیے مکہ کی جانب سفر کی تیاری شروع کردی۔ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ اور ان کی اہلیہ بھی اس قافلے میں شامل تھے۔ یہاں آکر معلوم ہوا کہ یہ خبر غلط تھی۔ بلکہ اس کے برعکس اُن کے ظلم وستم میں مزید اضافہ ہو چکا ہے تو وہ دوبارہ حبشہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ حبشہ میں پھر کچھ مدت گزارنے کے بعد حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ اہلیہ سمیت واپس مکہ آگئے۔ اُس دوران مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کی اجازت مل چکی تھی، چنانچہ آپ نے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت فرمائی۔

پھر ہجرتِ مدینہ تک آپ وہیں مقیم رہے۔ آپ اسلام لانے کے بعد سوائے ہجرت یا کسی اور مہم کے ہمیشہ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے۔ صرف ناگزیر حالات میں آپ کسی ایسے اہم کام کے لیے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جدا ہوتے تھے جس کے بغیر کوئی چارہ نہ ہوتا اور کوئی دوسرا آدمی اسے انجام نہ دے پاتا۔ آپ دوسرے خلفائے راشدین کی طرح ہمیشہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ساتھ رہے۔ گویا انھیں محاسن اور معاشرتی شعور سے آگاہ وآراستہ کر کے یکے بعد دیگرے خاص طور پر خلافت کے لیے تیار کیا گیا تھا۔[2]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اسلام لانے کے بعد روزِ اول ہی سے تبلیغِ اسلام کی بڑی گہری لگن تھی، اسی لیے آپ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے عام وخاص واقعات سے خوب آگاہ تھے۔ اِسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد آپ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ ساتھ رہے۔ ان کی زندگی کا کوئی پہلو ان سے مخفی نہیں تھا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قرآنِ کریم سے گہرا لگاؤ:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی تربیت قرآنِ کریم کی تعلیمات کی روشنی میں ہوئی۔

[1] تربية قيادية دكتور منير غضبان (١/ ٣٣٣) السيرة النبوية للصلابي (١/ ٣٤٨)

[2] عثمان بن عفان للعقاد (ص: ٧٨)

قرآنِ کریم اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتاب اور حصولِ دین کا واحد ذریعہ ہے، اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے منبعِ دین ہونے پر بہت زور دیا ہے۔ کسی مسلمان فرد یا معاشرے کے لیے صرف قرآن ہی وہ دستورِ حیات ہے جس کی روشنی میں معاشرہ پروان چڑھ سکتا ہے۔ قرآنِ مجید کی اُن آیاتِ کریمہ نے، جو آپ نے براہِ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی تھیں، دینی اعتبار سے آپ کی شخصیت سازی میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔ ان آیات نے آپ کے دل کو پاک صاف کر کے آپ کے کردار کو نہایت پاکیزہ بنا دیا۔ آپ کی روح ان سے ہم آہنگ ہوگئی، یوں آپ بہت باشعور، بیدار مغز اور ایک عظیم انسان بن کر سامنے آئے۔[1]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے شب و روز قرآنِ کریم کی تلاوت میں گزرتے تھے۔ حضرت ابوعبدالرحمٰن سلمی رحمہ اللہ نے آپ کے قرآن سیکھنے کے متعلق کئی اقوال بیان کیے ہیں، ان اقوال سے آپ کی قرآنِ کریم سے بہت گہری محبت کا پتا چلتا ہے۔ ابوعبدالرحمٰن رحمہ اللہ کہتے ہیں: ''ہمیں ہمارے اساتذہ حضرت عثمان بن عفان اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما وغیرہ نے بتایا کہ جب وہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دس آیتیں سیکھ لیتے تھے تو ان کا مطلب، معانی اور مفہوم سمجھے اور ان پر عمل کیے بغیر مزید آیات نہیں سیکھتے تھے۔'' ہمارے اساتذہ کرام کہا کرتے تھے:

''ہم نے قرآن، علم اور عمل تینوں چیزیں اکٹھی یعنی ایک ساتھ سیکھی ہیں۔''

اسی لیے وہ ایک ایک سورت کو سیکھنے کے لیے بڑا وقت صرف کرتے تھے۔[2] اور یہ اس لیے تھا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴾ [صٓ: ۲۹]

''(یہ قرآن) ایک کتاب ہے، ہم نے اسے آپ کی طرف نازل کیا، بڑی برکت والی ہے تاکہ وہ اس کی آیتوں پر غور کریں اور عقل مند (اس سے) نصیحت حاصل کریں۔''

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہی نے نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان نقل کیا ہے:

« خَيْرُكُمْ مَّنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَ عَلَّمَهُ »[3]

''تم میں سے سب سے بہتر شخص وہ ہے جو قرآن سیکھے اور دوسروں کو اس کی تعلیم دے۔''

---

[1] السيرة النبوية للصلابي (۲/ ۱۴۵)

[2] مجموع فتاویٰ لابن تيمية (۱۳/ ۱۷۷)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (۵۰۲۷)

حفظِ قرآن کا اہتمام:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پورا قرآن سنایا تھا۔
قرآنِ کریم کی فضیلت واہمیت کے بارے میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:
''اگر ہمارے دل پاک صاف ہوں تو اللہ تعالیٰ کے کلام سے کبھی سیر نہ ہوں۔''

نیز فرمایا:
''مجھے ہرگز گوارا نہیں کہ میرا ایک دن بھی ایسا گزرے جس میں اللہ کے عہد، یعنی قرآن مجید کو نہ دیکھ لوں۔''[1]

آپ نے فرمایا: مجھے تین چیزیں بہت پسند ہیں:

1. بھوکوں کو کھانا کھلانا۔
2. بے لباس لوگوں کو کپڑے پہنانا۔
3. اورقرآنِ کریم کی تلاوت کرنا۔[2]

آپ کی وفات کے وقت آپ کا مصحف کثرتِ تلاوت کی وجہ سے پھٹ چکا تھا۔[3] ان کا نظریہ تھا کہ دنیاوی زندگی چاہے کتنا ہی طول پکڑ جائے بہر حال فانی ہے اور آخرت کے مقابلے میں اس کے سامانِ کثیر کی کوئی حیثیت نہیں ہے بلکہ وہ نہایت قلیل اور حقیر ہے۔ جیسا کہ سورۂ یونس (آیت: ٦١) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَمَا تَكُونُ فِي شَأْنٍ وَمَا تَتْلُوا مِنْهُ مِنْ قُرْآنٍ وَلَا تَعْمَلُونَ مِنْ عَمَلٍ إِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُودًا إِذْ تُفِيضُونَ فِيهِ ۚ وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَبِّكَ مِنْ مِثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ وَلَا أَصْغَرَ مِنْ ذَٰلِكَ وَلَا أَكْبَرَ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُبِينٍ﴾

''اور (اے نبی!) آپ جس حال میں بھی ہوتے ہیں اور اللہ کے طرف سے (نازل شدہ) قرآن میں سے جو کچھ بھی پڑھتے ہیں اور تم لوگ جو بھی عمل کرتے ہو، اس وقت ہم تمھیں دیکھ

---

[1] البداية والنهاية (٧/ ٢٢٥) فوائد الكلام لقاسم عاشور (ص: ٢٧٥)
[2] إرشاد العباد للاستعداد ليوم المعاد عبد العزيز سلمان (ص: ٨٨)
[3] البداية و النهاية (١/ ٢٢٥)

رہے ہوتے ہیں جب تم اس میں مصروف ہوتے ہو۔ اور آپ کے رب سے کوئی ذرہ بھر چیز بھی چھپی نہیں ہوتی، زمین میں اور نہ آسمان میں اور نہ کوئی اس سے چھوٹی (چیز) اور نہ بڑی مگر (وہ) واضح کتاب میں (درج) ہے۔''

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا اس بات پر بھی ایمان تھا کہ قیامت تک ہونے والا ہر کام اللہ تعالیٰ نے لکھ دیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ إِنَّا نَحْنُ نُحْيِ الْمَوْتَىٰ وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوا وَآثَارَهُمْ ۚ وَكُلَّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَاهُ فِي إِمَامٍ مُّبِينٍ ﴾ [یٰسٓ: ١٢]

''بلاشبہ ہم ہی مُردوں کو زندہ کریں گے، اور جو (اعمال) وہ آگے بھیج چکے ہیں انھیں ہم لکھ رہے ہیں اور ان کے آثار (نشاناتِ قدم) کو بھی، اور ہم نے ہر شے کو واضح کتاب میں محفوظ کر رکھا ہے۔''

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا اس بات پر بھی یقینِ کامل تھا کہ اللہ قادرِ مطلق ہے اور اس کا ہر فیصلہ نافذ ہو کر رہتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ أَوَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ وَكَانُوا أَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً ۚ وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُعْجِزَهُ مِن شَيْءٍ فِي السَّمَاوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ ۚ إِنَّهُ كَانَ عَلِيمًا قَدِيرًا ﴾ [الفاطر: ٤٤]

''کیا وہ زمین میں چلتے پھرتے نہیں کہ وہ دیکھتے اُن لوگوں کا انجام کیسا ہوا جو ان سے پہلے تھے؟ جبکہ وہ ان سے زیادہ طاقتور تھے اور اللہ (ایسا) نہیں کہ اسے کوئی چیز آسمانوں میں اور زمین میں عاجز کر دے، بلاشبہ وہ خوب جاننے والا، بڑی قدرت والا ہے۔''

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ ہر چیز کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ ذَٰلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمْ ۖ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۖ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوهُ ۚ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ وَكِيلٌ ﴾ [الأنعام: ١٠٢]

''یہ ہے اللہ، تمھارا رب، اس کے سوا کوئی معبودِ (برحق) نہیں، وہی ہر چیز کو پیدا کرنے والا

ہے، چنانچہ تم اُسی کی عبادت کرو اور وہ ہر چیز پر نگران ہے۔''

قضاء و قدر کی حقیقت کے صحیح فہم اور اس پر پکے یقین کے بڑے مثبت اور مفید اثرات آپ کی زندگی میں نمایاں تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآنی تعلیمات کی روشنی میں نفسِ انسانی کی حقیقت سے آگاہی حاصل کی۔ اور قرآنِ کریم ہی کے ذریعے اس بات سے واقف ہوئے کہ انسانی تخلیق کی دو قسمیں ہیں:

پہلی قسم یہ ہے کہ جب اُسے مٹی سے بنایا گیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے اعضاء ٹھیک کر کے اس میں روح پھونکی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر یہ حقیقت قرآنِ کریم ہی کی بدولت اُجاگر ہوئی کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ سے پیدا فرمایا، اسے اچھی صورت دی اور معتدل قامت عطا کر کے اسے عزت بخشی۔ اسے عقل وبصیرت، زبان و بیان اور اچھے بُرے کی تمیز جیسی عظیم نعمتوں سے نوازا۔

انسان کی تکریم کو اتنا عروج بخشا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی محبت اور خوشنودی کا اہل بنا دیا۔ اور اس محبت اور خوشنودی کا حصول اس پیغمبر کی اتباع میں رکھ دیا جس نے لوگوں کو اسلام کی طرف بلایا تاکہ وہ دنیا میں پاکیزہ زندگی بسر کریں اور آخرت میں ہمیشہ رہنے والی نعمتیں حاصل کر کے ابدی کامیابی پائیں۔

دوسری قسم: معروف ہے کہ انسان مرد اور عورت کے ملاپ سے پیدا ہوتا ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآنِ کریم کے مطالعے سے شیطان اور انسان کے درمیان جھگڑے کی حقیقت معلوم کی اور اس بات سے آگاہ ہوئے کہ شیطان ہر ممکن طریقے سے انسان کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اللہ کی نافرمانی اور گناہ پر اکسانے کے لیے ہر حربہ استعمال کرتا ہے۔ وسوسے ڈال کر انسان کی دبی ہوئی شہوتیں ابھارتا ہے اور اسے غیر محسوس طریقے سے برائی کے راستے پر لا کھڑا کرتا ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہمیشہ شیطان کے خلاف اللہ سے مدد مانگتے رہے، یوں آپ نے اپنے آپ کو اللہ ہی کی پناہ میں دیے رکھا۔

قرآنِ کریم کی نشر و اشاعت:

اللہ عزّ وجل نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اسلام کی بدولت عزت بخشی۔ آپ نے اسے زندگی کا لازمی جزء بنا لیا اور اس کی نشر و اشاعت کے لیے ہر ممکن کوشش بروئے کار لائے۔ تمام بنیادی اور فروعی مسائل میں کتاب اللہ اور سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کیا۔

مدینہ منورہ میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شخصیت سازی میں نمایاں کردار ادا کرنے، آپ کی صلاحیتوں کو جلا بخشنے،

آپ کی زندگی میں انقلاب بر پا کرنے اور آپ کو باوقار بنانے والا اہم ترین عنصر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبتِ مبارکہ سے فیض یابی تھی۔ آپ مکی اور مدنی دونوں زمانوں میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے۔ آپ نے اپنے آپ کو سلیقہ مند بنایا اور معلّمِ انسانیت کے مدرسۂ نبوت سے علوم و معارف کے موتی اکٹھے کرنے کے لیے دیوانہ وار کوششیں کیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآن کی چھاؤں میں تربیت پائی۔ اُن کے مربی خود رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ آپ کی تربیت کا آغاز خیر البشر صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات سے ہوا۔ اس ابتدائی ملاقات ہی نے آپ کی زندگی میں انقلاب بر پا کر دیا اور آپ جہالت کی تاریکیوں سے نکل کر علم وعرفان کے اجالے میں آ گئے۔ آپ نے ایمان قبول کر لیا۔ کُفر کا طوق گردن سے اتار پھینکا۔ اس طرح آپ میں اسلام اور سیدھے سادھے آسان فہم عقیدے کی خاطر مصائب جھیلنے کی ہمت پیدا ہو گئی۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہ کر امن وجنگ کی زندگی کے ہر گوشے کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نظریات و خیالات جاننے کی بھر پور کوشش کی۔ اس رفاقت سے آپ کی شخصیت میں جنگی تجربات اور پیچیدہ معاملات بھانپ لینے کی زبردست صلاحیت پیدا ہو گئی۔ اس طرح آپ لوگوں کی نفسیات اور جبلّت سے بھی آگاہ ہو گئے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سلطنتِ اسلامیہ کے قابلِ اعتماد رکن تھے۔ آپ نے کبھی مشورہ دینے میں بخل سے کام لیا نہ اللہ کے راستے میں مال خرچ کرنے میں کنجوسی کی۔ آپ غزوۂ بدر کے سوا تمام غزوات میں شریک ہوئے۔[1]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور غزوۂ بدر:

جب مسلمان غزوۂ بدر کے لیے نکلے تو آپ کی زوجہ محترمہ سیدہ رقیہ رضی اللہ عنہا بنتِ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) خسرے کی بیماری میں مبتلا تھیں اور شدتِ مرض کی وجہ سے پابندِ بستر تھیں۔ جب رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو مشرکینِ مکہ کا قافلہ روکنے کے لیے نکلنے کا حکم دیا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بھی رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکل پڑے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں سیدہ رقیہ رضی اللہ عنہا کی تیمارداری کے لیے رک جانے کا حکم دیا۔ آپ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل میں سیدہ رقیہ رضی اللہ عنہا کی تیمارداری کے لیے رک گئے۔ جب مرض شدت اختیار کر گیا اور ان پر موت کے سائے منڈلانے لگے تو وہ نہایت افسردگی کی حالت میں بدر گئے ہوئے والدِ گرامی صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] الخلفاء الراشدون لعبد الوهاب النجار (ص: ٢٦٩)

اور مکہ میں مقیم بہن زینب رضی اللہ عنہا کی زیارت کی تمنا کرنے لگیں۔ اس الم انگیز صورتِ حال میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، ٹکٹکی باندھے انھیں دیکھ رہے تھے اور غم سے نڈھال تھے۔[2]

سیدہ رقیہ رضی اللہ عنہا کی روح جسدِ خاکی سے پرواز کر گئی۔ جانکنی کی حالت میں ان کی زبان پر کلمۂ شہادت جاری تھا۔ وہ رفیقِ اعلیٰ سے جاملیں۔ اپنے والدِ گرامی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نہ کر سکیں۔ کیونکہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے میدانِ بدر میں تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے کفن دفن کے وقت بھی تشریف نہ لا سکے۔ جنازہ تیار ہوا، ان کا جسدِ اطہر قبرستان لے جایا جا رہا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ غم سے نڈھال پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ جنازہ بقیع الغرقد قبرستان پہنچا۔ سیدہ رقیہ رضی اللہ عنہا کو وہاں دفن کر دیا گیا۔ قبر پر مٹی برابر کر دی گئی۔ دفن کے بعد واپس جانے والوں کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

اِسی دوران حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہما رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی پر سوار بدر کی فتح، مشرکین کے قتل ہونے، اُن کے سرداروں کے قید ہونے اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سلامتی کی خبر لے کر مدینہ پہنچے۔ مسلمان اس خبر سے نہایت خوش ہوئے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے چہرے پر خوشی اور غم کے ملے جلے جذبات نمایاں تھے۔ ایک طرف انھیں بدر کی فتح کی خوشی تھی لیکن دوسری طرف سیدہ رقیہ رضی اللہ عنہا کی وفات کا غم ان کے چہرے سے عیاں تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بسیار کوشش کے باوجود اس غم کو نہ چھپا سکے۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بدر سے واپس تشریف لائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سیدہ رقیہ رضی اللہ عنہا کی وفات کا علم ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بقیع تشریف لے گئے اور اپنی لختِ جگر کے لیے مغفرت کی دعا کی۔[2]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کسی سستی یا بزدلی کی وجہ سے جنگِ بدر سے پیچھے نہیں رہے تھے جیسا کہ آپ کی ذات پر طعن توڑنے والے گمراہ لوگوں کا خیال ہے۔ آپ نے صرف رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم مانا اور اپنی اہلیہ محترمہ کی عیادت کی۔ جو مقام و مرتبہ اہلِ بدر نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور اتباع کرتے ہوئے بدر میں شریک ہو کر حاصل کیا، وہی اعزاز حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بھی حاصل کر لیا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا لشکر بدر چلا تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی لختِ جگر سیدہ رقیہ رضی اللہ عنہا کی دیکھ بھال

---

[1] نساء أهل البيت لاحمد خليل جمعه (ص: ٤٩١ ـ ٥٠٤)

[2] دماء على قميص عثمان بن عفان للدكتور ابراهيم المنشاوى (ص: ٢٠)

کے لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو واپس بھیج دیا تھا۔ ایسی حالت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرنا اور بدر سے پیچھے رہنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا فرض تھا۔

نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کے لیے غنیمت میں سے حصہ مقرر فرمایا اور اجر و فضیلت میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت و فرمانبرداری کی وجہ سے آپ کو برابر کا شریک شمار کیا۔[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے فرمایا:

«اِنَّ لَكَ اَجْرَ رَجُلٍ مِّمَّنْ شَهِدَ بَدْراً وَّ سَهْمَهٗ»[2]

''تمھارے لیے بدر میں شریک ہونے والے شخص جیسا ہی اجر اور حصہ ہے۔''

حضرت ابو وائل رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''بدر کے دن میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی کی تیمار داری کی خاطر پیچھے رہا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غنیمت میں میرا حصہ بھی مقرر فرمایا۔''

راویِ حدیث کہتے ہیں: ''جس کے لیے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حصہ نکالا وہ یقیناً حاضر شمار کیا جائے گا۔''[3] لہٰذا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بالاتفاق بدری صحابی ہیں۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور غزوۂ ذات الرقاع:

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر پہنچی کہ بنوغطفان مدینہ پر چڑھائی کا ارادہ کر رہے ہیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم چار سو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو لے کر مدینہ سے نکلے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سفر میں بھی مدینہ کی نیابت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہی کے سپرد کی۔ مقامِ صرار پر پہنچ کر مسلمانوں کا بنوغطفان کے کثیر لوگوں سے آمنا سا منا ہوا لیکن لڑائی کی نوبت نہ آئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو نمازِ خوف پڑھائی اور انھیں لے کر واپس تشریف لے آئے۔ اس مہم کے دوران آپ صلی اللہ علیہ وسلم پندرہ دن مدینہ سے باہر رہے۔[4]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور بیعتِ رضوان:

۶ ہجری میں ۱۴۰۰ صحابی کے ہمراہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عمرہ کی نیت سے مکہ مکرمہ کی طرف روانہ ہوئے۔

---

[1] الإمامة و الرد على الرافضة للأصبهاني (ص: ۳۰۲)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (۳۶۹۹)

[3] الإمامة والرد على الرافضة للأصبهاني (ص: ۳۰٤) عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ لصادق عرجون (ص: ٤٧)

[4] لأمين ذو النورَين لمحمود شاكر (ص: ٥٢ ٥٣)

مکہ مکرمہ سے قریب حدیبیہ پہنچ کر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ضرورت محسوس کی کہ اہلِ مکہ کے پاس اپنا خصوصی نمائندہ بھیج کر انھیں اپنے ارادوں سے مطلع کیا جائے اور بتایا جائے کہ ہم لڑائی کی غرض سے نہیں آئے بلکہ ہمارا مقصد ادائے عمرہ اور مقاماتِ مقدسہ کی زیارت ہے، ہم عمرہ ادا کرنے کے بعد واپس چلے جائیں گے۔

اس مہم کے لیے حضرت خراش بن امیہ خزاعی رضی اللہ عنہ نامزد ہوئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں سواری کے لیے اپنا ثعلب نامی اونٹ مرحمت فرمایا۔ وہ مکہ میں داخل ہوئے تو قریش نے اونٹ کی کھونچیں کاٹ دیں اور حضرت خراش رضی اللہ عنہ کو بھی قتل کرنا چاہا لیکن احابیش (حلیف قبائل) نے انھیں بچالیا۔ حضرت خراش رضی اللہ عنہ واپس آگئے۔ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے سفر کی روداد سنائی اور قریش کے رویئے سے آگاہ کیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا پیغام پہنچانے کے لیے دوسرا سفیر بھیجنے کا ارادہ فرمایا تو شروع میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نام پیش کیا گیا۔[1]

لیکن انھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے معذرت کر لی اور اپنی جگہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بھیجنے کا مشورہ دیا۔ عذر کی وجہ بیان کرتے ہوئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ موجودہ صورتِ حال میں دشمن بپھرا ہوا ہے۔ کوئی ایسا شخص ہی وہاں جاسکتا ہے جس کا قبیلہ اس کی حمایت کرے اور اسے دشمن کے شر سے بچائے۔ جہاں تک میرا معاملہ ہے، میرا قبیلہ اس پوزیشن میں نہیں کہ وہ میرا دفاع کرے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا معاملہ یکسر مختلف ہے۔ اگر انھیں سفارت کی ذمے داری سونپی جائے تو وہ یہ فریضہ بخوبی ادا کر سکتے ہیں۔ اس کے لیے ان کی قوم بھی ان کی حمایت کرے گی۔ انھوں نے مزید کہا: ''اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے مشرکینِ مکہ سے خطرہ ہے، جیسا کہ آپ جانتے ہیں انھیں مجھ سے شدید دشمنی ہے اور بنو عدی میں کوئی شخص ایسا نہیں جو میرا دفاع کرے۔ اِس صورتحال کے باوجود بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہو تو میں جانے کے لیے تیار ہوں۔''[2]

آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی: ''میں آپ کو ایک ایسا آدمی بتاتا ہوں جو اہلِ مکہ کے نزدیک مجھ سے زیادہ عزت والا ہے، مزید برآں اس کا دفاع کرنے والا مضبوط خاندان بھی ہے۔ میری مراد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہیں۔''

---

[1] غزوة الحديبية لأبي فارس (ص: ٨٣)

[2] المغازی للواقدی (٢/ ٦٠٠)

رسول اللہ ﷺ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بلا کر فرمایا کہ آپ قریشِ مکہ کے پاس جائیں اور انھیں بتائیں کہ ہم کسی سے لڑائی کی غرض سے نہیں آئے۔ ہمارا مقصد صرف بیت اللہ کی زیارت کرنا ہے، ہمیں اس کی حرمت کا پاس ہے۔ ہدی، یعنی قربانی کے جانور ہمارے ساتھ ہیں، ہم عمرہ کریں گے اور جانور ذبح کر کے واپس چلے جائیں گے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ چل پڑے۔ مکہ کے قریب مقام بلدح پر پہنچے تو قریش کو سامنے پایا۔ انھوں نے پوچھا: ''کہاں کا ارادہ ہے؟'' حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ''مجھے رسولِ اکرم ﷺ نے تمھاری طرف بھیجا ہے، وہ تمھیں اللہ تعالیٰ اور اسلام کی طرف دعوت دے رہے ہیں کہ تم مکمل طور پر اللہ کے دین میں داخل ہو جاؤ۔ یقیناً اللہ تعالیٰ اپنے دین کو غالب کرے گا اور اپنے نبی کریم ﷺ کو عزت سے نوازے گا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ تم اس دعوت کی مزاحمت نہ کرو تو نبی اکرم ﷺ اپنی دعوت کا مرکز کسی اور کو بنا لیں گے۔ اگر آپ ﷺ پر وہ لوگ غالب آجائیں تو یہی تمھاری خواہش ہے۔ اگر رسول اللہ ﷺ کامیاب ہو جاتے ہیں تو تمھیں اختیار ہو گا کہ اس دعوت کو جس طرح لوگ قبول کریں تم بھی اسی طرح قبول کر لو، ورنہ کثرت کے ساتھ جم کر لڑائی کرنا۔

اس طرح تمھیں اپنی بھڑاس نکالنے کا موقع مل جائے گا۔ جنگوں نے تمھیں کمزور کر دیا ہے اور تمھارے اشراف جنگوں کی بھینٹ چڑھ گئے ہیں۔''

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی یہ گفتگو ان کے لیے ناپسندیدہ تھی، وہ کہنے لگے۔: ''ہم نے آپ کی بات سن لی۔ لیکن یہ کبھی نہیں ہوسکتا کہ محمد (ﷺ) بزور مکہ میں داخل ہو جائیں۔ آپ واپس چلے جائیں اور اپنے ساتھی (محمد ﷺ) کو خبردار کر دیں کہ ہم انھیں کسی صورت مکہ میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دے سکتے۔''
اس دوران ابان بن سعید العاص اٹھے۔ انھوں نے آپ کو خوش آمدید کہا، اپنی پناہ میں لیا اور کہا: ''آپ نامراد نہیں لوٹیں گے۔'' وہ گھوڑے سے اترے۔ زین پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بٹھایا۔ خود پیچھے سوار ہو گئے۔ یوں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مکہ تشریف لے گئے۔ وہاں پہنچ کر آپ فرداً فرداً اشرافِ مکہ سے ملے۔ ابوسفیان بن حرب رضی اللہ عنہ اور صفوان بن امیہ وغیرہ جن سے بلدح میں ملاقات ہوئی تھی، ان سے خاص طور پر ملے۔ لیکن اُن سب کا ایک ہی جواب تھا کہ ہم محمد (ﷺ) کو کسی صورت مکہ میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دے سکتے۔ انھوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو عمرہ ادا کرنے کی پیش کش کی لیکن آپ نے نبی مکرم ﷺ کے بغیر عمرہ

کرنے سے انکار کر دیا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مکہ میں مقیم کمزور مسلمانوں کو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام پہنچایا اور انھیں آپ کی طرف سے آسانی اور رہائی کی بشارت سنائی۔[1]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مکہ کے کمزور مسلمانوں کا پیغام لے کر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے۔ اُس پیغام کا نفس مضمون یہ تھا: ''ہماری طرف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام عرض کرنا اور کہنا کہ جو ذاتِ پاک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حدیبیہ میں لائی ہے، وہ اس پر بھی قادر ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ لے آئے۔''[2]

قبل ازیں جب کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ابھی مکہ ہی میں تھے، مسلمانوں میں یہ افواہ پھیل گئی کہ انھیں شہید کر دیا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو بلایا اور اُن سے مشرکین کے ساتھ مقابلہ کرنے کی بیعت لی۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے بخوشی لبیک کہا اور موت پر بیعت کر لی۔[3] البتہ جد بن قیس نے نفاق کی وجہ سے بیعت نہیں کی۔

ایک روایت کے مطابق یہ بیعت صبر کے لیے تھی کہ دشمن کے مقابلے میں پہنچنے والے مصائب پر صبر کرو گے۔[4] ایک روایت کے مطابق میدانِ جنگ سے نہ بھاگنے کی بیعت تھی۔[5] ان دونوں روایتوں میں کوئی تعارض نہیں کیونکہ موت پر بیعت کا مقصد یہی ہے کہ دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے اور میدانِ جنگ سے فرار کی راہ اختیار نہ کی جائے۔ سب سے پہلے بیعت کرنے والے حضرت ابو سنان عبد اللہ بن وہب اسدی رضی اللہ عنہ تھے۔ اور ان کے بعد سب لوگ بیعت کے لیے ٹوٹ پڑے۔[6]

حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ نے تین مرتبہ بیعت کی: اولاً آغاز میں، پھر درمیان میں اور پھر آخر میں۔[7] نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دایاں ہاتھ بلند کیا اور فرمایا: «هٰذِهِ يَدُ عُثْمَانَ»[8] ''یہ عثمان رضی اللہ عنہ کا ہاتھ

[1] زاد المعاد (٣/ ٢٩٠) السيرة النبوية لابن هشام (٣/ ٣٤٤)
[2] غزوة الحديبية لأبي فارس (ص: ٨٥)
[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤١٦٩)
[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٩٥٨)
[5] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٥٦)
[6] السيرة النبوية في ضوء المصادر الأصلية للدكتور مهدي رزق الله (ص: ٤٨٦)
[7] زاد المعاد (٣/ ٢٩١)
[8] صحيح السيرة النبوية لإبراهيم العلى (ص: ٤٠٤)

ہے۔'' پھر اُسے اپنے بائیں ہاتھ پر مارا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بھی بیعت کرنے والوں میں شامل کر لیا۔ درخت کے نیچے بیعت کرنے والے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی تعداد ۱۴۰۰ تھی۔ [1]

شُرکائے بیعتِ رضوان کی فضیلت:

قرآنِ مجید نے بیعتِ رضوان کرنے والوں کا کئی مقامات پر تذکرہ کیا ہے اور ان کے فضائل میں متعدد آیات اور احادیث وارد ہیں:

❁ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا يَنْكُثُ عَلٰى نَفْسِهٖ وَمَنْ اَوْفٰى بِمَا عٰهَدَ عَلَيْهُ اللّٰهَ فَسَيُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴾ [الفتح: ۱۰]

''بلاشبہہ جو لوگ آپ سے بیعت کرتے ہیں، وہ تو بس اللہ ہی سے بیعت کرتے ہیں، اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں کے اوپر ہے، پھر جس نے عہد شکنی کی تو وہ اپنی ہی ذات کے خلاف عہد شکنی کرتا ہے اور جس نے (وہ) عہد پورا کیا جو اس نے اللہ سے باندھا تھا تو عنقریب اللہ اسے بہت بڑا اجر دے گا۔''

❁ نیز ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ﴾ [الفتح: ۱۸]

''تحقیق اللہ مومنوں سے راضی ہو گیا جب وہ درخت کے نیچے آپ سے بیعت کر رہے تھے، چنانچہ ان کے دلوں میں جو (خلوص) تھا، اُس نے جان لیا، پس اس نے ان پر طمانینت وتسکین نازل کی اور بدلے میں انھیں قریب کی فتح عطا فرمائی۔''

❁ اور کتبِ حدیث میں سے صحیح بخاری میں حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ کے روز ہم سے فرمایا:

«اَنْتُمْ خَيْرُ اَهْلِ الْاَرْضِ» ''تم روئے زمین پر سب سے بہتر لوگ ہو۔''

حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''ہماری تعداد اس دن چودہ سو تھی۔ اگر آج میری بصارت ٹھیک

[1] السيرة النبوية في ضوء المصادر الأصليه للدكتور مهدى رزق الله (ص: ۱٤٨٢)

ہوتی تو میں تمھیں درخت والی جگہ دکھاتا۔‘‘

اِس حدیث سے بیعتِ رضوان کرنے والوں کی فضیلت بالکل واضح ہے جبکہ مسلمان ان کے علاوہ بھی مکہ اور مدینہ میں موجود تھے۔ بعض شیعہ حضرات اس سے دلیل لیتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مرتبہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے زیادہ ہے، کیوں کہ وہ بیعتِ رضوان کرنے والوں میں سے تھے جبکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو یہ فضیلت حاصل نہیں ہوئی۔ یہ موقف ٹھیک نہیں ہے، کیوں کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف سے خود بیعت کی تھی اور وہ اس خیر اور برکت وفضیلت میں برابر کے شریک تھے۔ اس حدیث سے ایک کی دوسرے پر فضیلت ثابت نہیں ہوتی۔[2]

غزوۂ حدیبیہ کے حوالے سے محبّ الدین طبری نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خصوصی فضیلت کا ذکر کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ درجِ ذیل امور کی بنا پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو نمایاں خصوصیت حاصل ہے:

- حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی عدم موجودگی میں بیعتِ رضوان کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ہاتھ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا ہاتھ قرار دیا۔ یہ فضیلت کسی دوسرے کو نصیب نہیں ہوئی۔
- مکہ مکرمہ میں مقیم کمزور مسلمانوں کو پیغامِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم پہنچانے کا شرف بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہی کو حاصل ہوا۔
- مکہ جا کر بھی عمرہ نہیں کیا۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی موافقت کی۔ اس باب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گواہی کا شرف بھی آپ ہی کو حاصل ہے۔[3]

چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر یہ الزام لگانا بہت بڑا ظلم ہے کہ آپ نے بیعتِ رضوان میں شرکت نہیں کی۔

حد درجہ کے سخی:

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ تشریف لانے کے بعد اسلامی سلطنت کو مضبوط کرنے کا آغاز کیا۔ مہاجرین اور انصار کے درمیان مؤاخات قائم کی، ہر مہاجر کو کسی انصاری کا بھائی بنا دیا۔ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے بھائی اوس بن ثابت رضی اللہ عنہ کے بھائی بنائے گئے۔ یہ وقت بہت تنگی کا تھا۔ مسلمان اپنا سب کچھ لٹا کر صرف ایمان بچا کر مدینہ آ گئے تھے۔ مسلمانوں کے پینے کے لیے

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤١٤٥)

[2] فتح الباري (٤٤٣)

[3] الرياض النضرة في مناقب العشرة للمحب الطبرى (ص: ٤٩٠ ـ ٤٩١)

پانی کا مسئلہ بن گیا۔ کیوں کہ وہاں کے میٹھے پانی کے واحد کنویں بئر رومہ کا مالک بنوغفار کا ایک یہودی آدمی تھا۔ وہ بہت مہنگا پانی فروخت کرتا تھا۔ اللہ کے رسول ﷺ نے اس شخص کے لیے جنت کی بشارت دی جو بئر رومہ خرید کر مسلمانوں کے لیے وقف کر دے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ۳۵ ہزار درہم میں وہ کنواں (بئر عثمان) خرید لیا اور ہر عام و خاص مسلمانوں کے لیے وقف کر دیا۔[1]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بڑے تاجر اور سرمایہ دار انسان تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو وافر مال عطا کیا تھا۔ آپ نے یہ مال اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لیے لٹا دیا۔ آپ خیر اور بھلائی کے ہر کام میں بڑھ چڑھ کر خرچ کرتے۔ آپ نے کبھی فقر کا خدشہ محسوس نہ کیا۔

مسجد نبوی ﷺ کی توسیع:

نبیِ اکرم ﷺ نے مدینہ میں مسجد تعمیر کی تو اس میں نہ صرف باجماعت نمازِ پنجگانہ کا مثالی اہتمام ہوا بلکہ وہاں رسالت مآب ﷺ کے ارشادات و مواعظ سننے کے لیے مسلمانوں کا زبردست ہجوم بھی رہنے لگا۔ تعلیم و تربیت کی درس گاہ بھی مسجد ہی تھی۔ ایوانِ عدل ہونے کے ساتھ ساتھ مسجد کو فوجی ہیڈ کوارٹر کا درجہ بھی حاصل تھا۔ یہیں سے لشکر روانہ ہوتے اور یہیں مجاہدین کی واپسی عمل میں آتی تھی۔ ان اسباب کی بنا پر مسجد تنگیِ داماں کی شکایت کرنے لگی۔ نبی کریم ﷺ نے مسجد کی توسیع کے لیے ملحقہ زمین خرید کر مسجد میں شامل کرنے کی ترغیب دلاتے ہوئے فرمایا:

> ''کون ہے جو آلِ فلاں کی زمین خرید کر مسجد میں شامل کرے، اللہ اسے جنت میں اس سے بہتر زمین عطا فرمائے گا۔''

اس ترغیب پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔ آپ نے وہ زمین اپنے ذاتی مال سے خریدی اور مسجد میں شامل کر دی۔[2]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بڑے مالدار تاجر تھے مگر اس کے ساتھ ساتھ حد درجہ فیاض اور سخی بھی تھے۔ ان کا مال مسلمانوں کی فلاح و بہبود میں استعمال ہوتا تھا۔ غزوات کے موقع پر دل کھول کر خرچ کرتے تھے۔ غزوۂ تبوک کے موقع پر تو انھوں نے بے حد فیاضی سے کام لیا۔

---

[1] جامع سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٤٣٣)

[2] جامع الترمذي، رقم الحديث (٣٧٠٣) وصححه الألباني.

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور غزوۂ تبوک:

۹ ھ میں ہرقل نے جزیرہ نمائے عرب کو ہڑپ کرنے اور ظلم وعدوان کا بازار گرم کرنے کے لیے اپنا رخ اس کی طرف کر لیا۔ اس نے اپنے جرنیلوں کو تیاری کا حکم دیا اور جنگ کے لیے اپنی ہدایات کے مطابق انتظام کا حکم صادر کیا۔ اس کی تیاری کی خبریں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک بھی پہنچ گئیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو جہاد کی تیاری کا حکم دیا۔ شدید گرمی کا موسم تھا۔ سورج آگ اُگل رہا تھا۔ اہلِ مدینہ کو قحط سالی اور سخت پریشانی کا سامنا تھا۔ اگر مسلمان تپتے ہوئے صحراؤں اور مہلک گرمی کا مقابلہ اپنی ایمانی قوت سے کرتے تب بھی تیاری کا مسئلہ بہر حال درپیش تھا۔ جہاد پر اٹھنے والے اخراجات کا انتظام نہایت ضروری تھا۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقات وخیرات کی ترغیب دلائی۔ ہر شخص نے اپنی استطاعت کے مطابق تعاون کیا۔ عورتوں نے جہادی لشکر کی تیاری کے لیے اپنے زیورات تک پیش کر دیے، اس کے باوجود جنگ کے بھاری اخراجات پورے نہ ہوئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سیکڑوں افراد تھے جو لڑائی کے لیے تیار تھے مگر ان کے پاس زادِ راہ نہ تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف دیکھ کر ارشاد فرمایا:

''جو انھیں تیار کرے گا۔ اللہ تعالیٰ اسے معاف فرما دے گا۔''[1]

یہ آواز سنتے ہی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اللہ کی خوشنودی اور مغفرت کی طرف سبقت کی۔ یوں یہ تنگی آسایش میں بدل گئی۔[2]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے لشکر کے اخراجات برداشت کیے اور اہلِ لشکر کی ادنیٰ سے ادنیٰ ضرورت کو بھی پورا فرمایا۔ امام ابنِ شہاب زہری رحمہ اللہ کا بیان ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے غزوۂ تبوک میں اسلامی لشکر کے لیے نو سو چالیس اونٹ اور ساٹھ گھوڑے دے کر ہزار کی گنتی پوری کر دی۔ علاوہ ازیں وہ دس ہزار دینار (تقریباً پانچ کلو سونے کے سکے) لے آئے اور انھیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان دیناروں کو اپنے مبارک ہاتھوں سے الٹ پلٹ رہے تھے اور زبانِ مبارک پر یہ الفاظ جاری تھے:

''آج (حضرت) کے بعد عثمان (رضی اللہ عنہ) کو اس کا کوئی عمل نقصان نہیں پہنچائے گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ بات بار بار ارشاد فرما رہے تھے۔''[3]

---

[1] صحيح البخاري تعليقاً (٢٧٧٨) مسند البزار (٣٩١)

[2] فتح الباري (٧/ ٦٧) خلفاء الرسول (ص: ٢٥٠) عشرة مبشرون بالجنه محمد صالح عوض (ص: ٥٣)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٦٣١) جامع الترمذي، رقم الحديث (٣٧٠١)

قرائن سے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے جدید مملکت کے لیے سرمایہ کاری کرنے والے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہی ہیں۔ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم لشکر کو لے کر اپنی منزل کی طرف چل دیے۔ دمشق اور مدینہ کے درمیان تبوک نامی جگہ پر پہنچے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خوش گوار خبریں موصول ہوئیں کہ ہرقل جو جنگ پر تُلا بیٹھا تھا اسے اللہ تعالیٰ نے پسپا کر دیا ہے۔ درحقیقت جب اُس نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم کی چڑھائی کی خبر سنی تو وہ اپنی ناکام کوشش سے دست بردار ہوکر دمشق سے بھاگ گیا۔ اسلامی لشکر اپنے مکمل ساز و سامان سمیت واپس آ گیا۔ کیا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کوئی چیز واپس طلب کی؟ ہرگز نہیں!

بلکہ آپ بدستور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے مطابق دینی مقاصد کے لیے خرچ کرتے رہے۔ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب بھی کسی چیز کا مطالبہ کرتے، اس کی فراہمی میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے۔[1]

اس کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے پھر صدقہ کیا، پھر صدقہ کیا، یہاں تک کہ ان کے صدقے کی مقدار نقدی کے علاوہ نوسو چالیس اونٹ اور ساٹھ گھوڑوں تک جا پہنچی۔ یہی وہ مقام ہے جب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اپنے منبر پر کھڑے ہوکر متعدد بار جنت کی بشارت سنائی۔[2] سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ اللہ کی رضا کے لیے ہر جمعہ کو ایک غلام آزاد کرتے تھے۔[3]

انفاق فی سبیل اللہ:

اُن کے انفاق فی سبیل اللہ کے سلسلے میں بے شمار واقعات ہیں۔ ایک مرتبہ شام سے ان کا ایک سو اونٹوں کا غلے سے لدا ہوا قافلہ آیا۔ مدینہ طیبہ میں ان دنوں غلے کی شدید ضرورت تھی۔ تجارِ مدینہ کو علم ہوا تو بھاگتے ہوئے ان کے پاس پہنچے اور کہنے لگے: ہم آپ کو بھاری منافع دیتے ہیں یہ غلہ ہمارے ہاتھ بیچ دیں۔ انھوں نے سوال کیا: کتنا منافع دو گے؟ جواب ملا: دو گنا۔ فرمانے لگے: بس اتنا ہی یا اس سے زیادہ بھی دے سکتے ہو؟ کہنے لگے: تین گنا۔ فرمایا: بس اتنا ہی یا اس سے زیادہ بھی دے سکتے ہو؟ تجار کو اس کی توقع نہ تھی۔ تھوڑی دیر بعد فرمانے لگے: میں یہ غلہ اس کے ہاتھ فروخت کروں گا جو مجھے دس گنا زیادہ منافع

[1] خلفاء الرسول (ص: ١٣٨)

[2] مسند أحمد (٥/ ٦٣)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٢٤٧)

دے گا۔ تاجروں نے معذرت کر لی اور کہا: یہ ناممکن ہے۔ بھلا اتنا منافع کون دے سکتا ہے؟ انھوں نے

تمام غلہ صدقہ کر دیا اور کہا کہ مجھے اللہ تعالیٰ سے اس کا دس گنا ملے گا، اللہ اکبر، سبحان اللہ! کیا ایمان ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ایامِ جاہلیت میں بھی نہایت برگزیدہ اور افضل لوگوں میں شمار ہوتے تھے، اور عہدِ اسلام میں بھی معزز ومکرم تھے۔

فضائلِ عثمان رضی اللہ عنہ بزبانِ نبوت

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں زبانِ رسالت سے بارہا تعریفی کلمات صادر ہوئے جو آپ کی فضیلت ومنقبت کی سب سے بڑی دستاویز ہیں۔ یہ تصدیق وتعریف دو طرح کی ہے۔ کبھی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی تعریف کے ساتھ اوروں کو بھی شامل فرمایا اور کبھی صرف آپ ہی کے فضائل و مناقب کا تذکرہ کیا۔ ذیل میں ہم دونوں طرح کے فضائل بیان کرتے ہیں:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو مصائب جھیلنے پر جنت کی بشارت:

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مدینہ کے ایک باغ میں موجود تھا کہ کسی نے اندر آنے کی اجازت طلب کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اس کے لیے دروازہ کھول دو اور اسے جنت کی بشارت دے دو۔''

میں نے دروازہ کھولا۔ (حضرت) ابوبکر صدیق (رضی اللہ عنہ) تشریف لائے۔ پھر کسی نے اندر آنے کی اجازت طلب کی، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اس کے لیے دروازہ کھول دو اور اسے جنت کی بشارت دے دو۔''

(حضرت) عمر بن خطاب (رضی اللہ عنہ) تشریف لائے تھے۔ میں نے انھیں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے بشارت سنائی۔ انھوں نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ پھر ایک تیسرے آدمی نے اندر کی اجازت طلب کی۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا:

''دروازہ کھول دو اور انھیں پہنچنے والے آلام ومصائب پر جنت کی بشارت دے دو۔''

میں نے دیکھا تو وہ (حضرت) عثمان (رضی اللہ عنہ) تھے۔ میں نے انھیں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت سنائی۔ انھوں نے اللہ کا شکر ادا کیا اور فرمایا: ''اللہ مدد کرنے والا ہے۔''[1]

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٦٩٣)

اس حدیث سے تین صحابۂ کرام: حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمرِ فاروق اور حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہم

کی فضیلت بالکل واضح ہے کہ وہ جنتی ہیں۔ اس حدیث سے حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کی فضیلت بھی ظاہر ہوتی ہے۔ نیز معلوم ہوا کہ کسی شخص کے فتنے اور تکبر میں پڑنے کا خدشہ نہ ہو تو اس کی منہ پر تعریف کی جا سکتی ہے۔ اس حدیث سے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک معجزہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبل از وقت ہی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی آزمائش کی پیش گوئی کر دی اور بتا دیا کہ یہ تینوں حضرات ایمان پر ثابت قدم رہیں گے۔[1]

اُحد! حرکت نہ کر ...:

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اُحد پہاڑ پر چڑھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حضرت ابوبکر، حضرت عمر، اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم بھی تھے۔ پہاڑ میں حرکت ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اُحد! ٹھہر جا، (میرا خیال ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہاڑ پر اپنا پاؤں بھی مارا تھا) ۔تجھ پر ایک نبی، ایک صدیق اور دو شہید (موجود) ہیں۔''[2]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا دوسرا نکاح:

سیدہ رقیہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دوسری صاحبزادی سیدہ ام کلثوم رضی اللہ عنہا کی شادی بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کر دی۔ سیدہ ام کلثوم رضی اللہ عنہا بھی شعبان ۹ ہجری میں وفات پا گئیں۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے فرشتے بھی حیا کرتے تھے:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نہایت شرم وحیا والے تھے۔ ام المؤمنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ ایک مرتبہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ران مبارک سے کپڑا ہٹا ہوا تھا۔ اس دوران (حضرت) ابوبکر صدیق (رضی اللہ عنہ) تشریف لائے اور اندر داخل ہونے کی اجازت طلب کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں اندر آنے کی اجازت دے دی۔ وہ حاضر ہوئے مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح بدستور لیٹے رہے، پھر (حضرت) عمرِ فاروق (رضی اللہ عنہ) تشریف لائے، انھوں نے بھی داخل ہونے کی اجازت مانگی جو عطا کی گئی۔ وہ داخل ہوئے اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اُسی حالت میں تشریف فرما رہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ران مبارک سے کپڑا ہٹا رہا۔ تھوڑی دیر بعد (حضرت) عثمان (رضی اللہ عنہ) تشریف لائے اور حاضری کی اجازت طلب کی۔ اللہ

[1] شرح النووي على صحيح مسلم (١٥/ ١٧٠۔ ١٧١)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٦٩٧)

کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اٹھ کر بیٹھ گئے اور اپنے کپڑوں کو درست کر لیا، یعنی ران پر کپڑا ڈال لیا۔'' ارشاد فرمایا: عائشہ

اپنے کپڑے وغیرہ درست کرلو۔'' جب وہ چلے گئے تو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کی: اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! جب (حضرت) ابوبکر صدیق (رضی اللہ عنہ) یعنی میرے والد آئے، اور پھر (حضرت) عمرِ فاروق (رضی اللہ عنہ) اندر آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح تشریف فرما رہے، مگر جب (حضرت) عثمان (رضی اللہ عنہ) آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کپڑوں کو سمیٹ لیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (حضرت) عثمان (رضی اللہ عنہ) کے لیے یہ خصوصی اہتمام کیوں کیا؟'' اس کی کیا وجہ ہے؟ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اے عائشہ! میں اُس شخص سے حیا کیوں نہ کروں، اللہ کی قسم! جس سے فرشتے بھی حیا کرتے ہیں۔''[1]

کہا گیا ہے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہر روز غسل کرتے تھے۔ اپنے گھر میں، بند کمرے میں غسل ہوتا، اس کے باوجود انھوں نے کبھی ننگے غسل نہیں کیا۔ ہمیشہ چادر باندھ کر غسل کرتے۔[2]

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''میری امت میں سب سے زیادہ حیادار عثمان (رضی اللہ عنہ) ہیں۔''[3]

شہادتِ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی پیش گوئی:

حضرت عبد اللہ بن حوالہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جو شخص تین چیزوں میں راہِ حق پر رہا اور فتنے میں نہ پڑا وہ نجات پا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات تین بار دہرائی۔ وہ تین چیزیں یہ ہیں: میری موت کے وقت، فتنۂ دجال کے وقت اور حق پر ڈٹ جانے والے صابر اور فیاض خلیفہ کے قتل، یعنی اس کی شہادت کے موقع پر۔''[4]

ظاہر ہے حق پر ڈٹ جانے والے شہید خلیفہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہی ہیں۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک فتنے کا ذکر فرما رہے تھے۔ اُسی دوران ایک آدمی گزرا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«يُقْتَلُ فِيهَا هٰذَا الْمُقَنَّعُ يَوْمَئِذٍ مَظْلُوماً»

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٠١)

[2] مسند أحمد (٦/ ٦٢)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٣٨٢٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤١٩) جامع ترمذي (٣٧٠١) سنن النسائي الكبرىٰ (٨٢٤٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٥٥) مسند أحمد (١/ ٦٠٤) رقم الحديث (١٢٩٠٤)

[4] مسند أحمد (٤/ ١٠٩)

''یہ نقاب پوش آدمی اُس دن مظلوم شہید ہوگا۔''

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: ''میں نے غور سے دیکھا تو وہ (حضرت) عثمان (رضی اللہ عنہ) تھے۔''[1]

جنت کی بشارت:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو مصائب جھیلنے پر جنت کی خوشخبری دی گئی، یہ اُن خوش قسمت لوگوں میں سے تھے، جنھیں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا ہی میں متعدد موقعوں پر جنت کی خوشخبری سنائی۔ اور آخری وقت تک اُن سے راضی رہے۔

عہدِ صدیقی اور عہدِ فاروقی میں کردار:

آپ خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد میں اُن کے مشیر خاص تھے۔ فتویٰ دینے کی خدمت بھی ان کے ذمے تھی۔ وہ کاتب بھی تھے۔ اسی طرح حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانے میں وہ مجلسِ شوریٰ کے ممتاز ارکان میں شامل تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خلافتِ فاروقی میں وزیر اعظم کے مرتبے پر فائز تھے، دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجیے کہ جو مرتبہ حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ کا خلافتِ صدیقی میں تھا، وہی مرتبہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا خلافتِ عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ میں تھا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بھی رحم دلی اور نرمی میں حضرتِ صدیق رضی اللہ عنہ کے مشابہ تھے۔ انھوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے دوران وہی کردار ادا کیا جو حضرتِ صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے عہدِ خلافت میں ادا کیا تھا، یعنی حضرتِ فاروق رضی اللہ عنہ کی سختی کے ساتھ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی نرمی کا امتزاج ایک مستحکم فلاحی اور مثالی سلطنت کا باعث بن گیا۔

حکومت کے نظم وضبط اور امت کی مبنی بر عدل سیاست میں عہدِ صدیقی وفاروقی کو دنیا بھر میں ضرب المثل کے طور پر بیان کیا جاتا ہے۔ لوگ خلافتِ حضرت عمر رضی اللہ عنہ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مقام و مرتبہ سے بخوبی واقف تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہی نے قیامِ دیوان، یعنی تمام معاملات کا ریکارڈ رکھنے کے لیے رجسٹر بنانے کا مشورہ دیا، اسی طرح بعض روایات کی رو سے سن ہجری جاری کرنے کا مشورہ بھی آپ ہی نے دیا تھا۔

---

[1] فضائل الصحابة للإمام أحمد (١/ ١٥٥) إسناده حسن.

خَراج کی زمین:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا شمار بھی اُن صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں ہوتا ہے جنھوں نے مفتوحہ زمین فاتحین میں تقسیم نہ کرنے کے سلسلے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی پالیسی کی تائید کی تھی اور اسے مسلمانوں اور ان کی اولاد کے لیے بطورِ فَے رکھنے کا مشورہ دیا تھا۔[1]

خلافتِ عثمان ذوالنورَین رضی اللہ عنہ

انتخابِ خلیفہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی فراست:

حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ امت کی وحدت اور اس کے درخشاں مستقبل کے لیے زندگی کی آخری سانس تک تگ و دَو کرتے رہے۔ آپ گہرے زخموں کی وجہ سے بڑی شدید تکلیف میں مبتلا تھے۔ اس کے باوجود آپ کو امت ہی کی بھلائی کی فکر لگی ہوئی تھی۔ زندگی کے آخری اکھڑتے ہوئے سانسوں سے بھی آپ کے مضبوط ایمان، خلوص اور ایثار کی خوشبو آرہی تھی۔

شدید زخمی ہونے کے باوجود آپ نے خلیفہ کے انتخاب کا ایسا جدید طریقہ اپنایا جس کی پہلے کوئی مثال نہیں ملتی۔ یہ آپ کی سیاسی بصیرت، عقل و دانش اور ایک عظیم قائد ہونے کی سب سے بھاری دلیل تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے رخصت ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خلافت کے لیے کسی کو نامزد نہیں کیا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ فوت ہوئے تو انھوں نے جلیل القدر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے مشورے سے حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ کو نامزد کر دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے جب آخری ایام میں مطالبہ کیا گیا کہ کسی کو خلیفہ نامزد کر دیجیے تو انھوں نے اس تجویز پر غور و فکر کیا اور حالات کی مناسبت سے ایک نیا طریقۂ نامزدگی اختیار فرمایا۔

جدید طریقۂ انتخاب میں شوریٰ کی تعداد محدود کر دی گئی۔ ایسے چھے افراد منتخب کیے گئے جو سب کے سب خلافت کے اہل تھے، اگرچہ ان کے مراتب مختلف تھے۔ آپ نے طریقۂ انتخاب اور مدت کا تعیّن بھی کر دیا اور تاکید فرما دی کہ اس دورانیے میں لازماً کسی ایک کو خلیفہ منتخب کر لیا جائے۔ ایک شخص کو اس انتخابی کمیٹی کا چیئرمین مقرر کیا اور تمام کے ووٹ برابر ہونے کی صورت میں مسئلے کا حاصل بتا دیا۔ خصوصی تاکید

---

[1] السياسة المالية لعثمان بن عفان رضي الله عنه لقطب إبراهيم محمد (ص: ٢٥)

کی کہ انتخاب کے تمام معاملات مخفی رکھے جائیں اور جو شخص متفقہ فیصلے کی مخالفت کرے اسے سزا دی جائے۔ ارکانِ شوریٰ کے علاوہ کسی اور شخص کو دخل اندازی یا سماعت کی قطعاً اجازت نہ دی جائے۔[1]

مجلسِ شوریٰ کے ارکان کی تعداد اور ان کے نام:

مجلسِ شوریٰ کے ارکان کی تعداد چھ تھی۔ ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

1. حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ
2. حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ
3. حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ
4. حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ
5. حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ
6. حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ

حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ بھی عشرہ مبشرہ میں سے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انھیں شاید اپنے خاندان بنوعدی کا فرد ہونے کی وجہ سے نظر انداز کر دیا۔[2]

انتخابی عمل کے لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ہدایات:

حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے مسئلہ حل کرنے کے لیے تین دن کی مہلت دی، وجہ یہ تھی کہ اگر زیادہ وقت دیا گیا تو اختلافات بڑھنے کا اندیشہ ہے، اس لیے انھیں تاکید کرتے ہوئے فرمایا: ''چوتھے روز لازماً کوئی امیر چن لینا۔''[3]

ارکانِ شوریٰ کی حقیقی تعداد:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بخوبی علم تھا کہ یہ مشورہ صرف چھ افراد تک محدود نہیں رہے گا بلکہ یہ حضرات مدینہ کے عوام سے بھی مشورہ کریں گے کہ کسے خلیفہ مقرر کیا جائے۔ اسی لیے آپ نے مشورہ اور بحث وتمحیص کے لیے تین دن کی مہلت دی تاکہ وہ مدینہ کے عوام سے مشورہ کرلیں اور خلیفہ کا انتخاب متفقہ طور پر

[1] أولیات الفاروق للدکتور غالب القرشي (ص: ١٢٤)
[2] البدایة و النھایة (٧/ ١٤٢)
[3] الطبقات لابن سعد (٣/ ٣٦٤)

ہو سکے۔ بالخصوص اہلِ مدینہ اس معاملے پر یکسو اور متفق ہوں کیوں کہ وہاں جلیل القدر صحابہ موجود تھے، اور باقی ماندہ لوگ ان کے تابع تھے۔ اس لیے ان کا اتفاق اہلِ مدینہ کی رائے کے ساتھ ضروری تھا۔

۲۳ھ تک مدینہ منورہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا مرکز رہا بلکہ کبار صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم مدینہ ہی میں موجود تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انھیں اپنی رفاقت ہی میں رکھا اور مفتوحہ علاقوں کی طرف جانے کی اجازت نہیں دی۔[1]

اہلِ شوریٰ:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اہلِ شوریٰ کو صرف یہی اختیار دیا کہ وہ اپنے میں سے کسی فرد کو خلیفہ چن لیں۔ سب سے اہم اور گراں مایہ بات یہ ہے کہ اہلِ شوریٰ کے کسی بھی فرد نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس فیصلے کی مخالفت نہیں کی۔ نہ دیگر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی نے کوئی اعتراض کیا۔ کتبِ سیرت و تاریخ میں اس معاملے کی مکمل وضاحت موجود ہے۔ فی الجملہ ہم کسی ایسے شخص کو نہیں جانتے جس نے کوئی اور رائے پیش کی ہو یا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زندگی کے آخری لحات میں یا اُن کی وفات کے بعد اُن کی رائے سے اختلاف کیا گیا ہو۔

اس کے برعکس سبھی لوگ اس فیصلے پر متفق تھے اور انھیں اسی میں امتِ مسلمہ کی بھلائی نظر آتی تھی۔ ہم پورے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نہایت بلند پایہ سیاسی کمیٹی بنائی۔ اس کمیٹی کے تمام ارکان بڑے عظمت مآب تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انھیں یہی کام سونپا کہ آپ اپنے میں سے خود ہی ایک خلیفہ کا انتخاب کر لیں۔ یہ دن رات وسعت پذیر اسلامی مملکت کا وہ جدید ترین دستوری نظام تھا جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسا عبقری ہی اپنی سیاسی بصیرت اور ایمانی فراست سے وضع کر سکتا تھا۔ یہ طریقِ انتخاب اسلام کی کسی بنیادی اصل سے نہیں ٹکراتا۔ بالخصوص اس میں شورائی نظام کی روح پوری طرح کام کر رہی تھی، پھر جس حتمی اور فیصلہ کن نتیجے کا اعتبار کیا گیا وہ مسلمانوں کی طرف سے جامع مسجد میں عام بیعت تھی۔ اگر کسی کو کوئی اعتراض ہوتا تو وہ بیعت نہ کرتا۔ اس بیعتِ عامہ سے وہ اشکال بھی ختم ہو جاتا ہے جو امکانی طور پر کسی کے ذہن میں آ سکتا تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ حق کس نے دیا؟ اور اس فیصلے میں آپ کی دلیل کیا تھی؟

ہمارے لیے یہی بات کافی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس فیصلے کو تمام مسلمانوں نے نہ صرف تسلیم کیا بلکہ اس پر خوشی کا اظہار بھی کیا۔ ایک فرد بھی ایسا نہ تھا جس نے اعتراض کی انگلی اٹھائی ہو۔ اس کے برعکس آپ کے اس فیصلے کے صائب ہونے پر تمام امتِ مسلمہ کا اجماع ہے اور اجماع شریعت کے مصادر میں سے ہے۔

[1] المدينة المنورة فجر الإسلام محمد حسن شراب (٢/ ٩٧)

اس مرحلے پر یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہیے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفۂ راشد تھے اور اہلِ شوریٰ وقت کے مروجہ سیاسی ڈھانچے کے سب سے اعلیٰ افراد تھے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جس کمیٹی کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نامزد کیا اُس کے افراد ایسی بیش بہا خوبیوں کے مالک تھے جو باقی مسلمانوں میں نہیں تھیں۔ ان پر اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت تھی۔ اُن خوبیوں کی نشاندہی خود رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی مبارک زندگی میں فرمادی تھی۔ کسی مسلمان کا تقوے اور امانت میں عشرہ مبشرہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے مرتبے تک پہنچنا محال ہے۔[1]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روح اس حال میں پرواز کر گئی کہ موت کی انتہائی شدید سختیاں بھی انھیں آخری سانس تک امتِ مسلمہ کے مفادات سے غافل نہ کر سکیں۔ آپ نے شوریٰ کا ایک مستحکم اور باقاعدہ نظام قائم کیا جو ان سے پہلے موجود نہ تھا اگرچہ قرآن و سنت سے اس کی اصل ثابت ہے۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی ذاتِ گرامی سے عملی طور پر اس کا ثبوت ملتا ہے، اس لیے یہ کوئی بدعت نہ تھی جسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایجاد کیا ہو، لیکن انھوں نے خلیفہ کے انتخاب کے لیے ارکانِ شوریٰ کی تعداد محدود کر دی۔ اس زمانے کی نئی کروٹوں کے مطابق یہی طریقہ زیادہ مناسب اور موزوں تھا۔[2]

مجلسِ شوریٰ کا اجلاس

شوریٰ کے نظم و نسق میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کا کردار:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تجہیز و تکفین سے فارغ ہوتے ہی سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں ارکانِ شوریٰ اور وزرائے اعلیٰ کا اجلاس ہوا۔ بعض روایات کے مطابق یہ اجلاس ضحاک بن قیس رضی اللہ عنہ کی بہن فاطمہ فہریہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں ہوا، تاکہ مسلمانوں کو درپیش مسئلے کا حل تلاش کیا جائے۔ اتوار کے دن ارکانِ شوریٰ کا اجلاس ختم ہوا۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے اصحابِ رائے سے مشاورت اور رابطے شروع کر دیے۔ رابطوں اور مشاورت کا سلسلہ تین دن تک جاری رہا۔ چار محرم الحرام بروز بدھ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف سے دی گئی مہلت ختم ہونے والی تھی۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا: ''اگر میں آپ کی بیعت نہ کروں تو آپ کسے نامزد کریں گے؟'' حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو۔'' اس کے

---

[1] نظام الحكم في الشريعة والتاريخ الإسلامي لظافر القاسمي (١/ ٢٢٧۔ ٢٢٩)
[2] أوليات الفاروق للدكتور غالب القرشي (ص: ١٢٧)

بعد حضرت عبد الرحمٰن رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور ان سے بھی یہی پوچھا: ’’اگر میں آپ کی بیعت نہ کروں تو آپ کسے خلیفہ نامزد کریں گے؟‘‘ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ’’حضرت علی رضی اللہ عنہ کو۔‘‘ اس کے بعد حضرت عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا۔ انھوں نے مدینہ منورہ کے تمام کبار صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا۔ مجاہدین کے کمانڈروں کی رائے لی اور مدینہ آنے والے ہر صاحبِ شعور شخص سے مشاورت کی۔ باپردہ فہیم خواتین کی رائے بھی معلوم کی۔

لوگوں نے کھل کر اپنی اپنی رائے پیش کی، اکثریت کی رائے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حق میں سامنے آئی کہ انھیں خلیفہ نامزد کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اکابر صحابہ سے لے کر عوام الناس تک سب ہی اس بات پر راضی ہو گئے۔[1]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بیعت پر اتفاق:

۲۹/ ذوالحجہ ۲۳ھ۔ یعنی ۶/ نومبر ۶۴۴ء کو فجر کی نماز حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ نے پڑھائی۔ نماز ختم ہوئی تو حضرت عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ آگے بڑھے۔ آپ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عطا کردہ عمامہ باندھے ہوئے تھے۔ شوریٰ کے ارکان منبرِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس موجود تھے۔ آپ نے مدینہ میں موجود انصار ومہاجرین اور سربراہانِ فوج کو بلا بھیجا جن میں شام کے گورنر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ، حمص کے امیر حضرت عمیر بن سعد رضی اللہ عنہ اور امیرِ مصر حضرت عَمرو بن عاص رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ یہ حضرات درحقیقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ حج کرنے کی غرض سے آئے تھے اور پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی کے ساتھ مدینہ آ گئے تھے۔ بعد ازاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا واقعۂ شہادت پیش آ گیا۔[2]

صحیح بخاری میں ہے کہ جب لوگوں نے فجر کی نماز پڑھ لی اور ارکانِ شوریٰ بھی منبرِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس موجود تھے تو حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے خطبہ دیا اور فرمایا: ’’اے علی (رضی اللہ عنہ)! میں نے لوگوں کی رائے لی ہے، وہ (حضرت) عثمان (رضی اللہ عنہ) کے برابر کسی کو نہیں سمجھتے، لہٰذا آپ کوئی ایسا اقدام نہ کیجیے جو آپ کے خلاف دلیل بنے۔‘‘ پھر حضرت عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ’’اے عثمان (رضی اللہ عنہ)! میں اللہ تعالیٰ، اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق اور ان کے بعد (حضرت) ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے طریقے کے مطابق

---

[1] عثمان بن عفان لصادق عرجون (ص: ٦٢، ٦٣)

[2] شهيد الدار للدكتور أحمد الخروف (ص: ٣٦)

آپ کی بیعت کرتا ہوں۔'' پھر مہاجرین وانصار، سربراہانِ افواج اور تمام لوگوں نے آپ کی بیعت کی۔[1]

آپ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مقرر کیے ہوئے وقت کی پوری پابندی کی۔ شوریٰ کا اجلاس بر وقت طلب کیا۔ ساری صورتِ حال کھول کر بیان کر دی، اس طرح تمام ارکانِ شوریٰ کو اپنی اپنی رائے دینے کا موقع میسر آ گیا۔ یوں ہر ایک کا موقف اور رائے بھی سامنے آ گئی جس کی بنا پر فیصلہ کرنا آسان ہو گیا۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے اپنی عقل وبصیرت، دیانت وامانت اور پوری بے لوثی سے خلافت جیسے عظیم منصب سے بے نیاز ہو کر اس نہایت اہم ذمہ داری کو جس محنت، مہارت اور غیر جانبداری سے پورا کیا اور اس سلسلے میں جس طرح مجلسِ شوریٰ کی قیادت کی، وہ ایک بے مثال تاریخی واقعہ بلکہ کارنامہ ہے۔[2]

آپ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مقرر کیے ہوئے وقت کی پوری پابندی کی۔ شوریٰ کا اجلاس بر وقت طلب کیا۔ ساری صورتِ حال کھول کر بیان کر دی، اس طرح تمام ارکانِ شوریٰ کو اپنی اپنی رائے دینے کا موقع میسر آ گیا۔ یوں ہر ایک کا موقف اور رائے بھی سامنے آ گئی جس کی بنا پر فیصلہ کرنا آسان ہو گیا۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے اپنی عقل وبصیرت، دیانت وامانت اور پوری بے لوثی سے خلافت جیسے عظیم منصب سے بے نیاز ہو کر اس نہایت اہم ذمہ داری کو جس محنت، مہارت اور غیر جانبداری سے پورا کیا اور اس سلسلے میں جس طرح مجلسِ شوریٰ کی قیادت کی، وہ ایک بے مثال تاریخی واقعہ بلکہ کارنامہ ہے۔[1]

امام ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''خلیفہ کے انتخاب کے لیے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ آپ خود اس منصب کی امیدواری سے دستبردار ہو گئے اور امت کے لیے اس شخص کا انتخاب کیا جس پر سب متفق تھے۔

اس طرح خلیفہ کے انتخاب کے لیے خلفائے راشدین ہی کے دَور میں ایک نیا شورائی نظام رائج ہو گیا اور وہ یہ کہ خلیفہ کے انتخاب کے لیے مجلسِ شوریٰ مقرر کی جائے جو عوام الناس کی رائے لے کر، بیعتِ عامہ کے ذریعے ان میں سے کسی ایک کو خلیفہ منتخب کرے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو منتخب کرنے والی مجلسِ شوریٰ کے بارے میں رافضیوں کی کذب بیانیاں:

تاریخِ اسلام پر رافضیوں اور شیعوں کی کذب بیانیوں کے نہایت گہرے اثرات موجود ہیں۔ انھوں

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٢٠٧)

[2] مجلّة البحوث الإسلامية (١٠/ ٢٥٥)

نے تاریخ کے جن واقعات کو اپنی دروغ گوئیوں سے مسخ کیا ہے، اُن میں سے ایک واقعہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلیفہ منتخب ہونے اور مجلسِ شوریٰ کے کردار کا ہے۔ روافض کی ان موشگافیوں کو مستشرقین نے بڑی ہوشیاری سے اچک لیا اور خوب پھیلایا۔ بہت سے جدید مفکّرین اور مؤرخین بھی اس سے متاثر ہوئے۔ انھوں نے روایات کی جانچ پڑتال کیے بغیر ہر رطب ویابس بات عوام میں پھیلا دی۔

روافض اور شیعہ مؤرخین نے مجلسِ شوریٰ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلیفہ منتخب ہونے کے واقعہ کو خوب اہتمام سے بیان کیا۔ جھوٹ اور فریب کی ایسی پیوند کاری کی کہ عام قاری الجھ کر رہ گیا۔ انھوں نے اس موضوع پر مستقل تصنیفات شائع کیں۔ ابومخنف نے ''کتاب الشوریٰ'' لکھی۔ اسی طرح ابن عقدہ اور ابن بابویہ نے بھی مستقل کتابیں لکھیں۔[1]

ابنِ سعد نے واقدی سے شوریٰ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بیعت اور تعیناتی کے سلسلے میں نو روایات بیان کی ہیں۔ عبید اللہ بن موسیٰ کی روایت میں حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ کی شہادت، ارکانِ شوریٰ کا تعیّن، منتخب ہونے والے خلیفہ کے لیے وصیّت اور اس معاملے میں حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ کے لیے وصیّت کی تفصیل موجود ہے۔[2] بلاذری نے شوریٰ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بیعت کے بارے میں ابومخنف اور ہشام کلبی سے واقعات نقل کیے ہیں۔ ابن ہشام کی بھی بعض روایات ابومخنف ہی کی بیان کردہ ہیں۔

اسی طرح اس نے عبیداللہ بن موسیٰ سے بھی بیان کیا ہے۔[3] امام طبری نے اس واقعہ میں بہت سی روایات پر اعتماد کیا ہے جن میں ابومخنف کی روایت بھی ہے۔[4]

روافض اور شیعہ کی روایات مکر وفریب اور دروغ گوئی سے بھری ہوئی ہیں،ان سے ہماری تاریخ اور امت کا ثقافتی ورثہ اتنا غبار آلود ہو چکا ہے کہ بڑے بڑے مفکرین، اصحابِ قلم اور مؤرخ بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔

---

1. الذريعة إلى تصانيف الشيعة (١٤/ ٢٤٦)
2. الطبقات لابن سعد (٣/ ٦٣ـ ٦٧، ٣٤٠)
3. أنساب الأشراف (٥/ ٦، ١٨، ١٩)
4. أثر التشيع على الروايات التاريخية للدكتور ابن عبد العزيز نور (ص: ٣٢١) یہ اس موضوع کی یہ بہترین کتاب ہے) ابن ابی الحدید نے شوریٰ کے بعض واقعات احمد بن عبدالعزیز جوہری کے واسطے سے نقل کیے ہیں۔(شرح نهج البلاغة: ٩/ ٤٩، ٥٠ و ٥٨)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کا جواز:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے برحق ہونے میں کسی کو کوئی شک نہیں، سوائے اُن لوگوں کے جن کے دل بغضِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے سبب زنگ آلود ہو چکے ہیں اور وہ شیعہ اورروافض ہیں جن کی زندگی کی ساری پونجی (معاذ اللہ) صحابہ کو گالیاں دینا اور ان کے لیے بُغض رکھنا ہے۔ ان کے اعتراضات بے بنیاد ہیں۔ خلفائے ثلاثہ کی خلافت کے بارے میں ان کے اعتراضات کی حیثیت بیتِ عنکبوت سے زیادہ نہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے برحق ہونے پر کئی آیات، احادیث اور آثار دلالت کرتے ہیں، ان میں سے چند درجِ ذیل ہیں:

قرآنی آیات سے استدلال:

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۭ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَـيْـــًٔا ۭ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴾ [النور: ٥٥]

”جو تم میں سے ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے، اللہ نے ان لوگوں سے وعدہ کیا ہے کہ وہ انھیں زمین میں ضرور خلافت دے گا، جس طرح اُس نے اُن سے پہلے لوگوں کو خلافت دی تھی۔ اور ان کے لیے ان کا وہ دین ضرور پائیدار کردے گا جو اُس نے اُن کے لیے چنا اور یقیناً اُن کی حالتِ خوف کو بدل کر وہ انھیں لازماً امن دے گا، وہ میری ہی عبادت کریں گے، اور کسی چیز کو میرا شریک نہیں ٹھہرائیں گے اور جو اس کے بعد کفر کریں گے تو درحقیقت وہی لوگ فاسق ہیں۔“

اس آیت سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے برحق ہونے کا استدلال اس طرح ہے کہ آپ کا شمار بھی اُن لوگوں میں ہے جنھیں باری تعالیٰ نے زمین میں اقتدار سے نوازا، اور زمین میں خلیفہ بنایا۔ دورانِ خلافت آپ نے اپنی کارگزاری کا اچھا نمونہ پیش کیا، عدل قائم کیا، نماز اور زکاۃ کے نظام کو مضبوط بنایا۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیا۔ مذکورہ بالا آیت میں صحیح خلافت کی یہی نشانیاں بیان کی گئی ہیں۔[1]

---

[1] عقيدة أهل السنة في الصحابة للدكتور ناصر بن علي (٢/ ٦٥٦)

احادیثِ مبارکہ سے استدلال:

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک باغ میں داخل ہوئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دروازے پر بطور دربان کھڑا کر دیا۔ اس دوران ایک آدمی آیا۔ اس نے اندر آنے کی اجازت طلب کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اسے اجازت دے دو اور جنت کی بشارت بھی دے دو'' میں نے دیکھا تو وہ (حضرت) ابوبکر (رضی اللہ عنہ) تھے، پھر ایک اور شخص نے اندر آنے کی اجازت مانگی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اسے اجازت دے دو اور جنت کی خوشخبری سنا دو۔'' میں نے دیکھا کہ وہ (حضرت) عمر (رضی اللہ عنہ) تھے، پھر ایک تیسرے شخص نے اندر آنے کی اجازت چاہی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اسے اجازت دے دو اور اسے اُن مصائب پر جنت کی بشارت دو جو اسے پہنچنے والے ہیں۔'' میں نے دیکھا تو وہ (حضرت) عثمان (رضی اللہ عنہ) تھے۔''[1]

اس حدیث میں ان تینوں اصحابِ گرامی کی پے در پے خلافت کا اشارہ ہے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر آنے والی اُس آزمایش کی پیش گوئی ہے جس میں انھیں محصور کر کے ناحق شہید کر دیا گیا۔ یہ حدیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزے کی بیّن دلیل بھی ہے اور اس میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے شہید ہونے کا بھی اشارہ ملتا ہے۔[2]

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک روز فرمایا:

''ایک نیک آدمی نے آج رات خواب میں دیکھا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے چمٹے ہوئے ہیں، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ حضرت عمر رضی اللہ عنہ چمٹے ہوئے ہیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ چمٹے ہوئے ہیں۔''

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''جب ہم رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے اٹھے تو ہم نے کہا: نیک آدمی سے مراد خود رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور جو ایک دوسرے کے ساتھ چمٹے ہوئے ہیں، یہ یکے بعد دیگرے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٦٩٥)

[2] عقيدة أهل السنة و الجماعة في الصحابة للدكتور ناصر بن علي (٢/ ٦٥٧)

کے مشن کے نگران ہوں گے۔''[1]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا:

''عنقریب ایک فتنہ اور اختلاف بر پا ہوگا یا اختلاف اور فتنہ نمودار ہوگا۔''

راوی کہتے ہیں کہ ہم نے عرض کی: اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! ہمارے لیے کیا ارشاد ہے؟'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''تم امین اور اس کے ساتھیوں کا ساتھ دینا۔''

اس ارشادِ مبارک سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تھے۔[2]

اِس حدیث میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت پر دلالت کرنے والا معجزہ ہے۔ وہ اس طرح کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خلافتِ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ میں بر پا ہونے والے فتنے سے آگاہ کیا اور وہ بعینہٖ واقع ہوا۔ اِسی طرح یہ حدیث حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے برحق ہونے پر بھی دلالت کرتی ہے کیوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا ساتھ دینے کا حکم دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے بھی آگاہ فرمایا کہ فتنے اور اختلاف کے وقت امیر المومنین حق پر ہوں گے اور آپ کے خلاف شورش بر پا کرنے والے جھوٹے اور خواہشات کے پجاری ہوں گے۔ اِس حدیث میں اس بات کی گواہی بھی موجود ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ حق پر ڈٹے رہیں گے۔[3]

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اے عثمان! ہوسکتا ہے اللہ تعالیٰ تمھیں ایک خلعت سے نوازے۔ اگر لوگ اسے اتارنے کا مطالبہ کریں تو ان کی وجہ سے ہرگز نہ اتارنا۔''[4]

اس حدیث میں بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے برحق ہونے کا اشارہ ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بطورِ استعارہ خلافت کو خلعت یا قمیص سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ آپ کو خلافت سے سرفراز کرے گا، اگر لوگ اس سے دستبردار ہونے کا مطالبہ کریں تو اُن کی بات ہرگز نہ ماننا کیوں کہ آپ حق پر ہوں گے اور

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٦٣٦)

[2] المستدرك للحاكم (٣/ ٩٩) وقال: حديث صحيح الإسناد ولم يخرجاه ووافقه الذهبي.

[3] عقيدة أهل السنة والجماعة في الصحابة للدكتور ناصر بن علي (٢/ ٦٦٠)

[4] فضائل الصحابة لأحمد بن حنبل (١/ ٦١٣) وإسناده صحيح.

وہ باطل پر ہوں گے۔[1]

حضرت ابو سہلہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے محاصرے کے دوران مجھ سے فرمایا:

''رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے ایک عہد لیا تھا، چنانچہ میں اُسی عہد پر قائم ہوں۔''[2]

عہد سے مراد یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے وصیّت فرمائی تھی کہ خلافت سے دستبردار نہ ہونا، اگر لوگ آپ کی قمیص اتروانا چاہیں تو ہرگز نہ اتارنا، لہٰذا میں اس وصیّت کی پاسداری کر رہا ہوں۔[3]

یہ دونوں حدیثیں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے برحق ہونے کی بڑی روشن دلیلیں ہیں۔ جو شخص آپ کی خلافت کا منکر ہے، آپ کو جنتی اور شہید نہیں گردانتا اور آپ کی بے ادبی کا مرتکب ہوتا ہے، وہ دائرۂ اسلام سے خارج اور ایمان سے خالی ہے۔[4]

مذکورہ بالا دلائل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کسی راست باز کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے برحق ہونے میں کوئی کلام نہیں تھا۔ بالخصوص قرآن وسنت کے پیروکار اہلِ سنت کے نزدیک تو اس کے برحق ہونے میں ذرا بھی تردّد نہیں۔ ان نصوص کی روشنی میں ہر مسلمان کو خلافتِ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے برحق ہونے کا یقین رکھنا چاہیے۔[5]

خلافتِ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر اجماع:

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور اُن کے منہج کی پیروی کرنے والے اہلِ سنت کا اس بات پر اجماع ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بعد خلافت کا حقدار حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر کوئی نہ تھا، کیوں کہ حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے بعد آپ ہی سب لوگوں سے افضل تھے۔ اہلِ علم اور محدّثینِ کرام کا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے برحق ہونے پر اجماع ہے۔

- امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''سب لوگوں کا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت پر اتفاق تھا۔ اور ابو حامد محمد المقدسی نے امام شافعی رحمہ اللہ کے حوالے سے لکھا ہے: ''واضح رہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بعد امامِ برحق

[1] الدين الخالص لمحمد صديق البخاري والئ بهوپال (٣/ ٤٤٦)

[2] جامع الترمذي، رقم الحديث (٣٧١١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١١٣)

[3] تحفة الأحوذي (١/ ٢٠٩)

[4] الدين الخالص لمحمد صديق البخاري (٣/ ٤٤٦)

[5] عقيدة أهل السنة للدكتور ناصر بن علي (٢/ ٤٤٤)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہی ہیں کیوں کہ مجلسِ شوریٰ نے امامت کا اختیار حضرت عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کو سونپ دیا اور انھوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو خلیفہ منتخب فرمایا۔ تمام صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے اس سے اتفاق کیا اور اُن کے اُس فیصلے کو برحق قرار دیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے عدل قائم کیا اور لوگوں کو حق کے راستے پر چلایا حتیٰ کہ انھوں نے اِسی حالت میں جامِ شہادت پی لیا۔''[1]

❁ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''تمام مسلمانوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بیعت کی، کوئی بھی بیعت سے پیچھے نہیں رہا۔ جب مقتدر شرفائے قوم نے آپ کی بیعت کر لی تو وہ امام بن گئے۔ فرض کریں اگر حضرت عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ بیعت کر لیتے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دوسرے بااختیار صحابہ بیعت نہ کرتے تو کیا آپ امام بن سکتے تھے؟ ہرگز نہیں۔

مذکورہ بالا تمام دلائل اس بات کا قطعی ثبوت ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت پر تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع تھا اور اس برحق انتخاب پر کسی کو کوئی اختلاف نہیں تھا۔[2]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا طرزِ حکومت:

بیعت مکمل ہونے کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے خطبہ ارشاد فرمایا۔ اُس میں آپ نے اپنے سیاسی منہج کا اعلان کیا اور فرمایا کہ میں کتاب و سنت اور شیخین (حضرت) ابوبکر و عمر (رضی اللہ عنہما) کے طرزِ حکومت کی پابندی کروں گا۔ آپ نے اپنے خطبے میں یہ بھی فرمایا کہ میں حدود اللہ کے سوا (باقی مقدمات میں) لوگوں کے ساتھ نرمی، بُردباری اور حکمت کا معاملہ اختیار کروں گا۔ آپ نے لوگوں کو دنیا کی رنگینیوں اور اِس کے فتنے سے ڈرایا۔ اس میں مقابلہ بازی سے اجتناب کرنے کی تاکید اور ایک دوسرے سے حسد و بُغض نہ رکھنے کی نصیحت فرمائی۔

آپ نے فرمایا کہ یہی چیزیں تفرقہ بازی اور اختلاف کا سبب بنتی ہیں۔ گویا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی دور رس بصیرت آپ کو آگاہ کر رہی تھی کہ عنقریب یہ امت خواہشات پرستی کے باعث فتنوں اور مصائب میں مبتلا ہو جائے گی۔[3]

---

[1] الردعلی الرافضة لأبي حامد المقدسي (ص: ٣١٩، ٣٢٠)

[2] عقيدة أهل السنة و الجماعة للدكتور ناصر بن علي (٢/ ٦٧١)

[3] تحقيق مواقف الصحابة في الفتنه للدكتور محمد المحزون.

آپ نے فرمایا:

''اما بعد! مجھے حکومت کی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔ میں نے اسے قبول کر لیا ہے لیکن یاد رہے کہ میں متّبع ہوں مُبتدع نہیں ہوں۔ اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے بعد میری تین ذمے داریاں ہیں: تمھارے متفقہ امور اور طریقوں میں اپنے سے پہلے لوگوں (حضرت) صدیق وفاروق (رضی اللہ عنہما) کی پیروی کروں اور جن بھلائی کے امور کو انھوں نے باہمی مشورے سے طے کیا، ان میں انہی کی اتباع کروں اور تمھیں بے جا سزا نہ دوں۔ دنیا بڑی پُرکشش ہے۔ اسے مزیّن کر کے لوگوں کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ بہت سے لوگ اس کے دامِ فریب میں آ چکے ہیں۔ تم دنیا کی طرف مائل نہ ہونا۔ نہ اس پر اعتماد کرنا کیونکہ یہ دھوکے باز ہے۔ یقین جانو یہ صرف اُسے چھوڑتی ہے جو اسے ترک کر دے۔''[1]

عاملین، گورنروں، کمانڈروں اور عام لوگوں کے نام خطوط:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وصیّت پرعمل کرتے ہوئے اُن کے مقرر کردہ کسی بھی گورنر کو ایک سال تک برطرف نہ کیا بلکہ انھیں برقرار رکھا۔ فوجی کمانڈروں، وزرائے خزانہ اور دیگر امراء کو بھیجے گئے خطوط کے مطالعے سے آپ کی خلافت کے منہج کا اندازہ ہوتا ہے۔ ذیل میں اُن خطوط کی کچھ تفصیل بیان کی جاتی ہے:[2]

گورنروں کے نام پہلا خط:

''اما بعد! اللہ تعالیٰ نے ائمہ کو حکم دیا ہے کہ وہ محافظ بنیں، انھیں مال وصول کرنے کی ذمے داری نہیں دی۔ اس امت کے اوّلین لوگ مال کے نگران تھے محض وصول کنندہ نہیں تھے۔ ایک زمانہ آئے گا جب ائمہ مال اکٹھا کرنے لگ جائیں گے اور محافظ نہیں رہیں گے۔ جب یہ صورت پیدا ہو جائے گی تو حیاء، امانت اور وفاداری ختم ہو جائے گی۔ سب کے ساتھ انصاف والا طرزِ عمل یہ ہے کہ آپ مسلمانوں کی ضروریات اور امور کا خیال رکھیں۔ انھیں ان کا حق پہنچاتے رہیں، پھر ان سے اپنے حقوق کا مطالبہ کریں، پھر اہلِ ذمہ کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ ان کے حقوق وفرائض کا خیال رکھیں، پھر اپنے ان دشمنوں کے خلاف

---

[1] تاريخ الطبري (٥/ ٤٤٣)

[2] تحقيق مواقف الصحابه للدكتور محمد المحزون (١/ ٣٩٣)

میدان میں کود پڑیں جو آپ سے نبرد آزما ہیں اور اُن کے خلاف وفاداری کے ساتھ مدد طلب کریں۔''[1]

اس خط میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مختلف شہروں میں تعینات حکّام کو نصیحت کی کہ وہ رعایا کا خاص خیال رکھیں گے تو معاملات درست رہیں گے۔ اگر مقصود صرف لوگوں سے مال وصول کرنا ہو تو عوام کے دلوں میں پائی جانے والی حیاء، دیانت داری اور خیر خواہی ختم ہو جائے گی۔[2]

آپ نے انھیں خبردار کرتے ہوئے بتایا کہ عنقریب ایسے حکّام آئیں گے جن کا مقصد عوام الناس کا خیال رکھنے کے بجائے صرف دولت جمع کرنا ہو گا۔ اور ایسا اُس اخلاق عالیہ کے فقدان کے نتیجے میں ہو گا جسے آپ نے حیاء، امانت اور وفاداری سے تعبیر کیا ہے۔ اچھے اخلاقِ میں سے ایک خُلق حیا بھی ہے، جس کی طرف حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اشارہ کیا ہے۔ لوگ حیا کی وجہ سے برے کاموں سے باز رہتے ہیں۔ وہ کسی دوسرے کے احساسات کو مجروح کر کے اُسے کسی مصیبت میں مبتلا نہیں کرتے۔

فوجی کمانڈروں کے نام خط:

آپ نے مختلف صوبوں میں مقرر جرنیلوں کے نام خط میں لکھا: ''امابعد! آپ مسلمانوں کے نگران اور محافظ ہیں۔ (حضرت) عمر (رضی اللہ عنہ) نے اپنی زندگی میں آپ پر جو ذمہ داریاں ڈالیں اور جو قوانین مقرر کیے وہ ہمارے مشورے سے طے ہوئے تھے۔ مجھے یہ شکایت نہیں ملنی چاہیے کہ آپ میں سے کسی نے ان میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی کی ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ آپ کو بدل دے گا اور آپ کی جگہ کسی اور کو لے آئے گا، لہٰذا آپ غور کریں کہ آپ نے اپنی ذمہ داری کو کس طرح پورا کرنا ہے۔ میں اپنی ذمہ داریوں پر غور وفکر کرتا رہوں گا اور اس بات پر ثابت قدم رہوں گا۔''[3]

اس خط میں توجہ دلائی گئی ہے کہ خلیفہ کے بدلنے سے معاملات نہیں بدلتے کیوں کہ خلیفہ اور اس کے ماتحت وزراء کا صرف یہی مقصد ہوتا ہے کہ عملی زندگی میں اسلام کو کارفرما کیا جائے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا یہ فرمانا کہ ''(حضرت) عمر (رضی اللہ عنہ) نے اپنی زندگی میں جو قوانین مقرر کیے تھے وہ ہماری مشاورت سے طے کیے تھے، ان میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں آنی چاہیے۔'' اس سے دراصل یہ واضح کرنا مقصود تھا کہ سابقہ

---

[1] تاريخ الطبري (٥/ ٢٤٤)

[2] تحقيق مواقف الصحابة للدكتور محمد المحزون (١/ ٣٩٣)

[3] تاريخ الطبري (٥/ ٢٤٤)

خلفاء کے احکامات باہمی مشورے سے جاری کیے جاتے تھے۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام ذمہ دار لوگ اہم فیصلوں کی تفصیلات سے بخوبی آگاہ ہوتے ہیں۔ جب ایک حاکم کی جگہ دوسرا حاکم آئے تو وہ اُسی منہج پر چلتا ہے کیوں کہ سب کے نزدیک ہدف واضح ہوتا ہے۔ آپ کا یہ فرمان: ''آپ ان قوانین میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہ کریں ورنہ اللہ آپ کی جگہ کسی اور قوم کو لے آئے گا۔'' اس بات کی عکّاسی کرتا ہے کہ آپ نے کائنات میں اللہ تعالیٰ کے کارفرما قوانین کو یاد رکھا۔ پس اللہ ذوالجلال کا اپنے بندوں کی نصرت وحمایت کرنا اور نیکی کی توفیق عطا کرنا شریعت کی پابندی کرنے اور اس کے احکام کے سامنے سرِتسلیم خم کرنے سے مشروط ہے۔ لیکن جب مسلمانوں میں تبدیلی آگئی تو اللہ تعالیٰ نے ان کے اعزاز، وقار اور دبدبہ کو چھین کر غیروں کے سپرد کر دیا۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۭ وَاِذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْۗءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ ﴾ [الرعد: ۱۱]

''اِس (انسان) کے لیے اس کے آگے اور اس کے پیچھے باری باری آنے والے (فرشتے) ہیں، وہ اللہ کے حکم سے اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ بے شک اللہ کسی قوم کی حالت اُس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی روِش میں تبدیلی نہ کر لے اور جب اللہ کسی قوم پر عذاب لانے کا ارادہ کرتا ہے تو وہ کسی کے ٹالے نہیں ٹلتا۔ اور ان کے لیے اس کے سوا کوئی کارساز نہیں۔''

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انھیں نصیحت کرتے ہوئے لکھا کہ میں اپنی ذمہ داریوں سے خوب واقف ہوں اور انھیں ادا کرنے میں مشغول ہوں۔ آپ نے یہ بات اس لیے لکھی تاکہ حاکم اور رعایا میں یکساں طور پر احساسِ ذمہ داری بیدار رہے اور ملت کا ہر فرد محسوس کرے کہ اس کا کام صرف اپنا ہی نہیں بلکہ پوری امت کا ہے۔[1]

عُمّال کے نام خط:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے خَراج وصول کرنے والے عاملین کے نام اپنے پہلے خط میں فرمایا:

[1] عثمان بن عفان لصادق عرجون (ص: ۱۹۹)

''اما بعد! بے شک اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے اور وہ حق ہی قبول فرماتا ہے۔ اپنا حق وصول کرنے کے ساتھ ساتھ اس کا حق بھی ادا کرو۔ امانت کا معاملہ نہایت اہم ہے، لہٰذا امانت پر کاربند رہو۔ ان لوگوں کے پیشرو نہ بنو جن سے امانت چھن جائے گی کہ اپنے گناہوں کے ساتھ ساتھ بعد والوں کا وبال بھی تم پر پڑے۔ وفاداری اور خیرخواہی نہایت ضروری ہے، لہٰذا یتیم اور معاہد (ذِمی) پر ہرگز ظلم نہ کرنا کیوں کہ اللہ ان پر ظلم کرنے والوں کے خلاف ہے۔''[1]

آپ نے انھیں نصیحت کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر تم ان پر ظلم کرو گے تو اللہ تعالیٰ کی سزا کے حقدار ٹھہرو گے، کیوں کہ ان کمزوروں پر ظلم کرنے والوں سے خود اللہ تعالیٰ جواب طلب کرے گا۔ اس بات سے اسلام کی عظمت آشکار ہوتی ہے کہ وہ مظلوموں کی مدد کا حامی ہے چاہے وہ کفار ہی ہوں۔[2]

سلطنت کا دستورِ اعلیٰ:

حضرت ذوالنورین رضی اللہ عنہ نے اعلان کیا کہ مملکت کا اصل مرجع قرآن وسنت اور شیخین کی سیرت کی پیروی ہوگا۔ آپ نے فرمایا: ''خبردار! میں متّبع ہوں مُبتدع نہیں۔ بے شک قرآن وسنت کے بعد میری تین ذمے داریاں ہیں: تمھارے متفقہ امور میں اپنے سے پہلے لوگوں کی پیروی کرنا وغیرہ....''[3]

پہلا مرجع...اللہ کی کتاب:

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ إِنَّآ أَنزَلْنَآ إِلَيْكَ ٱلْكِتَٰبَ بِٱلْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ ٱلنَّاسِ بِمَآ أَرَىٰكَ ٱللَّهُ ۚ وَلَا تَكُن لِّلْخَآئِنِينَ خَصِيمًا ﴾ [النساء: ١٠٥]

''(اے نبی!) بے شک ہم نے آپ کی طرف یہ کتاب حق کے ساتھ نازل کی ہے، تاکہ آپ کو اللہ نے جو سیدھی راہ دکھائی ہے اُس کے مطابق لوگوں کے مابین فیصلہ کریں اور آپ خیانت کرنے والوں کے حمایتی نہ بنیں۔''

[1] تاريخ الطبري (٥/ ٢٤٤)

[2] التاريخ الإسلامي للدكتور عبد العزيز الحمَيدي (٢٠/ ٣٧١)

[3] تاريخ الطبري (٥/ ٣٤٤)

قرآنِ مجید زمانے اور زندگی کے ہر شعبے کی اصلاح کے لیے بنیادی، اصولی اور قطعی احکامِ پُرحکمت بیان فرماتا ہے۔ قرآنِ مجید نے اسلامی ریاست کی تشکیل وتقویم میں درپیش راہنمائی کی ضرورت کو بڑے واشگاف الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔

دوسرا مرجع...سنتِ مطہّرہ:

سنتِ مطہرہ کے ذریعے اسلامی قانون کی تشکیل میں بنیادی اصول وقواعد مرتّب کرنے میں مدد لی جاتی ہے۔ احکامِ قرآن کی صحیح تطبیق اور نفاذ بھی سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ذریعے سے ممکن ہے۔[1]

تیسرا مرجع...شیخین رضی اللہ عنہما کی اقتداء:

اس کے بارے میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

«اِقْتَدُوْا بِالَّذَیْنِ مِنْ بَعْدِیْ: اَبِیْ بَکْرٍ وَّ عُمَرَ»[2]

''میرے بعد (آنے والے) دونوں (خلفاء) ابوبکر وعمر (رضی اللہ عنہما) کی اقتداء کرو۔''

حضرت عثمان ذو النورَین رضی اللہ عنہ کی خلافت شریعتِ اسلامیہ کا مظہر تھی۔ آپ کی نظر میں شریعتِ اسلامیہ کے مقابلے میں کسی بھی قانون اور شریعت کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ آپ کی خلافت سے یہ بات عیاں ہوتی ہے اور ہمارے لیے شمعِ رہبری کا کام دیتی ہے کہ اسلامی مملکت، شریعت کی سلطنت ہوتی ہے، جہاں ہر لحاظ سے احکامِ شریعت ہی کی بالا دستی ہوتی ہے۔ حاکم بھی احکامِ شریعت کا پابند ہوتا ہے، وہ اس میں کوئی کمی کر سکتا ہے نہ زیادتی۔[3]

حضرت ذوالنورَین رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے معاشرے میں شریعت کی قدر و منزلت سب پر فائق تھی۔ حاکم ومحکوم سبھی اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے تھے۔ خلیفہ کی اطاعت اللہ کی اطاعت کے ساتھ مشروط تھی۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

''(اللہ کی) نافرمانی میں اطاعت جائز نہیں، اطاعت صرف نیکی میں ہے۔''[4]

---

[1] فقه التمكين في القرآن الكريم للصلابي (ص: ٢٣٤)

[2] جامع الترمذي، رقم الحديث (٣٦٦٢) وصححه الألباني، صحيح الترمذي (٣/ ٢٠٠)

[3] نظام الحكم في الإسلام (ص: ٢٢٧)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٢٥٧)

مجلسِ شوریٰ:

مضبوط اسلامی ریاست کے بنیادی قوانین میں سربراہِ حکومت اور اس کے ماتحت حکّام کی عوام کے ساتھ مشاورت بھی شامل ہے۔ عوام کی رضا مندی اور رائے نہایت اہمیت کی حامل ہے، اسی لیے نظامِ ریاست کو شوریٰ کے ذریعے سے چلانے کا حکم ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۗ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ﴾ [آل عمران: ١٥٩]

''پس (اے نبی!) آپ اللہ کی رحمت کے باعث ان کے لیے نرم ہو گئے۔ اگر آپ تُند خو اور سخت دل ہوتے تو وہ سب آپ کے پاس سے چُھٹ جاتے، چنانچہ آپ ان سے درگزر کریں اور ان کے لیے بخشش مانگیں اور ان سے (اہم) معاملات میں مشورہ کریں، پھر جب آپ پختہ ارادہ کر لیں تو اللہ پر بھروسا کریں، بے شک اللہ بھروسا کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔''

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں انصار و مہاجرین پر مشتمل کبار صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی مجلسِ شوریٰ تشکیل دی تھی۔ آپ نے اپنے تحصیل داروں اور فوجی کمانڈروں کو خاص تاکید کی: ''انھیں باتوں پر کاربند رہیں جن پر آپ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت میں کاربند تھے۔ انھیں تبدیل نہ کریں۔ کتنا ہی مشکل معاملہ درپیش ہو، ہم سے رجوع کریں، ہم اس پر امت کو جمع کر کے اس کا کوئی حل نکال لیں گے اور آپ کو مطلع کر دیں گے۔''[1]

فوجی کمانڈروں نے اس حکم کی تعمیل کی۔ وہ جب بھی کوئی جنگ کرنا چاہتے یا پیش قدمی کا ارادہ کرتے تو سب سے پہلے مرکز سے رجوع کر کے اجازت اور مشاورت طلب کرتے تھے۔ ایسے مواقع پر آپ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو جمع کرتے، اُن سے مشاورت کر کے اس کے لیے مناسب حکمت عملی تیار کرتے اور صحابہ کی باقاعدہ رضا مندی کے بعد انھیں اپنے اقدام کی اجازت دیتے۔[2]

---

[1] الإدارة العسكرية في الدولة الإسلامية للدكتور سلمان العودة (١/ ٢٧٧) نقلا عن تاريخ الطبري.

[2] فتوح مصر لابن عبد الحكم (ص: ٨٣)

عدل ومساوات:

اسلامی حکومت کے اہداف میں یہ بات بھی شامل ہے کہ وہ ایسا اسلامی نظم وضبط قائم کرے جو اسلامی معاشرے کی تشکیل میں مُمِد ومعاون ثابت ہو۔ اس کے لیے عدل وانصاف ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مختلف شہروں کے عوام کو یہ وثیقہ ارسال فرمایا:

”نیکی کی تبلیغ کرو اور منکرات سے ایک دوسرے کو روکتے رہو۔ مومن اپنے آپ کو کمزور نہ سمجھے۔ میں طاقتور کے مقابلے میں اُس وقت تک کمزور کے ساتھ ہوں جب تک وہ مظلوم ہے۔ ان شاء اللہ۔“[1]

آپ کی سیاست عدل کی اعلیٰ ترین اقدار پر قائم تھی۔ آپ نے گواہی ملنے پر اپنے اخیافی (ماں شریک) بھائی، گورنرِ کوفہ، حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کو شراب پینے پر حد لگائی۔ انھیں ان کے منصب سے معزول کر دیا اور ان کی جگہ حضرت سعید بن عاص رضی اللہ عنہ کو کوفہ کا گورنر مقرر کیا۔ لیکن اہلِ کوفہ کے عدمِ اطمینان کی وجہ سے ان کی جگہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو کوفہ کا گورنر مقرر کیا۔

آپ کے بارے میں منقول ہے کہ ایک دن آپ کو ایک خادم پر غصہ آیا تو اس کا کان پکڑ کر رگڑا۔ اسے سخت تکلیف ہوئی۔ رات ہوئی تو آپ پریشان ہو گئے، خادم کو اپنے کمرے میں بلایا۔ اسے قصاص لینے کا کہا اور حکم دیا کہ وہ بھی ان کا کان رگڑے۔ خادم نے انکار کیا تو دوبارہ سختی سے کہا۔ پھر اس نے قصاص لے لیا۔[2]

آزادی اور خودمختاری:

آزادی کا اصول ان بنیادی اصولوں میں سے ہے جن پر خلافتِ راشدہ قائم تھی۔ یہ اصول شریعتِ اسلامیہ کی حدود میں رہتے ہوئے مکمل خودمختاری اور آزادی کی ضمانت دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کی دعوت درحقیقت لوگوں کے لیے آزادی اور خودمختاری کی دعوت ہے۔ یہ اس قدر کشادہ دعوت ہے کہ تاریخِ انسانی میں اس جیسی دعوت کی مثال ملنی مشکل ہے۔ موجودہ دَور میں مذہبی آزادی، نقل وحرکت کی آزادی، امن وامان، چادر اور چار دیواری کا تقدّس، مالکانہ حقوق کی آزادی اور رائے کی آزادی کے تمام تصورات خلافتِ راشدہ میں بطریقِ احسن عملاً بدرجۂ اتم جلوہ گر تھے۔[3]

---

[1] تاريخ الطبري (٤/ ٤١٤)

[2] نظام الحكم في عهد الخلفاء الراشدين لحمد محمد عبدالصمد (ص: ١٤٩)

[3] نظام الحكم في عهد الخلفاء الراشدين لحمد محمد عبدالصمد (ص: ١٥٧۔ ١٥٨)

زرد کپڑے پہننے پر تنقید:

آپ نے دیکھا کہ حضرت محمد بن جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے عصفر بوٹی سے رنگے ہوئے کپڑے پہن رکھے ہیں تو ان پر تنقید فرمائی۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ انھیں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے دیکھا تو ڈانٹا اور ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا:

''کیا تو زرد (سرخ) کپڑے پہنتا ہے، حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے روکا ہے۔''[1]

دورانِ عدّت حج وعمرہ کرنے والی عورتوں پر تنقید:

آپ کے احتساب کی ایک مثال یہ بھی ہے کہ آپ دورانِ عدّت حج وعمرہ کا قصد کرنے والی خواتین کو واپس بھیج دیتے تھے۔[2]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خطبے اور نکات

آخرت کی تیاری کے لیے خطبہ:

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے خطبہ دیا۔ آپ نے اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء کے بعد فرمایا: ''اے لوگو! اللہ سے ڈر جاؤ۔ اللہ کا تقویٰ غنیمت ہے۔ سب سے زیادہ سمجھدار وہ ہے جس نے اپنے آپ کو سنوار لیا۔ موت کے بعد کی زندگی کے لیے تیاری کی اور اللہ کے نور سے قبر کی تاریکی دور کرنے کا سامان کر لیا۔ بندے کو اللہ تعالیٰ سے ڈرنا چاہیے۔ مبادا دنیا میں بصارت کے باوجود وہ اُسے بروزِ قیامت اندھا کر کے اٹھائے۔ سمجھدار کے لیے مختصر بات کافی ہے۔ بہرے کو سنانے کی تمام کوششیں لاحاصل رہتی ہیں۔ جان لو! جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ ہو وہ کسی سے نہیں ڈرتا اور جس کے خلاف اللہ تعالیٰ ہو بھلا اس کا کہاں ٹھکانا؟''[3]

معروف حکیمانہ اقوال:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا:

---

[1] مسند أحمد (١/ ٧١)

[2] المصنف لعبد الرزاق (٧/ ٣٣) رقم الحديث (٢٠٧١)

[3] صحيح التوثيق في سيرة وحياة ذى النورَين للدكتور مجدى فتحى السيد (ص: ١٠٧)

''اگر تمھارے دل پاک صاف ہو جائیں تو تم اپنے رب کے کلام، یعنی تلاوتِ قرآن سے کبھی سیر نہ ہو۔''[1]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا:

''کوئی شخص کسی بات کو چھپالے تو اس کے چہرے کے تأثرات اور سبقت لسانی اسے ظاہر کر دیتی ہے۔''[2]

ایک موقع پر فرمایا:

''اللہ تعالیٰ حاکم کے ذریعے سے ان برائیوں کو روک دیتا ہے جو صرف قرآن کے ذریعے سے نہیں رک سکتی تھیں۔''[3]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ دنیا کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے۔ آپ کا ارشاد ہے:

''دنیا کی فکر دل کو تاریک کر دیتی ہے اور آخرت کی فکر دل کو جِلا بخشتی ہے۔''[4]

آپ کی حکمت بھری باتوں میں سے ہی ایک بات یہ بھی ہے کہ حاسد کو یہی (سزا) کافی ہے کہ وہ آپ کی خوشی کے وقت غمگین ہو جاتا ہے۔[5]

فتنے کے دنوں میں آپ نے ارشاد فرمایا: ''اگر میں نے ظلم کیا ہے تو اللہ تعالیٰ سے معافی مانگتا ہوں۔ اگر کوئی مجھ پر ظلم کرنے والا ہے تو میں نے اسے معاف کر دیا۔''[6]

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''ہر چہرے کے لیے کوئی نہ کوئی آفت ہوتی ہے اور ہر نعمت کسی ناگہانی مصیبت کی نذر ہو جاتی ہے۔ اِس دین کی آفت لوگوں پر کثرت سے عیب لگانے والے اور چڑھتے سورج کے پُجاری لوگ ہیں۔ ان کا ظاہر تمھیں اچھا لگے گا مگر ان کے باطن سے تمھیں گِھن آئے گی۔ یہ نہایت

---

[1] جامع العلوم و الحكم لابن رجب الحنبلي (ص: ٣٦٣)

[2] فرائد الكلام لخلفاء الكرام للدكتور قاسم عاشور (ص: ٢٦٩)

[3] الكامل في اللغة والأدب لأبي العباس محمد بن يزيد (١/ ١٥٧)

[4] الاستعداد ليوم المعاد (ص: ٩)

[5] مجمع الأمثال للميداني (٢/ ٤٥٣)

[6] تاريخ خليفة بن خياط (ص: ١٧١)

کمینے اور بے وقوف لوگ ہوں گے۔''[1]

آپ کا ارشاد ہے:

''اللہ تعالیٰ ہر شخص کو اس کے عمل کی چادر پہنائے گا۔''[2]

ایک موقع پر فرمایا: مومن کو پانچ قسم کا خوف لاحق ہوتا ہے:

① اللہ تعالیٰ کا خوف کہ وہ اس سے ایمان کی دولت چھین نہ لے۔

② اللہ کے مقرر کردہ کاتبین کا خوف مبادا وہ انسان کا ایسا عمل لکھ لیں جس کی وجہ سے قیامت کے دن رسوائی ہو۔

③ شیطان کی طرف سے خوف کہ وہ اس کے اعمال باطل نہ کردے۔

④ موت کے فرشتے سے خوف مبادا وہ چانک جھپٹ کر غفلت میں جان قبض کر لے۔

⑤ دنیا سے خوف مبادا وہ اسے دھوکے میں ڈال دے اور آخرت سے غافل کردے۔

آپ نے فرمایا: ''میں نے چار چیزوں میں عبادت کی مٹھاس محسوس کی ہے:

① اللہ تعالیٰ کے لیے ادائے فرائض میں۔

② اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیزوں سے اجتناب میں۔

③ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی خاطر امر بالمعروف میں۔

④ اس کے غضب سے بچنے کے لیے نہی عن المنکر میں۔''[3]

ادب کی کتابوں میں بعض اشعار حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کیے گئے ہیں یا یہ بتایا گیا ہے کہ آپ انھیں بطورِ تمثیل بیان کیا کرتے تھے۔ ان میں سے کچھ اشعار کا ترجمہ یہ ہے:

''میں جانتا ہوں کہ یقیناً اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ چیزوں کی کوئی مثال نہیں۔ اور یہ بات کسی پر بھی مخفی نہیں۔''

آپ یہ اشعار اکثر پڑھا کرتے تھے:

''حرام طریقے سے حاصل ہونے والی تمام پسندیدہ لذتیں ختم ہو جائیں گی، صرف گناہ اور

---

[1] مجمع الأمثال للميداني (٢/ ٤٥٣)

[2] الزهد للإمام أحمد (ص: ١٨٥)

[3] فرائد الكلام للخلفاء الكرام للدكتور قاسم عاشور (ص: ٢٧٨)

شرمندگی باقی رہ جائے گی۔ بدکار بُرے انجام سے دو چار ہو کر رہے گا۔ جس لذت کے بعد آگ ہو بھلا اس کا کیا فائدہ۔"[1]

جب حملہ آور آپ کو شہید کرنے کی غرض سے آپ کے گھر میں داخل ہوئے تو آپ نے انھیں دیکھتے ہی فرمایا:

"میں دیکھتا ہوں کہ موت کسی طاقتور کو بھی نہیں چھوڑتی۔ اس نے قومِ عاد کے لیے شہروں میں کوئی پناہ چھوڑی، نہ کوئی چرا گاہ باقی رکھی۔"

اور جب ان کا محاصرہ کیا گیا تو انھوں نے کہا:

"(موت) قلعے والوں پر بھی حملہ کرتی ہے، حالانکہ وہ قلعہ بند ہوتا ہے، موت تو پہاڑوں کی بلند چوٹیوں پر بھی آ جاتی ہے۔"[2]

ذاتی اوصاف و مکارم:

آپ ایک ربانی قائد کی صفات سے بدرجۂ اتم متصف تھے۔ آپ بے شمار خوبیوں کے مالک تھے، ہم ان میں سے آپ کی بعض خوبیاں ذکر کر رہے ہیں:

- آپ اللہ تعالیٰ اور یومِ آخرت پر نا قابلِ شکست ایمان رکھتے۔
- شرعی علم کے زیور سے آراستہ تھے۔
- اللہ تعالیٰ پر مکمل بھروسا کرنے والے، صدق و وفا کے پیکر، بہت باصلاحیت اور بڑے دلیر تھے۔
- مروّت، زہد، جذبۂ قربانی، عجز و انکسار، قبولِ نصیحت، حِلم و بُردباری، صبر و شکر، عالی ہمتی، پختگی، ٹھوس ارادہ اور عدل و انصاف جیسی گرانمایہ خوبیوں کے حامل تھے۔
- مشکلات حل کرنا اور ماتحتوں کی اچھی تربیت کرنا آپ کا خاص وصف تھا۔

اللہ کی عطا کردہ انہی خوبیوں کی وجہ سے آپ نے مملکتِ اسلامیہ کے خلاف اٹھنے والی ہر اندرونی اور بیرونی یورش کا بڑی خوبی سے قلع قمع کیا۔ اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور اپنی مبنی بر صداقت پالیسیوں سے امت کو اس کے اعلیٰ اہداف و مقاصد تک پہنچایا۔

---

1. شعراء الخلفاء لنبال تيسير الخماش (ص: ٢٧)
2. البداية والنهاية (٧/ ١٩٢)

علمی فضیلت اور عوامی تعلیم کی قائدانہ صلاحیّت:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا شمار قرآن وسنت کا راسخ علم رکھنے والے کبار صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں سے ہوتا ہے۔ آپ ہر معاملے میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور شیخین رضی اللہ عنہما کی پیروی کیا کرتے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اسلام لانے کے بعد عمر بھر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے علم وعرفان کے جواہر سے خوب استفادہ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کا شمار اُن صحابۂ کبار میں ہوتا ہے جو بڑے بلند پایہ عالم تھے۔ آپ قوم کی بڑی صحیح راہنمائی فرماتے تھے۔ لوگوں کو ان کے فرائض کی تعلیم دیتے تھے۔ اپنے علم، تجربہ اور مہارت کی بنا پر نہایت قیمتی آراء سے مستفید فرماتے تھے تاکہ ان میں دعوت وجہاد، تعلیم وتربیت اور اللہ کی ملاقات کا شوق اور صلاحیت پیدا ہوسکے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے منقول چند فرامینِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی متعدد احادیث لوگوں تک پہنچائیں جن سے لوگوں نے خوب استفادہ کیا۔

قرآنی تعلّم وتعلیم کی اہمیّت:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے یہ حدیث سنی ہے اور اس پر عمل پیرا ہوں۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو قرآن سیکھے اور دوسروں کو اس کی تعلیم دے۔''[1]

حضرت سعد بن عبیدہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابوعبدالرحمٰن سلمی رحمہ اللہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت سے قرآن پڑھانا شروع کیا اور حَجاج کے دَور تک قرآنِ کریم ہی پڑھاتے رہے۔ وہ خود فرماتے ہیں کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان ہی نے مجھے (اتنا عرصہ) اس مسند پر بیٹھنے پر آمادہ کیا۔

حِلم وبُردباری:

حِلم اور بُردباری حکمت کی بنیادی اکائی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید کے کئی مقامات پر اپنی ذاتِ عالیہ کے لیے صفتِ ''حِلم'' کا ذکر کیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٠٢٧)

﴿ إِنَّ الَّذِينَ تَوَلَّوْا مِنكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ إِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطَانُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوا ۖ وَلَقَدْ عَفَا اللَّهُ عَنْهُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ ﴾ [آل عمران: ١٥٥]

''بے شک جب دو لشکر (اُحد میں) آپس میں ٹکرائے تھے تو تم میں سے جن لوگوں نے پسپائی اختیار کی یقیناً وہ اپنی کوتاہیوں کے سبب شیطان کے بہکاوے میں آگئے تھے اور بلاشبہہ اللہ نے انھیں معاف کر دیا، بے شک اللہ نہایت بخشنے والا، بہت حوصلے والا ہے۔''

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا حِلم اور عفو و درگزر ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ اپنے اقوال، افعال اور احوال میں بڑی شدّت سے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کیا کرتے تھے۔ کئی واقعات آپ کے حِلم اور ضبطِ نفس پر شاہد ہیں۔ آپ کے حِلم کی سب سے اعلیٰ مثال اُس وقت سامنے آئی جب بلوائیوں نے آپ کے گھر کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ آپ نے انصار و مہاجرین سے فرمایا: ''مجھے میرے حال پر رہنے دو، تم اپنے گھروں کو چلے جاؤ، حالانکہ وہ دفاع کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ آپ کے حِلم کی بنیاد اللہ تعالیٰ سے ملاقات کا شوق تھا۔ آپ کسی صورت بھی مسلمانوں کا خون بہنا گوارا نہیں کر سکتے تھے، چاہے اس کے لیے خود ان کی اپنی ہی جان کیوں نہ چلی جائے۔[1]

عالی ظرفی اور فراخ دلی:

حضرت عطاء بن فروخ رحمہ اللہ مولیٰ قریش فرماتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک شخص سے زمین خریدی۔ اُس نے (رقم لینے میں) دیر کر دی۔ آپ اس سے ملے اور فرمایا: ''کیا وجہ ہے، اپنا مال لینے نہیں آئے؟'' اس نے کہا: ''آپ نے مجھے نقصان پہنچایا ہے کیونکہ ہر شخص مجھے ملامت کر رہا ہے (کہ تو نے زمین سستے داموں بیچ ڈالی ہے۔) آپ نے فرمایا: ''کیا اِسی وجہ سے پیسے لینے نہیں آئے؟'' اس نے کہا: ''ہاں۔'' آپ نے فرمایا: ''کوئی بات نہیں، آپ کی مرضی ہے، زمین واپس لے لیں یا اپنی رقم، پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ مبارک ہے:

''اللہ تعالیٰ اُس شخص کو جنت میں داخل کرے جو خرید و فروخت اور اپنا حق لینے دینے میں نرمی اور فراخ دلی کا مظاہر کرتا ہے۔''[2]

[1] الكفاءة الإدارية في السياسة الشرعية للقادري (ص: ٦٥)

[2] مسند أحمد (١/ ٥٨) حسن لغيره.

یہ خرید وفروخت میں عالی ظرفی کی نہایت عمدہ مثال ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ فطری طور پر نہایت کریم اور زاہد انسان تھے۔ آپ کے نزدیک زندگی کا مقصد عمدہ اخلاق کی تکمیل تھا اور عمدہ اخلاق میں سب سے اہم وصف ایثار اور قربانی ہے۔ آپ دنیا کو عمدہ اخلاق کے لیے قربان کر دیتے تھے لیکن دنیا کی وجہ سے اچھے اخلاق پر کبھی زَد نہیں آنے دی۔ آپ نے اپنی کسی بھی دنیاوی مصلحت کی خاطر لوگوں کو کبھی نقصان نہیں پہنچایا۔[1]

نرم خوئی:

اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اپنے باقی بندوں پر رحمت کرتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نرم خوئی کی صفت سے نوازا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ دیگر خوبیوں کے ساتھ ساتھ نرم مزاجی سے بھی متصف تھے۔ آپ رعایا کے لیے نہایت نرم مزاج اور شفیق تھے۔ آپ اس بات سے بہت محتاط رہتے تھے کہ آپ کی طرف سے کسی کو کوئی معمولی سا دکھ بھی پہنچے اور انھیں علم نہ ہونے کی وجہ سے اس کی حاجت براری نہ ہو پائے۔ لوگوں کے دکھ درد میں شریک ہونے کے لیے ان کے حالات کا پتا لگاتے رہتے تھے تاکہ کمزور کی مدد کر سکیں اور طاقتور سے کمزور کو حق دلا سکیں۔

عفو و درگزر:

حضرت عمران بن عبداللہ بن طلحہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ فجر کی نماز کے لیے نکلے۔ اپنے معمول کے دروازے سے داخل ہوئے تو کوئی شخص آپ سے ٹکرا گیا۔ آپ نے فرمایا: ''دیکھو! یہ کیا معاملہ ہے؟'' لوگوں نے دیکھا کہ ایک شخص خنجر یا تلوار سے مسلح ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس سے پوچھا: ''کیا بات ہے تم اِدھر کس لیے آئے؟'' اس نے کہا: ''میں آپ کو قتل کرنا چاہتا تھا'' آپ نے فرمایا: ''سبحان اللہ! آخر کیوں؟'' اُس نے کہا: ''یمن میں آپ کے عامل نے مجھ پر ظلم کیا ہے۔'' آپ نے فرمایا: ''تم نے مجھ سے اس کی شکایت کیوں نہ کی؟ پھر اگر میں تم سے انصاف نہ کرتا یا اپنے عامل کی حمایت کرتا تب تم مجھ سے یہ سلوک کر سکتے تھے۔'' پھر آپ نے وہاں موجود لوگوں سے دریافت فرمایا: ''تمہاری اِس کے بارے میں کیا رائے؟ اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے!'' لوگوں نے کہا: ''امیر المؤمنین! دشمن کو اللہ نے قابو میں دے دیا ہے، (لہٰذا قتل کر دیجیے)۔''

---

[1] التاريخ الإسلامي للدكتور عبد العزيز الحميدي (١٧، ١٨/ ١٢٦)

آپ نے فرمایا: ''نہیں، بلکہ ایک بندے نے گناہ کا ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے مجھے اس سے بچالیا ہے۔'' پھر اُس شخص سے فرمایا: ''جاؤ کوئی ضامن لے آؤ کہ میری خلافت میں تم کبھی مدینہ میں داخل نہیں ہوگے۔'' وہ اپنی قوم کا ایک ضامن لے آیا تو آپ نے اسے چھوڑ دیا۔[1]

قتل کا ارادہ کرنے والے پر مکمل قابو پا جانے کے بعد اُسے معاف کر دینا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی عظمت اور چشم پوشی کی بہت بڑی دلیل ہے۔

عجز وانکساری:

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ﴾ [الفرقان: ٦٣]

''اور رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر آہستگی (وقار اور عاجزی) سے چلتے ہیں، اور جب جاہل لوگ ان سے بات کریں تو وہ کہتے ہیں: سلام ہے۔''

اللہ عزوجل نے مومنوں کی صفات ذکر کرتے ہوئے پہلی خوبی عجز وانکساری بتائی ہے۔ خلیفۂ راشد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اس خوبی سے بدرجۂ اتم متّصف تھے اور اس کی وجہ اللہ تعالیٰ کے لیے ان کا اخلاص تھا۔

حیا اور پاکدامنی:

حیا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی معروف خوبیوں میں سے ہے۔ اس خوبی سے اللہ تعالیٰ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو خوب مزیّن کیا تھا۔ یہ بڑا بیش بہا وصف ہے! آپ خیر اور بھلائی کا مرکز اور رحمت وشفقت کا منبع تھے۔ آپ تمام لوگوں سے بڑھ کر حیا والے تھے۔[2]

جود وسخا:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ امت کے سب سے زیادہ سخی اور کریم انسان تھے۔ آپ کی سخاوت کے واقعات اور اثرات تاریخِ اسلامی کا ایک لازوال اور سنہرا باب ہیں۔ غزوۂ تبوک میں مجاہدین کی تیاری، مسلمانوں

[1] التاريخ الإسلامي للدكتور عبد العزيز الحميدي (١٧، ١٨/ ٢٢)

[2] عثمان بن عفان رضي الله عنه لصادق عرجون (ص: ٤٨ ـ ٤٩)

کے لیے بئرِ رومہ (بئرِ عثمان رضی اللہ عنہ) کی خریداری، رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دَور میں مسجدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی توسیع، عہدِ صدیق رضی اللہ عنہ میں قحط سالی کے دوران پورے قافلے کے غذائی سامان کی فقراء میں تقسیم جن کا ذکر گزر چکا ہے۔ اسلام لانے کے بعد آپ ہر جمعہ کو ایک غلام یا لونڈی آزاد کیا کرتے تھے۔ آپ کے آزاد کردہ غلاموں کی تعداد تقریباً چوبیس سو (۲۴۰۰) ہے۔[1]

بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ، جو خود بہت بڑے سخی تھے، اُن کے ذمے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پچاس ہزار درہم تھے۔ ایک دن حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ''آپ کی رقم کا بندوبست ہوگیا ہے، لہٰذا وصول کرلیں۔'' حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''وہ رقم آپ ہی کی ہے۔ اسے اپنے اچھے کاموں میں لگا لیں۔''[2]

جود وسخا کی عظیم خوبی میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شخصیت منفرد تھی۔ آپ نے اپنا مال اللہ کے دین کی خدمت، اسلامی سلطنت کی تعمیر وترقی، جہاد فی سبیل اللہ اور معاشرتی کاموں میں اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے خرچ کر دیا اور اس میں کبھی کسی بخل سے کام نہ لیا۔

بہادری

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا شمار بہادر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں ہوتا ہے جس کی دلیل درجِ ذیل امور ہیں:

غزوۂ بدر:

آپ کا جہاد کے لیے نکلنا اور ہر غزوے میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہنا آپ کی شجاعت کی واضح دلیل ہے۔ جہاں تک غزوۂ بدر میں پیچھے رہنے کا تعلق ہے، وہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے تھا، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں مجاہدینِ بدر میں شمار کیا اور آپ کو غنیمت میں حصہ دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انھیں اصحابِ بدر میں شامل کرنے کے بعد کسی کو اس پر کلام کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔

صلح حدیبیہ میں سفارت کے فرائض:

جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے

[1] الصواعق المحرقة لابن حجر الهيتمي (١/ ٣٢٧)

[2] البداية و النهاية (٧/ ٢٢٧)

حدیبیہ کے روز قریش کے ہاں جانے کی ذمہ داری اٹھائی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ درپیش حالات میں سفارت کاری جان جوکھوں میں ڈالنے کا کام ہے، لیکن آپ کو آپ کی مردانگی اور شجاعت ہی نے حکم رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعمیل پر آمادہ کیا۔ ایسے حالات میں سفارت کاری کی ذمہ داری قبول کرنا کسی بہت بڑے بہادر اور نابغۂ روزگار ہی کا کام ہوسکتا ہے۔ یہ بات درست ہے کہ یہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم تھا لیکن باصلاحیت بہادر انسان کے علاوہ کسی بزدل آدمی کے لیے اسے قبول کرنا ممکن نہ تھا۔[1]

جان فدا کرنا:

جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا ان کے گھر میں محاصرہ کرلیا گیا تو باغیوں نے دو باتیں آپ کے سامنے رکھیں:

1. خلافت سے دستبردار ہو جائیں۔
2. اپنے بعض عاملوں کو معطل کر کے ان کی جگہ ہمارے آدمی مقرر کریں۔

ورنہ قتل کے لیے تیار ہو جائیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اپنے موقف پر ڈٹے رہے۔ باغیوں کی کوئی بات قبول نہیں کی۔ حالانکہ محاصرہ کرنے والوں کی چمکتی ہوئی تلواروں میں آپ کو موت نظر آرہی تھی۔ ایسے جان لیوا حالات میں اپنے موقف پر ڈٹے رہنا اور دشمن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنا یقیناً کسی بہادر اور حق پرست انسان ہی کا کام ہے۔ دنیا سے محبت کرنے والا اور بزدل شخص کبھی یہ موقف اختیار نہیں کرسکتا بلکہ بزدل کا سارا سرمایہ اس کی حیاتِ فانی ہوتی ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا اپنے موقف پر اس قدر اصرار، پختہ عزیمت اور کمال بہادری اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر پختہ ایمان کی وجہ سے تھا جو ان کے دل و دماغ کے ایک ایک ریشے میں راسخ ہوگیا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بہت بہادر تھے۔ موت کو بھی خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ باطل کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ بُردبار تھے، احمق کی حماقت آپ کو جاہل نہیں بناسکتی تھی۔[2]

مستقل مزاجی اور دوراندیشی:

مستقل مزاجی حضرت ذوالنورَین رضی اللہ عنہ کی پہچان تھی۔ آپ کی مستقل مزاجی پر دلالت کرنے والے واقعات میں سے یہ بھی ہے کہ آپ نے نظامِ خلافت کو ضائع ہونے سے محفوظ رکھا۔ خارجیوں کے مطالبے

[1] الأمين ذو النورَين لمحمود شاكر (ص: ۱۹۴۔ ۱۹۶)

[2] الأمين ذو النورَين لحمود شاكر (ص: ۱۹۷) جولة تاريخية في عصر الخلفاء الراشدين لمحمد الوكيل (ص: ۳۰۴)

پر خلافت سے دستبردار ہونے سے انکار کر دیا۔ اگر آپ خارجیوں کے کہنے پر خلافت سے دستبردار ہو جاتے تو امامت جیسا عظیم منصب مفسدین، شریر اور فساد برپا کرنے والوں کے ہاتھوں کھیل تماشا بن جاتا اور غیر منظّم لوگوں کی بالادستی ہو جاتی اور ریاست کا نظام درہم برہم ہو جاتا۔ اگر آپ ان خارجیوں کی شرائط قبول کر لیتے تو یہ ایک طریقہ چل نکلتا کہ ہر شخص اپنی مرضی سے جس کے خلاف چاہتا اٹھ کھڑا ہوتا اور اسے معزول کر دیتا۔ اس طرح پوری قوم اندرونی تنازعات میں الجھ کر بیرونی دشمنوں سے غافل ہو جاتی، اس کا شیرازہ بکھر جاتا اور ساکھ ختم ہو جاتی۔[1]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس امت کو اختلافات اور تفریق سے بچانے اور اس کے ڈھانچے اور بنیادوں کو محفوظ کرنے کے لیے اِس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ آپ اپنی جان کی قربانی دے دیں، سو آپ نے بے دریغ جامِ شہادت پی لیا۔[2]

صبر و تحمل:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ صبر و تحمل کی خوبی سے بھی متّصف تھے۔ بہت سے واقعات آپ کے صابر ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔ دورانِ فتنہ بلوائیوں کے مقابلے میں پیدا ہونے والے حالات میں امت کے ڈھانچے کو بچانے کے لیے آپ نے جس جوانمردی کا مظاہرہ کیا، وہ صبر و تحمل کی منفرد مثال ہے۔ امت کے وقار کا تحفّظ اور مسلمانوں کو خونریزی سے بچانا اور اپنی جان قربان کر دینا کوئی معمولی صبر نہ تھا۔ اگر امت کے مفادات پیشِ نظر نہ ہوتے تو آپ اپنے آپ کو بڑی آسانی سے بچا سکتے تھے۔ اگر آپ اُن لوگوں کو، جو آپ کی حفاظت کے لیے اپنی خدمات پیش کر رہے تھے، حکم دیتے تو وہ خارجیوں کی گردنیں کاٹ دیتے۔ وہ معمولی لوگ نہ تھے بلکہ انصار اور مہاجرین صحابہ و تابعین تھے۔ لیکن آپ نے امت کا شیرازہ بکھرنے سے بچایا اور اللہ سے ثواب کی امید رکھتے ہوئے اپنی جان قربان کر دی۔ آپ نے اعلان فرمایا کہ میں شدید فتنے کا مقابلہ اللہ تعالیٰ کے فرمان کی تعمیل کرتے ہوئے صبرِ جمیل کے ساتھ کروں گا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا ایمان نہایت مضبوط تھا۔ آپ بلند پایہ، صاحبِ بصیرت اور نہایت صابر

---

[1] آج کل یہ سب کچھ ''جمہوریت'' کا مرہونِ منت ہے، اسی وجہ سے تمام جمہوری ریاستوں کا یہی حال ہے۔

[2] تحقيق مواقف الصحابة من الفتنه للدكتور محمد المحزون (١/ ٤٧٤)

شخصیت تھے کہ امت کی خاطر اپنی جان تک قربان کردی۔ مسلمانوں کے نزدیک یہ آپ کی بہت بڑی فضیلت ہے۔[1]

عبادت وریاضت:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ عدل وانصاف کی صفت سے مزیّن تھے جسکی تفصیل گزری ہے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شرعی عبادات نہایت کوشش اور خوبی سے بجالاتے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا معمول تھا کہ قرآن کی بکثرت تلاوت کیا کرتے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کثرت سے روزے رکھتے اور رات کا اکثر حصہ قیام میں گزارتے تھے۔[2]

محاسبۂ نفس اور خشیتِ الٰہی:

آپ کے ایک خطبے کا اقتباس یہ ہے:

''اے لوگو! تقویٰ اختیار کرو، اللہ کا تقویٰ غنیمت ہے۔ سب سے زیادہ دانا وہ ہے جو اپنے آپ کو سنوار لے، موت کے بعد کی زندگی کے لیے محنت کر لے، اللہ کے نور سے قبر کے لیے روشنی کا سامان کر لے اور اس بات سے ڈرے کہ کہیں اللہ اسے بصارت کے باوجود روزِ قیامت اندھا نہ کردے۔''[3]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے یہ قول بھی منقول ہے: ''اگر میں جنت اور دوزخ کے درمیان ہوں اور مجھے علم نہ ہو کہ میرا اٹھکانا کون سا ہے تو میں خواہش کروں گا کہ اپنے ٹھکانے کا علم ہونے سے پہلے مٹی ہو جاؤں۔'' آپ جب آخرت کا تذکرہ فرماتے تو جسم پر کپکپی طاری ہو جاتی، روح مضطرب ہو جاتی اور آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی۔ جب قبر اور حشر کے حالات اور حساب کتاب کا تصوّر فرماتے تو آپ پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا۔[4]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلام حضرت ہانی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جب کسی قبر کے پاس سے گزرتے تو اس قدر روتے کہ داڑھی بھیگ جاتی۔ آپ سے کہا گیا کہ جنت اور جہنم کا تذکرہ

---

1. سير الشهداء للسختياني (ص: ٥٧۔ ٥٨) تحقيق مواقف الصحابة في الفتنه للدكتور محمد المحزون (١/ ٤٧٢)
2. علو الهمة (٣/ ٩٣) صفة الصفوة لابن الجوزي (١/ ٣٠٢)
3. صحيح التوثيق للدكتور مجدى فتحى السيد (ص: ١٠٧)
4. نظام الحكم في عهد الخلفاء الراشدين لحمد محمد عبدالصمد (ص: ٢٠٥)

ہوتا ہے تو آپ نہیں روتے لیکن قبر کے پاس آپ روتے ہیں؟ کہنے لگے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

''بے شک قبر آخرت کی منزلوں میں سے پہلی منزل ہے، اگر انسان اس سے نجات پا گیا تو اس کے بعد والا معاملہ اس سے آسان ہوگا اور اگر اس (کے عذاب) سے نہ بچ سکا، تو اس کے بعد کے مراحل اس سے بھی زیادہ سخت ہیں۔''[1]

مزید فرمایا، رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی فرمان ہے:

''اللہ کی قسم! میں نے جتنے بھی مناظر دیکھے ہیں، ان میں سے قبر سب سے بڑھ کر پریشان کن ہے۔''[2]

زہد و ورع:

یہ بات معروف ہے کہ آپ کا شمار بہت بڑے سرمایہ داروں اور اہلِ ثروت میں ہوتا تھا۔ اس کے باوجود آپ کے بارے میں کئی ایسے واقعات ملتے ہیں جو آپ کے زہد پر دلالت کرتے ہیں۔ حمید بن نعیم کا بیان ہے کہ حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کسی دعوت پر مدعو تھے۔ چنانچہ دونوں نکلے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ''بہتر تھا کہ ہم اس دعوت پر نہ جاتے۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: ''وہ کس لیے؟'' فرمایا: ''مجھے خدشہ ہے کہ اس دعوت کی بنیاد کہیں فخر و مباہات پر نہ ہو۔''[3]

اس سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی سخاوت کے سلسلے میں فہم و فراست کا اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام میں سخاوت، خرچ کرنے میں فخر و غرور اور مختلف انواع کے کھانے کھلانے میں نہیں بلکہ عجز و انکساری اور باری تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے اسراف کیے بغیر نہایت خلوص سے مال خرچ کرنے میں ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی اسی سوچ نے انھیں دنیا کے جاہ و جلال کی خاطر مال خرچ کرنے سے دور رکھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ دنیاوی شہرت سے بے نیاز تھے۔[4]

شکر و سپاس اور قدر شناسی:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ زبان، عمل اور کردار سے ہر آن اللہ تعالیٰ کا بہت شکر ادا کرنے والے تھے۔ ایک

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٣٠٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٤٦١) مسند أحمد (١/ ٢٢٥) و صححه أحمد شاكر.

[2] صحيح جامع الترمذى، رقم الحديث (٢٣٠٨)

[3] الزهد للإمام أحمد (ص: ١٢٦)

[4] التاريخ الإسلامي للدكتور عبد العزيز الحميدي (١٧،١٨/ ٤٩)

دن کچھ لوگوں کو شک کی بنا پر پکڑ نے گئے۔ وہ لوگ آپ کے وہاں پہنچے سے پہلے ہی منتشر ہو چکے تھے۔ آپ نے اللہ تعالیٰ کے شکر کے طور پر ایک غلام آزاد کیا کہ ان کے ہاتھوں مسلمانوں کی رسوائی نہیں ہوئی۔[1]

لوگوں کی خبر گیری:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نہایت شفیق اور محبّ انسان تھے۔ آپ مسلمانوں کے احوال اور مشکلات کی خبر گیری کرتے رہتے تھے۔ غیر موجود احباب کے گھر والوں کو اطمینان دلاتے، نو وارد کو تسلی دیتے اور مریضوں کی تیمار داری فرماتے تھے۔

ذمہ داریوں کی تقسیم:

اس کا مطلب ہے مختلف علاقوں کے کام مختلف لوگوں کے سپرد کرنا مثلاً ہر شعبے کے ملازم کو اس کے کام کا مکلّف ٹھہرایا گیا کہ وہ اپنے دائرۂ کار سے تجاوز نہ کرے۔ عدلیہ، مالیات، فوج وغیرہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں یہ ذمہ داریاں مسلمانوں کے سپرد ہوئیں۔ آپ نے ذمہ داریوں کی تقسیمِ کار کے فطری اور شرعی تقاضوں کا خیال رکھا۔ یہ عوامل خلافتِ راشدہ کی کامیابی کا باعث تھے۔

قابل اور باصلاحیت لوگوں کی قدر، امت کو ان کے ادب واحترام کی تلقین، ان سے ان کے شایانِ شان سلوک، ان کے حقوق کا خیال، ان کی صلاحیتوں اور تجربات سے فائدہ اٹھانا نہایت اہم خوبیاں ہیں۔ انہی خوبیوں نے سلف صالحین رحمہم اللہ کو دنیا میں اقتدار اور عزت وشرف سے نوازا تھا۔[2]

یہ ہیں بعض وہ صفاتِ عالیہ جن سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ متّصف تھے۔ یہ صفات ان مسلمان حکمرانوں اور عوام الناس کے لیے، جو نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے منہج پر چلنا چاہتے ہیں، مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

محکمۂ مالیات:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جب برسرِ اقتدار آئے تو آپ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قائم کردہ شعبۂ مالیات کی پالیسی میں کوئی تبدیلی نہیں کی، تاہم مسلمانوں کو مال جمع کرنے، پختہ مکانات بنانے اور ملک کے طول وعرض

[1] علو الهمة (٥/ ٤٨١)

[2] الكفاءة الإدارية في السياسة الشرعية للقادري (ص: ١١٧، ١٥٧)

میں پھیلی ہوئی کھلی زمینوں کو ملکیت میں لینے کی اجازت دے دی۔ گویا کہ آپ کا زمانۂ خلافت مسلمانوں کے لیے قدرے آسانی کا زمانہ تھا۔[1]

عام مالی پالیسی کا مقصد:

یہ بات یقینی ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اسلام کی عمومی پالیسی کے نفاذ کے لیے بھرپور کوشش کی کیونکہ ان کی بیعت میں بنیادی طور پر یہ بات شامل تھی کہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات اور سابقہ دونوں خلفاء حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی پالیسیوں کو عملی جامہ پہنائیں گے۔ ظاہر ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مالی پالیسیوں اور دیگر احکام کے نفاذ میں قرآنِ کریم اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعیّن کردہ اصولوں ہی کو سامنے رکھا تھا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس مالیاتی ادارے کو مزید ترقی دی، اس کے قواعد وضوابط مقرر کیے، اس کی آمدن بڑھائی اور مصارف کا تعیّن فرمایا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انہی کی پیروی کی، تاہم بعض قابلِ غور مسائل میں اجتہاد کرتے ہوئے مالیات اور دیگر مسائل میں احکامِ الٰہی کی روشنی میں تصرّف کیا۔

آپ نے زکاۃ بیت المال میں جمع کرنے اور اسے مستحق لوگوں میں تقسیم کرنے کا انتظام کیا۔ ذِمیوں کی حفاظت، امن و امان اور دوسرے حقوق کی ذمہ داری چونکہ حکومت پر ہوتی ہے، اس لیے جزیہ کی صورت میں وصول ہونے والی رقم بھی مرکزی بیت المال میں جمع کرنے کا حکم دیا۔

مسلمان مجاہدین مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ مرکزی بیت المال کو بھیجتے تھے اور بیت المال ہی سے یتیموں، مسکینوں اور مسافروں وغیرہ پر اللہ تعالیٰ کے اس حکم کے مطابق خرچ کیا جاتا تھا، جس کا سورۃ الانفال (آیت: ۴۱) میں حکم دیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴾

''اور جان رکھو کہ (لڑائی میں) جو غنیمت تم کو ملے اس میں سے (چار حصے تو لڑنے والوں کو ملیں گے اور) پانچواں حصہ اللہ ہے اور رسول کا اور ناطے والوں کا اور یتیموں کا اور مسکینوں کا اور

[1] مبادئ الاقتصاد الإسلامي لسعاد إبراهيم صالح (ص: ٢١٧)

مسافروں کا (جن کے پاس راہ خرچ نہ رہا ہو) جو تقسیم اوپر بیان ہوئی اس پر چلو) اگر تم اللہ پر یقین رکھتے ہو اور اس (مدد) پر جو ہم نے اپنے بندے (نبی) فیصلے کے دن اتاری جس دن دونوں فوجیں (اسلام اور کفر) گتھ گئی تھیں (ایک دوسرے سے بھڑ گئی تھیں) اور اللہ سب کچھ کرسکتا ہے۔‘‘

اسی طرح سلطنت کی دیگر ضرورتیں بھی بیت المال ہی سے پوری ہوتی تھیں۔مختصر یہ کہ خلیفہ کے فرائض عقدِ بیعت کی دو شرطوں، دین کی حفاظت اور دنیاوی معاملات کی سہولت سے انجام دہی کی تدبیر اور حُسنِ انتظام سے عیاں ہوتے ہیں۔[1]

یہی رسولِ اکرم ﷺ کا مشن تھا اور آپ ﷺ اس زمین میں اللہ تعالیٰ کے احکام کو نافذ کرنے والے تھے۔ اس لیے بہتر بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ ان دونوں شرطوں، دین کی حفاظت اور دنیاوی معاملات کی تدبیر، کو پیشِ نظر رکھ کر ہر دور کے تقاضوں کے مطابق امام کے فرائض کا تعیّن کیا جائے اور اس کے لیے علماء اور ماہرین کی کمیٹیاں تشکیل دی جائیں جو اس دور کے تقاضوں کا جائزہ لے کر فرائض کا تعیّن کریں۔[2]

بیت المال پر مسلمانوں کے حقوق:

بیت المال کے عطیات دو طرح کے ہو سکتے ہیں:

1. بیت المال براہِ راست کوئی چیز دیتا ہے، جیسے مستحقین تک زکاۃ کا مال پہنچانا اور شعبۂ مالیات کے لیے ضرورت سے زائد مال کی مسلمانوں میں تقسیم۔
2. بیت المال بالواسطہ خرچ کرے، جیسے رفاہِ عامہ کے کام جو حکومت عوام الناس کے لیے کرتی ہے۔

ادائے حقوق کا اہتمام:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اہلِ کتاب سے جزیہ لیتے وقت کسی بھی قسم کے ظلم و زیادتی سے اجتناب کرنے کا حکم بھی دیا تھا، کیوں کہ جو لوگ ٹیکس صحیح طریقے سے ادا کرتے ہیں، مملکت کی ذمہ داری ہے کہ ان کے مال و جان کا تحفّظ کرے اور ان سے اچھا سلوک روا رکھے۔ رسولِ اکرم ﷺ نے حضرت عبد اللہ بن ارقم رضی اللہ عنہ کو ذِمیوں سے ٹیکس وصول کرنے پر مقرر کیا، جب وہ جانے لگے تو آپ ﷺ نے فرمایا:

---

[1] مقدمہ ابن خلدون (ص:۱۹۱)

[2] الخلافة بين التنظير و التطبيق لمحمد المرداوی (ص: ٦٧)

’’خبردار! جس نے کسی معاہد یا ذِمی پر ظلم وزیادتی کی یا اس پر اس کی استطاعت سے بڑھ کر بوجھ ڈالا یا اس کی توہین کی یا اس سے کوئی چیز زبردستی لی تو قیامت کے دن میں اس کی طرف سے جھگڑوں گا۔‘‘[1]

اِسی فرمان کے پیشِ نظر حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اپنی موت کے وقت صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو یہ نصیحت فرمائی:

’’میں اپنے بعد آنے والے خلیفہ کو ذِمیوں سے اچھا سلوک کرنے کی وصیّت کرتا ہوں۔ وہ ان کے عہد کی پاسداری کرے۔ ان کے دفاع کے لیے لڑائی کرے اور ان پر ان کی استطاعت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالے۔‘‘

اِن باتوں سے خلیفۂ ثالث حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بھی باز رہنے کا حکم دیا اور ان کا یہ حکم رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے ماخوذ تھا۔[2]

یتیم پر ظلم سے گریز:

قرآن مجید کی رُو سے یتیم کا مسلمانوں کے عام اموال میں بھی حق ہے اور اگر وہ فقیر ہو تو مالِ زکاۃ کا بھی مستحق ہے۔ بیت المال کے وظائف میں بھی یتیم کا حق ہے۔ جس طرح عام بچوں کو وظائف ملتے ہیں اسی طرح یتیم بھی ان کا مستحق ہے۔ اور اگر یتیم مالدار ہو تو نصاب پورا ہونے پر اس کے مال میں سے بھی زکاۃ وصول کی جائے گی۔ زکاۃ وصول کرنے والے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس کے مال سے عدل وانصاف سے زکاۃ وصول کرے۔ اس پر ظلم نہ کرے۔[3]

امت کے طرزِ زندگی پر آرام وآسایش کا اثر:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے امت کو راحت وآسایش ملنے کے بعد بھٹکتے ہوئے شُتر بے مہار کی طرح نہیں چھوڑا بلکہ انھیں دنیا کی لذتوں اور مال ومتاع کے خطرات سے آگاہ کیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بھانپ لیا کہ مال و دولت کی فراوانی اہلِ ثروت کو صحیح طرزِ زندگی سے بیگانہ کر دیتی ہے اور ان کا بے جا اور فضول

---

[1] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٠٥٢)

[2] السياسة المالية لعثمان بن عفان رضي الله عنه لقطب إبراهيم محمد (ص: ٦٧)

[3] السياسة المالية لعثمان بن عفان رضي الله عنه لقطب إبراهيم (ص: ٦٨)

کاموں میں خرچ کرنا عوام الناس کے بگاڑ کا سبب بنتا ہے۔[1]

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَإِذَآ أَرَدْنَآ أَن نُّهْلِكَ قَرْيَةً أَمَرْنَا مُتْرَفِيهَا فَفَسَقُوا۟ فِيهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا ٱلْقَوْلُ فَدَمَّرْنَٰهَا تَدْمِيرًا ﴾ [بني إسرائيل: ١٦]

''اور جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں تو اس کے متکبر امراء کو حکم دیتے ہیں، پھر وہ اس میں نافرمانی کرنے لگتے ہیں، چنانچہ اس بستی پر (عذاب کی) بات ثابت ہو جاتی ہے، تب ہم اسے مکمل طور پر تباہ کر ڈالتے ہیں۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی پالیسیوں کا موازنہ:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جس مالی پالیسی کا اعلان کیا وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی دولت کی اُسی پالیسی سے مطابقت رکھتی تھی جس کا اجراء حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خلافت سنبھالتے ہی کیا تھا۔ آپ نے درجِ ذیل پالیسی کے نفاذ کا اعلان کیا اور فرمایا کہ دولتِ عامہ (بیت المال) کے نظام کی اصلاح کے لیے تین باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے:

1. حق کے ساتھ مال وصول کیا جائے۔
2. حق کی راہ میں خرچ کیا جائے۔
3. باطل میں استعمال نہ کیا جائے۔[2]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مالی پالیسی کا سرچشمہ ایک ہی ہے اور وہ ہے اسلام اور اس کے اصول وقواعد۔[3]

زکاۃ کی رقم سے مسافروں اور فقراء کے لیے کھانے کا بندوبست:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک نیا طریقہ جاری کیا۔ آپ رمضان المبارک میں مسجد میں کھانے کا انتظام کرتے اور یہ اعلان فرماتے کہ مسجد میں عبادت کی نیت سے ٹھہرنے والے، مسافر اور فقراء یہیں سے کھانا کھائیں۔[4]

---

[1] السياسة المالية لعثمان بن عفان رضی اللہ عنہ لقطب إبراهيم محمد (ص: ٧٠)

[2] السياسة المالية لعمر بن الخطاب لقطب إبراهيم محمد (ص: ٢٣)

[3] السياسة المالية لعثمان بن عفان رضی اللہ عنہ لقطب إبراهيم محمد (ص: ٧٦)

[4] تاريخ الطبري (٥/ ٢٤٥)

اس طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بیت المال سے مسلمانوں کی عزت افزائی کا طریقہ جاری کیا۔ اس میں بھی رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی تھی کہ آپ رمضان المبارک میں بہت زیادہ سخاوت کیا کرتے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اس طرزِ عمل سے مسلمانوں میں اعتکاف کا رجحان بڑھ گیا کیونکہ انھیں کھانے کا مسئلہ درپیش نہیں ہوتا تھا۔ یوں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتِ اعتکاف کے احیا کی ترغیب خود بخود ملنے لگی۔[1]

بیت المال سے ہر غلام کے لیے وظیفہ:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک نیا طریقہ یہ جاری کیا کہ کوفہ میں ہر غلام کو باقی ماندہ مال میں سے ہر مہینے تین درہم وظیفہ دینے کا حکم دیا تاکہ وہ خوشحال رہیں۔ یہ وظیفہ ملنے کے باوجود غلاموں کے مالکان انھیں پوری تنخواہ دیتے تھے۔ کوئی کمی نہیں کرتے تھے۔[2]

مالِ غنیمت کا خُمس:

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ مبارک سے جہاد شروع ہوا۔ حضرت صدیق وفاروق رضی اللہ عنہما کے عہد میں بھی جاری رہا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد میں بھی جہاد بدستور جاری تھا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام پھیل رہا تھا اور مملکتِ اسلامیہ کی سرحدیں وسیع ہو رہی تھیں۔ خود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ حکومت کی فتوحات کا دائرہ نہایت وسیع ہو گیا تھا، اس لیے بہت سا مالِ غنیمت بصورتِ خُمس بیت المال میں آ رہا تھا۔ ذِمیوں سے جزیے کی آمدنی بھی بیت المال میں ہی جمع ہوتی تھی۔ گویا بیت المال اور اسلامی فتوحات کا باہمدگر بڑا گہرا تعلق تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں فتوحات بڑھانے کے لیے بیت المال سے فوجیوں کی تنخواہیں ادا کی جاتی تھیں اور جنگی سامان واسلحہ وغیرہ خریدا جاتا تھا۔ جب فتح ہو جاتی تو مفتوحہ علاقے میں رہنے والے کافر اگر اسلام قبول نہ کرتے تو ان سے جزیہ (ٹیکس) وصول کیا جاتا تھا۔ کسی مفتوحہ علاقے کے لوگ اسلام لے آتے تو پھر وہ زکاۃ ادا کرتے تھے جو ایک مسلمان کے لیے فرض اور دین کا رکن ہے۔ یہ سارے دولتِ عامہ کے ذرائع تھے۔

عہدِ عثمان رضی اللہ عنہ میں جزیے کی عام تفصیلات:

جزیے کے قواعد وضوابط اور اسے اکٹھا کرنے کا طریقِ کار حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے ہی دور

[1] السياسة المالية لعثمان بن عفان رضي الله عنه لقطب ابراهيم محمد (ص: ٨٢ - ٨٣)

[2] تاريخ الطبري (٥/ ٢٧٥)

میں طے پا گیا تھا، اس لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں بیت المال کی صرف یہ ذمہ داری تھی کہ وہ جزیے کی رقم طے ہونے کے بعد جمع شدہ رقم وصول کرے اور مملکت کی یہ ذمہ داری تھی کہ جن کی صلح کا معاہدہ پورا ہو چکا ہے، ان کے پرانے عہد نامے ہی کو برقرار رکھے یا صلح کی نئی شرائط طے کرے اور جنھوں نے جزیہ دیا ہے، اُن کے حقوق ادا کرے۔[1]

بیت المال کو وصول ہونے والے جزیے کے چند نمونے:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں کوفہ کے گورنر حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ نے آذر بائیجان فتح کیا تو وہاں کے باشندوں نے آٹھ لاکھ درہم جزیہ ادا کرنے پر مصالحت کر لی۔ دراصل ان لوگوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وفات کے وقت جزیہ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ نے دوبارہ فوج کشی کر کے انھیں پسپا کر دیا اور جزیہ وصول کیا۔[2]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جب حضرت عبد اللہ بن سعد بن ابی سرح رضی اللہ عنہ کو افریقہ پر فوج کشی کا حکم دیا تو افریقہ کے ایک کمانڈر ''جرجیر'' نے تقریباً پچیس لاکھ بیس ہزار دینار جزیے کے عوض مصالحت کر لی۔ یہ رقم درحقیقت تین سو قنطار سونے کا مالیت تھی۔ (جبکہ ایک قنطار تقریباً ۱۶۶ کلوگرام کے برابر ہوتا ہے)۔[3]

اہلِ قبرص نے سات ہزار دینار سالانہ ادا کرنے کے عوض صلح کی تھی جو وہ مسلمانوں کو ادا کرتے تھے۔ حضرت سعید بن عاص رضی اللہ عنہ نے اہلِ جُرجان سے مصالحت کی۔ وہ لوگ کبھی ایک لاکھ، کبھی دو لاکھ اور کبھی تین لاکھ درہم جزیہ ادا کیا کرتے تھے۔[4]

حضرت عبد اللہ بن عامر رضی اللہ عنہ نیشا پور کو فتح کرتے ہوئے سرخس تک جا پہنچے تو اہلِ مَرو نے ان سے مصالحت کرنی چاہی۔ حضرت عبد اللہ بن عامر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابن حاتم رضی اللہ عنہ باہلی کو بھیجا تو انھوں نے مَرو کے حاکم سے بیس لاکھ درہم اور ایک روایت کے مطابق ساٹھ ہزار درہم ادا کرنے کی یقین دہانی پر صلح کی۔[5]

[1] السياسة المالية لعثمان بن عفان رضي الله عنه لقطب إبراهيم محمد (ص: ١٠٣)
[2] تاريخ الطبري (٥/ ٢٤٦)
[3] تاريخ الطبري (٥/ ٢٥٥)
[4] تاريخ الطبري (٥/ ٢٦١)
[5] تاريخ الطبري (٥/ ٣١٨)

حضرت احنف بن قیس رحمہ اللہ نے بلخ پر فوج کشی کر کے اس کا محاصرہ کر لیا۔ اہلِ بلخ نے چار لاکھ درہم سالانہ جزیہ ادا کرنے پر مصالحت کر لی۔ آپ نے اسے قبول کیا اور اپنے چچا زاد بھائی اسید بن متشمّس رحمہ اللہ کو رقم کی وصولی پر مامور کیا۔[1]

خلاصۂ کلام:

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے عہد کی پاسداری کی۔ اور یہ روزِ اول ہی سے عموماً اہلِ اسلام کی خوبی رہی ہے کہ جس نے کوئی معاہدہ یا کوئی معاملہ کیا اسے بہرحال پورا کیا ہے۔

اہلِ کتاب جب تک جزیہ ادا کرتے رہیں گے مسلمانوں کی امان میں رہیں گے:

اسکندریہ کی فتح کے دوران حضرت عَمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے دورانِ جنگ عہد شکنی کرنے والوں کے مال واسباب پر قبضہ کر لیا۔ جنگ ختم ہونے کے بعد وہ لوگ آئے۔ انھوں نے کہا: ''ہم نے عہد شکنی نہیں کی تھی۔ رومی چور ہمارے پاس سے گزرے۔ انھوں نے لوٹ مار کی۔ ہمارا سامان اور جانور ہانک کر لے گئے۔ اب وہ سب کچھ آپ کے قبضے میں ہے۔'' حضرت عَمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے انھیں دلیل پیش کرنے کا حکم دیا۔ انھوں نے دلیل پیش کر دی تو آپ نے ان کے مال واپس کر دیے۔

آپ اس سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جزیے کے بدلے میں مسلمان ذِمیوں کے حقوق کا کس قدر خیال رکھتے تھے، باوجود اس کے کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر ملک کا دفاع بھی نہیں کرتے تھے۔ وہ صرف اپنے ہی حقوق کے لیے جزیہ دیتے ہیں اور اس کے بدلے میں مسلمان ان کی مکمل حفاظت کرتے تھے۔ حضرت عَمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے ان کے حقوق بھی ادا کیے اور ان کا مال بھی انھیں واپس کر دیا۔[2]

خَراج اور ٹیکس کی عام تفصیلات

خَراج:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں فتوحات کا دائرہ نہایت وسیع ہو گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مفتوحہ

[1] تاريخ الطبري (٥/ ٣٠٧)

[2] السياسة المالية لعثمان بن عفان رضي الله عنه لقطب ابراهيم محمد (ص: ١٠٦)

علاقوں کی بہت سی زرعی زمین مملکتِ اسلامیہ کے زیرِ استعمال آ گئی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس زمین کو مسلمانوں کے لیے مالِ فَے قرار دیا تھا۔ لیکن اہلِ کتاب میں سے جو اپنے دین پر قائم رہے ان کی زمین انہی کے پاس رہنے دی۔ وہ کاشت کاری کرتے تھے اور بیت المال کو خَراج بھیجتے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں فتوحات کا دائرہ مزید وسیع ہونے کے ساتھ ساتھ خَراج کی صورت میں وصول ہونے والی رقم بیت المال کے ذرائع میں مزید اضافے کا باعث بنی۔[1]

جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ مقرر ہوئے تو انھوں نے وسیع پیمانے پر لوگوں کو زمینیں الاٹ کیں۔ بالخصوص مفتوحہ علاقوں کی وہ زمینیں جنھیں ان کے مالک چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ بے آباد ہو جانے کے ڈر سے آپ نے مفروروں کی زمینیں لوگوں میں تقسیم کر دیں جس سے مملکتِ اسلامیہ کو بہت فائدہ پہنچا۔[2]

امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ہموار زمین کے علاوہ پتھریلی زمینیں بھی تقسیم کی تھیں۔ ظاہر ہے مفتوحہ اراضی میں جہاں ہموار زمینیں تھیں وہیں پتھریلی زمینیں بھی ہوں گی۔ بہر حال زمینوں کی الاٹمنٹ سے قومی خزانے میں زکاۃ اور خَراج کی صورت میں بے پناہ اضافہ ہوا جس کا محتاط اندازہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں نو لاکھ درہم سالانہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں پانچ کروڑ درہم سالانہ تھا۔ اتنی بڑی رقم سے زمینوں کی تقسیم کی پالیسی کی افادیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

کتبِ سیرت و تاریخ میں ان لوگوں کے نام ملتے ہیں جنھیں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے زمینیں الاٹ کی تھیں، ایسے لوگوں کی اکثریت قریش کے علاوہ ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی زمینوں کی تقسیم کی پالیسی سے مسلمانوں کے بیت المال کی آمدنی میں زکاۃ اور خراج کی صورت میں زبردست اضافہ ہوا۔

سرکاری چراگاہوں کی پالیسی:

اس سے مراد وہ زمینیں ہیں جو سرکاری اونٹ اور گھوڑوں کے چَرنے کے لیے مخصوص تھیں۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وادی نَقیع کو بطورِ سرکاری چراگاہ خاص کر دیا تھا۔[1] اور وہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے زمانے میں بھی بدستور چراگاہ کے طور پر ہی زیرِ استعمال رہی۔ اس چراگاہ کی لمبائی تقریباً اسی (۸۰) کلومیٹر

[1] السياسة المالية لعثمان بن عفان رضي الله عنه لقطب إبراهيم محمد (ص: ۱۱۳)

[2] عصر الخلافة الراشدة للعمري (ص: ۲۲۳)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (۲۳۷۰) سنن أبي داود، رقم الحديث (۳۰۸۳ ـ ۳۰۸٤)

تھی۔ یہ مدینہ سے چالیس کلو میٹر جنوب میں تھی۔[1]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں جہاد کے لیے تیار کردہ گھوڑوں اور اونٹوں کی کثرت کی وجہ سے چراگاہوں میں اضافہ ہوا، آپ نے زکاۃ کے اونٹوں کے لیے ربذہ کی چراگاہ مخصوص کی۔[2]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بھی چراگاہوں کے معاملے میں اپنے پیش رَووں کے نقشِ قدم پر چلے۔ جب ان کے دورِ خلافت میں فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا تو انھوں نے صدقے کے جانوروں کی حفاظت کے لیے کئی چراگاہیں مخصوص کر دیں۔ رعایا کی بڑھتی ہوئی تعداد کی مناسبت سے ضرورتوں میں بھی اضافہ ہوا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے چراگاہوں میں اضافہ کر دیا۔[3]

عام اخراجات کی اقسام

خلیفہ کے اخراجات:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بیت المال سے کچھ نہیں لیتے تھے۔ آپ قریش میں سب سے زیادہ مالدار اور کامیاب ترین تاجر تھے۔ گھر والوں اور اپنے اعزہ واقارب پر اپنا ذاتی مال خرچ کرتے تھے۔

بیت المال سے گورنروں کی تنخواہیں:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں مملکتِ اسلامیہ کئی صوبوں میں منقسم تھی۔ خلیفہ کی طرف سے ہر صوبے پر ایک گورنر مقرر ہوتا تھا اور اس کی تنخواہ بیت المال سے ادا کی جاتی تھی۔ ہر گورنر صوبے کے انتظامات قرآن وسنت کے احکامات کے مطابق چلاتا تھا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دَور میں عطیات کا نظام:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں عطیات کا فاروقی نظام ہی جاری رہا اور آپ نے بھی عطیات دینے کے لیے مسابقتِ اسلام کو بنیاد بنایا۔

معاشرتی اور اقتصادی زندگی پر مال و دولت کی فراوانی کا اثر:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں خَراج میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ ہر طرف سے مال آنے لگا۔

[1] عصر الخلافة الراشدة للعمري (ص: ٢٢٥ـ ٢٢٦)

[2] الطبقات لابن سعد (٣/ ٣٢٦)

[3] نظام الخلافة في الفكر الإسلامي للدكتور مصطفى حلمي (ص: ٧٨)

آپ نے اس کے لیے سٹور بنوائے اور اسے محفوظ کر لیا۔ اس صورتحال کا معاشرتی اور اقتصادی زندگی پر بڑا اچھا اثر پڑا۔ ابواسحاق رحمہ اللہ کا بیان ہے کہ جن کے دادا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس سے گزرے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے پوچھا: ''بزرگوار! آپ کے اہل وعیال کتنے افراد پر مشتمل ہیں؟'' انھوں نے تعداد بتائی۔ آپ نے فرمایا: ''ہم نے آپ کا پندرہ سو اور آپ کے گھرانے کے ہر فرد کا سو سو درہم وظیفہ مقرر کر دیا ہے۔''[1]

محمد بن بلال مدنی رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ مجھے میرے والد نے میری دادی کے بارے میں بتایا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر جایا کرتی تھی۔ کچھ دن نہ گئیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنی اہلیہ سے پوچھا کہ آج کل فلاں خاتون نظر نہیں آتی۔ اُن کی بیوی نے بتایا کہ اس کے ہاں گزشتہ روز بچہ پیدا ہوا ہے۔ دادی کہتی ہیں کہ امیر المؤمنین نے مجھے پچاس درہم اور خوشبودار کپڑے کا ایک ٹکڑا بھیجا اور فرمایا: ''یہ تیرے بیٹے کا وظیفہ اور لباس ہے۔ ایک سال بعد اس کا وظیفہ سو درہم کر دیں گے۔''[2] آپ نے مدینہ کے گردونواح رہنے والوں کے لباس اور خوراک کے عطیے میں اضافہ کر دیا تھا۔[3]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں زراعت، صنعت اور تجارت کے میدان میں بھی بڑی ترقی ہوئی۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتوحات عطا کیں جن کے نتیجے میں عام مسلمان اور بالخصوص اہلِ مدینہ نہایت خوشحال ہو گئے۔ مال و دولت کی کثرت کے ساتھ ساتھ بکثرت فتوحات کے بعد کئی تہذیبوں سے واسطہ پڑا جن سے وہ اس سے قبل ناواقف تھے۔ وہ ان تہذیبوں سے متاثر ہوئے اور ان کی کئی چیزوں کو اپنانے کی کوشش کی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت میں یہ رجحان قدرے بڑھ گیا۔ بعض صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے عظیم الشان اور کشادہ گھر بنا لیے۔ معاشرتی اور اقتصادی ترقی میں وہ لوگ بھی شریک تھے جو جنگوں کے دوران گرفتار ہو کر آئے تھے۔[4]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عزیز واقارب اور بیت المال سے نوازشات کی حقیقت:

باغیوں اور خارجیوں کی طرف سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر الزام لگایا گیا کہ وہ بیت المال میں بے جا اسراف کرتے ہیں اور اپنے عزیز واقارب کو نوازتے ہیں۔ باطل پرست بلوائیوں نے اسی الزام کو بنیاد بنا

[1] الإدارة العسكرية في الدولة الإسلامية للدكتور سلمان العوده (٢/ ٧٦٨)
[2] الإدارة العسكرية في الدولة الإسلامية للدكتور سلمان العوده (٢/ ٧٦٩)
[3] الطبقات لابن سعد (٣/ ٢٩٨)
[4] الحضارة العربية الإسلامية للدكتور واضح عبدالصمد (ص: ١١٤)

کر آپ پر حملہ کیا۔ ان بلوائیوں کی پُشت پناہی آپ کے مخالف سبائی، شیعہ اور روافض کر رہے تھے۔ کتبِ تاریخ میں ان باطل امور کو حقائق بنا کر پیش کیا گیا جنھیں بعض مفکّرین اور مؤرخین نے درست ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، حالانکہ یہ سب کچھ شیطانی سازش کے سوا کچھ نہیں۔ آپ کا اپنے عزیز واقارب کو جو کچھ دینا ثابت ہے اس کا شمار آپ کے فضائل میں ہوتا ہے۔ یہ کوئی عیب نہیں ہے۔

❁ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بڑے مالدار اور صلہ رحمی کرنے والے انسان تھے۔[1]

آپ ہر ممکن طریقے سے اپنے عزیز واقارب کے ساتھ صلہ رحمی فرماتے۔ بدقماش قسم کے لوگ آپ سے حسد کرتے اور کہتے کہ بیت المال سے اپنے عزیزوں کو نوازتے ہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس کا جواب دیتے ہوئے فرمایا:

> ”لوگ کہتے ہیں کہ میں اپنے خاندان سے محبت کرتا ہوں اور انھیں عطیات دیتا ہوں۔ سن لو! جہاں تک محبت کا تعلق ہے تو میں یہ کام کر کے کسی ظلم کا ارتکاب نہیں کرتا بلکہ میں اُن پر ذمہ داریاں بھی ڈالتا ہوں۔ جہاں تک عطیات ہیں تو وہ میں اپنے ذاتی مال سے دیتا ہوں۔ مسلمانوں کا مال نہ میں اپنے لیے حلال سمجھتا ہوں اور نہ کسی اور کے لیے بلکہ میں تو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے دَور سے اپنے ہی ذاتی مال سے رعایا پر خرچ کرتا چلا آرہا ہوں، حالانکہ اس وقت مجھے مال کی زیادہ طلب تھی۔ اب جبکہ میرے گھر والے بھی عمر گزار چکے، میں بھی بوڑھا اور مال سے بے رغبت بھی ہو چکا ہوں تو ملحد تہمت لگاتے ہیں کہ میں مسلمانوں کے مال میں خیانت کرتا ہوں۔“

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنا مال بنوامیہ میں تقسیم کر دیا تھا اور اپنی اولاد کو بھی عام لوگوں کے برابر حصہ دیا تھا۔ آپ کے اسراف اور رشتہ داروں کو نوازنے کے واقعات الزامات کے سوا کچھ نہیں۔ یہ محض جھوٹی حکایات کا پلندہ ہیں۔ آپ کی براءت کے باوجود بعض علماء کا موقف یہ بھی ہے کہ خُمس سے رشتہ داروں کے حق سے مراد خلیفہ کے رشتہ داروں کا حق ہے۔[2]

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

---

[1] تاريخ الطبري (٥/ ٣٠٥٦)

[2] فصل الخطاب في مواقف الأصحاب لمحمد صالح الغرسي (ص: ٨٣)

''بعض فقہاء، جیسے حضرت حسن بصری اور ابو ثور وغیرہ رحمہ اللہ کا موقف یہ بھی ہے کہ خُمس میں ذوی القربیٰ کے حصے سے مراد خلیفہ اور امام کے قرابت داروں کا حصہ ہے اور نبی کریم ﷺ جو اپنے رشتہ داروں کو دیتے تھے، وہ بحیثیت سربراہ دیتے تھے، لہٰذا ''ذوی القربیٰ'' والا حصہ رسولِ اکرم ﷺ کی زندگی میں آپ ﷺ کے اقرباء کے لیے تھا اور آپ کی وفات کے بعد جو بھی مسلمانوں کا خلیفہ ہے، یہ حصہ اس کے لیے خاص ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خلیفہ کی نصرت و تائید کرنا نہایت ضروری ہے اور جو دفاع اور مدد رشتے دار کرتے ہیں وہ عام لوگ نہیں کرتے۔ مختصر طور پر کہا جاسکتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بعد جو بھی مسلمانوں کا والی بنا ہے وہ اپنے بعض اقارب کو ولایت یا مال کے معاملے میں خاص درجہ دیتا تھا۔''[1]

اس میں شک نہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اپنے عزیز و اقارب سے بڑی محبت تھی لیکن اتنی بھی نہیں کہ ان کی خاطر آپ کسی ملّی بد دیانتی یا حرام کا ارتکاب کرتے۔ ایسا کرنے سے تو ایک عام مسلمان بھی بچتا ہے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جیسے محبوب صحابیِ رسول ﷺ کے بارے میں تو ایسا سوچا بھی نہیں جاسکتا۔ درحقیقت یہ آپ کے مخالفین سبائیوں، شیعوں اور رافضیوں کی من گھڑت کہانیاں ہیں، جو کتبِ تاریخ میں نہایت ہوشیاری سے سمودی گئیں۔ رشتہ داروں کے ساتھ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا حسنِ سلوک بجائے خود اسلام کے نہایت خوبصورت پہلو کی عکاسی کرتا ہے اور اللہ کے اس فرمان کا مصداق ہے:

﴿ذٰلِكَ الَّذِيْ يُبَشِّرُ اللّٰهُ عِبَادَهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۗ قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ۗ وَمَنْ يَّقْتَرِفْ حَسَنَةً نَّزِدْ لَهٗ فِيْهَا حُسْنًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ﴾ [الشوریٰ: ۲۳]

''یہی (فضل) ہے جس کی اللہ اپنے اُن بندوں کو بشارت دیتا ہے جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے۔ (اے نبی!) آپ کہہ دیجیے: میں تم سے اس (تبلیغِ رسالت) پر کسی صلے کا سوال نہیں کرتا، مگر قرابت داری کی محبت (ضرور چاہتا ہوں۔) اور جو شخص کوئی نیکی کماتا ہے تو ہم اس کے لیے اس میں بھلائی بڑھا دیتے ہیں۔ بے شک اللہ بہت بخشنے والا، نہایت قدر دان ہے۔''

نیز ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

---

[1] منہاج السنة لابن تیمیة (۳/ ۱۸۷۔ ۱۸۸)

﴿ وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ﴾

[بني إسرائيل: ٢٦]

''اور قرابت دار کو اس کا حق دے اور مسکین اور مسافر کو بھی، اور فضول خرچی سے مال نہ اڑا۔''

اِسی طرح یہ بات رسول اللہ ﷺ کی عملی زندگی کا ایک پہلو بھی نمایاں کرتی ہے کیونکہ آپ رسولِ اکرم ﷺ کی زیارت سے شرف یاب ہوئے اور تنقید کرنے والوں سے کئی گنا بڑھ کر آپ رسول اللہ ﷺ کی سیرت سے واقف تھے اور اکثر لوگوں سے کہیں زیادہ دین کی سوجھ بوجھ رکھتے تھے۔ آپ نے رسولِ اکرم ﷺ کو رشتہ داروں سے محبت اور حسنِ سلوک کرتے دیکھا جو ان کے لیے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ نبی اکرم ﷺ کے پاس جب بحرین سے مال آیا تو آپ ﷺ نے اپنے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو سب سے زیادہ مال مرحمت فرمایا تھا۔[1]

آپ ﷺ نے اپنے چچا زاد اور داماد حضرت علی رضی اللہ عنہ سے شدید محبت کا اظہار کرتے ہوئے انھیں اپنی طرح مومنوں کا مولیٰ قرار دیا، لہٰذا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور تمام مسلمانوں کے لیے رسولِ اکرم ﷺ کی سیرت بہترین نمونہ ہے۔[2]

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر اقرباء پروری کا الزام لگانے والوں کا رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''لوگوں کا یہ کہنا کہ ''حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بیت المال سے اپنے رشتہ داروں کو نوازتے تھے حتیٰ کہ آپ نے اپنے چار قریشی دامادوں کو چار لاکھ دینار دیے تھے اور مروان بن حکم کو دس لاکھ یا کئی ملین دینار دیے تھے'' بالکل بے بنیاد ہے۔ یہ بات کسی بھی صحیح روایت سے ثابت نہیں۔

قصاص، حدود اور تعزیرات کے سلسلے میں اجتہادات

قتل کا فیصلہ:

خلافت کا بوجھ اٹھاتے ہی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے سامنے سب سے پہلے قتل کا مقدمہ پیش ہوا۔ یہ حضرت عبید اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا مقدمہ تھا۔ انھوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر قاتلانہ حملہ کرنے والے ابولؤلؤ فیروز کی بیٹی کو قتل کر دیا تھا، اِسی طرح ایک جفینہ نامی نصرانی کو تلوار کے وار سے موت کے گھاٹ اتار دیا اور تستر

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣١٦٥)

[2] البداية والنهاية (٧/ ٢٠١)

کے حاکم ہُرمزان کو بھی قتل کر دیا۔ ان دونوں کو قتل کرنے کی وجہ یہ تھی کہ صحابہ رضی اللہ عنہم میں مشہور ہو گیا کہ ان دونوں نے ابولؤلؤ کو اس پر اکسایا تھا کہ وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو شہید کر دے۔[1]

حضرت عبد الرحمٰن بن ابوبکر رضی اللہ عنہما کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ابولؤ لؤ اور یہ دونوں سرگوشی کر رہے تھے۔ حضرت عبد الرحمٰن بن ابوبکر رضی اللہ عنہما کے اچانک وہاں آجانے سے ان کے ہاتھ سے خنجر گر گیا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد جب خنجر دیکھا گیا تو یہ وہی تھا جس کے متعلق ان دونوں حضرات نے بتایا تھا کہ وہ خنجر اس طرح کا ہے۔[2]

مذکورہ بالا بحث سے معلوم ہوا کہ ہُرمزان اور جفینہ واقعی قتل کے مستحق تھے اور ابولؤلؤ کی بیٹی اس شبہ میں قتل کی گئی کہ وہ بھی اس سازش میں شریک تھی کیونکہ وہ اپنے باپ کا اسلحہ چھپا کر رکھتی تھی۔ قتلِ شبہ میں قصاص نہیں، بلکہ دیت ہے۔ لہٰذا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا حضرت عبید اللہ رضی اللہ عنہ کو معاف کرنا اور اپنی طرف سے دیت ادا کرنا بالکل برحق تھا۔[3]

تاجر کے قتل کا فیصلہ:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں ایک آدمی نے ایک تاجر کو اس کے مال کی خاطر قتل کر دیا۔ آپ نے اسے بطورِ قصاص قتل کرایا۔[4]

جادوگر کو سزا:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں ام المؤمنین سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا کی ایک لونڈی نے سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا پر جادو کر دیا۔ اس نے اس اقدام کا اعتراف بھی کیا۔ سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا نے حضرت عبدالرحمٰن بن زید رضی اللہ عنہما کو حکم دیا کہ اسے قتل کر دو۔ انھوں نے اسے قتل کر دیا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اس معاملے کا علم ہوا تو اس پر ناگواری کا اظہار فرمایا۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''آپ ام المؤمنین پر ایسی عورت کو قتل کرانے پر جس نے جادو کر کے اعتراف بھی کیا، ناگواری کا

[1] البداية و النهاية (٧/ ١٥٤) والله أعلم.
[2] الطبقات لابن سعد (٣/ ٣٥٠ ـ ٣٥٥)
[3] الخلافة و الخلفاء الراشدون للمستشار البهنساوي (ص: ٢١٨ـ ٢١٩)
[4] عصر الخلافة الراشدة للعمرى (ص: ١٥٣)

اظہار کیوں کرتے ہیں؟'' حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خاموش ہو گئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ نے جادوگر کی سزا کو قانونی طور پر جائز سمجھا اور سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا پر صرف اس لیے اعتراض کیا کہ حدود قائم کرنا خلیفہ کا حق ہے، ام المومنین کو یہ حق استعمال نہیں کرنا چاہیے تھا، لازم تھا کہ خلیفہ کو مطلع فرماتیں، پھر وہ اسے قتل کراتے۔[1]

میں نے قتل کیا ہے، کیا میری توبہ ہے؟

ایک شخص نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے پوچھا: امیر المومنین! میں نے قتل کیا ہے۔ کیا میرے لیے توبہ کی کوئی صورت ہے؟ یہ سن کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے سورۃ المؤمن کی ابتدائی آیات پڑھیں:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿حٰمٓ ۝ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ۝ غَافِرِ الذَّنْبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ شَدِيْدِ الْعِقَابِ ذِي الطَّوْلِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ﴾ [المؤمن:۱۔۳]

''شروع اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بہت مہربان ہے رحم والا۔ حٰم، اس کتاب کا نزول اللہ کی طرف سے ہے جو نہایت غالب، خوب جاننے والا ہے، گناہ بخشنے والا اور توبہ قبول کرنے والا ہے، سخت سزا (دینے) والا، بڑا فضل والا ہے، اس کے سوا کوئی سچا معبود نہیں، اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔''

پھر فرمایا: ''عمل کرو اور ناامید نہ ہو۔''[2] قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ حقوق العباد سے متعلقہ گناہوں پر توبہ کے لیے ضروری ہے کہ حقوق العباد ادا کیے جائیں یا معاف کرا لیے جائیں۔[3]

حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے جنازے پر کنٹرول:

حضرت عبدالرحمٰن بن یزید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کا جنازہ، جنازہ گاہ میں لایا گیا تو لوگوں کی اس قدر کثرت تھی کہ جگہ تنگ پڑ گئی۔ بادلِ نخواستہ جنازہ بقیع میں رکھنا پڑا۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے جنازے میں جس قدر لوگوں کی بھیڑ تھی میں نے اتنی تعداد کسی اور جنازے میں کبھی نہیں دیکھی۔ جنازے کے قریب جانا بھی ممکن نہ تھا۔

---

[1] موسوعة فقه عثمان بن عفان رضي الله عنه للدكتور قلعجي (ص: ١٦٩۔ ١٧٠)

[2] السنن الكبرىٰ للبيهقي (٨/ ١٧)

[3] موسوعة فقه عثمان بن عفان رضي الله عنه للدكتور قلعجي (ص: ٩٣)

بنو ہاشم جنازہ اٹھائے ہوئے تھے۔ جب وہ لحد کے قریب پہنچے تو لوگوں کا اس قدر زبردست ہجوم ہو گیا کہ وہ بے بس ہو گئے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے الگ ہو کر رضا کاروں کو بھیجا۔ انھوں نے لوگوں کو پیچھے ہٹایا یہاں تک کہ صرف بنو ہاشم رہ گئے، پھر انھوں نے جنازے کو قبر میں اتارا اور دفن کیا۔[1]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت بھی پولیس کی خاصی تعداد موجود تھی۔ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہی وہ پہلے خلیفہ ہیں جنھوں نے سب سے پہلے پولیس کا شعبہ قائم کیا۔ آپ نے مدینہ منورہ میں پولیس کا شعبہ جلیل القدر صحابی مہاجر بن قُنفذ بن عُمیر قُرشی رضی اللہ عنہ کے سپرد کیا۔[2]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے پولیس کا خوب اہتمام کیا اور آپ کے عہدِ خلافت میں اس شعبے کو بڑی شہرت ملی۔ اِسی طرح کوفہ میں حضرت سعید بن عاص رضی اللہ عنہ کے ماتحت پولیس کے آفیسر حضرت عبد الرحمٰن اسدی رضی اللہ عنہ تھے۔ شام میں حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما کی زیرِ نگرانی پولیس کے آفیسر حضرت نصیر بن عبد الرحمٰن رضی اللہ عنہ تھے۔

حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے بعد سوائے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اور کوئی خلیفہ نہیں گزرا جو ہر قریبی اور دور والے، فقیر اور مالدار، خاندانی اور غیر خاندانی ہر کس و ناکس مجرم پر بلا امتیاز حد نافذ کرتا ہو اور سب کے حقوق ادا کرتا ہو۔ آپ کے فخر کے لیے اتنی بات ہی بہت کافی ہے کہ آپ کا دَور، خلافتِ راشدہ میں شمار ہوتا ہے۔[3]

جمعہ کی دوسری اذان کا اضافہ:

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

«عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَ سُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ مِنْ بَعْدِيْ»[4]

''تم پر میری سنت اور میرے (بعد) خلفائے راشدین کے طریقے کی پیروی لازم ہے۔''

جمعۃ المبارک کے لیے دوسری اذان کا اضافہ خلفائے راشدین کی سنت میں سے ہے۔ حضرت

---

[1] تاريخ خليفة بن خياط (ص: ١٧٩)

[2] ولاية الشرطة في الإسلام للدكتور نمر الحميداني (ص: ١٠٥، ١٠٦)

[3] تحقيق مواقف الصحابة في الفتنه للدكتور محمد المحزون (١/ ٤٠٩)

[4] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٦٠٧) جامع الترمذي، رقم الحديث (٢٦٧٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٢) مسند أحمد (١٧١٤٤) صحيح الترغيب والترهيب: ٣٧)

عثمان رضی اللہ عنہ یقیناً خلفائے راشدین میں سے ہیں۔ انھوں نے مدینہ منورہ کی آبادی بڑھ جانے پر لوگوں کو نمازِ جمعہ کے وقت سے آگاہ کرنے کے لیے پہلی اذان کا اضافہ مناسب سمجھا۔ تاکہ لوگ جمعہ کے ثواب سے محروم نہ ہوں اور خطبہ شروع ہونے سے پہلے مسجد میں آجائیں۔ انھوں نے اجتہاد کیا کہ ایک اذان کا اضافہ کر دیا جائے۔ دیگر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ کی موافقت کی۔ یوں یہ طریقہ اُس وقت سے لے کر حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ، بنو امیہ اور بنو عباس کے دَور سے گزرتے ہوئے آج تک جاری ہے اور یہ بالاجماع سنت ہے۔[1]

عہدِ عثمانی کی فتوحات:

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر سن کر دشمنانِ اسلام دلیر ہو گئے۔ خصوصاً ایرانی اور رومی اپنے اپنے ملک واپس لینے کی سوچنے لگے۔ ایران کا بادشاہ یزدگرد سمرقند کے دار الحکومت ''فرغانہ'' کے بارے میں، جس میں وہ رہتا تھا۔ منصوبہ بندی کرنے لگا۔

روم کے رؤساء شام چھوڑ کر بازنطینی دار الحکومت قسطنطنیہ منتقل ہو گئے تھے۔ انھوں نے بھی عہدِ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ میں اپنے مقبوضہ علاقے واپس لینے کی منصوبہ بندی شروع کر دی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت ہی میں مصر میں رومیوں کے باقی ماندہ لشکر اسکندریہ میں قلعہ بند ہو گئے تھے۔ حضرت عَمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے اسے فتح کرنے کے لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اجازت طلب کی تھی۔ اسکندریہ بہت سے حفاظتی اقدامات کی بنا پر نہایت محفوظ جنگی مقام بن چکا تھا، یہاں قلعے کی فصیلوں پر منجنیقیں (توپیں) بھی نصب کی ہوئی تھیں۔ ہرقل روم نے بذاتِ خود جنگ میں شامل ہونے کا عزم کر رکھا تھا اور یہ طے تھا کہ کوئی رومی پیچھے نہیں رہے گا کیونکہ اسکندریہ ان کا آخری قلعہ اور پناہ گاہ تھی۔[2]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں رومی اسکندریہ میں اکٹھے ہونے لگے۔ انھوں نے اپنی سلطنت کو واپس لینے کی منصوبہ بندی شروع کر دی، حتیٰ کہ انھوں نے معاہدۂ صلح بھی ختم کر دیا اور روم کی بحری سپاہ سے بھی مدد طلب کی۔[3]

---

[1] حقبة من التاريخ لعثمان الخميس (ص: ٨٨)

[2] الخلافة والخلفاء الراشدون للمستشار البهنساوي (ص: ٢٢١)

[3] جولة تاريخية في عصر الخلفاء الراشدين للدكتور محمد السيد الوكيل (ص: ٣٢٤)

چنانچہ روم کی بحریہ نے جنگی ساز وسامان اور افرادی قوت سے لیس تین سو بحری جہاز روانہ کر دیے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس کا مقابلہ کرنے کے لیے نہایت سمجھ داری، ہمت اور منصوبہ بندی سے اہم اقدامات کیے، مثلاً:

- ایرانی اور رومی سرکشوں کو مطیع کرنے کے لیے دوبارہ اُن کے شہروں تک اسلامی سلطنت کی سرحدوں کو وسعت دی۔
- جہاد اور فتوحات کے سلسلے کو مفتوحہ علاقوں سے آگے تک جاری رکھنے کے احکام جاری کیے تاکہ اُن مفتوحہ علاقوں کو پیچھے سے پہنچے والی امداد کا سدِّ باب ہو۔
- بلادِ اسلامیہ کے استحکام کے انتظامات کیے اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے رابطے میں رہنے کی سہولتیں مہیا کیں۔
- اسلامی فوج کی ضرورت کے پیشِ نظر بحری عسکری قوت کا آغاز کیا۔[1]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں بڑے سرحدی شہر ہی فوجی چھاؤنیاں تھیں۔ عراق کی چھاؤنیاں کوفہ اور بصرہ تھیں۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پورے شام کے گورنر بنے تو دمشق میں مجاہدینِ اسلام کی بڑی فوجی چھاؤنی بنادی گئی۔ اسی طرح مصر بھی چھاؤنی کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کا مرکز فُسطاط تھا۔ مملکتِ اسلامیہ کی حفاظت، فتوحات میں وسعت اور اسلام کو پھیلانا اُن چھاؤنیوں کی اولین ذمہ داری تھی۔[2]

بلادِ مشرق میں فتوحات

آذربائیجان:

رَے اور آذربائیجان کے علاقے کے غزوات اہلِ کوفہ کے سپرد تھے۔ وہاں ہر وقت دس ہزار سپاہی الرٹ (سربکف) رہتے تھے۔ چھ ہزار سپاہی آذربائیجان میں اور چار ہزار رَے میں مقرر تھے۔ کوفہ کی کل باقاعدہ فوج چالیس ہزار تھی۔ ان میں سے ہر سال دس ہزار فوجی ڈیوٹی دیتے تھے۔ اس طرح ہر سپاہی چار سال کے بعد ایک سال کے لیے عسکری ڈیوٹی دیتا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے پورا کوفہ حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ

---

[1] الخلافة والخلفاء الراشدون للمستشار البهنساوي (ص: ٢٢٢)

[2] عثمان بن عفان رضي الله عنه لصادق عرجون (ص: ١٩٩۔ ٢٠٠)

کے زیرِ انتظام کر دیا تو آذر بائیجان کے باشندوں نے بغاوت کر دی۔ ان لوگوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کو جتنا خَراج دینا طے کیا تھا، اس کی ادائیگی سے نہ صرف انکار کیا بلکہ اپنے تحصیلدار حضرت عقبہ بن فرقد رضی اللہ عنہ پر حملہ بھی کر دیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت ولید رضی اللہ عنہ کو ان پر چڑھائی کا حکم دیا۔ جلد ہی آذر بائیجان کے باشندے پہلی شرائط پر صلح کے لیے تیار ہو گئے۔ اس کے بعد حضرت ولید رضی اللہ عنہ کوفہ واپس آ گئے۔

آذر بائیجان کے باشندے بڑے دغاباز تھے۔ انھوں نے کئی بار سرکشی کی۔ حضرت ولید رضی اللہ عنہ کی واپسی کے بعد وہ پھر باغی ہو گئے۔ اب آذر بائیجان کے والی حضرت اشعث بن قیس رضی اللہ عنہ نے حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ سے کمک طلب کی تو انھوں نے کوفہ سے ایک لشکر روانہ کیا۔ حضرت اشعث بن قیس رضی اللہ عنہ نے باغیوں کو شکست فاش دی۔ بالآخر وہ صلح کرنے پر مجبور ہو گئے۔ حضرت اشعت بن قیس رضی اللہ عنہ نے پہلی شرائط پر اُن سے صلح کر لی۔ حضرت اشعت بن قیس رضی اللہ عنہ کو خدشہ لاحق ہوا کہ کہیں یہ لوگ دوبارہ بغاوت نہ کر دیں۔ اِس خدشے کے پیشِ نظر انھوں نے اہلِ عرب کی ایک فوج محافظ دستے کے طور پر بھرتی کی۔ اُن کی باقاعدہ تنخواہ مقرر کی، اُن کے ناموں کا اندراج کیا اور انھیں حکم دیا کہ وہ لوگوں کو اسلام کی دعوت دیں۔

جب حضرت سعید بن عاص رضی اللہ عنہ آذر بائیجان کے گورنر مقرر کیے گئے تو وہاں کے باشندوں نے دوبارہ بغاوت کر دی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت جریر بن عبد اللہ بجلی رضی اللہ عنہ کو اُن پر چڑھائی کا حکم دیا۔ انھوں نے باغیوں کو شکست دے کر اُن کے رئیس کو قتل کر دیا۔ اس کے بعد حالات معمول پر رہے۔ بہت سے قبائل مسلمان ہو گئے اور انھوں نے قرآن کریم سیکھ لیا۔

جہاں تک ''رَے'' کا تعلق ہے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جب حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو کوفہ کا گورنر مقرر کیا تو انھیں حکم دیا کہ اہلِ رَے کی بغاوت کو کچلنے کے لیے فوج کشی کریں۔ انھوں نے حضرت قُریظہ بن کعب انصاری رضی اللہ عنہ کی قیادت میں ایک فوجی دستہ اہلِ رَے پر حملے کے لیے روانہ کیا۔ انھوں نے بغاوت کچل دی اور دوبارہ فتح کا جھنڈا لہرا دیا۔[1]

رومیوں کے حملوں کو ناکام بنانے کے لیے اہلِ کوفہ کا کردار:

حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ جب آذر بائیجان کی مہم سے واپس موصل پہنچے تو انھیں امیر المؤمنین

[1] الخلافة و الخلفاء الراشدون للمستشار البهنساوي (ص: ٢٢٤)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا یہ خط موصول ہوا:

''اما بعد! حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ نے خط کے ذریعے سے اطلاع دی ہے کہ رومی مسلمانوں پر فوج کشی کے لیے بہت بڑا لشکر جمع کر رہے ہیں۔ مناسب یہی ہے کہ میں کوفی بھائیوں کو اُن کی مدد کے لیے بھیجوں۔ پس جونہی میرا یہ خط جہاں بھی موصول ہو، آپ وہیں سے کسی جذبۂ ایمان سے سرشار، دلیر اور بااعتماد شخص کو آٹھ دس ہزار کا لشکر دے کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی مدد کے لیے بھیج دیں۔ والسلام۔''

یہ خط ملتے ہی حضرت ولید رضی اللہ عنہ نے لوگوں سے خطاب کیا۔ انھوں نے اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء کے بعد کہا:

''لوگو! اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اِس آزمایش میں کامیاب کیا ہے۔ بغاوت کرنے والی قوموں کو دوبارہ مطیع کر دیا ہے۔ علاوہ ازیں مزید شہر مسلمانوں کے زیرِ نگیں آگئے ہیں اور مسلمانوں کو غنیمتوں سے مالا مال کر کے بہت زیادہ اجر وثواب کے ساتھ صحیح و سالم واپس بھیجا ہے۔ اُن تمام احسانات کے لیے ہم پر رب العالمین کا بے حد شکر واجب ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ امیر المؤمنین نے حکم دیا ہے کہ میں آپ میں سے دس ہزار افراد کو اہلِ شام کی مدد کے لیے بھیجوں کیونکہ رومی اُن پر چڑھ دوڑے ہیں۔ اِس نقل وحرکت میں بڑا اجر اور بڑی فضیلت ہے۔ اللہ آپ پر رحم کرے! آپ حضرت سلمان بن ربیعہ باہلی رضی اللہ عنہ کی قیادت میں نکلنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔''

لوگوں نے تیاری شروع کر دی اور تیسرے ہی دن آٹھ ہزار کا لشکر کوفہ سے نکل پڑا۔ وہ شام پہنچے تو اہلِ شام رومیوں کے علاقے میں داخل ہو چکے تھے۔ شامی فوج کے کمانڈر حضرت حبیب بن مسلمہ بن خالد فہری رضی اللہ عنہ تھے اور کوفی فوج کی قیادت حضرت سلمان بن ربیعہ باہلی رضی اللہ عنہ کر رہے تھے، انھوں نے مل کر رومیوں پر شب خون مارے۔ اِس کے نتیجے میں بہت سے قیدی اور بے شمار مالِ غنیمت ہاتھ آیا اور بہت سے قلعے فتح ہوئے۔[1]

حضرت سعید بن عاص رضی اللہ عنہ کی طَبرستان پر فوج کشی:

۳۰ھ کو حضرت سعید بن عاص رضی اللہ عنہ کوفہ سے خراسان پر چڑھائی کے لیے نکلے، آپ کے ساتھ

[1] تاريخ الطبري (٥/ ٢٤٧)

حضرت حذیفہ بن یمان اور حضراتِ حسن و حسین رضی اللہ عنہم کے علاوہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دیگر صحابہ حضرت عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عَمر و بن عاص اور عبداللہ بن زبیر وغیرہ رضی اللہ عنہم بھی تھے۔ اُدھر بصرہ سے حضرت عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ بھی خراسان پر چڑھائی کے لیے جارہے تھے۔ وہ حضرت سعید رضی اللہ عنہ سے پہلے خراسان پہنچ گئے۔ انھوں نے ''ابرشہر'' میں پڑاؤڈالا۔ ''ابرشہر'' میں اُن کے پڑاؤ کی خبر حضرت سعید رضی اللہ عنہ کو ملی تو انھوں نے ''قومس'' میں قیام کیا۔ قومس والوں کے ساتھ معاہدۂ صلح تھا۔ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ نے ''نہاوند'' کی فتح کے بعد اُن سے معاہدہ کیا تھا۔ حضرت سعید رضی اللہ عنہ جُر جان کی طرف بڑھے۔ وہاں کے باشندوں نے دو لاکھ درہم جزیہ پر مصالحت کر لی۔

ایران کے بادشاہ یزدگرد کا خراسان کی طرف فرار:

حضرت عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ نے بصرہ واپس پہنچ کر ایران کا رُخ کیا اور اسے فتح کر لیا۔ یزدگرد ۳۰ھ کو جوز (ایک مقام کا نام ہے اور اسی کا دوسرا نام اردشیر خُرَّہ ہے) یعنی اردشیر خرہ سے بھاگ نکلا۔ حضرت ابن عامر رضی اللہ عنہ نے حضرت مجاشع بن مسعود سلمی رضی اللہ عنہ کو اس کا پیچھا کرنے کا حکم دیا۔ انھوں نے کرمان تک اس کا پیچھا کیا۔ بالآخر حضرت مجاشع رضی اللہ عنہ نے سیر جان میں پڑاؤ ڈالا اور یزدگرد خراسان بھاگ گیا۔[1]

شاہِ ایران یزدگرد کا قتل:

یزدگرد کے قتل کے بارے میں مؤرخین کے مابین اختلاف پایا جاتا ہے۔ ابن اسحاق کا بیان ہے کہ یزدگرد کرمان سے چند آدمیوں کے ساتھ مَرو کی طرف بھاگا، اس نے وہاں کے باشندوں سے مال کا مطالبہ کیا۔ اُن لوگوں نے انکار کر دیا لیکن انھیں اس سے خطرہ لاحق ہوا تو انھوں نے ترکوں کو اس خطرے سے آگاہ کیا۔ ترکوں نے آکر اس کے ساتھیوں کو قتل کر دیا۔ یزدگرد وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ اس نے نہرِ مرغاب کے کنارے ایک چکی بنانے والے کے پاس پناہ لی۔ اُس شخص نے اسے رات کو نیند کی حالت میں قتل کر دیا۔[2]

یزدگرد کے قتل کے بعد عیسائیوں کی اس سے ہمدردی:

یزدگرد کے قتل کی خبر اہواز کے ایلیاء نامی شخص کو ملی۔ وہ مَرو میں عیسائیوں کا مذہبی راہنما تھا۔ اس نے اپنے گرد ونواح کے عیسائیوں کو جمع کیا اور ان سے کہا: ''ایران کا بادشاہ قتل کر دیا گیا ہے۔ وہ شہریار بن کسریٰ

---

[1] تاریخ الطبري (۵/ ۲۸۸)

[2] تاریخ الطبري (۵/ ۲۹۵)

کا فرزند تھا۔ شہر یار شیریں کا فرزند تھا اور شریں عیسائی تھی۔ تم ملکہ شیریں کے اپنے ہم مذہبوں پر احسانات سے واقف ہو۔ یزدگرد میں عیسائیت کا اثر پایا جاتا تھا۔ اس کے جدِّ امجد کسریٰ کی سلطنت میں عیسائیوں کی بڑی قدرومنزلت تھی۔

اس سے پہلے بھی ایرانی بادشاہوں نے عیسائیوں کے لیے بھلائی کے بڑے کام کیے ہیں۔ انھوں نے عیسائیوں کے لیے گرجے اور عبادت خانے تعمیر کرائے اور عیسائیت کو فروغ دینے کے لیے بڑی خدمات انجام دیں، لہٰذا ہمیں بھی چاہیے کہ یزدگرد کے قتل پر سوگ منائیں کیونکہ اس کی دادی شیریں کے ہم پر بہت سے احسانات ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کے لیے مقبرہ تعمیر کروں اور اس کی لاش کو باعزت طور پر دفن کردوں۔'' عیسائیوں نے کہا: ''اے مطران! ہم آپ کے حکم کے تابع ہیں۔ ہم آپ کی رائے کی حمایت کرتے ہیں۔'' پھر مطران کے حکم پر مَرو میں پادریوں کے باغ میں ایک مقبرہ تعمیر کیا گیا۔ اس کے بعد مطران مَرو کے چند عیسائیوں کے ساتھ نہر پر گیا، یزدگرد کی لاش نہر سے نکال کر تابوت میں رکھی۔ اس کے ساتھی وہ تابوت مقبرے تک اٹھا لائے۔ وہاں اسے دفن کیا۔ پھر انھوں نے مقبرے کا دروازہ بند کردیا۔[1]

دربند اور بلنجر کی جنگ:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت سعید بن عاص رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ وہ حضرت سلمان بن ربیعہ باہلی رضی اللہ عنہ کو باب الابواب (دربند) کی جنگ کے لیے روانہ کریں اور حضرت عبدالرحمٰن بن ربیعہ باہلی رضی اللہ عنہ کو، جو پہلے ہی باب الابواب کے مقام پر متعیّن تھے، تحریر فرمایا: ''رعایا کے اکثر افراد کو آرام و آسایش نے خراب کردیا ہے۔ وہ کوتاہ ہمت ہو گئے ہیں، اس لیے جب تک حضرت سلمان بن ربیعہ باہلی رضی اللہ عنہ تمھارے ساتھ مل نہیں جاتے اُس وقت تک مسلمانوں کو لے کر آگے نہ بڑھنا اور دشمن کے علاقے میں مت گُھسنا کیونکہ مجھے خدشہ ہے کہ وہ کسی آزمایش میں نہ پڑ جائیں۔''

حضرت عبدالرحمٰن بن ربیعہ باہلی رضی اللہ عنہ نے خط کی پروا کیے بغیر پیش قدمی جاری رکھی۔ وہ ہر قیمت پر بلنجر فتح کرنا چاہتے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے نویں سال انھوں نے بلنجر پر حملہ کیا۔ جب وہاں پہنچے تو دشمنوں نے اپنے شہر کو ہر طرف سے بند کرلیا۔ انھوں نے منجنیقیں اور گولے برسانے والی مشینیں پہلے

[1] تاريخ الطبري (٥/ ٣٠٤)

ہی نصب کر رکھی تھیں۔ جو بھی اُن کے قریب جاتا وہ اسے زخمی یا قتل کر دیتے تھے۔ اس طرح مسلمانوں کو بہت نقصان اٹھانا پڑا۔[1]

اُدھر ترکوں نے بھی اہلِ بلنجر سے امدادی فوج بھیجنے کا وعدہ کر رکھا تھا، جب ان کی امدادی فوج پہنچی تو اہلِ بلنجر شہر سے باہر نکل آئے۔ پھر خوب گُھمسان کی جنگ ہوئی، حضرت عبد الرحمٰن بن ربیعہ باہلی رضی اللہ عنہ جنھیں ذو النور کہا جاتا تھا، شہید ہوگئے۔ مسلمانوں کو شکست ہوئی۔ وہ منتشر ہو کر پسپا ہو گئے۔ جن لوگوں نے حضرت سلمان بن ربیعہ باہلی رضی اللہ عنہ والا راستہ اختیار کیا تو وہ انھیں باب الابواب (دربند) سے صحیح سلامت لے کر نکل گئے۔ خزر یا دوسرے شہروں کا راستہ اختیار کیا پھر گولان اور جُرجان جا نکلے۔ ان میں حضرت سلمان فارسی اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما بھی تھے۔ دشمنوں نے حضرت عبدالرحمٰن بن ربیعہ رضی اللہ عنہ کی میت پر قبضہ کر لیا اور اسے ایک صندوق میں رکھ دیا۔ میت انہی کے قبضے میں رہی۔ وہ اس کے وسیلے سے اپنے عقیدے کے مطابق بارش اور فتح ونصرت کی دعائیں مانگتے تھے۔ ان کی نسلیں آج تک ایسا ہی کرتی چلی آرہی ہیں۔[2]

حضرت یزید بن معاویہ النخعی رضی اللہ عنہ کی شہادت:

اہلِ کوفہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں کئی سال تک بلنجر میں جنگ کی۔ ان جنگوں میں کوئی جانی نقصان نہیں ہوا۔ نہ کوئی عورت بیوہ ہوئی، نہ کوئی بچہ یتیم ہوا۔ خلافتِ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا نواں سال شروع ہوا تو حملے سے دور روز پہلے حضرت یزید بن معاویہ رضی اللہ عنہ نے خواب دیکھا کہ ایک نہایت خوبصورت ہرن ان کے خیمے میں لایا گیا ہے اور اسے ان کے بستر میں لپیٹ دیا گیا ہے، پھر اسے ایک قبر کے پاس لایا گیا، قبر بالکل سیدھی اور نہایت خوبصورت تھی۔ وہاں چار آدمی کھڑے تھے، اُس ہرن کو اس قبر میں دفنا دیا گیا۔ اگلے روز مسلمان ترکوں سے برسرِ پیکار ہوئے تو ایک پتھر حضرت یزید بن معاویہ رضی اللہ عنہ کے سر پر آلگا۔ ان کا سر پھٹ گیا۔ اس طرح خون کے دھبوں سے ان کے لباس کو زیب و زینت بخشی گئی۔ گویا یہی وہ ہرن تھا جو آپ نے خواب میں دیکھا تھا۔

حضرت یزید بن معاویہ رضی اللہ عنہ نہایت حسین وجمیل تھے۔ اللہ اُن پر رحم فرمائے! حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو

[1] تاريخ الطبري (٥/ ٣٠٨)

[2] تاريخ الطبري (٥/ ٣٠٩)

ان کی شہادت کی خبر ملی تو انھوں نے ''اِنّا للّٰہ و إِنّا إِلیه رَاجِعون'' پڑھا اور فرمایا:

''اہلِ کوفہ نے بے وفائی کی ہے۔ اے اللہ! ان کی توبہ قبول فرما اور انھیں ہدایت عطا فرما۔''[1]

حضرت عَمرو بن عتبہ رضی اللہ عنہ کی شہادت:

حضرت عَمرو بن عتبہ رضی اللہ عنہ سفید چادر اوڑھتے تو کہتے:

''اے چادر! تجھ پر خون کی سرخی کتنی خوبصورت لگے گی۔''

دشمن سے لڑتے لڑتے انھیں ایک پتھر لگا۔ وہ شدید زخمی ہو گئے، انھوں نے اپنی چادر کو حسبِ خواہش خون سے رنگین دیکھا اور بالآخر اسی زخم سے شہید ہو گئے۔[2]

یہ بھی تمھاری طرح مرتے ہیں:

اس معرکے میں ترک مسلمانوں سے اس قدر خائف تھے کہ وہ جھاڑیوں میں چھپ گئے۔ ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں پر اسلحہ اثر انداز نہیں ہوتا۔ اتفاق سے ایک چھپے ہوئے ترکی فوجی نے کسی مسلمان کو تیر مارا تو وہ شہید ہو گیا۔ اس نے زور سے آواز لگائی: ''جس طرح تم مرتے ہو اُسی طرح یہ بھی مرتے ہیں۔ ان سے مت ڈرو۔'' یہ سُن کر ترک مسلمانوں کے خلاف دلیر ہو گئے۔ اپنی کمین گاہوں سے باہر نکل آئے اور مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ گھمسان کا رَن پڑا۔ حضرت عبدالرحمٰن بن ربیعہ باہلی رضی اللہ عنہ نے ڈٹ کر مقابلہ کیا لیکن بالآخر شہید ہو گئے۔[3]

اہلِ کوفہ اور اہلِ شام میں پہلا اختلاف:

۲۳ھ میں جب حضرت عبدالرحمٰن بن ربیعہ باہلی رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے تو حضرت سعید بن عاص رضی اللہ عنہ نے ان کی جگہ حضرت سلمان بن ربیعہ باہلی رضی اللہ عنہ کو حاکم بنایا۔ ادھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے (خلافت کے دسویں سال) ثَغر[4] اور مرعش وغیرہ شامل ہیں۔ ثغر شام کا مشہور ترشن شہر انطا کیہ ہے۔ (اِن دنوں مصّیصہ، اذنہ،

[1] تاريخ الطبري (٥/ ٣١٠ ـ ٣١١)

[2] تاريخ الطبري (٥/ ٣١٠)

[3] قادة الفتح الإسلامي في أرمينيه لمحمود خطاب (ص: ١٥١)

[4] (ثَغر: دشمن کی سرزمین کے قریب کا ہر موضع ثغر کہلاتا ہے۔ اس نام کے کئی علاقے ہیں۔ ثغرِ شام میں مصّیصہ، اَذِنہ، طرسوس، اسکندرون (اسکندریہ)

طرسوس، اسکندریہ اور انطاکیہ سب ترکی میں شامل ہیں)۔[1]

سرحدی علاقے کی طرف اہلِ شام کو امدادی فوج بھیجی۔ اس فوج کے کمانڈر حضرت حبیب بن مسلمہ رضی اللہ عنہ تھے۔ اصولی طور پر حضرت حبیب بن مسلمہ رضی اللہ عنہ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کے تحت تھے، لیکن حضرت سلمان رضی اللہ عنہ اور حضرت حبیب رضی اللہ عنہ کے مابین اِمارت کے مسئلے پر جھگڑا کھڑا ہو گیا۔ حضرت حبیب رضی اللہ عنہ نے حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کی اِمارت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اہلِ شام نے کہا: ''ہم (حضرت) سلمان رضی اللہ عنہ کو ماریں گے۔'' اس پر اہلِ کوفہ نے کہا: ''اگر تم نے ایسا کیا تو ہم (حضرت) حبیب رضی اللہ عنہ کی پٹائی کریں گے اور اسے قید کر دیں گے۔ اگر تم مطیع نہ ہوئے تو ہمارے اور تمھارے مابین بڑی خون ریزی ہوگی۔ دونوں طرف مقتولوں کی تعداد بہت زیادہ ہو جائے گی۔'' حضرت اوس بن مغراء کوفی رضی اللہ عنہ نے اس بارے میں کچھ اشعار کہے ہیں:

''اگر تم انصاف سے کام لو تو سرحدی علاقہ ہمارے امیر کے ماتحت ہے۔ یہ دیکھو! امیر فوجوں کو لے کر آ رہا ہے۔ ہم سرحد کے حاکم ہیں۔ ہم ہی اس کی حفاظت کرتے تھے۔ ہم تیر اندازی کرتے رہیں گے اور دشمن کو نکیل ڈالتے رہیں گے۔''[2]

آخر اللہ تعالیٰ کی توفیق سے مسلمانوں نے اس فتنے پر قابو پا لیا۔ ابھی ان میں حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابی موجود تھے۔ وہ اہلِ کوفہ کے لشکر میں شامل تھے۔ انھوں نے اس سرحد پر تین غزوات میں شرکت کی۔ تیسرے غزوے میں انھیں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر ملی۔[3]

خراسان میں قارن کی شکست:

جب حضرت ابن عامر رضی اللہ عنہ خراسان کی مُہموں سے واپس ہوئے تو حضرت قیس بن ہیثم رضی اللہ عنہ کو خراسان میں اپنا جانشین مقرر کیا۔ حضرت ابن عامر رضی اللہ عنہ کے واپس آنے کے بعد قارن چالیس ہزار ترکوں کا لشکر لے کر حملے کے لیے نکلا۔ حضرت عبد اللہ بن خازم السُّلمی رضی اللہ عنہ بھی چار ہزار کا لشکر لے کر قارن کے مقابلے کے لیے نکلے۔ جب شام ہوئی تو انھوں نے چھ سو سپاہیوں کا ہراول دستہ آگے بھیجا اور انھیں حکم دیا

[1] معجم البلدان (٢/ ٧٩، ٨٠)
[2] تاريخ الطبري (٥/ ٣١١) البداية والنهاية (٧/ ١٦٦)
[3] تاريخ الطبري (٥/ ٣١١)

کہ نیزوں کی نوک پر روئی اور تیل لگا کر آگ روشن کریں، وہ آدھی رات ہی کو قارن کے لشکر پر ٹوٹ پڑے۔ ترکوں کے اوسان خطا ہو گئے۔ وہ سمجھ ہی نہ سکے کہ یہ کیا آفت آن پڑی ہے۔ اس طرح مسلمانوں کے مختصر سے ہراول دستے ہی نے دشمن کے چالیس ہزار کے لشکر کو جنگ میں الجھائے رکھا۔ اس دوران حضرت ابن خازم رضی اللہ عنہ نے باقی فوج کو ساتھ لے کر ان کا گھیراؤ کر لیا۔ ترک دُم دبا کر بھاگے۔ مسلمانوں نے ان کا پیچھا کیا۔ بہت سے فوجیوں کو واصل جہنم کیا۔ قارن مارا گیا۔ دشمن کے بہت سے فوجی قیدی بنا لیے گئے اور بے شمار مالِ غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ لگا۔[1]

اس طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مشرق میں اٹھنے والی شورشوں اور بغاوتوں کا سدِّ باب کیا۔ فتوحات کا سلسلہ مسلسل جاری رہا۔ بغاوتیں مسلمانوں کو کمزور نہ کر سکیں۔ انھیں کچلنے کے لیے خلیفۂ راشد ہر آن مستعد رہے۔ ان کے عزم واستقلال میں ذرا بھی کمی نہیں آئی، انھوں نے بڑی جرأت کے ساتھ ہر چیلنج کا مقابلہ کیا اور بڑی تیزی سے حالات کا رخ پھیر دیا۔ تاریخ طبری، ابن کثیر اور کلاعی میں وارد واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جن حضرات کو سرکاری عہدوں اور قیادت کے لیے منتخب کیا وہ اپنے مناصب کے پوری طرح اہل تھے۔ انھوں نے نہایت کامیابی سے فتوحات کا دائرہ وسیع کیا اور پریشان کُن صورتِ حال پر خوش اسلوبی سے قابو پالیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مسندِ خلافت پر جلوہ افروز ہونے کے بعد جس طرح اور جس تیزی سے درپیش مشکلات پر قابو پایا، وہ اُن کے استقلال، عزم وہمت، بُردباری، حد درجہ احتیاط، شخصی قوت اور پختہ بصیرت کی بڑی روشن دلیل ہے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد مملکتِ اسلامیہ کے وقار کو بہت نقصان پہنچا اور مملکت میں خاصی کمزوری آ گئی تھی۔ اُس عظمت اور وقار کو دوبارہ بحال کرنے میں اللہ تعالیٰ کی ذاتِ اقدس کے فضل وکرم کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مساعیِ جمیلہ نہایت مؤثر طور پر کارفرما رہیں اور آپ کے اقدامات کے نہایت شاندار نتائج سامنے آئے۔ ذرا اِن نتائج پر نظر ڈالیے:

- باغیوں اور سرکشوں کو مطیع ہونا پڑا اور ان پر دوبارہ سلطنتِ اسلامیہ کی دھاک بیٹھ گئی۔
- فتوحاتِ اسلامیہ کا دائرہ بغاوت کرنے والے شہروں سے آگے تک وسیع کر دیا گیا تاکہ ان شہروں میں پناہ لینے والے باغیوں کی روک تھام ہو، اور ان شہروں سے جو فتنے سر اٹھائیں ہیں ان کا قلع قمع کیا جا سکے۔

[1] البداية و النهاية (٧/ ١٦٧)

۞ مفتوحہ شہروں کی حفاظت کے لیے مسلمانوں نے باقاعدہ ضابطے مقرر کیے جن کی روشنی میں وہ ان شہروں کی نگرانی کرتے تھے۔

بحری جنگ کی اجازت:

سب سے پہلے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بحری جنگ کی اجازت دی: حضرت معاویہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہما شام کے گورنر تھے، انھوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اصرار کیا کہ انھیں بحری جنگ کی اجازت دی جائے۔ انھوں نے حمص کے قریب رومیوں کی موجودگی ہونے کا ذکر کرتے ہوئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو لکھا: ''حمص کی ایک بستی کے لوگ اہلِ روم کے کتوں کے بھونکنے اور مرغیوں کے چلاّنے کی آوازیں سنتے ہیں۔'' انھوں نے روم کے قُرب کا اس قدر دردناک نقشہ کھینچا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دل پر اس کا گہرا اثر ہوا، چنانچہ انھوں نے حضرت عَمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو لکھا: مجھے سمندر اور اس کے مسافروں کی صورتِ حال سے آگاہ کرو کیوں کہ میرا دل اس طرف مائل ہو رہا ہے اور مجھے اس معاملے میں بڑی تشویش ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عَمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کا خط پڑھا اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو لکھا: ''میری طرف سے تمھیں بحری جنگ کرنے کی اجازت نہیں۔ اور اُس ذات کی قسم جس نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو رسولِ برحق بنا کر مبعوث فرمایا! میں سمندر پر کسی مسلمان کو ہرگز سوار نہیں ہونے دوں گا۔ اللہ کی قسم! مجھے ایک مسلمان رومیوں کی ساری سلطنت سے کہیں زیادہ محبوب ہے، اب میرے سامنے ایسی درخواست کبھی پیش نہ کرنا۔ میں نے تمھیں خبردار کر دیا ہے۔ تمھیں معلوم ہے کہ میں نے (حضرت) علاء حضرمی (رضی اللہ عنہ) سے کیا سلوک کیا تھا، حالانکہ میں نے اس معاملے میں انھیں پہلے سے کوئی حکم بھی نہیں دیا تھا۔''

یہ مکتوبِ گرامی پڑھنے کے باوجود روم پر فوج کشی کی خواہش حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دل میں مسلسل مچلتی رہی۔ وہ سمجھتے تھے کہ روم کی فتح میں مسلمانوں کے لیے نہ صرف بھاری مالی بلکہ دیگر بہت سے دور رس فوائد مضمر ہیں، اس لیے وہ بحری جنگ کے آرزومند رہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے دوبارہ اجازت طلب کی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا: ''جب تم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے جنگ کی اجازت طلب کی تھی اور انھوں نے انکار کر دیا تھا تو اُس وقت میں بھی وہاں موجود تھا۔ (پس میرا فیصلہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مختلف نہیں ہوسکتا)۔''

[1] تاریخ الطبري (٥/ ٢٨٥)

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ہمت نہیں ہاری، کچھ وقت گزرنے کے بعد دوبارہ اصرار کیا اور لکھا کہ قبرص (سائپرس) کی طرف سمندری سفر نہایت آسان ہے۔ اس کے جواب میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے لکھا: ''اگر تمھاری بیوی بھی تمھارے ساتھ جائے تو اجازت ہے بصورتِ دیگر نہیں۔''

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بحری جنگ کی اجازت تو دے دی لیکن اُسے درجِ ذیل ہدایات کے ساتھ مشروط کیا: ''لوگوں کا انتخاب نہ کرنا۔ نہ ان کے درمیان قرعہ ڈالنا بلکہ جو اپنی مرضی خوشی سے ساتھ جانا چاہے اسے لے جانا اور اس کی پوری معاونت کرنا۔''

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو یہ خط ملا تو وہ قبرص رضی اللہ عنہ پر فوج کشی کے لیے سرگرم ہو گئے، انھوں نے ساحل والوں کے ذمہ دار افراد کو لکھا کہ کشتیوں کی اصلاح کرو اور انھیں ''حصن عکا'' کی بندرگاہ کے قریب لاؤ تاکہ مسلمان وہاں سے سوار ہو کر قبرص رضی اللہ عنہ کی طرف روانہ ہوسکیں۔[1]

جنگِ قبرص:

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے سپاہیوں کو لے جانے کے لیے مضبوط کشتیوں کا بندوبست کیا، روانگی کے لیے ''عکا'' کی بندرگاہ کا انتخاب کیا۔ کشتیاں بہت زیادہ تھیں۔ انھوں نے اپنی بیوی حضرت فاختہ بنت قرظہ رضی اللہ عنہا کو بھی ساتھ لے لیا، اسی طرح حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی بیوی حضرت ام حرام بنت ملحان رضی اللہ عنہا بھی اپنے شوہر کے ساتھ اس غزوے میں شریک ہوئیں۔[2]

یہ وہی حضرت امِ حرام اللہ عنہا ہیں جو ''شهيدة البحر'' کہلوائیں جن کا قصہ معروف ہے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اکثر و بیشتر حضرت ام حرام بنت ملحان رضی اللہ عنہا کے ہاں تشریف لے جایا کرتے تھے۔ وہ آپ کی خدمت میں کھانے کی کوئی نہ کوئی چیز ضرور پیش کرتیں۔ حضرت ام حرام رضی اللہ عنہا حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کے نکاح میں تھیں۔ ایک روز رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ہاں تشریف لے گئے تو حضرت ام حرام رضی اللہ عنہا نے کھانا پیش کیا۔ اس کے بعد وہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سرِ مبارک سے جوئیں ٹٹولنے بیٹھ گئیں اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سو گئے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسکراتے ہوئے بیدار ہوئے۔ وہ فرماتی ہیں کہ میں نے پوچھا: ''اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! آپ کیوں مسکرا رہے ہیں؟'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

[1] تاريخ الطبري (٥/ ٢٦٠) الإدارة العسكرية في الدولة الإسلامية للدكتور سليمان بن صالح (٢/ ٥٣٨)

[2] البداية و النهاية (٧/ ١٥٩)

میری امت کے کچھ لوگ اللہ کے راستے میں جہاد کے لیے بحرِ اخضر پر سوار ہوں گے، ان کی مثال (دنیا اور آخرت میں) تختوں پر بیٹھے ہوئے بادشاہوں کی سی ہے۔ وہ فرماتی ہیں کہ میں نے کہا: ''اے اللہ کے رسول ﷺ! دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ مجھے بھی ان لوگوں میں شامل کردے۔'' آپ ﷺ نے ان کے لیے دعا کی: ''اے اللہ! انھیں بھی ان لوگوں میں شامل کردے۔'' آپ ﷺ نے سر رکھا اور پھر سو گئے، پھر بیدار ہوئے تو مسکرا رہے تھے۔ وہ کہتی ہیں، میں نے پوچھا: ''اے اللہ کے رسول ﷺ! اب آپ ﷺ کی مسکراہٹ کا کیا سبب ہے؟'' آپ ﷺ نے پہلے ارشاد کا اعادہ فرمایا: وہ کہتی ہیں کہ میں نے کہا: ''اللہ کے رسول ﷺ! دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ مجھے اُن لوگوں میں شامل کردے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا:

«اَنْتِ مِنَ الْاَوَّلِیْنَ» ''تم پہلے گروہ میں سے ہو۔''

پھر حضرت ام حرام بنت ملحان رضی اللہ عنہا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی گورنری کے زمانے میں بحری سفر پر روانہ ہوئیں لیکن سمندر پار کرنے کے بعد اپنی سواری سے گر گئیں اور اسی تکلیف کی شدت سے وفات پا گئیں۔[1]

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے کسی کو اس غزوے کے لیے مجبور نہیں کیا۔ اس کے باوجود مسلمانوں کا ایک بہت بڑا لشکر آپ کی معیت میں نکل پڑا۔

یہ عمل اس بات کی دلیل ہے کہ مسلمانوں کے نزدیک دنیا اور اس کے خزانوں کی کوئی حیثیت نہیں، دنیا کی فراوانی کے باوجود انھوں نے اسے جمع نہیں کیا بلکہ اس کی چمک دمک سے بالکل بے نیاز رہے۔ مسلمان اس خطرے سے بہت ڈرتے تھے کہ اگر انھوں نے اپنی ذمہ داری میں کوتاہی کی اور اپنا فرض ادا نہ کیا تو اللہ تعالیٰ انھیں دنیا میں اپنی مدد و نصرت اور آخرت میں اپنی خوشنودی سے محروم کردے گا اور یہ بہت بڑا خسارہ ہے۔ اسی وجہ سے لوگ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ دوڑ پڑے اور ایک دوسرے سے آگے بڑھ کر لپک لپک کر کشتیوں میں سوار ہوئے۔ شاید حضرت ام حرام رضی اللہ عنہا کی مذکورہ حدیث ان کے دل و دماغ میں بیٹھ گئی تھی، اسی لیے وہ جہاد فی سبیل اللہ کی غرض سے نکل پڑے۔ یہ (۲۸ھ/ ۶۴۹ء) میں سردیوں کا موسم ختم ہونے کے بعد کا واقعہ ہے۔

مسلمانوں نے دینِ اسلام کو پھیلانے کے لیے اپنی قربانیوں اور پیش رفت کی آخری جگہ (لارنکا) پر

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٧٧٨٨)

بطورِ یادگار سیدہ ام حرام رضی اللہ عنہا کو دفن کردیا۔ وہاں ان کی قبر "قبر المرأة الصالحة"، 'صالح عورت کی قبر' کے نام سے آج بھی معروف ہے۔[1]

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے کچھ ساتھیوں پر مشتمل مجلسِ مشاورت قائم کی اور درپیش مہم کے بارے میں طویل مشورے کیے، مجلسِ مشاورت کا اجلاس برخواست کرنے کے بعد اہلِ قبرص کو پیغام بھیجا کہ ہم تمھارے جزیرے کو چھیننے یا اپنا تسلط قائم کرنے نہیں آئے، ہمارا مقصد تمھیں اللہ کے دین کی دعوت دینا ہے۔ مزید برآں ہم مملکتِ اسلامیہ کی شام کی سرحد کے تحفظ کے لیے ضمانت لینا چاہتے ہیں۔

خودسپردگی اور صلح کی درخواست:

جب انھوں نے مسلمانوں کی پیش کش قبول نہ کی تو مسلمان آگے بڑھے اور انھوں نے قبرص کے دارالحکومت قسطنطنیہ کا محاصرہ کرلیا۔ بہت جلد وہ لوگ صلح کی درخواست کرنے پر مجبور ہوگئے، مسلمانوں نے ان کی درخواست قبول کرلی۔ انھوں نے مسلمانوں کے سامنے کچھ شرائط رکھیں اور مسلمانوں نے بھی ان پر چند شرائط عائد کیں۔

- اہلِ جزیرہ پر اگر کوئی جنگ جو حملہ آور ہوگا تو مسلمان ان کا دفاع نہیں کریں گے۔
- اہلِ جزیرہ کے لیے لازم ہوگا کہ وہ مسلمانوں کو ان کے رومی دشمنوں کی نقل وحرکت سے آگاہ کریں۔
- اہلِ جزیرہ ہر سال مسلمانوں کو سات ہزار دوسو دینار بطورِ جزیہ دیا کریں گے۔
- انھیں دشمن کے خلاف مسلمانوں کی راہنمائی کرنا ہوگی یا ان کا سفر خرچ برداشت کرنا ہوگا۔
- رومی اگر اسلامی شہروں پر حملہ کرنے کی کوشش کریں تو اہلِ جزیرہ ان کی مدد نہیں کریں گے، نہ انھیں مسلمانوں کے رازوں سے آگاہ کریں گے۔[2]

اس کے بعد مسلمان واپس شام آگئے، لیکن اس کارروائی نے ثابت کر دیا کہ مسلمان کسی بھی بڑے سے بڑے بحری معرکے میں کود جانے کی مکمل صلاحیت رکھتے ہیں، مزید برآں اس مہم کے ذریعے مسلمانوں کو بلادِ شام اور اسکندریہ پر حملہ کرنے کے منتظر رہنے والے دشمنوں کے ساتھ بحری معرکوں میں طبع آزمائی کے لیے مشق کرنے کی فرصت بھی میسر آگئی۔[3]

---

[1] جولة تاريخية في عصر الخلفاء الراشدين للدكتور محمد السيد الوكيل (ص: ٣٥٤ ـ ٣٥٧)
[2] تاريخ الطبري (٥/ ٢٦١)
[3] جولة تاريخية في عصر الخلفاء الراشدين (ص: ٣٥٨ ـ ٣٥٩)

اہلِ قبرص کی عہد شکنی:

۲۳ھ میں اہلِ قبرص رضی اللہ عنہ رومیوں کے زبردست دباؤ میں آ گئے، رومیوں نے انھیں مجبور کیا کہ وہ مسلمانوں کے خلاف جنگ کے لیے کشتیاں دے کر ان کی مدد کریں۔ اس طرح اہلِ قبرص رضی اللہ عنہ نے دباؤ کی وجہ سے صلح توڑ دی۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو اہلِ قبرص رضی اللہ عنہ کی اس خیانت کا علم ہوا تو انھوں نے جزیرۂ قبرص پر چڑھائی کرنے اور انھیں سلطنتِ اسلامیہ کے زیرِ نگین کرنے کا فیصلہ کرلیا، چنانچہ مسلمانوں نے اہلِ قبرص پر زبردست حملہ کیا۔ حملے کا طریقۂ کار یہ طے کیا گیا کہ ایک طرف سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حملہ کیا اور دوسری جانب سے حضرت عبد اللہ بن سعد رضی اللہ عنہ حملہ آور ہوئے۔ اس حملے میں بہت سے کافر قتل ہوئے، بہت سارے قیدی ہاتھ آئے اور بے شمار دولت بطورِ غنیمت حاصل ہوئی۔

اسلامی فوج کے دباؤ میں آ کر قبرص رضی اللہ عنہ کا حاکم مجبور ہو گیا کہ وہ فاتحین کے سامنے سرنگوں ہو جائے اور ان سے صلح کی بھیک مانگے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے انھیں پہلی صلح ہی پر برقرار رکھا۔[1]

اللہ کی نافرمانی سے انسان کتنا گر جاتا ہے؟

مذکورہ غزوے کے سیاق میں حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ کے حوالے سے ایک واقعہ ہے کہ جب انھوں نے دشمن کے قیدیوں کو دیکھا تو رو پڑے، پھر فرمایا: ''ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی تو کس قدر بے وقعت ہو گئے۔ دیکھو! یہ لوگ جب برسرِ اقتدار تھے تو اپنے مخالفین پر کس قدر غالب تھے لیکن جب انھوں نے اللہ عزّ وجل کے حکم کو چھوڑ دیا اور اس کی نافرمانی کی تو اب ان کی حالت تم خود دیکھ رہے ہو۔''[3]

اللہ تعالیٰ نے ان کی تقدیر میں غلامی اور اسیری لکھ دی۔ جس قوم کے مقدّر میں قید اور اسیری ہو، وہ اللہ کے نزدیک نہایت بے حیثیت ہو جاتی ہے۔'' پھر فرمایا:

''مَا اَهْوَنَ الْعِبَادِ عَلَى اللّٰهِ تَعَالٰى اِذَا تَرَكُوْا اَمْرَه''[4]

''جب بندے اللہ تعالیٰ کے حکم کے تارک ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک کتنے بے وقعت ہو جاتے ہیں۔''

---

[1] جولة تاريخية في عصر الخلفاء الراشدين (ص: ٣٥٩ ـ ٣٦٠)

[2] فتوح البلدان للبلاذری (ص: ١٥٨)

[2] التاريخ الإسلامي للدكتور عبد العزيز الحميدي (١٢/ ٣٩٦)

[4] البداية و النهاية (٧/ ١٥٩)

رومی لشکر مسلمانوں کے حملوں کی تاب نہ لا سکا، ان کے حوصلے پست ہو گئے، اعصاب جواب دے گئے اور وہ ان بہادروں اور حریت کے شاہینوں کے سامنے نہ ٹھہر سکے جن کا مقصد (دنیا و آخرت کی) دو بھلائیوں میں سے ایک بھلائی، یعنی شہادت پانا یا غازی بننا تھا۔ انھوں نے بھاگتے ہوئے اسکندریہ کا رخ کیا کہ شاید انھیں محفوظ قلعوں یا بلند فصیلوں میں پناہ مل جائے اور وہ سر پر سوار موت کے منہ سے بچ جائیں۔[1]

مصریوں نے جب رومیوں کی شکست اور مسلمانوں کی فتح دیکھی تو وہ بھی نکل پڑے۔ انھوں نے وہ تمام راستے جو رومیوں نے خراب کر دیے تھے ٹھیک کیے۔ ٹوٹے ہوئے پلوں کو از سرِ نو تعمیر کیا۔ وہ لوگ جنھوں نے مصریوں کی عزتیں پامال کی تھیں اور ان کا مال لوٹا تھا، ان کی شکست اور مسلمانوں کی فتح پر اہلِ مصر نے بے حد خوشی کا اظہار کیا اور مسلمانوں کی اسلحہ کے علاوہ دیگر جنگی ضروریات میں ہر ممکن مدد کی۔[2]

حضرت ابن سعد رضی اللہ عنہما نے ان کے لیے ایک معاہدہ لکھا۔ اس میں درج تھا کہ وہ داخلی طور پر خود مختار ہوں گے اور جنوبی حدود کی جانب سے مسلمانوں کو اطمینان کی یقین دہانی کرائیں گے، نیز مملکت کی خدمات پر مامور رضا کاروں، غلاموں کی تجارت اور آمدنی کے معاملے میں راہنمائی کرنا ان کی ذمہ داری ہو گی۔ مسلمان نُوبہ اور بجہ میں وہاں کے باشندوں کے ساتھ مل جل کر رہے۔ اس کے نتیجے میں ان میں سے بہت سے لوگ مسلمان ہو گئے۔[3]

افریقہ کی فتح:

حضرت عَمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کا بَرقہ، طرابلس اور لیبیا کے دوسرے علاقوں پر حملہ کرنے کا ایک مقصد یہ تھا کہ ان شہروں کو فتح کیا جائے اور مخلوق کے دلوں سے رومی طاغوت کا اثر زائل کر دیا جائے تاکہ ان کے لیے راستے روشن ہوں اور انھیں مختلف عقائد کا پتا چلے۔

جب حضرت عبد اللہ بن سعد رضی اللہ عنہما نے افریقہ پر حملہ کرنے کے لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے اجازت طلب کی تو انھوں نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو جمع کر کے ان سے مشورہ کیا۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے اسے فتح کرنے کا مشورہ دیا۔ حضرت ابو الاعور سعید بن زید رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے کو بنیاد بنا کر کہ کوئی مسلمان

[1] فتوح البلدان للبلاذري (ص: ٦٩)
[2] جولة تاريخة في العصر الخلفاء الراشدين (ص: ٣٣٨)
[3] قادة فتح بلاد المغرب لمحمود خطاب (١/ ٦١ـ ٦٣)

افریقہ پر لشکر کشی نہ کرے، اس کی مخالفت کی۔ لیکن اکثر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اسے فتح کرنے پر متفق ہو گئے۔ چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جہاد کی دعوت دی۔ خلافتِ اسلامیہ کے دار الحکومت مدینہ منورہ میں رضا کاروں کو جمع کرنے، ان کی جنگی تیاری کرنے اور انھیں مصر روانہ کرنے کی مہم شروع ہوگئی تاکہ حضرت عبد اللہ بن سعد رضی اللہ عنہما کی قیادت میں افریقہ پر لشکر کشی کی جا سکے۔ اس غزوے کا اہتمام بڑے زور شور اور بھرپور طریقے سے کیا گیا۔

اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ کئی کبار صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اہلِ بیت کے جوانانِ رعنا اور سابقینِ اولین مہاجرین و انصار کے فرزند بھی اس غزوے میں شریک ہوئے۔ اس غزوے میں حضرت حسن و حسین، ابن عباس اور ابن جعفر رضی اللہ عنہم بھی شامل تھے۔ جب تیاری مکمل ہوگئی تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مجاہدینِ اسلام کو خطبہ دیا۔ جہاد کے فضائل سے آگاہ کیا اور فرمایا: حضرت عبد اللہ بن سعد رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچنے تک حضرت حارث بن حکم رضی اللہ عنہ تمھارے امیر ہوں گے، اور وہاں پہنچنے پر تم سب کے امیر حضرت عبد اللہ بن سعد رضی اللہ عنہ ہوں گے۔'' پھر فرمایا:

«أَسْتَوْدِعُكُمُ اللّٰهَ» ''میں تمھیں اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔''

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس غزوے میں کم و بیش ایک ہزار اونٹ جہاد فی سبیل اللہ کے لیے دیے تاکہ وہ لوگ جو مالی طور پر کمزور ہیں ان پر سوار ہو کر جہاد میں شامل ہو سکیں۔ اس لشکر کی کل تعداد تقریباً بیس ہزار تھی، افریقہ کی فتح کے راستے میں ایک خاصی قیمتی غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ لگی۔ حضرت عبد اللہ بن سعد رضی اللہ عنہ نے افریقہ کی جانب پیش قدمی جاری رکھی۔ ہر طرف جاسوس اور خبر رساں دستے پھیلا دیے یہاں تک کہ ان کا لشکر امن و امان کے ساتھ سبیطلہ پہنچ گیا۔

حضرت عبد اللہ بن سعد رضی اللہ عنہ نے جرجیر کو اسلامی نقطہ نظر سے آگاہ کیا اور اسے ترغیب دی کہ اسلام قبول کر لے اور اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کر لے، بصورتِ دیگر جزیہ ادا کرے اور اسلامی سلطنت کے تابع ہو کر رہے۔ لیکن اس نے یہ تمام پیش کشیں ٹھکرا دیں اور اپنے کفر پر مصرّ رہا۔ اس نے اور اس کے لشکر نے تکبّر کیا۔ مسلمانوں کے لیے یہ صورتِ حال خاصی پریشان کن تھی۔ بالآخر فریقین میں جنگ چھڑ گئی۔ کئی دن تک سخت لڑائی ہوتی رہی یہاں تک کہ حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کی قیادت میں کمک پہنچ گئی اور ان کے ہاتھوں متکبر اور سرکش جرجیر اپنے انجام کو پہنچا۔[1]

[1] الشرف والتسامي بحركة الفتح الإسلامي للصلابي (ص: ١٩٣) البداية والنهاية (٧/ ١٩٨)

افریقہ کی فتح میں حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کی بہادری:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا جب افریقہ پر حملہ کرنے والے مسلمانوں سے رابطہ منقطع ہو گیا تو انھوں نے حالات کا جائزہ لینے کے لیے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کو ایک جماعت کے ساتھ روانہ کیا۔ وہ نہایت سُبک رفتاری سے چلے۔ افریقہ جا پہنچے، مسلمان خوشی سے پُھولے نہ سمائے، ہر طرف نعرۂ تکبیر کی صدائیں گونج اٹھیں۔ جرجیر نے اپنے جاسوسوں سے اس کی وجہ دریافت کی تو انھوں نے بتایا کہ مسلمانوں کے پاس امدادی لشکر آیا ہے۔ اس خبر سے اس کے اعصاب شکستہ ہو گئے۔

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کا کارنامہ:

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما انتہائی دلیر انسان تھے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ ان کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''جب مسلمانوں نے افریقہ پر چڑھائی کی تو ان کی تعداد بیس ہزار تھی۔ ان کی قیادت حضرت عبداللہ بن سعد بن ابی سرح رضی اللہ عنہ کر رہے تھے۔ اس لشکر میں حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم بھی موجود تھے۔ ادھر بربر کا حاکم جرجیر ایک لاکھ بیس ہزار یا دو لاکھ فوج لے کر مقابلے کے لیے نکلا۔ دونوں فریق آمنے سامنے ہوئے تو جرجیر نے اپنی فوج کو حکم دیا کہ وہ مسلمانوں کو چاروں طرف سے گھیر لے۔ اس طرح مسلمان نہایت خطرناک صورتِ حال میں پھنس گئے۔

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ''میں نے دیکھا کہ جرجیر لشکر کی پُشت پر موجود ہے۔ عمدہ گھوڑے پر سوار ہے، دولڑکیاں اس پر مور کے پَروں سے سایہ کیے ہوئے ہیں۔'' یہ منظر دیکھ کر مَیں حضرت عبداللہ بن سعد بن ابی سرح رضی اللہ عنہ کے پاس گیا اور ان سے کہا: ''چند نوجوان میرے ساتھ کر دیں جو پیچھے رہ کر میرا دفاع کریں۔ میں جرجیر کو قتل کرنا چاہتا ہوں۔ انھوں نے بہادروں کا ایک گروہ میرے ساتھ روانہ کیا اور انھیں حکم دیا کہ پیچھے سے میری حفاظت کریں۔

مَیں صفیں چیرتا ہوا بادشاہ کی جانب بڑھا۔ دشمن سمجھتے رہے کہ میں بادشاہ کی جانب کوئی پیغام لے کر جا رہا ہوں۔ جب میں اس کے قریب ہوا تو اسے مجھ سے خطرہ محسوس ہوا۔ وہ اپنے گھوڑے پر بھاگ نکلا۔ میں نے اس کا تعاقب کیا۔ اسے پیچھے سے جا لیا اور نیزے سے حملہ کر دیا، پھر تلوار سے اس کا سر کاٹ کر نیزے کی اَنی پر نصب کیا اور نعرۂ تکبیر لگایا۔ یہ منظر دیکھتے ہی بربری دہشت زدہ ہو گئے اور دُم دبا کر ایسے بھاگے جیسے تیتر میدان چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے، مسلمانوں نے ان کا پیچھا کیا۔ انھیں قتل کیا، قیدی بنایا

اور بہت سا مال بطورِ غنیمت حاصل کیا۔ یہ واقعہ سبیطلہ شہر میں، جو قیروان سے دو دن کی مسافت پر ہے، پیش آیا۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے: ''یہ پہلا کارنامہ تھا جس سے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کی شہرت ہو گئی۔ اللہ ان سے، ان کے والد اور ان کے تمام ساتھیوں سے راضی ہو۔''[1]

حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کا یہ کارنامہ ہولناکیوں سے گھری ہوئی بلندیوں کی طرف ایک اہم قدم تھا۔ یہ وہ کارنامہ تھا جو انھوں نے کسی سابقہ تجربے کے بغیر انجام دیا۔ اُس وقت اُن کی عمر رضی اللہ عنہ صرف ستائیس سال تھی۔ اس سے پہلے ان کی بہادری کے کارناموں کا ذکر کسی مہم میں نہیں ملتا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس خطرناک مہم میں، جس میں عام تجربات کے مطابق انجام ہلاکت ہی ہوتا ہے، وہ کس طرح آگے بڑھے اور یہ کارنامہ کس طرح انجام دے ڈالا۔ اس طرح کی مہم میں جانباز کے دل میں دو طرح کے خیالات پیدا ہو سکتے ہیں:

- اس کا مقصد یہ ہو کہ وہ اپنے حملے میں کامیاب ہو جائے اور بر بری حاکم کا کام تمام کر دے۔
- ایک مقصد یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ اسے بطورِ شہید قبول کر لے اور یوں وہ اعلیٰ آرزو کے حصول میں کامیاب ہو جائے، اور ایسا اقدام صرف وہی عظیم لوگ کر سکتے ہیں جنھیں معرکۂ حق و باطل سے جنت کی خوشبو آ رہی ہو اور وہ اس میں رہنے کے مشتاق ہوں۔

حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے یہ حملہ کیا تو وہ اُس وقت دنیا کے تعلقات اور اس کے حوصلہ شکن بوجھ سے آزاد تھے۔ اُن کا مقصد اُن نعمتوں کا حصول تھا جو اللہ تعالیٰ نے اُن مجاہدین کے لیے تیار کی ہیں جو اُس کے راستے میں اپنی طاقت کے مطابق جہاد کرتے ہیں، چاہے انھیں غلبہ نصیب ہو یا وہ جامِ شہادت نوش کر جائیں۔[2]

علاوہ ازیں مسلمانوں نے افریقہ کی فتوحات میں ہر چھوٹی بڑی قربانی پیش کی۔ ان میں سے بہت سے لوگ شہادت سے سرفراز ہوئے۔ کچھ غازی بن کر لوٹے اور افریقہ ہی میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں فوت ہوئے۔

---

[1] البداية و النهاية (١/ ١٥٨)

[2] التاريخ الإسلامي للدكتور عبد العزيز الحميدى (١٢/ ٣٩٠)

فتوحاتِ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے فوائد و نتائج

اللہ تعالیٰ کا مومنوں سے کیا گیا وعدہ پورا ہونا:

امام ابن کثیر رحمہ اللہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ نے اُن کے ہاتھوں بہت سے صوبے اور شہر فتح کرائے۔ مملکتِ اسلامیہ میں وُسعت پیدا ہوئی، سلطنتِ محمدیہ پھیل گئی، مصطفوی پیغام شرق وغرب میں پہنچ گیا اور اللہ تعالیٰ کے اِس ارشادِ گرامی کے مصداق مسلمانوں کو ہر طرف غلبہ حاصل ہوا:

﴿ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۚ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا ۚ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴾ [النور: ٥٥]

''جو تم میں سے ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے، اللہ نے اُن لوگوں سے وعدہ کیا ہے کہ وہ انھیں زمین میں ضرور خلافت دے گا، جس طرح اُس نے اُن سے پہلے لوگوں کو خلافت دی تھی اور ان کے لیے ضرور ان کا وہ دین پائیدار کر دے گا جو اس نے ان کے لیے چُنا اور یقیناً ان کی حالتِ خوف کو بدل کر وہ انھیں امن دے گا، وہ میری عبادت کریں گے، میرے ساتھ کسی شے کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے، اور جو اِس کے بعد کفر کرے تو وہی لوگ فاسق ہیں۔''

نیز ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ﴾ [التوبة: ٣٣]

''وہی (اللہ) ہے جس نے اپنے رسول کو ہدیت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا تا کہ اسے سب دینوں پر غالب کرے، چاہے مشرکین کو برا ہی لگے۔''

اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے:

«قَدْ مَاتَ كِسْرٰى فَلَا كِسْرٰى بَعْدَهٗ، وَ اِذَا هَلَكَ قَيْصَرُ فَلَا قَيْصَرَ بَعْدَهٗ، وَ الَّذِي

نَفْسِی بِیَدِہٖ! لَتُنْفَقَنَّ کُنُوْزُھُمَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ»[1]

''کسریٰ مر چکا، لہٰذا اس کے بعد کوئی کسریٰ نہیں ہوگا۔ قیصر کی ہلاکت کے بعد کوئی قیصر نہیں ہوگا۔ مجھے اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! ان دونوں کے خزانے اللہ کے راستے میں ضرور خرچ کیے جائیں گے۔''

مملکتِ اسلامیہ کی سرحدوں کی نگہبانی:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں مملکتِ اسلامیہ کے پھیلاؤ کی وجہ سے ضروری تھا کہ سرحدوں کی حفاظت کی پالیسی جاری رکھی جائے اور دشمن کے حملوں سے بچنے کے لیے نگران دستے مقرر کیے جائیں۔ اس کی دو صورتیں تھیں:

1. وہاں نگران فوجی دستے مقرر کیے جائیں۔
2. سرحدوں پر چھاؤنیاں اور چوکیاں بنا دی جائیں۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مملکتِ اسلامیہ کی سرحدوں کی حفاظت کے لیے مامور فوجی دستوں کے کمانڈروں کو لکھا: ''اما بعد! تم مسلمانوں کے محافظ ہو، ان کا دفاع کرنے والے ہو۔''[2]

انتظامی آسانی کے لیے (حضرت) عثمان (رضی اللہ عنہ) نے شام اور جزیرہ کو باہم مدغم کر دیا۔ اس کے منتظم حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ تھے۔ ان علاقوں کی سرحدوں کی ذمہ داری بھی ایک ہی نظام کے تحت تھی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ شمشاط کی سرحد پر خود چڑھائی کریں یا کسی تجربہ کار، بااعتماد اور بہادر کمانڈر کو روانہ کریں جو رومیوں سے قتال کی رغبت رکھتا ہو۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت عبداللہ بن سعد رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ اسکندریہ کی سرحد پر باقاعدہ فوج مقرر کر کے اسے محفوظ بنائیں اور فوجیوں کو پابندی سے بر وقت تنخواہیں دیں۔ وہاں ان کی ڈیوٹیاں باری باری لگائیں تاکہ وہ ایک ہی جگہ ڈیوٹی سے اکتا نہ جائیں۔

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے سپہ سالاروں کا طریقۂ کار یہ تھا کہ جب فتوحات کرتے ہوئے پیش قدمی کرتے اور دشمنوں کے قلعوں پر قبضہ کرتے تو اپنے پیش رَو سپہ سالاروں کی طرح ان میں ترمیم کرتے،

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٩١٨)

[2] تاریخ الطبري (٥/ ٢٤٤)

پھر وہاں مسلمان سپاہیوں کو ٹھہرا دیتے۔ اس کے ساتھ ساتھ نئے دفاعی قلعے بھی تعمیر کرتے جاتے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں مختلف سرحدوں پر متعدد نئے قلعے تعمیر ہوئے۔ ان میں مملکتِ اسلامیہ کی سرحدوں کی حفاظت کے لیے ہر وقت مستعد مجاہدین موجود رہتے تھے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے گرمیوں اور سردیوں کی مناسبت سے دشمن پر حملوں کا خصوصی بند وبست کیا۔ انھوں نے اس سلسلے میں درپیش مشکلات کو آسان کرنے کوششیں کیں۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں سردیوں اور گرمیوں کے یہ حملے خشکی تک ہی محدود نہ تھے بلکہ آپ کے عہد میں دشمنوں پر بحری حملے بھی سال بھر جاری رہتے تھے۔[1]

لشکر کو صلح کی دفعات میں حسبِ ضرورت شرط عائد کرنے کی اجازت:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں مملکتِ اسلامیہ میں وُسعت پیدا ہوئی تو سپہ سالاروں نے صلح کے بعض معاہدوں میں یہ شرط لگانے کی ضرورت محسوس کی کہ جب مسلمانوں کا لشکر ان کے علاقے سے گزرے گا تو اہلِ علاقہ کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ مویشی اور کھانے پینے کا سامان فراہم کرنے کے علاوہ لشکر کی دیگر جنگی ضروریات بھی پوری کریں گے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ اس طرح مسلمانوں کو مرکزی قیادت سے رسد طلب نہیں کرنی پڑے گی۔ یوں وہ سامان اٹھانے کی مشقت سے بھی بچ جائیں گے۔ اس طرح یہ شرط فتوحات میں ان کی مُمد ومعاون ثابت ہوگی۔ وہ زیادہ مؤثر طریقے سے دشمن کا مقابلہ کرسکیں گے اور پیش قدمی آسان ہو جائے گی۔[2]

دشمن کی سرگرمیوں پر نظر:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں فتوحات کا سلسلہ جاری رہا۔ آپ ازخود دشمنوں کے حالات پر نظر رکھتے اور ان کی چھان بین بڑے اہتمام سے کیا کرتے تھے۔[3]

---

[1] الإدارة العسكرية في الدولة الإسلامية للدكتور سليمان بن صالح (٢/ ٢٦٦ ـ ٤٧٠)

[2] تاریخ الیعقوبی (٢/ ١٦٦ـ ١٦٧)

[3] الطبقات لابن سعد (٣/ ٥٩)

امت کو ایک مصحف پر جمع کرنے کا عظیم دینی اور تاریخی کارنامہ

عہدِ نبوی ﷺ میں کتابتِ قرآن:

یہ بات قطعی دلیل سے ثابت ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ پر جو وحی نازل ہوتی تھی آپ ﷺ اسے لکھنے کا حکم دیتے تھے۔ یہ بھی ثابت ہے کہ آپ ﷺ کے کاتبینِ وحی مقرر تھے جو نازل ہونے والے قرآن کو لکھتے تھے۔ یہاں تک کہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کتابتِ وحی کی وجہ سے ''کاتب النبی ﷺ'' کے لقب سے معروف تھے۔ امام بخاری نے اپنی صحیح میں فضائلِ قرآن کے سلسلے میں یہ باب قائم کیا ہے:

''باب كُتَّاب النَّبِي ﷺ'' ''نبی ﷺ کے کاتبوں کا بیان''

اور اس کے تحت دو حدیثیں درج کی ہیں:

(۱) حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت زید رضی اللہ عنہ سے کہا:

''وَقَدْ كُنْتَ تَكْتُبُ الْوَحْيَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ''[1]

''اور یقیناً آپ رسولِ اکرم ﷺ کے لیے وحی کی کتابت کیا کرتے تھے۔''

(۲) حضرت براء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب یہ آیت: ﴿لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾. نازل ہوئی تو رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا:

«اُدْعُ لِيْ زَيْداً وَ لْيَجِيءْ بِاللَّوْحِ وَالدَّوَاةِ وَالْكَتِفِ، اَوِ الْكَتِفِ وَ الدَّوَاةِ»[2]

''زید کو میرے پاس بلا لاؤ اور اسے کہو کہ تختی، دوات اور شانے کی ہڈی لیتا آئے یا (فرمایا:) شانے کی ہڈی اور دوات بھی ساتھ لے آئے۔''

نبی اکرم ﷺ ہجرت سے پہلے مکہ مکرمہ میں بھی قرآنِ مجید لکھواتے تھے۔ آپ ﷺ کے کاتبین میں حضرت عبد اللہ بن سعد بن ابی سرح رضی اللہ عنہ بھی تھے جو مرتد ہو گئے مگر پھر فتح مکہ کے سال انھوں نے دوبارہ اسلام قبول کر لیا۔ ان کا قصہ معروف ہے۔ اور یہ بات بھی معروف ہے کہ خلفائے اربعہ کا شمار بھی کاتبینِ وحی میں ہوتا ہے۔ بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ حضرات مکہ مکرمہ میں قرآنِ مجید کی کتابت کیا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے بھی آگاہ فرمایا ہے کہ قرآنِ مجید صحیفوں میں لکھا ہوا ہے۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٩٨٦)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٩٩٠)

﴿ رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ﴾ [البينة: ۲]

''اللہ کے رسول جو پاکیزہ صحیفے پڑھتے ہیں۔''

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت پورا قرآن لکھا ہوا تھا لیکن ایک جگہ پر جمع نہیں تھا۔ مختلف چیزوں، کھجور کے پتوں اور چوڑے سفید پتھروں وغیرہ پر تحریر تھا۔ لوگوں کے سینوں میں بھی محفوظ تھا۔ صحیفوں اور لوگوں کے سینوں میں محفوظ ہونے کے علاوہ حضرت جبرائیل علیہ السلام ہر سال نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قرآنِ کریم کا دَور کیا کرتے تھے۔ اور جس سال رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی اس سال دومرتبہ دَور کیا۔[1]

ممکن ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے ناسخ اور منسوخ، یعنی بعض احکام منسوخ ہو جانے یا بعض آیات کی تلاوت منسوخ ہو جانے کے امکان کے پیشِ نظر اسے ایک مصحف میں جمع نہ کیا ہو۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک پورا قرآن نازل ہو چکا اور نزولِ وحی کا سلسلہ منقطع ہوگیا تو اللہ تعالیٰ نے خلفائے راشدین کو یہ کام کرنے کا الہام کر دیا تاکہ امتِ محمدیہ کے لیے قرآن کی حفاظت کی ذمہ داری کا سچا وعدہ پورا ہو جائے۔[2]

عہدِ حضرت ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہ میں کتابتِ قرآن:

جنگِ یمامہ میں قرآنِ مجید کے بہت زیادہ حفّاظ شہید ہو گئے۔ جس کے نتیجے میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مشورے سے قرآن کو چمڑوں کے ٹکڑوں، ہڈیوں، کھجور کی چھالوں، پتھر کی سِلوں اور لوگوں کے سینوں سے ایک جگہ جمع کیا۔[3]

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے یہ عظیم ذمہ داری جلیل القدر صحابی حضرت زید بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ کو سونپی۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: ''یمامہ میں بہت سے حفّاظ کی شہادت کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مجھے بلا بھیجا۔ وہاں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''(حضرت) عمر (رضی اللہ عنہ) میرے پاس آئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ جنگِ یمامہ میں بہت سے حفّاظِ قرآن شہید ہو گئے ہیں۔ خدشہ ہے کہ آیندہ معرکوں میں اگر اسی طرح حفّاظ شہید ہوئے تو قرآن کا بہت سا حصہ ضائع ہو جائے گا۔

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٩٩٨)

[2] المدينة المنورة، فجر الإسلام والعصر الراشدي لمحمد حسن شراب (ص: ٢٤٠) نقلًا عن فتح الباري (٩/ ١٢)

[3] حروب الردة، بنا الدولة الإسلامية لأحمد سعيد (ص: ١٤٥)

میرا خیال ہے کہ آپ قرآن کو جمع کرنے کا حکم دیں۔ میں نے (حضرت) عمر (رضی اللہ عنہ) سے کہا ہے کہ میں ایسا کام کیسے کروں جسے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا؟ (ایک مصحف میں جمع نہیں کیا ہے) (حضرت) عمر (رضی اللہ عنہ) کہتے ہیں: اللہ کی قسم! یہ خیر ہے۔ (حضرت) عمر (رضی اللہ عنہ) بار بار مجھ سے اصرار کرتے رہے۔ اب اللہ نے میرا سینہ بھی اِس کام کے لیے کھول دیا ہے جس کے بارے میں (حضرت) عمر (رضی اللہ عنہ) کو انشراحِ صدر تھا۔ اب میری بھی اس بارے میں وہی رائے ہے جو (حضرت) عمر (رضی اللہ عنہ) کی ہے۔'' حضرت زید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مجھ سے فرمایا: ''آپ عقل مند ہیں۔ نوجوان ہیں۔ ہم آپ کو (حفظ واِتقان اور دین داری میں سے کسی معاملے میں بھی) متّہم نہیں ٹھہراتے۔ مزید یہ کہ آپ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی وحی کی کتابت کرتے رہے ہیں، لہٰذا مختلف اشیاء سے (جو آپ کے پاس ہیں یا کسی اور کے پاس ہیں) قرآن پاک کی آیات اور سورتیں تلاش کریں اور انھیں جمع کریں۔''

حضرت زید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''اللہ کی قسم! اگر وہ مجھے پہاڑوں میں سے کوئی پہاڑ منتقل کرنے کا مکلّف ٹھہراتے تو یہ حکم مجھ پر اس قدر گراں نہ گزرتا جس قدر قرآن جمع کرنے کی ذمہ داری ثقیل تھی۔ پس (یہ ذمہ داری قبول کرتے ہوئے) میں نے کھجور کی چھالوں، چوڑے سفید پتھروں، لوگوں کے سینوں، چمڑے کے ٹکڑوں اور شانوں کی ہڈیوں سے قرآن کی تلاش شروع کردی۔''

فرماتے ہیں: ''حتیٰ کہ سورۂ توبہ کی درجِ ذیل آیت سے آخر تک کا حصہ مجھے صرف ابوخزیمہ انصاری رضی اللہ عنہ کے پاس سے ملا۔ ان کے علاوہ کہیں سے نہ ملا:

﴿ لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ ﴾ [التوبة: ١٢٨]

''(لوگو!) تمھارے پاس تم ہی میں کا (یعنی عربی قریشی) ایک پیغمبر آچکا، تمھاری تکلیف اس کو ناگوار ہے، تمھاری بھلائی کی اس کو لَو لگی ہے مسلمانوں پر بہت شفقت کرتا ہے مہربان۔''

[یہ صحیفے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی زندگی میں ان کے پاس رہے، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زندگی میں اُن کے پاس رہے، پھر وہ مصاحف سیدہ حفصہ بنت عمر رضی اللہ عنہا کے پاس رہے][1]

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٩٨٦)

تدوین کے دوسرے مرحلے سے ماخوذ چند نتائج:

قرآن جمع کرنے کی ضرورت اس کے ضائع ہونے کے خوف سے اُس وقت پیش آئی جب مرتدین کے خلاف لڑی جانے والی جنگوں میں بے شمار قُرّائے کرام شہید ہو گئے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں بھلائی کے کاموں بالخصوص جہاد فی سبیل اللہ میں علمائے دین پیش پیش رہتے تھے۔ انھوں نے نہ صرف اپنے افکار ونظریات اور کردار سے اسلام کے محاسن اجاگر کیے بلکہ جہاد بالسیف کے ذریعے بھی اسلام کی شان وشوکت بڑھائی۔ یوں وہ امت کے بہترین افراد تھے جو لوگوں کی راہنمائی کے لیے بروئے کار آئے۔ یہ لوگ امتِ مسلمہ کے لیے ایک درخشاں نمونے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

تدوینِ قرآن مصالحِ مُرسلہ کے پیشِ نظر کی گئی۔ اِس کی سب سے بڑی دلیل حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یہ کہا: ''ہم وہ کام کس طرح کر سکتے ہیں جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا؟'' تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''یہ خیر ہے۔'' اور بعض روایات میں ہے: ''اللہ کی قسم! اِس میں خیر اور مسلمانوں کی مصلحت ہے۔''

یہی جواب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو اُس وقت دیا جب انھوں نے پوچھا: ''آپ وہ کام کیسے کر سکتے ہیں جو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا۔''

جس روایت میں ''مصلحت'' کا لفظ ہے وہ صحیح ہو یا نہ ہو ''کلمۂ خیر'' کی تعبیر اسی (مصلحت والے) معنیٰ پر دلالت کرتی ہے کہ قرآن جمع کرنے میں مسلمانوں کی مصلحت ہے اور اس کی بنا شروع میں تو مصالحِ مُرسلہ ہی پر تھی، پھر جب سب لوگوں نے اِس کا صریح یا ضمنی اقرار کر کے اس کی موافقت کی تو اس امر پر اجماع ہو گیا۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ مصالحِ مُرسلہ کی حجّیت کے قائل ہیں، اُن کے نزدیک یہ اجماع کے لیے سند بن سکتے ہیں جیسا کہ اصولِ فقہ کی کتابوں سے یہ بات ثابت ہے۔

اس واقعے سے ہمیں یہ بھی پتا چلتا ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نہایت پر امن فضا میں اجتہاد کرتے تھے جس میں باہمی محبت و احترام ملحوظ رکھا جاتا تھا۔ اِس سے اُن کا مقصد صرف مسلمانوں کی عمومی مصلحت کا حصول ہوتا تھا۔ وہ صحیح رائے فوراً مان لیتے تھے۔ اور اُسے قبول کرنے کے بعد انھیں انشراحِ صدر بھی ہو جاتا تھا۔ اور جب وہ کسی رائے کو تسلیم کر لیتے تو اُس کا دفاع اِس طرح کرتے، جیسے یہ شروع ہی سے خود ان کی اپنی رائے ہو۔ اِسی جذبے کی بنا پر بہت سے اجتہادی مسائل میں ان کا اجماع ہوا۔[1]

[1] الاجتهاد في الفقه الإسلامي لعبد السلام السليماني (ص: ١٢٧)

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو تدوینِ قرآن کی ذمہ داری سونپنے کے بنیادی اسباب:

تدوینِ قرآن جیسے عظیم کام کے لیے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا انتخاب کیا۔ یہ انتخاب درجِ ذیل بنیادی اسباب کی بنا پر تھا: وہ اسباب کیا ہیں؟

- حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ جواں سال تھے، آپ کی عمر ابھی صرف اکیس سال تھی۔ اِس عمر میں انسان نہایت چاق و چوبند ہوتا ہے اور اپنی ذمہ داریاں احسن انداز سے پوری کر سکتا ہے۔
- آپ نہایت قابل اور لائق تھے، اور انھیں نہایت صحت کے ساتھ قرآن پاک زیادہ یاد تھا اور جسے اللہ تعالیٰ نے وافر سوجھ بوجھ اور عقل ودانش سے نوازا ہو، اُس کے لیے خیر کے تمام راستے آسان ہو جاتے ہیں۔
- آپ کاتبِ وحی تھے، اس لیے آپ کو پہلے سے اس کام کا تجربہ اور عملی مہارت تھی۔ آپ اِس کام سے اجنبی اور ناواقف نہیں تھے۔
- اس پر مستزاد آپ اُن چار افراد میں سے تھے جنھوں نے عہدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں قرآنِ مجید جمع کیا تھا۔ حضرت قتادہ رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے پوچھا: ''عہدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں کس نے قرآن جمع کیا؟'' انھوں نے فرمایا: ''چار لوگوں نے، اور وہ چاروں انصاری تھے: حضرت ابی بن کعب، معاذ بن جبل، زید بن ثابت اور ابوزید رضی اللہ عنہم۔''[2]

حضرت زید رضی اللہ عنہ نے قرآن جمع کرنے میں جس طریقے کی پیروی کی وہ یہ تھا کہ کوئی بات اُس وقت تک قرآن میں جمع نہ کرتے جب تک کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لکھی ہوئی نہ ہوتی یا پھر صحابہ رضی اللہ عنہم نے اسے محفوظ نہ کیا ہوتا۔ آپ صرف حافظے پر اعتماد نہیں کرتے تھے، اس ڈر سے کہ کہیں حفظ میں کوئی غلطی ہوگئی ہو یا وہم نہ ہو گیا ہو۔ اِسی طرح اگر کوئی شخص کچھ لکھا ہوا لاتا تو اُس کو اس وقت تک قبول نہ کرتے جب تک وہ دو گواہ نہ لاتا جو اس بات کی گواہی دیتے کہ یہ مکتوب رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لکھا گیا ہے۔ ساتھ ہی اس بات کا بھی خیال رکھتے کہ کیا یہ لکھا ہوا ان وجوہ (قراءات) میں سے بھی ہے جن میں قرآن نازل ہوا۔[3]

---

1. التفوق والنجابة على نهج الصحابة لحمد العجمي (ص: ٧٣)
2. سير أعلام النبلاء (٢/ ٤٣١)
3. التفوق والنجابة على نهج الصحابة لحمد العجمي (ص: ٧٤)

اِس منہج پر کار بند رہتے ہوئے حضرت زید رضی اللہ عنہ نے نہایت حزم و احتیاط، باریک بینی اور جانچ پڑتال کے ساتھ قرآنِ مجید جمع کیا۔[1]

عہدِ نبوی ﷺ اور عہدِ صدیقی کی کتابت کے مابین فرق:

عہدِ نبوی ﷺ کے مکتوب اور عہدِ صدیقی میں جمع کیے جانے والے میں فرق یہ تھا کہ رسولِ اکرم ﷺ کی زندگی میں قرآن مختلف صحیفوں، تختیوں، کھجور کی شاخوں، صاف شدہ تنوں اور دیگر اشیاء پر الگ الگ محفوظ تھا لیکن سورتوں کی ترتیب سے جمع نہ تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں ہر سورت کو ایک صحیفے یا کئی سورتوں کو ایک صحیفے میں اُس ترتیب کے ساتھ جمع کر دیا گیا جس ترتیب سے انھوں نے رسولِ اکرم ﷺ سے یاد کیا تھا۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ کی یہ ذمہ داری تھی کہ رسولِ اکرم ﷺ کے عہد کے لکھے ہوئے مختلف صحیفوں کو ازسرِ نو مرتّب کر کے آیات کو ترتیبِ توقیفی کے مطابق جمع کر دیں اور یہ کارنامہ انھوں نے سرانجام دے دیا۔[2]

عہدِ عثمان رضی اللہ عنہ میں تدوینِ قرآن:

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس آئے۔ وہ آرمینیا اور آذربائیجان کی فتح میں اہلِ شام اور اہلِ عراق کے ساتھ مل کر جہاد کر رہے تھے۔ قرآنِ مجید کی قراءت کے بارے میں اہلِ شام اور اہلِ عراق کے باہم اختلاف نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کو پریشان کر دیا۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کہا: ''امیر المومنین! اس امت کو سنبھالیے۔ اس سے پہلے کہ یہ کتاب اللہ میں یہود و نصاریٰ کی طرح اختلاف میں پڑ جائے۔'' حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا کو پیغام بھیجا کہ (عہدِ صدیقی والے) مصاحف ہمیں بھیج دیں، انھیں مزید صحیفوں میں نقل کر کے آپ کو واپس کر دیں گے۔ سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا نے وہ مصاحف بھیج دیے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت زید بن ثابت، عبداللہ بن زبیر، سعید بن عاص اور عبدالرحمٰن بن حارث رضی اللہ عنہم کو حکم دیا تو انھوں نے انھیں نقل کر دیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے قریش کے تینوں حضرات کو حکم دیا کہ اگر تمھارا کسی چیز میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے اختلاف ہو جائے تو اُسے قریش کی لغت کے مطابق لکھو کیوں کہ قرآن انہی کی زبان میں نازل ہوا

---

[1] الإنشراح ورفع الضيق بسيرة أبي بكر الصديق للصلابي (ص: ٣٠٦)

[2] المدينة المنورة، فجر الإسلام والعصر الراشدى لمحمد حسن شراب (٢/ ٢٤١)

ہے۔ انھوں نے اسی طرح کیا۔ جب انھوں نے اُن مصاحف کی کئی کاپیاں تیار کرلیں تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مصاحف سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا کو واپس کر دیے اور جو کاپیاں انھوں نے تیار کی تھیں، اُن میں سے ایک ایک کاپی ہر علاقے میں بھیج دی۔ ساتھ ہی حکم دے دیا کہ اس کے علاوہ جتنے صحیفے یا مصحف ہیں انھیں جلا دیا جائے۔[1]

قرآنِ کریم کو جمع کرنے کی وجہ:

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد میں قرآنِ مجید کے مصاحف میں جمع ہونے کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو جمع کرنے کی ضرورت مسلمانوں کے قرآن کی قراءت میں اختلاف کی وجہ سے پیش آئی۔ کتاب اللہ کی قراءت میں یہ اختلاف کسی بہت بڑے فتنے کا باعث بن سکتا تھا کیونکہ قرآن مجید ہی شریعت کی اساس اور دین کا بنیادی ستون ہے۔ امت کی سیاسی، اجتماعی اور اخلاقی وحدت کی اساس بھی یہی آخری آسمانی کتاب ہے۔ اختلافِ قراءت اس حد تک پہنچ گیا کہ لوگ ایک دوسرے سے کہنے لگے: ''میری قراءت تیری قراءت سے بہتر ہے۔''

اسی بات نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کو پریشان کیا۔ وہ گھبرا کر مسلمانوں کے خلیفہ اور امام کی خدمت میں گئے اور ان سے درخواست کی کہ امت میں اختلاف کا زہر پھیلنے سے پہلے ہی اس کا سدِ باب کر دیں اور اس فتنے کو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں، مبادا قرآنِ مجید کی نص متاثر ہو اور اس کی آیات اور کلمات میں تحریف ہو جائے جیسا کہ یہود و نصاریٰ اور دیگر قوموں نے کیا تھا۔

قرآن جمع کرنے کے لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآنِ کریم کو اپنی مرضی سے جمع نہیں کیا بلکہ مہاجرین وانصار کو جمع کیا اور قرآن جمع کرنے کے لیے اُن سے مشورہ کیا۔ ان میں امت کے سر برآوردہ علماء صحابہ رضی اللہ عنہم شامل تھے۔ ان حضرات میں سرِفہرست حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ مشکل اور اہم ترین مسئلہ امت کے ان ہدایت یافتہ احباب اور بہترین رہنمائی کرنے والے برگزیدہ قائدین کے سامنے رکھا۔ ان سے بحث مباحثہ کیا۔ مختلف سوال و جواب ہوئے، یہاں تک کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ان کی رائے معلوم ہوگئی اور انھیں آپ کے موقف کا علم ہوگیا۔

انھوں نے بھرپور اتفاق کرتے ہوئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی رائے کو قبول کیا یہاں تک کہ مومنوں کو

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٩٨٧)

قرآنِ کریم کی صحت وترتیب میں کسی قسم کے شک وشبہ کی ذرہ بھر گنجایش نہ رہی۔ پھر اس اجماع کی خبر ہر طرف پھیل گئی۔ کسی نے اس کی مخالفت نہیں کی نہ کسی نے اس پر کوئی اعتراض کیا۔ قرآنِ کریم کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ امت کے کسی فرد پر مخفی رہے چہ جائیکہ علماء اور مشہور ائمہ پر اس کے جمع وترتیب کا معاملہ مخفی رہتا۔[1]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآن کو ایک مصحف میں جمع کر کے کسی بدعت کا ارتکاب نہیں کیا۔ کیوں کہ آپ سے پہلے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ یہ کام کر چکے تھے۔ انھوں نے یہ کام اپنی مرضی سے نہیں بلکہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے مشورے سے کیا تھا اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے اس کام کو سراہتے ہوئے کہا:

''نِعْمَ مَا رَاَیْتَ!'' ''جی ہاں! آپ کی رائے بہت اچھی ہے۔''

اور انھوں نے یہ بھی کہا: ''قَدْ اَحْسَنَ!'' ''انھوں نے بہت اچھا کام کیا'' یعنی آپ کا قرآن کی نقلیں تیار کرنے والا کام بہت اچھا ہے۔[2]

اگر کوئی شخص اس سلسلے میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر اعتراض کرتا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ اُسے منع کرتے ہوئے فرماتے: ''اے لوگو! حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں حد سے نہ بڑھو۔ ان کے بارے میں کلمۂ خیر ہی کہو۔ اللہ کی قسم! انھوں نے قرآن جمع کرنے کے لیے جو کچھ کیا ہے وہ سب کچھ ہم صحابہ کی ایک بہت بڑی جماعت کے مشورے سے ہی کیا ہے۔ اللہ کی قسم! اگر یہ ذمہ داری مجھ پر ڈالی جاتی تو میں بھی انہی کی طرح عمل کرتا۔''[3]

اللہ کی ان برگزیدہ اور صاحبِ فضل وکمال ہستیوں کے اس مبارک امر پر اتفاق کے بعد ہر اس شخص پر جو خواہشاتِ نفس کا پجاری نہیں ہے خوب واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قرآنِ مجید کی حفاظت کے لیے کیے گئے اس کام کو برضاء ورغبت تسلیم کرنا نہایت ضروری ہے۔[4]

مختلف شہروں میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ارسال کردہ صحیفوں کی تعداد:

جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مصحف کی نقلیں تیار کرانے کے بعد فارغ ہوئے تو آپ نے ہر علاقے میں ایک ایک نسخہ بھیج دیا اور متعلقہ حکّام کو حکم دیا کہ جو مصحف میرے اس بھیجے ہوئے مصحف کے موافق نہ ہو

[1] عثمان بن عفان لصادق عرجون (ص: ١٧٥)

[2] فتنة مقتل عثمان بن عفان للدكتور محمد عبد الله الغبان (١/ ٧٨)

[3] فتح الباري (٩/ ١٨) وسنده صحيح.

[4] فتنة مقتل عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ للدكتور محمد عبد الله الغبان (١/ ٧٨)

اُسے جلا دیا جائے۔ ان میں سے ایک نسخہ آپ نے اپنے لیے رکھ لیا۔ اور آپ اسی مصحف کی تلاوت کیا کرتے تھے اور اُسی کے اوراق کے سامنے آپ کو شہید کر دیا گیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے لوگوں کی راہنمائی کے لیے ہر مصحف کے ساتھ ایک قاری بھی روانہ کیا تاکہ وہ رسمِ عثمانی والے نسخے میں مذکور صحیح اور متواتر قراءتوں سے لوگوں کو آگاہ کردے۔ اہلِ مکہ کی طرف مصحف کے ساتھ حضرت عبداللہ بن سائب رضی اللہ عنہ روانہ کیے گئے۔ اہلِ شام کی طرف حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ بھیجے گئے اور کوفہ کی جانب حضرت ابو عبد الرحمٰن سُلَمی رضی اللہ عنہ مصحف لے کر گئے۔ اہلِ بصرہ کو مصحف کی تعلیم دینے کے لیے حضرت عامر بن قیس رضی اللہ عنہ گئے۔ اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو حکم ملا کہ وہ مدینہ میں مصحف کی تعلیم دیں۔[1]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت کا انتظامی ڈھانچہ اور مملکتِ اسلامیہ کے صوبے اور ان کے گورنر

مکہ مکرمہ:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فوت ہوئے تو ان دنوں حضرت خالد بن عاص بن ہشام بن مغیرہ مخزومی رضی اللہ عنہ مکہ کے گورنر تھے۔[2] حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کچھ وقت کے لیے، جس کی تحدید مشکل ہے، انھیں برقرار رکھا۔ پھر معزول کر دیا۔ بعض مؤرخین نے پورے وثوق سے لکھا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے وقت حضرت خالد بن عاص رضی اللہ عنہ ہی مکہ کے گورنر تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے منصبِ خلافت پر فائز ہونے کے بعد انھیں معزول کر دیا۔[2]

مدینہ منورہ:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں مدینہ منورہ نہایت اہم اسلامی شہروں میں شمار ہوتا تھا۔ یہی دار الخلافہ تھا۔ مختلف شہروں سے یہیں وفود آتے تھے۔ یہیں اسلامی لشکروں کا آنا جانا رہتا تھا، نیز بہت سے کبار مہاجرین و انصار صحابہ رضی اللہ عنہم بھی یہیں مقیم تھے۔ اس لیے مدینہ منورہ کو زبردست اہمیت حاصل تھی۔ حضرت

[1] أضواء البيان في تاريخ القرآن لأبي سليمان رحمه الله (ص: ٧٧: ٦٨)

[2] تجريد أسماء الصحابة لشمس الدين الذهبي (ص: ١٥١)

[3] الولاية على البلدان للدكتور عبد العزيز العمري (١/ ١٦٦)

عثمان رضی اللہ عنہ بھی یہیں رہ کر خلافت کے فرائض سرانجام دیتے تھے۔ آپ مدینہ کی صورتِ حال سے ہر آن آگاہ رہتے تھے یہاں تک کہ غذائی اجناس کے بھاؤ اور لوگوں کے حالات کی بھی پوری خبر رکھتے تھے۔[1]

مدینہ منورہ میں بھی دوسرے شہروں کی طرح بیت المال اور عطیات کا دفتر قائم تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے آخری ایامِ خلافت میں جب فتنہ بر پا ہوا، خارجیوں نے آپ رضی اللہ عنہ کا محاصرہ کر لیا اور کبار صحابہ رضی اللہ عنہم مدینہ منورہ سے چلے گئے، اُن ایام کے علاوہ عصرِ عثمانی میں مدینہ منورہ تمام اسلامی شہروں سے زیادہ پُر امن تھا۔[2]

بحرین اور یمامہ:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے وقت حضرت عثمان بن ابی العاص ثقفی رضی اللہ عنہ بحرین کے گورنر تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت تک بحرین کے داخلی حالات معمول پر رہے۔ جہاں تک یمامہ کا تعلق ہے، وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں بحرین اور بڑی حد تک عمان ان کے ماتحت تھا بلکہ بحرین کا گورنر ہی بعض اوقات وہاں عامل مقرر کرتا تھا۔ جہاں تک حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دَورِ خلافت کا تعلّق ہے تو تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یمامہ پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہی کی طرف سے براہِ راست والی (عامل) مقرر تھا۔

شام:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے زمامِ خلافت سنبھالی تو شام کے اکثر حصے کے گورنر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انھیں ان کے عہدے پر برقرار رکھا۔[3] آپ نے مصر، یمن اور بحرین وغیرہ کے گورنروں کو بھی اُن کے عہدوں پر بحال رکھا۔ حالات کے تغیّر و تبدّل کے ساتھ ساتھ دیگر کئی علاقے بھی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ماتحت آ گئے۔ اور وہ بلا شرکتِ غیرے پورے شام کے گورنر بن گئے بلکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مضبوط اور مؤثر ترین گورنر شمار ہونے لگے۔[4]

---

[1] تاریخ المدینة لابن شبه (٣/ ٩٦١- ٩٦٢)

[2] الولایة علی البلدان للدکتور عبد العزیز العمري (١/ ١٦٨- ١٦٩)

[3] تاریخ خلیفة بن خیاط (ص: ١٥٥)

[4] تاریخ الطبري (٥/ ٤٤٣)

آرمینیا:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں پہلی بار اسلامی لشکروں نے آرمینیا کارخ کیا۔ سب سے پہلے بلادِ شام کی اسلامی فوج نے ان خطوں کی طرف پیش قدمی کی۔ شام تمام اسلامی ریاستوں کے مقابلے میں آرمینیا کے قریب تر تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کوفہ سے تقریباً چھے ہزار کا لشکر، جس کی قیادت حضرت سلمان بن ربیعہ باہلی رضی اللہ عنہ کر رہے تھے، روانہ کرنے کا حکم دیا۔[1] تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت سلمان بن ربیعہ باہلی رضی اللہ عنہ نے اسلامی لشکروں کی قیادت سنبھالی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انھیں آرمینیا کا امیر مقرر کیا۔[2]

مصر:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں مصر کے گورنر حضرت عَمر و بن عاص رضی اللہ عنہ تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وفات کے وقت انھیں اس عہدے پر کام کرتے ہوئے تقریباً چار سال گزر چکے تھے۔

بصرہ:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے وقت ان کی طرف سے بصرہ کے گورنر حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ تھے۔ ان دنوں بصرہ سب سے بڑی اسلامی فوجی چھاؤنی بن چکا تھا۔ کئی قبائل ہجرت کر کے بصرہ میں آباد ہو چکے تھے۔ بصرہ کی فوج نے بہت سے علاقے فتح کیے تھے۔ اس لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے بعد آنے والے خلیفہ کو وصیت کی کہ میری وفات کے بعد چار سال بعد تک حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو بصرہ کی امارت سے معزول نہ کیا جائے۔ بصرہ پر حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی امارت کا دَور جہاد کا دور ہے۔ اس میں اہلِ بصرہ کا کردار واضح ہوا۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ ایران کے کئی شہروں کے فاتح کی حیثیت سے معروف ہوئے۔

جہادی کارناموں کے ساتھ ساتھ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے عہدِ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ میں فلاحِ عامہ کے لیے بھی بڑی خدمات سرانجام دیں۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ زیادہ لمبی مدت تک بصرہ کے گورنر نہیں رہے بلکہ جلد ہی (۲۹ھ) میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انھیں ان کے عہدے سے سبکدوش کردیا، جیسا کہ اکثر تاریخی روایات میں ہے۔ اُن کی جگہ حضرت عبداللہ بن عامر بن کریز رضی اللہ عنہ کو بصرہ کا گورنر مقرر کیا گیا۔[3]

---

[1] الطبقات لابن سعد (٦/ ١٣١)

[2] الفتوح لابن اعثم (٢/ ١١٢)

[3] تاریخ الطبري (٥/ ٢٦٤)

حضرت ابن عامر رضی اللہ عنہ نے گورنر کا عہدہ سنبھالنے کے فوراً بعد فتوحات کی منصوبہ بندی اور تگ ودَو شروع کردی تھی۔ بصرہ حضرت ابن عامر رضی اللہ عنہ کے زمانۂ گورنری میں اسلامی ریاستوں میں زبردست اہمیت حاصل کر گیا۔ اسی ترقی کی بنا پر امیر المومنین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خاص توجہ حاصل کر لی اور وہ ایسا انتظامی مرکز بن گیا جس کی طرف ہر وقت نظریں لگی رہتی تھیں۔[1]

حضرت ابن عامر رضی اللہ عنہ کے دورِ گورنری میں ان کی ریاست کے ماتحت علاقے اطرافِ فارس میں بطورِ کرنسی درہم جاری کیے گئے۔ ان پر عربی الفاظ کندہ تھے۔ یہ درہم (۳۰ سے ۳۵ ھ) تک کارآمد رہے۔[2]

کوفہ:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مسندِ خلافت پر بیٹھے تو اُس وقت حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کوفہ کے گورنر تھے۔ انھیں یہ عہدہ سنبھالے ابھی تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انھیں معزول کر دیا۔ اور ان کی جگہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو کوفہ کا گورنر مقرر کیا۔[3]

ان کی معزولی کا سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خلافت کے آخری ایام میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو معزول کیا۔ اور ان کے بارے میں فرمایا: ''میں نے انھیں ان کی کسی برائی یا خیانت کے وجہ سے معزول نہیں کیا۔ میں اپنے سے بعد والے خلیفہ کو وصیت کرتا ہوں کہ وہ انھیں کسی علاقے کا عامل مقرر کریں۔''[4]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ اپنے زمانۂ گورنری میں کوفہ کے ماتحت کئی سرحدوں، مثلاً: رَے وغیرہ میں قیام پذیر رہے اور (۲۵ ھ) میں وہاں کا نظم ونسق مستحکم کر دیا۔[5]

گورنروں کے بارے میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی پالیسی:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ۲۴ ہجری میں خلیفہ مقرر ہوئے۔ مملکتِ اسلامیہ کے اطراف و اکناف میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مقرر کردہ گورنر پھیلے ہوئے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انھیں ایک سال تک برقرار رکھا۔

---

[1] الولاية على البلدان للدكتور عبد العزيز العمري (١/ ١٨٩)
[2] الدراهم الإسلامية لوداد على القزاز (ص: ١٤)
[3] تاريخ الطبري (٥/ ٢٣٩)
[4] تاريخ الطبري (٥/ ٢٣٩)
[5] الولاية على البلدان للدكتور عبد العزيز العمريي (١/ ١٩٧)

ایک سال بعد انھوں نے ملکی ضرورت اور عوام الناس کی مصلحت کی خاطر پرانے گورنروں کی جگہ نئے گورنر مقرر کیے۔ اس بارے میں شاید حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وصیّت پر عمل کیا۔ انھوں نے وصیت کی تھی کہ میرے بعد آنے والا خلیفہ میرے مقرر کردہ گورنروں کو ایک سال سے زیادہ برقرار نہ رکھے، ہاں! حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو چار سال تک ان کے عہدے پر بحال رکھا جائے۔[1]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی گورنروں کے بارے میں پالیسی یہ تھی کہ وہ انھیں تبدیل کرنے کے لیے اکثر و بیشتر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ کرتے تھے۔

حکّام کی نگرانی:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے حکّام اور سپہ سالاروں کی نگرانی اور ان کی صورتِ حال سے آگاہ رہنے کے لیے کئی طریقے اختیار کیے۔ مثلاً:

- **حج کے لیے جانا:** حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بذاتِ خود حج کے لیے تشریف لے جاتے تھے اور مختلف علاقوں سے آئے ہوئے حُجّاجِ کرام سے ملتے تھے۔ اُن کی گورنروں کے متعلق شکایات سنتے اور ان کی زیادتیوں کے متعلق دریافت کرتے تھے۔
- **اسی طرح مختلف شہروں سے آنے والوں سے پوچھ گچھ کرنا:** حکّام سے متعلق معلومات کا یہ آسان ترین طریقہ تھا۔
- لوگوں کی شکایات پر گورنروں کے نام خطوط ارسال کرنا۔
- تحقیقات کے لیے مختلف علاقوں میں ٹیموں کو روانہ کیا کرتے تھے۔
- اور براہِ راست لوگوں سے ملاقات کرنا اور ان سے معلومات لینا۔
- **گورنروں کی دار الخلافہ طلبی:** یوں مختلف معاملات پر تبادلۂ خیال کرنے کے لیے خلیفہ اور گورنروں کے مابین مسلسل رابطہ رہتا تھا۔
- **گورنروں سے خط و کتابت کرنا:** یہ بھی قریبی ربط و ضبط کا طریقہ ہے۔
- **گورنروں کی تنخواہ:** حکّام کا حق ہے کہ انھیں گزر بسر کے لیے (بیت المال سے) مشاہرہ دیا جائے۔ یہ خلفائے راشدین کے مابین متفق علیہ مسئلہ تھا جس میں وہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ مبارک کی پیروی کیا کرتے تھے۔

---

[1] سيرة أعلام النبلاء (٢/ ٣٩١)

حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہما حکّام کی تنخواہوں کے معاملے میں شیخین ہی کے نقشِ قدم پر چلتے تھے، ہاں! حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دَور میں مشرق، آرمینیا اور افریقہ کی فتوحات کی وجہ سے آمدنی بڑھنے پر عوام الناس کے عطیات اور حکّام کے وظائف میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوا۔

گورنروں کے فرائض:

دینی نفاذ کے بارے میں چند باتیں۔

- **دینِ اسلام کی نشر و اشاعت:** خلفائے راشدین کے دور میں فتوحات کی کثرت کی وجہ سے گورنر اور حکّام اس بات کے پابند تھے کہ وہ نئے مفتوحہ علاقوں میں موجود صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی معاونت سے اسلام کی نشر و اشاعت کا فریضہ انجام دیں۔ کیونکہ حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کے دور میں اسلامی فتوحات کا دائرہ وسیع ہو گیا تھا نئے شہر آباد ہوئے تھے اور آبادیاں بڑھ گئی تھیں، حصولِ علم کے خواہشمند زیادہ ہو گئے تھے۔ اس کے لیے فقہاء اور معلّمین کی ضرورت میں اضافہ ہو گیا جن کا تقرّر کیا جاتا۔
- نظامِ صلوٰۃ کا قیام اور امامت کی ذمہ داری بھی گورنر ہی نبھاتے تھے۔
- اِسی طرح دین اور شریعت کے اصولوں کی حفاظت کرنا۔
- اور مساجد کی تعمیر اور لائحۂ عمل کی ذمہ داری۔
- حُجّاجِ کرام کے لیے سہولتیں اور ان کے لیے امیر کا مقرر کرنا۔
- **شرعی حدود کا قیام:** اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی مخالفت کرنے والواں پر حد قائم کرنا حکّام کا دینی فریضہ ہے۔ اور یہ ان کی ذمہ داریوں میں سے ایک اہم ترین ذمہ داری ہے۔
- **امن و امان کا قیام:** امن و امان قائم کرنا بھی ان کے فرائض میں سے تھا۔
- **جہاد فی سبیل اللہ:** خلفائے راشدین کے دور میں عموماً یہی طریقہ رائج تھا کہ گورنر ہی اپنے ماتحت شہروں کی جہادی مہموں کی قیادت کیا کرتا تھا۔
- **رضا کاروں کو میدانِ جہاد میں بھیجنا:** حضرت ابوبکر و عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے ادوارِ خلافت میں یمن، بحرین، مکہ اور عُمان وغیرہ کے گورنر لوگوں کو جہاد کے لیے بھیجتے تھے۔
- **شہروں کا تحفّظ:** حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ساحلِ سمندر کو تحفّظ فراہم کرنے اور ساحلوں کو آباد کرنے کا حکم دیتے تھے۔

- **دشمن کی جاسوسی:** مسلمان گورنر دشمن کی جاسوسی کا بھی معقول انتظام کرتے تھے، اور گاہے گاہے ان پر کاری ضربیں لگاتے رہتے تھے۔
- **جہادی گھوڑوں کی فراہمی:** جہاد میں گھوڑوں کی بڑی اہمیت ہے۔ مسلمانوں نے گھوڑے پالنے اور ان کی تربیت کرنے کا اہتمام رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک زندگی ہی میں شروع کر دیا تھا۔ وہ اس پر خاص توجہ دیتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مختلف اسلامی شہروں میں حسبِ ضرورت جہاد کے لیے گھوڑے پالنے اور ان کی تربیت کرنے کی پالیسی وضع کی۔[1]
- **بچوں کی تعلیم اور جہادی مشق:** خلفائے راشدین نے اپنے بچوں کی اخلاقی اور جہادی تربیت کا خاص اہتمام کیا تاکہ وہ بڑے ہو کر اچھے مجاہد اور معاشرے کے مفید افراد ثابت ہوں۔
- **فوج کا ریکارڈ:** فوج کا باقاعدہ ریکارڈ تیار کرنے، مجاہدین کی تعداد اور اُن سے متعلقہ ضروری کوائف کے اندراج کا آغاز حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانۂ خلافت میں کیا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اس پالیسی کو نہ صرف جاری رکھا بلکہ اسے ترقی بھی دی۔ انھوں نے (مرکز کے علاوہ) دیگر شہروں کے دیوان خاص طور پر تیار کرائے، ان کے نزدیک یہ کام بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ خصوصاً وہ شہر جو دشمنوں کی سرحدوں کے قریب تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ وہاں کے حالات پر گہری نظر رکھتے تھے۔ ان شہروں میں ہر وقت فوج کی ضرورت رہتی تھی۔
- **معاہدوں کا نفاذ:** خلفائے راشدین کے عہد میں فتوحات کا دائرہ وسیع ہونے کے ساتھ ساتھ دشمن کے ساتھ خط و کتابت، معاہدوں اور عہد و پیمان کا سلسلہ بھی بڑھ گیا۔ جنھیں وہ نافذ بھی کرواتے تھے۔
- **لوگوں کو معاشی تحفّظ فراہم کرنے کے اقدامات:** خلفائے راشدین نے اوائلِ خلافت ہی سے بیت المال کے مختلف ذرائع آمدنی میں سے مسلمانوں میں عطیات تقسیم کرنے کے جدید طریقے اختیار کیے۔ شروع میں یہ عطیات بغیر کسی وقتِ معینہ کے دیے جاتے تھے۔ یعنی جب بھی کوئی ضرورت مند آتا تھا اُس کی ضرورت پوری کر دی جاتی تھی۔ چنانچہ جب مختلف شہروں کے دیوان (رجسٹر) تیار ہو گئے تو پھر عطیات کے نظام میں قدرے تبدیلی آئی اور انھیں منظّم طریقے سے سالانہ یا ماہانہ بنیادوں پر تقسیم کیا جانے لگا۔

---

[1] الولاية على البلدان للدكتور عبد العزيز العمري (٢/ ٧٢)

❀ **عُمال اور جملہ ملازمین کا تقرّر:** ریاست کے تابع علاقوں میں مختلف ذمہ داریوں کے لیے اکثر اوقات ملازمین اور عُمال کا تقرر بھی گورنر ہی کی ذمہ داری ہوتی تھی۔ اس طرح کہ ریاست بہت سے شہروں اور اضلاع پر مشتمل ہوتی تھی اور ایک مرکزی شہر ریاست کا صدر مقام ہوتا تھا، جہاں گورنر قیام پذیر ہوتا اور اُسی شہر سے ماتحت شہروں اور اضلاع کے انتظامات کنٹرول کیے جاتے تھے۔ لہٰذا عُمال کا تقرّر اور ان کے نظم ونسق کو کنٹرول کرنا بھی گورنروں کی اہم ترین ذمہ داریوں میں شامل ہونے لگا۔

❀ **ذِمیوں کا خیال رکھنا:** ان کے شرعی حقوق ادا کرنا یعنی مسلمانوں کے ذمے ان کے حقوق پورے کرنا اور ان کی خبر گیری کرنا بھی گورنر کی ذمہ داری ہوتی تھی۔

❀ ریاست کے بارے میں اہلِ حل وعقد سے مشورہ کرنا۔

❀ ریاست کی تعمیراتی ضرورتوں کا خیال رکھنا۔

❀ **شہریوں کے معاشرتی احوال کی دیکھ بھال:** اسلام کی ہمہ گیر اور وسیع تر تعلیمات کے ضابطے اور قانون کے پیشِ نظر اور خلفائے راشدین کی طرف سے توجہ دلانے کے باعث گورنر اس جانب خصوصی توجہ دیتے تھے۔ چنانچہ ان میں سے بعض نے ایسے معاشرتی کارنامے سرانجام دیے جو ان کے منصب پر فائز کوئی دوسرا شخص انجام نہیں دے سکتا تھا۔ اسی طرح خلفائے راشدین انھیں ترغیب دیتے تھے کہ وہ لوگوں سے ان کے مقام و مرتبے کے مطابق میل جول رکھیں اور اہلِ شرف اور سابقین فی الاسلام لوگوں کا خاص طور پر احترام کریں۔ اِسی ضمن میں ایک موقع پر کوفہ کے گورنر نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے شکوہ کرتے ہوئے لکھا کہ جن لوگوں نے اسلام کے لیے قربانیاں دی ہیں اور وہ اہلِ شرف سابقین فی الاسلام ہیں، اُن پر اعرابی اور متاخرین فی الاسلام غالب آ گئے ہیں۔[1]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گورنر:

اکثر مؤرخین کہتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اپنے اعزاء واقرباء کی طرف داری کیا کرتے تھے اور وہی اُن کے عہدِ حکومت میں کلیدی عہدوں پر فائز تھے حتیٰ کہ وہی لوگ دوسروں کو آپ کے خلاف صف آراء کرنے کا باعث بنے۔ اور لوگوں نے ان کی زیادتیوں اور مملکت میں بے جا تصرّفات کو روکنے کے

[1] الولاية على البلدان للدكتور عبد العزيز العمري (٢/ ٨٢) تاريخ الطبري (٥/ ٢٨٠)

لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف ہنگامہ آرائی کی۔[1]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے جن اقارب کو سرکاری عہدوں پر فائز کیا، ان کے نام یہ ہیں:

1. حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما
2. حضرت عبداللہ بن سعد بن ابی سرح رضی اللہ عنہ
3. حضرت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ
4. حضرت سعید بن العاص رضی اللہ عنہ
5. حضرت عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ

اپنے اقرباء میں سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان مذکورہ بالا پانچ افراد کو سرکاری عہدے دیئے جبکہ ان کے دورِ خلافت میں گورنروں کی مجموعی تعداد چھبیس (۲۶) بنتی ہے۔ کیا اتنے گورنروں کی فہرست میں بنی امیہ کے صرف پانچ افراد کی شمولیت بھی غلط بات ہے؟ بالخصوص جب کہ ہمیں اس بات کا بھی بخوبی علم ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دوسروں کی نسبت زیادہ تر بنو امیہ کے افراد کو سرکاری عہدوں پر فائز کیا کرتے تھے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کسی ایسے شخص یا قبیلے کو عہدے نہیں دیے جنھیں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ دیئے ہوں۔ لہٰذا انھوں نے اپنے جن عزیزوں کو گورنر مقرر کیا وہ واقعی اس عہدے کے اہل تھے، اور سلطنت کے امور چلانے کی بھرپور صلاحیت رکھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کے ہاتھوں کئی شہر فتح کرائے اور وہ رعایا کے ساتھ عدل و احسان کے ساتھ رہے۔ ان میں سے کئی تو وہ تھے جو اس سے قبل حضرت صدیق و فاروق رضی اللہ عنہما کے دور میں بھی گورنر رہ چکے تھے۔[2]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں شہروں کے گورنر احکامِ شرعی سے بے خبر نہیں تھے نہ وہ دینی امور میں کوتاہی کرنے والے تھے۔ اگر اُن کے گناہ تھے تو ان کی نیکیاں بھی بہت زیادہ تھیں، باوجود اس کے کہ ان کی نیکیوں اور گناہوں کا تعلق خود ان کی ذات سے ہے، مسلم معاشرے پر اس کا کوئی اثر نہیں تھا۔ ان سے اسلام اور مسلمانوں کو بہت فائدہ ہوا۔ لاکھوں لوگ اُن کی کاوشوں سے دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے

---

[1] الدولة الاموية المفتریٰ علیها للدكتور حمیدی شاهین (ص: ۱۵۹)

[2] تحقيق مواقف الصحابة من الفتنة للدكتور محمد المحزون (۱/ ٤١٧)

اور ان کی فتوحات کے نتیجے میں مملکتِ اسلامیہ کی سرحدیں دور دور تک پھیل گئیں اور بہت سے نئے علاقے مملکتِ اسلامیہ کا حصہ بنے۔

اگر اُن میں دینداری اور بہادری نہ ہوتی تو وہ دشمن سے جہاد نہ کرتے اور جان جوکھوں میں ڈال کر خود میدانِ کارزار میں مجاہدوں کی قیادت کرتے نظر نہ آتے، میدانِ جہاد میں مال و متاع اور سکون وراحت کی قربانی لازمی بات ہے۔ جس نے بھی ان گورنروں کی سیرت کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا اسے یہی معلوم ہوگا کہ ان میں سے ہر ایک نہایت اعلیٰ صفات و کردار اور عمدہ صلاحیتوں کا مالک تھا اور اس نے اپنی ریاست میں فتوحات کا دائرہ وسیع کیا۔[1]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے لکھا تھا: ''سابقون اوّلون جن کے ہاتھوں اللہ تعالیٰ نے اُن شہروں کو فتح کرایا، انھیں فضیلت دو اور جنھیں ان کے سبب شرف وعزت نصیب ہوئی، انھیں ان کے تابع رکھو۔ ہاں اگر قدیم الاسلام لوگ دینی احکام کی بجا آوری میں سستی کا مظاہرہ کریں اور نئے اسلام لانے والے اسلام پر زیادہ مستعدی سے عامل ہوں تو پھر اور بات ہے۔ لوگوں کی حفاظت کرو، سب کے مقام ومرتبے کو پہچانو۔ ہر ایک کو اس قدر دو جتنا وہ حق (اسلام) کا پیرو ہے۔ اس معیار سے لوگوں کو پہچاننا حصولِ عدل کے زیادہ قریب ہے۔''[2]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کا زمانہ بارہ سال کے عرصہ پر محیط ہے۔ اس دوران اسلام دور دور تک پھیل گیا۔ تاریخ کے ان حقائق کو پڑھ کر انسان حیران رہ جاتا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں مسلمانوں نے کس قدر کامیابیاں حاصل کیں۔ چاروں طرف اسلامی حکومت پھیلتی چلی گئی۔ کہاں ہندوستان کا گجرات، کہاں خراسان، طبرستان، سوات، کابل، نیشاپور، تونس، الجزائر، مراکش حتیٰ کہ اندلس (سپین) کے دروازوں پر اسلامی لشکر نے دستک دی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بے پناہ سیاسی بصیرت کا اندازہ اِس بات سے بھی کرلیں کہ اُن کے دور میں تہذیب و تمدن، صنعت و حرفت، تجارت اور علوم وفنون کو بے حد ترقی ہوئی۔ دولت وثروت کا دَور دورہ ہوگیا۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے مدینہ طیبہ کے گردونواح میں خوبصورت مکانات تعمیر کیے۔ تجارت کو فروغ

---

1. المدينة المنورة لمحمد حسن شُراب (٢/ ٢١١)
2. الولاية على البلدان للدكتور عبد العزيز العمرى (٢/ ٨٢)

دینے کے لیے پرانے بازاروں کے ساتھ ساتھ نئے بازار قائم کیئے گئے۔ قریش کے سرکردہ افراد حجاز سے نکل کر دور دور تک پہنچ گئے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے کارناموں میں سے ایک عظیم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے امتِ مسلمہ کو ایک ایسا تحفہ دیا جو رہتی دنیا تک سب کے کام آتا رہے گا۔ وہ یہ کہ انھوں نے عالمِ اسلام کو ایک ہی مصحف اور قراءت پر اکٹھا کیا۔ قرآنِ مجید کے نسخے لکھوا کر دنیا کے مختلف علاقوں میں بھجوائے۔[1] آج ہم جس قرآنِ کریم کی تلاوت کرتے ہیں یہ مصحفِ عثمانی ہے۔ اسی لیے اُن کو ''جامع القرآن'' کا لقب دیا گیا۔

اسباب ومحرّکاتِ شہادتِ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ:

شہادتِ عثمان رضی اللہ عنہ کے سانحہ اور اس کے نتیجہ میں پیش آنے والے حادثات کی تحقیق کی اہمیت اسی وقت ظاہر ہوسکتی ہے جب اس فتنے اور سانحہ کے حقیقی اسباب اور محرّکات کا علم ہو۔ قطع نظر اس کے کہ وہ اسباب داخلی ہوں یا خارجی، پھر ان اسباب میں سے کسی سبب کا ان حادثات میں کتنا عمل دخل ہے، اس کی پہچان بھی ضروری ہے۔ اور یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ کیا اس راستے میں ایسے اسباب بھی ہیں جنھیں کالعدم قرار دیا جاسکے؟ جو شخص ان فتنوں کے متعلق لکھے ہوئے مواد کے کچھ حصے کو پڑھ لے تو وہ ازخود محسوس کرے گا کہ اس کے لیے باقاعدہ منصوبہ بندی کی گئی ہے اور مجوسیوں، عیسائیوں، یہودیوں اور منافقین نے اسے عملی جامہ پہنانے میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ مسلمان ہمیشہ دشمنوں کی سازشوں کا سامنا کرتے رہے ہیں۔[2]

یہ سازشیں اس وقت تک کامیاب نہیں ہوتیں جب تک داخلی طور پر ایسے کمزور عوامل موجود نہ ہوں جو اُن سازشوں کو کامیاب کریں۔ کیا امتِ مسلمہ کے ضُعف کے اسباب جاننے اور جن پوشیدہ عوامل کی وجہ سے امت کی یہ صورتِ حال ہوئی، انھیں معلوم کرنے اور ان کی نشاندہی کرنے کے لیے عہدِ صحابہ اور عصرِ حاضر کا مطالعہ کرنا دوسرے فرائض کی طرح فرضِ لازم کی حیثیت نہیں رکھتا؟ تاکہ امت کی اصلاح ہو اور وہ آیندہ ایسی ہلاکتوں سے محفوظ رہے؟ کیا اس امت کے حق میں یہ لکھ دیا گیا ہے کہ یہ ہمیشہ اندرونی خلفشار اور بیرونی مکر وفریب کے بوجھ تلے دبی رہے؟[3]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٩٨٧)

[2] احداث واحاديث فتنة الهرج للدكتور عبد العزيز دخان (ص: ٨٣)

[3] احداث و احاديث فتنة الهرج للدكتورعبد العزيز دخان (ص: ٨٥)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے ہولناک حادثات کی نہایت گہرائی اور غور وفکر کے ساتھ تحقیق کی ضرورت ہے تا کہ ہم اس تاریخی دور سے مواعظ اور عبرتوں کا استخراج کر کے عصرِ حاضر میں انھیں مشعلِ راہ بنائیں اور منہج نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق خلافت کے قیام کے لیے کی جانے والی کوششوں میں ان سے راہنمائی لیں تا کہ انسانیت دوبارہ اللہ کے دین اور شریعت کی برکتوں سے مالا مال ہوکر سعادت کے راستے پر گامزن ہوسکے۔ اور شریعتِ اسلامیہ سے دوری کی وجہ سے انسانیت جس بدنصیبی، ہلاکت اور تنگی کے گرداب میں پھنسی ہوئی ہے اس سے چھٹکارا پا سکے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فتنوں سے آگاہ فرما دیا تھا:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سی احادیث میں اس بات کی خبر دی ہے کہ یہ امت باہم اختلاف کرے گی اور ان کے مابین جنگ وقتال بھی ہوگا۔ متعدد احادیث میں اس کا اجمالی طور پر یا تفصیلی ذکر بھی موجود ہے۔ اس کے لیے مختلف انداز اختیار کیے گئے ہیں۔ کبھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتنوں کے اسباب بیان فرمادیئے، کبھی نتائج کا تذکرہ کردیا، کبھی بعض حادثات اور واقعات کی طرف اشارہ کر دیا اور کبھی فتنہ برپا کرنے والوں کا ذکر کردیا۔ اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور بھی کئی طریقوں سے ان کی نشاندہی کی۔ اس میں سے بہت سا حصہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے ان سوالوں کے جواب کی صورت میں ہے جو وہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اخوت، بھائی چارے اور اتحاد کی اس نعمتِ عظمیٰ سے، جو اللہ تعالیٰ نے انھیں عطا کی تھی، فیض یاب ہو رہے تھے۔ وہ پوچھتے رہتے تھے کہ اتحاد کی یہ نعمت دائمی ہے یا زائل ہوجائے گی۔ کیونکہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کے ذریعے سے معلوم تھا کہ یہ نعمت ہمیشہ اسی طرح نہیں رہے گی، اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی ایسی تربیت فرماتے رہتے تھے کہ وہ ان مشکلات اور فتنوں کے لیے تیار رہیں تا کہ جب اللہ تعالیٰ کی مشیّت سے یہ فتنے رونما ہوں تو وہ اچھے طرزِ عمل کا مظاہرہ کریں اور انھیں فوری طور پر حل کرنے کی کوشش کریں۔[1]

اس موضوع کی جملہ روایات پر غور کیا جائے تو درجِ ذیل حکمتیں سامنے آتی ہیں:

- نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان فتنوں کا ذکر امت کی تربیت کے نقطۂ نظر سے فرمایا تا کہ امت کو قبل از وقت ان کی اطلاع ہو اور وہ ذہنی طور پر ان مسائل سے نپٹنے کے لیے تیار رہے تا کہ فتنوں کے وقوع کے

[1] احداث واحادیث فتنة الهرج للدکتور عبد العزیز دخان (ص: ۸۶)

وقت مسلمانوں کا طرزِ عمل صحیح ہو اور وہ اُنھیں ختم کرنے کی کوشش کر سکیں۔

- ان احادیث میں سے کچھ ایسی بھی ہیں جن میں فتنہ پر دازوں کی طرف اشارہ ہے کہ وہ کون لوگ ہوں گے۔ آپ ﷺ نے نشاندہی کر دی کہ بسا اوقات فتنہ بر پا کرنے والے لوگ ظاہری طور پر بڑے متشدّد ایمان دار ہوں گے لیکن ان کی عقلیں منحرف ہوں گی، اور ان کے دل ٹیڑھے ہوں گے، اور وہ مجموعی طور پر ادراک سے عاجز اور سوجھ بوجھ سے خالی ہوں گے۔
- ان احادیث میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ یہ فتنے منافقین کو بے نقاب کر دیں گے، اور مومنوں کے دلوں کے لیے پالش کا کام دیں گے۔ مومنوں کا ایمان بڑھے گا اور وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے آمادہ ہوں گے۔ یہ ایک طرح کی آزمایش ہوگی جس کے ذریعے سے ان کے دل چمکیں گے اور وہ مجاہدے کے عادی ہوں گے۔ خیر کو پہچان کر اس کا دوسروں کو بھی حکم دیں گے اور شرّ کی پہچان کر کے لوگوں کو بھی اس سے باز رکھیں گے۔[1]
- ان فتنوں سے آگاہ کرنے کا ایک مقصد انتباہ اور ڈراوا بھی ہے۔ وہ اس طرح کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم یا دیگر مسلمان جب آپ ﷺ کی فتنوں کے بارے میں یہ پیش گوئیاں سنیں گے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''میری امت کے کچھ لوگوں سے قتل سرزد ہوگا۔'' اور ''میری امت کے کچھ لوگ دنیا میں الجھ جائیں گے۔'' اور ''میری امت کے کچھ لوگ جہاد کرنا چھوڑ دیں گے۔'' وغیرہ وغیرہ ..تو وہ ہر وقت ہوشیار رہیں گے اور ان فتنوں کو ذہن نشین رکھتے ہوئے ہر شخص ان سے بچنے کی کوشش کرے گا اور ہر وقت خوف زدہ رہے گا کہ کہیں غفلت میں وہ ان ہلاکتوں میں نہ پڑ جائے کیوں کہ اس باب میں ڈرتے رہنا ہی نجات کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔[2]

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ امتِ مسلمہ کے جھگڑوں اور اختلافات کے وقوع پذیر ہونے کی بابت متعدد مرفوع احادیث ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں: ''ایسی احادیث رسولِ اکرم ﷺ سے کئی طُرق سے محفوظ ہیں جن میں آپ ﷺ نے اشارہ کیا ہے کہ یہ امت لازمی طور پر گروہ بندیوں اور اختلاف وانتشار کا شکار ہو گی۔ رسول اللہ ﷺ اپنی امت کو اس سے ڈراتے رہے تاکہ جس کے مقدّر میں اللہ تعالیٰ نے نجات رکھی ہے وہ بچ جائے۔''[3]

---

[1] الوحدة الإسلامية لمحمد ابو زهرة (ص: ١٣٦- ١٣٧)

[2] احداث واحاديث فتنة الهرج للدكتور عبد العزيز دخان (ص: ٦٨- ٦٩)

[3] احداث و احاديث فتنة الهرج للدكتور عبد العزيز دخان (ص: ٧٠) واقتضاء الصراط (١/ ١٢٧)

یقیناً ان فتنوں سے آگاہ کرنا، نجات کے طریقوں کی حد بندی کا لطیف انداز ہے۔ آپ کسی انسان کوکسی خطرے سے چاہے کتنا ہی ڈرائیں، جب تک آپ اس کی حد بندی نہیں کریں گے یا اس میں واقع ہونے والی کیفیت کا ذکر نہیں کریں گے، اُس وقت تک اس شخص کے لیے اس سے بچنا انتہائی مشکل ہے۔ بعض اوقات لاعلمی کے باعث وہ قابلِ احتراز فعل کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے، حالانکہ اُسی فعل سے ڈرایا گیا ہوتا ہے۔

اس کے بعد یہ احادیث ہر دور میں اہلِ ایمان کے ایمان میں اضافے کا باعث بنیں اور آج بھی بن رہی ہیں۔ اور وہ ان فتنوں اور اختلافات سے آگاہ ہوتے رہتے ہیں جن کے واقع ہونے کی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی تھی۔

- تمام امتوں میں فتنوں کا ظہور اللہ تعالیٰ کی سنت رہی ہے۔ اِس امت میں بھی فتنے قیامت تک رہیں گے۔ یہ تاریک رات کی طرح ہوں گے۔ اندھے، بہرے اور گونگے ہوں گے، یعنی ان فتنوں کے ایام میں نہ تو حق بات سننے کو ملے گی نہ کوئی حق کے بارے میں گفتگو کرے گا۔ نہ حق و باطل کے درمیان فرق کیا جائے گا۔ جس نے اُن میں حصہ لیا وہ دنیا وآخرت میں تباہ ہو گیا۔ جو ان میں شریک ہونے سے باز رہے گا وہ نجات پا جائے گا۔ ان فتنوں میں وہی شخص راہِ نجات پا سکتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے علم وتقویٰ سے مالا مال کیا ہو اور جسے اپنے فضل سے اختلافی امور میں صحیح راستے کی ہدایت دی ہو۔
- ان احادیث میں یہ بھی ہے کہ اس امت کے مابین قتال کا فتنہ ضرور برپا ہو گا۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ کے دور میں جو کچھ وقوع پذیر ہوا اسے ابتدائی طور پر یا اس کے تاحال جاری وساری رہنے کو بعید سمجھنا یا اس کا انکار کرنا ممکن نہیں۔ لیکن اس کی تلافی کے لیے فتنۂ قتال کے اسباب کو جاننا ضروری ہے تاکہ جب کبھی اُن فتنوں کے شعلے بھڑکیں تو انھیں بجھانے کی کوشش کی جائے یا کم ازکم ایک مسلمان کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ ان فتنوں سے دور رہے اور ان سے لاتعلقی کا اظہار کرے۔
- اِس امت پر اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت ہے کہ وہ دنیا ہی میں اس کے گناہوں کو ختم کر دیتا ہے، اس لیے قتال، بپا ہونے والے فتنے اور زلزلے جن کی زد میں یہ امت آئی ہے، یہ اس کے گناہوں کا کفارہ ہے۔
- بعض احادیث میں بڑی صراحت سے یہ اشارے موجود ہیں کہ اُن فتنوں کا مرکز مشرق ہے۔ اور فی الواقع ایسا ہی ہوا۔ سب سے پہلے فتنے کی ابتدائی تحریک کوفہ اور بصرہ سے اٹھی۔ جنگِ جمل کا فتنہ بھی وہیں سے پیدا ہوا۔

- بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ان فتنوں میں کچھ لوگ معمولی دنیاوی فائدے کی خاطر اپنا دین فروخت کر دیں گے۔ اُن پر شہوات اور شبہات کا غلبہ ہو جائے گا۔ صحیح اسلام پر کاربند لوگ خال خال ہوں گے اور وہ اپنے سلوک، طرزِ عمل اور معاملات میں اجنبی ہوں گے۔ دین پر ثابت قدم رہنا ہاتھ میں انگارہ لینے یا کانٹوں پر چلنے کے مترادف ہوگا۔ انھیں دین کے راستے میں اور حق پر قائم رہنے کی پاداش میں جو اذیتیں اور تکلیفیں پہنچیں گی وہ انھیں صبر کے ساتھ ثواب کی نیت سے برداشت کریں گے۔
- فتنوں کے دور میں اللہ تعالیٰ ایک گروہ کی حفاظت فرمائے گا۔ اُن کا دامن فتنوں سے آلودہ نہیں ہوگا اور وہ اپنے ہاتھ مسلمانوں کے خون سے نہیں رنگیں گے۔ وہ لوگوں کے مابین اصلاح کی کوشش کریں گے اور صحیح اسلام کی مبادیات، یعنی باہمی مودّت و رحمت کی طرف بلائیں گے۔ بلاشبہ عنقریب ان کا یہ طرزِ عمل لوگوں کے متلاطم ہجوم اور منہ زور خواہشات کے نرغے میں غیر مانوس محسوس ہوگا۔
- فتنوں کے زمانے میں زبان تلوار سے زیادہ نقصان کرے گی۔ اکثر فتنوں اور مصائب کی بنیاد زبان ہی ہوگی۔ مشاہدے کی بات ہے کہ بسا اوقات ایک زہریلا کلمہ زبان سے نکلتا ہے اور دلوں میں آگ لگا دیتا ہے۔ اور دلوں میں دبی دبائی باتوں کو ابھار دیتا ہے۔ اس طرح جذبات بھڑک اٹھتے ہیں اور یہ زبان بڑے بڑے ضرر رساں فتنوں کا باعث بنتی ہے۔
- فتنوں کے زمانے میں علم اٹھ جائے گا، علماء کے فوت ہونے کی وجہ سے یا ان کے سکوت کی وجہ سے یا سلامتی کو ترجیح دیتے ہوئے ان کے الگ ہو جانے کی وجہ سے یا لوگوں کے بعض وجوہ کی بنا پر ان سے دور ہو جانے کی وجہ سے۔ اُس وقت جاہل سردار بن جائیں گے اور لوگ اپنا سربراہ جاہلوں کو بنا لیں گے، وہ بغیر علم کے فتویٰ دیں گے، خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔ گھٹیا لوگ اعلیٰ مناصب پر فائز ہو جائیں گے اور کم عقل لوگوں کا غلبہ ہو جائے گا۔
- فتنے کے بارے میں احادیث میں یہ بات بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو ضمانت دی ہے کہ وہ اِس امت کو قحط سالی اور بھوک سے ہلاک نہیں کرے گا، نہ ان کے کسی دشمن کو ہمیشہ کے لیے ان پر مسلط کرے گا، چاہے دشمن کتنا ہی مضبوط ہو اور اس کے پاس قابو پانے کے لیے کتنی ہی

[1] احداث و احادیث فتنة الهرج للدكتور عبد العزيز دخان (ص: ٣٤٥، ٣٤٨)

طاقت اور غلبہ پانے کے امکانات ہوں۔ لیکن رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کی ضمانت نہیں دی گئی کہ آپ کی امت باہم اختلاف نہیں کرے گی۔ اور ہوسکتا ہے اس کے اختلاف ہی کی وجہ سے اس پر باہر سے دشمن وار کرے۔ جب امت کے افراد باہم اختلاف کا شکار ہوں گے اور ایک دوسرے کو قتل کریں گے تو ان کی قوت کمزور پڑ جائے گی، دشمن ان پر قابو پالے گا۔ ان کے تمام وسائل بیکار ہو جائیں گے۔ اور اس ذلت سے نکلنا اُس وقت تک ممکن نہیں ہوگا جب تک وحدت، اتفاق و اتحاد اور اللہ تعالیٰ کی شریعت کو قائم نہ کرلیا جائے۔

- ان احادیث میں یہ بھی ہے کہ فتنوں کے دور میں لوگوں کے اخلاق بگڑ جائیں گے۔ رویے تبدیل ہو جائیں گے۔ لوگ نیک اعمال سے بے اعتنائی برتیں گے اور خیر و بھلائی کے کاموں سے دور بھاگیں گے۔ دشمنی، حسد اور کینے کی بیماری عام ہو جائے گی اور یہ ناسور رگ و ریشے میں سرایت کر جائے گا۔ لوگوں کی سمجھ میں کچھ نہیں آئے گا کہ وہ کیا کریں۔
- بعض احادیث میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ فتنوں کے ظاہر ہونے سے پہلے ہر طرف امن واستحکام ہوگا، معیشت کی صورتِ حال تسلی بخش ہوگی یہاں تک کہ ایک سوار مکہ سے عراق تک کا تنہا سفر کرے گا اور اسے راستہ بھولنے کے سوا کوئی خوف نہ ہوگا۔
- احادیث میں یہ بات بھی ملتی ہے کہ فتنوں کے دور میں اچھے، سمجھ دار اور صاحبِ رائے لوگ قتل ہو جائیں گے۔ بچے کھچے گھٹیا اور نابلد لوگ ہی باقی رہ جائیں گے جو نیکی اور بدی کی پہچان سے بھی بے خبر ہوں گے۔

یہ فتنوں کے بارے میں احادیث میں بیان کی گئی باتوں کا خلاصہ ہے۔[1]

شریر عناصر اور سرِعام اسلحہ لہرانے والے کی جلاوطنی:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شریر لوگوں پر کڑی نظر رکھتے تھے۔ فساد پھیلانے اور مسلّح ہو کر شہر میں گشت کرنے والے کو مدینہ سے نکال دیتے تھے۔ حضرت سالم بن عبد اللہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ فسادی شخص اور ضرورت سے زیادہ اسلحہ رکھنے والے کو شہر بدر کردیتے تھے۔[2]

---

[1] احداث وأحاديث فتنة الهرج للدكتور عبد العزيز دخان (ص: ٣٤٥ ـ ٣٤٨)

[2] تاريخ الطبري (٥/ ٤١٦)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا کی توہین کرنے والے کو سزا:

آپ کے دورِ خلافت میں ایک شخص نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے تنازع کے دوران ان کی توہین کی تو آپ نے اسے سزا دی۔ لوگوں نے سزا کی وجۂ جواز دریافت کی۔ آپ نے فرمایا: ''رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تو اپنے چچا کی تعظیم کریں اور میں ان کی توہین کی اجازت دے دوں (یہ کیسے ممکن ہے؟) جس نے ایسا کیا اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی اور جس نے اس توہین پر رضا مندی کا اظہار کیا اس نے بھی مخالفت کی۔''[1]

آخرت کی تیاری کے لیے خطبہ:

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے خطبہ دیا۔ آپ نے اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء کے بعد فرمایا: ''اے لوگو! اللہ سے ڈر جاؤ۔ اللہ کا تقویٰ غنیمت ہے۔ سب سے زیادہ سمجھدار وہ ہے جس نے اپنے آپ کو سنوار لیا، موت کے بعد کی زندگی کے لیے تیاری کر لی اور اللہ کے نور سے قبر کی تاریکی دور کرنے کا سامان کر لیا۔

مکارمِ اخلاق کی تعلیم و تذکیر:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا: ''اللہ کی قسم! ہم سفر وحضر میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے بیماروں کی تیمار داری فرماتے تھے، جنازوں میں شریک ہوتے تھے، ہمارے ساتھ مل کر دشمن کے خلاف قتال کرتے تھے اور ہر چھوٹے بڑے معاملے میں ہماری غم خواری فرماتے تھے۔ آج وہ لوگ مجھے سکھانے کی کوشش کرتے ہیں جنھوں نے شاید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی دیکھا بھی نہیں۔''[2]

ایک طرف داخلی محاذ پر بے چینی کی یہ لہر جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف پھیلی۔ دوسری طرف شکست خوردہ ایرانی اور رومی مسلمانوں کے خلاف گھات لگائے بیٹھے تھے۔ اتنی تیزی سے ہر طرف ترقی، اسلامی حکومت کی توسیع اور اتنے عظیم کارنامے آخر کفر کو کیسے گوارا ہو سکتے تھے، چنانچہ مسلمانوں کے داخلی اور خارجی محاذ کی یہ سرکش لہریں رفتہ رفتہ بے قابو ہو کر اس قدر تموّج میں آگئیں کہ اپنے عہد کا سب سے بڑا مسلمان حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ جیسا خلیفۂ عادل اپنے ہی گھر میں انتہائی سفاکی سے شہید کر دیا گیا۔ یہ اتنا بڑا المیہ تھا کہ مسلمان آج تک اس کے اذیت ناک اثرات سے نجات نہیں پا سکے۔

---

[1] تاريخ الطبري (٥/ ٤١٧)

[2] صحيح التوثيق في سيرة وحياة ذي النورين للدكتور مجدى فتحى السيد (ص: ١٠٧)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف یہودیوں کی گھناؤنی سازشیں:

جیسا کہ ابھی ذکر ہوا ہے کہاتنی تیزی سے ہر طرف ترقی، اسلامی حکومت کی توسیع اور اتنے عظیم کارنامے آخر کفر کو کیسے گوارا ہو سکتے تھے، چنانچہ انھوں نے مسلمانوں کے اس راست باز اور معزز و مکرم خلیفۂ سوم اور برگزیدہ قائدِ ملتِ اسلامیہ کے خلاف بڑی گہری اور گھناؤنی سازشیں شروع کر دیں۔

عبد اللہ بن سبا یمن کا ایک یہودی تھا جو ابن السوداء کے نام سے مشہور تھا، اس نے فتنے کو ہوا دینے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ اس نے بظاہر اسلام قبول کیا۔ اپنے آپ کو محبِّ اہلِ بیت اور محبِّ بنی ہاشم ظاہر کیا۔ اپنی چکنی چپڑی باتوں سے ان پڑھ اور سادہ لوح عوام کو گرویدہ بنایا اور اسلامی حکومت کے خلاف وسیع اور منظّم پروپیگنڈے کا جال بچھا دیا۔ فتنے کی بنیاد غلط شکایات اور غلط بیانیوں پر رکھی گئی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی دیگر بے شمار خوبیوں میں ان کا نرم دل ہونا بھی شامل ہے۔ ان پر بے بنیاد الزامات لگائے گئے۔ جن کی کوئی اصلیت نہ تھی۔ جھوٹے اور جعلی خط لکھوائے گئے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان الزامات کے جوابات بھی دیے۔ لوگوں کو مطمئن بھی کیا۔ راست باز اور سچے مومن اس فتنے سے مکمل طور پر الگ ہو گئے۔ مگر اس کے باوجود آہستہ آہستہ شر پسند مدینہ طیبہ میں جمع ہوتے چلے گئے اور پھر ایک دن وہ آیا جب شر پسندوں نے اُن کے گھر کا محاصرہ کر لیا۔ انھوں نے اپنے مکان کی چھت پر چڑھ کر باغیوں سے خطاب کیا اور انھیں سمجھایا۔ شورش پسندوں کو نصیحت کی مگر باغیوں کا دباؤ بڑھتا چلا گیا۔ اِس دوران مسلمان ان کے دفاع کے لیے آگے بڑھے۔ سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے اپنے صاحبزادوں حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کو ان کی قیام گاہ کے باہر حفاظت کے لیے پہرے دار بنا کر بھیجا۔

حضرت عبد اللہ بن زبیر اور عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہم جیسے نوجوان دیگر بہت سارے مسلمانوں کے ساتھ موجود تھے۔ مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی فطری نرم دلی کہ انھوں نے مدینۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم میں خون ریزی کو پسند نہ کیا۔ وہ امت میں فتنہ اور خانہ جنگی نہیں چاہتے تھے، اس لیے اپنی حمایت میں کسی کو جنگ کی اجازت نہ دی اور اپنے ذاتی تحفّظ کے لیے مدینۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حرمت پر آنچ نہ آنے دی۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے پیشین گوئی فرمائی تھی کہ وہ شہید ہوں گے۔ ان کو اپنی شہادت کا یقین ہو چکا تھا۔

جب سے تاریخ کی صبح طلوع ہوئی ہے، سرمایہ و محنت کی جنگ جاری ہے۔ اس جنگ کا نہایت

منصفانہ حل صرف اسلام نے پیش کیا ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا عہدِ خلافت سرمائے کی بہتات اور اس کی عادلانہ تقسیم کا آئینہ دار تھا۔ آپ کو ایک طرف بیرونی محاذ پر رومیوں سے واسطہ پڑا تو دوسری طرف اندرونی محاذ پر دولت کے فتنے سے سابقہ پیش آیا۔ آپ کے دور میں مجاہدین کی فتوحات کا تانتا بندھ گیا۔ یوں دیارِ عرب کے صحراؤں، ایران کے لالہ زاروں اور روم کے جزیروں سے خُمس خَراج اور جزیے کی صورت میں دولت کے انبار مدینہ منورہ پہنچتے رہے۔

سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ اس دولت کو مسلمانوں میں نہایت عادلانہ طور پر تقسیم فرماتے رہے۔ اس طرح عام لوگ بھی بہت امیر ہوگئے۔ دولت کی فراوانی رنگ لائی۔ بے تحاشا دولت مند خاندانوں کے اکثر نوجوان فرزند عیش کے متوالے ہوگئے۔ وہ غُلیلیں بنانے اور کبوتر اُڑانے لگے۔ اور اسی طرح شطرنج کھیلنے اور شراب پینے لگے۔[1]

سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ یہ بے راہروی برداشت نہ کرسکے۔ انھوں نے کسی کا لحاظ نہ کیا، اپنے کمانڈروں کو حکم دیا کہ شراب پینے والوں کو شریعت کے مطابق کوڑے مارے جائیں۔ اس طرح جس بھی امیر زادے نوجوان کی پٹائی ہوئی تو وہ اور اس کے سارے افرادِ خاندان حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے ناراض ہوگئے۔ مگر حضرت عثمان تو صرف احکامِ الٰہی کے پابند تھے۔ وہ کسی کی خوشی و ناراضگی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔[2]

دورِ خلافتِ حضرتِ عثمان رضی اللہ عنہ پر ایک طائرانہ نظر:

امام زہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بارہ سال امیر المومنین رہے۔ ابتدائی چھے برسوں میں کسی شخص نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر کوئی اعتراض نہیں کیا بلکہ آپ قریش کے نزدیک حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بھی زیادہ مقبول شخصیت تھے۔ کیوں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان پر سختی کرتے تھے جبکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان سے نرمی کی اور انھیں اپنے ساتھ ملایا۔ اس کے بعد فتنہ بپا ہوا۔ مسلمان مؤرخین نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت کے دوسرے نصف، یعنی ۳۰ھ سے ۳۵ھ میں ہونے والے حادثات کو ''فِتَن'' کا نام دیا ہے اور بتایا ہے کہ یہی فتنے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کا باعث بنے۔[3]

---

[1] السنن الكبرىٰ للبيهقي (١٥/ ٢١٥)

[2] تاريخ الطبري (٥/ ٤١٦)

[3] الطبقات لابن سعد (١/ ٣٩ ـ ٤٧) البداية و النهاية (٧/ ١٤٤ـ ١٤٩) الخلفاء الراشدون للخالدي (ص: ١١٢)

حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے دورِ خلافت اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ابتدائی چھے برسوں میں مسلمان باہم متحد تھے، ان کے مابین کوئی تنازعہ نہیں تھا، پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت کے آخر میں ایسے حالات پیدا ہوئے جن سے کئی طرح کے اختلافات نے جنم لیا یہاں تک کہ فتنہ پرور لوگوں کا ایک گروہ اٹھا اور انھوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا۔ آپ کی شہادت کے بعد فتنوں کا دروازہ کھل گیا۔ اور مسلمان گروہ بندیوں میں بٹ گئے۔[1]

حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے عہدِ خلافت اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ابتدائی ماہ و سال میں اسلامی معاشرے کی صورتِ حال یہ تھی:

- عمومی طور پر مسلمان معاشرہ اسلام کی عملی تصویر تھا۔ اللہ تعالیٰ اور یومِ آخرت پر پختہ ایمان تھا۔ اسلامی تعلیمات کی نہایت تاکید وسنجیدگی اور پورے التزام کے ساتھ تطبیق و نفاذ کرنے والا معاشرہ تھا۔ تاریخ کے کسی بھی دَور کے کسی بھی معاشرے کے مقابلے میں گناہ نہ ہونے کے برابر تھے۔ دین کو زندگی کی حیثیت حاصل تھی۔ دینی تعلیمات ہی لوگوں کی بنیاد اور روحِ رواں تھیں، دین صرف اس چیز کا نام نہیں تھا کہ جو عبادت کے طریقے وہ اپناتے تھے اسے ہی صحیح انداز سے بروئے کار لاتے رہیں اور بس بلکہ اس سے آگے بڑھ کر ان کے عمدہ اخلاق و کردار، تصوّرات و ترجیحات، اقدار، معاشرتی تعلقات، خاندانی روابط، ہمسائیگی کے رشتے، خرید و فروخت، لین دین، رزق کی تلاش اور باہمی معاملات میں راست بازی، الغرض ہر چیز میں اسلام کی تعلیمات کارفرما نظر آتی تھیں۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ طبعی طور پر معاشرے کا ہر فرد ہی ان اوصاف سے مزیّن تھا۔ دنیا کی زندگی میں ایسا ممکن نہیں۔ نہ انسانوں کے کسی معاشرے میں ایسا ہوسکتا ہے۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے معاشرے میں، جیسا کہ قرآن نے بتایا ہے، منافق بھی تھے جو ظاہراً اسلام کا لبادہ اوڑھ کر اندرونِ خانہ دشمنی رکھتے تھے۔ کمزور ایمان والے بھی تھے۔ معذور بھی تھے۔ کاہل، سست اور خائن بھی تھے۔ لیکن ان سب کی معاشرے میں کوئی حیثیت تھی نہ ان میں حالات کا رُخ بدلنے کی ہمت تھی، کیونکہ غلبہ اللہ کے راستے میں اپنی جان و مال سے جہاد کرنے والے سچے مومنوں کا تھا جو دینِ اسلام پر کاربند تھے۔

- وہ ایسا معاشرہ تھا جس میں امت کے حقیقی معنیٰ مجسّم اور جیتے جاگتے نظر آتے تھے۔

---

[1] مجموعة الفتاویٰ لابن تیمیة (۱۳/ ۲۰)

❁ اس معاشرے میں اخلاقی قدریں نہایت مستحکم تھیں۔ ضابطۂ اخلاق دینِ اسلام کے احکام اور ہدایات کی روشنی میں مقرر تھا۔ یہ سیاست، اقتصادیات، فرد، سماج، اجتماع اور فکر وتعبیر پر بھی جلوہ ریز نظر آتا تھا۔ حکومت اور اقتدار اسلام کی اخلاقیات پر قائم تھا۔ لوگوں کے باہمی تعلقات سچائی، امانت، اخلاص اور تعاون ومحبت پر قائم تھے۔ لگائی بجھائی، چغل خوری اور بہتان طرازی کا وجود تک نہ تھا۔[1]

❁ وہ معاشرہ سرگرمِ عمل تھا۔ صرف جہاد فی سبیل اللہ میں نہیں بلکہ ہر میدان میں مجاہدانہ جذبہ کارفرما تھا۔ وہ معاشرہ نہایت عبادت گزار تھا۔ جذبۂ عبادت اس کے تمام معاملات پر چھایا ہوا تھا۔ وہ صرف ادائے فرض اور اللہ کی خوشنودی کے حصول کے لیے نوافل کی ادائیگی تک محدود نہ تھا بلکہ تمام کام جذبۂ عبادت کے ساتھ تکمیل پاتے تھے۔ حاکم رعایا کی نگرانی عبادت کے جذبے کے ساتھ کرتا۔ شوہر گھر کی ذمہ داریاں عبادت سمجھ کر پوری کرتا اور عورت گھر کی پاسداری جذبۂ عبادت کے ساتھ کرتی تھی۔ الغرض ہر کام رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اِس فرمان کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ہوتا:

«كُلُّكُمْ رَاعٍ وَّكُلُّكُمْ مَّسْئُوْلٌ عَنْ رَّعِيَّتِهٖ»[2]

''تم میں سے ہر ایک ذمہ دار ہے اور اس سے اس کی ذمہ داری کے متعلق سوال کیا جائے گا۔''

یہ عہدِ صدیق رضی اللہ عنہ اور دیگر خلفائے راشدین کے دَور کے اہم پہلو تھے۔ جوں جوں ہم عہدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ہوتے جائیں یہ پہلو زیادہ مستحکم ہوتا جاتا ہے اور جوں جوں ہم عصرِ نبوت سے دور جائیں گے یہ پہلو کمزور ہوتا جائے گا۔ ان صفات نے مسلمان معاشرے کو اعلیٰ سطح تک پہنچا دیا تھا۔ انھی خوبیوں کا نتیجہ تھا کہ اسلام اس تیزی سے پھیلا کہ عقلیں دنگ رہ گئیں۔ دنیا کی تاریخ میں اسلامی فتوحات کا دائرہ جس سُرعت کے ساتھ پھیلا اس کی مثال ملنا ناممکن ہے۔

پچاس سال کے نہایت قلیل عرصے میں اس کی سرحدیں بحرِ اوقیانوس سے جزائرِ ہند تک پھیل گئیں۔ اسلام خود بھی نمایاں تھا، اور اسے عملاً نمایاں کرنا اور دور دور تک کے ہر انسان تک پہنچانا ہر مسلمان کا اوّلین فرض تھا۔ اس دورِ ہمایوں کے ہر مسلمان نے یہ فرض بخیر وخوبی ادا کیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مفتوحہ علاقوں کے لوگ بغیر کسی دباؤ اور زبردستی کے دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے۔ یہی وہ خوبیاں تھی جن پر یہ معاشرہ مشتمل تھا، جو اس کے غلبے کی حقیقی ضامن تھیں۔

---

[1] كيف نكتب التاريخ الإسلامي للدكتور محمد قطب (ص: ١٠٠۔ ١٠٢)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٤٠٩)

خوشحالی اور معاشرے پر اس کے اثرات:

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب بھی صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی تنگ حالی اور فقر کو دیکھتے تھے تو انھیں دلاسا دیتے اور یہ خوش خبری سناتے تھے کہ ان کی یہ تنگی زیادہ طول نہیں پکڑے گی اور بہت جلد ان پر دنیا کے خزانے اور خیر و برکت کے دروازے کھول دیے جائیں گے۔ اور ساتھ ہی انھیں اس بات سے بھی ڈراتے تھے کہ تم مال و زر میں مشغول ہو کر نیک اعمال اور جہاد فی سبیل اللہ کو ترک نہ کر دینا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کی خاطر اور زائل ہونے والے مال و متاع کے لیے ممکنہ باہمی لڑائی سے بھی ڈرایا۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اس تحذیر کو خوب سمجھا تھا۔ اسی لیے ان کی پالیسیوں میں یہ بات بھی شامل تھی کہ وہ مسلمانوں کو مال و دولت کے فتنوں کا شکار ہونے اور دنیا کی پُر فریب اور دل لبھانے والی چیزوں سے بچائیں، چنانچہ انھوں نے ہر ممکن کوشش کی کہ مسلمان بلادِ عجم میں زیادہ دیر نہ ٹھہریں اور اگر ان کے شہروں میں جانے کی دوسری مصلحتیں نہ ہوتیں جن کا تقاضا تھا کہ وہ بلادِ عجم میں جائیں (تاکہ دینِ اسلام کی ترویج کریں) تو یہ حکمِ امتناعی برابر قائم رہتا۔ لیکن ان مصلحتوں کے باوجود حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مہاجرین و انصار میں سے کبار صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو، جو مدینہ منورہ میں رہتے تھے، باہر نہیں جانے دیا اور ممانعت کا یہ حکم ان پر آخر دم تک لاگو رہا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اقدام سے صاف پتا چلتا ہے کہ آپ کو اس بات کا خدشہ تھا کہ مسلمان اگر بلادِ عجم میں چلے گئے جہاں دولت کی ریل پیل ہے اور طرح طرح کی نعمتیں موجود ہیں، تو ان کے دلوں پر دنیا کا غلبہ ہو جائے گا اور ان کی آخرت برباد ہو جائے گی۔[1]

جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا دورِ خلافت آیا تو فتوحات کا دائرہ وسیع ہو گیا اور مشرق و مغرب میں ہر طرف مملکتِ اسلامیہ کی سرحدیں پھیل گئیں۔ بیت المال میں غنیمتوں اور دشمن کے دیگر اموال سے روز بروز اضافہ ہونے لگا۔ لوگوں کے پاس مال و دولت کی فراوانی ہو گئی۔

یہ بات محتاجِ وضاحت نہیں کہ نعمتوں، فتوحات کی صورت میں حاصل ہونے والے اموال اور دوسری آمدنیوں کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ معاشرے پر اس کا اثر پڑے، چنانچہ اس سے معاشرے میں خوشحالی

[1] احداث وأحاديث فتنة الهرج للدكتور عبد العزيز دخان (ص: ٥٥٩۔ ٥٦٥)

آ گئی اور لوگ دنیا کے فتنوں میں پڑ گئے۔ ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی دوڑ لگ گئی۔ یوں باہمی بُغض وعداوت نے جنم لیا۔

بالخصوص وہ لوگ جن کے دلوں کو ابھی تک ایمان نے پوری طرح چمکایا نہیں تھا اور ان کی بدویّت اور جفا کو تقویٰ نے مہذّب نہیں بنایا تھا، وہ اس فتنہ کا شکار ہوئے۔ اس طرح مفتوحہ علاقوں میں رہنے والے نومسلم دنیا کی رونقوں میں کھو گئے۔ اسی کو مقصدِ حیات بنا کر ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی خواہش کرنے لگے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس ظاہری حالت سے یہ بھانپ لیا کہ امت خطرناک ڈگر کی طرف جارہی ہے۔ رعایا کے نام ایک خط میں انھوں نے امت میں مستقبل میں پیدا ہونے والے تغیّر وتبدّل سے ڈرایا۔

مدینہ منورہ میں جب دنیاوی خوشحالی آئی اور لوگوں کی دولت مندی انتہاء کو پہنچی تو وہاں جو سب سے پہلی برائی رونما ہوئی وہ کبوتر بازی اور چکنی مٹی کے چھوٹے چھوٹے گولوں اور غلیلوں کے ذریعے سے نشانہ بازی تھی۔ اس کے سدِ باب کے لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت کے آٹھویں سال قبیلۂ لیث کے ایک شخص کو مقرر کیا۔ اس نے کبوتروں کے پر کاٹ دیے اور غلیلیں توڑ دیں۔[1]

اسی طرح لوگ نبیذ کو نشہ آور بنا کر پینے لگے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو مقرر کیا، وہ لاٹھی لے کر گشت کرتا تھا تا کہ لوگوں کو اس سے روکے۔ لیکن جب اس کے استعمال میں اضافہ ہو گیا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ صورتِ حال لوگوں کے سامنے رکھی۔ اس بات پر اتفاق ہوا کہ نشہ آور نبیذ پینے پر بھی کوڑے لگائے جائیں گے، چنانچہ ایسے کچھ افراد کو پکڑ کر کوڑوں کی سزا دی گئی، پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جسے دیکھتے کہ وہ شرارت پر اترا ہوا ہے یا اسلحہ کی نمایش کرتا پھرتا ہے تو اسے مدینے سے نکال دیتے۔ اس فیصلے سے شر پسندوں کے والدین کو بڑی تکلیف ہوئی۔[2]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مدینہ منورہ میں لوگوں سے خطاب کیا۔ آپ نے فرمایا:

''مجھے کچھ لوگوں کی طرف سے ہنگامے اور فتنے برپا کرنے کی خبریں موصول ہوئی ہیں۔ میں ان فتنوں کا دروازہ نہیں کھولنا چاہتا۔ نہ یہ پسند کرتا ہوں کہ میں فتنوں کا سبب بنوں۔ میں اپنے آپ پر مکمل کنٹرول رکھوں گا۔ فتنوں میں نہیں پڑوں گا۔ میرے اور تمھارے درمیان ایک عہد و پیمان

---

[1] تاريخ الطبري (٥/ ٤١٥)

[2] تاريخ الطبري (٥/ ٤١٦)

اور رشتہ ہے، جو میری پیروی کرے گا میں سمجھوں گا وہ اس عہد کا پاس کر رہا ہے اور جو میری اتباع نہیں کرے گا، یہ اس کی عہد شکنی اور جفا شمار ہوگی۔ آگاہ رہو کہ روزِ قیامت ہر شخص کا ایک چلانے والا اور ایک گواہ ہوگا۔ چلانے والا اسے اللہ کے حکم کے مطابق چلائے گا اور گواہ اس کے اعمال کے بارے میں اس کے خلاف گواہی دے گا۔ پس جو شخص اللہ تعالیٰ کی رضا کا طالب ہے اسے خوش ہونا چاہیے اور جو دنیا کا ارادہ رکھتا ہے تو وہ ناکام ہوگیا۔''[1]

خلیفۂ راشد، صاحبِ تقویٰ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جب اپنے منصبی فرائض ادا کیے تو آپ کے احکام اور تعزیرات کا شکار اکثر و بیشتر ان سرمایہ داروں کے بچے تھے جنھوں نے عیش و عشرت کی زندگی شروع کر دی تھی اور ان کے اخلاق بگڑ گئے تھے، چنانچہ یہ منحرف لوگ ان سے انتقام لینے والوں کی صفوں میں شامل ہو گئے۔

اس تبدیلی کا اثر پہلے پہل دار الخلافہ سے دور کے علاقوں میں ظاہر ہوا اور آہستہ آہستہ دار الخلافہ کی طرف بڑھتا گیا جس کی وجہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اپنے خطبوں میں گاہے بگاہے لوگوں کو اس دلربا دنیا کے فتنوں سے بچنے کے لیے وعظ و تلقین کی ضرورت محسوس ہوئی۔ آپ نے دنیا کی رغبت کے نقصانات سے آگاہ کرتے ہوئے اپنے ایک خطبے میں فرمایا:

''اللہ تعالیٰ نے دنیا صرف اس لیے دی ہے کہ تم اس کے ذریعے سے آخرت تلاش کرو، اس لیے نہیں دی کہ تم اس پر فریفتہ ہو جاؤ۔ دنیا فانی ہے، آخرت دائمی ہے۔ کہیں یہ فانی دنیا تمھیں غرور میں مبتلا کر کے آخرت سے غافل نہ کر دے۔ اللہ تعالیٰ سے ڈرو مبادا وہ تمھاری اس روش کی وجہ سے تم پر کوئی دشمن مسلّط کر دے۔ اپنی وحدت قائم رکھو۔ گروہوں میں مت بٹو۔''

پھر آپ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی:

﴿وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا ۚ وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا وَكُنْتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِنَ النَّارِ فَأَنْقَذَكُمْ مِنْهَا ۗ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ﴾

[آل عمران: ١٠٣]

[1] تحقيق مواقف الصحابة في الفتنه للدكتور محمد المحزون (١/ ٣٦١)

''اور سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو اور جدا جدا نہ ہو اور تم اپنے آپ پر اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، پھر اس نے تمھارے دلوں میں الفت ڈال دی اور تم اس کے احسان سے بھائی (بھائی) بن گئے۔ اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے پر تھے، پھر اس نے تمھیں اس میں گرنے سے بچا لیا، اللہ تعالیٰ اسی طرح تمھارے لیے اپنی آیتیں بیان کرتا ہے شاید کہ تم ہدایت پاؤ۔''

ایسے حالات میں جبکہ مال و دولت کی فراوانی تھی، اور دنیا کا کثیر مال و دولت مسلمانوں کے پاس آ گیا تھا، لوگ مختلف علاقوں کو فتح کرنے کے بعد فارغ ہو کر اطمینان سے بیٹھ گئے تھے۔ ان حالات میں لوگوں نے اپنے خلیفہ پر تنقید شروع کر دی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ فتنے کی تحریک میں آسودہ حالی کا کس قدر عمل دخل تھا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی وہ بات بھی سمجھ میں آجاتی ہے جو آپ نے در بند کے گورنر صحابیِ رسول حضرت عبدالرحمٰن بن ربیعہ باہلی رضی اللہ عنہ کو لکھی تھی:

''رعایا میں سے بہت سے لوگوں کو مال و دولت کی کثرت نے مغرور بنا دیا ہے، لہٰذا ان کے عطیات میں کمی کر دو اور مسلمانوں کو خطرے میں نہ ڈالو۔ مجھے خدشہ ہے کہ وہ آزمائش میں پڑ جائیں گے۔''[1]

عہدِ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ میں معاشرتی تبدیلیوں کا انداز اور ان کے اثرات:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں سماجی سطح پر نہایت عمیق تبدیلیاں رونما ہوئیں جو بڑی قوت اور خاموشی سے اس طرح اثر انداز ہوئیں کہ بیشتر لوگ ان سے آگاہ ہی نہیں ہو سکے حتیٰ کہ یہ تبدیلیاں نہایت بھیانک صورت میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے دوسرے نصف کے آغاز میں ظاہر ہوئیں۔ رفتہ رفتہ ان میں ایسی شدت پیدا ہوتی گئی جو بالآخر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کا باعث بنی۔[2]

فتوحات کی تحریکوں کے بعد جب مملکتِ اسلامیہ میں وسعت پیدا ہوئی تو معاشرتی گٹھ جوڑ میں تبدیلی رونما ہوئی اور معاشرے کی ساخت میں بگاڑ پیدا ہو گیا۔ کیوں کہ رقبے اور آبادی کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ اس وسیع خطے میں ہر رنگ، نسل، زبان، ثقافت، عادات، افکار و خیالات اور مختلف نظریات کے

---

[1] تحقیق مواقف الصحابة في الفتنة للدكتور محمد المحزون (١/ ٣٦٢)

[2] الدولة الأموية المفترىٰ عليها للدكتور حمدى شاهين (ص: ١٦٦)

لوگ مسلمان معاشرے کا حصہ بن گئے۔ ادبی اور تہذیبی تنوّع پیدا ہوا۔ کئی طرح کے مناظر سامنے آئے اور معاشرتی وحدت پر طرح طرح کے اضطراب کی لہریں اور بے ہنگم شگاف نظر آنے لگے۔ بڑے بڑے شہر بالخصوص بصرہ، کوفہ، شام، مصر، مدینہ منورہ اور مکہ مکرمہ اس سے متاثر ہوئے۔ کیوں کہ ان شہروں کو مذہبی اور جغرافیائی لحاظ سے بڑی اہمیت حاصل تھی۔ یہیں سے مجاہدین جنگوں میں شریک ہوتے۔ جنگوں میں شرکت کے باعث شہادتوں اور موت کی وجہ سے آئے روز ان کی تعداد کم ہوتی گئی اور مفتوحہ علاقوں ایران، ترکی، رومی، قبطی، کرد اور بربر (شمالی افریقہ میں تونس، الجزائر، مراکش اور موریطانیہ وغیرہ کے باشندے بربر کہلاتے ہیں) کے باشندے ان کی جگہ آکر آباد ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ ان کی تعداد وہاں کے مقامی باشندوں کی تعداد سے بڑھ گئی۔ ان میں بھی اکثریت ایرانیوں کی، عرب اور دیگر ممالک کے عیسائیوں اور یہودیوں کی تھی۔

ان میں سے اکثر آس پاس کے عرب اور وہ لوگ تھے جنھیں شرفِ صحابیّت نصیب نہیں ہوا تھا یا یوں کہہ لیں کہ وہ براہِ راست رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتہ نہیں تھے۔ اور فتوحات میں مشغولیت کی وجہ سے انھیں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے بھی فیض یابی کا موقع نہ مل سکا۔ ویسے بھی اس زمانے میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اِدھر اُدھر بکھر گئے تھے۔ اور ان کی تعداد بھی خاصی کم رہ گئی تھی۔

اس طرح جب دیہی لوگ، مفتوحہ علاقوں کے باشندے، قدیم رہائشی مرتدّین اور یہود و نصاریٰ ایک ساتھ اکٹھے ہوئے تو معاشرے کی ساخت میں بڑی تبدیلیاں پیدا ہوگئیں۔ ساتھ ساتھ معاشرتی تہذیب میں بھی تغیّر و تبدّل ہوا۔ اس طرح معاشرتی زندگی میں بڑی رنگا رنگ وسعت اور طرح طرح کے انحرافات پیدا ہوگئے۔ افواہوں کو قبول کیا جانے لگا جس کی وجہ سے معاشرہ بدامنی کا شکار ہوگیا۔[1]

معاشرے میں رونما ہونے والی تبدیلیاں:

یہ معاشرہ کئی طرح کے لوگوں سے تشکیل پایا تھا۔

1. ایک گروہ تو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا تھا جو اس معاشرے کی پہلی اینٹ تھے۔
2. اور دوسرے وہ لوگ تھے جنھیں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی صحبت میں دیر تک رہنے کا شرف حاصل تھا۔
3. اس معاشرے کا تیسرا حصہ مفتوحہ علاقوں کے باشندے تھے۔ ان کی تعداد فاتحین سے کہیں زیادہ تھی۔

[1] دارسات في عهد النبوة و الخلافة الراشدة للدكتور عبد الرحمن الشجاع (ص: ٣٧٩، ٣٨٠)

گو انتظام و انصرام فاتحین کے ہاتھوں میں تھا۔ اخلاقی، فکری اور لسانی طور پر اُنھی کا اثر ورسوخ تھا لیکن ان سب باتوں کے باوجود وہ اقلیت شمار ہوتے اور اُن کی تعداد آئے روز کم ہو رہی تھی۔ مفتوحہ علاقوں کے بیشتر باشندے اپنے ہی شہروں میں آباد تھے جبکہ کچھ لوگ مملکت کے دوسرے شہروں کی طرف بھی نقل مکانی کر گئے تھے۔

اگر چہ اس نقلِ مکانی پر ان کی حوصلہ افزائی نہیں ہوتی تھی لیکن انھیں روکنے کے لیے کوئی قانون بھی نہیں تھا۔ مفتوحہ علاقوں سے جو عجمی دار الخلافہ میں آ کر آباد ہوئے وہ بہت جلد فتنوں کا شکار ہو گئے کیوں کہ ان میں سے اکثریت ان لوگوں کی تھی جو اپنے مقتولین کا بدلہ نہ لے سکے تھے، اس لیے درجِ ذیل اسباب کی وجہ سے وہ بہت جلد فتنوں میں مبتلا ہو جاتے تھے:

- وہ مسلمان تو ہو چکے تھے لیکن اسلامی تعلیمات سے نا آشنا تھے اور ان کی اکثریت زمانۂ قریب ہی میں کفر کو چھوڑ کر اسلام لائی تھی۔ اسلام کی محبت پختہ نہ ہونے کی وجہ سے انھیں اپنے ملک اور عزت کے چھن جانے کا بڑا دکھ تھا۔
- عربی زبان سے نابلد ہونے کی وجہ سے دین کی زیادہ سوجھ بوجھ نہیں رکھتے تھے۔
- اہلِ عرب سے نفرت اور عجمیّت کا تعصّب تا حال ان میں موجود تھا۔
- ان میں سے ایک طبقہ صرف تلوار کے ڈر اور جزیہ ادا کرنے کے خوف سے ظاہری طور پر مسلمان ہوا تھا جب کہ دلی طور پر وہ مسلمانوں سے بُغض وعداوت رکھتا تھا جس کی وجہ سے وہ طبقہ موقع ملتے ہی فتنے میں کود پڑتا تھا۔
- خواہشات پرست لوگ اپنے مفاد کے حصول کے لیے انھیں ان کی مذکورہ کمزوریوں کی وجہ سے اکساتے رہتے تھے۔[1]

4. اس معاشرے کا چوتھا طبقہ دیہاتی لوگ تھے۔ ان میں بھی دوسرے لوگوں کی طرح متقی پرہیزگار، کافر اور منافق سبھی شامل تھے مگر ان میں فطری سختی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی اس فطری سختی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿ اَلۡاَعۡرَابُ اَشَدُّ كُفۡرًا وَّنِفَاقًا وَّاَجۡدَرُ اَلَّا یَعۡلَمُوۡا حُدُوۡدَ مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ عَلٰی رَسُوۡلِهٖ ۗ

[1] دراسات في الأهواء و الفِرق و البدع لناصر العقل (ص: ١٦١)

وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴾ [التوبة: ٩٧]

''دیہاتی کفر اور منافقت میں زیادہ سخت ہیں اور اس امر کے زیادہ لائق ہیں کہ وہ ان احکام کو نہ جان پائیں جو اللہ نے اپنے رسول پر نازل کیے اور اللہ خوب جاننے والا بہت حکمت والا ہے۔''

یہ اس لیے کہ وہ نہایت سخت دل، اکھڑ مزاج اور تُند خو تھے۔ اپنی انہی عادات وخصوصیات کی وجہ سے وہ شرعی احکام اور جہاد وغیرہ سے زیادہ دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔[1]

یہ لوگ بھی بہت جلد فتنوں کا شکار ہو جاتے تھے اور ان کے فتنوں میں الجھنے کے اسباب یہ تھے:

- ان میں دینِ اسلام کے بارے میں سوجھ بوجھ کی کمی تھی۔
- ان میں سے کوئی قرآن مجید کی تھوڑی سی تعلیم حاصل کر کے ہی دھوکے میں پڑ جاتا تھا، اور وہ یہ گمان کر لیتا تھا کہ وہ تھوڑی بہت سمجھ بوجھ حاصل کر کے عالم بن گیا ہے۔
- ان لوگوں کو علماء کی ناقدری کرنے، ان کی اقتداء نہ کرنے اور ان سے راہنمائی نہ لینے کا مرض لاحق تھا۔
- قبائلی تعصّب ان کے رگ وریشہ میں سرایت کر چکا تھا۔
- شریر النفس اور خواہشات پرست لوگ انھیں دھوکا دیتے اور ان کی سادگی اور جہالت سے فائدہ اٹھاتے تھے۔
- باہم میل جول اور شہری زندگی انھیں طبعاً ناپسند تھی۔ وہ طبیعت کی تیزی کی وجہ سے ناواقف لوگوں سے بہت جلد بدگمان ہو جاتے تھے۔ یہ صرف انہی کی نہیں بلکہ ہر دَور اور ہر علاقے کے بدوؤں کی یہی عادات ہوتی ہیں۔
- دین میں بڑے متشدّد تھے اور جہالت کی بنا پر ہٹ دھرمی کا شکار تھے۔ اس لیے خوارج کی اکثریت بدوؤں ہی پر مشتمل تھی۔[2]
- یہ جاہل بہت جلد فتنوں میں مبتلا ہو جاتے تھے، ان کی حالت یہ تھی کہ کچھ خارجیوں کے منہج پر کاربند تھے اور قرآن مجید ایک خاص فکر ونظر کی روشنی میں سمجھتے تھے۔ ان میں کچھ لوگ قرآنِ کریم کے مفہوم ہی سے ناآشنا تھے اور معاشرتی مسائل و معاملات سے نپٹنے کی صلاحیت سے بھی محروم تھے۔ ان پر

---

[1] دراسات في عهد النبوة والخلافة الراشدة للدكتور عبد الرحمن الشجاع (ص: ٣٨٠) نقلًا عن فتح القدير للشوكاني (٢/ ٣٩٥ ـ ٣٩٧)

[2] دراسات في الاهواء و الفِرق والبدع لناصر العقل (ص:١٦١)

مذہبی جنون سوار تھا۔ سمجھ بوجھ سے خالی تھے۔ اس وجہ سے ان کے اندر علم و بصیرت کے بغیر دینی غیرت کا اندھا جذبہ تھا۔ انجامِ کار کی فکر کیے بغیر ہی دینی غیرت کے نام پر خواہشات اور جذبات کی رو میں بہہ جاتے اور بہت جلد فتنوں کا شکار ہو جاتے تھے۔ شریعت کے قاعدے ''دَرْءُ الْمَفَاسِدِ أَوْلَىٰ مِنْ جَلْبِ الْمَصَالِحِ'' سے بھی ناواقف تھے۔ (اس قاعدے کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی کام میں منفعت بھی ہو اور نقصان بھی تو منفعت کو ترک کر دیا جائے گا اور نقصان سے بچا جائے گا)

ان کی حالت یہ تھی کہ اگر ان میں سے کسی کو چند آیات اور احادیث کا بھی علم ہو جاتا تو وہ سمجھتا تھا کہ وہ بہت بڑا عالم ہے، حالانکہ اسے آیات و احادیث کے مفہوم کا بھی علم نہ ہوتا تھا، ساتھ ہی وہ اپنے آپ کو مسلمانوں کی مصلحت کے لیے جوڑ توڑ کرنے والا بھی شمار کرنے لگتا تھا۔

❁ ان کی ایک خرابی یہ تھی کہ وہ اپنے آپ کو علماء اور ائمہ سے برتر سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ خود اُس مرتبے پر پہنچ چکے ہیں کہ انھیں علماء کی فقہ اور علم کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ بھی انسان ہیں اور ہم بھی انسان ہیں۔ انھوں نے علماء اور ائمہ کو چھوڑ کر اپنے لوگوں میں سے جہلاء ہی کو اپنا سردار مقرر کر لیا تھا۔

5 اس معاشرے کا پانچواں طبقہ مرتدّین کا تھا۔ ان کا اسلام میں رہنے کا دورانیہ نہایت تھوڑا تھا۔ ان کی اسلام سے نسبت صرف مفاد کی خاطر تھی۔ اِس سے انکار نہیں کہ ان میں سے کئی لوگ توبہ کرنے کے بعد نہایت متقی اور پرہیز گار ہو گئے تھے اور اُن کا شمار فضلاء میں ہوتا تھا، لیکن ان میں سے ایک طبقہ ایسا ضرور تھا جنھوں نے اسلام کی مٹھاس کو چکھا ہی نہیں تھا اور اسلام سے منسوب ہونے کے باوجود یہ لوگ اپنی سابقہ ذہنیت اور طرزِ فکر کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ دعوتِ اسلام سے پہلے کی عصبیّت آلود قبائلی نفسیات ابھی تک ان کے ذہنوں پر مسلّط تھی۔

انھوں نے گمان کر لیا تھا کہ اُن کے قبائلی تعصّب پر مبنی ان کے کردار اور اسلام کے بارے جو کچھ انھیں معلوم ہے اس میں کوئی تناقض نہیں ہے۔ یعنی وہ جو کچھ کر رہے ہیں، اسلام کے عین مطابق ہے۔[1]

مرتدّین کے مختلف گروہوں سے ایسی قوم تیار ہوئی جس نے فتنے کا ماحول پیدا کرنے میں نہایت گھناؤنا کردار ادا کیا۔ مرتدّین اگرچہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے ادوار میں بھی موجود تھے لیکن ان کے بارے

[1] دراسات في عهد النبوة و الخلافة الراشدة للدكتور عبد الرحمن الشجاع (ص: ٣٨١)

میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی پالیسی سابقہ دونوں خلفاء سے مختلف تھی جس کی وجہ سے یہ حالات پیدا ہوئے۔
امام شعبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنی وفات تک کسی مرتد سے کسی غزوے میں کوئی مدد نہیں لی۔''[1]

اس لیے بعض مرتدّین، جو بعد میں تائب بھی ہو گئے، پھر بھی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا سامنا کرتے ہوئے شرماتے تھے۔ اور جب تک حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ زندہ رہے وہ ان کے سامنے نہیں آئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں اس پالیسی میں کچھ نرمی آ گئی۔ انھوں نے ان مرتدّین کو، جو توبہ کر چکے تھے، شام اور عراق کے غزوات میں شرکت کی اجازت دے دی۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا دورِ حکومت آیا تو انھوں نے یہ پابندی ساری شرائط سمیت ختم کر دی۔ یوں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا جاری کردہ حکمِ امتناعی بھی ختم ہو گیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو شرائط مقرر کی تھیں انھیں بھی ختم کر دیا گیا۔ آپ نے یہ سمجھا کہ انھیں اپنے مرتد ہونے کے جرم کی کافی سزا مل چکی ہے اور اب وہ ارتداد کی دلدل سے نکل چکے ہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ان کی اصلاح کی خاطر انھیں عامل مقرر کر دیتے لیکن اس سے ان کی اصلاح نہ ہوئی بلکہ ان کی اس خیر خواہی نے انھیں سرکش بنا دیا۔

مرتدّین کو کوفہ وغیرہ میں عامل مقرر کرنے کا نقصان یہ ہوا کہ اس کے نتیجے میں اہلِ کوفہ بدل گئے اور اُن کے قائد حضرت عبدالرحمٰن بن ربیعہ باہلی رضی اللہ عنہ ترکوں سے ایک جنگ کے دوران شہید ہو گئے۔ جب کہ وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں ترکوں سے لڑتے تھے تو ترک ان سے اس قدر ڈرتے تھے کہ آپس میں ایک دوسرے سے کہتے تھے: عبدالرحمٰن ہم پر خواہ مخواہ حملہ نہیں کرتا۔ اس کے ساتھ یقیناً فرشتے ہوتے ہیں جو اسے موت سے محفوظ رکھتے ہیں۔''[2]

فتنوں کے دَور میں ان عوامل کے آثار بالکل کھل کر سامنے آ گئے۔ نتیجتاً حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا گیا۔ جن لوگوں پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے کا الزام ہے ان کا تعلق انہی مرتد قبائل سے تھا، مثلاً سودان بن حمران سکونی، قتیرہ بن فلان سکونی اور حکیم بن جبلہ عبدی وغیرہ۔[3]

---

[1] البداية و النهاية (٦/ ٣٤٧)

[2] تاريخ الطبري (٤/ ٣٨٢)

[3] عبد اللّٰه بن سبا واثره في احداث الفتنة للدكتور سلمان العوده (ص: ١٥٥۔ ١٥٧)

6 چھٹا طبقہ یہود و نصاریٰ کا تھا۔ ان کی بہت بڑی تعداد جزیرۃ العرب سے نکل گئی تھی یا انھیں نکال دیا گیا تھا، یہ لوگ بڑے شہروں، کوفہ اور بصرہ وغیرہ میں جا کر آباد ہو گئے تھے۔ اپنی طبعی رذالت کی وجہ سے یہ لوگ مفتوحہ علاقوں میں اپنا زہر پھیلانے لگے۔ ان کے سامنے دو مقاصد تھے:

- مالی اجارہ داری قائم کرنا، اس کے لیے وہ مختلف ذرائع اختیار کرتے تھے۔
- مسلمانوں میں انتشار پھیلانا تاکہ اُن کی غلط پالیسیاں کامیاب ہوں۔[1]

معاشرے میں تہذیبی تغیّرات:

مختلف معاشروں کے بہت سے لوگوں کے ساتھ ایک جگہ رہنے کی وجہ سے مختلف تہذیبوں میں بھی امتزاج پیدا ہوجاتا ہے۔ اسلامی سلطنت میں جہاں بہت سی قومیں اکٹھی ہوگئیں وہاں کئی تہذیبوں کا امتزاج بھی ہوا۔ اختلاط اگر اپنا کمال نہ بھی دکھاتا تب بھی مختلف تہذیبوں کا باہم گُھل مل جانا کچھ کم خطرناک نہیں تھا کیوں کہ آبادی کی کثرت کے ساتھ ساتھ کئی رنگا رنگ تہذیبوں، جداگانہ افکار ونظریات اور طرح طرح کے عقائد کے حامل افراد کا اسلامی معاشرے میں رہنا زبردست تبدیلی کے خدشات سے خالی نہ تھا۔ اس سے اسلامی معاشرے پر بہت بڑی ذمہ داری آپڑی تھی۔

مفتوحہ علاقوں کے باشندوں نے کوئی خاطرخواہ تربیت حاصل نہیں کی تھی۔ وہ مہاجرین وانصار صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی طرح جذبۂ اسلام سے سرشار نہیں ہوئے تھے۔

لوگوں میں گُھل مل جانے والے عرب قبائل بھی مہاجرین و انصار جیسے جذبۂ ایمانی کی تب و تاب سے محروم تھے۔ ان کی کثرتِ تعداد کی وجہ سے ان کی تعلیم و تربیت اُس نہج پر نہ ہوسکی تھی جس پر مہاجرین و انصار پروان چڑھے تھے۔ اس لیے نئے اسلام لانے والے اور اسلامی سلطنت میں شامل ہونے والے اپنے جاہلی اطوار و عادات کے نرغے سے پوری طرح نہ نکل سکے۔

اسلامی تعلیم کے میدان میں بھرپور کوشش کے باوجود بعض منفی رجحانات کو ختم کرنا ممکن نہیں تھا کیونکہ فتوحات کا دائرہ بڑی تیزی سے وسیع ہو رہا تھا، نہایت تھوڑے عرصے میں عراق، اس کے گردونواح کا علاقہ اور شام کے علاقے فتح ہو گئے تھے، اس لیے مفتوحہ علاقوں میں رہنے والے لوگوں کی بھاری اکثریت کے لیے صحیح تعلیم و تربیت انسانی طاقت سے باہر تھی۔[2]

---

[1] دراسات في عهد النبوة و الخلافة الراشدة للدكتور عبد الرحمن الشجاع (ص: ٣٨١)

[2] تحقيق مواقف الصحابة في الفتنة للدكتور محمد المحزون (١/ ٣٥٨)

اس کی وجہ یہ تھی کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم جن سے یہ امید وابستہ تھی کہ وہ اس امانت کو ادا کریں گے، ان کی کثیر تعداد جہاد کے میدانوں میں شہید ہو چکی تھی۔ بہت تھوڑے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم زندہ تھے، وہ بھی مختلف علاقوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ علم کے متلاشی ان کے اردگرد جمع رہتے تھے اور تعلیم حاصل کرتے تھے۔ یہ طبقہ تابعین کے نام سے معروف ہوا۔ اُن کی اکثریت بھی مخلص تھی، اس لیے میدانِ جہاد میں یہ بھی پیش پیش رہے اور ان کی بھی خاصی تعداد میدانِ جہاد میں شہید ہو گئی۔[1]

محدود وقت کی وجہ سے کئی تابعین کے دلوں میں بھی اسلامی تعلمات راسخ نہ ہو سکیں، یہ صورتِ حال دوسرے عوامل کے ساتھ مل کر نظریاتی خلیج اور اسلامی منہج پر منفی اثرات مرتب کرنے کا باعث بنی جس کے نتیجے میں سلطنتِ اسلامیہ عدمِ استحکام کا شکار ہو گئی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے آخری دَور میں یہ صورتِ حال پوری طرح کھل کر سامنے آ گئی۔[2]

نئی نسل کا ظہور:

معاشرے میں بہت بڑا تغیّر اُس وقت پیدا ہوا جب لوگوں کی ایک نئی نسل سامنے آئی۔ انھوں نے معاشرے میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی جگہ لے لی۔ یہ لوگ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے مختلف تھے۔ یہ نسل ایسے زمانے میں پروان چڑھی تھی جو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے دَور سے مختلف تھا اور جو صفات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں تھیں، نئی نسل اُن صفات سے خالی تھی۔[3]

اس نسل میں وہ خوبیاں ان لوگوں کی نسبت بہت کم تھیں جنھوں نے مملکتِ اسلامیہ کی تاسیس اور ترقی کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھایا تھا۔ اسلامی عقیدے کو صحیح طریقے سے سمجھنے اور مضبوط ایمان کی وجہ سے پہلی مسلمان نسل کے کئی امتیازات تھے، یہ خوبیاں مفتوحہ علاقوں کے باشندوں میں بدرجۂ اتم پیدا نہیں ہوئی تھیں۔ ان میں خود غرضی پیدا ہو گئی۔ ان کا خاندانی اور قومی تعصّب جاگ اٹھا۔ اور کچھ لوگ تو اپنی بہت سی جاہلانہ عادات کے ساتھ مسلسل چمٹے ہوئے تھے۔

- ان کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ فاتحین جنگوں اور نئی فتوحات میں مشغول ہو گئے اور ان کی طرف پوری توجہ

---

[1] اليمن في صدر الإسلام للدكتور عبد الرحمن الشجاع (ص: ٣٣٤)

[2] تحقيق مواقف الصحابة في الفتنة للدكتور محمد المحزون (١/ ٣٥٩)

[3] الدولة الأموية ليوسف العش (ص: ١٢٣)

نہ دے سکے۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم بعد والوں کی نسبت بہت کم فتنوں میں مبتلا ہوئے تھے۔ جوں جوں وقت کی رفتار بڑھتی گئی اور عہدِ نبوت سے دوری ہوتی گئی اختلاف و انتشار پھیلتا گیا۔ صورتِ حال یہ تھی کہ وہ پرانی ذہنیت کو سمجھتے تھے نہ اس کی حکمتوں کو ماننے کے لیے تیار تھے۔ وہ اسے قبول کرنے کی صلاحیت بھی نہیں رکھتے تھے۔ اس لیے نئی نسل کے منحرف لوگ بھی فتنہ پردازوں کے ساتھ شامل ہو گئے۔[1]

افواہوں کو معتبر سمجھنے کا مرض:

تاریخ کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مخلوط قوموں سے وجود میں آنے والے معاشرے کی فضا شر پھیلانے اور انتشار پیدا کرنے والوں کے لیے ہموار تھی اور اس میں اس قدر انحطاط پیدا ہو گیا تھا کہ بے پر کی افواہوں اور بے بنیاد خبروں کو بھی صحیح مان لیا جاتا تھا۔[2]

جب خارجیوں کے جارحانہ عزائم منظرِ عام پر آئے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور دوسرے لوگوں کے سامنے ان کے الزامات کا جواب دیا اور انھیں دلیل دینے کا پابند کیا۔ مسلمان خارجیوں سے لڑائی کرنے پر مُصر تھے مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا اپنے خلقی حلم و بردباری کی وجہ سے اصرار یہ تھا کہ نہیں! ہم عفو و درگزر کرنے سے کام لیں گے اور ہر ممکن طریقے سے انھیں سمجھائیں گے۔ کسی سے اس وقت تک دشمنی اور جنگ نہیں کریں گے جب تک وہ حد سے تجاوز نہیں کرتا اور واضح طور پر کفر کا مرتکب نہیں ہوتا۔[3]

مدینہ منورہ سے کبار صحابہ رضی اللہ عنہم کی دوسرے شہروں میں منتقلی:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قریش کے جلیل القدر مہاجرین صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم پر پابندی لگا رکھی تھی کہ وہ کسی دوسرے شہر میں منتقل نہ ہوں۔ اگر کوئی کہیں جانا چاہتا تو امیر المومنین سے باقاعدہ اجازت لیتا اور وہاں اپنے قیام کی مدت کا تعیّن بھی کرتا۔ اگر ان میں سے کوئی جہاد میں شریک ہونے کی اجازت طلب کرتا تو آپ اس سے فرماتے:

''تم رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ فلاں غزوے میں شریک ہوئے تھے۔ بس وہی کافی ہے۔ اب تمھارے لیے جہاد میں شریک ہونے سے بہتر ہے کہ تم دنیا کو دیکھو نہ دنیا تمھیں دیکھے۔''

[1] ذو النورين عثمان بن عفان لمحمد مال الله (ص: ٩٩)

[2] دراسات في عهد النبوة و الخلافة الراشدة للدكتور عبد الرحمن الشجاع (ص: ٣٨٢)

[3] تحقيق مواقف الصحابة في الفتنة للدكتور محمد امحزون (١/ ٣٦٤)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ برسرِ اقتدار آئے تو انھوں نے نرمی اختیار فرمائی، مہاجرین و انصار کو مدینے سے نقل مکانی کی اجازت دے دی۔ امام شعبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''حضرت عثمان رضی اللہ عنہ برسرِ اقتدار آئے تو انھوں نے اُن مہاجرین کو باہر جانے کی اجازت دے دی، جن پر پابندی تھی۔ وہ مختلف شہروں میں پھیل گئے۔ لوگ اُن پر ٹوٹ پڑے، اس طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ لوگوں میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے زیادہ مقبول ہو گئے اور نہایت پسندیدہ شخصیت شمار ہونے لگے۔''[1]

جاہلی عصبیّت:

ابن خلدون کا بیان ہے: ''جب فتوحات تکمیل کو پہنچیں اور ملتِ اسلامیہ کی سلطنت بھی مکمل ہوگئی تو اہلِ عرب کوفہ، بصرہ، شام اور مصر میں جگہ جگہ قیام پذیر ہو گئے۔ اُن میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبتِ مبارکہ سے فیض یافتہ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق وآداب سے آشنا صرف مہاجرین و انصار، قریش، اہلِ حجاز یا ان کے علاوہ کچھ اور خوش قسمت حضرات تھے۔

جب مشکلات و مصائب کے دن بیت گئے اور حالات قدرے بہتر ہوئے، نیز دشمن خائب و خاسر ہو گیا اور سلطنتِ اسلامیہ مستحکم ہوگئی تو وہ جاہلی تعصّب جو صحابہ کی دین داری سے دب گیا تھا، دوبارہ سر اٹھانے لگا۔ عرب اور دیگر قبائل اپنے اوپر مہاجرین و انصار کی حکومت ناگوار محسوس کرنے لگے اور بغاوت پر آمادہ ہو گئے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے آخری دَور میں ایسے حالات پیدا ہوگئے جس سے اُن باغیوں کی سوچ کو شہہ ملی اور وہ آپ کے مقرر کردہ مختلف شہروں کے گورنروں کی عیب جوئی کرنے لگے۔ انھوں نے ان کی جاسوسی کو اپنا مشغلہ بنا لیا۔ ان کی ہر ہر حرکت نوٹ کرتے۔ انھوں نے اطاعت و فرمانبرداری سے ہاتھ کھینچ لیا۔ خود مختاری کے نام پر ان سے خلاصی پانے اور ان کی معزولی کا مطالبہ کرنے لگے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر تنقید شروع کردی، یہ خبریں ان کے ہم مشرب لوگوں میں بڑی تیزی سے پھیل گئیں، اور انھوں نے بڑی مکاری سے آگے بڑھ کر ہر طرف پھیلا دیں۔

یہاں تک کہ مدینہ منورہ میں موجود بعض صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم تک بھی یہ خبریں پہنچ گئیں۔ اور وہ بھی ان سے متاثر ہوئے اور شکوک وشبہات کا شکار ہو کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو معزول کرنے کی کوشش کرے لگے اور آپ سے مطالبہ کرنے لگے کہ وہ اپنے مقرر کردہ گورنروں کو معزول کریں۔ آپ نے ان خبروں کی تصدیق

[1] تاريخ الطبري (٥/ ١٤٤)

اور حالات کا جائزہ لینے کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی۔ وہ حالات کا جائزہ لینے کے بعد واپس آئے اور کہا:

''حالات معمول کے مطابق ہیں اور ہمیں کوئی ایسی بات معلوم نہیں ہوئی جو قابلِ اعتراض ہوا۔ نہ مسلمان شہریوں اور عوام الناس نے کوئی ایسی بات کہی۔''[1]

ایسے حالات میں اُن بدو لوگوں میں جو غزوات میں مصروف رہے اور دین سے زیادہ واقفیت نہیں رکھتے تھے، ایسی گفتگو کرنا اور سوچ پیدا کرنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ اُن سے کسی بھی ہنگامے کی توقع کی جاسکتی تھی۔ انھیں صرف مہمیز لگانے کی ضرورت تھی اور انھیں بھڑکانے کے لیے ایک اشارہ ہی کافی تھا۔ وہ اضطراب و انتشار اور فتنوں کا پہاڑ کھڑا کر سکتے تھے۔ اور یہ خدشہ صحیح ثابت ہوا۔ اسلام دشمن عناصر نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور ان کے جذبات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انھیں خوب بھڑکایا حتیٰ کہ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مباح اور مصالح کی خاطر کیے گئے اقدامات کو غیر شرعی سمجھنے لگے اور یہ سمجھ بیٹھے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اسلام سے (معاذ اللہ) غداری اور اپنے پیش روؤں کے طریقے کی مخالفت کر رہے ہیں۔ جاہل لوگوں کی نظروں میں یہ مسائل بڑے سنگین تھے، لہٰذا انھوں نے اس آڑ میں خلیفۂ راشد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خون کو مباح سمجھا یا پھر خون کرنے والوں کی معاونت کی اور قیامت تک کے لیے مسلمانوں پر فتنوں کا دروازہ کھول دیا۔

حاسدوں کی سازشیں:

منافق اور مفتوحہ قوموں کے باشندے بھی اسلام میں داخل ہو گئے لیکن اسلام کے خلاف نفرت اور کینہ اُن کے دلوں میں پرورش پاتا رہا اور وہ نہایت مکاری اور عیاری سے فتنہ برپا کرنے کے لیے موقع کی تلاش میں رہے۔ اس کے لیے وہ مسلمانوں کے کمزور پہلوؤں کو نوٹ کرتے رہے۔ پھر ان مقاصد کے حصول کے لیے انھیں ہم مشرب مل گئے جو انھیں مکمل اطلاعات فراہم کرتے تھے جس کے نتیجے میں فتنے برپا ہوئے۔[2]

یہود و نصاریٰ اور ایرانی مسلم معاشرے کا حصہ بن چکے تھے۔ اور ان کی اسلام، مسلمانوں اور مملکتِ اسلامیہ سے دشمنی اور حسد کی وجوہ بھی بالکل واضح ہیں کہ انھیں اپنے اقتدار اور سیادت کے کھوجانے کا قلق

[1] تاريخ ابن خلدون (٢/ ٤٧٧)

[2] الأساس في السنة للدكتور سعيد حوّىٰ (٤/ ١٦٧٦)

تھا جو تا حال اُن کے دلوں میں آگ کی طرح سلگ رہا تھا۔ انھیں شہروں کے شر پسند، بادیہ نشین قبائل، خانہ بدوش اور مدینہ کے غلاموں کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا تھا۔

یہ پاجی لوگ شر پھیلانے کے لیے متحد ہو گئے۔ وہ نہایت بداخلاق، وحشی، اکھڑ مزاج اور شور وغل برپا کرنے والے قبائل کے گھٹیا لوگ تھے۔ نہایت سِفلی خیالات کے مالک اور شیطان کے آلۂ کار تھے۔[1]

اپنے بڑوں کا بدلہ نہ لے سکنے والے اُن حاسدوں میں عبد اللہ بن سبا صنعانی یہودی کا نام بار بار کتبِ تاریخ میں آتا ہے۔ وہ یہودی تھا، پھر نام نہاد مسلمان ہو گیا۔ کسی نے اس کے ناپاک ارادوں کی تحقیق ہی نہ کی اور وہ بحیثیت مسلمان اسلامی شہروں میں دندناتا رہا۔

یہاں تک کہ عوام الناس کے بہت بڑے طبقے کو بھی اپنا ہمنوا بنا لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر الزام تراشی میں نہایت مبالغے سے کام لیا گیا۔ وہ الزامات جو آپ کی زندگی میں آپ پر لگائے گئے اور آپ نے خود ان کے جوابات دیے یا آپ کی وفات کے بعد مؤرخین نے اپنی کتابوں میں آپ پر الزام لگائے، وہ سراسر باطل تھے۔ ان میں سے کوئی الزام اس قدر سنگین نہیں کہ اس کی وجہ سے آپ کو شہید کر دیا جاتا۔[2]

لوگوں کو برانگیختہ کرنے کے لیے مختلف وسائل و ذرائع کا استعمال:

شر پسند عناصر نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بدنام کرنے اور اسلامی معاشرے کی ساکھ کو سبوتاژ کرنے کے لیے مختلف انداز اختیار کیے۔ اُن میں سے چند قابلِ ذکر یہ ہیں:

- افواہیں پھیلائی گئیں اور یہ سلسلہ اس قدر وُسعت اختیار کر گیا کہ یہی باتیں موضوعِ سخن بن گئیں۔
- اشتعال پھیلایا گیا۔
- لوگوں کے سامنے بھرے مجمع میں تنقید کی گئی اور خلیفہ سے جھگڑا اور مناظرہ کیا گیا۔
- گورنروں پر تنقید کی گئی۔
- جلیل القدر صحابۂ کرام سیدہ عائشہ، حضرت علی، حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہم کی طرف جھوٹے اقوال اور خطوط منسوب کیے گئے۔

---

[1] شرح النووي (١٥/ ١٤٨۔ ١٤٩) تاريخ الطبري (٥/ ٢٣٧)

[2] دراسات في عهد النبوة و الخلافة الراشدة للدكتور عبد الرحمن الشجاع (ص: ٣٩٣ ـ ٤٠٠)

۞ اس بات کو عام کیا گیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ خلافت کے زیادہ حقدار تھے اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعد ان کے حق میں خلافت کی وصیّت کی تھی۔ اس شر پسند ٹولے نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے وصیت کے باطل دعوے کو ثابت کرنے کے لیے کہا: ''ہزار ہا نبی تھے اور ہر نبی کا وصی تھا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے وصی تھے ...'' پھر کہا: ''حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء تھے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ خاتم الاوصیاء ہیں۔''

جب یہ باتیں اس ٹولے کے سرغنہ ابنِ سبا کے پیروکاروں کے ذہنوں میں پختہ ہوگئیں اور وہ اُس کے گرویدہ ہو گئے تو وہ اپنے طے شدہ ہدف کی طرف پلٹا اور وہ یہ تھا کہ لوگ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت کریں۔ اس نے بعض لوگوں سے کہا: ''رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیّت کو نافذ نہ کرنے والے سے بڑا ظالم کون ہے؟ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصی کے حق پر ڈاکہ ڈال کر خود امت کے معاملات سنبھالنے والے سے بڑا ظالم کون ہوسکتا ہے؟'' پھر بعد میں کہنے لگا: ''حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خلافت کے مستحق نہیں تھے، انھوں نے ناجائز قبضہ کیا ہے۔ اٹھو! یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصی ہیں، انھیں ان کا حق دلانے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ امراء پر طعن کرنا شروع کر دو اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا لبادہ اوڑھ کر لوگوں کو اپنی طرف مائل کرو اور انھیں خلیفہ کی معزولی کی دعوت دو۔''[2]

پھر اس نے اپنے کارندے پھیلا دیے اور مختلف علاقوں کے شر پسند عناصر سے رابطے شروع کر دیے اور خفیہ طریقے سے انھیں اپنے عزائم بتائے۔ انھوں نے بھی اس سے خط کتابت کی اور مقاصد سے آگاہ کیا۔

۞ ان حالات میں باغیوں نے بصرہ، کوفہ، شام اور مصر ہر شہر میں چار گروہ تشکیل دیے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پہلے سے ہی طے شدہ سازش تھی۔ اس بات نے اہلِ مدینہ کو شبہات میں ڈال دیا کہ شاید صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے کہنے پر آئے ہیں، پھر ہنگامے شروع ہو گئے یہاں تک کہ معاملہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت پر منتج ہوا۔

اِس کے علاوہ باغیوں نے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے بعض نعروں کو آڑ بنایا۔ انھوں نے اللہ کی بڑائی کا نعرہ بلند کیا کہ ہمارا مقصد اللہ کی کبریائی قائم کرنا ہے۔ ان کا نعرہ تھا کہ ہمارا یہ جہاد مظالم کے

[1] تاریخ الطبري (٥/ ٣٤٧)
[2] تاریخ الطبري (٥/ ٣٤٨)

خلاف ہے، وہ کہتے تھے: ''ہم یہ سب کچھ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دینے کے لیے کر رہے ہیں۔ جن وسائل کو انھوں نے اپنے مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنایا اُن میں سے یہ بھی تھا کہ گورنروں کو تبدیل کیا جائے اور انھیں معزول کرایا جائے۔ بالآخر انھوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے خلافت سے دستبر دار ہونے کا مطالبہ کر دیا اور اس قدر جرأت مند ہو گئے کہ صرف دستبرداری کے مطالبے ہی پر اکتفاء نہ کیا بلکہ خلیفہ کو شہید کرنے پر تل گئے، بالخصوص جب انھیں یہ خبریں موصول ہوئیں کہ مختلف شہروں کے باشندے خلیفہ کی نصرت کے لیے مدینہ کا رخ کر چکے ہیں تو وہ اور زیادہ پُر جوش ہوگئے اور ہر قیمت پر خلیفہ کو شہید کرنے کی ٹھان لی۔[1]

دوسرا حربہ اس نے یہ اختیار کیا کہ اپنے ہم مشرب لوگوں کو حکم دیا کہ وہ مختلف شہروں سے ایک دوسرے کو ایسے خطوط لکھیں جن میں اپنے شہر کی صورتِ حال کو نہایت مایوس کن اور خطرناک ظاہر کریں، تاکہ تمام شہروں کے باشندے یہ سمجھیں کہ پورے ملک میں صورتِ حال بگڑ گئی ہے اور اب مزید مہلت کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس صورتِ حال سے یقیناً سبائیوں نے فائدہ اٹھایا کیوں کہ لوگوں کی طرف سے اس صورتِ حال کی تصدیق کے بعد اُن کے لیے اسلامی معاشرے میں فتنے کی آگ بھڑکانا آسان ہوگیا۔[2]

ابن سبا مصر میں پروان چڑھا۔ وہیں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف منصوبہ بندی کرتا رہا اور لوگوں کو اکساتا رہا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خلافت پر زبردستی قابض ہوئے ہیں۔ انھوں نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصی حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حق غصب کیا ہے۔[3]

اُس نے لوگوں کو کچھ خطوط دکھا کر دھوکا دیا کہ یہ کبار صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف سے آئے ہیں، وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے نجات چاہتے ہیں۔ جب یہ لوگ چڑھائی کر کے مدینہ منورہ آئے اور اُن کبار صحابہ رضی اللہ عنہم سے اُن کی ملاقات ہوئی تو انھوں نے کسی ایک صحابی کو بھی اس فتنے کے لیے تیار نہ پایا۔ انھوں نے اپنی طرف منسوب ان تمام خطوط سے لاعلمی اور لاتعلقی کا اظہار کیا جن میں لوگوں کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بھڑکایا گیا تھا۔[4]

---

[1] دراسات في عهد النبوة و الخلافة الراشدة للدكتور عبد الرحمن الشجاع (ص: ٤٠١ ـ ٤٠٢)

[2] الدولة الأموية ليوسف العش (ص: ٦٨) التحقيق للدكتور محمدالمحزون (١/ ٣٣٠)

[3] تاريخ الطبري (٥/ ٣٤٨)

[4] تحقيق مواقف الصحابة في الفتنة للدكتور محمد المحزون (١/ ٣٣٠) تاريخ الطبري (٥/ ٣٤٨ـ ٣٥٦)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بھی اس بدلتی ہوئی صورتِ حال کو بھانپ گئے کہ اندرونِ خانہ کوئی سازش ہو رہی ہے اور امت کسی شر میں مبتلا ہو رہی ہے، چنانچہ انھوں نے فرمایا: ''اللہ کی قسم! فتنے کی چکی گھومنے والی ہے۔ (حضرت) عثمان (رضی اللہ عنہ) کے لیے اچھا ہے کہ فوت ہو جائے اور اس کا شمار اس فتنے کو بھڑکانے والوں میں نہ ہو۔''[1]

لوگوں نے دیکھا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تو حقوق کی پاسداری کرنے والے ہیں بلکہ جو باتیں انھوں نے آپ کی طرف منسوب کیں، آپ نے بالمشافہ ان کے جوابات دیے۔ ان الزامات کو غلط ثابت کر کے ان کی تردید کی اور اپنی سچائی ثابت کر دی۔ یہاں تک کہ اُن بدوؤں میں سے ایک بدو مالک الاشترنخعی پکار اٹھا: ''لگتا ہے امیر المومنین کے ساتھ اور تمھارے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔''[2]

امام ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ لوگوں کے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف متحد ہو جانے کے اسباب میں سے ایک سبب ابن سبا کا ظہور، اس کا مصر جانا اور لوگوں میں خود ساختہ افواہیں پھیلانا بھی ہے۔ اسی وجہ سے بہت سے مصری باشندے فتنے میں مبتلا ہوئے۔[3]

کم ظرف و کینہ پروروں کی سرگرمیاں:

گھٹیا قسم کے لوگ اور اجڈ بدو اُن لوگوں سے ملتے جلتے تھے جو اسلام میں سبقت، جہاد میں شرکت، اسلام کے لیے آزمایش اٹھانے، علم و تقویٰ اور ریاست میں بلند مرتبے پر فائز ہو چکے تھے اور سلطنت کے امور میں ان سے مشورہ لیا جاتا تھا۔

جب گورنر اُن صاحبِ فضیلت لوگوں کو ترجیح دیتے اور اُن گھٹیا اور بدو لوگوں کو چھوڑ کر ان سے مشورہ کرتے تو وہ گورنروں کو مطعون ٹھہراتے اور کہتے کہ یہ ناانصافی ہے۔ یہ بے رخی ہے۔ ہمیں دور رکھا جا رہا ہے۔ کینہ پرور اور اپنی شکست کا بدلہ نہ لے سکنے والے لوگوں نے ان کی اس ذہنیت سے خوب فائدہ اٹھایا اور اُن کے دلوں میں خلیفہ اور ریاست کے لیے نفرت پیدا کر دی۔

اسلام دشمن یہودی، عیسائی، مجوسی اور شکست کا بدلہ نہ لے سکنے والے لوگ مسلسل اسلام اور

---

[1] تاريخ الطبري (٥/ ٣٥٠)

[2] تحقيق مواقف الصحابة في الفتنة للدكتور محمد المحزون (١/ ٣٣١)

[3] البداية والنهاية (٧/ ٢٦٧- ١٦٨)

مسلمانوں کے خلاف سازشوں میں مصروف رہتے تھے۔ خلیفہ اور گورنروں کے متعلق غلط افواہیں پھیلاتے رہتے تھے۔

ان دشمنوں نے ایک گھناؤنی خفیہ تنظیم بنائی۔ پھر انھوں نے بڑے شہروں اور کئی صوبوں میں اپنے حواری تلاش کر لیے اور ان کے مابین خفیہ رابطے کا نیٹ ورک بنا لیا۔ اُس ناپاک جماعت کی اہم شاخیں کوفہ، بصرہ اور مصر میں تھیں۔ بعض عناصر مدینہ منورہ اور شام کے علاقے میں بھی موجود تھے۔ اور جو کچھ وہ سنتے تھے اس کی تصدیق کرتے تھے۔ اس بنیاد پر سبائیوں نے زمین میں فساد برپا کیا، مسلمانوں میں بگاڑ پیدا کیا، ان کی وحدت کو پارہ پارہ کیا، ان کے بھائی چارے اور اتحاد کی دھجیاں بکھیر دیں اور لوگوں کو امراء اور گورنروں کے خلاف بھڑکایا حتیٰ کہ خود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف جھوٹی افواہیں پھیلائیں۔ انھوں نے یہ کام نہایت چالاکی اور مہارت سے انجام دیا۔ یہ لوگ کرتے کچھ تھے اور کہتے کچھ تھے۔ ان کے ظاہر و باطن میں تضاد تھا۔ اُن کا ہدف حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو خلافت سے معزول کرنا اور مملکتِ اسلامیہ کو ختم کرنا تھا۔[1]

فتنہ پرور لوگوں کی کارروائیاں:

۳۳ھ میں ایک روز حضرت سعید بن عاص رضی اللہ عنہ کھلی کچہری میں لوگوں کے درمیان تشریف فرما تھے۔ لوگ باہم گفت وشنید میں مشغول تھے کہ فتنہ پرور خارجیوں کے چند افراد وہاں آن پہنچے اور ماحول کو خراب کرنے اور فتنہ برپا کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ قریب تھا کہ دونوں گروہوں میں لڑائی شروع ہو جاتی لیکن حضرت سعید بن عاص رضی اللہ عنہ معاملے کو سلجھانے میں کامیاب ہو گئے اور معاملہ رفع دفع کر دیا۔[2]

جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اس واقعہ کا علم ہوا تو آپ نے حضرت سعید رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ اس صورتِ حال کو حکمتِ عملی سے کنٹرول کریں اور جس قدر جلدی ممکن ہو فتنے کا دروازہ بند کریں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حکم کے مطابق حضرت سعید رضی اللہ عنہ نے انھیں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس شام بھیج دیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو لکھا: ''کوفہ کے چند فتنہ پرور افراد کو آپ کی طرف بھیجا جا رہا ہے، آپ انھیں ڈرا دھمکا کر ادب سکھائیں، نیز ان کی کڑی نگرانی رکھیں، پھر اگر ان میں کوئی بھلائی محسوس کریں تو اسے ان سے قبول کریں۔''[3]

[1] الخلفاء الراشدون للخالدي (ص: ١٢٦)

[2] تاريخ الطبري (٥/ ٣٢٣)

[3] تاريخ الطبري (٥/ ٣٢٤)

ابن سبا اور اس کی کابینہ کی کوششیں خفیہ طور پر چھے سال تک جاری رہیں۔ ۳۰ھ کو انھوں نے اپنے شیطانی کھیل کا آغاز کیا اور ۳۵ کے آخر میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے میں کامیاب ہو گئے، پھر اُن کے فسادات کا سلسلہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت میں بھی جاری رہا۔ سبائیوں نے یہ بھی طے کیا کہ فتنے کا آغاز کوفہ سے کیا جائے۔[1]

لاتوں کے بھوت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دربار میں:

جب یہ لوگ شام پہنچے تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اُن کی خوب آؤ بھگت کی۔ انھیں مریم نامی گرجے میں ٹھہرایا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حکم سے اُن کے عراق والے وظائف بھی جاری کردیے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ صبح اور شام کا کھانا ان کے ساتھ کھاتے، اِسی دوران ایک دن اُن سے کہنے لگے: ''تم لوگ عرب میں سے ایک زبان دراز اور غیبت کرنے والی قوم ہو۔ تم نے اسلام کے ذریعے سے عزت حاصل کی۔ اسی کی بدولت دوسری قوموں پر غالب آئے اور ان کے مراتب و میراث پر قبضہ کیا۔ مجھے اطلاع ملی ہے کہ تم قریش سے نالاں ہو، حالانکہ اگر قریش کا قبیلہ تمھارے لیے ڈھال نہ ہوتا تو تم اُسی طرح ذلیل و رسوا رہتے جیسا کہ تم پہلے تھے۔''[2]

ان میں سے ایک شخص نے کہا: ''آپ نے قریش کا ذکر کیا ہے مگر قریش عرب کی اکثریت نہیں ہیں۔ نہ وہ جاہلیت میں زیادہ طاقتور تھے کہ آپ ہمیں ان سے خوفزدہ کریں۔ اور آپ نے ڈھال کا جو تذکرہ کیا ہے، جب ڈھال ٹوٹے گی تو ہمارے لیے میدان صاف ہو جائے گا۔'' حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اب مجھے تمھارا علم ہوگیا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ تمھاری بیوقوفی نے تمھیں یہ باتیں کرنے پر آمادہ کیا ہے اور تم اُسی گروہ کے نمائندے ہو لیکن تم میں عقل نہیں ہے۔ میں تم سے اسلام کا ذکر کر رہا ہوں اور تم جاہلیت کی باتیں کرتے ہو۔ اللہ ان لوگوں کو رسوا کرے جنھوں نے تمھارے معاملے کو اہمیت دی اور اسے تمھارے خلیفہ کے سامنے پیش کیا۔''[3]

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بھانپ گئے کہ یہ لاتوں کے بھوت ہیں، باتوں سے ماننے والے نہیں، کیوں

---

[1] الخلفاء الرشدون للخالدی (ص: ۱۳۰)

[2] تاريخ الطبري (٥/ ٣٢٤)

[3] تاريخ الطبري (٥/ ٣٢٤)

کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے انھیں سمجھانے کے لیے فکری، سیاسی اور ثقافتی ہر حربہ استعمال کیا تھا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے انھیں سب سے پہلے اسلام اور زمانۂ جاہلیت میں قریش کو جو مقام و مرتبہ حاصل تھا اس سے آگاہ کیا، پھر انھیں اُن کے اپنے قبائل کی رذالت اور جاہلیت میں اُن کی پستی کا احساس دلایا اور انھیں بتایا کہ تم جس علاقے سے تعلق رکھتے ہو، قدرتی طور پر وہاں کی آب و ہوا ناخوشگوار اور پیداوار بدبودار ہے، پھر سیاسی طور پر بھی تم ایرانیوں کے محکوم اور ماتحت تھے۔ اللہ نے تمھیں اسلام کے ذریعے عزت بخشی۔ تمھاری ذلت عزت میں بدل گئی اور تم پستی کے بعد بلند ہو گئے۔

دوبارہ نصیحت:

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اُن کے پاس اگلے روز پھر آئے۔ دیر تک اُن سے گفتگو کرتے رہے۔ فرمایا: ''اے شر پسندوں کی جماعت! مجھے صحیح جواب دو یا پھر خاموش رہو۔ غور و فکر کرو اور جائزہ لو کہ تمھارے اور تمھارے اہلِ خانہ کے لیے کیا بہتر ہے؟ تمھارے خاندان، عزیز و اقارب اور مسلمانوں کا فائدہ کس میں ہے؟ اُس کے حصول کی کوشش کرو۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی انھیں راہِ راست پر لانے کی آخری کوشش کی تھی۔ اِس بار انھوں نے سمجھانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ اپنے علم و حلم اور ایڑی چوٹی کا زور لگا کر انھیں فتنے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ انھیں اللہ سے ڈرنے، اس کی فرمانبرداری کرنے اور مسلمانوں کی جماعت کے ساتھ جُڑے رہنے کی ترغیب دی۔ گروہ بندی سے نفرت دلانے کی کوشش کی۔ مگر اُن کی زبان کھلی تو وہ یہ کہہ کر مخاطب ہوئے: ''تیری اطاعت کے لیے ہم اللہ کی نافرمانی نہیں کر سکتے۔''[1]

کوفہ کے شریروں کے بارے میں امیر المومنین کے نام حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا خط:

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو لکھا:

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم! معاویہ بن ابو سفیان (رضی اللہ عنہما) کی طرف سے اللہ کے بندے امیر المومنین (حضرت) عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف۔ اما بعد: ''امیر المومنین! آپ نے ایسے لوگوں کو میرے پاس بھیجا ہے جو شیاطین کی زبان میں گفتگو کرتے ہیں اور شیاطین اُن کی راہنمائی کرتے ہیں۔ وہ لوگوں کے پاس آ کر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ قرآن کی دعوت پیش کرتے ہیں، اِس طرح یہ لوگ مسلمانوں کو غلط فہمی میں مبتلا کرتے

[1] تاریخ الطبري (٥/ ٣٣٠۔ ٣٣١)

ہیں کیوں کہ ہر شخص اُن کا مقصد نہیں سمجھتا۔ اُن کا مقصد تفرقہ بازی اور انتشار پھیلانا ہے۔ وہ فتنے کی فضا پیدا کر رہے ہیں، اسلام انھیں مشکل معلوم ہو رہا ہے۔ وہ اسلام سے بیزار ہیں۔ شیطان کی غلامی اُن کے دلوں میں اتر چکی ہے۔ انھوں نے اہلِ کوفہ کے بہت سے ایسے افراد کو بھی جن کا اُن سے کوئی واسطہ نہیں، خراب کر دیا۔ مجھے خدشہ ہے کہ اگر یہ شام میں رہے تو اپنی چالبازیوں اور سحر بیانی کی وجہ سے یہاں کے باشندوں کو بھی خراب کریں گے، اس لیے آپ انھیں اِن کے شہر لوٹا دیں تاکہ وہ اُسی شہر میں رہیں جہاں سے اِن کی منافقت پھوٹی ہے۔''[1]

شر پسندوں کی کوفہ واپسی اور جزیرہ کی طرف جلاوطنی:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کوفہ کے گورنر حضرت سعید بن عاص رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ ان شر پسندوں کو واپس بلا لو۔ انھوں نے انھیں بلا لیا۔ وہاں پہنچ کر ان کی زبانیں پہلے سے بھی زیادہ کھل گئیں۔ بالآخر حضرت سعید بن عاص رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ وہ اِن سے بہت تنگ آ گئے ہیں۔ اِس پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انھیں جواباً لکھ بھیجا کہ انھیں حضرت عبدالرحمٰن بن خالد بن ولید رضی اللہ عنہما کے پاس بھیج دو۔ وہ حمص کے امیر تھے۔[2]

جب وہ حمص پہنچے تو حضرت عبدالرحمٰن بن خالد رضی اللہ عنہما نے انھیں طلب کیا اور اُن کی خوب سرزنش کی، انھوں نے کہا:

''اے شیطان کے آلہ کارو! ہم تمھارا خیر مقدم نہیں کرتے۔ نہ تمھاری تعظیم کرتے ہیں۔ شیطان عاجز اور رسوا ہو گیا ہے مگر تم ابھی تک باطل کو پھیلانے کے لیے مستعد اور ہوشیار ہو۔ اگر عبدالرحمٰن (رضی اللہ عنہ) نے تمھیں ادب سکھا کر ٹھیک نہ کیا تو اللہ اِس کا بھلا نہ کرے۔ میں تمھیں عاجز اور ذلیل کر کے چھوڑوں گا۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں تم سے کس طرح خطاب کروں، تم کون ہو؟ عربی ہو یا عجمی؟ کان کھول کر سن لو! مجھ سے اس طرح گفتگو نہ کرنا جس طرح میری اطلاع کے مطابق تم (حضرت) معاویہ (رضی اللہ عنہ) سے کیا کرتے تھے۔ میں (حضرت) خالد بن ولید (رضی اللہ عنہ) کا فرزند ہوں! جسے آزمانے والے آزما چکے ہیں۔ میں ارتداد کی کمر توڑنے والے کا بیٹا ہوں۔ اللہ کی قسم! میں تمھیں ذلیل اور عاجز کر کے چھوڑوں گا۔''

---

[1] تاريخ الطبري (٥/ ٣٣١)

[2] تاريخ الطبري (٥/ ٣٣١)

حضرت عبد الرحمٰن رضی اللہ عنہ نے انھیں مکمل ایک ماہ اپنے پاس رکھا۔ ان پر سختی کی اور ان کی مکمل نگرانی کی۔ حضرت سعید اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کی طرح اُن سے نرمی نہیں برتی۔ وہ جہاں جاتے انھیں اپنے ساتھ لے جاتے۔ وہ پیدل چلتے تو انھیں بھی پیدل چلاتے اور غزوات میں بھی انھیں ساتھ لے جاتے۔

حضرت عبد الرحمٰن رضی اللہ عنہ کا اُن کے ساتھ یہ رویہ بارآور ثابت ہوا۔ اُن کی سختی اور جزم وقساوت نے انھیں گونگا کر دیا، وہ توبہ اور ندامت کا اظہار کرتے ہوئے کہنے لگے: ہم اللہ کے حضور توبہ کرتے ہیں، اور اس سے معافی مانگتے ہیں۔ آپ ہمیں معاف کر دیں، اللہ آپ کو معاف کرے گا۔ ہم سے درگزر فرمائیں، اللہ آپ سے درگزر فرمائے گا۔'' وہ مسلسل معافی مانگتے رہے۔ بالآخر حضرت عبد الرحمٰن رضی اللہ عنہ نے انھیں کے ایک ساتھی اشتر نخعی کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجا کہ جا کر انھیں اپنی توبہ کی خبر دو اور بتاؤ کہ ہم انسان بن گئے ہیں اور اپنے عزائم سے بھی تائب ہو گئے ہیں۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اشتر سے کہا: ''تم جہاں چاہو جا سکتے ہو، میں تمھیں اور تمھارے ساتھیوں کو معاف کرتا ہوں۔'' اشتر نے کہا کہ ہم حضرت عبد الرحمٰن بن خالد بن ولید رضی اللہ عنہما کے پاس ہی رہنا چاہتے ہیں۔ اس نے حضرت عبد الرحمٰن رضی اللہ عنہ کے فضائل و مناقب بھی بیان کیے۔ پھر کچھ عرصہ وہ جزیرہ میں حضرت عبد الرحمٰن رضی اللہ عنہ ہی کے پاس رہے اور اپنی توبہ، استقامت اور ٹھیک ہو جانے کا عملی اظہار کیا۔[1]

اس صورتِ حال میں کچھ عرصے کے لیے شر پسند کوفہ میں بھی دب گئے۔ اُن پر سکتہ طاری ہو گیا۔ یہ ۳۳ ہجری کی بات ہے۔ اس کی وجہ یہ بنی کہ جب شر پسندوں نے دیکھا کہ اُن کے سرغنوں کو پہلے شام اور پھر جزیرہ جلا وطن کر دیا گیا تو انھوں نے فیصلہ کیا کہ اسی میں مصلحت ہے کہ کچھ دیر کے لیے چپ ہو جائیں۔[2]

ابن سبا کی تحریک کے ایجنڈے کی حتمی شکل:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے گیارھویں سال ۳۴ھ میں ابن سبا نے اپنی تحریک کو منظّم کیا اور اپنی سازش کو عملی جامہ پہنانے کے لیے خاکہ بنایا اور اپنی جماعت کے لیے یہ پروگرام طے کیا کہ اب خلیفہ اور اس کے گورنروں کے خلاف بغاوت شروع کی جائے۔

---

[1] تاريخ الطبري (٥/ ٣٢٧)

[2] الخلفاء الراشدون للخالدي (ص: ١٣٤)

فتنہ گروں کی کارستانیوں کے وقت اہلِ کوفہ کے حالات:

امام طبری کوفہ کے ۳۴ھ کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے گیارھویں سال حضرت سعید بن عاص رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس مدینہ منورہ گئے۔ جانے سے پہلے انھوں نے حضرت اشعث بن قیس رضی اللہ عنہ کو آذر بائیجان، حضرت سعید بن قیس رضی اللہ عنہ کو ''رَے''، حضرت نُسیر عجلی رضی اللہ عنہ کو ہمدان، حضرت سائب بن اقرع رضی اللہ عنہ کو اصبہان، حضرت مالک بن حبیب رضی اللہ عنہ کو ''ماہ''، حضرت حکیم بن سلامہ رضی اللہ عنہ کو موصل، حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کو قرقیسیا، حضرت سلمان بن ربیعہ رضی اللہ عنہ کو در بند اور حضرت عتیبہ بن نہاس رضی اللہ عنہ کو حلوان کا امیر بنا کر روانہ کیا۔ حضرت قعقاع بن عَمرو تمیمی رضی اللہ عنہ کو جنگی معاملات کا نگران مقرر کیا اور کوفہ میں اپنا نائب حضرت عَمرو بن حُریث رضی اللہ عنہ کو مقرر کیا۔ اس طرح کوفہ کمانڈروں اور بااثر لوگوں سے خالی ہوگیا۔ صرف فتنہ پرداز لوگ باقی رہ گئے۔[1]

اِن حالات میں سبائیوں کے سرغنے یزید بن قیس نے مصر میں موجود اپنے سرغنے ابن سبا کو اعتماد میں لینے کے بعد کوفہ میں بغاوت کردی۔ بغاوت میں ان لوگوں نے یزید بن قیس کا ساتھ دیا جو ابن سبا کی خفیہ انجمنِ پلیداں میں شامل ہو چکے تھے۔ اس موقع پر بازاری قسم کے وہ لوگ بھی باغیوں کے ساتھ شامل ہو گئے جو اُن سے متاثر تھے۔[2]

حضرت قعقاع بن عَمرو رضی اللہ عنہ نے پہلی سازش کچل دی:

یزید بن قیس نے کوفہ میں بغاوت کی اور اس کا عزم یہ تھا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو معزول کیا جائے۔ وہ کوفہ کی مسجد میں بیٹھ گیا۔ اُس کے اردگرد وہ سبائی بھی جمع ہو گئے جن سے عبداللہ بن سبا مصر سے خط وکتابت کرتا تھا۔ جب یہ باغی مسجد میں جمع ہوئے تو اِس کی خبر حضرت قعقاع بن عَمرو رضی اللہ عنہ کو بھی ہوگئی۔ انھوں نے اُن کا گھیراؤ کر کے انھیں اور اُن کے سرغنے یزید بن قیس کو گرفتار کرلیا۔ یزید نے جب حضرت قعقاع رضی اللہ عنہ کی سختی، اُن کی روشن دماغی اور بصیرت دیکھی تو اپنے اصل ہدف سے دستبردار ہوگیا۔ اُس نے کہا کہ ہمارا مقصد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت کرنا نہیں، ہم تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ حضرت سعید بن عاص رضی اللہ عنہ کو معزول کر کے اُن کی جگہ کسی اور شخص کو گورنر مقرر کیا جائے۔ حضرت قعقاع رضی اللہ عنہ نے یزید کی

---

[1] تاریخ الطبري (٥/ ٣٣٧)

[2] الخلفاء الراشدون للخالدی (ص: ١٣٥)

بات سن کر اُس کی درخواست قبول کر لی اور اس کی جماعت کو آزاد کر دیا۔ انھوں نے یزید سے کہا: ''اس مقصد کے لیے مسجد میں مت بیٹھو! نہ اپنے گرد لوگوں کو اکٹھا کرو۔ بلکہ اپنے گھر میں بیٹھو اور جو مسئلہ ہو، امیر المومنین کے سامنے پیش کرو۔ تمھاری ضرور شنوائی ہوگی۔''[1]

یزید بن قیس کا جزیرہ میں مقیم شر پسندوں سے رابطہ:

حضرت قعقاع رضی اللہ عنہ کی سرزنش کے بعد یزید بن قیس اپنے گھر میں رہ کر فتنہ برپا کرنے اور بغاوت کرنے کا منصوبہ بنانے لگا۔ اُس نے ایک شخص اجرت پر لیا اور اُسے چند درہم اور سواری دے کر جلا وطن کوفیوں کے پاس بھیجا اور ہدایت کی کہ جلد از جلد سب تک میرا پیغام پہنچاؤ لیکن خیال رکھنا کہ راز فاش نہ ہونے پائے۔ یزید نے اپنے شیطان صفت دوستوں کو لکھا: ''تم لوگ یہ خط ملتے ہی فوراً یہاں پہنچ جاؤ۔ ہم نے بغاوت کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔'' اشتر نے یہ خط پڑھا تو فوراً کوفہ روانہ ہو گیا اور اُس کے دوسرے خارجی دوست بھی اُس سے آ ملے۔ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے انھیں موجود نہ پا کر تلاش کرایا لیکن وہ وہاں نہ ملے۔ انھوں نے فوراً ایک دستہ انھیں پکڑنے کے لیے روانہ کیا لیکن وہ جزیرے سے نکل چکے تھے، اس لیے قابو نہ آئے۔

یزید بن قیس نے دوبارہ اپنے لوگوں سے اور انھوں نے عوام میں سے اپنے ہم مشرب لوگوں سے رابطہ کیا۔ وہ سب مسجد میں جمع ہوئے۔ اشتر نخعی بھی مسجد میں آ گیا۔ اس نے انھیں بھڑکایا۔ بغاوت پر اُکسایا اور تقریر کرتے ہوئے کہا: ''اے لوگو! میں ابھی امیر المومنین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس سے آیا ہوں، تمھارے گورنر حضرت سعید بن عاص رضی اللہ عنہ بھی وہیں موجود تھے۔ وہ دونوں اس بات پر متفق ہو چکے تھے کہ تمھارے عطیات گھٹا دیے جائیں۔ دو سو درہم سے کم کر کے سو درہم فی کس کر دیے جائیں۔'' یہ اس کی سراسر کذب بیانی تھی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت سعید بن عاص رضی اللہ عنہ نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔ یہ عوام کو بھڑکانے کے لیے سبائیوں کی ایک چال تھی جس کے ذریعے اشتر نے مسجد میں موجود لوگوں کو بیوقوف بنایا اور کم عقل لوگوں کو متاثر کر کے انھیں مشتعل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ مسجد میں شور برپا ہو گیا۔ یزید بن قیس نے اعلان کر دیا کہ میں حضرت سعید بن عاص رضی اللہ عنہ کو کوفہ میں داخل نہیں ہونے دوں گا۔

---

[1] تاریخ الطبري (٥/ ٣٣٧)

فتنہ گروں اور حضرت سعید بن عاص رضی اللہ عنہ کا آمنا سامنا:

یزید بن قیس کوفہ سے نکل کر مدینہ کے راستے میں مقامِ جُرعہ پر ٹھہرا۔ اشتر نخعی بھی اُس کے ساتھ تھا۔ حضرت سعید بن عاص رضی اللہ عنہ مدینہ سے واپسی پر اُن کے پڑاؤ کی جگہ پہنچے تو یزید اور اُس کے ساتھیوں نے کہا: ''آپ جہاں سے آئے ہیں وہیں واپس چلے جائیں، ہمیں آپ کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہم آپ کو کوفہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بتا دیں کہ ہم آپ کو اپنا گورنر نہیں رکھنا چاہتے۔ ہم چاہتے ہیں کہ خلیفہ (حضرت) ابوموسیٰ اشعری (رضی اللہ عنہ) کو گورنر مقرر کر دیں۔'' حضرت سعید بن عاص رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''تم اتنی سی بات کرنے کے لیے اتنی بڑی تعداد میں کیوں آئے ہو؟ تمھارے لیے صرف یہی کافی تھا کہ تم امیر المومنین کے پاس ایک آدمی بھیج دیتے اور ایک شخص مجھے خبر دینے کے لیے روانہ کر دیتے۔ کیا صرف ایک آدمی سے بات کرنے کے لیے ایک ہزار عقل مند نکلتے ہیں؟''[1]

حضرت سعید رضی اللہ عنہ سمجھ گئے کہ حکمت کا تقاضا یہی ہے کہ ان سے مقابلہ بازی نہ کی جائے اور فتنے کی آگ نہ بھڑکائی جائے، بلکہ کسی طریقے سے اُسے بجھانے کی کوشش کی جائے یا کم ازکم اسے جلد بھڑکنے سے روکا جائے۔ اور یہی رائے کوفہ میں حضرت ابوموسیٰ اشعری، عَمرو بن حُریث اور قعقاع بن عَمرو رضی اللہ عنہم کی تھی۔[2]

حضرت سعید بن عاص رضی اللہ عنہ وہاں سے واپس آئے اور امیر المومنین کو خارجیوں کی نئی صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اُن سے پوچھا: ''وہ کیا چاہتے ہیں؟ کیا انھوں نے اطاعت سے ہاتھ کھینچ لیا ہے؟ کیا انھوں نے خلیفہ کے خلاف بغاوت کر دی ہے؟

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے پوچھا: ''وہ کسے اپنا گورنر بنانا چاہتے ہیں؟'' حضرت سعید رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ''(حضرت) ابوموسیٰ اشعری (رضی اللہ عنہ) کو۔'' حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''ہم (حضرت) ابوموسیٰ اشعری (رضی اللہ عنہ) ہی کو اُن کا گورنر مقرر کر دیتے ہیں۔ اللہ کی قسم! ہم انھیں حجت بازی کا موقع نہیں دیں گے تا کہ کسی کا کوئی عذر نہ رہے۔ ہم صورتِ حال واضح ہونے تک صبر کریں گے، جیسا کہ ہمیں حکم ہے۔'' پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ آپ کو کوفہ کا گورنر مقرر کیا جاتا ہے، آپ حالات کو کنٹرول کریں۔[3]

---

[1] تاریخ الطبري (٥/ ٣٣٨)

[2] الخلفاء الراشدون للخالدي (ص: ١٤٠)

[3] تاریخ الطبري (٥/ ٣٣٩)

کوفہ کی مسجد میں جب ہنگامہ بپا ہوا تو اس وقت وہاں دو جلیل القدر صحابہ حضرت حذیفہ بن یمان اور حضرت ابومسعود عقبہ بن عَمر و انصاری رضی اللہ عنہما موجود تھے۔ حضرت ابومسعود رضی اللہ عنہ اس سرکشی اور ہنگامہ آرائی پر نہایت برہم تھے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو معزول کرانے اور ان کی نافرمانی کرنے پر نہایت غضبناک تھے کیوں کہ ایسا حادثہ پہلی بار رونما ہوا تھا حضرت ابومسعود رضی اللہ عنہ کے برعکس حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ دور اندیش تھے۔ معاملے کی تہہ تک جا کر غور وفکر سے رائے قائم کرتے تھے۔[1]

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فتنوں کے بارے میں بڑا فہم و ادارک رکھتے تھے۔ انھوں نے کوفہ وغیرہ میں سبائیوں کے فتنہ میں اُن سے بڑی سوچ سمجھ کا معاملہ کیا، جس طرح انھوں نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا اور سیکھا تھا، انھیں اس موضوع کی احادیث کا مکمل استحضار تھا اور وہ اِن فتنوں میں رونما ہونے والے حالات و حوادث کو بخوبی سمجھتے تھے، اس لیے انھوں نے اسے انہونی اور انوکھی چیز نہیں سمجھا۔ وہ حتی الوسع اصلاحِ احوال کی کوشش کرتے رہے۔[2]

فسادیوں کو حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی طرف سے اطاعتِ امیر کی نصیحت:

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے ہنگامہ آرائی پر کنٹرول کیا اور لوگوں کو سمجھایا کہ وہ آیندہ ایسی حرکت سے باز رہیں۔ امیر کی نافرمانی نہ کریں۔ انھوں نے لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ''تم ایسی باتوں کے لیے نہ دوڑا کرو۔ آیندہ نافرمانی کا کوئی اقدام مت کرنا۔ یوں سمجھو کہ امیر تمھارے درمیان موجود ہے۔''

لوگوں نے کہا: ''آپ ہمیں نماز پڑھائیں۔'' انھوں نے کہا: ''ہرگز نہیں! ہاں ایک شرط پر نماز پڑھاتا ہوں کہ تم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے احکام سننے اور اطاعت کرنے کا اقرار کرلو۔'' وہ کہنے لگے: ''ہم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی فرمانبرداری کا اقرار کرتے ہیں۔''[3]

انھوں نے زبان سے تو اقرار کر لیا لیکن دل میں منافقت رکھی اور اپنے ناپاک اہداف و مقاصد ظاہر نہیں کیے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف سے گورنر کے تقرر کا حکم آنے سے پہلے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نماز پڑھاتے رہے۔ کچھ وقت کے بعد (۳۴ ہجری) میں کوفہ کے حالات میں ٹھہراؤ آ گیا۔ حضرت

[1] الخلفاء الراشدون للخالدي (١٤١)

[2] حذيفة بن اليمان لإبراهيم العلي (ص: ٨٦) الخلفاء الراشدون للخالدي (ص: ١٤١)

[3] تاريخ الطبري (٥/ ٣٣٩)

حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ جہادی دستوں کی قیادت کرنے کے لیے آذر بائیجان اور دربند چلے گئے۔ ان کے علاوہ ایران کے سرحدی علاقوں کے جتنے کمانڈر اور مختلف علاقوں کے جو ذمہ دار حکّام کوفہ آئے ہوئے تھے، وہ سب واپس چلے گئے۔[1]

فتنوں کے سدِ باب کے لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی پالیسی

مختلف علاقوں میں تحقیقاتی ٹیموں کی روانگی:

حضرت محمد بن مسلمہ اور طلحہ بن عبید اللہ وغیرہ رضی اللہ عنہم نے ابن سبا کی مختلف شہروں میں پھیلائی ہوئی افواہیں سنیں تو وہ نہایت پریشان اور مضطرب ہوئے، وہ فوراً امیر المومنین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی: ''اے امیر المومنین! ہم تک جو باتیں پہنچی ہیں کیا آپ کو بھی اُن کا علم ہے؟'' انھوں نے کہا: ''نہیں، اللہ کی قسم! میرے علم میں تو یہی ہے کہ ہر طرف سلامتی اور امن ہے۔'' انھوں نے مختلف اسلامی شہروں میں فتنوں کے بپا ہونے کی جو افواہیں اُن تک پہنچی تھیں، امیر المومنین کے گوش گزار کیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''تم میرے شریکِ کار ہو اور مسلمانوں کے گواہ ہو، اس لیے مشورہ دو کہ کیا کرنا چاہیے؟'' انھوں نے کہا: ''ہمارا مشورہ یہ ہے کہ آپ قابلِ اعتماد افراد کو مختلف شہروں میں بھیجیں، تاکہ وہ وہاں کے حالات کی صحیح اطلاعات لے کر آئیں۔''[2]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ تجویز منظور کر لی۔ انھوں نے صحابہ رضی اللہ عنہم کے ایک ایسے گروہ کا انتخاب فرمایا جن کے زہد و ورع اور صداقت و خیر خواہی میں کسی کو کوئی شک نہیں تھا۔

اُن میں سے حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کو کوفہ، حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کو بصرہ، حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما کو مصر اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کو شام روانہ کیا گیا۔ اِن میں سے ہر ایک کے ساتھ اور لوگ بھی تھے، یہ ان کے امراء تھے۔ آپ نے انھیں بڑے شہروں کی طرف بھیجا۔ یہ سب لوگ اس نہایت مشکل، خطرناک اور عظیم مہم کو سر کر کے واپس آ گئے، حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما قدرے تاخیر سے واپس پہنچے۔ یہ تحقیقاتی کمیشن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنے مشاہدات اور لوگوں سے جو کچھ پوچھا اور سنا تھا، اُس سے آگاہ کیا۔ یہ جلیل القدر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم تمام شہروں سے ایک ہی خبر لائے تھے۔ انھوں

[1] الخلفاء الراشدون للخالدي (ص: ١٤٢)

[2] تاريخ الطبري (٥/ ٣٤٨)

نے کہا: ''حالات بالکل معمول کے مطابق ہیں۔ ہم نے وہاں کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں دیکھی اور نہ وہاں کے خواص وعوام کو کسی ناخوشگوار معاملے کا علم ہے۔ اُن کے درمیان عدل وانصاف کرتے ہیں اور اُن کی خبر گیری میں مصروف رہتے ہیں۔''[1]

حاسدین نے اندرونِ خانہ جو افواہیں اور جھوٹی خبریں پھیلا رکھی ہیں، وہ بالکل بے بنیاد ہیں۔ لیکن نیک سیرت عظیم خلیفۂ راشد نے اسی پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ مختلف شہروں کے عوام کے نام خطوط لکھے۔

عوام الناس کے نام کھلا خط:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے عوام الناس کے نام یہ کھلا خط تحریر فرمایا:

''میں نے حکّام کے لیے لازم کر دیا ہے کہ وہ ہر سال موسمِ حج میں مجھ سے ملاقات کریں۔ میں اُن کا محاسبہ کرتا ہوں۔ جب سے خلیفہ مقرر کیا گیا ہوں، میں نے ملتِ اسلامیہ کے لیے یہ اصول مقرر کیا ہے کہ نیکی کا حکم دیا جائے اور برے کاموں سے روکا جائے، اس لیے میرے یا میرے حکّام کے سامنے جو مطالبۂ حق پیش کیا جائے گا وہ پورا کیا جائے گا۔ میں نے اپنے اور اپنے اہل وعیال کے رعایا پر جو حقوق ہیں وہ معاف کر دیے ہیں۔ اہلِ مدینہ کو یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ کچھ لوگ گالی دیتے ہیں اور زدوکوب کرتے ہیں۔ پوشیدہ طور پر ملامت کرنا، گالی دینا اور مار پیٹ کرنا بہت برا ہے۔ جو شخص کسی حق کا دعویدار ہو وہ موسمِ حج میں آئے اور اپنا حق حاصل کر لے مجھ سے یا میرے حکّام سے حاصل کرے یا معاف کردے کہ اللہ تعالیٰ معاف کرنے والوں کو جزائے خیر دے گا۔''

جب یہ خط مختلف شہروں میں پڑھا گیا تو عوام رو پڑے۔ انھوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حق میں دعا کی اور کہنے لگے: ''قومی مصیبت کے آثار نظر آرہے ہیں۔''[2]

انھوں نے عوام کے نام یہ خط بھی کافی نہ سمجھا کہ جس کا کوئی مطالبہ یا شکایت ہو، وہ حج کے موسم میں آئے اور حُجّاج کے بھرے مجمع میں کھلے عام مطالبہ کرے۔ انھوں نے اِن سارے اقدامات کے ساتھ ساتھ مختلف شہروں کے گورنروں کو بھی لکھا کہ وہ خود حاضر ہوں اور جب لوگ امیر المومنین کے سامنے اپنی

---

[1] عثمان بن عفان لعبد الستار الشيخ (ص: ٢١٠) تاريخ الطبري (٥/ ٣٤٨)

[2] تاريخ الطبري (٥/ ٣٤٩)

شکایات پیش کریں تو وہ اُن کا سامنا کریں تاکہ امیر المومنین خود اُن گورنروں سے ان افواہوں کے متعلق پوچھیں جو لوگ پھیلا رہے تھے۔ مزید برآں گورنر صاحبان امیر المومنین کو ٹھیک ٹھیک خیر خواہانہ مشورہ دیں۔[1]

شر پسندوں کی مدینہ آمد:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نہایت با خبر اور محتاط تھے۔ انھوں نے شر پسندوں کے حالات معلوم کرنے اور ان کے عزائم جاننے کے لیے دو ایسے مسلمانوں کی خدمات حاصل کیں جنھیں ماضی میں خلیفہ کی طرف سے کسی غلطی کی وجہ سے سزا مل چکی تھی۔ انھیں بھیجنے میں حکمت یہ تھی کہ چونکہ وہ سزا یافتہ ہیں، اس لیے شر پسند سمجھیں گے کہ یہ بھی ہمارے ساتھی ہیں، اس طرح وہ انھیں راز کی بات بتا دیں گے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان دونوں کو ہدایت کی کہ تم اُن کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کرو۔ جب سبائیوں نے انھیں دیکھا تو اُن سے کھود کرید کی اور انھیں اپنے مقاصد سے آگاہ کیا۔ اُن دونوں نے پوچھا: ''مدینہ میں کون تمھارے ساتھ ہے؟'' وہ بولے: ''تین افراد ہیں۔'' ان دونوں نے کہا: ''اُن سے کوئی عہد و پیمان ہوا ہے؟'' وہ کہنے لگے: ''نہیں۔'' پھر انھوں نے پوچھا: ''تم کیا کرنا چاہتے ہو؟'' سبائیوں نے اپنی سازش کی تفصیل اور مستقبل کے منصوبے کی مکمل وضاحت کی اور کہا: ''ہم اسے یعنی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو چند باتیں یاد دلانا چاہتے ہیں، جن کے بارے میں ہم لوگوں کو پہلے ہی بتا چکے ہیں، اور وہ باتیں ہم نے لوگوں کے دلوں میں پختہ کر دی ہیں۔ پھر ہم واپس جا کر عوام کو بتائیں گے کہ ہم نے امیر المومنین کو یہ باتیں یاد دلائیں مگر انھوں نے ان کی تلافی نہیں کی، نہ توبہ کی۔ اس کے بعد ہم حاجیوں کی حیثیت سے آئیں گے اور اُن کا محاصرہ کر کے انھیں معزول کر دیں گے۔ اگر انھوں نے خلافت چھوڑنے سے انکار کیا تو انھیں قتل کر دیں گے۔ کوئی تیسری صورت قبول نہیں کریں گے۔''

انھوں نے واپس آ کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو صورتِ حال سے آگاہ کیا تو آپ ہنس پڑے۔ پھر فرمایا: ''اے اللہ! انھیں اس فتنہ پردازی سے بچا لے، اگر تو نے انھیں نہ بچایا تو یہ لوگ بد بخت ٹھہریں گے۔'' آپ نے اہلِ بصرہ اور اہلِ کوفہ کو خط لکھے۔ بعد ازاں لوگوں کو اکٹھا ہونے کا حکم دیا۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور منبر کے بالکل قریب بیٹھ گئے۔ آپ نے اللہ کی حمد و ثناء کے بعد ان فتنہ پرور لوگوں کے حالات سے انھیں آگاہ کیا اور اُن کے عزائم بتائے کہ پہلے وہ بغاوت کریں گے اور پھر مجھ

---

[1] عثمان بن عفان لعبد الستار الشیخ (ص: ۲۱۲)

سے معزولی کا مطالبہ کریں گے اور انکار کرنے پر قتل کرنے کی کوشش کریں گے، دونوں مخبر کھڑے ہو گئے، انھوں نے شر پسندوں کی ساری صورتِ حال بتائی۔

اس پر تمام مسلمانوں کے متفقہ تاثرات یہ تھے کہ امیر المومنین انھیں قتل کر دیں کیونکہ وہ امیر المومنین کے خلاف بغاوت کرنا اور مسلمانوں میں انتشار پھیلانا چاہتے ہیں۔ لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انھیں قتل کرنے کی تجویز مسترد کر دی کیونکہ ظاہراً ان کا شمار مسلم رعایا ہی میں ہوتا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کسی قیمت پر بھی یہ برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ لوگ یہ کہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اپنے مخالف مسلمانوں کو قتل کراتے ہیں، اس لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ کہہ کر اُن کی تجویز کو رد کر دیا: ''ہم انھیں قتل نہیں کریں گے بلکہ انھیں معاف کرتے ہیں، ہم ان سے درگزر کریں گے اور مقدور بھر انھیں سمجھانے کی کوشش کریں گے۔ ہم کسی مسلمان کو اُس وقت تک قتل نہیں کریں گے جب تک وہ کسی ایسے فعل کا ارتکاب نہ کرے جس کی سزا قتل ہے۔ اگر وہ ایسا جرم کریں گے تو ہم ضرور انھیں قتل کریں گے یا اگر وہ مرتد ہو جاتے ہیں تو ہم انھیں نہیں چھوڑیں گے۔''[1]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا سبائیوں پر اِتمامِ حجت:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اِس کے بعد مسجد کی کھلی کچہری لگائی۔ سبائیوں کو بلایا اور انھیں کہا کہ تمھارے جو شبہات یا اعتراضات ہیں بتاؤ، میری جو غلطیاں ہیں یا میں نے جن حدود سے تجاوز کیا ہے اور شریعت کی مخالفت کی ہے، اُن سے آگاہ کرو۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انھیں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور دیگر مسلمانوں کے سامنے کھلم کھلا اعتراضات اٹھانے کی اجازت دی۔ سبائیوں نے اپنے اعتراضات پیش کیے۔ اُن کے خیال کے مطابق حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جن غلطیوں کے مرتکب ہوئے تھے، ان کا بھی تذکرہ کیا۔ اِس کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اُن کے اعتراضات کے جوابات دیے اور دلائل کے ذریعے موقف کی وضاحت کی کہ انھوں نے یہ کام کیوں اور کس لیے کیے ہیں۔ تمام منصف مزاج مسلمان حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی اس کھلی کچہری اور مجلسِ محاسبہ کی گفتگو سن رہے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اُن کے ایک ایک اعتراض کا جواب دیا۔ ان کے بیان کردہ واقعات کی حقیقت سے آگاہ فرمایا اور ثابت کر دیا کہ امیر المومنین رضی اللہ عنہ کے اقدامات نہایت قابلِ تعریف

---

[1] تاريخ الطبري (٥/ ٣٥٤ ـ ٣٥٥)

ہیں۔ مسجد میں موجود تمام صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی آپ کے موقف کی تائید کی اور آپ کی کارگزاریوں کی تحسین کی۔[1]

سبائیوں نے جو غلط افواہیں پھیلا رکھی تھیں اور جن کی ترویج کے لیے وہ شام وسحر کوشاں تھے، آپ نے ان سب اعتراضات کا اجمالاً ذکر کر کے تسلی بخش جواب دیا اور حقیقتِ حال سے آگاہ کرتے ہوئے لوگوں پر ساری صورتِ حال واضح فرمائی کہ انھوں نے یہ کام کیوں کیے؟ کیسے کیے؟ آپ نے ثابت کیا کہ آپ کے پاس مبنی بر صداقت قطعی دلائل موجود ہیں۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا اُن کے ساتھ مباحثہ ایک ایسے مخلص اور نیک طینت شخص کے مباحثے کی طرح تھا جس کا فریقِ مخالف اُس کے بام و در پر گردشِ ایام کا منتظر ہو، اور اُس کی لغزش کا انتظار کر رہا ہو کہ کب وہ کوئی غلطی کرے تو وہ اسے نشانہ بنائے اور اس پر کیچڑ اچھال کر لوگوں کو اس سے متنفر کرے۔ ایسا شخص دلیل سے کبھی مطمئن نہیں ہوتا۔ نہ کوئی برہان اسے راہِ راست پر لا سکتی ہے اور جسے اللہ گمراہ کر دے اسے کوئی راہِ راست پر لانے والا نہیں۔[1]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی وضاحتی تقریر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی طرح فتنہ پرور لوگوں کے زعماء بھی منبر کے ایک طرف بیٹھے سن رہے تھے، عام مسلمانوں نے بھی یہ گفتگو توجہ سے سنی۔ مسلمان حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی سچائی اور توضیحات سن کر متاثر ہوئے، انھوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے کلام کی تصدیق کی اور اُن کے دلوں میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے لیے محبت میں اضافہ ہوا جبکہ گروہ بندی اور فتنے کی دعوت دینے والے سبائی اس سے ذرا متاثر نہ ہوئے۔ نہ انھوں نے اپنے ناپاک ارادوں سے توبہ کی کیوں کہ وہ حق کے متلاشی تھے نہ خیر میں رغبت رکھنے والے۔ ان کا مقصد صرف فتنہ برپا کرنا اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرنا تھا۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور دیگر مسلمانوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو مشورہ دیا کہ اِن سبائیوں کو، جو فتنہ گروں کے سرغنے ہیں، قتل کر دیجیے کیوں کہ اِن کا جھوٹ اور سازش ظاہر ہو چکی ہے۔ آپ مسلمان معاشرے کو اس ناسور سے بچائیں تاکہ مسلمانوں کے شہروں میں امن وامان مستحکم ہو اور اس فتنے کی جڑ کاٹ دی جائے۔

لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اس رائے کے برعکس دوسری رائے رکھتے تھے۔ اُن کے نزدیک اس کا حل

---

[1] الخلفاء الراشدون للخالدی (ص: ١٥٤، ١٥٥)

[2] تاريخ الجدل لمحمد أبو زهرة (ص: ٩٨۔ ٩٩)

نرمی تھی۔ انھوں نے شر پسندوں کو چھوڑ نے اور قتل نہ کرنے کا فیصلہ کیا تا کہ فتنے کے واقع ہونے میں جس قدر تاخیر ممکن ہو سکے، اس کی بہر حال کوشش کی جائے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مصر، کوفہ اور بصرہ سے آئے ہوئے سبائیوں کے خلاف اُن کے مقاصد علم میں آجانے کے باوجود کوئی ایکشن نہ لیا اور انھیں صحیح سلامت مدینہ سے رخصت ہونے اور اپنے شہروں میں جانے کی اجازت دے دی۔[1]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے سبائیوں کے بعض مطالبات تسلیم کر لیے

سبائیوں نے بعض گورنروں کی تبدیلی اور اُن کی جگہ اپنے من مانے گورنر تعینات کرنے کا مطالبہ کیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اُن کی مرضی کے مطابق گورنر تبدیل کر دیے۔ اتنی بات ہی احقاقِ حق اور حجت قائم کرنے کے لیے کافی تھی بشرطیکہ اعتراضات درست ہوتے اور امور کو فطری طریقے سے حل کرنے کی کوشش کی جاتی لیکن حقیقتاً معاملہ اس کے برعکس تھا کہ ان شکایات اور افواہوں کی آڑ میں دیگر مذموم مقاصد کا حصول پیشِ نظر تھا، جاہلی کینہ پروری، مسلمانوں میں فتنہ بھڑ کانے اور اُن کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے میں سرگرمِ عمل تھی۔ چنانچہ بالآخر نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئی کے مطابق مظلوم خلیفہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کا سانحہ پیش آ گیا۔[2]

فتنوں کے انسداد کے لیے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سے راہنمائی:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فتنوں کے دَور میں خارجیوں اور سبائیوں کے بارے میں جذباتی موقف اختیار نہیں کیا۔ نہ بغاوت کرنے والوں کی سرکشی دیکھ کر آپ نے کوئی لائحۂ عمل تیار کیا بلکہ آپ کا موقف چراغِ نبوت کی کرنوں سے منور تھا۔ جس طرح رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں صبر کرنے، اللہ تعالیٰ سے ثواب کی امید رکھنے اور کسی صورت قتال نہ کرنے کا حکم دیا تھا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اُسے مِن وعَن تسلیم کیا اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا ہوا وعدہ پورا کر دکھایا۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے جو عہد لیا تھا کہ اللہ تعالیٰ تمھیں خلافت کی خلعت پہنائے گا۔ لوگ اسے اتارنا چاہیں گے تم ہرگز نہ اتارنا۔ آپ نے زندگی کی آخری سانس تک اِس عہد کو نبھایا یہاں تک کہ اپنے پاکیزہ خون میں لت پت ہو کر شہید ہو گئے۔[3]

---

[1] الخلفاء الراشدون للخالدي (ص: ۱۵۸، ۱۵۹)

[2] خلافة عثمان رضي الله عنه للدكتور السلمى (ص: ۷۸)

[3] جامع الترمذي، رقم الحديث (۳۷۰۵)

جب باغیوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر حملہ کر دیا تو انھیں یقین ہو گیا کہ اب دفاع کئی جانوں کے خون کا نذرانہ پیش کیے بغیر ناممکن ہے، اس لیے انھوں نے اپنے پیروکاروں اور اطاعت پر قائم لوگوں سے مطالبہ کیا کہ وہ اِن سنگین حالات میں اپنے ہاتھ اور اسلحہ روک کر رکھیں۔ کسی قسم کا کوئی جوابی اقدام نہ کریں۔

فتنہ پروروں کا مدینہ منورہ پر قبضہ

اہلِ فتنہ نے اپنے منصوبے کو حتمی شکل دینے کے لیے باہم طے کیا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر مدینہ منورہ ہی میں چڑھائی کر دی جائے اور انھیں مجبور کیا جائے کہ وہ خلافت سے دستبردار ہو جائیں۔ اگر وہ انکار کریں تو انھیں قتل کر دیا جائے۔ اس کے لیے انھوں نے فیصلہ کیا کہ حج کے موسم میں تینوں مراکز، مصر، کوفہ اور بصرہ سے مدینہ کا رخ کیا جائے۔ اور حج کا ارادہ رکھنے والوں کے ساتھ ہی شہروں سے نکلا جائے اور حاجیوں ہی کا روپ دھارا جائے۔ لوگوں کو یہی باور کروایا جائے کہ وہ حج کے لیے جا رہے ہیں۔ جب وہ مدینہ منورہ پہنچیں تو حاجیوں سے جدا ہو کر وہیں رک جائیں، حُجّاج مناسکِ حج ادا کرنے کے لیے مکہ چلے جائیں گے۔ مدینہ کے بھی اکثر باشندے حج کے ارادے سے مکہ مکرمہ جا چکے ہوں گے۔ مدینہ خالی ہوگا۔ اُس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے (حضرت) عثمان (رضی اللہ عنہ) کا محاصرہ کر کے انھیں معزول ہونے پر مجبور کیا جائے۔ وہ انکار کریں تو انھیں قتل کر دیا جائے۔ شوال ۳۵ھ میں فتنہ گر مدینہ منورہ کے گرد و نواح میں جمع تھے۔[1]

انھوں نے طریقۂ واردات یہ اختیار کی کہ مصر سے وہ چار ٹولیوں میں نکلے، ہر گروہ کا ایک سردار تھا، پھر اُن سب کا ایک سردار تھا اور اُن کے ساتھ ان کا شیطانِ اعظم ابن سبا بھی تھا۔ چاروں گروہوں کے سرداروں کے نام یہ ہیں: عبدالرحمٰن بن عدیس بلوی، کنانہ بن بشر تجیبی، سودان بن حمران سکونی، قتیرہ بن فلان سکونی، اِن چاروں غنڈوں کا سردار غافقی بن حرب عکی تھا۔ اِن چاروں گروہوں کی تعداد ایک ہزار تھی۔ کوفہ سے بھی ایک ہزار شر پسند چار گروہوں میں نکلے۔ بصرہ سے بھی ایک ہزار سرکش چار گروہوں میں تقسیم ہو کر نکلے۔ ان سب کا سربراہ حرقوص بن زہیر سعدی تھا۔ ابن سبا اُن کے ساتھ خوش وخرم جا رہا تھا کیوں کہ اس کا شیطانی منصوبہ اُسے کامیاب ہوتا نظر آ رہا تھا۔ مصر سے نکلنے والے باغیوں کا اعلان یہ تھا کہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو خلیفہ ہونا چاہیے۔ کوفہ کے فتنہ پرور حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کی خلافت کا اعلان کرتے ہوئے آ رہے تھے جبکہ بصرہ کے شر پسند حضرت طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنانے کا ارادہ ظاہر کر رہے تھے۔[2]

---

[1] الخلفاء الراشدون للخالدي (ص: ١٥٩)

[2] تاريخ الطبري (٥/ ٣٥٧)

اس سارے پروپیگنڈے کا مقصد یہ باور کرانا تھا کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم بھی اس مسئلے میں ان سے ہم آہنگ ہیں تاکہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں پھوٹ پڑ جائے۔ امام آجری اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ نے حضرت علی، طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہم کو اُن فرقوں سے دور رکھا، اُن شر پسندوں کے ساتھ اُن جلیل القدر ہستیوں کا کوئی تعلق نہ تھا۔ شر پسندوں نے ان کا نام لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں انتشار پیدا کرنے کے لیے استعمال کیا جبکہ اللہ تعالیٰ نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو اس سازش میں شریک ہونے سے محفوظ رکھا۔''

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ان کے پہنچنے سے پہلے ہی اُن کی آمد کی خبر ہوگئی۔[1]

سب سے پہلے مصری باغی ٹولہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچا۔ اُن لوگوں نے آپ سے کہا: ''مصحف منگوایئے۔'' حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مصحف منگوایا تو وہ کہنے لگے: ''سابعہ کھولیے۔'' وہ سورت یونس کو سابعہ کہتے تھے۔ آپ نے سورت یونس کی تلاوت شروع کی جب آیت (۵۹) پر پہنچے، جس میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّحَلٰلًا قُلْ آٰللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ اَمْ عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ ﴾ [یونس: ۵۹]

''کہہ دیجیے: بھلا دیکھو تو، اللہ نے تمھارے لیے جو رزق نازل کیا، پھر تم نے اس میں سے کچھ حرام اور کچھ حلال ٹھہرا لیا۔ کہہ دیجیے: کیا اللہ نے تمھیں (یہ) حکم دیا ہے یا تم اللہ پر جھوٹ باندھتے ہو؟''

تو انھوں نے کہا: ''رکیے اور غور کیجیے! آپ نے جو چراگاہ خاص کی ہے؟ کیا اللہ نے اس کا حکم دیا ہے یا آپ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں؟'' آپ نے فرمایا: ''آگے چلو۔ اس کی شانِ نزول تو یہ ہے.... جہاں تک چراگاہ کو خاص کرنے کا تعلق ہے تو مجھ سے پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صدقے کے اونٹوں کے لیے اِسے خاص کیا تھا۔ جب میں برسرِ اقتدار آیا تو صدقے کے اونٹوں کی تعداد میں اضافہ ہوگیا۔ اس وجہ سے لامحالہ چراگاہ کا رقبہ بھی بڑھانا پڑا۔'' وہ ایک ایک آیت پڑھ کر آپ پر اعتراض کر رہے تھے۔ آپ اُن کا جواب دیتے رہے کہ آگے چلو یہ فلاں کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہ کہتے۔ بالآخر وہ مطمئن ہو گئے۔ انھوں نے آپ پر اعتماد کا اظہار کیا اور آپ کے سامنے چند شرائط رکھیں۔ آپ نے انھیں

---

[1] استشهاد عثمان و واقعة الجمل للدكتور خالد الغيث (ص: ١٨)

پورا کرنے کا عہد کیا۔ آپ نے ان سے یہ عہد لیا کہ وہ بھی نافرمانی اور بغاوت نہیں کریں گے اور جب تک خلیفہ ان کی پابندی کرے گا وہ مسلمانوں کی جماعت سے جدا نہیں ہوں گے۔ بعدازاں وہ خوش وخرم واپس چلے گئے۔[1]

شر پسندوں سے مذکرات کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روانگی:

شر پسندوں کا یہ ٹولہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت سے ڈیڑھ ماہ پہلے مقام ذی مروہ میں ٹھہرا ہوا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اُن سے مذکرات کرنے کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ایک دوسرے آدمی کو بھیجا، دوسرے آدمی کا نام نہیں بتایا گیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اُن سے کہا:

''تم کتاب اللہ کی پیروی کرو، تمھیں ہر ملامت وخفگی سے خوش کر دیا جائے گا۔'' وہ اس بات سے متفق ہو گئے۔[2]

اور تمام وفود نے ان پانچ شرائط پر صلح کر لی:

- جلاوطن افراد کو واپس آنے کی اجازت دی جائے۔
- جن کے وظائف بند ہیں، اُن کے وظائف جاری کیے جائیں۔
- مالِ فَے عام کیا جائے۔
- تقسیمِ مال میں عدل وانصاف سے کام لیا جائے۔
- امانت دار اور باصلاحیت افراد گورنر مقرر کیے جائیں۔

اس طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ہر وفد کے ساتھ مصالحت کی اور تمام وفد اپنے اپنے علاقوں کی طرف واپس روانہ ہو گئے۔[3]

اہلِ مصر کے وفد کو قتل کرنے کا جعلی حکم نامہ:

جب تمام وفود کے ساتھ صلح ہو گئی اور وہ سب راضی خوشی اپنے اپنے گھروں کو پلٹ گئے تو فتنوں کی آگ بھڑکانے والوں کو اپنا منصوبہ ناکام ہوتا نظر آیا۔ وہ سمجھ گئے کہ ان کے گھٹیا عزائم کی تکمیل اس طرح ناممکن ہے۔ اگر اُن کی اس بار کوشش ناکام ہو گئی تو دوبارہ کامیابی ممکن نہیں ہو گی، لہٰذا انھوں نے فوراً ہی

---

[1] فتنة مقتل عثمان رضي الله عنه للدكتور محمد عبد الله الغبان (١/ ١٢٨)

[2] تاريخ دمشق ترجمة عثمان (ص: ٣٢٨) تاريخ خليفة بن خياط (ص: ١٦٩۔ ١٧٠)

[3] فتنة مقتل عثمان رضي الله عنه للدكتور محمد عبد الله الغبان (١/ ١٢٩)

دوسرا ایسا منصوبہ تشکیل دیا جس سے فتنے کی آگ دوبارہ بھڑک اٹھی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور مختلف شہروں کے ٹولوں کے مابین ہونے والی صلح کا فیصلہ کالعدم قرار پایا۔ وہ منصوبہ اس طرح سامنے آیا:

اہلِ مصر نے واپسی پر ایک اونٹ سوار شخص دیکھا جو کبھی ان کے قافلے میں شامل ہو جاتا اور کبھی ان سے جدا ہو جاتا اور یہ ظاہر کرتا کہ وہ ان سے کنی کترا کر بھاگنا چاہتا ہے۔ گویا وہ خود دعوت دے رہا تھا کہ مجھے پکڑ لو۔ انھوں نے اسے پکڑ لیا۔ اُس سے پوچھا کہ تم کون ہو اور کہاں جا رہے ہو؟ تو اس نے کہا: ''میں امیر المومنین کا قاصد ہوں اور مصر کے عامل کی طرف امیر المومنین کا پیغام لے کر جا رہا ہوں۔'' انھوں نے اس کی تلاشی لی تو اس کے پاس ایک خط پایا جو امیر المومنین کی طرف سے والی مصر کے نام تھا۔ اس پر امیر المومنین کی مہر بھی ثبت تھی۔ انھوں نے خط کھول کر پڑھا۔ اس میں مصر کے عامل کو لکھا گیا تھا کہ یہ شر پسند جونہی پہنچیں انھیں سولی پر لٹکا دینا یا قتل کر دینا یا ان کے ہاتھ پاؤں مخالف سمت سے کاٹ دینا۔ یہ دیکھ کر مصری قافلہ دوبارہ مدینہ آ گیا۔[1]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس خط سے لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے کہا: ''میں نے یہ خط نہیں لکھا۔ تم اس پر دو گواہ پیش کرو یا مجھ سے اللہ کی قسم لے لو کہ میں نے یہ لکھا نہ املاء کرایا ورنہ مجھے اس کا علم ہے۔ بسا اوقات جعلی خط لکھ کر بھی کسی کی طرف منسوب کر دیا جاتا ہے اور مہر بھی دو نمبر بن سکتی ہے۔ لیکن انھوں نے آپ کی بات کی تصدیق سے انکار کر دیا۔[2]

یہ وہ خط تھا جسے بنیاد بنا کر اُن سرکشوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کیا اور کہا کہ اس خط پر اُن کی مہر تھی اور اس خط کو لے جانے والا آپ کا ایک غلام تھا جو صدقے کے اونٹ پر سوار تھا اور مصر کے گورنر حضرت عبداللہ بن سعد بن ابی سرح رضی اللہ عنہ کے نام یہ حکم لے جا رہا تھا کہ ان سب باغیوں کو قتل کر دو۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ خط جھوٹ کا پلندہ تھا جسے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کیا گیا۔ اس خط کے جھوٹ ہونے کی وجوہ درج ذیل ہیں:

- یہ بات بتائی جا چکی ہے کہ خط لے جانے والا مصریوں کے اس قافلے سے چھیڑ خانی کرتا رہا۔ کبھی ان میں شامل ہو جاتا اور کبھی جدا ہو جاتا۔ اس طرح وہ خود اپنے آپ کو مشکوک بنا کر پیش کر رہا تھا

---

[1] تاريخ الطبري (٥/ ٣٧٩)

[2] فتنة مقتل عثمان رضی اللہ عنہ للدكتور محمد عبد الله الغبان (٥/ ١٣٢) البداية والنهاية (٧/ ١٩٧)

کہ میرے پاس تمھارے کام کی ایک چیز ہے وہ لے لو۔ اگر یہ شخص حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف سے ہوتا تو اس قافلے کے قریب بھی نہ پھٹکتا بلکہ ان سے بچ بچا کر جلد از جلد مصر کے گورنر کے پاس جاتا تاکہ انھیں صورتِ حال سے آگاہ کرے اور وہ بر موقع کاروائی کر سکیں۔

۞ اس خط کے خود ساختہ ہونے کی دوسری دلیل یہ ہے کہ عراقیوں کو اس خط کے بارے میں کیسے معلوم ہوا، جبکہ وہ اہلِ مصر سے الگ ہو کر اپنے شہروں کا رخ کر چکے تھے اور ان کے مابین میلوں مسافت تھی۔ عراقی مدینہ سے مشرق میں تھے جبکہ مصری مدینہ سے مغرب میں۔ اس کے باجود دونوں گروہ یک لخت مدینہ آگئے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان کی طے شدہ سوچی سمجھی سازش تھی کہ اُن لوگوں نے بھاڑے کا ایک ٹٹو اہلِ مصر کے قافلے کی طرف روانہ کیا جو یہ ظاہر کرے کہ وہ کوئی خط لے جا رہا ہے اور مصریوں کے سامنے ایسا ڈرامہ کرے کہ وہ اسے پکڑ لیں، انھوں نے اپنے ایک دوسرے گماشتے کو اہلِ عراق کی طرف روانہ کر دیا کہ وہ انھیں قتل کے حکم نامے والے مزعومہ خط کی داستان سنائے، اسی لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان سے فرمایا تھا:

''اے بصرے اور کوفے والو! تمھیں کیسے معلوم ہوا کہ مصریوں نے اس طرح کا خط پکڑا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ تم اپنے منصوبے کے مطابق یونہی تھوڑا سا چل کر پھر واپس آگئے ہو۔''[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قسم کھائی اور فرمایا: ''اللہ کی قسم! یہ سارا منصوبہ مدینہ میں بنایا گیا ہے۔''

امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس کا یوں رد کیا ہے: ''یہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم پر صریحاً الزام اور واضح جھوٹ ہے، شر پسندوں نے جعلی خط لکھ کر ان کی طرف منسوب کیے۔ قاتلینِ عثمان رضی اللہ عنہ خارجیوں کے نام حضرت علی، طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہم کی طرف سے جعلی خطوط تیار کیے گئے جن سے انھوں نے براءت کا اظہار کیا۔ اسی طرح یہ جعلی خط بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کیا گیا۔ اس خط کے لکھنے کا آپ نے حکم دیا نہ آپ کو اس کے بارے میں کوئی علم تھا۔''[2]

بلاشبہہ جن مجرم ہاتھوں نے جھوٹے خطوط کی جعل سازی کر کے انھیں اُن صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف منسوب کیا، وہ شروع سے لے کر آخر تک فتنوں کی آگ بھڑکانے والوں ہی کی کارستانی تھی، انہی لوگوں

---

[1] تاريخ الطبري (٥/ ٣٥٩)

[2] البداية والنهاية (٧/ ١٧٥)

نے یہ لمبا چوڑا فساد برپا کیا۔

اِس یہودی سبائی سازش کے تحت صرف حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہی کی ذات پر ظلم نہیں ڈھایا گیا بلکہ اس کے ذریعے تاریخِ اسلام اور مسلمانوں کی نسلِ نو کو بھی نقصان پہنچایا گیا، تاریخِ اسلام کا حلیہ بگاڑ دیا گیا اور آیندہ آنے والی مسلمان نسل پر یہ ظلم کیا گیا کہ انھی کی تاریخ ان کے روبرو مسخ کر کے پیش کی گئی۔ لہٰذا ضروری ہے کہ مسلمان اپنی صحیح تاریخ سے آگاہی حاصل کریں اور اپنی تاریخ کے عظیم لوگوں کی بے مثال قربانیوں اور درخشاں کردار سے مجاہدانہ زندگی کا سبق سیکھیں۔

کیا ابھی وقت نہیں آیا کہ اِس دور کے مسلمان مؤرخین اللہ سے ڈریں اور اُن معصوم اور بے گناہوں کی روحوں کو اپنے قلم سے مجروح کرنے سے پہلے حقائق کی چھان بین کرلیں تاکہ وہ بھی دوسروں کی طرح اندھا دھند غلطی پر غلطی نہ کرتے چلے جائیں؟[1]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا محاصرہ:

صحیح روایات میں اس کی کوئی صراحت نہیں ملتی کہ محاصرہ کس طرح شروع ہوا اور اُس کی ابتدائی شکل کیا تھی، البتہ اس سے پیشتر رونما ہونے والے واقعات سے اس کی ابتدائی حالت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ہوا یوں کہ ایک روز حضرت عثمان رضی اللہ عنہ لوگوں کو وعظ فرما رہے تھے۔ اچانک مجلس میں سے ''اعین'' نامی ایک شخص اٹھا۔ اُس نے آپ کی بات کاٹتے ہوئے کہا: ''اے نعثل! (عرب تنقیص کے لیے یہ کلمہ بولتے ہیں) تو نے دین کو بدل دیا ہے۔'' حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے پوچھا: ''یہ کون ہے؟'' لوگوں نے بتایا: ''یہ اعین ہے۔'' حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اصل حقیقت یہ ہے کہ تم بدل گئے ہو۔'' یہ سن کر لوگ اعین پر ٹوٹ پڑے، بالآخر بنولیث کے ایک شخص نے لوگوں کی منت سماجت کر کے اس کی جان بچائی اور اسے گھر لے گیا۔ باغیوں کی دوبارہ واپسی اور محاصرہ ہونے سے پہلے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مسجد میں نماز کے لیے تشریف لاتے تھے اور کوئی ملنا چاہتا تو اسے بھی کھلے عام ملنے کی اجازت تھی، پھر آپ کو گھر سے نکلنے سے روک دیا گیا، یہاں تک کہ باغیوں نے آپ کو فرض نمازوں کی ادائیگی کے لیے بھی مسجد میں آنے کی اجازت نہیں دی۔[2]

محاصرہ کرنے والوں میں سے ایک شر پسند شخص لوگوں کو نماز پڑھاتا تھا۔ حضرت عبیداللہ بن عدی الخیار رضی اللہ عنہ

---

[1] عثمان بن عفان لعبد الستار الشيخ (ص: ٢٢٨ـ ٢٢٩)

[2] فتنة مقتل عثمان رضي الله عنه للدكتور محمد عبد الله الغبان (١/ ١٤٣) تاريخ دمشق ترجمة عثمان (ص: ٢٤٧) إسناده حسن.

نے اس کے پیچھے نماز پڑھنا جائز نہ سمجھا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے اس کے بارے میں مشورہ کیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس کے پیچھے نماز پڑھتے رہو، مزید فرمایا کہ:

''نماز ان لوگوں کے اچھے اعمال میں سے ہے۔ جب یہ لوگ اچھا کام کریں تو ان کے ساتھ مل کر اچھا کام کرو اور جب برائی کریں تو اس میں ان کا ساتھ نہ دو۔''[1]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور محاصرہ کرنے والوں کے مابین مذکرات:

جب باغیوں نے آپ کے گھر کو پوری طرح گھیرے میں لے لیا تو انھوں نے آپ سے خلافت سے دستبرداری کا مطالبہ کیا اور دھمکی دی کہ اگر آپ دستبردار نہ ہوئے تو آپ کو قتل کر دیا جائے گا۔[2]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے خلافت سے دستبردار ہونے سے انکار کرتے ہوئے فرمایا:

''لَا أَخْلَعُ سِرْبَالًا سَرْبَلَنِيهِ اللّٰهُ''[3]

''میں وہ قمیص نہیں اتاروں گا جو اللہ نے مجھے پہنائی ہے۔''

آپ کا اشارہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیّت کی طرف تھا۔ اِسی طرح بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کی رائے یہ بھی تھی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو دستبردار ہو جانا چاہیے تاکہ ان کا خون محفوظ رہے۔ ان میں حضرت مغیرہ بن اخنس رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔[4]

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا مشورہ:

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس آئے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اُن سے کہا: ''دیکھیے! یہ لوگ کہتے ہیں کہ خلافت سے دستبردار ہو جاؤ اور اپنے آپ کو ہلاک نہ کرو۔'' حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ''اگر آپ دستبردار ہو گئے تو کیا آپ دنیا میں ہمیشہ رہیں گے؟'' حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''نہیں۔'' پھر انھوں نے فرمایا: ''اگر آپ دستبردار نہ ہوں تو وہ قتل کرنے سے زیادہ تو کچھ نہیں کر سکتے؟'' حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''نہیں'' انھوں نے فرمایا: ''کیا وہ آپ کو جنت یا جہنم بھیجنے کا اختیار رکھتے ہیں؟'' حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''نہیں'' حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''میں یہ بات ٹھیک

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٩٥)

[2] الطبقات لابن سعد (٣/ ٦٦)

[3] التمهيد والبيان لمحمد بن يحيىٰ الأندلسي (ص: ٤٦ ـ ٤٧)

[4] فتنة مقتل عثمان رضي الله عنه للدكتور محمد عبد الله الغبان (١/ ١٤٧)

نہیں سمجھتا کہ آپ وہ قمیص اتار دیں جو اللہ نے آپ کو پہنائی ہے۔ اس طرح تو یہ طریقہ چل نکلے گا کہ جب کوئی قوم خلیفہ کو ناپسند کرے گی، وہ حملہ کرنے کے لیے اٹھ کھڑی ہو گی اور خلیفہ کو قتل کر دے گی۔[1]

اللہ تعالیٰ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے راضی وخوشنود رہے۔ وہ کس قدر دور اندیش تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خلفاء کے لیے کوئی ایسا برا طریقہ جاری کر جائیں جس سے خلفاء کھیل تماشا بن کر رہ جائیں اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ایسا کرنے والے بھی کہاں تھے؟ اگر آپ ان سبائی باغیوں کا مطالبہ تسلیم کرتے ہوئے خلافت سے دستبراد ہو جاتے تو خلفاء نفس پرستوں اور خود غرضوں کے ہاتھوں کھیل تماشا بن جاتے۔ خلافت کی بنیادیں کھوکھلی ہو جاتیں اور خلیفہ کا دبدبہ ختم ہو جاتا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اور دیگر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے مشورے سے بعد والوں کے لیے اچھی مثال قائم کی کہ صبر و استقامت سے کام لیا۔ ثواب کی نیت سے ڈٹ گئے۔ دستبردار نہیں ہوئے، نہ اس معاملے میں مسلمانوں کا خون بہایا۔[2]

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما مسلّح ہو کر آ گئے:

جب صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے دیکھا کہ معاملہ سنگین ہو چکا ہے اور پانی سر سے گزرنے لگا ہے تو بعض صحابہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مشورے کے بغیر ہی آپ کا دفاع کرنے کا عزم کیا۔ وہ لڑائی کے لیے تیار ہو کر آپ کے گھر میں داخل ہو گئے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بھی ان میں شامل تھے۔ آپ نے تلوار لٹکا رکھی تھی اور زرہ بھی پہن رکھی تھی لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے سختی سے منع کر دیا اور حکم دیا کہ آپ چلے جائیں کیونکہ لڑائی کی صورت میں ان کے قتل ہونے کا اندیشہ تھا۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما دوبارہ پھر مسلّح ہو کر آئے، لیکن آپ کے منع کرنے پر پھر واپس چلے گئے۔[3]

ام المومنین سیدہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کا موقف:

ام المؤمنین سیدہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے ان حادثات میں انتہائی خطرناک موقف اختیار کیا، وہ اِس قدر خطرناک موقف تھا کہ وہ اُن ہنگاموں میں قتل ہوتے ہوتے بچ گئیں۔ وہ اس طرح کہ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا محاصرہ کیا گیا اور آپ کا پانی بھی بند کر دیا گیا تو سیدہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے حضرت عَمرو بن حزام انصاری رضی اللہ عنہ

---

[1] فضائل الصحابة لأحمد بن حنبل (١/ ٤٧٣) اسناده صحيح)

[2] الخلفاء الراشدون للخالدي (ص: ١٧٩)

[3] فتنة مقتل عثمان رضي الله عنه للدكتور محمد عبد الله الغبان (١/ ١٦٣)

کے دو بیٹوں کو جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پڑوسی تھے، پیغام دے کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف بھیجا کہ باغیوں نے پانی بند کر دیا ہے، ممکن ہو تو کسی طریقے سے پانی اندر بھیجو۔ اسی طرح حضرت طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہما، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور دیگر ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کی طرف بھی یہی پیغام بھیجا۔ حضرت علی اور سیدہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے سب سے پہلے اُن کی معاونت کی کوشش کی۔ اور سیدہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا مکمل طور پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مدد میں مشغول ہوگئیں، جیسا کہ ابن عساکر نے کہا ہے۔ اور یہ طبعی تقاضا تھا، کیونکہ ان کا تعلق بھی بنو امیہ سے تھا۔ سیدہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا معاونت کرنے کے لیے آگے بڑھیں تو باغیوں نے اُن کے خچرے کے چہرے پر مارا۔ سیدہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

''بنو امیہ کے کچھ افراد کی وصیتیں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس ہیں، میں اُن سے مل کر اُن وصیتوں کے متعلق پوچھنا چاہتی ہوں تاکہ یتیموں اور بیوگان کے اموال ضائع نہ ہو جائیں۔''

باغیوں نے کہا کہ آپ جھوٹ بولتی ہیں، پھر وہ آپ پر حملہ آور ہوئے اور آپ کے خچر کی رسی تلوار سے کاٹ دی۔ خچر حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کو لے کر بھاگ کھڑا ہوا۔ لوگوں نے اسے پکڑنے کی کوشش کی، سیدہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا ایک طرف لُڑھک گئیں۔ لوگ خچر سے چمٹ گئے اور اسے پکڑ لیا۔ سیدہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا بال بال بچیں، پھر لوگ انھیں اُن کے گھر لے گئے۔ بعض شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ سیدہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے اپنے آزاد کردہ غلام حضرت ابوجراح رضی اللہ عنہ کو بھی حکم دیا کہ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ رہے، اتنے شدید ہنگاموں کے باوجود حضرت ابوجراح رضی اللہ عنہ آخری وقت تک حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ رہے۔

ام المومنین سیدہ صفیہ رضی اللہ عنہا کا کردار:

سیدہ صفیہ رضی اللہ عنہا نے بھی سیدہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کا سا موقف اختیار کیا۔ حضرت کنانہ بن عدی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں سیدہ صفیہ رضی اللہ عنہا کی سواری کی لگام تھامے ہوئے تھا اور وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا دفاع کرنا چاہتی تھیں۔ راستے میں اشتر ملا، اس نے آپ کے خچر کے چہرے پر مارا یہاں تک کہ آپ گر گئیں، اس پر آپ نے فرمایا: ''مجھے چھوڑ دو، مجھے یہ رسوا نہیں کرسکتا۔''

بعد ازاں اپنے گھر کی چھت سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر کی چھت تک لکڑی کا پل بنایا۔ وہ اس پل کے ذریعے کھانا اور پانی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر منتقل کرتی رہیں۔[1]

[1] سير أعلام النبلاء (٢/ ٢٣٧)

ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا باغیوں پر برہم ہوکر مدینہ سے چلی گئیں:

سیدہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ بدتمیزی لوگوں پر بہت گراں گزری، اسی وجہ سے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا باغیوں پر برہم ہوکر مدینہ چھوڑ کر چلی گئیں۔ حضرت مروان بن حکم رحمہ اللہ نے ان سے گزارش کی کہ ام المؤمنین! اگر آپ یہاں رہتیں تو ممکن تھا کہ لوگ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی حفاظت کر سکتے۔ اس پر سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

''کیا تم چاہتے ہو کہ میرے ساتھ بھی وہی سلوک کیا جائے جو (حضرت) ام حبیبہ (رضی اللہ عنہا) کے ساتھ کیا گیا؟ پھر مجھے کوئی ایسا شخص بھی نہ ملے جو میری حفاظت کر سکے۔ اللہ کی قسم! میں عار نہیں دلائی جاؤں گی، کوئی ایسا اقدام نہیں کروں گی جو باعثِ ملامت ہو، مجھے نہیں معلوم کہ ان لوگوں کا معاملہ کہاں تک پہنچے گا۔''[1]

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا مدینہ چھوڑنے کا مقصد یہ تھا کہ شاید اُن کے اس طرح احتجاجاً چلے جانے کی وجہ سے خارجیوں کو حیا آئے اور وہ اپنے ناپاک مقاصد سے باز آجائیں۔ پھر تمام امہات المؤمنین رضی اللہ عنہن نے حج کے ارادے سے وہاں سے چلے جانے کی تیاری کر لی۔ ان سب کا مقصد فتنے سے فرار یا محض ڈر کر وہاں سے نکلنا نہ تھا بلکہ اُن فتنہ پرور لوگوں کے چنگل سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو نکالنا تھا کہ شاید اس طرح وہ باز آجائیں۔ یعنی اُن کے نکلنے کا مقصد لوگوں کے اس ہجوم کو کسی طرح منتشر کرنا تھا کیونکہ لوگوں میں یہ بات معروف تھی کہ وہ امہات المؤمنین رضی اللہ عنہن کی آراء اور فتاویٰ کے منتظر رہتے تھے۔ یہ بات تو امہات المؤمنین رضی اللہ عنہن کے تصوّر میں بھی نہیں تھی کہ معاملہ اس قدر سنگین ہوجائے گا کہ شر پسند خلیفہ کو قتل ہی کر دیں گے۔[2]

فتنے کے دوران ۳۵ھ کا خطبۂ حج؟ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا مکتوب:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو ذمہ داری سونپی کہ وہ اس سال لوگوں کو خطبۂ حج دیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے عرض کی: ''امیر المومنین! مجھے اپنے ساتھ رہنے دیجیے تاکہ میں ان (خوارج) کا مقابلہ کروں، اللہ کی قسم! اِن خارجیوں سے جنگ کرنا مجھے حج سے زیادہ محبوب ہے۔'' حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''میرا حکم ہے کہ آپ لوگوں کو حج کا خطبہ دیں۔'' اب حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس

[1] تاريخ الطبري (٥/ ٤٠١)

[2] دور المرأة السياسي لأسماء محمد (ص: ٣٤٣)

ماننے کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک خط لکھ کر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو دیا کہ وہ یہ خط خطبۂ حج میں لوگوں کو سنائیں۔ اس میں آپ نے باغیوں کی صورتِ حال واضح فرمائی۔ اپنا موقف اور ان کے مطالبات بھی بیان کیے۔[1]

فرمایا: ''میں نے ان کے سارے مطالبات تسلیم کیے اور اس پر قائم ہوں۔ میں تمھیں اور اپنے ساتھیوں کو مطلع کر رہا ہوں کہ انھوں نے تقدیر کے کاموں میں عجلت کی۔ مجھے نماز پڑھانے سے روک دیا۔ وہ میرے اور مسجد کے درمیان حائل ہو گئے، یعنی مسجد میں میرا آنا جانا بند کر دیا۔ مدینہ منورہ سے جو کچھ لُوٹ سکتے تھے لوٹ لیا۔ اب جب کہ میں تمھیں یہ خط لکھ رہا ہوں وہ مجھے تین باتوں میں سے ایک کا اختیار دے رہے ہیں:

- وہ کہتے ہیں کہ آپ نے جسے بھی صحیح یا غلط طریقے سے سزا دی ہے ہم اس کا بدلہ لیں گے اور اس معاملے میں کوئی رعایت نہیں کریں گے۔
- میں خلافت سے علاحدہ ہو جاؤں اور وہ میرے علاوہ کسی دوسرے شخص کو خلیفہ مقرر کر لیں گے۔
- انھیں ان فوجیوں اور شہریوں کی طرف بھیجا جائے جو ان کے فرمانبردار ہیں اور وہ میری اس وفاداری اور اطاعت سے آزادی کا اعلان کر دیں جو اللہ نے ان پر فرض کر دی ہے۔''

میں نے ان کے جواب میں ان سے کہا ہے: جہاں تک مجھ سے بدلہ لینے کا تعلق ہے تو مجھ سے پہلے بھی خلفاء گزرے ہیں جو صحیح فیصلہ بھی کرتے تھے اور ان سے غلط فیصلے بھی صادر ہوئے مگر ان سے کوئی بدلہ نہیں لیا گیا۔ مجھے بخوبی علم ہے کہ وہ صرف میرے خون کے پیاسے ہیں۔

> ''اور جہاں تک خلافت سے دستبرداری اور علیحدگی کا تعلق ہے تو میں اسے کسی قیمت پر چھوڑنے کے لیے تیار نہیں۔ وہ مجھے سخت ترین اذیت بھی دیں تو وہ مجھے اس بات سے زیادہ پسند ہے کہ میں اللہ بزرگ و برتر کے کام اور اس کی خلافت سے اعلانِ دستبرداری کروں۔''
>
> ''اور جہاں تک میری اطاعت سے بے زاری کی اجازت کا تعلق ہے تو اس کا جواب میں نے یہ دیا ہے کہ میں ان کا وکیل نہیں ہوں۔ میں نے اس سے پہلے اِن لوگوں کو زبردستی اطاعت پر مجبور نہیں کیا وہ اپنی رضامندی سے میری اطاعت کر رہے ہیں کیوں کہ ان کا مقصد اللہ بزرگ و برتر

[1] الخلفاء الرشدون للخالدی (ص: ١٦٧۔ ١٦٨)

کی رضا جوئی ہے، نیز وہ باہمی اصلاح کے خواہش مند ہیں۔ لٰہذا اللہ سے ڈرتے رہو اور اُسی سے بدلے کی امید رکھو۔ اگر تم میں سے کوئی وعدے کی خلاف ورزی کرنا چاہتا ہے تو میں اُسے پسند کروں گا نہ اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند کرتا ہے کہ تم اس سے کیے ہوئے عہد کو توڑ دو۔''

اور وہ جس بات پر مجھے مجبور کر رہے ہیں وہ تمام تر خلافت اور اقتدار کا جھگڑا ہے (وہ کسی بھی طریقے سے اُسے حاصل کرنا چاہتے ہیں) اب میں صرف اپنی ذات اور اپنے ساتھیوں کا اختیار رکھتا ہوں۔

میں اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کی نعمت کی تبدیلی کا انتظار کر رہا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی غلط روایت قائم ہو اور امتِ اسلامیہ میں اختلاف وانتشار پیدا ہو اور ناحق خون ریزی ہو، اس لیے میں تمھیں اللہ تعالیٰ اور اسلام کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کہ صرف حق بات کرو، میرے ساتھ بھی حق کے مطابق سلوک کرو۔ اہلِ حق کے خلاف بغاوت ترک کردو۔ اور ہمارے معاملے کے بارے میں بھی عدل وانصاف کرو جیسا کہ اللہ عز وجل نے تمھیں حکم دیا ہے۔ میں اللہ عزّ وجل کا واسطہ دے کر تمھیں وعدے کی پاسداری اور اللہ کے دین کی نصرت ومدد کا عہد یاد دلاتا ہوں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ ۖ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا ﴾ [بني إسرائيل: ٣٤]

''اور تم عہد پورا کرو، بے شک عہد کی بابت سوال کیا جائے گا۔''

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

میں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا یہ گرامی نامہ حجاج کرام کو مکہ میں ۷ ذوالحجہ کو پڑھ کر سنایا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا آخری خطاب:

محاصرہ ہوئے کئی ہفتے گزر گئے۔ ایک دن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں سے خطاب کرنے کا فیصلہ کیا۔ انھوں نے تمام لوگوں کو بلوا بھیجا۔ سب جمع ہو گئے۔ حاضرین میں آپ کے خلاف بغاوت کرنے والا سبائی ٹولا بھی تھا اور اطاعت پر قائم اہلِ مدینہ بھی۔ حضرت علی، طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہم پیش پیش تھے۔ جب لوگ بیٹھ گئے تو آپ نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ نے تمھیں دنیا اس لیے دی ہے کہ تم اس کے ذریعے آخرت طلب کرو۔ دنیا اس لیے نہیں دی گئی کہ تم اس کے پجاری بن جاؤ اور اس پر مائل ہو جاؤ۔ دنیا فانی ہے۔ آخرت

[1] تاريخ الطبري (٥/ ٢٢٥۔ ٤٣١)

دائمی ہے۔ یہ فانی دنیا تمھیں دھوکے اور غرور میں مبتلا نہ کرے۔ ہمیشہ باقی رہنے والی آخرت سے غافل نہ کر دے، باقی رہنے والی آخرت کو فناء ہونے والی دنیا پر ترجیح نہ دو۔ تم دنیا کو جلد چھوڑ کر جدا ہو جاؤ گے۔ تمھارا ٹھکانا اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ اللہ عزّ وجل کا تقویٰ اختیار کرو۔ اس کا تقویٰ اس کے عذاب اور پکڑ سے بچاؤ کا ذریعہ اور ڈھال ہے۔ اپنی (مسلمانوں کی) جماعت کے ساتھ منسلک رہو اور گروہ بندیوں میں مت بٹو۔''

نیز ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۚ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ۗ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ﴾

[آل عمران: ۱۰۳]

''اور سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو اور جدا جدا نہ ہو اور تم اپنے آپ پر اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، پھر اس نے تمھارے دلوں میں الفت ڈال دی اور تم اس کے احسان سے بھائی (بھائی) بن گئے۔ اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے پر تھے، پھر اس نے تمھیں اس میں گرنے سے بچا لیا، اللہ اسی طرح تمھارے لیے اپنی آیتیں بیان کرتا ہے شاید کہ تم ہدایت پاؤ۔''

پھر مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرمایا:

''اے اہلِ مدینہ! میں تمھیں اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔ اُسی سے خواستگار ہوں کہ میرے بعد تمھیں اچھے خلیفہ سے نوازے۔ اللہ کی قسم! میں آج کے بعد کسی کے سامنے نہیں آؤں گا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ میرے بارے میں اپنا فیصلہ جاری فرما دے۔ میں اِن خوارج کو دروازے کے پیچھے ہی رکھوں گا، اِن سے کوئی سمجھوتہ نہیں کروں گا۔ انھیں ان کے ناروا مطالبات کے سلسلے میں کوئی رعایت نہیں دوں گا جس سے فائدہ اٹھا کر یہ لوگ تمھارے دین و دنیا میں بگاڑ پیدا کریں یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ جو پسند کرے فیصلہ فرما دے۔''

اس کے بعد آپ نے اہلِ مدینہ کو واپس جانے کا حکم دیا۔ انھوں نے پس و پیش کیا تو انھیں قسم دے

کر واپس جانے کا حکم دیا، چنانچہ بیشتر لوگ لوٹ گئے، البتہ حضرت حسن بن علی، محمد بن طلحہ اور عبد اللہ بن زبیر وغیرہ رضی اللہ عنہم اپنے والدین کے حکم کے مطابق حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دروازے ہی پر بیٹھے رہے۔ کئی دیگر لوگ بھی ان کی طرف لوٹ آئے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ گوشہ نشین ہو گئے اور شہادت تک گوشہ نشین ہی رہے۔[1]

شہادتِ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ:

خلیفہ کی امداد کے لیے مختلف شہروں میں لشکر متحرّک ہو رہے تھے۔ اس کے علاوہ حج کے ایام بھی تیزی سے گزر رہے تھے۔ اس بات کا بھی قوی امکان ظاہر کیا جا رہا تھا کہ حُجّاجِ کرام جلد خلیفہ کی مدد کے لیے پہنچ رہے ہیں، بالخصوص حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جیسے خلیفہ کے حمایتی بھی حُجّاج میں موجود تھے۔ باغیوں اور سبائیوں کو یہ خبریں موصول ہونے لگیں کہ مختلف شہروں کی فوج کے علاوہ حُجّاج کرام بھی خلیفہ کی کُمک پر ہیں اور مدینے کا رخ کر چکے ہیں چنانچہ شیطان نے انھیں اپنے جال میں پھنسایا اور انھوں نے سوچا کہ ہم جس مشکل میں گھِر چکے ہیں، اس سے نکلنے کا واحد راستہ یہی ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کر دیا جائے تا کہ لوگوں کی توجہ ہم سے ہٹ کر اس سانحے کی طرف لگ جائے۔[2]

محاصرے کی آخری رات اور خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت:

محاصرے کے آخری روز جس دن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا گیا، اس رات آپ سوئے اور صبح بیدار ہو کر لوگوں کو بتایا کہ یہ سبائی لوگ مجھے شہید کر دیں گے۔ پھر فرمایا: میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما بھی تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا:

«يَا عُثْمَانُ أَفْطِرْ عِنْدَنَا» ''اے عثمان! کل روزہ ہمارے ہاں افطار کرنا۔''

اُس روز حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے روزہ رکھا ہوا تھا اور اسی روز شہید کر دیے گئے۔[3]

آپ نے حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کے مشورے پر عمل کیا جب انھوں کہا کہ آپ ڈٹ جائیں، اس سے آپ کا موقف زیادہ مستحکم ہو گا اور دشمن پر حجت قائم ہو جائے گی۔ بالآخر نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پیش گوئیاں سچ ثابت ہوئیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا جائے گا۔

---

[1] تاريخ الطبري (٥/ ٣٩٩ ـ ٤٠٠)

[2] تاريخ الطبري (٥/ ٤٠٢)

[3] الطبقات لابن سعد (٣/ ٧٥) إسناده حسن.

شہادتِ حضرت عثمان کے المناک مناظر:

شقی القلب باغیوں نے آپ کے گھر پر دھاوا بول دیا۔ حضرت حسن بن علی، عبداللہ بن زبیر، محمد بن طلحہ، مروان بن حکم اور سعید بن عاص رضی اللہ عنہم اور دیگر صحابۂ کرام کے صاحبزادوں نے مزاحمت کی، لڑائی چھڑ گئی۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے انھیں دیکھا تو بلند آہنگی سے فرمایا:

''اللہ! اللہ! تم میری نصرت سے بریٔ الذمہ ہو، لڑائی نہ کرو۔''

لیکن انھوں نے انکار کر دیا۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے غلام آگے بڑھے کہ آپ کی مدد کریں تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انھیں بھی روک دیا بلکہ اعلان کر دیا کہ جو لڑائی نہیں کرے گا وہ آزاد ہے۔[1]

پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بڑے اصرار کے ساتھ پُر زور اعلان فرمایا:

''جو شخص سمجھتا ہے کہ اس پر میری اطاعت و پیروی ضروری ہے میں اُسے حکم دیتا ہوں کہ وہ لڑائی سے باز رہے۔''[2]

اِس کی وجہ صرف یہ تھی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئی کے باعث یقین ہو چکا تھا کہ اب انھیں شہید کر دیا جائے گا، اس لیے وہ نہیں چاہتے تھے کہ اُن کی خاطر کُشت وخون ہو، اور مسلمانوں کے مابین فتنہ کھڑا ہو جائے۔[3]

حضرت مغیرہ بن اخنس رضی اللہ عنہ اُن لوگوں میں سے تھے جو حج سے فراغت پا کر جلد ہی وطن واپس آ گئے تھے، وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت سے پہلے مدینہ منورہ پہنچ گئے۔ وہ آپ کے دفاع کے لیے آپ کے گھر میں داخل ہو گئے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہو کر فرمانے لگے: ''اگر ہم نے آپ کو اِسی طرح شدید خطرے کی حالت میں چھوڑ دیا تو ہم اللہ کو کیا جواب دینگے؟ ہم طاقت رکھتے ہیں اور ہم آپ کا اُس وقت تک دفاع کریں گے جب تک ہمیں موت نہ آ جائے۔''

باغیوں نے گھر کے دروازے اور چھت کو آگ لگا دی، اہلِ خانہ مشتعل ہو گئے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نماز پڑھ رہے تھے، فارغ ہو کر انھیں سمجھایا کہ مشتعل نہ ہوں۔ حضرت مغیرہ بن اخنس، حسن بن علی، محمد بن طلحہ، سعید بن عاص، مروان بن حکم اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم نے لڑائی کی اور بہادری کے جوہر دکھائے،

[1] الدولة الإسلامية في عصر الخلفاء الراشدين للدكتور حمدى شاهين (ص: ٢٨٢) البداية و النهاية (٧/ ١٩٠)
[2] العواصم من القواصم لابن العربي (ص: ١٣٣)
[3] الدولة الإسلامية في عصر الخلفاء الراشدين للدكتور حمدي شاهين (ص: ٢٨٣)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ انھیں پیغام بھیجتے رہے کہ لڑائی ترک کر دو، واپس چلے جاو، پھر وہ نماز میں مشغول ہو گئے۔ انھوں نے نماز میں سورۃ طٰہٰ کی تلاوت شروع کی:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿ طٰهٰ ① مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ② اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ﴾

''شروع اللہ کے نام سے جو بہت مہربان ہے رحم والا۔''

''طٰہٰ، ہم نے آپ پر قرآن اس لیے نازل نہیں کیا کہ آپ مشقت میں پڑیں، مگر (یہ تو) اس شخص کے لیے نصیحت ہے جو اللہ سے ڈرتا ہے۔''

آپ تلاوت کرتے رہے، شور وغل اور ہنگامہ آرائی سے متاثر نہ ہوئے۔ بغیر کسی غلطی اور رکاوٹ کے اپنی قراءت جاری رکھی اور خارجیوں کے اندر گھس آنے سے پہلے پہلے سورت کے آخر تک تلاوت کر ڈالی۔ نماز سے فارغ ہوئے تو بیٹھ گئے اور یہ آیت پڑھی:

﴿ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عٰقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴾ [آل عمران: ۱۳۷]

''تم سے پہلے بھی ایسے واقعات گزر چکے ہیں، چنانچہ تم زمین میں چل پھر کر دیکھو کہ (نبیوں کو) جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا؟۔''

اُس روز قریش کے چار نوجوان: حضرت حسن بن علی، عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم، محمد بن حاطب، اور مروان بن حکم رحمہ اللہ زخمی ہوئے۔[1] اور حضرت مغیرہ بن اخنس، نیار بن عبداللہ اسلمی اور زیاد فہری رضی اللہ عنہم شہید ہو گئے۔[2]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے دفاع کرنے والوں کو مطمئن کیا اور انھیں حکم دیا کہ وہ اپنے گھروں میں چلے جائیں، اب آپ کے اور محاصرہ کرنے والوں کے مابین کوئی رکاوٹ باقی نہ رہی۔ گھر میں صرف حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور اُن کے اہلِ خانہ رہ گئے۔ اب محاصرین کے سامنے کوئی دفاع کرنے والا موجود نہ تھا، چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے گھر کا دروازہ کھول دیا۔[3]

---

[1] فتنة مقتل عثمان رضي الله عنه للدكتور محمد عبدالله الغبان (١/ ١٨٨)

[2] الخلفاء الراشدون للخالدي (ص: ١٨٤۔ ١٨٥) البداية والنهاية (٧/ ١٩٦)

[3] فتنة مقتل عثمان رضي الله عنه للدكتور محمد عبدالله الغبان (١/ ١٨٨)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو یہ اندازہ تھا کہ اسلام کا دعویدار ایک گروہ اوّلین ہجرت کرنے والے مسلمانوں کے خلیفہ پر ٹوٹ پڑے گا۔ جب دفاع کی غرض سے آئے ہوئے سب لوگ چلے گئے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مصحف کھول لیا اور تلاوتِ قرآن شروع کر دی۔ اُس دن آپ روزے سے تھے۔ محاصرین میں سے ایک باغی، جس کے نام کا روایات میں کوئی ذکر نہیں ملتا، آپ کے پاس آیا۔ آپ نے اسے دیکھ کر فرمایا:

''میرے اور تیرے درمیان کتاب اللہ ہے۔''[1]

وہ شخص آپ کو اسی حالت میں چھوڑ کر واپس چلا گیا۔ ابھی وہ نکلا ہی تھا کہ ایک اور شخص گھس آیا۔ یہ بنو سدوس قبیلے کا فرد تھا۔ اسے ''الموت الاسود'' کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ اُس نے تلوار کا وار کرنے سے پہلے آپ کا گلا دبایا۔ اس کا ہی بیان ہے: ''اللہ کی قسم! میں نے ان کی گردن سے زیادہ ملائم چیز کبھی نہیں دیکھی۔ پھر اس کہا کہ: ''میں نے جب اُن کا گلا دبایا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اُن کے جسم میں کوئی جِن گردش کر رہا ہے۔''[2]

پھر اس نے ان پر تلوار کا وار کیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ہاتھ سے اس کے وار کو روکا تو ان کا ہاتھ کٹ گیا۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''اللہ کی قسم! یہ پہلی ہتھیلی تھی جس نے مُفصّل سورتوں کو لکھا تھا۔''[3]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ وہ پہلے کاتبِ وحی تھے جنھوں نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے مصحف کی املاء کی۔ انھیں کلامِ الٰہی کے عین سامنے شہید کر دیا گیا۔ ہاتھ کٹنے کے بعد بہنے والے خون کے چھینٹے اُس مصحف پر پڑے جس کی آپ تلاوت فرما رہے تھے۔ زندگی کی آخری ہچکی لیتے ہوئے حضرت ذوالنورین رضی اللہ عنہ کی زبان سے یہ آسمانی الفاظ نکلے:

﴿ فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللَّهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴾ [البقرة: ١٣٧]

''سو اُن کے مقابلے میں آپ کو اللہ کافی ہے اور وہی خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے۔''[4]

---

1. تاريخ الطبري (٥/ ٤٠٥، ٤٠٦)
2. تاريخ خليفه بن خياط (ص: ١٧٤،١٧٥)
3. تاريخ الطبري (٥/ ٣٩٨)
4. تاريخ الطبري (٥/ ٣٩٨)

ایک روایت میں ہے سب سے پہلے جس بدبخت نے آپ پر وار کیا وہ رومان یمانی تھا اور اس نے آپ پر ہاکی کی طرح کے ڈنڈے کا وار کیا۔ جب خارجی آپ کو قتل کرنے کے لیئے آپ کے گھر میں داخل ہوئے تو آپ نے انھیں دیکھتے ہی فرمایا:

''میں دیکھتا ہوں کہ موت کسی طاقتور کو نہیں چھوڑتی، اس نے قومِ عاد کے لیے شہروں میں کوئی جائے پناہ نہیں چھوڑی نہ کوئی چراگاہ باقی رکھی۔''

''وہ (موت) قلعہ بند لوگوں پر بھی حملہ کرتی ہے، حالانکہ وہ قلعہ بند ہوتے ہیں۔ موت وہ چیز ہے جو بلند و بالا پہاڑوں کی چوٹیاں پھلانگ کر بھی آدبوچتی ہے۔''[1]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ایک غلام حضرت نُجَیح رضی اللہ عنہ نے جب صورتِ حال دیکھی تو وہ شہادتِ عثمان رضی اللہ عنہ کے صدمے سے لرز اٹھے۔ اور غصے سے بے قابو ہوکر سودان بن حمران پر ٹوٹ پڑے۔ انھوں نے اس ظالم کو آن کی آن میں ڈھیر کردیا۔ اُدھر قتیرہ بن فلان سکونی نے جب دیکھا کہ حضرت نُجَیح رضی اللہ عنہ نے سودان کو قتل کر دیا ہے تو اس نے حضرت نُجَیح رضی اللہ عنہ پر وار کرکے انھیں شہید کردیا۔ یہ منظر دیکھ کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا حضرت صُبَیح رضی اللہ عنہ نامی ایک اور غلام قتیرہ بن فلان پر ٹوٹ پڑا اور اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اب گھر میں چار افراد کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ ان میں سے دو شہید تھے اور دو مجرم، شہید حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور آپ کا غلام حضرت نُجَیح رضی اللہ عنہ تھے جبکہ مجرم سودان اور قتیرہ تھے اور دونوں سکونی تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہید ہوگئے تو ایک سبائی پکار اٹھا:

''جس کا خون ہمارے لیے حلال تھا، اس کا مال بھی حلال ہے، لہٰذا اس گھر میں جو کچھ ہے لوٹ لو۔'' پھر سبائیوں نے گھر میں لوٹ مار شروع کردی، گھر کی ہر چیز لوٹ لی یہاں تک کہ عورتوں کے زیورات بھی چھین لیے۔ ایک سبائی کلثوم تجیبی سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی زوجۂ محترمہ سیدہ نائلہ رضی اللہ عنہا پر جھپٹا اور ان کی چادر چھین لی۔ اُس نے اُن کے پہلو میں تلوار کا چوکا بھی لگایا اور بدزبانی بھی کی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ایک غلام حضرت صُبَیح رضی اللہ عنہ نے جب یہ وحشیانہ منظر دیکھا اور گستاخانہ گفتگو سنی تو تلوار لے کر تجیبی پر ٹوٹ پڑا اور اسے قتل کردیا۔ ایک سبائی نے اُس غلام پر حملہ کرکے اسے شہید کردیا۔ گھر کو لُوٹنے کے بعد انھوں نے صدا لگائی کہ اب بیت المال کا رخ کرو اور جلدی پہنچو تاکہ کوئی اسے محفوظ مقام پر نہ لے جائے اور ہاں جو کچھ

---

[1] فتنة مقتل عثمان رضي الله عنه للدكتورمحمد عبد الله الغبان (١/ ١٩١) البداية والنهاية (٧/ ١٩٢)

بھی ملے، لوٹ لو۔ بیت المال کے محافظوں نے جب یہ اعلان سنا تو انھوں نے ایک دوسرے سے کہا: ”ارے! بھاگ چلو یہ تو صرف دنیا کے دیوانے ہیں۔“ بیت المال میں صرف دو بوریاں غلہ تھا جسے سبائی لوٹ کر لے گئے۔[1]

خارجیوں اور سبائیوں کا کلیجہ ٹھنڈا ہوگیا۔ انھوں نے امیر المؤمنین کو شہید کر دیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد چرواہے اور بازاری قسم کے لوگ جنھیں سبائی اپنے مقاصد کے لیے آلۂ کار کے طور پر استعمال کر رہے تھے متفکّر ہو گئے۔ ان کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ اتنا وحشیانہ قدم بھی اٹھایا جائے گا کہ امیر المومنین کو شہید کر دیا جائے گا۔ انھیں ان کے شیاطین سبائیوں نے غافل رکھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف یورش میں اُن سے ناجائز فائدہ اٹھایا اور انھیں سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل جیسے بھیانک اور الم انگیز معاملے میں گھسیٹ لائے جس کا وہ تصوّر بھی نہیں کر سکتے تھے۔ سبائیوں نے سب سے بڑا ظلم خود ڈھا کر الزام اُن بازاری اور چرواہے قسم کے لوگوں پر ڈال دیا۔ ان کے ساتھ ویسا ہی معاملہ ہوا جس طرح بنی اسرائیل سے بچھڑے کو معبود بنانے کے بعد ہوا تھا کہ اسے معبود بنانے کے بعد بعض لوگ نادم اور پریشان ہو گئے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوسَىٰ مِن بَعْدِهِ مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهُ خُوَارٌ ۚ أَلَمْ يَرَوْا أَنَّهُ لَا يُكَلِّمُهُمْ وَلَا يَهْدِيهِمْ سَبِيلًا ۘ اتَّخَذُوهُ وَكَانُوا ظَالِمِينَ ﴿148﴾ وَلَمَّا سُقِطَ فِي أَيْدِيهِمْ وَرَأَوْا أَنَّهُمْ قَدْ ضَلُّوا قَالُوا لَئِن لَّمْ يَرْحَمْنَا رَبُّنَا وَيَغْفِرْ لَنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ ﴾ [الأعراف: ١٤٨۔ ١٤٩]

”اور موسیٰ کی قوم نے اُن کے (طُور پر جانے کے) بعد اپنے زیورات سے ایک بچھڑا بنا لیا، وہ ایک جسم تھا جس کی آواز گائے کی تھی۔ کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ وہ اُن سے کلام نہیں کرتا اور نہ انھیں کوئی راستہ بتاتا ہے؟ (پھر بھی) انھوں نے اسے (معبود) بنادیا اور وہ ظالم تھے۔ اور جب انھیں شرمندگی ہوئی اور انھوں نے دیکھا کہ وہ گمراہ ہو گئے ہیں تو کہنے لگے: اگر ہمارے رب نے ہم پر رحم نہ کیا اور ہمیں نہ بخشا تو ہم ضرور خسارہ پانے والوں میں (شامل) ہو جائیں گے۔“[2]

---

[1] تاريخ الطبري (٥/ ٤٠٧)

[2] البداية والنهاية (٧/ ١٩٧۔ ١٩٨)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد صلحائے مدینہ نہایت غمگین اور پریشان ہو گئے، ان کی زبانوں پر "إنا للّٰہ وإنا إلیه راجعون" کے الفاظ تھے اور آنکھوں سے آنسوؤں کی برسات ہو رہی تھی۔ لیکن وہ بے بس تھے آخر کیا کرتے؟ مدینہ منورہ پر سبائی قابض تھے۔ وہ فساد برپا کر رہے تھے۔ مقامی باشندوں کو کوئی اقدام کرنے کی اجازت نہ تھی۔

عملی طور پر مدینہ منورہ کا حاکم مصر کے خارجیوں کا سرغنہ غافقی بن حرب عکی تھا اور فسادیوں کے ساتھ اس حادثے کا اصل منصوبہ ساز شیطانِ اعظم ابنِ سبا تھا۔ وہ اپنے مقاصد کی تکمیل اور یہودی اہداف کے پورے ہونے پر نہایت خوش تھا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت پر کبار صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے تبصرے

① حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہما:

انھیں شہادت عثمان رضی اللہ عنہ کی اطلاع ملی تو انھوں نے کہا: "اللہ تعالیٰ (حضرت) عثمان (رضی اللہ عنہ) پر رحم فرمائے! "إنا للّٰہ وإنا إلیه راجعون" انھیں بتایا گیا کہ قاتلینِ عثمان رضی اللہ عنہ اب بہت پریشان اور نادم ہیں، تو انھوں نے فرمایا: "وہ غور وفکر کرتے رہے، لیکن راہِ راست نہ پا سکے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔ یہ لوگ ہمیشہ نادم رہیں گے۔

﴿ وَحِيلَ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ مَا يَشْتَهُونَ كَمَا فُعِلَ بِأَشْيَاعِهِم مِّن قَبْلُ ۚ إِنَّهُمْ كَانُوا فِي شَكٍّ مُّرِيبٍ ﴾ [سبأ: ٥٤]

"اور ان کے اور ان چیزوں کے درمیان جنھیں وہ چاہتے ہیں، آڑ حائل کر دی جائے گی، جیسے اس سے پہلے ان جیسوں کے ساتھ کیا گیا تھا، بلاشبہ وہ ایسے شک میں مبتلا تھے جو تردّد میں ڈالنے والا ہے۔"

② حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ:

انھیں معلوم ہوا تو انھوں نے کہا: "اللہ (حضرت) عثمان (رضی اللہ عنہ) پر رحم فرمائے! "إنا للّٰہ وإنا إلیه راجعون" ان سے بھی یہی کہا گیا کہ اب قتل کرنے والے لوگ بہت پریشان ہیں۔ انھوں نے فرمایا: "تُف اُن پر، وہ تباہ ہوں۔" انھیں یقیناً اللہ کا عذاب آ پکڑے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ کے اِس فرمان کو پڑھا:

﴿ مَا يَنْظُرُوْنَ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً تَاْخُذُهُمْ وَهُمْ يَخِصِّمُوْنَ ۝ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ تَوْصِيَةً وَّلَآ اِلٰٓى اَهْلِهِمْ يَرْجِعُوْنَ ﴾ [يٰسٓ: ٤٩، ٥٠]

’’یہ لوگ یہی انتظار کر رہے ہیں کہ وہ آپس میں جھگڑ رہے ہوں اور ایک چنگھاڑ (صُور کی آواز) ان کو (ایک دم سے) آدبوچے۔ پھر نہ تو وہ (کچھ) وصیّت کر سکیں گے اور نہ اپنے گھر والوں تک لوٹ کر جا سکیں گے۔‘‘

③ حضرت علی رضی اللہ عنہ:

انھیں شہادتِ عثمان رضی اللہ عنہ کا علم ہوا تو انھوں نے فرمایا: ’’اللہ (حضرت) عثمان (رضی اللہ عنہ) پر رحمتوں کا نزول فرمائے۔‘‘ إنا لله وإنا إليه راجعون، انھیں بتایا گیا کہ قاتلین اب نادم ہو رہے ہیں تو انھوں نے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کو پڑھا:

﴿ كَمَثَلِ الشَّيْطٰنِ اِذْ قَالَ لِلْاِنْسٰنِ اكْفُرْ فَلَمَّا كَفَرَ قَالَ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكَ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ فَكَانَ عَاقِبَتَهُمَآ اَنَّهُمَا فِي النَّارِ خَالِدَيْنِ فِيْهَا ۭ وَذٰلِكَ جَزٰۗؤُا الظّٰلِمِيْنَ ﴾ [الحشر: ١٦۔ ١٧]

’’ان (منافقوں) کی مثال شیطان کی طرح ہے، وہ آدمی سے کہتا ہے کفر کر، جب وہ کفر کرتا ہے تو کہتا ہے مجھ سے تیرا کیا واسطہ، میں تجھ سے بریٔ ہوں، میں اللہ (کے غضب) سے ڈرتا ہوں جو سارے جہان کا مالک ہے۔ پھر ان دونوں کا انجام یہ ہوا کہ وہ دونوں ہمیشہ کے لیے آتشِ دوزخ میں گئے اور ظالموں کی یہی سزا ہے یعنی جہنم کی دائمی سزا۔‘‘

④ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ:

انھیں شہادتِ عثمان رضی اللہ عنہ کا علم ہوا تو انھوں نے فرمایا: ’’اللہ (حضرت) عثمان (رضی اللہ عنہ) پر رحم فرمائے۔‘‘ پھر آپ نے ان آیات کی تلاوت فرمائی:

﴿ قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ۝ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ۝ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَاۗىِٕهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ۝ ذٰلِكَ جَزَاۗؤُهُمْ جَهَنَّمُ بِمَا كَفَرُوْا وَاتَّخَذُوْٓا اٰيٰتِيْ وَرُسُلِيْ هُزُوًا ﴾ [الكهف: ١٠٣۔ ١٠٦]

’’کہیے: کیا ہم تمھیں اعمال کے اعتبار سے سب سے زیدہ خسارہ پانے والے بتائیں؟ جن کی سعی دنیاوی زندگی میں اکارت گئی، جبکہ وہ سمجھتے ہیں کہ یقیناً وہ اچھے کام کر رہے ہیں یہی لوگ ہیں جنھوں نے اپنے رب کی آیات کا اور اس کی ملاقات کا انکار کیا، چنانچہ ان کے اعمال برباد گئے، لہٰذا روزِ قیامت ہم ان کے لیے کوئی وزن قائم نہیں کریں گے۔ یہ ہے ان کی سزا جہنم، اس وجہ سے کہ انھوں نے کفر کیا، اور میری آیات اور میرے رسولوں کو ٹھٹھا بنایا۔‘‘

پھر حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے اُن خارجیوں کو بد دعا دیتے ہوئے فرمایا: ’’اے اللہ! انھیں ذلیل وخوار کر۔ پھر ان کا موَاخذہ فرما۔‘‘ اللہ تعالیٰ نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی دعا قبول فرمائی۔ وہ مستجاب الدعوات تھے۔ بالآخر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل میں شریک تمام لوگ پکڑے گئے جیسے عبد اللہ بن سبا، غافقی، اشتر، حکیم بن جبلہ اور کنانہ تجیبی وغیرہ۔ پھر انھیں قتل کر دیا گیا۔[1]

آپ کی عمرِ مبارک:

تاریخِ شہادت: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ۱۲ ذوالحجہ ۳۵ھ کو شہید کیا گیا۔[2] شہادت کے وقت آپ کی عمرِ مبارک ۸۲ سال تھی۔ یہی جمہور علماء کا قول ہے۔ یہ قول درجِ ذیل وجوہ کی بنا پر راجح ہے:

- سنِ شہادت اور سنِ ولادت کا حساب لگایا جائے تو اس قول کی تائید ہوتی ہے۔ کیوں کہ آپ عام الفیل کے چھٹے سال پیدا ہوئے اور ۳۵ھ کو شہید ہوئے، یوں درمیانی عرصہ ۸۲ سال ہی بنتا ہے۔

جسدِ خاکی، نمازِ جنازہ اور کفن و دفن:

جس دن آپ شہید ہوئے اُسی دن صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت نے آپ کو غسل دیا اور کفن و دفن کا انتظام کیا۔ حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی نمازِ جنازہ پڑھائی اور انھیں دفن کیا کیونکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہی نے اِس کی وصیّت کی تھی۔[3]

رات کے وقت آپ کو دفن کیا گیا۔ اس کی تائید ابن سعد اور امام ذہبی کی روایات سے بھی ہوتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ آپ کو مغرب اور عشاء کے درمیانی وقت میں دفن کیا گیا۔[4]

---

[1] تاريخ الطبري (٥/ ٤٠٧ ـ ٤٠٨) البداية والنهاية (٧/ ١٩٧ـ ١٩٨) الخلفاء الراشدون للخالدي (ص: ١٩٢)

[2] تاريخ الطبري (٥/ ٤٣٥)

[3] مسند أحمد (١/ ٧٤) اس کی سند منقطع ہے۔

[4] الطبقات لابن سعد (٣/ ٧٨) و تاريخ الإسلام للذهبي ـعهد الخلفاءـ (ص: ٤٨١)

شہادتِ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر عام مسلمانوں کے تاثرات اور حُزنیہ اشعار:

شہادتِ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مسلمانوں پر بہت بڑی مصیبت ٹوٹ پڑی۔ وہ بے حد غمزدہ ہوئے۔ حُزن و ملال کی تصویر بن گئے۔ ان کی آنسوؤں کی برسات تھمنے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ اُن کی زبانوں پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مدح کے ترانے تھے۔ اور ان کے لیے دم بدم دعائے مغفرت کے کلمات جاری تھے۔ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ آپ کی شہادت پر نہایت غمزدہ ہوئے۔ انھوں نے آپ کی مدح میں اشعار کہے۔ قاتلینِ عثمان رضی اللہ عنہ کی مذمت کی اور اُن کے وحشیانہ فعل کے انجام کی وعید سنائی۔ وہ فرماتے ہیں:

''کیا تم نے سرحدوں اور پہاڑوں پر جہاد ترک کر دیا ہے کہ اب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی قبرِ مبارک کے پاس ہم سے جنگ کرنے آ گئے ہو۔ تم نہایت برے طریقے پر نکل کھڑے ہوئے اور بہت پاجی اور بدکار لوگوں کے نقشِ قدم پر چل پڑے ہو۔ اگر تم آگے بڑھے تو ہم تمھارے سرداروں کی مدینے کے آس پاس ہر قسم کے دفاعی آلات سے مہمان نوازی کریں گے، یا پھر واپس لوٹ جاؤ۔ تمھارا بہت برا سفر ہے جو تم نے کیا۔ تمھارے امیر کے کام ہدایت کے خلاف ہیں۔ شہادت کی رات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی کیفیت یہ تھی کہ گویا وہ قربانی کے اونٹ ہیں جنھیں مسجد کے دروازے پر ذبح کیا جا رہا ہے۔ میں ابو عمر (حضرت) عثمان (رضی اللہ عنہ) کے لیے روتا ہوں۔ وہ اپنے امتحان میں کامیاب ہو گئے اور اب وہ بقیع الغرقد میں آرام فرما رہے ہیں۔''[1]

حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے یہ اشعار بھی لائقِ مطالعہ ہیں۔ دیکھیے ان اشعار میں خلیفۂ راشد کی شہادت کا قلق کس طرح سمٹ آیا ہے:

''میرے دینی بھائی سے تم نے کیا چاہا؟ اُس کے نحیف جسم میں اللہ تعالیٰ نے برکت ڈالی۔ تم نے اللہ کے ولی کو اُس کے گھر میں گھس کر قتل کیا۔ تم نے بڑے بھیانہ گمراہ کُن فعل کا ارتکاب کیا۔ تم نے اللہ کے عہد کی پاسداری بھی نہ کی۔ تم نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سے بھی وفاداری نہ کی۔ کیا وہ تم لوگوں میں سب سے زیادہ احسان کرنے والا اور سب سے بڑھ کر سچا اور راست باز انسان نہ تھا؟ کیا وہ ہر میدان میں تم لوگوں سے کہیں زیادہ بڑھ کر وفادار نہ تھا؟ کبھی مراد کو نہ پہنچیں اُن بدبختوں کے عہد و پیمان جنھوں نے ہدایت یافتہ اور راہِ مستقیم کے

[1] تاريخ الطبري (٥/ ٤٤٥)

مسافر (حضرت) عثمان (رضی اللہ عنہ) کو شہید کرنے پر ایکا کر لیا۔''[1]

انھوں نے مزید فرمایا:

''جسے سراسر شہادت کی موت مرنا پسند ہو، وہ شیروں کے مسکن (حضرت) عثمان (رضی اللہ عنہ) کے گھر اِس حال میں آئے کہ اُس نے زرہ پہنی ہوئی ہو، زرہ کی وجہ سے اُس کے جسم پر نشان پڑ چکے ہوں۔ سر پر خود ہو جس کی وجہ سے اس کا جسم خوبصورت لگ رہا ہو۔ میری ماں اور اس کی اولاد تجھ پر قربان! صبر کرو! یقیناً سختیوں میں صبر ہی کارآمد ہوتا ہے۔ ہم اہلِ شام کے ساتھ لڑائی کے لیے نکلنے پر، ان کے امیر پر اور بھائیوں کے بھائی چارے پر خوش ہیں۔ سن لو! جب تک میں زندہ ہوں اور جب تک مجھے حسان کہہ کر پکارا جائے گا، میں انہی اہلِ شام ہی میں سے ہوں، چاہے وہ میرے پاس موجود ہوں یا نہ ہوں۔ اے (حضرت) عثمان (رضی اللہ عنہ) کا بدلہ لینے والے! تم ان کے گھروں میں اللہ اکبر کی صدائیں ضرور سنو گے۔''[2]

حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے یہ دردناک اشعار بھی غمِ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے آئینہ دار ہیں:

''ہر چند آج ابن اروی (حضرت) عثمان (رضی اللہ عنہ) کا گھر خالی پڑا ہے، اس گھر کے کچھ دروازے ٹوٹے ہوئے ہیں۔ کچھ جلے ہوئے ہیں، کچھ خراب حالت میں پڑے ہیں، لیکن ایک وقت تھا جب خیر کے طالب آتے تھے اور یہاں سے حاجتیں پوری کرتے تھے۔ حسب ونسب اور ذکرِ خیر اسی پر ختم ہوتا تھا۔ اے لوگو! اپنے آپ کو بے نقاب کرو۔ اللہ کے ہاں سچ اور جھوٹ برابر نہیں ہو سکتے۔''[3]

سیدنا کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے آپ کی شہادت پر اس طرح اظہارِ ملال کیا:

''اس سانحے پر افسوس ہے۔ یہ میرے کانوں پر نہایت خوفناک خبر بن کر بجلی کی طرح گرا ہے۔ اس المیے نے پہاڑوں کو بھی لرزا دیا۔ وہ بھی اس خبر سے تھرتھر کانپ رہے ہیں۔ اس امامِ عالی مقام کے قتل کی خبر سے ستارے ماند پڑ گئے ہیں، سورج بھی کسوف کی حالت میں ہے۔ کل ان کی نعش کندھوں پر اٹھائی جائے گی تو میرے اضطراب اور بے قراری کا کیا عالم ہو گا؟ انھوں

---

[1] البداية والنهاية (٧/ ٢٠٥)

[2] تاريخ الطبري (٥/ ٤٤٧)

[3] تاريخ الطبرى (٥/ ٤٤٦)

نے اپنے بھائی کو لپیٹ کر قبر کے حوالے کر دیا، اس کی چھت والی قبر نے کیا کیا چھپا لیا؟ ہائے افسوس! ہائے افسوس! کی حُزنیہ صدائیں بلند ہوئیں۔ (حضرت) عثمان (رضی اللہ عنہ) بقیع میں آرام فرمانے لگے اور وہ سفاک لوگ منتشر ہو گئے جنھوں نے گھیر اڈالنے پر اتفاق کیا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ فولاد کی طرح مضبوط اور انتہائی عفیف و پاکدامن تھے، ایسے امام کو قتل کرنے کی وجہ سے ظالموں کا انجام آگ ہے۔ (حضرت) عثمان (رضی اللہ عنہ) نے نہایت دانشمندی سے بڑے بڑے کارنامے انجام دیے۔ ان میں بھلائی کے جوہر تھے۔ ان کی نیکی معروف تھی۔ اے کعب (رضی اللہ عنہ)! تو جب تک زندہ ہے اور شہر آنے جانے کے قابل ہے، غمِ عثمان (رضی اللہ عنہ) میں ہمیشہ روتا رہے گا۔''[1]

سیدنا کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے مزید کہا:

''انھوں (سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ) نے اپنے ہاتھوں کو روک لیا، پھر اپنا دروازہ بھی بند کر لیا۔ انھیں یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ اس ساری صورتِ حال سے غافل نہیں ہے۔ انھوں نے اپنے گھر والوں سے کہا کہ اِن سے لڑائی مت کرو۔ میری اس شخص کے لیے جو آج لڑائی نہیں کرے گا دعا ہے کہ اللہ اُسے معاف کر دے۔ تم نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کی باہمی محبت کے بعد ان پر بُغض وعدات کا عذاب کیسے مسلّط کیا، تم نے دیکھا کہ ان کے چلے جانے کے بعد نیکی لوگوں سے روٹھ کر اس طرح بھاگ گئی جیسے شُتر مرغ بھاگتے ہیں۔''[2]

اونٹوں کے چرواہے حضرت نمیری رضی اللہ عنہ نے اپنے جذبات کا اظہار اس طرح کیا:

''(ظالم لوگ) دن کے دوسرے حصے میں بغیر اجازت اس متوکّل، وفا دار اور اچھے انسان پر دھاوا بولنے آگھسے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیارے دوست تھے۔ سچے وزیر تھے۔ اور زمین پر بسنے والوں میں سے سب سے عالی رتبہ لوگوں میں چوتھے نمبر پر تھے۔''[3]

آخری شعر کا مطلب یہ ہے کہ پہلے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سب سے افضل انسان تھے، دوسرے حضرت

---

[1] التمهيد والبيان لمحمد بن يحيىٰ الأندلسي (ص:٢١١)

[2] البداية و النهاية (٧/ ٢٠٥)

[3] البداية والنهاية (٧/ ٢٠٦)

ابوبکر رضی اللہ عنہ، تیسرے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اور چوتھے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تھے۔ قانونِ الٰہی چلا آ رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ افراد، جماعتوں، معاشروں، قوموں اور سلطنتوں کو آزماتا ہے تاکہ کھرے اور کھوٹے کی حقیقت کھل جائے۔ اس ذاتِ عالی نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی آزمایا اور وہ ہر آشوب اور آزمایش میں سرخرو نکلے۔ انھوں نے پہاڑوں کو بھی ہلا دینے والے مصائب برداشت کیے۔ اپنا مال اور خون اللہ کے راستے میں قربان کیا۔ اُن پر جو مشکلات آئیں وہ بیان سے باہر ہیں۔ مسلمانوں کے سرکردہ اور معززین کو بھی ان آزمائشوں سے گزرنا پڑا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بھی اللہ کے راستے میں، اپنے چچا حَکم بن ابوالعاص کے ہاتھوں، شدید مصائب اور دکھ جھیلنے پڑے۔

قبولِ اسلام کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مسلسل غیر منقطع طور پر ہمیشہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے۔ سخت ضرورت کے بغیر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے جدا نھیں ہوتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی اجازت سے آپ نے ہجرت کی۔ آپ باقی خلفائے راشدین ہی کی طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے۔ یہ ان سب کی نمایاں خوبی تھی جو اللہ تعالیٰ نے اُن میں ودیعت فرمائی تھی اور اسی خوبی نے انھیں پےَ درپےَ یکے بعد دیگرے خلافت کا بار اٹھانے کا اہل بنایا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مالی پالیسی بڑی صاف شفاف تھی، انھوں نے اسلام کی عادلانہ مالی پالیسی کا نفاذ کیا، رعایا کے حقوق و فرائض کا پورا خیال رکھا، مسلمانوں پر بیت المال کا جو حق تھا وہ وصول کیا۔ ذِمیوں پر بیت المال کا جو حق ٹیکس وغیرہ کی صورت میں لاگو تھا، وہ وصول کیا اور ان کا جو حق بنتا تھا وہ پوری فراخ دلی سے ادا کیا۔ انھوں نے خَراج وصول کرنے کے لیے نہایت دیانتدار عملے کا تقرر کیا اور ان عوامل کا سدِ باب کیا جن سے عوام میں یہ تاثر پیدا ہو کہ عاملین ناز و نعمت میں رہتے ہیں۔

سرکاری عہدے داروں اور گورنروں کی تنخواہیں، افواج کی تنخواہیں، حج کے اخراجات، مسجدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازسرِ نو تعمیر، مسجدِ حرام کی توسیع، پہلا اسلامی بحری بیڑا بنانے کے اخراجات، بندرگاہ کو شعیبہ سے جدہ منتقل کرنے کے اخراجات، کنوؤں کی کھدائی، مؤذنوں کی ضروریاتِ زندگی پر خرچ ہونے والی رقم اور دیگر کئی ضروری امور سرکاری اخرجات میں شامل تھے۔

آپ زبردست قائدانہ صلاحیتوں کے مالک تھے۔ ایک ربانی قائد کی جملہ صفات، جیسے علم، ذہن سازی اور تعلیم و تربیت کی صلاحیت، حلم و بردباری، سخاوت، عفوودرگزر، تواضع، حیاء، پاک دامنی، شجاعت و

پامردی، حزم واحتیاط، صبر، عدل، عبادت گزاری، محاسبۂ نفس، خوف وبکاء، زہد، شکر گزاری کا جذبہ، لوگوں کی خبر گیری، اختیارات کی تحدید اور باصلاحیت افراد سے استفادہ کرنا، یہ تمام خوبیاں آپ کی شخصیت میں بدرجۂ اتم موجود تھیں۔

کسی شخص کے بارے میں یہ جاننے کے لیے کہ آیا وہ صحیح بنیادوں پر امت کی قیادت کر سکتا ہے یا نہیں؟ اس جانچ پرکھ کی بہترین اور بے لاگ کسوٹی خلفائے راشدین کی سیرت ہے۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ اپنے پیش رَو بزرگوں کی طرح ہمہ صفت موصوف تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بعد اُن کے عہدِ مبارک میں ہر طرف اسلام کا بول بالا ہوگیا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا عہد خلافتِ راشدہ کی درمیانی کڑی ہے اور آپ کے دورِ حکمرانی کی اہمیت عہدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ہونے کی وجہ سے بالکل عیاں ہے۔ خلفائے راشدین کا دَور ہر لحاظ سے مثالی تھا۔ اس کے عدالتی نظام کی خصوصیت یہ تھی کہ یہ عہدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے نظام کا تسلسل تھا اور جو فیصلے عہدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ہو چکے تھے اگر اُن جیسے معاملات بعد میں پیش آتے تو اُن کے بارے میں مِن وعَن عہدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا فیصلہ لاگو کیا گیا اور اس کا مکمل نفاذ کیا گیا حتیٰ کہ اس کی عبارت اور معانی کا بھی خیال رکھا گیا۔

مسلمانوں کی تالیفِ قلبی اور ان کی وحدت کو قائم رکھنا سب سے بڑا اجہاد ہے۔ مسلمانوں کے غلبے اور اسلامی ریاست کی بقاء کے لیے یہ ازحد ضروری ہے۔ اسی طرح شرعی قوانین کی بالا دستی کے لیے بھی یہ اقدام بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ خلفائے راشدین کی یہی پالیسی تھی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں مملکت کے کل صوبے یہ تھے: مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، بحرین، یمامہ، یمن، حضر موت، شام، آرمینیا، مصر، بصرہ اور کوفہ۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سرکاری حکّام اور گورنروں کی مختلف طریقوں سے کڑی نگرانی کیا کرتے تھے اور اُن کے حالات سے پوری طرح باخبر رہتے تھے۔ اس سلسلے میں آپ کا طریقۂ کار یہ تھا کہ آپ حج پر تشریف لے جاتے اور مختلف شہروں اور ریاستوں سے آئے ہوئے حُجّاجِ کرام سے اُن کے حالات براہ راست دریافت فرماتے تھے۔ مختلف اوقات میں مختلف ریاستوں کی طرف تفتیشی ٹیمیں بھی روانہ کیا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کے ذریعے کئی شہر فتح کیے اور انھوں نے اپنی رعایا کے ساتھ عدل وانصاف ہی نہیں، احسان کا برتاؤ کیا۔

جو شخص تاریخی واقعات میں سے صرف صحیح واقعات کی طرف رجوع کرتا ہے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ

کے مقرر کردہ گورنروں کے حالات سے آگاہی حاصل کرتا ہے۔ جن میں کئی تو ایسے تھے جو عہدِ صدیق اور عہدِ فاروق رضی اللہ عنہما میں بھی نہایت اہم پوسٹوں پر فائز رہ چکے تھے۔ اور دعوتِ اسلام کی تاریخ میں ان کے جہاد کے اثرِ جمیل کو دیکھتا ہے بلکہ ان کے انتظام اور امت کی تعمیر و ترقی میں ان کے کردار کا جائزہ لیتا ہے، وہ تاریخ کے اس عظیم دَور پر فخر اور شادمانی کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی پولیسی یہ تھی کہ فتنوں کی آگ حلم و بردباری اور نرمی و نوازش سے بجھائی جائے اور شریروں سے بھی مبنی برعدل سلوک کیا جائے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُس وصیّت پہ عمل کیا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سرگوشی میں کی تھی۔ اُس وصیّت کا اظہار حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس وقت کیا جب وہ گھر میں محبوس تھے۔ آپ نے بتایا کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے عہد لیا تھا کہ میں صبر کروں، لہٰذا میں اُس عہد پر کاربند رہوں گا اور صبر سے کام لوں گا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ گوارا نہیں کیا کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں خون بہانے والے پہلے شخص کہلائے جائیں۔

انھیں بخوبی علم تھا کہ باغیوں کا ہدف صرف اُنھی کی ذات ہے، لہٰذا اُنھوں نے محض اپنی جان بچانے کے لیے کسی مومن کی جان کو معرضِ خطر میں ڈالنا گوارا نہیں کیا۔ اس کے برعکس انھوں نے اپنی جان کا نذرانہ پیش کر کے مومنوں کی جان بچانے کو ترجیح دی۔

انھیں معلوم تھا کہ وہ اس فتنے میں شہید کر دیے جائیں گے کیوں کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب آپ کو جنت کی بشارت دی تھی تو یہ بھی بتا دیا تھا کہ اُن پر آزمایش آئے گی۔ اور انھیں حق پر ثابت قدم رہنے کی وجہ سے عنقریب شہید کر دیا جائے گا۔

حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے آپ کو مشورہ دیا کہ آپ حق پر ہیں۔ اس لیے آپ ڈٹ جائیں۔ بلوائیوں کا مطالبہ ہرگز تسلیم نہ کریں اور جنگ سے بھی رکے رہیں، اس طرح آپ کے موقف کو تائید و تقویت ملے گی۔ آپ نے اس مشورے پر عمل کیا اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو لڑنے کی اجازت نہیں دی۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قاتل ایک مصری تھا، لیکن روایات میں اس شقی القلب کا نام مذکور نہیں۔ اور جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ حضرت محمد بن ابوبکر رضی اللہ عنہما نے آپ کو برچھا مار کر شہید کیا تھا تو یہ بات سراسر باطل اور جھوٹ ہے۔ اس بارے میں وارد تمام روایات ضعیف ہیں۔ ان کے متون بھی ان صحیح روایات، جن میں آپ کا قاتل مصری بتایا گیا ہے، کی مخالفت کی وجہ سے شاذ ہیں۔

تمام صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خون سے بریٔ تھے۔ صحیح روایات اور تاریخی ثبوت شاہد ہیں کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی نے بھی آپ کے خلاف کسی سرگرمی میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ انھوں نے لوگوں کو کبھی نہیں بھڑکایا یا نہ وہ آپ کے قتل میں شریک ہوئے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بڑے بیدار مغز حکمران تھے۔ ایسا نہیں ہے کہ ان کی بے خبری میں سازش زور پکڑ گئی۔ بلکہ وہ چاہتے تو باغیوں کی صفوں کو درہم برہم کر سکتے تھے۔ اُن کے منصوبوں کا پول کھول سکتے تھے اور اُس سازش کا بہادری سے مقابلہ کر سکتے تھے۔ لیکن انھوں نے ایک لمحے کے لیے بھی یہ بات قبول نہیں کی کہ مسلمانوں کی تلواریں ایک دوسرے کی گردنوں پر چمکنے لگیں، اِس کے برعکس وہ خود امتِ مسلمہ کی بھلائی اور یک جہتی کے لیے مر مٹے۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت قربانی وایثار کی معراج ہے۔

شہادتِ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے نتیجے میں پیدا ہونے والے فتنے:

شہادتِ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا سانحہ دیگر کئی فتنوں کے پھوٹ پڑنے کا سبب بنا اور بعد میں پیدا ہونے والے فتنوں پر اس کا براہِ راست اثر پڑا۔ لوگوں کے دل بدل گئے، جھوٹ عام ہو گیا اور اسلامی عقیدے اور شریعت سے انحراف کی رفتار بڑھتی ہی چلی گئی۔[1]

لوگوں کے مابین فتنوں کا سب سے بڑا سبب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت تھی۔ اسی وجہ سے امت آج تک انتشار واختلاف کا شکار ہے، اُسی سے دلوں میں نفرتیں پیدا ہوئیں، بے چینی اور پریشانی کا گراف بہت اوپر چلا گیا، بدکردار لوگ غالب آ گئے۔ اچھے لوگ دب کر رہ گئے۔[2]

بالآخر لوگوں نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی بیعت کی۔ اُس وقت وہی سب سے زیادہ اِس کے اہل اور مستحق تھے اور باقی ماندہ صحابہ میں سے سب سے افضل تھے۔ لیکن دلوں میں نفرت کا بیج بویا جا چکا تھا۔ فتنے کی آگ بھڑک چکی تھی، اس لیے مسلمان متحد نہ ہو سکے۔ ان کی جماعت میں انتشار پھیل گیا۔ خلیفہ اور امت کے برگزیدہ افراد اپنے نیک مقاصد اور تعمیری اہداف پورے نہ کر سکے۔ اس اختلاف اور فتنے میں کئی قومیں شامل ہو گئیں۔ اور فتوحات کا سلسلہ شرق وغرب اور شمال میں چل نکلا۔[3]

---

[1] احداث وأحاديث فتنة الهرج للدكتور عبد العزيز دخان (ص: ٥٩)

[2] مجموعة الفتاویٰ لابن تيمية (٢٥/ ١٦٢)

[3] مجموعة الفتاویٰ لابن تيمية (٢٥/ ١٦٢)

ظلم وزیادتی دنیا وآخرت کی بربادی ہے:

یقیناً دوسروں پر ناحق ظلم وزیادتی دنیا وآخرت میں تباہی کے اسباب میں سے ایک سبب ہے، جیسا کہ سورۃ الکہف (آیت: ۵۹) میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَتِلْكَ الْقُرَى أَهْلَكْنَاهُمْ لَمَّا ظَلَمُوا وَجَعَلْنَا لِمَهْلِكِهِمْ مَوْعِدًا ﴾

’’اور یہ بستیاں ہم نے انھیں ہلاک کیا جب انھوں نے ظلم کیا اور ہم نے ان کی ہلاکت کے لیے ایک وقت مقرر کیا تھا۔‘‘

جو شخص حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت کرنے والوں اور آپ پر ظلم ڈھانے والوں کے حالات پڑھتا ہے وہ فوراً یہ حقیقت جان جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ظالموں کو مہلت نہیں دی بلکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خونِ ناحق کی پاداش میں انھیں ذلیل ورسوا کیا۔ اُن سے انتقام لیا اور اُن میں سے کوئی باقی نہیں بچا۔

خلیفہ بن خیاط نے اپنی تاریخ میں حضرت عمران بن حدیر رحمہ اللہ کے متعلق صحیح سند سے بیان کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا: اگر مجھے عبداللہ بن شقیق رضی اللہ عنہ نے یہ بات نہ بتائی ہوتی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خون کا پہلا قطرہ قرآنِ مجید کی آیت: ﴿ فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللَّهُ ﴾ پر گرا تھا، تو میں مان لیتا کہ انھیں مظلوم شہید نہیں کیا گیا۔ حضرت ابوحریث رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں اور حضرت سہیل نمیری رحمہ اللہ گئے اور مصحف نکال کر ان کے پاس لائے تو خون کا قطرہ واقعی قرآنِ مجید کی آیت: ﴿ فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللَّهُ ﴾ پر تاحال موجود تھا۔ اسے کُھرچ کر صاف نہیں کیا گیا تھا۔

تاریخ ابن عساکر میں امام محمد بن سیرین رحمہ اللہ سے مروی ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں خانہ کعبہ کا طواف کر رہا تھا کہ ایک آدمی کو یہ دعا کرتے ہوئے سنا: ’’اے اللہ! مجھے بخش دے حالانکہ مجھے یقین نہیں ہے کہ تو مجھے معاف کرے گا۔‘‘ میں نے کہا: ’’اے اللہ کے بندے! تو عجیب آدمی ہے، میں نے آج تک کسی کو کبھی تیری طرح دعا کرتے نہیں دیکھا؟‘‘ اس نے اپنا حال بتایا۔ کہنے لگا: ’’میں نے قسم کھائی تھی کہ اگر اللہ نے مجھے موقع دیا تو میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے منہ پر تھپڑ ضرور ماروں گا، چنانچہ انھیں شہید کر دیا گیا، ان کا جنازہ ان کے گھر پڑا تھا۔ لوگ دم بہ دم چلے آ رہے تھے، اور ان کے لیے دعائیں کر رہے تھے۔ اُس وقت میں بھی یہ ظاہر کرتے ہوئے اُن کے گھر میں گُھس گیا کہ آپ کے لیے دعا کرنا چاہتا ہوں۔ جب میں نے دیکھا کہ آس پاس اور کوئی نہیں ہے تو میں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے چہرے سے کپڑا ہٹایا اور تھپڑ مارا.... پھر میں

نے ان کا چہرہ دوبارہ چادر سے ڈھانپ دیا۔ اسی وقت اچانک میرا دایاں ہاتھ شل ہوگیا۔'' امام محمد بن سیرین رحمہ اللہ کہتے ہیں: ''میں نے اس کا دایاں ہاتھ دیکھا تو وہ لکڑی کی طرح خشک تھا۔''[1]

اگر ان باغیوں اور ظالموں کے انجامِ بد کے یہ آثار نہ بھی ظاہر ہوتے تب بھی مسلمانوں کی جو تلواریں قیامت تک ان کے سروں پر چمکیں گی، وہ انھیں اور اُن کے ہم مشربوں کو سزا دینے کے لیے کافی ہیں۔ شہادتِ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا سانحہ مسلمانوں پر قیامت بن کر ٹوٹا۔ وہ ہواس کھو بیٹھے۔ انھوں نے نہایت غم زدہ ہوکر آنسو بہائے، ان کی زبانوں پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مدح کے ترانے تھے۔ وہ آپ کے لیے رحمت کی دعائیں کر رہے تھے۔ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے امیر المومنین کی وفات پر بڑے دردناک اشعار کہے۔ انھوں نے آپ کی شہادت پر بڑے قلق کا اظہار کیا۔ قاتلوں کی مذمت کی، رلا دینے والے اشعار کہے جن کا ترجمہ تھوڑا پہلے گزرا ہے۔ انھیں تاریخ نے ہمارے لیے محفوظ رکھا ہے۔ نہ سیاہ راتیں انھیں ختم کرسکیں نہ زمانے اور زندگی کے حالات وحوادث انھیں تاریخ کے اوراق سے مٹا سکے۔ ؎

اسلام وہ شجر نہیں جس نے پانی سے غذاء پائی
دیا خون صحابہ رضی اللہ عنہم نے پھر اس میں بہار آئی

---

[1] سیر الشهداء لعبد الحميد السحيباني (ص: ٦٧) تاريخ دمشق لابن عساكر (ص: ٤٥٨) تحقيق مواقف الصحابة في الفتنه للدكتور محمد المحزون (١/ ٤٨٥)

مصادر و مراجع

سیرت سیدنا عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ

- تفسیر ابن کثیر، تفسیر حافظ صلاح الدین یوسف
- صحیح بخاری
- صحیح مسلم
- جامع الترمذی
- سنن ابن ماجہ
- سیرتِ نبوی، تالیف: ڈاکٹر مہدی رزق اللہ احمد۔ ترجمہ: شیخ الحدیث حافظ محمد امین
- سیرۃ امام الانبیاء، تالیف: شیخ ابو عدنان محمد منیر قمر
- سیرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ، مصنف: ڈاکٹر محمد الصلابی۔ ترجمہ: مولانا محمد اجمل بھٹی
- فضائلِ صحابہ، تالیف: مولانا اقبال کیلانی
- روشنی کے مینار، تالیف: مولانا عبدالمالک مجاہد
- تاریخِ اسلام، تالیف: محمد اکبر شاہ نجیب آبادی
- متعدد علمی ویب سائٹس

باب 4

سیرت

سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ

چچا زاد و دامادِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مختصر سیرت

اس سے پہلے ہم حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق اور حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہم کی مختصر سیرت آپ کے سامنے ذکر کر چکے ہیں، الحمد اللہ، اب ہم حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی تابناک سیرت کا مختصر تذکرہ کرنے کی کوشش کریں گے، ان شاء اللہ۔ بلاشبہ یہ مسلمانوں کے چوتھے خلیفۂ راشد، امیر المومنین حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ عشرہ مبشرہ میں سے ایک شخصیت تھے۔

خلفائے راشدین کی سیرت امت کے لیے ایک عظیم خزانہ ہے۔ اس میں بڑے لوگوں کے تجربات ہیں، مشاہدات ہیں، خبریں ہیں، امت کے عروج اور غلبے کی تاریخ ہے۔ اس کے مطالعہ سے ہمیں یہ دیکھنے کا موقع ملتا ہے کہ کن کن مواقع پر اہلِ حق کو عروج و ترقی ملی اور اس کے اسباب کو جانچنے اور جاننے کا موقع بھی ملتا ہے۔

جب ہم تاریخ کے اوراق پلٹتے ہیں تو ہمیں تصویر کا دوسرا رخ بھی نظر آتا ہے اور یہ جاننے کا موقع ملتا ہے کہ کب کب امتِ مسلمہ پستی و زوال یا تنزّل کا شکار ہوئی، کب اسے سیاسی، سماجی اور معاشی میدانوں میں پسپا ہونا پڑا۔ اور اس پستی و ذلت کے اسباب کو جانچنے کا موقع بھی ملتا ہے۔

اس کے باوجود اگر ہم نے اپنی تاریخ کو فراموش کر دیا، اور اس سے سبق سیکھنے کی کوشش نہ کی تو لاشعوری طور پر وہی غلطیاں دہرائیں گے جن کہ وجہ سے پہلے یہ امت پستی اور ذلت کا شکار ہو چکی ہے، کیوں کہ تاریخ عجب انداز میں خود کو دہراتی رہتی ہے۔

ہمیں اپنی عظمتِ رفتہ کے حصول اور تنزّل و ادبار کی گہرائیوں سے نکلنے کے لیے قرونِ اولیٰ کی تاریخ کو حرزِ جاں بنانے کی ضرورت ہے۔ اُس دور کی تمام اصلاحات اور مہمات ہمارے دل و دماغ پر نقش ہونی چاہییں، کیوں کہ انہی میں ہمارے دکھوں کا مداوا ہے۔ اور اس کے لیے مختلف زبانوں میں سیرت کے

موضوع پر آپ کو درجنوں کتابیں ملیں گی۔

اسی سنہری سلسلے کی ایک اہم کڑی سیرتِ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہے، اس لیے ان کی سیرت بیان کرنا بھی نہایت ضروری ہے، کیونکہ موجودہ پُرفتن دور میں جبکہ تشدّد، انتہاء پسندی اور فرقہ پرستی کا عفریت ہماری ہر چیز کو تباہ کرنے پر تلا بیٹھا ہے، تب اس موضوع کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ خصوصاً جس میں اہلِ بیت کا مقام و مرتبہ بھی بیان کیا گیا ہو کیوں کہ اہلِ بیت کی محبت ہمارے ایمان کا بنیادی عنصر ہے۔ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

«وَ الَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَا یُبْغِضُنَا اَھْلَ الْبَیْتِ اَحَدٌ اِلَّا اَدْخَلَہُ اللّٰہُ النَّارَ»[1]

''اُس ذات کی قسم! جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، جو شخص بھی ہم اہلِ بیت سے بُغض رکھے گا، اللہ تعالیٰ اسے جہنم کی آگ میں داخل کرے گا۔''

لہٰذا ہمارا ایمان ہے کہ مومن کے دل میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی گہری محبت کی موجودگی لازم ہے۔ آپ سے بُغض رکھنے والا شخص کوئی منافق ہی ہوسکتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مخاطب کر کے فرمایا:

«اِنَّہٗ لَا یُحِبُّكَ اِلَّا مُؤْمِنٌ وَ لَا یُبْغِضُكَ اِلَّا مُنَافِقٌ»[2]

''بلاشبہ صرف مومن ہی تجھ سے محبت رکھیں گے اور صرف منافق ہی تجھ سے بُغض رکھیں گے۔''

یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں، تاریخ کے اس نازک دور میں کچھ ناخوشگوار واقعات بھی پیش آئے۔ مشا جراتِ صحابہ پر لکھنا ایک تنے ہوئے رسے پر چلنے کے مترادف ہے جس میں زبردست توازن کے ساتھ ایک ایک قدم سنبھال کر رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ذرا سی بے احتیاطی انسان کو کسی گہری کھائی میں گرا سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا ۝٧٠ يُصْلِحْ لَكُمْ أَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ ۗ وَمَن يُطِعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيمًا ﴾ [الأحزاب: ٧٠۔ ٧١]

''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور ٹھیک بات کیا کرو، اللہ تمھارے اعمال درست کردے گا اور

---

[1] صحيح ابن حبان (٦٩٧٨) سلسلة الأحاديث الصحيحة، رقم الحديث (٢٢٩٥، ٢٤٨٨)

[2] حديث صحيح. جامع الترمذي، رقم الحديث (٣٧٣٦)

تمھارے گناہ معاف فرمائے گا۔ جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے، تو یقیناً اس نے بڑی کامیابی حاصل کی۔“

یا رب! میں تیری تعریف کرتی ہوں جیسے تیری ذات کی جلالتِ شان اور عظیم سلطنت کے لائق ہے۔ ہر دم تیری ہی تعریف ہے یہاں تک کہ تو راضی ہو جائے۔ اور جب تو راضی ہو جائے تو پھر بھی تو ہی تعریف کے لائق ہے۔ اب ہم خلفائے راشدین میں سے چوتھے خلیفۂ راشد، امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کی پیدایش سے لے کر آپ کی شہادت تک کے واقعات مختصراً ذکر کرنے کی کوشش کریں گے۔

نام و نسب:

سب سے پہلے آپ کا اسمِ گرامی و نسب نامہ یہ ہے:

حضرت علی رضی اللہ عنہ بن ابی طالب بن عبد المطلب بن ہاشم، آپ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی چچا ابو طالب کے بیٹے تھے۔ یعنی آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد بھائی ہیں گو یا نسب میں آپ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک ہی خاندان بنو ہاشم سے تعلق رکھتے تھے، جو قریش کا سب سے زیادہ معزز خاندان تھا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ جب پیدا ہوئے تو ان کی والدہ نے ان کا نام اسد یا حیدر رکھا۔ لیکن والد نے علی نام پسند کیا۔ پھر اسی نام پر اتفاق کر لیا گیا۔ البتہ حیدر ان کا لقب بن گیا۔ اسد نام ان کی والدہ نے اپنے والد اسد بن ہاشم کے نام پر رکھا تھا۔ اس کی دلیل غزوۂ خیبر کے موقع پر ان کے رَجز یہ شعر میں ملتی ہے۔ انھوں نے فرمایا تھا:

أَنَا الَّذِي سَمَّتْنِي أُمِّي حَيْدَرَه ضِرْغَامُ آجامٍ وَلَيْثُ قَسوَرَه
عَبلُ الذِّراعَينِ شَدِيدُ القِصَرَة كَلَيثِ غَاباتٍ كَرِيهِ المَنظَرَه

”میری ماں نے میرا نام حیدر رکھا ہے، جنگل کے شیر کی مانند خوف ناک منظر کا حامل۔“[1]

حیدر، شیر کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ آپ کے القاب اسد، مرتضیٰ اور حیدر ہیں۔

کنیت:

آپ کی کنیت ابو الحسن اور ابو تراب تھی۔ صحیح بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی

---

[1] الرياض النضرة في مناقب العشرة (ص: ٦١٧)

آپ کی یہ کنیت رکھی تھی۔[1] حضرت علی رضی اللہ عنہ کی دیگر کنیتوں میں ابوالحسن کے علاوہ ابوالحسین، ابوالقاسم الھاشمی۔ اور ابوالسبطین بھی شامل ہیں۔[2]

قبیلہ قریش:

تمام عرب نے قریش کے حسب ونسب کی رفعت، قیادت کی اہلیت، زبان کی فصاحت، کریمانہ اخلاق اور بہادری و جوانمردی کے اوصاف تسلیم کیے ہیں جس میں کسی بحث و اختلاف کی گنجایش نہیں۔ وہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی شریعت کے بڑے حصے پر کاربند اور باہمی الفت ومحبت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ وہ ان بدوؤں کی طرح نہیں تھے جنھیں نہ دین نے باوقار بنایا نہ وہ آدابِ زندگی سے مزیّن ہوئے۔

قریش اپنی اولاد سے محبت کرتے تھے، بیت اللہ کا حج کرتے تھے، مناسکِ حج قائم کرتے تھے، اپنے مُردوں کو کفن پہناتے تھے۔ حالتِ جنابت میں غسل کرتے تھے، پروہتوں اور ظالم سرداروں سے بیزار تھے۔ مجوسیت سے دور تھے۔ غیرت کے باعث، بیٹی، نواسی، ہمشیرہ اور بھانجی سے نکاح کرنے سے پرہیز کرتے تھے۔ قرآن نازل ہوا تو اس نے ان کے اس اچھے کردار اور عمدہ آداب کو صحیح قرار دیا۔ وہ حق مہر اور گواہوں کی بنیاد پر شادی کرتے تھے اور طلاقیں دیا کرتے تھے۔[3]

ان کے ہاں شرف و اعزاز کی بات یہ تھی کہ وہ کسی بھی قبیلہ سے رشتۂ ازدواج اختیار کرنے سے پہلے یہ شرط لگاتے تھے کہ وہ اپنے دین پر پختہ کار ہو۔ ان کے لیے یہی بڑا شرف و اعزاز تھا کہ ان کی بات کو تسلیم کرلیا جائے۔

بنو ہاشم:

رہے بنو ہاشم تو وہ قریش میں ربط وتعلق کی بنیاد تھے۔ جب ہم تاریخ اور سیرت کی کتابوں میں ان کے واقعات اور اقوال پڑھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ کریمانہ انسانی جذبات واحساسات والے تھے۔ ہر چیز میں اعتدال پر قائم رہتے، عقل وبصیرت میں دوسروں سے برتر اور ایمانی قوت کے مالک تھے۔

اللہ تعالیٰ کی نظر میں اس گھرانے کا بڑا مقام تھا، وہ ظلم سے نفرت کرتے تھے اور حق کی مخالفت سے

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤١، ٣٧٠٣)

[2] البداية و النهاية (٧/ ٢٢٣)

[3] المرتضى للندوي (ص: ٢٢) و بلوغ الأرب في معرفة أحوال العرب (١/ ٢٤٣)

بہت دور تھے۔ بڑے عالی ہمت تھے، ضعیف ومظلوم پر شفقت ومہربانی کرتے تھے، سخاوت اور شجاعت کے پُتلے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اجداد کی سیرت بڑی فضیلت والی تھی۔ ان کے محاسن اعلیٰ اخلاق کی طرف دعوت دیتے تھے۔ انھوں نے زمانۂ فترت، یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیانی وقفے میں زندگی بسر کی، اس لیے ان کے عقائد وعبادات اس دَور کے مروجہ عقیدوں سے مختلف نہیں تھے۔[1]

عبدالمطلب بن ہاشم:

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دادا جناب عبدالمطلب، اپنے چچا مطلب کے بعد حاجیوں کو پانی پلانے اور مہمان نوازی کی نگرانی پر مامور ہوئے۔ آپ نے ان دونوں امور کی ذمہ داری نہایت خوش اسلوبی سے انجام دی۔ آپ نے اپنے آباء واجداد کی راہ پر چلتے ہوئے اپنی قوم کو بھی باوقار رکھنے کی ذمہ داری سنبھالی۔ اپنی قوم کی طرف سے آپ کو جو شرف واعزاز ملا، آپ کے آباء میں سے کوئی اس مقام پر نہ پہنچ سکا۔ ان کی قوم نے ان سے گہری محبت کا رویہ اختیار کیا جس سے ان کی شان بہت بلند ہوگئی۔[2]

عبدالمطلب قریش کے ممتاز سردار ضرور تھے مگر وہ کوئی امیر نہیں تھے۔ وہ قُصیّ کی طرح مکہ کے ہمہ جہت مقتدر سردار بھی نہیں تھے۔ مکہ میں بہت سے ایسے لوگ تھے، جو مال و دولت اور طاقت میں ان سے بڑھ کر تھے، لیکن معزز وہی قرار پائے کیوں کہ حاجیوں کو زمزم اور پانی پلانے، حاجیوں کی مہمان نوازی اور زمزم کے کنویں کی نگرانی انھی کے حصے میں آئی۔ ان کا یہ اعزاز بیت اللہ کی نسبت سے وابستہ تھا۔ آپ کے دادا عبدالمطلب کا ایمان اس وقت روشن صورت اختیار کر گیا جب انھوں نے کہا کہ دنیا کے بت کدوں میں یہ پہلا گھر ہے جو اللہ تعالیٰ کی نظر میں عظیم مرتبے کا حامل ہے اور میں اس کا حامی اور محافظ ہوں۔[3]

جناب عبدالمطلب اپنی اولاد کو ظلم اور سرکشی سے باز رہنے کا حکم دیتے تھے۔ انھیں مکارمِ اخلاق کی تلقین فرماتے تھے۔ انھیں ذلیل اور گھٹیا کاموں سے روکتے تھے۔ اَسّی (۸۰) سال سے زیادہ عمر پاکر وہ وفات پا گئے۔ اُس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آٹھ سال کے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی وفات سن پانچ سو اٹہتر (۵۷۸) عیسوی میں ہوئی۔[4]

---

[1] بلوغ الأرب في معرفة أحوال العرب (١/ ٢٤٣)

[2] السيرة النبوية لابن هشام (١/ ١٤٢)

[3] المفصل في تاريخ العرب قبل الإسلام لجواد على (٤/ ٧٨) و المرتضى (ص: ٢٢)

[4] بلوغ الأرب (١/ ٢٣٤) المفصل في تاريخ العرب قبل الإسلام (٤/ ٧٨)

آپ کے والد کا نام:

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے والد کا نام عبد مناف تھا لیکن وہ اپنی کنیت ابو طالب سے مشہور تھے، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے والد جناب عبد اللہ اُن کے حقیقی بھائی تھے۔ ابو طالب کا مکے کے معاشرے میں بہت نمایاں اور ممتاز مقام تھا۔ مکے کی سرداری بھی انہی کے پاس تھی، لیکن بے مال و زر تھے، مگر وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ٹوٹ کر محبت کرتے تھے۔ کہیں بھی آنے جانے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے ساتھ ہی رکھتے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی اولاد سے بھی زیادہ چاہتے تھے۔ دادا کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سرپرست جناب ابو طالب ہی بنے۔ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عمرِ مبارک کے پچیس سال ان کے ساتھ، ان کے زیرِ سایہ گزارے۔ پھر جب تجارت کے پیشے کو اختیار کر کے دوسرے ملکوں میں جانا شروع کیا، تو پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا قدرے مختلف دور شروع ہوا۔

سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا سے شادی کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے الگ رہنا شروع کر دیا۔ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو اللہ کی طرف دعوت دی اور کھلم کھلا نبوت کا اعلانِ حق کیا، تو قریش جان کے دشمن ہو گئے۔ اور یہ ابو طالب ہی تھے جنھوں نے مخالفت کے ان طوفانوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور ہمیشہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دیا۔ انھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت کرنے اور کسی بھی حالت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد سے دستبردار نہ ہونے کا اعلان کیا۔ اس بات سے اہلِ قریش بھڑک اٹھے۔ ان کے غم و غصے، حسد اور مکر و فریب میں شدت آ گئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جناب ابو طالب کی شیفتگی اور رواداری کی بڑی حیران کن باتیں پڑھنے سننے کو ملتی ہیں۔ جناب ابو طالب نے اپنے انجام کو اپنے مقدس بھتیجے کے انجام سے وابستہ کر دیا تھا۔ انھوں نے بنی ہاشم کے سردار ہونے کا یہ فائدہ اٹھایا کہ بنی ہاشم اور بنی مطلب کے مسلمانوں اور مشرکوں کو موت و حیات کے وقت تک ایک ہی معاہدے میں منسلک کر دیا۔[1]

انھوں نے اپنے بھتیجے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ڈنکے کی چوٹ پر ایسی کھلم کھلا پناہ دی جس میں پسپائی کا کوئی تصوّر نہیں تھا۔ جناب ابو طالب نے اپنے بھتیجے کی مدد جاری رکھی اور اپنے ولولہ انگیز اشعار و افکار سے پورے قریشی معاشرے کو ہلا ڈالا۔ جب بعض قبائل کے افراد کے دلوں میں اسلام کی حقانیت ٹھاٹھیں مارنے لگی تو قریش جمع ہوئے۔ انھوں نے سازش کی کہ بنی ہاشم اور بنی مطلب کے خلاف باہم مل کر ایک معاہدہ کیا جائے کہ نہ تو ان کے ساتھ شادی بیاہ کریں گے، نہ ان سے خرید و فروخت کا کوئی تعلق رکھیں گے

[1] فقه السيرة النبوية للغضبان (ص: ١٨٤)

اور نہ کسی قسم کا کوئی لین دین کریں گے۔ انھوں نے اس معاہدے کی ایک تحریر لکھی اور کعبۃ اللہ پر لٹکا دی اور پھر اس پر جمے رہے۔ بنو ہاشم اور بنو مطلب، سب ابو طالب کی حمایت میں شعب ابی طالب میں چلے گئے۔ یہ نبوت کے ساتویں سال ماہِ محرم کا واقعہ ہے۔ بنو ہاشم تقریباً تین سال تک محبوس رہے۔ ان کے پاس خفیہ طور پر ہی کوئی چیز پہنچ پاتی تھی۔ آخر کار اس تحریر کو دیمک نے چاٹ لیا۔ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا ابو طالب کو اس تحریر کی بوسیدگی، پراگندگی اور بے وقعت ہو جانے کی خبر دی۔[1]

جناب ابو طالب نے نبوت کے دسویں سال ۱۵ شوال کو وفات پائی۔ اس وقت ان کی عمر اَسّی (۸۰) سال سے کچھ اوپر تھی۔ انھوں نے اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ بلکہ شرک کی حالت میں ہی فوت ہو گئے۔ اُسی سال نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجۂ محترمہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا فوت ہوئیں، یوں رسول اللہ کو مسلسل آلام و مصائب کا سامنا کرنا پڑا، اسی لیے اس سال کو ''عام الحزن'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔[2]

شعبِ ابی طالب میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ساتھ:

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تیرہ سالہ مکی زندگی میں بہت سے کٹھن مراحل آئے۔ قریش نے مخالفت و مزاحمت کی انتہاء کر دی۔ انھوں نے دعوتِ توحید کو روکنے کے لیے ہر حربہ اختیار کیا۔ جب انھوں نے دیکھا کہ اہلِ توحید مسلسل بڑھتے ہی جا رہے ہیں تو انھوں نے ان سب سے سوشل بائیکاٹ کا فیصلہ کر لیا۔ شعبِ ابی طالب میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان والوں کے لیے تین سال بڑے صبر آزما تھے۔ ان حالات میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بڑے بھائی حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ اپنی زوجہ حضرت اسماء بنت عُمیس رضی اللہ عنہا کے ہمراہ ہجرت کر کے حبشہ جا چکے تھے، حضرت علی رضی اللہ عنہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہی ٹھہرے رہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے معاون، جان نثار اور رفیق کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی والدہ:

ان نامِ جلیل القدر صحابیہ کا نام حضرت فاطمہ بنت اسد بن ہاشم بن عبد مناف بن قصیّ رضی اللہ عنہا تھا۔ ان کا تعلق بھی ہاشمی خاندان سے تھا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا جناب ابو طالب نے اپنے والد عبد المطلب کی وصیّت کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کفالت کی ذمہ داری اٹھائی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دوران میں اپنی چچی

---

[1] السيرة النبوية لابن هشام (١/ ٣٧٣، ٣٧٧) و المرتضىٰ (ص: ٢٦)

[2] السيرة النبوية لابن هشام (١/ ٤١٥، ٤١٦) و المرتضىٰ (ص: ٢٦)

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا بہت خیال رکھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ کی وفات کے بعد یہی عظیم خاتون آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ کے درجے میں تھیں۔ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام کام سرانجام دیتی تھیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام ضروریات کا بھرپور خیال رکھتی تھیں۔

نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی کا کچھ حصہ ان کے زیرِ سایہ بسر کیا اور انھیں اسلام کی دعوت دی۔ انھوں نے اس دعوت پر لبیک کہا اور قبولِ اسلام کے لیے سبقت لے جانے والی اولین شخصیات میں سے شمار ہوئیں۔ آپ اُن خواتینِ اسلام میں بہت ممتاز تھیں جنھوں نے فضیلت کے میدان میں بلند مقام حاصل کیا۔آپ نے سیدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کے معاملہ میں بھی نہایت شفقت و مہربانی کی اعلیٰ مثال قائم کی۔ اور ان کے عزت مآب والدحضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بے مثال حسنِ سلوک کا برتاؤ کیا۔ وہ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے انتہاء درجے کی محبت رکھتی تھیں۔ شاید اسی محبت کا نتیجہ تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت محبت رکھتے تھے۔[1]

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی والدہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بچپن میں بڑی خدمت، دیکھ بھال اور اعلیٰ معیار کی پرورش کی۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ان کی بہت زیادہ عزت کرتے تھے۔ حضرت فاطمہ بنت اسد رضی اللہ عنہا اپنی زندگی میں بھی اور وفات کے وقت بھی بابرکت قرار پائیں۔ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی میں ان کی وفات ہوئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی بھر ان کی بہت عزت و تکریم فرمائی۔ ایک متکلّم فیہ روایت کے مطابق اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے کفن کے لیے اپنی قمیص عطا فرمائی، نماز جنازہ پڑھی، خود لحد میں اتارا اور برکت کے لیے تھوڑی دیر تک ان کی قبر میں لیٹے بھی رہے۔[2]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بھائی بہن:

جناب ابو طالب کے چار بیٹے تھے، ان کے نام طالب، عقیل، حضرت جعفر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔ ان کے علاوہ دو بیٹیاں حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا اور حضرت جُمانہ رضی اللہ عنہا تھیں۔ یہ سب اولاد حضرت فاطمہ بنت اسد رضی اللہ عنہا سے تھی۔ ان میں سے ہر بھائی کے درمیان دس دس سال کا فرق تھا۔ طالب، عقیل سے دس سال بڑے تھے اور حضرت جعفر رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے دس سال بڑے تھے۔[3]

---

[1] نسب قريش (ص: ٤٠) فضائل الصحابة (٢/ ٦٨٥)

[2] المعجم الكبير للطبراني: (٥/ ٦٩٣) رقم الحديث (٣٧١) مجمع الزوائد (٩/ ٢٥٧) وتكلّم عليه.

[3] البداية و النهاية (٧/ ٢٢٣) و المرتضىٰ للندوي (ص: ٢٦)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کفالت:

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عمر پانچ برس کی تھی کہ ملک قحط سالی کا شکار ہو گیا۔ لوگ فاقوں سے مرنے لگے۔ کھانے کے لیے کچھ میسّر نہ تھا اور نہ ہی کوئی ملنے کی صورت نظر آتی تھی۔ ابو طالب اس وقت ایک بڑے کنبے کے سربراہ تھے۔ ان پر بھی مشکل وقت آ گیا۔ تنگی میں گزر بسر ہونے لگی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہوں سے اپنے پیارے چچا کے حالات پوشیدہ نہیں تھے۔ اپنے چچا کا ہاتھ بٹانے کے لیے اور ان کا بوجھ کم کرنے کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مانگ لیا۔ یوں حضرت علی رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہنے لگے۔ اس موقع پر نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجۂ محترمہ سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا نے بھی بھرپور کردار ادا کیا۔ ان کی تربیت اور پرورش میں برابر کا ساتھ دیا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بچپن:

اس طرح ان کا بچپن اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں گزرا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے زمانۂ جاہلیت میں بھی کبھی کسی بت کو سجدہ نہ کیا، اور نہ ہی کبھی شرک و بدعت کا ارتکاب کیا۔ نہ کسی اور رسمِ بد سے اپنے دامن کو آلودہ ہونے دیا۔ وہ کم سن تھے، لیکن شعور رکھتے تھے۔ اس عمر میں بھی انھیں اچھے اور برے کے درمیان فرق معلوم تھا۔ سب سے بڑی اور اہم بات یہ تھی کہ ان کی پرورش وہ ہاتھ کر رہے تھے، جو سب سے زیادہ بابرکت تھے۔ وہ انھی کے ساتھ اپنی زندگی کا ایک ایک پل گزار رہے تھے۔ جب پورا خطہ ہدایت کی کرنوں سے جگمگا اٹھا تو انھیں بچوں میں سے سب سے پہلے اس روشنی سے فیض یاب ہونے کا موقع ملا۔ روشنی کی یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ سارے چھپے ہوئے پہلوؤں اور گوشوں کو بے نقاب کر دیتی ہے۔ ہدایت کی روشنی نے ان کی ذات کو بچپن ہی میں اس طرح منور کر دیا کہ ان کی سیرت اور کردار پر صرف اور صرف حق اور سچائی کا غلبہ ہو گیا۔ ان کی زندگی علم و فضل کا مرقّع بن گئی۔ تربیت کرنے والے مقدس ہاتھوں نے انھیں علم کا سمندر بنا دیا اور علم ہی ان کا اوڑھنا بچھونا بن گیا۔ حکمت اور دانائی ان کی ہر ہر بات سے جھلکتی تھی۔

لڑکپن کی عمر میں:

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پانچ سال کی عمر سے اس آنگن میں قدم رکھ دیا تھا جہاں صرف اور صرف خیر اور بھلائی تھی۔ ان کی تربیت کائنات کے بہترین انسان حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا جیسی مثالی خاتون

نے کی تھی۔ فطرت میں بچپن ہی سے نیکی تھی، اس لیے ہمیشہ بتوں کو نفرت کے قابل سمجھا۔ لڑکپن ہی میں لکھنے پڑھنے کا ہنر سیکھ لیا۔ جہاں پڑھنے لکھنے کا رواج نہ ہو، وہاں علم حاصل کرنا بڑی خوبی کی بات ہے۔ تلوار چلانے میں مہارت بھی اسی عمر میں حاصل کر لی۔

نیزہ بازی کے فن میں بھی کمال پایا۔ لڑکپن کی یہ صلاحیتیں جوان ہونے تک خوب نکھر آئیں۔ لڑنے کے سارے داؤ پیچ اچھی طرح سیکھ لیے۔ ان کا جسم بہت طاقتور تھا، کُشتی لڑنے کا فن سیکھا تو خوب نام پایا، کوئی کُشتی میں اُن سے نہیں جیت سکتا تھا جن کے نگران اس دنیا کے بہترین انسان تھے۔ عمدہ تربیت، دیکھ بھال اور نگہداشت پا کر اس مقام تک جا پہنچے، جس پر دنیا رشک کرتی ہے۔ حکمت و دانائی ان کی پہچان بن گئی۔ دلیری اور شجاعت ان کی شان بن گئی۔

شکل و شباہت:

ابن عبد البر کہتے ہیں: حضرت علی رضی اللہ عنہ میانہ قد تھے، آنکھوں کی سیاہی انتہائی سیاہ اور سفیدی انتہائی سفید تھی۔ چودھویں کے چاند کی طرح خوبصورت تھے، پیٹ بڑا تھا، کندھے چوڑے تھے، ہتھیلیاں مضبوط لیکن نرم و نازک تھیں۔ ان کی گردن چاندی کی صراحی جیسی تھی، داڑھی مبارک بڑی تھی، کندھے اوپر کو نکلنے ہوئے۔ جب چلتے تو خود اعتمادی سے چلتے تھے۔ کسی کا بازو پکڑتے تو اپنا سانس روک لیتے تھے۔ جسم کا وزن زیادہ تھا۔ کلائیاں اور ہاتھ مضبوط تھے، جنگ کی طرف رواں دواں ہوتے تو چلنے اور دوڑنے کے بین بین حالت و کیفیت اختیار فرماتے تھے۔ دل کے بہت مضبوط، طاقتور اور بہادر تھے۔ اس بہادری کی بنا پر انھیں اسد اللہ (اللہ کے شیر) کا لقب ملا۔[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قبولِ اسلام:

حضرت علی رضی اللہ عنہ پر اللہ تعالیٰ کا یہ بہت بڑا کرم اور احسان ہوا کہ اللہ نے ان کے ساتھ خیر و بھلائی کا ارادہ کر لیا تھا۔ قریش پر مشکل اوقات آتے رہے۔ ابو طالب عیال دار تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے متموّل چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے کہا: اے چچا عباس رضی اللہ عنہ! آپ کے بھائی ابو طالب کثیر العیال ہیں۔ آپ کو معاشی مشکلات کا اندازہ بھی ہے۔ آؤ چلیں! ان کے عیال کا کچھ بوجھ کم کریں، ایک بچہ میں لے لیتا ہوں، ایک آپ لے لیں، ہم ان کی کفالت کریں گے۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے حامی بھر لی۔ دونوں جناب ابو طالب

[1] الاستیعاب في معرفة الأصحاب (٣/ ١١٢٣)

کے پاس آئے اور اپنی رائے پیش کی۔ انھوں نے کہا: عقیل کو میرے لیے چھوڑ دو، باقی جیسے مناسب سمجھو کر لو۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنے دامن سے چمٹا لیا اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کو لے لیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نبی مکرم ﷺ کے ساتھ ہی رہے، تا آنکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو مبعوث فرمایا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کی پیروی کی، ان کی نبوت کا اقرار کیا اور ان کی تصدیق کی۔ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے پاس رہے، تا آنکہ انھوں نے اسلام قبول کیا، پھر ان سے مستغنی ہو گئے۔[1]

رسول اللہ ﷺ نے اپنے دادا عبد المطلب کی وفات کے بعد چچا ابو طالب کی جانب سے ان کی سرپرستی، کفالت اور حسنِ سلوک کا ان کو اچھا بدلہ دیا۔ یہ بات حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے اللہ تعالیٰ کی جانب سے بہت بڑی نعمت اور احسانِ عظیم بن گئی۔ ان کے مربی اور ادب سکھانے والے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ وہ شخصیت تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے ادب سکھایا، ان کی حفاظت کی اور ان کا خاص خیال رکھا۔ آپ ﷺ کے اخلاق و اوصاف سراپا قرآن تھے، یہ قرآنی اخلاق حضرت علی رضی اللہ عنہ پر منعکس ہوئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت کے لیے یہی مبارک بات کافی ہے کہ انھوں نے نبی کریم ﷺ کے زیرِ سایہ اسلام کے گھر میں پرورش پائی اور زندگی کے ابتدائی دور ہی میں اسرارِ اسلام سے واقف ہو گئے۔ اس وقت ان کی عمر کم و بیش دس سال تھی جب اللہ کے رسول ﷺ پر غارِ حرا میں پہلی وحی نازل ہوئی۔ آپ ﷺ پر سب سے پہلے آپ کی زوجۂ محترمہ سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا ایمان لائیں۔ ان کے بعد مردوں میں سے حضرت ابوبکر صدیق، غلاموں میں سے حضرت زید بن حارثہ اور بچوں میں سے حضرت علی بن ابی طالب رضوان اللہ علیہم اجمعین نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا۔[2]

سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ ایک دن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اللہ کے رسول ﷺ اور سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کو نماز پڑھتے دیکھا تو حیرت سے پوچھا: یہ آپ کیا عمل کر رہے ہیں؟ آپ ﷺ نے اپنی نبوت کے اعلیٰ منصب کی خبر دیتے ہوئے نماز کی اہمیت واضح فرمائی، کفر و شرک کی مذمت کی اور توحید کا پیغام سنایا اور فرمایا: ''یہ اللہ کا وہ دین ہے جسے اس نے اپنے لیے منتخب فرمایا ہے، یہی دین رسولوں کو عطا کر کے معبوث فرمایا ہے، میں تمھیں بھی ایک اللہ کی بندگی کی دعوت دیتا ہوں۔ اب تمھیں لات و عزیٰ کا انکار کرنا ہوگا۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کی: یہ ایسی بات ہے جو میں نے آج سے پہلے کبھی

---

[1] السیرة النبویة لابن ھشام (١/ ٢٤٦)

[2] البدایة و النھایة (٣/ ٢٦۔ ٢٨)

نہیں سنی۔ جب تک میں اپنے والدِ ماجد ابو طالب کو نہ بتا دوں کوئی فیصلہ کن بات نہیں کہہ سکتا۔ رسول اللہ ﷺ نہیں چاہتے تھے کہ واضح طور پر اعلانِ اسلام سے پہلے یہ راز کھل جائے، چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے علی رضی اللہ عنہ! جب تک تم اسلام قبول نہیں کرتے، اسے ظاہر نہ کرنا۔''

چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس رات رک گئے اور انتظار کرتے رہے، اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں اسلام کی محبت ڈال دی۔ صبح ہوتے ہی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آئے اور عرض کی: اے محمد! (ﷺ) آپ نے مجھ سے کیا بات کہی تھی؟ رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا: ''تم یہ گواہی دو کہ ایک اللہ کے سوا کوئی حقیقی معبود نہیں، اس کا کوئی شریک نہیں اور لات وعزیٰ کا انکار کرو اور اللہ تعالیٰ کے مدِ مقابل سے بیزاری کا اظہار کرو۔'' یہ ارشادِ عالی سنتے ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فوراً اسلام قبول کر لیا اور وہی کیا جو انھیں کہا گیا تھا۔ انھوں نے اپنے والد جناب ابو طالب کے خوف سے کچھ عرصے تک اپنے اسلام کو ظاہر نہیں کیا۔[1]

اس طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کر لیا۔ اور پھر نبی اکرم ﷺ کی دی ہوئی تعلیمات پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ جب اللہ کے رسول ﷺ پر سورۃ الشعراء کی آیت (۲۱۴)

﴿ وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ﴾

''اور (اے نبی!) اپنے قریبی رشتہ داروں کو (اللہ کے عذاب سے) ڈرائیے۔''

نازل ہوئی تو اللہ کے رسول ﷺ نے اپنے قریبی رشتہ داروں کو دعوت پر بلوایا۔ ان میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ شرکاء کی تعداد ۴۰ تھی۔ کھانے کے بعد اللہ کے رسول ﷺ نے ان کو اسلام لانے کی دعوت دی تو سوائے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کسی نے بھی آپ ﷺ کی اس دعوت پر لبیک نہ کہا۔ ابو طالب نے نبی مکرم ﷺ سے پوچھا: میرے بھتیجے! یہ کون سا دین ہے جو تم نے اختیار کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''چچا جان! یہ اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتوں، اس کے رسولوں اور ہمارے جدِ امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دین ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنے بندوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا ہے۔ چچا جان! آپ میری خیر خواہی اور نصیحت کے زیادہ مستحق ہیں۔ ہدایت کی دعوت قبول کرنے اور اس بارے میں میری مدد کرنے کا زیادہ حق رکھتے ہیں۔''

ابو طالب نے کہا: میرے بھتیجے! میں اُس راستے اور دین کو نہیں چھوڑ سکتا جس پر میرے آباء و اجداد

---

[1] البداية و النهاية (٣/٤)

چلتے چلے آرہے ہیں۔ لیکن میں جب تک زندہ ہوں تمھیں کسی تکلیف اور پریشانی کی زد میں نہیں آنے دوں گا۔ ایک دن حضرت علی رضی اللہ عنہ کو نماز پڑھتے ہوئے ان کے والد سردار ابو طالب نے دیکھ لیا۔ پوچھا: بیٹا! یہ کیا کر رہے ہو؟ اب انھوں نے اپنے باپ سے چھپانا مناسب نہ سمجھا اور کہا: ''ابا جان، میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آیا ہوں، اور ابھی میں نے ان کے ساتھ نماز پڑھی ہے۔'' یوں انھوں نے صورتِ حال واضح کردی۔ بیٹے کی بات سن کر ابو طالب کہنے لگے: وہ تمھیں بھلائی کے سوا کسی چیز کی طرف نہیں بلائیں گے، اس لیے یہ عمل جاری رکھو۔ خود ایمان نہیں لائے مگر بیٹے کو نہیں روکا بلکہ بڑی محبت کے ساتھ کہا کہ ان کی ہر بات پر عمل جاری رکھو کیوں کہ وہاں سے آپ کو خیر ہی ملے گی۔[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ کی راہنمائی:

مکی دور کی اہم خصوصیات میں سے ایک نمایاں بات رازداری ہے حتیٰ کہ قریبی لوگوں سے بھی اسلام کے بارے میں راز داری برتی جاتی تھی۔ حفاظت کو یقینی بنانے کے احکام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے بڑے واضح اور قطعی تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ کو دربارِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچانے میں بہت احتیاط سے اہم کردار ادا کیا۔ حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ جاہلیت کی رسموں اور بتوں کی پوجا سے بیزار تھے۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنے والوں کو منع کرتے تھے۔ وہ اسلام لانے سے پہلے تین سال تک قبلہ رخ ہونے کا اہتمام کیے بغیر اللہ تعالیٰ کے حضور بندگی پیش کرتے رہے۔

وہ فرماتے تھے: میں تو ملتِ حنیفی پر ہوں۔ جب حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں سنا تو مکہ تشریف لائے۔ انھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کسی سے کچھ پوچھنا مناسب خیال نہ کیا، رات ہوگئی۔ آرام کی خاطر لیٹ گئے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انھیں دیکھا اور پہچان لیا کہ وہ اجنبی ہیں۔ وہ انھیں ساتھ لے گئے اور مہمان نوازی فرمائی۔ ان سے کسی بارے میں بھی کچھ نہیں پوچھا۔ صبح ہوگئی۔ تو ابو ذر رضی اللہ عنہ مسجدِ حرام کی طرف روانہ ہو گئے، شام تک وہیں رہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انھیں دیکھا تو دوسری رات بھی ان کی مہمان نوازی کی، تیسری رات بھی یہی ماجرا گزرا۔ اب انھوں نے ان سے مکہ میں آمد کا سبب پوچھا۔ جب حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کو پورا اعتماد ہو گیا تو انھوں نے بتایا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کرنے کا آرزومند ہوں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کو بتایا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے برحق رسول ہیں۔ جب

---

[1] السيرة النبوية لابن هشام (٢٤٦) و المرتضىٰ (ص: ٣٥)

صبح ہو تو میرے پیچھے پیچھے چلے آنا۔ اگر مجھے کہیں خطرہ محسوس ہوا تو میں رک جاؤں گا، پیشاب کے بہانے ٹھہروں گا۔ اگر میں چلتا رہا تو بدستور میرے پیچھے پیچھے چلے آنا۔ بالآخر وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچ گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی۔ بڑی توجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں سنیں اور فوراً اسلام قبول کر لیا۔ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں فرمایا: اپنی قوم کے لوگوں کے پاس چلے جاؤ۔ انھیں میری باتیں بتاؤ تاآنکہ میرا آیندہ حکم آپ تک پہنچے۔ حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ نے کہا: اُس اللہ کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! میں مشرکینِ مکہ کو بابانگِ دہل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات بتاؤں گا۔ آپ وہاں سے نکلے، مسجدِ حرام میں آئے اور بلند آواز سے کہا:

"أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَ أَنَّ مُحَمَّدَ رَّسُوْلُ اللّٰهِ"

یہ سن کر لوگ بھڑک اٹھے اور انھیں زمین پر گرا دیا، اسی دوران حضرت عباس رضی اللہ عنہ آگئے، انھوں نے لوگوں کو قبیلۂ غفار کے انتقام اور تجارتی قافلوں کے لیے ان کی طرف سے رکاوٹ ڈالنے کے انجام سے ڈرایا کیوں کہ شام کی طرف آنے جانے والے تجارتی قافلے قبیلۂ غِفار کی بستیوں سے ہو کر جاتے تھے۔ اس طرح حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے اہلِ مکہ سے ان کی جان بچائی۔[1]

اس واقعہ کے اسباق وفوائد... معلومات کے حصول کے لیے مناسب وقت کا انتظار:

حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ کو معلوم تھا کہ قریش ہر اس شخص کو ناپسند کرتے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے آتا ہے، لہٰذا انھوں نے انتظار اور تحمل کی راہ اختیار کی، یہ بات احتیاط اور حفاظتی نقطۂ نگاہ سے ان کے شعور کی عکّاس ہے، اگر وہ مکہ آتے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں پوچھ گچھ شروع کر دیتے تو قریش کو معلوم ہو جاتا کہ یہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے متاثر ہو کر آئے ہیں، اس لیے وہ ان کو اذیت دیتے اور مکہ سے بھگا دیتے، یوں وہ اپنا اصل مقصد حاصل کرنے میں ناکام رہتے جس کی خاطر انھوں نے طویل سفر کی مشقت اور مشکلات برداشت کی تھیں۔

معلومات کے حصول میں احتیاط:

جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ سے ان کے مکہ آنے کی وجہ پوچھی تو تین دن کی مہمان نوازی کے باوجود نہ وہ بے تکلّف ہوئے، نہ انھوں نے احتیاط کا دامن چھوڑا، انھیں کچھ نہیں بتایا، یقین و اعتماد

[1] صحيح البخاري مع فتح الباري (١/ ١٧٣) وصحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٧٣)

ہو گیا تو ان پر شرط لگائی کہ وہ ان کا معاملہ راز داری میں رکھیں اور اصل مقصد کے لیے ان کی راہنمائی بھی کریں۔ یہ انتہائی احتیاط کا پہلو ہے۔محتاط رہنے کے باعث حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے اور اسلام کی دولت سے مالا مال ہو گئے۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی دانش مندی اور بیدار مغزی:

صحابۂ کرام کے ہاں حفاظتی شعور کی یہ حالت عام تھی، ان کی شخصیت میں موجزن یہ جذبات، ان کے عمومی وخصوصی تمام تصرّفات میں امتیازی علامت بن چکے تھے۔ان کی نقل وحرکت سوچی سمجھی اور منظّم ہوتی تھی۔صحابۂ کرام میں پائے جانے والے اس شعور سے مزیّن ہونے کی آج ہمیں اشد ضرورت ہے، مسلمانوں کو بھی اپنی بقاء اور حفاظت کے لیے حفاظتی منصوبوں کی اہمیت کا ادراک کرنا چاہیے تاکہ ہمارے اہم اسرار ورموز ہمارے دشمنوں کی دست بُرد سے بچ سکیں۔[1]

بسترِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر سونے کی سعادت اور جان قربان کرنے کی پیشکش:

حضرت علی رضی اللہ عنہ وہ خوش قسمت انسان ہیں جنھیں رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے پاک بستر پر سونے کی سعادت نصیب ہوئی۔ یہ اُس وقت کی بات ہے جب قریش کے لوگ دارالندوہ میں جمع ہوئے اور (نعوذ باللہ) آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے گلو خلاصی پانے اور آپ کو شہید کرنے پر متفق ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات بتا دی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رات حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنے بستر پر سونے کا حکم دیا۔ بھلا کون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بستر پر سونے کی ہمت کر سکتا تھا، جبکہ دشمنوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کا گھیراؤ کر لیا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کرنے کے لیے گھات لگائے بیٹھے تھے۔کون آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں رہ سکتا تھا۔ یہ کام وہی انجام دے سکتا تھا جو اللہ تعالیٰ کے فضل سے انتہائی بہادر ہو۔[1]

نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سب لوگوں سے زیادہ دانا تھے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بستر پر کوئی ایسا شخص موجود رہے جسے ارادۂ قتل سے آنے والے دیکھیں اور اس کے باہر نکلنے کا انتظار کریں۔ان نازک

[1] دروس في التكمّن لمحمود شيت خطاب (ص: ۹) اور مؤلف کی کتاب "السيرة النبوية" عرض وقائع و تحلیل احداث (۱/ ۱۷۱)

[2] الحكمة في الدعوة إلى الله للقحطاني (ص: ۲۳۵)

لمحات میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے فرمایا: علی (رضی اللہ عنہ) ! تم میرے بستر پر لیٹ جاؤ اور میری سبز حضرمی چادر اوڑھ کر سو جاؤ۔ تمھیں ان کے ہاتھوں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا اور میرے پاس موجود لوگوں کی امانتیں ادا کر کے مدینے چلے آنا۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر سر جھکا دیا اور بستر پر لیٹ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر اوڑھی اور سو گئے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم یہی چادر اوڑھ کر سویا کرتے تھے۔[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو شدید خطرہ لاحق تھا۔ اس اضطرابی حالت میں ان کے لیے یہی لازم تھا کہ وہ اپنے تحفّظ اور ہجرت کے عظیم پروگرام کی کامیابی ہی پر پوری توجہ مبذول فرماتے لیکن اتنی نازک اور ہیجان انگیز حالت میں بھی انھوں نے ادائے امانت کا فریضہ فراموش نہیں کیا جبکہ ایسی حالت میں انسان خود اپنے آپ ہی کو بھول جاتا ہے۔ یہ احساسِ فرض ایمانداری اور راست بازی کی ایسی منفرد نظیر ہے جس کی مثال نہیں ملتی۔[2]

گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امانت میں خیانت کرنے سے انکار کر دیا، چاہے وہ امانت ایسے دشمن کی ہو جو ان کے قتل کی کارروائی پر تلا بیٹھا ہو، اس کی وجہ یہ تھی کہ امانت میں خیانت کرنا منافقین کی صفت ہے، اور مومن تو اس سے اجتناب کرتے ہیں۔[3]

اس کے بعد اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم گھر سے قرآن پڑھتے ہوئے نکل گئے۔ اللہ تعالیٰ نے کافروں کی آنکھوں پر پردے ڈال دیے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین کی صفیں چیریں، ایک مٹھی سنگریزوں والی مٹی لے کر اُن کے سروں پر ڈالی اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے گھر تشریف لے گئے۔ محاصرین نے دروازے کی جُھری سے جھانک کر دیکھا تو کہنے لگے: اللہ کی قسم! یہ تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سوئے ہوئے ہیں۔ ان کے اوپر اُن کی چادر موجود ہے، چنانچہ یہ لوگ صبح تک وہیں ڈٹے رہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ہجرت:

صبح ہوئی اور بستر سے سیدنا علی رضی اللہ عنہ اٹھے تو مشرکین کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ انھوں نے

---

[1] السيرة النبوية لابن هشام (٢/ ٩١)

[2] الهجرة في القرآن الكريم (ص: ٣٦٤)

[3] جولة تاريخية في عصر الخلفاء الراشدين (ص: ٤٢٣)

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا: تمھارا ساتھی یعنی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کہاں ہیں؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بڑے اطمینان بھرے لہجے سے کہا: مجھے کیا معلوم؟ میں اُن پر نگران مقرر ہوا تھا؟ تم نے یہاں سے نکل جانے کو کہا، لہٰذا وہ چلے گئے ہوں گے۔ جب انھیں یقین ہو گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ہاتھ سے نکل چکے ہیں تو ان پر جنون طاری ہو گیا۔ بہت غصہ میں تھے اور اپنے دل میں کہہ رہے تھے کہ کیا ہم اندھے ہو گئے تھے انھیں دیکھ بھی نہ سکے۔ انھوں نے سب سے پہلے اپنا غصہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی پر نکالا۔ وہ آپ کو گھسیٹ کر خانہ کعبہ تک لے گئے۔ اور کچھ دیر تک زیرِ حراست رکھا کہ ممکن ہے کوئی سراغ مل جائے۔ مگر ناکام ہو کر چھوڑ دیا۔[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جتنی سکون کی نیند مجھے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بستر پر سونے سے آئی تھی۔ مجھے آج تک نہیں آئی، ''اللہ اکبر۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اللہ کی راہ میں یہ سب کچھ برداشت کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بچ نکلنے پر ان کی خوشی کے مقابلے میں ان پر نازل ہونے والی تمام مصیبتیں ہیچ تھیں۔ ان کے نزدیک سب سے زیادہ اہمیت کی بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سلامتی تھی، انھوں نے کسی قسم کی کمزوری نہیں دکھائی اور دشمن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کچھ بتانے سے گریز کیا۔ وہ مکہ کی سڑکوں پر ان اہلِ امانت کو تلاش کرتے رہے جن کی خاطر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انھیں پیچھے چھوڑ گئے تھے۔ انھوں نے تمام امانتیں مالکوں کو واپس دے دیں۔ اس طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے ذمے عائد ذمے داریوں سے عہدہ برآ ہو گئے۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے مطابق حضرت علی رضی اللہ عنہ نے لوگوں کی امانتیں واپس لوٹائیں، اس کے بعد تین راتیں مکہ میں بسر کرنے کے بعد، جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جا ملنے کی تیاری کی۔ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت قباء میں تشریف فرما تھے۔ قباء مکے سے پونے تین سو میل (ساڑھے چار سو کلومیٹر تقریباً) کے فاصلے پر واقع ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مکہ سے مدینہ کا یہ سفر پیدل طے کیا۔ ان کے پاس سواری نہیں تھی، سخت گرمی تھی۔ دن کو سفر نہیں کرتے تھے۔ رات کو سفر میں انھیں شدید اندھیرے اور پریشان کن تنہائی کا سامنا تھا، غور کریں، انھوں نے یہ سارا سفر پیدل طے کیا، کوئی ہم سفر نہ تھا۔ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ، نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے تو پاؤں میں چھالے پڑ چکے تھے۔ لیکن اس طویل سفر کی تھکن اُس وقت دور ہو گئی جب نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم

[1] تاريخ الطبري (٢/ ٣٧٤)

کی محبت اور شفقت کا سا یہ نصیب ہوا، قباء سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مدینے پہنچے۔[1]

اس طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ہجرت قربانی، برداشت، صبر واستقامت، بہادری اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر فدا ہو جانے کے مبارک جذبے کی عکّاس ہے۔

مسجدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعمیر:

ہجرت کر کے مدینے آنے والے مسلمانوں کو عبادت میں بہت دشواری تھی۔ نماز ادا کرنے کے لیے ابھی تک کچھ مناسب انتظام نہیں کیا گیا تھا۔ چنانچہ مسجدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعمیر کا آغاز کیا گیا۔ مسجد کی تعمیر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے دل وجان سے حصہ لیا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تعمیر کے دوران اشعار بھی پڑھتے تھے، جن کا مفہوم یہ ہے:

''جو مسجد کی تعمیر کرتا ہے، کھڑے ہو کر اور بیٹھ کر مشقت برداشت کرتا ہے، اور جو گرد وغبار اور مٹی سے بچنے کے لیے اس سے جی چراتا ہے، وہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زندگی میں قرآن مجید کا کردار:

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی پوری زندگی قرآن ہی کی معیت میں بسر کر دی۔ وہ نہایت عقیدت ومحبت سے کلامِ الٰہی کی تلاوت کرتے تھے، اس پاک کتاب کو حفظ کرتے تھے، اس کے گراں قدر الفاظ و معانی پر غور وفکر کرتے تھے اور اس پر اپنے دل و دماغ کی گہرائیوں سے عمل کرتے تھے۔ وہ فرمایا کرتے تھے: جس نے قرآن پڑھا، پھر فوت ہونے کے بعد جہنم کا مستحق قرار پایا، وہ دراصل ان لوگوں میں سے تھا جو اللہ تعالیٰ کی آیات کا مذاق اڑاتا تھا۔ وہ فرمایا کرتے تھے: ان لوگوں کو مبارک ہو، جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام انسانوں سے زیادہ محبوب تھے۔ فرماتے تھے: میں کسی ایسے عقلمند کو نہیں جانتا کہ وہ رات کو سورۃ البقرہ کی آخری تین آیتیں پڑھے بغیر سو گیا ہو۔[2]

قرآنِ کریم کی قدر ومنزلت بیان کرتے ہوئے فرمایا تھا:

یہ عظیم کتاب ہے۔ اس میں تم سے پہلے گزرے ہوئے اور تمھارے بعد آنے والے لوگوں کی خبر ہے۔ اس میں تمھارے درمیان موجود لوگوں کے لیے احکام ہیں۔ یہ فیصلہ کن کتاب ہے، کوئی مذاق نہیں

---

[1] تاريخ الطبري (٢/ ٣٨٢) والبداية (٧/ ٣٣٥)

[2] المستطرف (١/ ٢٩) و فوائد الكلام (ص: ٣٧٥) التبيان في آداب حملة القرآن (ص: ١٤٦، ٢٦٦)

ہے۔ کسی سرکش نے اس سے بے رخی اختیار کی تو اللہ تعالیٰ اسے نیست ونابود کر دے گا۔ جو شخص اس کے بجائے کہیں اور ہدایت تلاش کرے گا، اللہ اسے گمراہ کر دے گا، یہ اللہ کی مضبوط رسی ہے۔ حکمت و دانائی پر مبنی یاددہانی ہے۔ یہی صراطِ مستقیم ہے۔ اس کی بدولت خواہشات میں کبھی کجی نہیں آتی، زبانوں میں کبھی ابہام پیدا نہیں ہوتا، اس کے عجائبات لامحدود ہیں، یہ کبھی ختم نہیں ہوں گے۔

علمائے کرام اس سے کبھی سیر نہیں ہوتے، جس نے قرآن کی بات کی اس نے سچ کہا۔ جس نے اس پر عمل کیا وہ اجر کا مستحق ہو گیا۔ جس نے اس کے مطابق فیصلہ دیا اس نے انصاف کیا۔ جس نے اس کی طرف دعوت دی اس نے سچے اور سیدھے راستے کی طرف راہبری کی۔[1]

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ قرآنِ کریم کو بے حد اہمیت دیتے تھے۔ ابن عبدالبر فرماتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ان جلیل القدر صحابہ میں سے ہیں جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی میں قرآنِ کریم جمع کر لیا تھا۔[2]

حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنی مبارک زندگی کے آخری دنوں میں عراق میں قیام فرما تھے۔ ان دنوں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں سے بڑے بڑے اجلّ علماء بقیدِ حیات تھے۔ اس ہجومِ نجوم میں بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے:

''اس سے پہلے کہ میں تمھارے مابین موجود نہ رہوں، مجھ سے قرآنِ کریم کے مطالب و مفاہیم معلوم کر لو۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مبارک سیرت کا سب سے گرانقدر پہلو یہ تھا کہ آپ جہالت زدہ افراد اور احکامِ دین سے یکسر نا آشنا لوگوں کو قرآنِ کریم کی تعلیم، سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی تدریس اور حق و صداقت کی طرف ان کی راہبری کے لیے بڑے بے قرار رہتے تھے۔ یقیناً حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے دَور کے بہت بڑے عالم تھے اور علمائے ربانی کا یہ طریقِ کار ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کو بھلائی کی تعلیم و تربیت دینے پر ہمیشہ حریص رہتے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش کردہ تفسیر سے استفادہ کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ سیکھا اسے لوگوں تک پہنچایا۔

---

[1] فضائل القرآن لابن کثیر (ص: ١٥) و موقف امیر المومنین علي.

[2] الاستیعاب (٣/ ١١٣٠)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہونے والی آیاتِ مقدسہ:

قرآنِ کریم، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہو رہا تھا، حضرت علی رضی اللہ عنہ اس نبوی معاشرہ میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات کا مشاہدہ کر رہے تھے۔ قرآنِ پاک کبھی کسی کام پر لوگوں کی تعریف کرتا تھا اور کبھی بعض کاموں سے بچنے کی تلقین اور کبھی بعض غلطیوں کی نشان دہی کرتا تھا، چنانچہ بعض ایسی آیات بھی نازل ہوئیں جن کی بدولت امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے عظیم کارناموں کو بقائے دوام کی سند مل گئی۔ ان میں سے ہی اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی ہے:

﴿ هٰذٰنِ خَصْمٰنِ اخْتَصَمُوْا فِيْ رَبِّهِمْ ۡ فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ مِّنْ نَّارٍ ۭ يُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوْسِهِمُ الْحَمِيْمُ ۝ يُصْهَرُ بِهٖ مَا فِيْ بُطُوْنِهِمْ وَالْجُلُوْدُ ۝ وَلَهُمْ مَّقَامِعُ مِنْ حَدِيْدٍ ۝ كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ اُعِيْدُوْا فِيْهَا ۤ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴾ [الحج: ١٩۔ ٢٢]

''یہ دو فریق ہیں۔ ان کے درمیان اپنے رب کے معاملے میں جھگڑا ہے، ان میں سے وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا، ان کے لیے آگ کے لباس تیار کیے جا چکے ہیں۔ ان کے سروں پر کھولتا ہوا پانی ڈالا جائے گا، اس سے ان کی کھالیں ہی نہیں پیٹ کے اندر کے حصے بھی گل جائیں گے اور ان کی خبر لینے کے لیے لوہے کے گُرز ہوں گے، جب بھی وہ گھبرا کر جہنم سے نکلنے کی کوشش کریں گے، پھر اسی میں دھکیل دیے جائیں گے کہ اب جلنے کی سزا کا مزا چکھو۔''

نیز فرمایا:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّلُؤْلُؤًا ۭ وَلِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ ﴾ [الحج: ٢٣]

''(دوسری طرف) جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے ان کو اللہ ایسی جنتوں میں داخل فرمائے گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی، انھیں وہاں سونے کے کنگنوں اور موتیوں سے آراستہ کیا جائے گا اور ان کے لباس ریشم کے ہوں گے۔''

امام بخاری نے اپنی سند کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، انھوں نے فرمایا:

''قیامت کے دن مدِ مقابل کے خلاف دلیل پیش کرنے والا میں پہلا شخص ہوں گا جو رحمان

کے حضور گھٹنوں کے بل پیش ہوں گا۔ قیس بن عبادہ کہتے ہیں یہ آیاتِ مقدسہ جن کے بارے میں نازل ہوئیں وہ جنگِ بدر میں شامل وہ لوگ تھے جو ایک دوسرے کے مدِ مقابل آئے، حمزہ، علی، ابو عبید بن حارث رضی اللہ عنہم اور (دوسری طرف) شیبہ بن ربیعہ، عتبہ بن ربیعہ اور ولید بن عتبہ۔[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ ان لوگوں میں شامل ہیں جن کے بارے میں یہ آیاتِ مقدسہ نازل ہوئیں:

﴿فَمَنْ حَآجَّكَ فِيهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ﴾

[آل عمران: ٦١]

''یہ علم آجانے کے بعد ان میں سے جو بھی اس معاملے میں تم سے جھگڑا کرے تو (اے نبی!) اس سے کہو کہ آؤ! بذاتِ خود ہم بھی اور تم بھی آجائیں اور اپنے اپنے بال بچوں کو بھی ساتھ لے آئیں اور اللہ سے دعا کریں کہ جو بھی جھوٹا ہو اس پر اللہ کی لعنت ہو۔''

یہ بات وفدِ نجران کے بارے میں ہے۔ اس وفد نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں مباحثہ کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں یہ حقیقت سمجھائی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بندے ہیں، اس کے رسول ہیں اور اس کا کلمہ ہیں جو ان کی پاکباز والدہ پر اتارا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لغوبات کی تردید بھی کی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ ہیں یا اس کا بیٹا ہیں یا وہ تین میں سے ایک ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں اسلام کی دعوت دی تو انھوں نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ پھر انھیں مباہلہ کی دعوت دی۔ حضرت عامر بن سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں:

''جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی، فاطمہ، حسن اور حسین رضی اللہ عنہم کو بلایا اور فرمایا: اے اللہ! یہ میرے اہلِ بیت (اہلِ خاندان) ہیں۔''[2]

قرآنِ کریم سے استنباط اور استفادے کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اصول:

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ قرآنِ کریم اور اس سے متعلقہ علومِ عالیہ کے بہت بڑے عالم تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کامل یقین کے ساتھ سمجھتے تھے کہ قرآنِ کریم میں واضح اور ضمنی طور پر تمام شرعی احکام موجود ہیں، وہ فرمایا کرتے تھے: ''یقیناً اللہ تعالیٰ بھولنے والا نہیں ہے۔'' یہی وجہ ہے کہ وہ اکثر قرآنِ پاک ہی

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٩٦٥)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٠٤)

سے استدلال کیا کرتے تھے اور شرعی حکم کے لیے جس آیت کا حوالہ دیتے، اس کی تلاوت فرماتے تھے، ان کا طریقِ استنباط درج ذیل ہے۔[1]

قرآن حکیم کے ظواہر کا التزام:

مثلاً وہ فرمایا کرتے تھے کہ بڑی عمر والے بچے کو دودھ پلانا حرمتِ نکاح کا باعث نہیں، انھوں نے اس بارے میں اس آیت کا حوالہ دیا:

﴿ وَالْوٰلِدٰتُ یُرْضِعْنَ اَوْلَادَھُنَّ حَوْلَیْنِ كَامِلَیْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ یُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ﴾

[البقرة: ۲۳۳]

''جو باپ چاہتے ہوں کہ ان کی اولاد پوری مدتِ رضاعت تک دودھ پیئے تو مائیں اپنے بچوں کو کامل دو سال تک دودھ پلائیں۔''

انھوں نے فرمایا: شرعی رضاعت دو سال ہے۔ ان دو برسوں میں اگر دودھ پیا ہے تو وہ حرمت کا باعث ہے اور جو دودھ دو سال کے بعد پیا جائے وہ حرمتِ نکاح کا باعث نہیں ہے۔[2]

عربوں کی عادتوں اور رسوم ورواج کی پہچان:

نزولِ قرآن کے وقت، عرب اور ان کے گرد رہنے والے یہود و نصاریٰ کے مزاج و عادات کی پہچان کا قرآنِ کریم کے فہم میں بڑا کردار ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ اُسی زمانے میں زندگی بسر کر رہے تھے اور وہ ان کی بہت سی ان عادات اور رسوم ورواج کو خوب جانتے اور سمجھتے تھے جن سے قرآنِ کریم نے روکا ہے یا انھیں صحیح قرار دیا ہے۔

فہمِ قرآن کے حوالے سے ایک مثال وہ روایت ہے جسے ابن ابی حاتم نے بیان کیا ہے، وہ کہتے ہیں: جب ابن وائل اور ابو الفرزدق کے درمیان اپنے حسب ونسب پر اظہارِ فخر کا مقابلہ ہوا تو ان دونوں نے ایک ایک سو اونٹ ذبح کر دیے۔ اس واقعہ پر حضرت علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سفید خچر پر سوار ہو کر فوراً باہر نکل آئے۔ آپ بلند آواز سے اعلان کر رہے تھے: اے لوگو! ان (اونٹوں) کا گوشت نہ کھانا، ان پر اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کا نام لیا گیا ہے۔ دراصل حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس موقع پر عرب کی عادات کو سمجھ لیا کہ اس قسم کی مقابلہ آرائی اللہ کی خاطر نہیں ہوتی بلکہ شیطان کی خاطر ہوتی ہے۔ اس لیے انھوں نے ذیل

---

[1] مصنف عبد الرزاق، رقم الحديث (١٧٤٤)

[2] المجموع للنووي (٨/ ٢١٣)

کی آیت سے استدلال کرتے ہوئے لوگوں کو ان اونٹوں کا گوشت کھانے سے منع کیا۔[1]

﴿ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهِ ﴾ [المائدہ: ٣]

''تم پر حرام کیا گیا مردار، خون، خنزیر کا گوشت اور وہ جانور جو اللہ کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیا گیا ہو۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وابستگی اور فہمِ حدیث:

حضرت علی رضی اللہ عنہ مکہ مکرمہ کے اُمّی معاشرے کی ان ممتاز شخصیتوں میں سے تھے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ یہ بچپن سے ہی علم سے ان کی محبت اور شغف کی دلیل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ لطف و کرم ان کے لیے بچپن ہی سے مقدّر فرما دیا کہ وہ کاشانۂ نبوت ہی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زیرِ سایہ زندگی بسر کریں۔ اسلام قبول کرنے کے بعد ان پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عنایات میں مزید اضافہ ہو گیا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زیرِ سایہ قرآنی تربیت کا نہایت گہرا اثر قبول کیا اور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیماتِ عالیہ کو اپنے دل میں جگہ دی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسلام کو گلے لگانے کے بعد قرآنِ کریم کے حفظ، اس کے فہم، غور و فکر اور تدبّر کا خاص اہتمام کیا۔ آپ نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی وابستگی کو اس قدر پختہ کر لیا کہ آپ نازل ہونے والی ہر آیت اور سورت بخوبی سیکھتے چلے گئے۔ اس طرح آپ نے تمام آیات اور سورتیں حفظ کر لیں۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اور تربیت کی برکت سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خیر و بھلائی کے نہایت بیش قیمت اثاثے حاصل کر لیے، بعد میں جب آپ خلیفۂ راشد کے اہم منصب پر فائز ہوئے تو امن اور جنگ دونوں قسم کے حالات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ پر عمل کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سنتِ مطہرہ کے وسیع علم و معرفت سے سرفراز ہوئے۔ انھوں نے یہ آیت پڑھی، یاد کی اور اسے خوب سمجھا:

﴿ مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ﴾ [النساء: ٨٠]

''جو رسول کی اطاعت کرے اس نے اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کی۔''

انھوں نے دین کے عظیم مقاصد ہمیشہ پیشِ نظر رکھے۔

---

[1] تفسير علي بن أبي طالب (١/ ٣) فهد بن عبد العزيز.

دلائلِ نبوت پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی احادیث

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کی برکت:

ایک مرتبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بیمار ہو گئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس آئے۔ اُس وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ کہہ رہے تھے: اے اللہ! اگر میری اجل آ گئی ہے تو مجھے راحت سے ہمکنار فرما۔ اگر میری اجل میں کچھ دیر ہے تو مجھے سر بلند کر دے اور اگر یہ بیماری آزمائش ہے تو مجھے صبر کی توفیق عطا فرما۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے دریافت فرمایا: ''تم نے کیا کہا ہے؟'' انھوں نے وہی الفاظ دہرائے جو اللہ تعالیٰ سے عرض کیے تھے۔ یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی: ''اے اللہ! انھیں شفاء عطا فرما! اے اللہ! انھیں عافیت سے نواز دے!'' پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ''اٹھو، کھڑے ہو جاؤ!'' وہ کہتے ہیں: میں اسی وقت کھڑا ہو گیا اور جس تکلیف میں مبتلا تھا وہ بعد ازاں مجھے کبھی نہیں ہوئی۔

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شب و روز میں نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء و اتباع کی حقیقی تصویر جھلکتی تھی۔ ان کی عملی زندگی اس کی روشن دلیل ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور روایتِ حدیث:

حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے دور میں تمام صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے زیادہ سنت کا علم رکھنے والے تھے۔ ایک بار حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے سامنے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ذکر آیا تو انھوں نے فرمایا: صحابہ میں سے جو آج موجود ہیں، (حضرت) علی (رضی اللہ عنہ) ان سب سے زیادہ سنت کا علم رکھنے والے ہیں۔ بیان کیا گیا ہے کہ انھوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پانچ سو چھیاسی احادیث روایت کی ہیں۔[2]

دیگر بعض صحابہ نے جو احادیث روایت کی ہیں یہ تعداد اُن سے کم ہے۔ اس کی وجوہات یہ ہیں: کہ قضاء، حکومت اور جنگوں کے معاملات میں آپ بہت مصروف رہے، مشغولیت کے باعث آپ فتویٰ دینے اور درس و تدریس کے ایسے حلقے قائم کرنے کے لیے فراغت نہ پا سکے جو حضرت عبداللہ بن مسعود، عبد اللہ بن عباس اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم جیسے صحابۂ کرام کی جانب سے علم کی نشر و اشاعت کا سبب بنے۔ اُن کے

[1] مسند أحمد (۲/ ۱۵۱) مع تحقيق أحمد شاكر، اس حدیث کی سند صحیح ہے۔

[2] الطبقات (۲/ ۳۳۸) تاريخ الخلفاء (ص: ۱۷۱)

دَور میں فتنوں کی بہتات ہوگئی اور بعض لوگوں کی اُس طرف توجہ ہو جانے کے نتیجے میں روایات نقل کرنے والوں پر اعتماد نہ رہا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''میرے پاس علم موجود ہے۔ کاش! اس کے لیے صحیح حاملین موجود ہوں۔''

روایت قبول کرنے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا منہج:

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ باندھنے سے اجتناب، کیوں کہ خود حضرت علی رضی اللہ عنہ اس حدیث کے راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّداً فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ»[1]

''جس نے جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ باندھا، وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں سمجھے۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ منکر اور شاذ قسم کی احادیث روایت نہیں کرتے تھے، ان سے منقول ہے کہ انھوں نے فرمایا: ''لوگوں کے روبرو وہ باتیں بیان کرو جو وہ سمجھ سکتے ہوں اور جو اُن کے لیے اجنبی اور منکر ہوں انھیں چھوڑ دو، کیا تم چاہتے ہوں کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلایا جائے؟''[2]

مدنی زندگی کا آغاز:

مدینہ کو مرکز بنانے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی ریاست کے ستونوں کو مضبوط بنانے کے لیے مہاجرین اور انصار کے درمیان مؤاخاۃ کا عمل شروع کیا، پھر مسجد کا قیام عمل میں لایا گیا۔ یہود کے ساتھ معاہدات کیے گئے، فوجی دستوں کی نقل وحرکت شروع ہوئی۔ نئے معاشرے میں تعلیمی، تربیتی اور اقتصادی امور کی بنیاد رکھی گئی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہر قسم کے حالات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ وابستہ رہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام نافذ کرتے رہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دیے ہوئے طریقِ زندگی کو نہایت مضبوطی سے اپنائے رکھا۔

علّامہ ابن قیم کا کہنا ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین کے درمیان باہمی مؤاخاۃ قائم کی۔ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین وانصار کے مابین مؤاخاۃ کی حکمتِ عملی، ان کے مابین محبت اور مودت کے جذبات واحساسات کو پختہ کرنے کے لیے اختیار فرمائی، انھوں نے خود بھی اس کا اہتمام کیا اور نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی حوصلہ افزائی کا سلسلہ جاری رکھا۔[3]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٠٦)

[2] صحيح البخاري، كتاب العلم قبل الحديث (١٢٧)

[3] فصول من السيرة النبوية لعبد المنعم سيد (ص: ٢٠٠)

غزوۂ بدر:

امام نووی کہتے ہیں: تمام اہلِ تواریخ متفق ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ غزوۂ تبوک کے سوا، تمام غزوات و سرایا میں نہایت مستعدی کے ساتھ شریک ہوئے۔ مؤرخین کا کہنا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں بہت سے مواقع پر جھنڈا عطا فرمایا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ ان مجاہدین صحابہ میں نمایاں تھے جو غزوۂ بدر میں شریک ہوئے۔[1]

غزوۂ بدر سن ۲ ہجری میں ہوا۔ اُس دور میں رواج تھا کہ عام لڑائی سے پہلے نامور اور دلیر ایک دوسرے کو لڑنے کی دعوتِ مبارزت دیا کرتے تھے۔ کافروں کے لشکر سے عتبہ ولید اور شیبہ نکلے اور مسلمانوں کو للکار کر مقابلے کی دعوت دی۔ صحابۂ کرام میں سے انصار کے چھ نوجوان سامنے آ گئے۔ عتبہ نے کہا: ہم ان کا مقابلہ نہیں کریں گے، ہمارے چچاؤں کی اولاد: عبدالمطلب کی اولاد میں سے کوئی آگے آئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی، حضرت حمزہ اور حضرت عبیدہ بن حارث رضی اللہ عنہم کو حکم دیا:

فرمایا: ''اٹھو آگے بڑھ کر ان کا مقابلہ کرو۔''

تینوں، ان کافروں کے چیلنج کا جواب دینے کے لیے میدان میں کود پڑے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مقابلہ ولید سے ہوا۔ انھوں نے آناً فاناً اسے کاٹ کر رکھ دیا۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے مقابلے پر شیبہ تھا، وہ بھی ان کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتر گیا۔ حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہ تیسرے کافر عتبہ پر جھپٹے، لیکن عتبہ کا داؤ چل گیا اور حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہ زخمی ہو گئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ عتبہ کی طرف لپکے اور بڑے جوش کے ساتھ اس پر وار کر کے اسے جہنم رسید کر دیا۔ پھر عام لڑائی کا آغاز ہوا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اتنی دلیری کے ساتھ لڑے کہ دشمنوں کی صفیں الٹا کر رکھ دیں۔ وہ ایک طوفان کی طرح دشمن کی طرف لپکتے تھے، جو بھی ان کی تلوار کی زد میں آتا موت اس کا مقدر ہو جاتی۔

دوسرے مسلمان بھی اسی جوش اور جذبے کے ساتھ لڑے۔ بالآخر مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی قریش کے ستر (۷۰) بڑے بڑے سردار اس لڑائی میں ہلاک ہو گئے، اور ستر (۷۰) کو قید کر لیا گیا۔ انصار قبیلے کا ایک آدمی حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کو گرفتار کر کے لے آیا۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے کہا: اے اللہ کے رسول! اس نے مجھے گرفتار نہیں کیا، مجھے تو ایک خوبصورت شخص نے قید کیا۔ وہ ایک سیاہ وسفید گھوڑے پر سوار تھا۔ مجھے وہ شخص اب کہیں نظر نہیں آ رہا۔ انصاری نے کہا: نہیں میں نے قید کیا ہے۔

[1] تهذيب الأسماء و اللغات (١/ ٢٤٥)

آپ ﷺ نے فرمایا: خاموش رہو، اللہ تعالیٰ نے ایک معزز فرشتے کے ذریعے تمھاری مدد کی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: پھر ہم نے عبد المطلب کی اولاد میں سے عباس، عقیل اور نوفل بن الحارث کو قیدی بنا لیا۔[1]

یاد رہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس کے ہر اول دستے میں شامل تھے۔ غزوۂ بدر کے مالِ غنیمت سے انھیں ایک زرہ، ایک اونٹ اور ایک تلوار عطا کی گئی۔

سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شادی اور اہلِ بیت کا مختصر تذکرہ:

سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا امام المتقین سید البشر حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی صاحبزادی ہیں۔ ان کی والدہ حضرت خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ عنہا ہیں۔[2] بعثت سے پہلے جب آپ ﷺ کی عمر ۳۵ سال تھی، ان کی ولادت ہوئی۔[3] واقعۂ بدر کے بعد سن دو ہجری میں نبی اکرم ﷺ نے ان کی شادی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کر دی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ سے بعض حضرات نے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کی درخواست کی۔ میری ایک لونڈی نے مجھ سے کہا: کیا آپ کو معلوم ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے رشتے کی درخواست کی جاری ہے۔ میں نے کہا: مجھے معلوم نہیں، اس نے کہا: بھلا اس میں کون سا امرِ مانع ہے کہ آپ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں جائیں۔ وہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا سے آپ کی شادی کر دیں گے۔

میں نے کہا: بھلا میرے پاس کیا ہے جس کی بنیاد پر میں شادی کر سکوں؟ اس نے کہا: اگر آپ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں چلے جائیں تو وہ یقیناً آپ سے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کا نکاح کر دیں گے۔ اللہ کی قسم! وہ مجھے بار بار امید دلاتی رہی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: آخر کار میں سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کی درخواست کرنے کے لیے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر تو ہو گیا مگر مجھے آپ ﷺ سے مدعا عرض کرنے کی ہمت ہی نہیں ہوئی۔ آپ ﷺ کی ہیبت و جلال کے باعث میں کچھ نہ کہہ سکا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بتاؤ کیسے آنا ہوا؟ کیا کسی چیز کی ضرورت ہے؟ میں چپ چاپ ہی بیٹھا رہا۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: شاید تم فاطمہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کا پیغام دینے آئے ہو؟ میں نے عرض کی: جی ہاں!

سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کا مہر:

آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: تمھارے پاس ادائے حق مہر کے لیے کچھ ہے؟ میں نے عرض کی: جی

---

[1] الموسوعة الحديثية، مسند أحمد، رقم الحديث (٩٤٨)

[2] أسد الغابة (٥/ ٥٢٥)

[3] الطبقات لابن سعد (٨/ ٢٦)

نہیں، میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ زرہ کہاں ہے جو میں نے تمھیں دی تھی؟ اس اللہ کی قسم! جس کے ہاتھ میں علی (رضی اللہ عنہ) کی جان ہے، وہ ٹوٹی پھوٹی تھی، اس کی قیمت چار سو درہم سے زیادہ نہ ہوگی.... بہر حال میں نے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی: جی ہاں! وہ زرہ میرے پاس موجود ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے اس کے بدلے تمھارا نکاح (حضرت) فاطمہ (رضی اللہ عنہا) سے کر دیا۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بنت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حق مہر بس یہی تھا۔[1]

ان کے نکاح کے وقت پورا عرب آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مرعوب تھا۔ گرد و پیش کے علاقوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اثر ورسوخ پھیل چکا تھا اور حالات انتہائی شاندار مستقبل کا پتا دے رہے تھے، مگر اس کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیٹی کا نکاح بڑی سادگی سے کیا۔

سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی رخصتی:

سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی رخصتی نکاح کے فوراً بعد نہیں ہوئی بلکہ چند ماہ کے بعد کی گئی۔ رخصتی کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پیاری بیٹی کو ایک بستر، چمڑے کا ایک تکیہ جس میں کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی، پانی کا ایک مشکیزہ اور ایک چادر دی۔ یہ تھا اللہ کے پیارے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی پیاری بیٹی کے لیے بوقتِ رخصتی دیا گیا سامان۔[2]

اور یہ سامان بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پیسوں سے لیا گیا تھا جو ان کی زرہ بیچنے پر ملے تھے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے خود نکاح پڑھایا اور برکت کی دعا فرمائی۔ شادی کے بعد زوجین کو نئے مکان کی ضرورت تھی، چنانچہ حضرت حارث بن نعمان رضی اللہ عنہ کا مکان ان کی نئی رہایش گاہ بنا۔

حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رخصتی کے معاملات میں شریک تھی، صبح ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ہاں تشریف لائے۔ پہلے دروازے پر کھڑے ہو کر اندر آنے کی اجازت مانگی، پھر اندر داخل ہوئے۔ اور فرمایا: اے ام ایمن (رضی اللہ عنہا)! میرے بھائی کو میرے پاس بلا لاؤ۔ میں نے کہا: وہ آپ کے بھائی ہیں جبکہ آپ نے اپنی بیٹی سے ان کا نکاح کر دیا ہے؟

---

[1] دلائل النبوة للبيهقي (٣/ ١٦٠) اس کی سند حسن ہے۔

[2] صحيح السيرة النبوية (ص: ٦٦٧) و سيدة فاطمة الزهراء رضی اللہ عنہا وما ورد في فضلها للسيوطي تحقيق فؤاد أحمد زمرلي (ص: ١٨٩)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہاں ام ایمن (رضی اللہ عنہا)! وہ کہتی ہیں کہ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ آ گئے۔ آپ ﷺ نے ایک برتن میں پانی منگوایا، اپنے دونوں ہاتھوں میں پانی لے کر ان پر چھڑکا اور ان کے لیے دعا فرمائی: پھر فرمایا: فاطمہ (رضی اللہ عنہا) کو میرے پاس بلاؤ، وہ لجاتی شرماتی ہوئی آئیں، آپ ﷺ نے ان سے فرمایا: میں نے اپنے اہلِ خانہ میں سے سب سے زیادہ پسندیدہ شخصیت سے تمھارا نکاح کر دیا ہے۔ حضرت ام ایمن رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: نبی مکرم ﷺ نے ان پر بھی پانی چھڑکا اور ان کے لیے دعا بھی فرمائی۔ پھر فرمایا: اے اللہ! ان دونوں کے حق میں برکت عطا فرما اور ان کے بچوں میں بھی برکت عطا فرما۔[1]

وہ کہتی ہیں: پھر رسول اللہ ﷺ واپس چلے تو اپنے سامنے کسی کا سایہ محسوس کیا۔ دریافت فرمایا: کون ہے؟ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: میں نے عرض کی: میں ہوں، فرمایا: اسماء (رضی اللہ عنہا) ہیں، میں نے کہا: جی ہاں! فرمایا: اسماء بنت عمیس (رضی اللہ عنہا) ہیں۔ میں نے عرض کی: جی ہاں! فرمایا: آپ رسول ﷺ کی بیٹی کی رخصتی کے سلسلے میں ان کی عزت افزائی کے لیے آئی ہیں؟ میں نے عرض کی: جی ہاں! وہ کہتی ہیں کہ پھر آپ ﷺ نے میرے لیے بھی دعا فرمائی۔[2]

دستور کے مطابق ولیمہ:

حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں: جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے شادی ہوئی، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: شادی پر ولیمہ ضروری ہے۔ دستور کے مطابق ولیمے کا بھی اہتمام ہوا، جَو کی روٹی، گوشت، کھجور اور پنیر سے ضیافت کی گئی۔ اس زمانے کے دستور کی مطابق یہ بہترین ولیمہ تھا۔

غزوۂ بدر کے بعد حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو نہایت عظیم الشان اعزاز ملا۔ یہ اعزاز اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ رشتۂ مصاہرت کا تھا۔ ہجرت کے دوسرے سال اللہ کے رسول ﷺ نے اپنی سب سے چھوٹی اور لاڈلی صاحب زادی سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو ان کے عقد میں دے دیا۔ ہر چند اور بھی متعدد شرفائے صحابہ رضی اللہ عنہم نے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کی خواہش ظاہر کی تھی، مگر اللہ کے رسول ﷺ نے ان سب کو نظر انداز کر دیا اور یہ اعزاز حضرت علی رضی اللہ عنہ کو عطا فرمایا۔

سیرت نگاروں کے مطابق آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: میں نے (حضرت) فاطمہ (رضی اللہ عنہا) کا نکاح

---

[1] المعجم الكبير للطبراني، رقم الحديث (١١٥٣)

[2] فضائل الصحابة (٢/ ٩٥٥) رقم الحديث (٣٤٢) اس کی سند صحیح ہے۔

بہترین انسان سے کیا ہے۔ جس طرح سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پیاری اور محبوب تھیں، اسی طرح مردوں میں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ بڑا امتیاز مرتبہ رکھتے تھے۔

شادی کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کا بہت خیال رکھتے تھے۔ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا بھی ان کی بہت عزت اور احترام کرتی تھیں۔ انتہائی پرہیزگار اور متقی، طبیعت میں نفاست اور گفتگو میں صداقت کے جوہر نمایاں تھے۔ اور کیوں نہ ہوتے! بچپن ہی سے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان کی حالت میں پروان چڑھیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کی بیٹی تھیں، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سب سے پہلے ایمان لائیں اور رسالت کے انتہائی کٹھن دَور میں آپ کی مدد اور غم خواری کی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی عائلی زندگی:

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے زیادہ عزیز تھے۔ شادی کے ابتدائی دنوں میں انھیں دیگر مہاجرین کی طرح انتہائی تنگی اور عُسرت کا سامنا کرنا پڑا، ایک مرتبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہم نے کچھ دن اس طرح گزارے کہ ہمارے پاس کوئی چیز تھی، نہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ تھا۔ میں گھر سے باہر نکلا۔ راستے میں ایک دینار پڑا نظر آیا۔ میں ایک لمحے کے لیے رکا، اسے اٹھانے یا نہ اٹھانے کے بارے میں سوچا، پھر میں نے حالات کی تنگی کے باعث اٹھا لیا۔

باربرداری والوں سے آٹا خریدا اور (حضرت) فاطمہ (رضی اللہ عنہا) کے پاس لے آیا۔ میں نے کہا: اسے گوندھ کر روٹی پکا لو۔ وہ گوندھنے لگیں جبکہ وہ کمزوری اور تکلیف میں مبتلا تھیں۔ ان کے سر کے بال لٹک رہے تھے اور برتن کے کنارے پر لگ رہے تھے۔ انھوں نے روٹی پکائی۔ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچا اور انھیں یہ ساری سرگزشت سنائی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کھاؤ! یہ وہ رزق ہے جو اللہ تعالیٰ نے تمھیں کھلایا ہے۔[1]

امام شعبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی سے شادی کی۔ ہمارے پاس صرف ایک مینڈھے کی کھال تھی۔ اس کے سوا کوئی بستر نہیں تھا۔ رات کو ہم اُسی پر سوتے اور دن کو اسی پر چارہ ڈال کر اپنے جانوروں کو چارا کھلا دیتے تھے۔ ہمارے پاس کوئی خدمت گار بھی نہیں تھا۔[2]

[1] كنز العمال (٧/ ٣٢٨) و المرتضىٰ للندوي (ص: ٤١)

[2] كنز العمال (٧/ ١٣٣) و المرتضىٰ للندوي (ص: ٤١)

اس واقعہ میں ان سخت حالات کا ذکر ہے جن کا سامنا امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ مدینہ میں کرتے رہے۔ اس سے ہمیں یہ زریں سبق حاصل ہوتا ہے کہ تنگی کے حالات میں ہمارا رویہ کیا ہونا چاہیے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کیا اور اپنے ہاتھوں سے محنت مزدوری کرنے نکل کھڑے ہوئے۔ انھوں نے اور لوگوں کی طرف نہیں دیکھا، کسی سخاوت یا عطاء و بخشش کا انتظار نہیں کیا۔ انھوں نے سخت بھوک کی حالت میں محنت و مشقت کے عوض کھجوریں حاصل کیں۔ اس حالت میں بھی وہ اپنے محبوب عزیزوں اور ساتھیوں کو نہیں بھولے۔ انھوں نے مزدوری کی کھجوروں میں نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی شریک کیا اور انھیں اپنے ساتھ کھجوریں کھلائیں۔[1]

سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کا زُہد اور صبر:

سیدہ رضی اللہ عنہا کی زندگی انتہائی سادہ تھی۔ ان کے مقدس گھر میں عیش و عشرت کا کوئی تصوّر نہیں تھا۔ زندگی بڑی تنگی اور عُسرت سے بسر ہوتی تھی۔ ذرا سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے مشکل حالاتِ زندگی کا آئینہ دیکھیے۔ انھوں نے گھر کے بھاری کام کاج کے نتیجے میں شدید تھکاوٹ کی وجہ سے ایک دن قیدیوں میں سے ایک خادم مانگا جو نہ ملا۔ اس واقعے کا پس منظر یہ ہے:

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک دن سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا سے کہا: میں بیمار ہوں۔ سینے میں تکلیف محسوس کر رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے تمھارے والدِ گرامی کی خدمت میں کچھ قیدی بھیج دیے ہیں، تم ان کی خدمت میں جاؤ اور ان سے ایک خادم ہی مانگ لاؤ۔ وہ کہنے لگیں: اللہ کی قسم! چکی پیستے پیستے میرے دونوں ہاتھ سوج گئے ہیں، میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا: کیسے آئی ہو بیٹی؟ میں نے عرض کی: میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کرنے آئی ہوں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پوچھا: کیا ہوا؟ انھوں نے بتایا کہ مجھے ابا حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ مانگتے ہوئے بڑی شرم آئی۔ پھر ہم دونوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اکٹھے پہنچے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عرض کی: میں بیمار رہتا ہوں، سینے میں تکلیف ہے ...... پھر میں نے عرض کی: چکی پیسنے کے نتیجے میں میرے ہاتھوں پر ورم آ گیا ہے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو کچھ قیدیوں اور فراخی سے نوازا ہے۔ ہمیں بھی ایک خادم عطا کر دیجیے![2]

---

[1] التاريخ الإسلامي للحميدي (١٩/ ٤٩، ٥٠)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٧٠٥) وصحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٢٧) السيرة النبوية للصلابي (٢/ ٩٩)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ کی قسم! میں تمھیں کچھ نہیں دے سکتا۔ کیا میں اہلِ صُفہ کو بھوکا چھوڑ دوں؟ ان پر خرچ کرنے کے لیے میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ میں قیدی فروخت کر کے ان کی آمدنی اہلِ صُفہ پر خرچ کروں گا۔ وہ دونوں واپس چلے آئے۔ بعد ازاں نبی اکرم ﷺ ان کے گھر ان کے پاس تشریف لائے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا اپنے اوپر چادر لیے ہوئے تھے، اور حالت یہ تھی کہ اگر وہ اپنا سر ڈھانپتے تو دونوں کے پاؤں ننگے ہو جاتے تھے اور پاؤں ڈھانپتے تھے تو سر ننگے ہو جاتے تھے۔ وہ دونوں رسالت مآب ﷺ کے احترام میں اٹھنے لگے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اپنی جگہ پر رہو۔ پھر فرمایا: تم نے مجھ سے جو کچھ مانگا ہے کیا تمھیں اس سے زیادہ بہتر چیز نہ بتاؤں؟ دونوں نے عرض کی: جی ہاں! کیوں نہیں۔ ضرور ارشاد فرمائیے! آپ ﷺ نے فرمایا: کچھ کلمات ہیں جو مجھے جبرائیل علیہ السلام نے سکھائے ہیں اور وہ یہ ہیں کہ ہر نماز کے بعد دس بار سبحان اللہ، دس بار الحمد للہ اور دس بار اللہ اکبر پڑھو، اور جب سوتے وقت بستر پر آؤ تو ۳۳ بار ''سبحان اللہ''، ۳۳ بار ''الحمد للہ'' اور ۳۴ بار ''اللہ اکبر'' پڑھ لیا کرو۔ تھکاوٹ دور ہو جائے گی۔[1]

رسالت مآب ﷺ کی اس تربیت سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بہت گہرا اثر لیا۔ نو جوان حضرت علی رضی اللہ عنہ آزمایش کے ان مراحل سے گزرنے کے بعد کُندن بن گئے، جب وہ خلیفۃ المسلمین بنے تو اس تربیت کے آثار درخشاں نظر آنے لگے۔ ان کے ہاتھ میں زمین کے خزانے تھے مگر انھوں نے اپنے آپ کو دنیا اور اس کی رنگینوں سے ہمیشہ بالاتر رکھا کیوں کہ ان کا دل اللہ کی یاد سے معمور تھا اور ان کا وجود ذکرِ الٰہی کے انوار سے سرشار رہتا تھا، انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی وصیّت کو ہمیشہ یاد رکھا۔ ہمیں بھی اس سے روشناس کرایا۔ وہ فرماتے ہیں:

> ''جب سے رسول اللہ ﷺ نے مجھے یہ مبارک کلمات سکھائے، تب سے میں نے انھیں پڑھنا کبھی بھی نہیں چھوڑا۔ ہمیشہ اور ہر حال میں پڑھتا رہا۔'' ایک صحابی نے ان سے پوچھا: کیا صِفین کی رات بھی آپ نے ان کلمات کو نہیں چھوڑا؟ انھوں نے فرمایا: ''ہاں! صِفین کی رات بھی نہیں چھوڑا۔''[2]

رسول اللہ ﷺ کی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے محبت:

رسول اللہ ﷺ کسی غزوہ یا سفر سے واپس تشریف لاتے تو سب سے پہلے مسجد میں آتے، دو رکعت

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٧٠٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٢٨، ٢٧ ٢٧)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٢٧)

نماز ادا فرماتے، پھر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے ہاں تشریف لے جاتے، بعدازاں اپنی ازواجِ مطہرات کے ہاں آتے۔ سفر پر روانہ ہوتے وقت بھی سب سے آخر میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے ملتے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

''میں نے اٹھنے بیٹھنے، رہن سہن اور آداب و اخلاق میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے زیادہ کسی اور کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشابہ نہیں پایا۔ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں آتی تھیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اُن سے کھڑے ہوکر ملتے تھے، بوسہ دیتے تھے اور اپنی جگہ پر بٹھاتے تھے۔ اور جب نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے ہاں تشریف لے جاتے تو وہ کھڑی ہو جاتی تھیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بوسہ دیتی تھیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی جگہ پر بٹھاتی تھیں۔'' ایک روایت میں ہے کہ: ''وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک کو بوسہ دیتی تھیں۔''[1]

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''مجھے میرے گھر والوں میں سے سب سے زیادہ محبوب فاطمہ رضی اللہ عنہا ہیں۔''[2]

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی موجودگی میں ابوجہل کی بیٹی سے شادی کا ارادہ کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

''فاطمہ (رضی اللہ عنہا) میرے جگر کا ٹکڑا ہے، جس نے اُسے ناراض کیا، اس نے مجھے ناراض کیا۔''[3]

امام ترمذی رحمہ اللہ نے اپنی سند کے ساتھ عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ابوجہل کی بیٹی کا ذکر کیا، یہ بات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ گئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''فاطمہ (رضی اللہ عنہا) میرے جسم حصہ ہے، اس کی تکلیف میری تکلیف ہے اور اس کی پریشانی میری پریشانی ہے۔''[4]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی تکلیف کو اپنی تکلیف کہنا اور ان کے لیے سرِعام انتہائی محبت اور قدر و منزلت کے جذبات ظاہر فرمانا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے وقار اور عزت و احترام کی

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٤٥٠) سنن أبي داود، رقم الحدیث (٥٢١٧)
[2] مسند الطیالسي (٢/ ٢٥) یہ حدیث حسن، صحیح ہے۔
[3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤١٧٣)
[4] فضائل الصحابه (٢/ ٧٥٦) رقم الحدیث (١٣٢٧) اس کی سند صحیح ہے۔

سب سے معتبر دلیل ہے۔[1]

سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

''فاطمہ (رضی اللہ عنہا) کائنات کی تمام جنتی عورتوں کی سردار ہیں۔''[2]

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا:

''فاطمہ میری لختِ جگر ہے۔ جو چیز اسے بے چین کردے وہ مجھے پریشان کرتی ہے اور جو اسے تکلیف دے وہ مجھے تکلیف دیتی ہے۔''[3]

ایک دن نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے ہاں تشریف لائے، حضرت علی رضی اللہ عنہ اُس وقت گھر پر نہیں تھے۔ ان کے متعلق سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا تو انھوں نے کہا:

''میرا ان سے کچھ جھگڑا ہوگیا تھا، وہ غصے میں گھر سے باہر چلے گئے ہیں۔''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے۔ پتا چلا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ مسجد میں سو رہے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف لے گئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ بڑی بے فکری کے ساتھ وہاں سو رہے تھے۔ ان کی چادر پہلو سے سرک گئی تھی اور جسم کو مٹی لگ گئی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے مٹی کو پونچھا، پھر فرمایا:

''ابوتراب، اٹھو! ابوتراب، اٹھو! (تراب، مٹی کو کہتے ہیں)۔''[4]

لہٰذا اس دن سے ان کا لقب ابوتراب مشہور ہوگیا۔ جب کوئی انھیں ابوتراب کہہ کر پکارتا تو بہت خوش ہوتے۔ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا اپنے تقویٰ، نرم مزاج اور زہد کی وجہ سے نہ صرف اللہ کے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو عزیز تھیں بلکہ اُس مقام پر فائز ہوچکی تھیں کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بھی انھیں ایک قربِ خاص حاصل تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ محنت مزدوری کر کے روزی کماتے تھے۔ ان کی زندگی بہت سادہ انداز میں گزری۔ انھیں دنیا کے مال سے کوئی رغبت نہ تھی اور نہ سامانِ عیش کی کوئی پروا۔ روکھی سوکھی کھا کر اپنے رب کا شکر ادا کرتے تھے۔

---

[1] الدوحة النبوية الشريفة (ص: ٥٧)

[2] مسند أحمد (١١٧٥٦) وقال الأرناؤوط: صحيح لغيره، المستدرك للحاكم (٤٧٣٣) مسند أبي يعلىٰ (١١٦٩)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٧١٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٤٩) سلسلة الأحاديث الصحيحة، رقم الحديث (١٩٩٥)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٠٩)

حضرت علی رضی اللہ عنہ میدانِ جنگ کے شہسوار تھے۔ اپنی دلیری کی بنا پر ''اسد اللہ'' (اللہ کا شیر) کے لقب سے مشہور ہوئے۔ ''حضرت علی رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے:

''لڑائی کے میدان میں مجھے پروا نہیں ہوتی کہ موت میری طرف آرہی ہے یا میں موت کی طرف بڑھ رہا ہوں۔''

غزوۂ اُحد سے فتح مکہ تک حضرت علی رضی اللہ عنہ کا کردار:

غزوۂ اُحد میں لڑائی کی ابتداء حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور طلحہ بن عثمان کے درمیان مقابلہ آرائی سے ہوئی، ثانی الذکر طلحہ کے ہاتھ میں مشرکین کا جھنڈا تھا۔ وہ بار بار للکار رہا تھا، کوئی ہے جو میرے مقابلے پر آئے؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس کے مقابلے کے لیے آئے اور فرمایا: اس اللہ کی قسم! جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، یا تو میری تلوار تمھیں فوراً جہنم رسید کرے گی یا تمھاری تلوار مجھے فوراً جنت پہنچا دے گی۔

اس کی للکار سن کر حضرت علی رضی اللہ عنہ تقریباً دوڑتے ہوئے اس کے سامنے پہنچ گئے۔ ابھی طلحہ سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ تلوار کے ایک ہی وار سے اسے ڈھیر کر دیا۔ طلحہ کی موت کا منظر دیکھ کر اس کا بھائی ابوسعید رہ نہ سکا۔ وہ طیش کے ساتھ میدانِ جنگ میں آیا۔ لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس پر بھی تلوار کا وار کیا، وہ زخمی ہو کر زمین پر گر پڑا اور پھر حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں مارا گیا۔

ان دو بہادروں کی موت دیکھ کر مشرکین بہت بھنائے، ان کے لشکر سے ان کا سب سے بڑا بہادر ''اَرْطَاۃ'' نکلا۔ اسے اپنی بہادری اور طاقت پر بہت گھمنڈ تھا، اس نے للکار کر کہا:

''کوئی ہے جو میرے مقابلے پر آئے۔''

اس کے غرور کا نشہ اتارنے کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ پھر میدان میں اترے اور دیکھتے ہی دیکھتے ''اَرْطَاۃ'' اپنے ہی خون میں نہا کر موت کا شکار ہو گیا۔ اس کے بعد عام لڑائی شروع ہو گئی۔ حضرت علی اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہما کافروں کی صفوں میں یلغار کرتے ہوئے دور تک پہنچ گئے۔ ان کی تلواروں کی کاٹ نے کافروں کے پاؤں اکھاڑ دیے۔ فتح مسلمانوں کے قدم چوم چکی تو پھر درے پر موجود دستے کے اپنی جگہ چھوڑ جانے پر کافروں کو موقع مل گیا۔ وہ اس طرف سے دوبارہ حملہ آور ہو گئے۔ اس اچانک حملے میں بہت سے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم شہید ہو گئے اور مسلمانوں کے پاؤں اکھڑ گئے۔ کافروں نے نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف یلغار کر دی، اس وقت جو چند بہادر صحابہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ میدان میں جم کر کھڑے رہے، ان میں سے

حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ اُس روز حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کئی کافروں کو جہنم واصل کیا۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اس معرکے میں شہید ہو گئے۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں سے بعض کے حوصلے ٹوٹ گئے، ان کے عزائم سرد پڑ گئے۔ ان کی صفیں اتھل پتھل ہو گئیں۔ افواہ پھیل گئی کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے ہیں۔ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جھنڈا حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے سپرد کر دیا۔ انھوں نے خوب جم کر لڑائی کی اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بحفاظت گھاٹی میں پہنچا دیا گیا۔ اس موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ گئے، اور اپنی ڈھال میں پانی بھر کر لائے۔ اس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے کا خون دھویا گیا اور سر پر بھی پانی ڈالا گیا۔[1]

حضرت سہل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: مجھے معلوم ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا زخم کس نے دھویا؟ پانی کس نے بہایا اور علاج کس چیز سے کیا گیا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی لختِ جگر سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا زخم دھو رہی تھیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ ڈھال سے پانی بہا رہے تھے۔ جب سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے دیکھا کہ پانی کے سبب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زخم سے خون کا بہاؤ بڑھتا ہی جا رہا ہے، تو چٹائی کا ایک ٹکڑا لیا اور اسے جلا کر چپکا دیا جس سے خون بہنا بند ہو گیا۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک دانت مبارک شہید ہو گیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مبارک بھی زخمی ہو گیا۔[2]

اس معرکہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شجاعت اور بہادری واضح ہو گئی۔ جب یہ خبر مشہور ہو گئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کر دیا گیا ہے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت ڈھونڈا اور جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ پایا تو یہ خیال کہ اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد زندگی بیکار ہے۔ انھوں نے اپنی تلوار کی نیام توڑ دی اور لوگوں کی طرف لپکے، جب غبار چھٹ گیا تو اللہ کے فضل و کرم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بخیر و عافیت نظر آ گئے۔[3]

انھوں نے نہایت ثابت قدمی اور بہادری سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دفاع کیا۔ اس روز حضرت علی رضی اللہ عنہ کو سولہ زخم لگے۔ جب لڑائی ختم ہو گئی تو مسلمانوں کو اس بات کا علم نہ تھا کہ مشرکین آیندہ کے لیے کیا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس موقع پر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو روانہ کیا اور فرمایا: مشرکین کے پیچھے پیچھے

---

[1] السنن الكبرىٰ للبيهقي (٩/ ١٣١) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٦٦٥)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٠٧٥)

[3] صحيح مسلم مع شرح النووي (١٢/ ١٤٨)

جاؤ اور دیکھو کہ وہ کیا کر رہے ہیں؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے مطابق ان کے پیچھے نکلا تو دیکھا کہ انھوں نے گھوڑے پہلو میں رکھے ہوئے ہیں اور اونٹوں پر سوار ہیں اور ان کا رخ مکے کی جانب ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ غزوہ حمراء الأسد میں:

یہ غزوۂ اُحد کی تکمیل کا غزوہ سمجھا جاتا ہے۔ مسلمان سن تین ہجری میں شوال کی پندرہ تاریخ کو ہفتے کی شام غزوۂ اُحد سے واپس آئے، اگلی صبح لوگ فجر کی نماز کے لیے نکلے۔ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان کرایا کہ دشمن پر حملے کے لیے فوراً تیاری کی جائے اور صرف وہی جنگ کے لیے نکلے جو اُحد میں بھی شریک ہو چکا ہو۔ لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز پر لبیک کہا، حالانکہ وہ زخموں سے چُور اور بہت تھکے ہوئے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب مجاہدین سے آگے تھے۔ لشکر نکل کھڑا ہوا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آگے آگے تھے، جھنڈا حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی اٹھائے ہوئے تھے، انھوں نے اُحد میں بھی جھنڈا اٹھا رکھا تھا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ غزوۂ بنی قریظہ میں:

غزۂ بنی قریظہ میں بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ جھنڈا لہراتے ہوئے سب سے آگے آگے رواں دواں تھے۔

غزوۂ خندق (احزاب) میں:

غزوۂ خندق کے موقع پر جب حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے مشورے سے خندق کھودی گئی تو کافروں نے اسے پار کرنے کی بار بار کوشش کی، لیکن ناکام رہے۔ بالآخر ان کے ایک نامور دلیر عَمرو بن عَبْدِ وُدّ نے وہ خندق پار کر لی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس سے مقابلے کے لیے نکلے۔ عَمرو بن عَبْدِ وُدّ پورے عرب میں بہت بہادر سمجھا جاتا تھا۔ اس کے بارے میں خیال جاتا تھا کہ وہ ایک ہزار سواروں کے برابر ہے۔ اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

''علی، تم بیٹھ جاؤ! ..... یہ عَمرو بن عَبْدِ وُدّ ہے۔''

عَمرو بن عَبْدِوُدّ نے پھر مسلمانوں کو مقابلے کے لیے للکارا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ پھر مقابلے کے لیے بڑھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں پھر روک دیا۔ تیسری بار پھر عَمرو بن عَبْدِوُدّ نے طاقت کے گھمنڈ میں للکارا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ بے قراری سے عرض کرنے لگے:

''اللہ کے رسول ﷺ! میں جانتا ہوں یہ عَمرو بن عَبْدِوُدّ ہے۔ آپ مجھے اس سے مقابلے کی اجازت دیں۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا جذبہ دیکھ کر آپ ﷺ نے انھیں اجازت دے دی۔ دربارِ رسالت سے اجازت پا کر حضرت علی رضی اللہ عنہ جلدی سے میدان میں اترے اور عمرو بن عَبْدِوُدّ کے مقابل ہو کر یوں گویا ہوئے:

''میں نے سنا ہے تم نے لوگوں سے کہہ رکھا ہے کہ جو شخص میرے سامنے تین باتیں پیش کرے تو میں ان میں سے ایک کو منظور کرتا ہوں۔''

اس نے کہا: ''تم نے بالکل ٹھیک سنا ہے۔'' حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: ''تب پھر میں بھی تمھارے سامنے تین باتیں پیش کرتا ہوں۔ پہلی بات یہ ہے کہ تو اسلام قبول کر لے۔'' عَمرو نے انکار کر دیا۔ انھوں نے دوسری بات پیش کی: ''مسلمانوں سے مت لڑ! واپس چلا جا۔'' اس نے اس سے بھی انکار کیا۔ تب سیدنا علی رضی اللہ عنہ للکار کر اور گرج کر بولے: ''تب پھر مجھ سے مقابلہ کر لے۔''

عَمرو بن عَبْدِ وُدّ یہ سن کر ہنس پڑا، اس کی ہنسی حیرت اور طنز سے بھرپور تھی۔ کہنے لگا: ''میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ عرب میں کبھی کوئی مجھ سے لڑنے کی جراَت کرے گا۔'' اتنا کہہ کر وہ اپنے گھوڑے سے نیچے اتر آیا اور کہنے لگا ''تم کون ہو؟'' حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''میرا نام علی بن ابی طالب ہے۔''

''تمھارے والد میرے دوست ہیں۔'' عَمرو بن عَبْدِ وُدّ نے کہا: ''میں تم سے نہیں لڑنا چاہتا۔''
یہ سن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''لیکن اللہ کے دشمن! میں تجھ سے لڑنا چاہتا ہوں۔''

یہ سن کر عَمرو بن عَبْدِ وُدّ بھڑک اٹھا۔ آج تک ایسا نہیں ہوا تھا کہ مقابل اس طرح ڈٹ کر اور للکار کر اس کے سامنے کھڑا رہا ہو۔ اس نے آگے بڑھ کر پوری طاقت کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر تلوار کا وار کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے تلوار کا وار اپنی ڈھال پر روکا لیکن وار اس قدر زبردست تھا کہ تلوار ڈھال کو کاٹتی ہوئی ان کی پیشانی پر زخم لگا گئی۔ وہ زخم کھا کر شیر کی طرح ابنِ عَبْدِوُدّ پر جھپٹے اور اس پر ایسا وار کیا کہ تلوار اس کے کندھے کو کاٹتی ہوئی سینے تک چلی گئی اور وہ وہیں پر ڈھیر ہو گیا۔ ابنِ عَبْدِ وُدّ کے گرتے ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ نے زور سے نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ اپنے بڑے شاہسوار کو یوں کٹتا دیکھ کر دیگر کافر جو خندق عبور کر آئے تھے، اس قدر مرعوب ہوئے کہ الٹے پاؤں بھاگنے لگے۔ ان میں سے ایک کافر عبداللہ بن نوفل خندق میں گر گیا جسے مسلمانوں نے تہِ تیغ کر دیا۔[1]

[1] السيرة النبوية لابن هشام (٣/ ٢٤٨)

صلح حُدَیبیہ کے موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ردِّ عمل:

صلح حُدَیبیہ کے موقع پر جب بیعتِ رضوان ہوئی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی وہیں تھے۔ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خیریت سے واپس آ گئے اور صلح نامہ لکھا جانے لگا تو لکھنے کا فریضہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سپرد کر دیا۔ انھوں نے جب "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" سے آغاز کیا تو قریش کے نمائندے نے اس پر اعتراض کیا اور کہا:

''ہم رحمٰن کو نہیں مانتے، لہٰذا یہ لکھا جائے: ''بِسْمِكَ اللّٰهُمَّ''

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہی لکھ دیا۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''لکھو، یہ وہ شرائط ہیں جو محمد رّسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش سے طے کی ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ الفاظ لکھ دیے۔ قریش کے نمائندے سہیل بن عَمرو نے کہا: ''جب ہم آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اللہ کا رسول نہیں مانتے تو پھر صلح نامے میں یہ کیوں لکھا جائے؟ آپ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بن عبداللہ لکھوایئے۔''

اس اعتراض پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''بے شک میں اللہ کا رسول ہوں، اگر چہ تم جھٹلاؤ لیکن اے علی رضی اللہ عنہ! یہاں لکھ دو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بن عبداللہ۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ حکم سنا تو عرض کی: ''اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! مجھ میں تو ہمت نہیں ہے کہ میں اپنے ہاتھ سے رسول اللہ کا لفظ مٹا دوں۔'' ان کی بات سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے دستِ مبارک سے ''رسول اللہ'' کے الفاظ کاٹ دیے، اس کے بعد باقی معاہدہ تحریر کیا گیا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ غزوۂ خیبر میں:

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ غزوۂ خیبر ہجرت کے ساتویں سال ماہِ محرم میں ہوا۔[1] اس غزوہ میں حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی بہادری کی دھاک بیٹھ گئی اور اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں اور تمام لوگوں کی نگاہ میں ان کا مقام و مرتبہ آشکارا ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے زبردست فوجی اہمیت کی حامل اس یہودی بستی کو فتح کرنے کا اعزاز انہی کو عطا کیا۔ مدینہ منورہ میں یہودی آئے دن مسلمانوں کے خلاف سازشیں

---

[1] تاريخ دمشق (١/ ٣٣)

کرتے رہتے تھے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے انھیں مدینے سے نکال دیا۔ یہودی وہاں سے نکلے تو خیبر جا پہنچے۔ خیبر کی بستی مدینہ طیبہ سے شمال مشرق میں تقریباً ۶۰ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع تھی۔ خیبر یہودیوں کی ایسی بستی تھی جو مضبوط قلعوں اور فوجی چھاؤنی پر مشتمل تھی۔ یہ بستی جزیرۃ العرب میں ان کی آخری پناہ گاہ تھی۔ وہ زندگی اور زمانے کی گردشوں کا جائزہ لے رہے تھے اور مسلمانوں کے خلاف گھات لگائے بیٹھے تھے۔ ان کا ارادہ یہ تھا کہ مدینہ اور بیرونِ مدینہ کے تمام یہودیوں کو ساتھ ملا کر مسلمانوں کے خلاف مدینہ پر یلغار کر دی جائے۔ اس مذموم ارادے کے لیے ان کی سازشیں عروج پر تھیں۔ رسول اللہ ﷺ یہودیوں کے ارادوں سے بے خبر نہیں تھے۔

سب سے پہلے رسول اللہ ﷺ نے خیبر کے قلعوں کی فتح یابی کے لیے جنگ کا اعلان کیا اور ایک ایک کر کے تمام قلعے فتح ہوتے چلے گئے، البتہ غموص کا قلعہ فتح کرنے میں مشکل پیش آئی۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ آشوبِ چشم کا شکار تھے۔[1]

رسول اللہ ﷺ نے ۷ ہجری میں ۱۴۰۰ صحابہ کے ساتھ خیبر کا رخ فرمایا۔ جب وہاں پہنچے تو ارشاد فرمایا: میں کل جھنڈا ایک ایسے آدمی کو دوں گا جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت کرتا ہے اور اللہ اور اس کا رسول ﷺ بھی اس سے محبت کرتے ہیں۔ صبح ہوئی تو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اللہ کے رسول ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ہر ایک کی آرزو تھی کہ جھنڈا اسے ملے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: حضرت علی بن ابی طالب (رضی اللہ عنہ) کہاں ہیں؟ صحابہ نے عرض کی: اللہ کے رسول ﷺ! ان کی آنکھ میں تکلیف ہے۔

ارشاد فرمایا: انھیں بلاؤ۔ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ اللہ کے رسول ﷺ کے پاس حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے ان کی آنکھوں میں لعابِ دہن لگایا اور دعا فرمائی۔ وہ یوں شفایاب ہو گئے، گویا انھیں کوئی تکلیف تھی ہی نہیں، پھر انھیں جھنڈا عطا فرمایا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عرض کی: اے اللہ کے رسول ﷺ! میں اُن سے اس وقت تک لڑتا رہوں گا حتیٰ کہ وہ ہمارے جیسے ہو جائیں؟

ارشاد فرمایا: اطمینان سے جاؤ یہاں تک کہ ان کے میدان میں جا اترو، پھر انھیں اسلام کی دعوت دو اور اسلام میں اللہ کے جو حقوق ان پر واجب ہوتے ہیں ان سے انھیں آگاہ کرو۔ اللہ کی قسم! اگر تمھارے ذریعے اللہ تعالیٰ ایک آدمی کو بھی ہدایت عطا کر دے تو یہ تمھارے لیے سرخ اونٹوں سے بہتر ہے۔[2]

---

[1] المرتضى للندوي (ص: ٥٣) الطبقات لابن سعد (٢/ ١٠٦)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٧٠١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٠٦)

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جھنڈا ہاتھ میں لیا اور تیزی کے ساتھ میدان کی طرف لپکے۔ ان کا رخ قلعہ کی طرف تھا۔ کیوں کہ وہ اپنے محلِ وقوع کی نزاکت اور فوجی حکمتِ عملی کے لحاظ سے یہود کی پہلی دفاعی لائن کی حیثیت رکھتا تھا۔ اور یہیں پر مرحب نامی شہ زوراور جانباز یہودی کا قلعہ تھا جسے ایک ہزار مردوں کے برابر مانا جاتا تھا۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ مسلمانوں کی فوج لے کر اس قلعے کے سامنے پہنچے۔ یہودیوں کو اسلام کی دعوت دی۔ انھوں نے یہ دعوت مسترد کردی اور اپنے لیڈر مرحب کی کمان میں مسلمانوں کے مدِمقابل آ کھڑے ہوئے۔

میدانِ جنگ میں اتر کر پہلے مرحب نے دعوتِ مبارزت دی جس کی کیفیت حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ نے یوں بیان کی ہے کہ جب ہم لوگ خیبر پہنچے تو ان (یہودیوں) کا سردار مرحب اپنی تلوار لے کر ناز وتکبر کے ساتھ آگے بڑھا اور کہا:

"قَدْ عَلِمَتْ خَيْبَرُ أَنِّي مَرْحَب، شَاكِيُ السِّلَاحِ بَطَلٌ مُجَرَّبُ"

''خیبر کو معلوم ہے کہ میں مرحب ہوں۔ ہتھیار پوش، بہادر اور تجربہ کار ہوں۔''

اس کے مقابلے میں حضرت عامر رضی اللہ عنہ آگے بڑھے اور صدا بلند کی:

"قَدْ عَلِمَتْ خَيْبَرُ أَنِّي عَامِرٌ، شَاكِيُ السِّلَاحِ بَطَلٌ مُغَامِر"

''خیبر جانتا ہے کہ میں عامر ہوں۔ ہتھیار پوش، شہ زور اور جنگجو ہوں۔''

دونوں بہادر ایک دوسرے کے مقابل کھڑے ہوئے۔ مرحب کی تلوار حضرت عامر رضی اللہ عنہ کی ڈھال میں جاچبھی اور حضرت عامر رضی اللہ عنہ نے اس پر نیچے سے وار کیا مگر آپ کی تلوار اتنی چھوٹی تھی کہ وار مرحب کو لگنے کے بجائے خود انہی کے گھٹنے پر آلگا۔ اور اتنا سخت تھا کہ بعد میں اسی وار کی وجہ سے حضرت عامر رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے۔ حضرت عامر رضی اللہ عنہ کے بعد مرحب کے مقابلے کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ تشریف لے گئے۔ حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ اُس وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ اشعار کہے: ؎

أَنَا الَّذِيُ سَمَّتْنِيُ أُمِّيُ حَيْدَرَة

كَلَيْثِ غَابَاتٍ كَرِيُهِ الْمَنْظَرَة

أُوُفِيُهُمُ بِالصَّاعِ كَيْلَ السَّنْدَرَة

''میں وہ آدمی ہوں کہ میری ماں نے میرا نام حیدر رکھا ہے، جنگل کے خوفناک شیر کی طرح،

میں انھیں صاع کے ساتھ پورا وزن دیتا ہوں اور بڑے پیمانے پر قتل کیا کرتا ہوں۔''

اس کے بعد مرحب کے سر پر اس زور سے تلوار ماری کہ مرحب وہیں ڈھیر ہو گیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فوج لے کر آگے بڑھے اور قلعے کا بھاری بھرکم دروازہ توڑ کر اندر پہنچ گئے۔ اس طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں یہ قلعہ فتح ہوا۔[1]

جنگ کے دوران حضرت علی رضی اللہ عنہ یہودیوں کے قلعے کے قریب پہنچے تو قلعے کی چوٹی سے ایک یہودی نے جھانک کر پوچھا: تم کون ہو؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: میں علی بن ابی طالب ہوں۔ یہودی نے کہا: اُس کتاب کی قسم جو موسیٰ علیہ السلام پر نازل کی گئی! تم لوگ بلند ہو گے۔[2]

نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کی برکت:

اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا قبول فرمائی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: جب سے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے میری دونوں آنکھوں میں اپنے مقدّس دہن کا لعاب ڈالا ہے، مجھے کبھی آشوبِ چشم کی تکلیف نہیں ہوئی۔[3]

حضرت علی رضی اللہ عنہ غزوۂ حُنین میں:

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے وہ جہادی اعمال جو ان کی بہادری کے عنوان سے موسوم ہیں اور میدانِ قتال میں ان کے ایک ماہر اور تجربہ کار جرنیل ہونے کی گواہی دیتے ہیں، ان میں سے ایک وہ ہے جو ہجرت کے آٹھویں سال غزوۂ حُنین میں واقع ہوا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دیگر مہاجرین و انصار کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں پوری ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا۔ جیشِ ہوازن میں ایک شخص سرخ اونٹ پر سوار تھا۔ اس کے ہاتھ میں کالا جھنڈا تھا، وہ گھات لگائے ہوئے تھا۔ جونہی اس کا داؤ لگتا تھا وہ نیزہ مار دیتا تھا اور جب لوگوں تک رسائی نہ ہو پاتی تو وہ اپنا نیزہ بلند کرتا اور اس کے پیچھے والے اس عمل میں اس کی پیروی کرتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی بصیرت، اعلیٰ حربی صلاحیت اور طویل تجربے کی بنا پر یہ حقیقت فوراً محسوس کر لی کہ ہوازن کی سخت جنگی حالت کا اصل مؤثر عامل یہی آدمی ہے، لہٰذا حضرت علی رضی اللہ عنہ فوراً ایک اور انصاری صحابی کے ساتھ اس آدمی کی طرف لپکے، اسے یک دم اونٹ سے نیچے گرا دیا اور قتل کر ڈالا، پھر چند لمحات ہی گزرے تھے کہ دشمن شکست کھا گیا۔ دشمن کے جرنیل اور عام فوجی سب پیٹھ پھیر کر بھاگ گئے اور مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی۔[4]

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٠٧)

[2] المعجم الكبير للطبراني (٧/ ٣٥) رقم الحديث (٣٦٠٣)

[3] الموسوعة الحديثيه (مسند أحمد) حديث (٥٧٩) یہ حدیث حسن ہے۔

[4] مسند أبي يعلى (٣/ ٣٨٨) اس کی سند حسن ہے۔ الصحيح المسند للعدوي (ص: ١٤١)

بت شکنی کا کارنامہ:

فتح مکہ کے موقع پر نبی کریم ﷺ نے بیت اللہ کو بتوں سے پاک کر دیا تھا۔ اب ضروری تھا کہ وہ مقامات جو قدیم زمانے سے جاہلیت کے نشان تھے، ان کا خاتمہ بھی کیا جائے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے یکے بعد دیگرے جزیرۂ عرب کے تمام علاقوں کو بتوں سے پاک کرنے کے لیے فوجی دستے روانہ کیے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو طَی کے علاقے میں فلس نامی بت مسمار کرنے کا حکم ملا، ربیع الثانی کے مہینے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک فوجی دستہ لے کر طَی کے فلس نامی بت کی طرف روانہ ہوئے۔ اس دستے میں ڈیڑھ سو انصاری مجاہدین شامل تھے، ایک سو مجاہدین اونٹوں پر اور پچاس مجاہدین گھوڑوں پر سوار تھے، ان کے ہاتھ میں سیاہ رنگ کا بڑا جھنڈا اور سفید رنگ کا چھوٹا جھنڈا تھا، انھوں نے مشہور سخی حاتم طائی کی قوم پر فجر کے وقت حملہ کر دیا اور فلس نامی بت کے پرخچے اڑا دیے۔ بہت سے قیدی اور بھیڑ بکریاں ان کے ہاتھ لگیں، ان قیدیوں میں عدی بن حاتم کی بہن بھی تھی۔ عدی شام کی طرف بھاگ گیا۔[1]

غزوۂ تبوک سے رسول اللہ ﷺ کی وفات تک:

ہجرت کے نویں سال رجب میں غزوۂ تبوک پیش آیا۔ سیرتِ نبوی ﷺ میں یہ غزوہ بڑی اہمیت کا حامل ہے، اس سے وہ اہم مقاصد حاصل ہوئے جن کے عربوں اور عام مسلمانوں کے دلوں پر بڑے دور رس اور گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ یہ تاریخِ اسلام کے حالات و حوادث کی ایک اہم گزرگاہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے مدینہ منورہ میں اپنے اہلِ خانہ پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنا جانشین بنایا جبکہ اسی غزوہ کے موقع پر مدینہ کے والی حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ تھے۔ منافقین نے اپنی چھپی ہوئی منافقت اور بُغض کی آگ کو بجھانے کے لیے اس موقع کو غنیمت جانا اور حضرت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں نامناسب باتیں کرنے لگے۔ یہ بری باتیں ان کے نفاق کی واضح علامت تھیں۔ صحیح حدیث میں آتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اُس اللہ کی قسم! جس نے دانے کو پھاڑا اور ہر جاندار کو پیدا کیا، نبیِ اُمّی ﷺ نے ایک مرتبہ مجھ سے نہایت محکم لہجے میں فرمایا تھا:

''مجھ سے محبت صرف وہی شخص کرے گا جو مومن ہوگا اور مجھ سے بُغض وہی رکھے گا جو منافق ہوگا۔''[2]

---

[1] تاريخ الإسلام للذهبي (ص: ٦٢٤)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٧٨) المرتضى للندوي (ص: ٥٥)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس بات سے بہت رنج ہوا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ ہتھیار سجا کر لشکر تک جا پہنچے۔ اور اسلام کے دشمنوں سے مقابلے کے لیے بے تاب ہو گئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انھیں دیکھ کر حیران ہوئے اور آنے کی وجہ دریافت کی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! میں نے شروع سے لے کر آج تک اللہ کی راہ میں لڑنے سے قدم پیچھے نہیں ہٹائے۔ لیکن معلوم نہیں اس دفعہ مجھے جہاد میں شرکت کرنے کی سعادت حاصل کرنے کے بجائے مدینے میں بچوں اور عورتوں کے پاس کیوں چھوڑ دیا گیا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی دلی کیفیت کو محسوس کرتے ہوئے فرمایا:

''علی (رضی اللہ عنہ)! کیا تم اس بات سے راضی نہیں ہو کہ تمھارا میرے ساتھ وہی تعلق ہو جو (حضرت) موسیٰ (علیہ السلام) کا (حضرت) ہارون (علیہ السلام) سے تھا، ہاں البتہ یہ کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔''[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشادِ گرامی کا مطلب تھا کہ جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہ طور پر جاتے وقت حضرت ہارون علیہ السلام کو اپنا قائم مقام بنا گئے تھے، میں نے بھی اسی طرح تمھیں اپنا قائم مقام بنایا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ حضرت ہارون علیہ السلام نبی بھی تھے، جب کہ تم نبی نہیں ہو سکتے، اس لیے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس بات نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو نہ صرف مطمئن کر دیا بلکہ ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ انھوں نے مدینے کا رخ کیا اور اپنی ذمے داری اسی طرح نبھانے لگے جس طرح ان پر عائد کی گئی تھی۔ فتح مکہ کے تاریخی موقع پر بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھے۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتوں کو توڑنا شروع کیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی ہاتھ بٹایا۔ تانبے کا ایک بہت بڑا بت وہاں بہت اونچائی پر نصب تھا اور لوہے کی ایک سلاخ کے ساتھ زمین میں گڑا ہوا تھا۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بت کو گرانے کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنے کندھے پر سہارا دے کر اس بت کو گرانے کا حکم دیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پہلے اس بت کو گرایا پھر اسے کعبے سے باہر پھینک دیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوۂ تبوک کے علاوہ تمام غزوات میں شرکت کی اور بہادری کے ایسے جوہر دکھائے کہ اگر الگ سے ان کی داستان قلم بند کی جائے تو نہ جانے کتنے صفحات درکار ہوں۔ لشکرِ اسلام کا جھنڈا عموماً حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ غزوۂ تبوک میں چونکہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں مدینہ میں اپنا نائب مقرر کیا تھا، اس لیے آپ اس غزوہ میں شرکت نہ کر سکے۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٤٥٤)

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بے حد محبت کرتے تھے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ اقدس سے نکلنے والی ہر بات کو برحق سمجھتے تھے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے اس حالت میں رخصت ہوئے کہ وہ اپنے چچیرے بھائی اور داماد حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے بے حد خوش اور راضی تھے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ حج میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا کردار:

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں معاشرے کی تربیت اور ریاست کی تعمیر کا عمل، عقیدہ، اقتصادیات، معاشرت، سیاست، عسکریت اور عبادت سمیت تمام شعبوں میں جاری رہا۔ پچھلے کئی برس سے فریضۂ حج ادا نہیں ہو سکا تھا۔ فتح مکہ کے بعد سن آٹھ ہجری کے حج کی ذمہ داری حضرت عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ پر آئی، اس وقت تک مسلمانوں اور مشرکین کے حج میں کوئی فرق نہیں تھا۔

سن نو ہجری میں موسمِ حج آیا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی حج کا ارادہ کیا لیکن فرمایا: بیت اللہ میں مشرکین ننگے طواف کریں گے، میں اس مرتبہ حج پر جانا نہیں چاہتا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ صحابہ کی بہت بڑی تعداد کے ساتھ سفرِ حج پر روانہ ہوئے۔ اور اپنے ساتھ قربانی کے جانور بھی لے گئے۔[2]

جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ حُجاج کے قافلے کے ساتھ روانہ ہوئے تو سورت براءت (التوبہ) نازل ہوئی۔ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بلایا اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے جا ملنے کا حکم دیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی عضباء پر روانہ ہوئے اور ذوالحلیفہ کے مقام پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے جا ملے۔ حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نے انھیں دیکھا تو فرمایا: کیا آپ امیر کی حیثیت سے آئے ہیں؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: نہیں، امیر آپ ہی ہیں۔ پھر ان دونوں نے سفر جاری رکھا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے لوگوں کے لیے انہی مقامات کو قائم رکھا جو جاہلیت میں حج کے مقامات تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے یومِ ترویہ (۸ ذوالحج) سے پہلے، عرفہ کے دن اور قربانی کے دن خطبے ارشاد فرمائے۔

حاجیوں کے پہلے دن، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ لوگوں کو ان کے وقوف، افاضہ، قربانی اور جمرات کی رمی کے مناسک وغیرہ سکھا رہے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہر مقام پر ان کے ساتھ تھے۔ وہ لوگوں کو سورت براءت (التوبہ) کی ابتدائی آیات سنا رہے تھے، بعد ازاں لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے چار امور کا اعلان فرمایا:

---

[1] السيرة النبوية لأبي شهبه (٢/ ٥٣٦) ودراسات في عهد النبوة (ص: ٢٢)

[2] فتح الباري (٨/ ٨٢) نضرة النعيم (١/ ٩٨) و الطبقات الكبرى (٢/ ١٦٨)

- جنت میں صرف مومن ہی داخل ہوگا۔
- آیندہ کوئی شخص برہنہ حالت میں بیت اللہ کا طواف نہیں کر سکے گا۔
- نبی اکرم ﷺ کا اگر کسی سے کوئی معاہدہ ہے تو وہ مدت مکمل ہونے ہی پر ختم ہوگا۔
- اس سال کے بعد مشرکین اور مسلمان اکٹھے حج نہیں کریں گے۔[1]

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے صحابہ کی ایک جماعت کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقصد میں ان کی مدد کرنے کا حکم دیا۔ سورت براءت (التوبہ) کی ابتدائی آیات کا نزول، بت پرستوں اور ان کے پیروکاروں کے ساتھ فیصلہ کن جدائی کا اعلان ہے۔ ان کے ساتھ حج کی ممانعت کر دی گئی اور ان کے خلاف جنگ کا اعلان ہوگیا۔[2]

فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝١ فَسِيْحُوْا فِي الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِي الْكٰفِرِيْنَ ۝٢ وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِيْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ وَرَسُوْلُهٗ ۚ فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ ۗ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴾ [التوبة:١-٣]

''اعلانِ براءت ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ان مشرکین سے جن سے تم نے معاہدے کیے تھے، پس اب تم لوگ ملک میں چار مہینے اور چل پھر لو اور جان رکھو کہ تم اللہ کے قابو سے باہر نہیں جا سکتے اور اللہ منکرینِ حق کو رسوا کر کے رہے گا۔ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے حجِ اکبر کے دن تمام لوگوں میں منادی ہے کہ اللہ اور اس کا رسول مشرکین سے بریٔ الذّمہ ہیں۔ اب اگر تم لوگ توبہ کر لو تو یہ تمھارے حق میں بہتر ہے اور اگر روگردانی کرو گے تو خوب سمجھ لو کہ تم اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے اور اے نبی! کافروں کو عذاب کی خبر پہنچا دو۔''

پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو جن سے معاہدہ ہوا ہے، ان کے معاہدے کی مقررہ مدت پوری ہونے تک مہلت دی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

---

[1] الموسوعة الحديثيه (مسند إمام أحمد)، رقم الحديث (٥٩٤) یہ حدیث صحیح ہے۔

[2] السيرة النبوية لأبي شهبه (٢/ ٥٣٧) نضرة النعيم (١/ ٣٩٩)

﴿ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْـًٔا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ﴾ [التوبة: ٤]

''وہ مشرکین اس سے مستثنیٰ ہیں جن سے تم نے معاہدہ کیا اور پھر انھوں نے اس میں تم سے کوئی خیانت کی نہ تمھارے خلاف کسی کی مدد کی، تو ان کے معاہدے ان کی مقررہ مدت تک پورے کرو۔ بے شک اللہ (نقضِ عہد سے) بچنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔''

نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے موسمِ حج میں مشرکین کے سامنے معاہدے ختم کرنے کے اعلان کی ذمہ داری حضرت علی رضی اللہ عنہ کو سونپی اور اس بات کا خیال رکھا گیا کہ عربوں کے ہاں معاہدے کرنے یا معاہدے توڑنے کے لیے یہی طریقہ متعارف تھا۔ یہ کام یا تو قبیلے کا سردار یا اس کے قبیلے کا کوئی ذمہ دار فرد سرانجام دے۔ یہ طریقہ اسلام کے منافی نہیں ہے، اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۂ توبہ کی ابتدائی آیات کے نزول کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ ذمہ داری دے کر بھیجا۔

اس سلسلے میں رافضی لوگوں کا یہ دعویٰ غلط ہے کہ اس واقعہ سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بجائے حضرت علی رضی اللہ عنہ خلافت کے زیادہ حق دار ہیں۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد ابوشہبہ نے کہا ہے: میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ انھوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے اس سوال پر کیوں توجہ نہیں دی کہ انھوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پہلا سوال ہی یہ کیا تھا کہ آپ بطورِ امیر آئے ہیں یا بطورِ مامور؟ اس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ امیر آپ ہی ہیں، میں مامور ہوں۔ اور مامور، امیر کے مقابلے میں خلافت کا زیادہ حق دار کیسے ہوسکتا ہے؟[1]

یہ حج، دراصل حجۃ الوداع کے لیے بطورِ تمہید تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی قیادت میں حج میں یہ اعلان ہوا کہ اب بت پرستی کا دَور ختم ہوا۔ اب نیا دَور آگیا ہے اور زندگی کے نئے مراحل شروع ہو گئے ہیں۔ اور بت پرستی کا دَور تاریخ کے کباڑ خانے میں جاپڑا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قبائل نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنے وفود بھیجنے شروع کیے اور وہ توحید اور اسلام کے دائرہ میں داخل ہونے لگے۔[2]

[1] السيرة النبوية لأبي شهبة (٢/ ٥٤٠) صحيح السيرة (ص: ٦٢٤)

[2] قراءة سياسية للسيرة النبوية (ص: ٢٨٣)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بحیثیت داعی تقرر:

فتح مکہ کے بعد جزیرۂ عرب کے بہت سے قبائل نے اسلام کی آواز پر لبیک کہا اور جو قبائل اس طرف متوجہ نہیں ہوئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف داعیانِ اسلام روانہ فرمائے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یمن میں ہمدان کی طرف بھیجا۔ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ یمن کی طرف جانے کا واقعہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں: ہم یمن کے علاقوں کے قریب پہنچے۔ لوگوں کو ہمارے آنے کی اطلاع ہوگئی۔ وہ جمع ہو گئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ہمیں فجر کی نماز پڑھائی۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو ہم سیدھے ایک ہی صف میں بیٹھ گئے، حضرت علی رضی اللہ عنہ آگے بڑھے۔ انھوں نے اللہ کی حمد وثناء بیان کی، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام پڑھ کر سنایا۔ ہمدان قبیلے کے تمام افراد ایک ہی دن میں مسلمان ہو گئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس صورتِ حال کی پوری رپورٹ ایک خط میں لکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ارسال کردی۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس خط کی تفصیلات معلوم ہوئیں تو اللہ کے حضور سجدے میں گر گئے اور دعا کی: ہمدان پر سلامتی ہو! ہمدان پر سلامتی ہو۔[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ حجۃ الوداع میں:

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے ساری زندگی اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت میں گزاری۔ حجۃ الوداع کے موقع پر سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے قربانی کے لیے اونٹ لانے کی غرض سے یمن بھیجا۔ آپ وہاں سے اونٹ لے کر آئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دستِ مبارک سے ۶۳ اونٹ ذبح کیے، یہ تعداد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر کے برسوں کی تعداد ہے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم رک گئے۔ اور باقی اونٹ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سپرد کیے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بقیہ ۳۷ اونٹ ذبح کیے۔[2]

اس طرح اس موقع پر ۱۰۰ اونٹ قربان کیے گئے۔ بلاشبہ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اعزاز تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو غسل دینے کی سعادت:

اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ایک اور شرف سے نوازا گیا، وہ یہ کہ جب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کپڑوں سمیت غسل دیا گیا جن شخصیات کو غسل دینے اور قبر میں اتارنے کا شرف حاصل ہوا، ان میں حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔[3]

---

[1] زاد المعاد (٣/ ٦٢٢) اس کی سند صحیح ہے۔

[2] صحیح مسلم، الحج، رقم الحدیث (١٢٨١)

[3] المستدرك للحاكم (١/ ٣٦١) مسند أحمد (٢/ ٩) رقم الحديث (٥٦٧)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافتِ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پر بیعت:

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت تاخیر سے کی، اس حوالے سے بہت سی باتیں کہی جاتی ہیں۔ اسی طرح حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کے متعلق بھی بحث کی جاتی ہے۔ ایسی تمام باتیں غلط ہیں۔ وہ روایات جن کی سند صحیح ہے، ان سے معلوم ہوتا ہے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ دونوں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت اولین مرحلے ہی میں کر لی تھی۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی، انصار قبیلہ کے خطیب کھڑے ہو گئے .... اس گفتگو میں انھوں نے سقیفہ بنی ساعدہ میں ہونے والی بیعت کا ذکر کیا ہے۔[1]

پھر فرماتے ہیں: جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، منبر پر بیٹھے اور لوگوں پر نگاہ دوڑائی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نظر نہیں آئے۔ ان کے بارے میں پوچھا، انصار کے کچھ لوگ انھیں بلا لائے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد بھائی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد! کیا آپ مسلمانوں کے اتحاد کو ختم کرنا چاہتے ہیں؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اے خلیفۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپ پر کوئی ملامت نہیں، پھر انھوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کر لی، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے دوبارہ نظر دوڑائی تو آپ کو حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ بھی نظر نہیں آئے، انھیں بلوایا، صحابہ انھیں لے آئے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پھوپھی زاد بھائی اور حواری! کیا آپ وحدتِ امت کو خراب کرنا چاہتے ہیں؟ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اے خلیفۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کوئی ملامت کی بات نہیں ہے۔'' اس طرح انھوں نے بھی آپ کی بیعت کر لی۔[2]

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی اس صحیح حدیث کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ امام مسلم جن کی الجامع الصحیح صحیح بخاری کے بعد تمام کتبِ احادیث میں صحیح ترین سمجھی جاتی ہے، وہ اپنے شیخ امام محمد بن اسحاق ابن خزیمہ، صحیح ابن خزیمہ کے مؤلف کے پاس گئے۔ ان سے اس حدیث کے بارے میں پوچھا، امام ابن خزیمہ نے ان کو یہ حدیث لکھ کر دی اور پڑھ کر بھی سنائی۔ امام ابن خزیمہ سے کہنے لگے: ''یہ

---

[1] مجمع الزوائد للهيثمي (٥/ ١٨٣) اس حدیث کے راوی کتبِ صحاح کے راوی ہیں۔ البداية و النهاية (٥/ ٢٨١) امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس حدیث کی سند کو صحیح اور محفوظ کہا ہے۔

[2] المستدرك للحاكم (٣/ ٧٦) السنن الكبرىٰ للبيهقي (٨/ ١٤٣) صحیح اسناد کے ساتھ۔

حدیث، قربانی کے نہایت قیمتی جانور کے برابر ہے۔''

امام ابن خزیمہ نے کہا: ''یہ صرف قربانی کے قیمتی جانور کے مساوی نہیں بلکہ یہ تو بہت بڑے قیمتی خزانے سے بھی بڑھ کر گراں مایہ ہے۔''

امام ابن کثیر نے اس حدیث پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا ہے: اس حدیث کی سند صحیح اور محفوظ ہے۔ اس میں بڑے اہم نکات ہیں۔ وہ یہ کہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے پہلے یا دوسرے دن بیعت کر لی تھی۔ یہی بات حق اور سچ ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کسی وقت بھی جدا نہیں ہوئے۔ ان کی اقتداء میں نماز پڑھتے رہے اور کبھی پیچھے نہیں رہے۔[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو مقدّم رکھنا:

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی فضلیت اور تقدیم کے حوالے سے تواتر کے ساتھ ثابت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیان کردہ احادیث یہ ہیں:

- حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا: ''کیا میں تمھیں نہ بتاؤں کہ اس امت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے بہتر شخص کون ہیں؟ وہ (حضرت) ابوبکر (رضی اللہ عنہ) ہیں۔'' پھر فرمایا: ''کیا میں تمھیں نہ بتاؤں کہ (حضرت) ابوبکر (رضی اللہ عنہ) کے بعد سب سے بہتر شخص کون ہیں؟ وہ (حضرت) عمر (رضی اللہ عنہ) ہیں۔''[2]
- حضرت ابو وائل شقیق بن سلمہ رحمہ اللہ کہتے ہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا: کیا آپ اپنے بعد کسی خلیفہ کا تعیّن نہیں کریں گے؟ انھوں نے فرمایا: ''نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو خلیفہ نہیں بنایا تو میں کیوں بناؤں؟ اگر اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے ساتھ خیر کا ارادہ کیا ہے تو انھیں میرے بعد بھی خیر پر اکٹھا رکھے گا جس طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد انھیں خیر پر جمع کیا تھا۔''[3]
- حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ سے کہا: ''ہم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خلافت کا اہل پایا ہے۔''[4]

---

[1] البداية و النهاية (٥/ ٢٣٩)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٦٧١)

[3] المستدرك للحاكم (٣/ ٧٩) اس کی سند صحیح ہے۔

[4] المستدرك للحاكم، و صححه ووافقه الذهبي والمزي في ترتيب الكمال.

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے فضائل و مکارم پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی گواہی:

یحییٰ بن حکیم بن سعد سے روایت ہے کہ میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے سنا، وہ فرما رہے تھے:

''اللہ کی قسم! حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا لقب، صدیق آسمان سے نازل ہوا۔''[1]

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اقتداء میں ادائے نماز:

حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت پر نہ صرف راضی تھے بلکہ ان کے ساتھ تمام معاملات اور فیصلوں میں بھی شریک ہوتے تھے۔ ان کی طرف سے ملنے والے تحائف قبول فرماتے تھے، ان کے پاس شکایات لے کر جاتے تھے، ان کی اقتداء میں نمازیں ادا کرتے تھے، ان سے محبت کرتے تھے اور ان سے بُغض رکھنے والوں کے ساتھ بُغض رکھتے تھے۔[2]

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اور میراثِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: (حضرت) فاطمہ رضی اللہ عنہا اور (حضرت) عباس (رضی اللہ عنہ) دونوں (حضرت) ابوبکر (رضی اللہ عنہ) کے پاس آئے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اپنا حقِ وراثت طلب کر رہے تھے، انھوں نے فَدَک کی زمین اور خیبر سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حصہ مانگا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان دونوں سے کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے:

«لَا نُوْرِثُ مَا تَرَكْنَا صَدَقَةٌ، اِنَّمَا يَاْكُلُ آلُ مُحَمَّدٍ مِنْ هٰذَا الْمَالِ»[3]

''ہمارا ورثہ تقسیم نہیں ہوتا، ہم نے جو ترکہ چھوڑا ہے وہ اللہ کی راہ میں صدقہ ہے۔ افادۂ عام کے اسی اثاثے سے آلِ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی کھائے گی۔''

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ''جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن نے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجنے کا ارادہ کیا تاکہ وہ ان سے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ترکے سے اپنا حقِ وراثت طلب کریں، اسی دوران میں نے ان سے کہا: کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا: ''ہمارے مال کا کوئی وارث نہیں ہے ہم جو ترکہ چھوڑیں وہ صدقہ ہے۔''[4]

---

[1] المعجم الكبير للطبراني (١/ ٥٥) امام ابن حجر رحمہ اللہ نے "فتح الباري" میں اس کے راویوں کو ثقہ بتایا ہے۔

[2] الشيعة و أهل البيت للشيخ العلّامة إحسان الٰهى ظهير (ص: ٦٩)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٧٢٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٦١)

[4] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٥٩)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میرے وارث آپس میں دینار تقسیم نہیں کریں گے۔ میں اپنی ازواج کے نان ونفقے اور اپنے عامل کے خرچے کے بعد جو کچھ چھوڑ جاؤں وہ صدقہ ہے۔''[1]

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان پر عمل کرتے ہوئے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ بھی یہی معاملہ کیا۔ اسی لیے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح جو عمل سرانجام دے رہے تھے، میں بھی ٹھیک اسی طرح کروں گا اور اسے ہرگز ترک نہیں کروں گا۔[2] پھر فرمایا: ''اللہ کی قسم! میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو کچھ کرتے ہوئے دیکھا ہے میں وہی کروں گا۔''[3]

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جب مذکورہ حدیث بطورِ دلیل پیش کی تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اس معاملے سے دستبردار ہوگئیں۔ اس سے یہ دلیل ملتی ہے کہ انھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کو حق سمجھتے ہوئے بسر وچشم قبول کر لیا۔ ابن قتیبہ کہتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی میراث کے حوالے سے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے جو مطالبہ تھا اس سلسلے میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے جواب کے بعد حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو کوئی شکایت نہیں رہی، کیوں کہ وہ میراث کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے آگاہ نہیں تھیں۔ انھیں محض یہ خیال ہوا کہ جس طرح ہر اولاد اپنے والدین کی وارث ہوتی ہے اسی طرح وہ بھی ہوں گی لیکن جب انھیں اصل حقیقت معلوم ہوگئی تو انھوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا فیصلہ تسلیم کر لیا۔[4]

رافضیوں نے میراثِ نبوت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں حق اور سچ سے روگردانی اختیار کی ہے اور بے حد غلو سے کام لیا ہے۔ انھوں نے اس بارے میں وارد صحیح نصوص سے تجاہلِ عارفانہ کا رویہ اختیار کیا ہے اور وہ انھیں اہلِ بیت اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان اختلاف کی بنیاد تصوّر کرتے ہوئے انھیں امرِ خلافت تک کھینچ لاتے ہیں۔ انھوں نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم پر یہ تہمت لگائی کہ انھوں نے آلِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ظلم وستم ڈھائے۔ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما پر خاص طور پر الزام لگایا ہے کہ ان دونوں نے اہلِ بیت سے خلافت چھینی ہے اور اس الزام پر مزید اضافہ یہ کہ کہ انھوں نے آلِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی املاک اوران کے مالی

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٧٧٦)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٥٨)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٧٢٦)

[4] تأويل مختلف الحديث لابن قتيبه (ص: ١٩)

حقوق بھی غصب کیے۔ رافضی بزعمِ خویش فدَک کے مسئلے اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو ان کی وراثت سے محروم کرنے کے معاملے کو اُن اہم ترین مسائل میں شمار کرتے ہیں جن پر بقول ان کے صحابۂ کرام حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کی خلافت پر (نعوذ باللہ) غاصبانہ قبضہ کے بعد متفق ہو گئے تھے۔

اس مسئلے میں کتبِ رافضیہ پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُس حدیث سے انکاری ہیں جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:

''ہم انبیاء کا کوئی وارث نہیں ہوتا، جو ترکہ ہم چھوڑ جائیں وہ صدقہ ہے۔''[1]

روافض کے دعووں کا جواب:

روافض کا یہ دعویٰ کہ مذکورہ حدیث حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی من گھڑت ہے، اس بارے میں ابن المطہر الحلی کہتا ہے: حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیان کردہ حدیث: «مَا تَرَكْنَاهُ صَدَقَةٌ» کو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے قبول نہیں کیا کیوں کہ یہ من گھڑت ہے۔ مزید برآں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اس حدیث کی روایت میں منفرد ہیں۔[2]

المجلسی نے لکھا ہے کہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما نے فدَک کا مال خود لے لیا تھا، اسی لیے انھوں نے «نَحْنُ مَعَاشِرَ الْأَنْبِيَاءِ لَانُوْرِثُ مَا تَرَكْنَا صَدَقَةٌ» والی روایت ۔نعوذ باللہ۔ خود وضع کر کے بیان کر دی۔[3]

خمینی کہتا ہے: ''ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آلِ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی (نعوذ باللہ) بیخ کنی کے لیے یہ حدیث وضع کی گئی ہے۔''

علمائے حق نے اس دعویٰ کا یہ جواب دیا ہے کہ یہ ساری باتیں یکسر جھوٹ اور افتراء پر دازی ہیں، کیونکہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اس روایت کو بیان کرنے میں منفرد نہیں ہیں بلکہ حضرت عمر، عثمان، علی، طلحہ، زبیر، سعد، عبد الرحمٰن بن عوف، عباس بن عبد المطلب، ابو ہریرہ اور حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہم ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن نے بھی اس حدیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو روایت کیا ہے۔[4]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٧٥٨)

[2] منهاج الكرامه للحلي (٤/ ١٩٣)

[3] حق اليقين للحلي (ص: ١٩١) بحواله العقيدة في أهل البيت للدكتور سليمان بن سالم السحيمي (ص: ٤٤٣)

[4] العقيدة في أهل البيت (ص: ٤٤٤) منهاج السنه لابن تيمية (٤/ ١٩٩)

امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے حدیث کے تمام راویوں کا حوالہ دے کر فرمایا ہے کہ اس حوالے سے رافضیوں کا دعویٰ سفید جھوٹ ہے۔ اگر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اس روایت کے منفرد راوی ہوتے تو بھی تمام اہلِ زمین پر ان کی روایت قبول کرنا اور اسے تسلیم کرنا لازم آتا ہے۔[1]

سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے خوش تھیں:

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے یہ بات ثابت ہے کہ وہ بعد ازاں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے راضی ہو گئی تھیں اور بوقتِ وفات بھی وہ ان سے راضی تھیں۔ امام بیہقی نے اپنی سند کے ساتھ حضرت شعبی رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے، انھوں نے فرمایا: جب حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بیمار ہوئیں، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ان کے گھر تشریف لائے اور ان سے اندر آنے کی اجازت طلب کی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''فاطمہ (حضرت) ابوبکر (رضی اللہ عنہ) تشریف لائے ہیں اور اندر آنے کی اجازت مانگ رہے ہیں، انھوں نے اپنے شوہرِ عالی قدر سے پوچھا: ''کیا آپ کو پسند ہے کہ میں انھیں اجازت دے دوں۔'' انھوں نے فرمایا: ''جی ہاں! بالکل پسند ہے'' چنانچہ انھوں نے اجازت دے دی۔ اب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اندر داخل ہوئے۔ ان کی رضا جوئی چاہی اور فرمایا: ''میں نے ہجرت کی، گھر بار، مال و دولت، اہل وعیال اور خاندان کو چھوڑا، یہ سب کچھ میں نے صرف اللہ کی خوشنودی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم جیسے مقدس اہلِ بیت کی خوشنودی کے لیے چھوڑا۔'' حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو راضی کرتے رہے حتیٰ کہ وہ راضی ہو گئیں اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے نہایت احترام سے کہا: ہم آپ کے حسنِ سلوک سے راضی اور خوش ہیں۔[1]

امام بیہقی رحمہ اللہ نے اس روایت کو مرسل بیان کیا ہے۔ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس حدیث کی سند جید اور قوی ہے۔ بظاہر لگتا ہے کہ حضرت عامر الشعبی رحمہ اللہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یا اس شخص سے روایت کیا جس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ اس سے رافضیوں کی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے خلاف عیب جوئی کی بنیاد ختم ہو جاتی ہے۔

اگر سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا شروع میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے ناراض ہوئی بھی تھیں تو بعد میں انھیں کوئی گلہ نہ رہا اور اپنی خوشنودی ظاہر فرما دی۔ اور بوقتِ وفات بھی وہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے راضی تھیں۔ جو بھی

[1] البداية والنهاية (٥/ ٢٥٠)

[2] السنن الكبرىٰ للبيهقي (٦/ ٣٠١)

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے اپنی عقیدت و محبت میں سچا ہے، اسے لازماً اس شخصیت سے بھی راضی ہو جانا چاہیے جس سے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اپنی خوشنودی ظاہر کر دی تھی۔[1]

سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے باہمی احترام، مضبوط تعلق اور گہری ہمدردی کی سب سے وزنی دلیل یہ ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اہلیہ حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا ہی مرضِ وفات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی تیمارداری کر رہی تھیں۔ وہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے آخری سانس تک ان کے ساتھ رہیں، ان کے غسل اور تجہیز و تکفین میں شریک رہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ خود شام و سحر اُن کی تیمارداری میں لگے رہے۔ اور حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا اس سلسلے میں ان کی مدد کرتی رہیں۔ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اپنی تجہیز و تکفین کے حوالے سے حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا کو کچھ وصیتیں فرمائیں، جن پر حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے پورا پورا عمل کیا۔[2]

جس دن حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا رحلت فرما گئیں، اس دن لوگ اسی طرح رنج و غم میں ڈوب گئے جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر شدید صدمے کا شکار ہوئے تھے۔ حضرت ابوبکر و حضرت عمر رضی اللہ عنہما حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس تعزیت کے لیے آئے۔ انھوں نے کہا: ”اے ابوالحسن! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی کے جنازے میں جلدی نہ کیجیے گا، تاکہ ہمیں شرکت کی سعادت نصیب ہو جائے۔“[3]

ان کی وفات تین رمضان سن گیارہ ہجری کو منگل کی رات ہوئی۔ حضرت زین العابدین علی رحمہ اللہ بن الحسین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی وفات مغرب اور عشاء کے درمیان ہوئی۔ جنازہ میں حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت زبیر اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہم سبھی شریک ہوئے۔ صحیح مسلم کی روایت میں ہے کہ ان کی نمازِ جنازہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خود پڑھائی۔ یہی روایت راجح ہے۔[4]

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور اہلِ بیت رضی اللہ عنہم کے قابلِ رشک تعلقات:

خلیفۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا اہلِ بیت کے افراد کے ساتھ مخلصانہ، محبت بھرا اور قدر افزائی

[1] البداية و النهاية (٥/ ٢٥٣) و الانتصار للصحب و الآل للدكتور إبراهيم الرحيل (ص: ٤٣٤)

[2] الشيعة و أهل البيت للأستاذ العلّامة إحسان الٰهى ظهير (ص: ٧٧)

[3] الشيعة و أهل البيت للأستاذ العلّامة إحسان الٰهى ظهير (ص: ٧٧) و كتاب اسرار آل محمد ﷺ سليم بن قيس (ص: ٢٥٥)

[4] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٥٩)

کا ایسا تعلق تھا جو ان کے شایانِ شان تھا۔ محبت اور اعتماد کا یہ رشتہ اتنا مضبوط تھا کہ اس میں تھوڑی سی بھی دوری یا اختلاف نہیں تھا۔ اگرچہ قصے کہانیاں گھڑنے والوں نے اپنے طور پر تانے بانے بننے کی بہت کوشش کی مگر منہ کی کھائی۔ حضرت عائشہ بنت الصدیق رضی اللہ عنہما نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجۂ محترمہ تھیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے زیادہ محبوب تھیں۔ یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ وہ طاہرہ اور مطہرہ تھیں۔ منکرین چاہے کتنا ہی انکار کریں، قرآن سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی عظمت کی گواہی دے رہا ہے۔ حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حقیقی بھائی حضرت جعفر طیّار بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی زوجہ تھیں، وہ شہید ہو گئے تو حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نے ان سے شادی کی، ان سے ایک بیٹا ہوا، اس کا نام محمد رحمہ اللہ رکھا گیا۔ وہ مصر کے گورنر مقرر ہوئے جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ وفات پا گئے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت اسماء رضی اللہ عنہا سے شادی کی، ان سے ایک بیٹا ہوا، اس کا نام یحییٰ رحمہ اللہ رکھا گیا۔[1]

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی پوتی کا نکاح حضرت محمد الباقر رحمہ اللہ سے ہوا۔ وہ روافض کے ہاں پانچویں امام اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پوتے ہیں۔ الاستاذ علّامہ احسان الٰہی ظہیر رحمہ اللہ نے خود روافض کی کتابوں سے متعدد ش اقتباسات نقل کیے ہیں۔ جن سے ثابت ہوتا ہے کہ بیتِ نبوت اور بیتِ صدیق رضی اللہ عنہ کے درمیان رشتہ داری کا بڑا قریبی اور مضبوط تعلق تھا۔ انھوں نے ثابت کیا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پوتے حضرت قاسم رحمہ اللہ بن محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہما اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پوتے علی رحمہ اللہ بن الحسین بن علی رضی اللہ عنہم بن ابی طالب، دونوں خالہ زاد بھائی تھے۔ قاسم رحمہ اللہ بن محمد رضی اللہ عنہ کی ماں اور علی رحمہ اللہ بن الحسین رضی اللہ عنہ کی مائیں دونوں یزدگرد بن شہریار بن کسریٰ کی بیٹیاں ہیں۔ وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دَور میں ایران سے گرفتار شدہ خواتین کے ساتھ آئی تھیں۔ علّامہ الشیخ احسان الٰہی ظہیر رحمہ اللہ نے اہلِ بیت رضی اللہ عنہم اور بیت الصدیق رضی اللہ عنہ کے درمیان محبت و مودّت کے تعلقات اور باہمی احترام کے جذبات و احساسات کو بڑے مدلل انداز میں خوب کھول کر بیان کیا ہے۔[1]

ان دونوں خاندانوں کی باہمی محبت و شیفتگی کا یہ حال تھا کہ اہلِ بیت نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے محبت کی بنا پر اپنے بیٹوں کے نام ابوبکر رضی اللہ عنہ رکھے۔ ان میں سر فہرست حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ہیں، انھوں نے

[1] خلافة علي بن أبي طالب، ترتيب و تهذيب البداية و النهاية للسلمي (ص: ٢٢)

[2] الشيعة و أهل البيت (ص: ٧٨ـ ٨٣)

اپنے ایک بیٹے کا نام ابوبکر رضی اللہ عنہ رکھا۔ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جانب سے حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کے لیے محبت و اخوت اور قدر شناسی کے جذبات کی بڑی بھاری دلیل ہے۔ خاص طور پر قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس بیٹے کی ولادت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے خلافت منصبِ و امامت پر متمکن ہونے کے بعد ہوئی بلکہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد ہوئی جیسا کہ کتبِ تاریخ سے عیاں ہے۔ کیا آج شیعہ حضرات میں سے وہ لوگ جو حضرت علی رضی اللہ عنہ اور اولادِ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے محبت کے دعویدار ہیں اپنے بچوں کا یہ مبارک نام رکھتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ نہیں رکھتے، تو اس صورت میں وہ اہلِ بیت سے محبت کرنے والے ہیں یا ان کے مخالف ہیں؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے صاحبزادے کا یہ نام حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے اظہارِ محبت کے لیے رکھا، نیز حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد ان سے وفاداری کی علامت کے لیے رکھا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پہلے بنو ہاشم میں کوئی ایسا فرد موجود نہیں جس نے اپنے بیٹے کا نام حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے نام پر رکھا ہو، پھر یہ صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی پر موقوف نہ رہا کہ انھوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے محبت و یگانگت کا ثبوت دیا ہو بلکہ اُن کے بعد ان کے مایۂ ناز صاحبزادے بھی اسی راہ پر چلے۔ حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما دونوں نے اپنے ایک ایک بیٹے کا نام ابوبکر رحمہ اللہ رکھا۔ یہ بات یعقوبی اور مسعودی نے بڑی وضاحت سے لکھی ہے اور یہ دونوں روافض کے مؤرخین میں شمار ہوتے ہیں۔[1]

اہلِ بیت رضی اللہ عنہم نے نسل در نسل اپنے بیٹوں کا نام ابوبکر رکھنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بھتیجے حضرت عبداللہ بن جعفر طیار رضی اللہ عنہما نے اپنے ایک بیٹے کا نام ابوبکر رکھا۔ یہ ان دونوں خاندانوں کے درمیان محبت و مودّت کی بہت بڑی پہچان ہے۔ کیا یہ بات روافض کے ان دعوؤں کی کھلی تردید نہیں کرتی کہ ان دونوں خاندانوں میں باہم شدید ناراضگی اور دائمی لڑائی تھی۔[2]

حضرت جعفر رحمہ اللہ بن محمد بن علی بن الحسین رضی اللہ عنہما روافض شیعہ کے ہاں ''صادق'' کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں: ''میں دو اعتبار سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا بیٹا ہوں۔[3]

ایک یہ کہ میری ماں حضرت ام فروہ رحمہا اللہ مدینہ کے سات فقہاء میں سے ایک شخصیت حضرت

[1] تاریخ الیعقوبي (۲/ ۲۲۸) والتنبیۃ والأشراف (ص: ۸۲)

[2] الشیعۃ و أھل البیت (ص: ۸۳) و الدر المنثور من تراث أھل البیت و الصحابہ للسید علاء الدین المدرسی (ص: ۳۸۔ ٤٤) ورحماء بینھم للصالح بن عبد اللہ الدرویش.

[3] سیر أعلام النبلاء (٦/ ۲٥٤)

قاسم رحمہ اللہ بن محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہما کی بیٹی ہیں اور حضرت قاسم رحمہ اللہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی گود میں پلے بڑھے۔ اور دوسرا اس اعتبار سے کہ میری والدہ حضرت ام فروہ رحمہا اللہ کی والدہ حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما کی بیٹی ہیں۔

حضرت جعفر صادق رحمہ اللہ اس وقت روافض سے بہت ناراض ہوتے تھے جب انھیں معلوم ہوتا کہ وہ ان کے نانا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی عزت کے درپے ہیں۔ چنانچہ جو شخص بھی حضرت جعفر رحمہ اللہ اور اہلِ بیت رضی اللہ عنہم کی محبت کا دعویدار ہے، وہ حضرت جعفر رحمہ اللہ کے عظیم نانا کو لعن طعن کرنے پر کیسے راضی ہو سکتا ہے؟

حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کی میت پر:

حضرت علی رضی اللہ عنہ ان برگزیدہ شخصیتوں میں سے ایک تھے جن سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے بعد خلافت پر کسی موزوں فرد کو فائز کرنے کے بارے میں مشورہ کیا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے یہ تھی کہ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ خلافت پر متمکن ہوں۔[1]

جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے اس دنیا سے کوچ کا وقت آیا تو وہ آخری الفاظ جو ان کی زبان سے ادا ہوئے۔ قرآن حکیم کے یہ الفاظ تھے:

﴿ تَوَفَّنِىْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِىْ بِالصّٰلِحِيْنَ ﴾ [يوسف: ١٠١]

''(یا اللہ) میرا خاتمہ اسلام پر کردے اور انجامِ کار مجھے صالحین کے ساتھ ملا دے۔''

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وفات کی خبر مدینہ میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مدینہ نے کوئی ایسا سوگوار دن نہیں دیکھا اور رونے والوں اور رونے والیوں نے کوئی ایسی غم زدہ شام نہیں دیکھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی جلدی جلدی چلتے، روتے ہوئے اور اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ راجِعُوْنَ پڑھتے ہوئے آرہے تھے حتیٰ کہ وہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے جسدِ مبارک کے سامنے آکر کھڑے ہوگئے اور کہنے لگے: ''اے ابوبکر (رضی اللہ عنہ)! اللہ آپ پر رحم فرمائے۔ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی الفت و محبت کا پیکر تھے۔ ان کے راز دان، مشیر اور با اعتماد ساتھی تھے، لوگوں میں سب سے پہلے اسلام قبول کرنے والے تھے، یقین و اخلاص سے سرشار تھے، انتہائی تقویٰ اور اللہ کا خوف رکھنے والے تھے، اللہ کے راستے میں بے دریغ مال لٹانے والے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ انتہائی محتاط رویہ رکھنے والے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بہترین مصاحبت

---

[1] الكامل لابن الأثير (٢/ ٧٩) و المختصر من كتاب الموافقه للزمخشري (ص: ٧٠/ ١٠٠)

اختیار کرنے والے تھے، فضیلت و منقبت میں سب سے بڑھ کر تھے، درجے میں بہت بلند تھے اور رسول اللہ ﷺ کے طریقِ زندگی اور سیرت سے بہت مشابہ تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے ہاں آپ کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو رسول اللہ ﷺ اور اسلام کی طرف سے بہترین جزاء عطا فرمائے۔

آپ نے رسول اللہ ﷺ کی اس وقت تصدیق کی جب لوگ ان تکذیب کر رہے تھے، آپ ان کی آنکھ اور کان تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو صدیق کے لقب سے نواز اور فرمایا:

﴿ وَالَّذِي جَاءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ ﴾ [الزمر: ٣٣]

''اور جو سچائی لے آیا اور جس نے اس کی تصدیق کی وہی (عذاب سے) بچنے والے ہیں۔''

آپ ہمیشہ رسول اللہ ﷺ کے منہج پر قائم رہے، آپ کے بارے میں جو کچھ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا آپ ویسے ہی تھے، آپ کی بات فیصلہ کن ہوتی تھی، آپ کا حکم بردباری اور دانائی پر مبنی ہوتا تھا۔ آپ کی رائے علم واستقامت پر قائم ہوتی تھی، آپ کے باعث دین میں اعتدال پسندی آئی، آپ کی وجہ سے ایمان میں قوت پیدا ہوئی اور اللہ کے دین کو غلبہ ملا۔ اللہ کی قسم! آپ ہم سے سبقت لے گئے اور بعد والوں کو مشقتوں اور مصیبتوں کا شکار کر گئے اور خود خیر و بھلائی کے ساتھ کامیاب ہو گئے۔ إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ.

ہم اللہ کی طرف سے اس کی قضاء و قدر پر راضی ہیں۔ ہم نے اپنا معاملہ اسی کے سپرد کر دیا ہے۔ اللہ کی قسم! رسول اللہ ﷺ کے بعد آج جیسی مصیبت مسلمانوں پر کبھی نہیں آئے گی۔ آپ دین کے لیے باعثِ عزت و حفاظت تھے، آپ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو پیارے ہو گئے، اللہ ہمیں آپ کے اجر سے محروم نہ کرے اور آپ کے بعد ہمیں گمراہی سے بچائے! اس دوران تمام لوگ خاموش رہے۔ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی بات مکمل کر لی تو تمام حاضرین بہت روئے حتیٰ کہ ان کی آوازیں بلند ہو گئیں۔ انھوں نے بلند آواز سے کہا: اے علی! آپ نے جو کہا سچ کہا۔[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں:

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت کے شروع دن ہی سے حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کے ساتھ پورا تعاون کرتے رہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دَور میں ان کے مشیرِ خاص تھے۔ ملکی مسائل میں خلیفۂ وقت کو ان کا مکمل تعاون حاصل رہا۔ یہ سلسلہ حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ کے دَور میں بھی جاری

[1] التبصرة لابن الجوزي (١/ ٤٧٧- ٤٧٩)

رہا۔ دونوں ایک دوسرے کی بے حد عزت کرتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خلافتِ فاروقی میں بھی ایک مصلح اور اعلیٰ مشیر کا کردار ادا کیا۔

اس سلسلے کے متعدد واقعات تاریخ میں محفوظ ہیں۔ وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی قیادت پر مکمل اعتماد رکھتے تھے۔ مالِ غنیمت اور وظائف کی تقسیم میں بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ برضا ورغبت اپنا حصہ وصول کرتے رہے۔ باہمی محبت کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے اپنے ایک بیٹے کا نام عمر رکھا۔ خلافتِ عثمانی میں بھی حسبِ سابق انھوں نے خلیفۂ وقت کے ساتھ اپنے بھرپور تعاون کا سلسلہ جاری رکھا۔ ان کی امامت میں نمازیں ادا کیں۔ انھوں نے کسی بھی موقع پر کسی کو یہ کہنے کا موقع نہیں دیا کہ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت سے مطمئن نہیں۔ انھوں نے ہر مجلس میں اور ہر موقع پر ان کی تعریف کی اور ان کی طرف دستِ تعاون بڑھائے رکھا۔

جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت ہوئی تو اسے ختم کرنے کے لیے انھوں نے اپنا پورا اثر ورسوخ استعمال کیا، لیکن باغی کہاں ماننے والے تھے؟ سازشی لوگوں نے کب امن اور سکون کو پسند کیا ہے؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جب دیکھا کہ وہ لوگ مطالبات پر ڈٹے ہوئے ہیں اور ان کی کوئی بات نہیں مان رہے تو انھوں نے اپنے بیٹوں حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی حفاظت کے لیے ان کے دروازے پر مقرر فرمایا۔ دوسرے صحابہ کی طرح ان کے ذہن میں بھی یہی بات تھی کہ باغی اپنے مطالبات منوانا چاہتے ہیں۔ ان سے یا تو بات چیت میں یہ مسئلہ حل ہو جائے گا یا پھر مطالبات نہ مانے جانے کی صورت میں وہ لوگ تنگ آ کر خود ہی واپس چلے جائیں گے۔

جب باغیوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے لیے پانی اور خوراک پر پابندی لگا دی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کچھ آدمیوں کو پانی دے کر بھیجا۔ وہ لڑتے بھڑتے پانی پہنچانے میں کامیاب ہو گئے۔ اس جھڑپ میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ زخمی بھی ہوئے۔ حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما دیگر صحابہ کے ساتھ دروازے پر باغیوں کو روکے ہوئے تھے کہ باغی دوسری طرف کی دیوار پھاند کر مکان میں داخل ہو گئے۔ معاملات ان کے بس سے باہر ہو گئے، شاید اللہ تعالیٰ کی مشیّت میں یہی طے تھا کہ امیر المومنین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہادت کے اعلیٰ مقام پر فائز ہوں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت امتِ مسلمہ کے لیے ایک بہت بڑا سانحہ تھی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بحیثیتِ خلیفہ بیعت:

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت بحیثیتِ خلیفہ منتخب ہونے کے ساتھ ہی ہوگئی تھی۔ اردگرد کے علاقوں سے

آنے والے اور مختلف قبائل سے تعلق رکھنے والے باغی اور فسادی لوگوں نے، جو دین سے یکسر خارج ہو گئے تھے، خلیفۂ راشد حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو جھوٹ، ظلم اور زیادتی کی بنیاد پر شہید کر دیا، یہ المناک واقعہ سن پینتیس (۳۵) ہجری میں ۱۹ ذوالحجہ کو جمعہ کے دن پیش آیا۔[1]

مدینہ میں اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سے جو شخصیات موجود تھیں، انھوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کی، کیوں کہ اس وقت بالا طلاق ان سے افضل کوئی نہ تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد کسی نے بھی اپنی ذات کو امامت و خلافت کا حق دار نہیں سمجھا۔ حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما کے والد حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی اس منصب کے آرزو مند نہیں تھے۔ انھوں نے مدینہ میں موجود صحابہ کرام کے زبردست اصرار پر منصبِ خلافت قبول کیا۔ آپ دنیاوی شان و شوکت اور جاہ و جلال سے دور بھاگتے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد آپ کو یہ خوف لاحق ہو گیا کہ مبادا امت میں فتنے بڑھ جائیں اور انتشار کی وبا پھوٹ پڑے، اس لیے امتِ مسلمہ کی بھلائی اور یک جہتی کے لیے آپ نے خلافت کی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔

خلافت کا مشکل مرحلہ:

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جن حالات میں خلافت سنبھالی وہ بڑا کٹھن اور مشکل ترین وقت تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر کے باغی اپنے ناپاک ارادوں میں کامیاب ہو چکے تھے۔ ان کی شہادت کے بعد مدینہ میں افراتفری کا سماں تھا۔ شہر پر باغیوں کا قبضہ تھا۔ اسلامی سلطنت لاکھوں مربع میل پر پھیلی ہوئی تھی لیکن اس سلطنت کا کوئی سربراہ نہیں تھا۔ ایسے وقت میں سب کی نظریں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف اٹھیں۔ اس نازک وقت میں وہی خلافت کے لیے موزوں ہو سکتے تھے۔ لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے درخواست کی کہ وہ خلافت کی ذمہ داری سنبھالیں، لیکن انھوں نے صاف انکار کر دیا۔ ان کے انکار نے حالات کو اور بھی نازک کر دیا۔ خلافت کی ذمے داری اٹھانے سے انکار کے باوجود لوگ انھیں آمادہ کرنے کی کوشش کرتے رہے۔

خلافت کی ذمہ داری حضرت علی رضی اللہ عنہ پر:

مہاجرین، انصار اور مدینے کے دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے مل کر سخت اصرار کیا کہ وہ خلافت قبول کر لیں تاکہ امتِ اسلامیہ فساد اور اختلاف و انتشار کا شکار نہ ہو جائے۔ اس بار درخواست کرنے والوں میں باغی بھی شامل تھے۔ بالآخر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ان سب کی بات ماننا پڑی اور وہ خلافت کی ذمے داری

[1] الطبقات لابن سعد (۳/ ۳۱)

نبھانے پر تیار ہو گئے۔ باغیوں کے شور وشغب سے بچنے کے لیے ایک قدم پیچھے ہٹتے ہوئے انھوں نے یہ شرط عائد کی کہ بیعت مسجد میں علانیہ طور پر ہو، اس طرح اہلِ حل وعقد امامت و قیادت کے مسائل طے کرتے رہیں گے اور عام لوگ عمومی اور علانیہ بیعت کریں گے۔ انھوں نے برسرِ منبر اس اصولی بات کو تاکیداً طے کر دیا اور صاف فرمادیا: اے لوگو! تمھارے ان معاملات میں کسی اور کا کوئی حق نہیں ہے، جیسے تم کہو گے ویسا ہی ہو گا۔[1]

چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے تین یا چھے دن کے بعد مدینہ میں موجود تمام لوگوں نے مسجدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ اس طرح وہ مسلمانوں کے چوتھے خلیفۂ راشد بنے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا پہلا خطبہ:

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت ایک الم انگیز فتنے کے بعد عمل میں آئی، اس فتنہ کے دوران سابق خلیفۂ مسلمین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے، انھوں نے مسلمانوں کو خیر و بھلائی اختیار کرنے اور شر کو ترک کرنے کی دعوت دی اور فرمایا کہ مسلمانوں کی حرمت تمام حرمتوں سے بڑھ کر ہے، کسی حالت میں بھی کسی مسلمان کو اذیت دینا جائز نہیں۔ پھر آپ نے انھیں موت اور آخرت کی یاد دلائی اور انھیں تقویٰ، اطاعت اور نیک اعمال اختیار کرنے کی ترغیب دی۔[2]

حضرت علی رضی اللہ عنہ پونے پانچ سال تک خلیفہ رہے۔ خلافت کا سارا زمانہ ان کے لیے بے انتہاء کٹھن اور دشوار تھا۔ وہ مسلسل مشکلات میں گھرے رہے۔ کوئی اور ہوتا تو کب کا حوصلہ ہار چکا ہوتا۔ لیکن وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے، جرأت، جواں مردی اور علم و ذہانت میں بے مثال تھے۔ انھوں نے بڑے صبر اور حوصلے کے ساتھ دشواریوں کا سامنا کیا۔ خلیفہ بنتے ہی سب سے پہلی مشکل تو یہی پیش آئی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں کو کس طرح پکڑا جائے؟ خلیفۂ وقت کی شہادت کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ یہ ہر دل کی پکار تھی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خون کا بدلہ لیا جائے۔ ان کے قاتلوں کو سخت ترین سزا دی جائے۔

عام صحابہ کے ساتھ خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دل میں بھی یہ خواہش پوری شدت کے ساتھ موجود تھی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں کو ہر صورت میں گرفتار ہونا چاہیے۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ جن لوگوں نے

[1] الدور السياسي للصفوة في صدر الإسلام للسيد عمر (ص: ٧٢) تاريخ الطبرى (٥/ ٤٤٩)

[2] الأدب الإسلامي لنايف معروف (ص: ٧٥)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مکان کو گھیرا تھا ان کی تعداد ہزاروں میں تھی۔ ان میں قاتل کون تھا؟ یہ پتا چلانا بہت مشکل تھا۔ کیوں کہ موقع کا کوئی گواہ نہیں تھا۔ جس وقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہید ہوئے۔ اس وقت ان کے پاس صرف ان کی زوجۂ محترمہ سیدہ نائلہ رضی اللہ عنہا تھیں۔ شوہر کو بچاتے ہوئے ان کی تین انگلیاں کٹ گئی تھیں۔ انھوں نے صرف اتنا بتایا کہ تین آدمی اندر آئے تھے۔

لہٰذا معاملہ بہت پیچیدہ ہو چکا تھا۔ کسی کے خلاف نہ کوئی ثبوت تھا نہ کوئی گواہ! لوگ تھے کہ انتقام اور بدلے کی پکار بلند کیے جا رہے تھے۔ اس موقع پر لوگ یہ بھی شک کرنے لگے کہ شاید حضرت علی رضی اللہ عنہ خود، جان بوجھ کر قاتلوں کو نہیں پکڑ رہے ہیں۔ اس بدگمانی کی وجہ یہ تھی کہ سارے باغی سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کر چکے تھے اور بہت سے ان کی فوج میں شامل ہو چکے تھے۔ حالات اتنے نازک تھے کہ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ ان لوگوں کو چن چن کر فوج سے نکال دیا جاتا۔ اسلامی قانونِ شہادت یہ کہتا تھا کہ بغیر گواہی اور ثبوت کے کسی کو قاتل نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

خلافت کی ذمہ داری سنبھالنے کے بعد:

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے صوبوں کے نئے گورنر مقرر فرمائے۔ تمام گورنروں نے صوبوں میں جا کر پرانے گورنروں کی جگہ سنبھال لی۔ لیکن شام کے گورنر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے گورنری سے دست بردار ہونے سے انکار کر دیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقرر کردہ گورنر حضرت سہل بن حُنَیف رضی اللہ عنہ کو واپس جانے پر مجبور کر دیا۔ انھوں نے ان کے ذریعے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو پیغام بھیجا:

> ''جب تک حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں کو گرفتار نہیں کیا جائے گا، وہ گورنری سے دست بردار نہیں ہوں گے۔''

یوں ابتداء ہی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ایک بڑی مشکل کا سامنا کرنا پڑا۔ ابھی وہ اس مشکل سے نپٹنے کی کوشش کر رہے تھے کہ ایک اور مشکل سامنے آ گئی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت اس وقت ہوئی جب زیادہ تر لوگ حج کے لیے گئے ہوئے تھے۔ ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بھی حج کے لیے مکے گئی ہوئی تھیں۔ حج کے بعد واپس تشریف لا رہی تھیں کہ راستے میں ان کی ملاقات اپنے ایک قریبی رشتے دار سے ہو گئی۔ انھوں نے بتایا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہید کر دیے گئے ہیں اور لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کر لی ہے، لیکن اس بیعت کے باوجود مدینہ ابھی تک فساد کی زد میں ہے۔ یہ خبر سن کر سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا مکے کی طرف پلٹ گئیں۔

ان کے مکہ پہنچتے ہی مدینہ سے حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما بھی ان کے پاس پہنچ گئے۔ یہ بزرگ صحابہ عشرہ مبشرہ میں شامل تھے۔ انھوں نے بھی مدینے کے حالات بتاتے ہوئے کہا:

''مدینے کے لوگ فسادیوں کے ہاتھوں پریشان ہیں۔ نہ تو وہ اپنی حفاظت کر سکتے ہیں اور نہ ان میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خون کا بدلہ لینے کی طاقت ہے۔''

جنگِ جمل:

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا جب راستے میں سے ہی واپس مکہ پلٹ گئیں تو مکہ کے لوگ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی واپسی پر حیران تھے۔ انھوں نے واپسی کا سبب دریافت کیا تو انھوں نے فرمایا: ''(حضرت) عثمان (رضی اللہ عنہ) مظلوم شہید کر دیے گئے ہیں، اور فتنہ دبتا ہوا نظر نہیں آتا، اس لیے تم فتنے کو دور کرنے اور شہید خلیفہ کے قاتلوں سے بدلہ لینے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اسی طرح اسلام کی عزت بچائی جا سکتی ہے۔''

اس پر ہزاروں مسلمان ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کی پکار پر جمع ہو گئے اور اس لشکر نے بصرہ پہنچ کر اس پر قبضہ کر لیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ان حالات کی خبر ملی تو وہ بھی اپنا لشکر لیکر بصرہ کے قریب پہنچ گئے، اور صلح کی کوشش شروع کر دی۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنے آنے کی وجہ بیان فرمائی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کے موقف کو درست تسلیم کرتے ہوئے اپنی مشکلات کا ذکر کیا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خون کا بدلہ تو وہ خود بھی لینا چاہتے ہیں لیکن نہ تو کوئی موقعے کا گواہ موجود ہے اور نہ کوئی ثبوت اور پھر باغی جو ہزاروں کی تعداد میں تھے، تائب ہو کر اسلامی فوج میں شامل ہو چکے ہیں۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا ان کی مشکلات کو سمجھ گئیں۔ یوں معاملہ صلح صفائی سے حل ہونے کے قریب تھا لیکن دونوں طرف کے لشکروں کے کچھ بدنیت اور منافق لوگوں نے جو اسلام کی عمارت کو کمزور کرنا چاہتے تھے، انھوں نے سازشیں شروع کر دیں کیوں کہ انھیں صلح میں نقصان اور جنگ میں فائدہ نظر آ رہا تھا لہٰذا انھوں نے رات کی تاریکی میں جنگ چھیڑ دی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سمجھے کہ ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے جنگ کا آغاز کر دیا ہے اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا یہ سمجھیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جنگ چھیڑ دی ہے۔ اس طرح بغیر کسی ارادے کے جنگ شروع ہو گئی۔

دونوں فوجوں میں زبردست لڑائی ہوئی۔ بالآخر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فتح حاصل ہوئی، فتح کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا حال معلوم کرنے کے لیے ان کے بھائی محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہما کو بھیجا،

پھر انھوں نے خود سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس جا کر پوچھا: ''ام المومنین (رضی اللہ عنہا) (مومنوں کی ماں) آپ کا مزاج کیسا ہے؟ انھوں نے فرمایا: ''میں ٹھیک ہوں۔''

اس وقت سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: بچو! یہ لڑائی غلط فہمی کا نتیجہ تھی۔ (حضرت) علی (رضی اللہ عنہ) سے نہ پہلے میرا جھگڑا تھا نہ اب ہے۔'' حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب میں کہا: ''آپ سچ فرماتی ہیں۔ آپ ہم سب کی ماں ہیں، آپ کی عزت کرنا ہم پر واجب ہے۔''

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اس جنگ کے دوران اونٹ پر سوار تھیں، اس لیے اس لڑائی کو جنگِ جمل کہا جاتا ہے۔ اس جنگ کے بعد سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا ہمیشہ پشیمان رہیں اور اس غلطی کو اور اس غلط فہمی کے نتیجے میں ہونے والی جنگ کو یاد کر کے روتی رہیں۔ جنگِ جمل کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کچھ دن بصرہ ہی میں قیام کیا۔ پھر ۱۲/ رجب ۳۶ ہجری کو کوفے چلے گئے۔ یہاں پہنچ کر انھوں نے ایک انقلابی فیصلہ کیا۔ انھوں نے کوفے کو ملک کا دار الخلافہ قرار دے دیا۔ دار الخلافہ پہلے مدینہ تھا۔ اس فیصلے کی بنیادی وجہ یہی تھی کہ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے شہر مدینہ کو فساد اور جھگڑوں سے محفوظ رکھا جائے۔

علمی گہرائی:

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ذہانت و فطانت کی داستان بڑی طویل ہے۔ تاریخ نے متعدد ایسے واقعات محفوظ کر رکھے ہیں جن سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ذہانت اور علمی گہرائی کا ثبوت ملتا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ علم کا سمندر تھے۔ آپ کی علمی باتوں نے بہت شہرت پائی۔ وہ کہا کرتے تھے کہ: ''علم مال سے بہتر ہے، کیوں کہ علم تمھاری حفاظت کرتا ہے اور مال کی حفاظت تمھیں کرنا پڑتی ہے۔ علم پھلتا پھولتا ہے اور عمل کے ذریعے راسخ ہوتا ہے۔ وہ اجتماعی تعلق جو مالی مفاد پر مبنی ہو مال ختم ہوتے ہی ختم ہو جاتا ہے۔ امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: عالم کا حق یہ ہے کہ اس سے بہت زیادہ سوال نہ کیے جائیں، نہ اسے جواب دینے پر مجبور کیا جائے۔ جب وہ تھکاوٹ و کسلمندی کا شکار ہوں تو ان کے پاس نہ جائیں، جب وہ کھڑے ہو جائیں تو ان کے دامن نہ پکڑو، ان کے راز افشاء نہ کرو، ان کے سامنے کسی کی غیبت نہ کرو، ان کی لغزشیں اور غلطیاں تلاش نہ کرو، اگر ان سے غلطی ہو جائے تو ان کی معذرت قبول کرو، جب تک وہ اللہ کے احکام کی حفاظت کریں ان کی عزت و توقیر تم پر لازم ہے۔ ان کے مدِمقابل نہ بیٹھو، اگر انھیں کوئی ضرورت درپیش ہو تو ان کی خدمت کے لیے قوم سے سبقت لے جاؤ۔''[1]

[1] جامع بیان العلم وفضله لابن عبدالبر (۱/ ۵۱۹)

اللہ تعالیٰ کے نزدیک باعمل علماء کا درجہ:

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''جس نے اپنے علم پر عمل کیا آسمانوں میں اسے عظمت ملی۔ یہ علم وعمل کی دعوت ہے۔ انھوں نے ایسے علم وعمل کی بنیاد پر اعلیٰ مقامات کے حصول کے لیے کوشش کرنے کی ترغیب دی ہے جن کے پس پردہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کی نیت کارفرما ہو۔''[1]

خلیفۂ ثانی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں ایک عورت نے اپنی شادی کے صرف چھے ماہ بعد ہی بچے کو جنم دیا۔ لوگوں کو شک ہو گیا کہ ضرور یہ عورت حقوقِ زوجیت میں خیانت کی مرتکب ہوئی ہے۔ کیوں کہ عام طور پر عورتیں نو یا کم از کم سات ماہ بعد بچہ جنتی ہیں۔

چنانچہ اس عورت کو خلیفۂ ثانی حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ کے دربار میں پیش کیا گیا تاکہ اسے سزا دی جائے۔ اس مجلس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے اور خلیفہ کے قاضی وہی تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ساری صورتِ حال کا جائزہ لے کر فرمایا: لوگو! تم صرف اس وجہ سے کہ اس عورت نے شادی کے چھے ماہ بعد بچے کو جنم دیا ہے، سزا نہیں دے سکتے، نہ اس پر یہ الزام عائد کر سکتے ہو کہ وہ اپنے شوہر کے حق میں مخلص نہیں ہے۔ لوگوں کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بات پر بڑا تعجب ہوا۔ انھوں نے پوچھا: آپ یہ بات کس بنیاد پر کہہ رہے ہیں؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَحَمْلُهُ وَفِصٰلُهُ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا ﴾ [الأحقاف: ١٥]

''عورت کے حمل کا اور اس کے دودھ چھڑانے کا زمانہ تیس مہینے ہے۔''

یعنی حمل اور رضاعت کی پوری مدت تیس ماہ (دو سال چھے ماہ) کی ہے اور سورۃ البقرۃ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَالْوٰلِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ ﴾ [البقرة: ٢٣٣]

''مائیں اپنی اولاد کو پورے دو سال دودھ پلائیں۔''

اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مطابق دودھ پلانے کی مدت دو سال، یعنی چوبیس مہینے ہے۔ حمل اور رضاعت کی کل مدت تیس مہینے بنتی ہے۔ اس میں سے چوبیس مہینے تو دودھ پلانے کی مدت ہے اور باقی چھے

[1] جامع بيان العلم وفضله (١/ ٥١٩)

مہینے حمل کے رہ گئے، لہٰذا چھ مہینے میں اگر کوئی عورت بچے کو جنم دیتی ہے تو وہ قابلِ سرزنش نہیں ہوسکتی، بلکہ اس کا بچہ اس کے شوہر ہی کا بچہ شمار ہوگا۔ اس طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اس دلیل سے ایک شریف عورت رجم ہوتے ہوتے بچ گئی۔[1]

اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کی تشریح:

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس علم کی اہمیت اس طرح اجاگر فرمائی ہے: اے علم کے طلبگار! عالم کی تین علامات ہیں:

1. اللہ کے بارے میں علم۔
2. اس امر کا علم کہ اللہ کن چیزوں کو پسند کرتا ہے۔
3. اور تیسرا یہ علم کہ اللہ کن باتوں کو پسند نہیں فرماتا۔[2]

انھوں نے اللہ تبارک وتعالیٰ کے اوصافِ عالیہ کا تعارف اس طرح کرایا: ''وہ ہر مقام اور جگہ کا علم رکھتا ہے اور ہر آن، ہر گھڑی اور ہر وقت سے باخبر ہے۔ اس نے جو چیز بھی پیدا کی اسے قائم رکھا۔ جو بھی تصویر بنائی بہترین بنائی، وہ اپنے بلند مرتبہ ہونے میں یکتائے روزگار ہے۔ مخلوق کی کسی قسم کی اطاعت کا محتاج نہیں، وہ دعا کرنے والوں کی دعا قبول فرماتا ہے، آسمانوں اور زمینوں میں جہاں بھی فرشتے ہیں وہ اسی کے تابع فرمان ہیں، اسے زندہ انسانوں کے بارے میں بھی اتنا ہی علم ہے جتنا فوت شدہ لوگوں کے بارے میں ہے۔ وہ جس طرح بلند آسمانوں کے بارے میں جانتا ہے اسی طرح زمین کی نچلی سے نچلی زمین کے بارے میں بھی جانتا ہے۔ اس کا علم ہر چیز پر حاوی ہے۔ طرح طرح کی آوازیں اسے حیرت زدہ نہیں کرتیں۔ مختلف قسم کی زبانیں اسے کسی بات سے غافل نہیں کرتیں، وہ مدبّر ہے۔ دور رس نگاہیں رکھنے والا ہے، وہ تمام امور کا علم رکھتا ہے، وہ زندہ جاوید ہستی ہے، وہ اپنی ذاتِ عالی میں بجائے خود قائم و دائم ہے اور دوسروں کو بھی قائم رکھنے والا ہے۔ وہ اس بات سے پاک ہے کہ اس کی صفات کی کیفیات بیان کی جائیں۔''[3]

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں ایک یہودی آیا۔ اس نے پوچھا کہ ہمارا رب کب سے

---

[1] المصنف لعبد الرزاق، رقم الحديث (٣٤٩)

[2] تاريخ اليعقوبي (٢/ ٢٠٧) و منهج علي بن بن أبي طالب ڈاكٹر سليمان العيد (ص:٩١)

[3] حلية الأولياء (١/ ٧٣)

تھا؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے چہرے کا رنگ فوراً بدل گیا۔[1]

فرمایا کہ رب کے بارے میں ''تھا'' تو ہم تب کہیں جب کہ وہ اس وقت جلو فرما نہ ہو۔ وہ تھا، ہے اور آیندہ کے لیے بھی ہمیشہ ہمیشہ قائم و دائم ہے۔ وہ بغیر کسی کیفیت کے ہے، اُس کے بارے میں ابتداء اور انتہاء کا کوئی تصوّر نہیں۔ وہ ہر چیز کی غایت ہے، ہر چیز کی انتہاء ہے۔ آپ کا یہ ارشاد سنتے ہی یہودی مسلمان ہو گیا۔[2]

اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ کی صفات کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا:

''بلاشبہ اللہ تعالیٰ نرم خو ہے اور نرمی کو پسند کرتا ہے اور نرمی پر وہ کچھ عطا فرماتا ہے جو سخت مزاجی پر عطا نہیں کرتا ہے۔''[3]

اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کی معرفت، اس کے معانی پر غور وفکر اور ان پر ایمان، اللہ تعالیٰ کی عظمت اور محبت کی شکل میں ثمر آور ہوتا ہے۔ اور یہ محبت اور تعظیم اس کے امر و نہی پر مبنی احکام پر عمل کے لیے ضروری ہے۔ یہی محبت تقاضا کرتی ہے کہ مصائب میں اسی کی پناہ حاصل کی جائے اور حاجات کے وقت صرف اسی سے مانگا جائے، پیش آمدہ مسائل کے حل میں صرف اسی سے مدد کی التجاء کی جائے اور اِس کے علاوہ بھی دیگر تمام قلبی عبادات میں اُسی کی طرف رجوع کیا جائے۔[4]

باعثِ شکر نعمتوں کا تعاف:

امیر المومنین حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ لوگوں کو نعمتوں پر شکر کے ذریعے سے اللہ کا قُرب حاصل کرنے کی ترغیب دلاتے تھے۔ نعمتوں کے نشے میں ڈوب کر غفلت اختیار کرنے اور ان پر تکیہ کر کے بیٹھ رہنے سے منع کرتے تھے۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ نعمتوں پر شکر کرنے کے نتیجے میں اللہ کے پاس سے مزید خیر و بھلائی ملے گی، اس لیے اسی کی طرف رخ کر لو، اللہ ہی کے ہو جاؤ۔ امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے: اگر دل اور طبیعت (خیر کی طرف) راغب ہو تو اللہ کا شکر ادا کرو، اللہ نے مسلمانوں سے اچھے انجام کا وعدہ کیا ہے، اور ''جو شکر کرے اسے مزید عطا کرنے کی یقین دہانی کرائی ہے۔''[5]

---

1. لسان العرب (٥/ ١٨١)
2. تاريخ الخلفاء للإمام السيوطي (ص: ٢٠٦)
3. صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٩٣) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٨٠٧)
4. منهج علي بن أبي طالب في الدعوة إلى الله (ص: ٩٢)
5. سورة إبراهيم [آيت: ٧] البداية و النهاية (٧/ ٣٠٩)

امیر المومنین لوگوں کو اپنی ذات پر غور وفکر کرنے کی دعوت دیتے تھے۔ فرمانِ ربانی ہے:

﴿ وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴾ [الذاریات: ۲۱]

''اور خود تمھارے اپنے وجود میں بہت سی نشانیاں ہیں کیا پھر تم دیکھتے نہیں۔''

ایمان کی حلاوت اور تقویٰ کی برکتیں:

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ایمان، دل میں ایک سفید نقطہ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، جوں جوں بندے کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے، دل زیادہ سفید ہونے لگتا ہے اور جوں جوں بندے کے نفاق میں اضافہ ہوتا ہے، دل کی سیاہی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ جب بندہ نفاق میں کامل ہو جاتا ہے تو دل پوری طرح سیاہ ہو جاتا ہے، اللہ کی قسم! اگر تم مومن کے دل کو چیر کر دیکھو تو وہ سفید ہوگا اور کافر و منافق کا دل چیر کر دیکھو تو وہ سیاہ نکلے گا۔[1]

علمائے اہلِ سنت نے ایمان کی حقیقت بیان کرتے ہوئے کہا ہے: ایمان دل سے تصدیق، زبان سے شہادتین کا اقرار اور اعضائے بدن کے عمل کا نام ہے یعنی ایمان کے ارکان: عقیدہ، قول اور عمل ہیں۔ یہ تینوں حقیقتِ ایمان اور اس کے اجزاء کی نمائندگی کرتے ہیں۔ علماء کے اقوال متواتر اسی حقیقت پر دلالت کرتے ہیں۔ اس بارے میں بہت سی قرآنی آیات اور احادیثِ نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی استدلال کیا جاتا ہے۔[2]

امیر المومنین نے تقویٰ کا مطلب بیان کرتے ہوئے فرمایا: ''معصیت پر اصرار نہ کرنا اور اطاعت سے دھوکا نہ کھانا۔'' مزید فرمایا: ''تقویٰ ذاتِ جلیل سے خوف، اللہ کے نازل کردہ احکام پر عمل، تھوڑے پر قناعت اور دنیا سے کوچ کی تیاری کا نام ہے۔''[3] تقویٰ کی ترغیب دلاتے ہوئے امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جو اہتمام کیا، فرد اور معاشرہ دونوں پر اس کے بڑے اچھے اثرات وثمرات مرتب ہوئے۔

مسئلۂ تقدیر:

امیر المومنین حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ زمین میں رونما ہونے والی ہر چیز اُسی وقت رونما ہوتی ہے جب اس کا فیصلہ آسمان میں کر دیا جاتا ہے۔ ہر شخص کی حفاظت و دفاع کے لیے دو

---

[1] الفتاویٰ (۷/ ۱۹۱)

[2] في ظلال الإيمان للخالدي (ص: ۲۳)

[3] تفسير الرازي (۲/ ۲۱) فرائد الكلام (ص: ۳۳٤)

فرشتے مقرر ہیں۔لیکن جب اس کی تقدیر کا وقت ہو جاتا ہے تو فرشتے اس سے الگ ہو جاتے ہیں اور تقدیر کا لکھا پورا ہو جاتا ہے۔ مجھے بھی اللہ کی طرف سے محفوظ ڈھال میسّر ہے۔ پھر جب میری اجل آجائے گی تو میری ڈھال ختم ہو جائے گی۔کوئی شخص اس وقت تک ایمان کی حلاوت نہیں پا سکتا جب تک وہ تقدیر پر ایمان نہ لے آئے کہ جو چیز اسے مل گئی وہ کبھی چھن نہیں سکتی تھی اور جو اسے نہیں ملی وہ اسے کبھی مل نہیں سکتی تھی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''ہر شخص کا جانی اور مالی نفع اور نقصان آسمان سے ایسے ہی نازل ہوتا ہے، جیسے آسمان سے بارش برستی ہے۔لہٰذا جس شخص کا مالی یا جانی نقصان ہو جائے اسے اس مصیبت کو اپنے لیے فتنہ و آمایش نہیں بنا لینا چاہیے۔ بلکہ مسلمان کو اللہ تعالیٰ سے دو بھلائیوں میں سے ایک کی امید رکھنی چاہیے۔ جو کچھ اللہ تعالیٰ کے خزانوں میں ہے وہی اس کے لیے بہتر ہے۔ یا تو اللہ تعالیٰ اسے مال و دولت سے نواز دیں اور وہ مال و دولت اور اہل وعیال کے ساتھ اپنے دین کی حفاظت کرتا ہوا زندگی گزار لے، یا ان چیزوں کی کمی کے ساتھ آخرت کی نعمتوں کا وارث بن جائے۔اور آخرت تو سراسر خیر ہے اور ہمیشہ باقی رہنے والی ہے۔''

کھیتی دوقسم کی ہے۔ ایک کھیتی دنیا کے مال و دولت اور تقوے کی ہے اور دوسری آخرت میں باقی رہنے والے نیک اعمال کی ہے۔اور کبھی اللہ خوش نصیبوں کو دونوں ہی عطا فرما دیتا ہے۔

بندوں کا حساب:

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا: اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی اتنی بڑی تعداد کا حساب کیسے لے گا؟ تو انھوں نے فرمایا: جس طرح اتنی بڑی تعداد کو رزق عطا فرماتا ہے۔

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کا زُہد وتقویٰ:

حضرت علی رضی اللہ عنہ بڑے بالغ نظر عالم اور دور اندیش مدبّر تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں خوب نوازا۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سایۂ عاطفت میں رہے۔اسی لیے ان کی تربیت نہایت اعلیٰ معیار پر ہوئی تھی۔آپ نے زندگی کا ہر لمحہ قرآن اور سنت کی چھاؤں میں بسر کیا، زہد وتقویٰ کو شعار بنانے، قرآنِ کریم کے سائے میں زندگی بسر کرنے، نبیِ امین صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہر آن وابستگی، صحابۂ کرام کی مصاحبت اور دنیا کے احوال و انجام کے مطالعے سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خوب سمجھ لیا کہ یہ دنیا آزمایش کا گھر ہے۔

قاضی شُرَیح کی عدالت میں:

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دَورِ حکومت زیادہ لمبا نہیں تھا۔ سارے کبار صحابہ کی طرح وہ بھی بڑے عابد و زاہد اور متقی تھے۔ ان کے زمانے میں اسلامی سلطنت خانہ جنگی کا شکار رہی، اس لیے بیرونی فتوحات کا سلسلہ رک گیا۔ تاہم خود مختار عدالتِ عالیہ عہدِ خلافتِ راشدہ میں ایک ایسا ادارہ رہا ہے جس پر فرزندانِ اسلام فخر کر سکتے ہیں۔ انصاف کا یہ عالَم تھا کہ خلیفۂ وقت کو بھی بعض اوقات قاضی کے ہاں پیشی بھگتنی پڑتی تھی۔ ایک واقعہ جو سنداً تو ضعیف ہے۔[1]

لیکن بعض اہل علم کے بقول خلفاء راشدین کے سنہرے دور میں ایسے واقعات کا پیش آنا کوئی بعید نہیں۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ہی کا دورِ خلافت ہے۔ اتفاق سے ایک دن آپ کی زرہ گم ہوگئی، جسے آپ نے ایک یہودی کے پاس دیکھ لیا۔ آپ نے یہودی سے کہا: یہ زرہ میری ہے، فلاں دن مجھ سے کھو گئی تھی۔ یہودی کہنے لگا: میرے پاس موجود زرہ پر آپ کیسے دعویٰ کر سکتے ہیں کہ وہ آپ کی ہے؟ اگر آپ کا یہی دعویٰ ہے تو اس کا حل صرف یہ ہے کہ مسلمانوں کے قاضی سے اس کا فیصلہ کرا لیتے ہیں۔

چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور یہودی دونوں قاضی شُرَیح کی عدالت میں جا پہنچے، جب قاضی شُرَیح کی نگاہ امیر المومنین پر پڑی تو وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بیٹھے رہیں۔ قاضی شریح بیٹھ گئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میری زرہ کھو گئی تھی۔ میں نے اس گم شدہ زرہ کو اس یہودی کے پاس دیکھا ہے۔ قاضی شُرَیح نے یہودی سے کہا: تمھیں کچھ کہنا ہے۔ یہودی نے کہا: میری زرہ ہے، میرے قبضے میں ہے اور میری ملکیت ہے۔ قاضی شُرَیح نے جب زرہ دیکھی تو کہا: امیر المومنین آپ کا دعویٰ بالکل سچ ہے، یہ آپ ہی کی زرہ ہے لیکن قانون کے مطابق آپ کے حق میں دو گواہوں کی شہادت ضروری ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے غلام قنبر کو بطورِ گواہ پیش کیا، اس نے آپ کے حق میں گواہی دی، پھر آپ نے اپنے فرزندوں حضرت حسن اور حسین رضی اللہ عنہما کو عدالت میں پیش کیا، ان دونوں نے بھی آپ کے حق میں گواہی دی۔ قاضی شُرَیح نے کہا: آپ کے غلام کی گواہی تو میں قبول کرتا ہوں لیکن ایک گواہ مزید درکار ہے۔ مجھے آپ کے صاحبزادوں میں سے کسی کی گواہی قبول نہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: اللہ کی قسم! میں نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث بیان کرتے ہوئے سنا ہے:

[1] البدر المنير (٩/ ٥٩٩)

«اَلْحَسَنُ وَ الْحُسَيْنُ سَيِّدَا شَبَابِ اَهْلِ الْجَنَّةِ»[1]

''حسن اور حسین (رضی اللہ عنہما) نو جوانانِ اہلِ جنت کے سردار ہیں۔''

قاضی شُرَیح نے کہا: اللہ کی قسم! یہ بالکل سچ ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: پھر آپ کو اہلِ جنت کے سرداروں کی گواہی قبول کرنے میں کیا تامّل ہے؟ قاضی شُرَیح نے کہا: یہ دونوں آپ کے بیٹے ہیں اور اسلامی قانونِ عدل کی رو سے باپ کے حق میں بیٹوں کی گواہی مقبول نہیں۔ یہ کہہ کر قاضی شُرَیح نے فیصلہ یہودی کے حق میں سنا دیا اور زرہ اس کے حوالے کر دی۔

یہودی نے تعجب سے کہا: مسلمانوں کا امیر مجھے اپنے قاضی کی عدالت میں لے گیا اور قاضی نے اس کے خلاف میرے حق میں فیصلہ صادر فرمایا۔ مزید یہ کہ امیر المومنین نے اس فیصلے کو بلا چون و چرا قبول بھی کر لیا! اب یہودی نے امیر المومنین حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی طرف نگاہ اٹھائی اور کہنے لگا: امیر المومنین! آپ کا دعویٰ بالکل سچ ہے۔ یہ زرہ یقیناً آپ ہی کی ہے۔ فلاں دن یہ آپ کے پاس سے گر گئی تھی۔ میں نے اٹھا لی۔ یہ زرہ آپ کے حوالے کرتا ہوں، پھر کلمۂ شہادت پڑھا:

''اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّداً رَّسُوْلُ اللّٰهِ''

''میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔''

اور وہ مسلمان ہو گیا۔ اب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس نومسلم سے فرمایا: میری یہ زرہ آج سے تمھاری ملکیت ہے۔[2]

دل میں خشوع پیدا ہو گا اور مومن پیروی کریں گے:

حضرت عمر بن قیس رحمہ اللہ کہتے ہیں: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ آپ اپنی قمیص میں پیوند کیوں لگائے ہوئے ہیں؟ انھوں نے فرمایا: اس سے دل میں خشوع پیدا ہو گا اور دیگر مومن اس کی اقتداء کریں گے۔[3]

خلیفہ کے لیے اللہ کے مال میں سے دو پیالوں سے زیادہ حلال نہیں:

حضرت عبداللہ بن زریر الغافقی رحمہ اللہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں: میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت

[1] السلسلة الصحيحة للألباني، رقم الحديث (٧٩٦) وقال: متواتر جامع المناقب، رقم الحديث (٣٧٦٧)

[2] حلية الأولياء (٤/ ١٥٢) البدر المنير (٩/ ٥٩٩)

[3] تاريخ الإسلام، عهد الخلفاء الراشدين للإمام الذهبي (ص: ٦٤٧)

میں حاضر ہوا تو انھوں نے ہمیں کھانا پیش کیا جو خشک گوشت اور آٹے سے بنا ہوا تھا، میں نے کہا: اللہ آپ کا بھلا کرے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو خیرِ کثیر سے نوازا ہے، آپ کسی مرغابی وغیرہ کے گوشت کا انتظام کر لیتے تو اچھا تھا۔ اس پر انھوں نے فرمایا: اسے ابن زریر! میں نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خلیفہ کے لیے اللہ کے مال میں سے دو پیالے لینا حلال ہے۔ ایک وہ جسے وہ خود اور اس کے اہلِ خانہ کھائیں اور دوسرا پیالہ وہ جو وہ مہمانوں کو پیش کرے۔[1]

یہ ہیں امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ جو زوال پذیر دنیا میں کھانے پینے، آرام و آسایش اور مال و متاع سے بے رغبتی اختیار کرنے کی اعلیٰ مثال ہیں۔ بالکل جائز اور حلال ذرائع سے ان کے لیے پوری طرح ممکن تھا کہ جتنا مال چاہیں لے لیں۔ انھیں مالدار مسلمانوں کے مساوی معیشت کی پیش کش کی گئی، لیکن انھوں نے یہ پیش کش قبول نہ کی۔ وہ موٹی چھوٹی اور مشقت بھری سادہ زندگی اختیار کرنے پر خوشی خوشی راضی ہو گئے۔ وہ آخرت کو دنیا پر ترجیح دیتے تھے، احتیاط پر مبنی زندگی بسر کرتے تھے۔[2]

میں انجانی چیز کھانا پسند نہیں کرتا:

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ اُس تھیلے کو سیل بند کر رہے تھے جس میں ان کے کھانے کے لیے جو کا آٹا تھا اور ساتھ فرما رہے تھے: میں پسند نہیں کرتا کہ میرے پیٹ میں وہ چیز داخل ہو جسے میں نہیں جانتا۔ اور مجھے یہ بھی پسند نہیں کہ میں اپنے نفس کو اس چیز کا عادی بناؤں جس کا وہ پہلے عادی نہیں۔[3]

حیا خوفِ الٰہی کی نشانی ہے:

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: حیا اخلاقِ فاضلہ میں سے اعلیٰ ترین صفت ہے، کیوں کہ یہ صفت نفس کی پاکیزگی، زندہ ضمیری، دینی بیداری اور خوفِ الٰہی کی دلیل ہے، اگر کوئی با حیا نہیں ہے تو وہ مہمان نوازی نہیں کرے گا، وعدہ وفاء نہیں کرے گا، ادائے امانت سے روگردانی کرے گا، لوگوں کی ضروریات پوری نہیں کرے گا، ایثار و قربانی سے گریز کرے گا، برائی سے اجتناب نہیں کرے گا۔ ستر پوشی کا اہتمام نہیں

[1] مسند أحمد (١/ ٧٨) رقم الحديث (٥٧٨) احمد شاکر کا کہنا ہے: اس کی سند صحیح ہے جبکہ بعض دیگر علماء نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔

[2] التاريخ الإسلامي (١٢/ ٤٣١)

[3] الكامل في التاريخ (٢/ ٤٤٣)

کرے گا اور فواحش سے باز نہیں آئے گا۔ یہ صفتِ حیا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شخصیت میں بدرجۂ اتم موجود تھی، وہ خود اپنے اس خُلق کے بارے میں فرماتے ہیں: مجھے اللہ تعالیٰ سے حیا محسوس ہوتی ہے۔ امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان صفات کو حیا کے ساتھ مربوط کر دیا کیونکہ ان کے پیشِ نظر سب سے بڑا مقصد، اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا حصول تھا، یہ صاف ظاہر ہے کہ دنیوی اہداف کے بجائے یہی ہدف قابلِ قدر اور قابلِ تعریف ہے۔[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عبودیت، صبر اور اخلاص:

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی زندگی میں عبادت کا جامع مفہوم اپنایا، آپ رات کے قیام کی وجہ سے ممتاز ہو گئے اور اُن اہلِ تہجد سے ہو گئے تھے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴾

[السجدة: ١٦]

''ان کی کروٹیں اپنے بستروں سے الگ رہتی ہیں، وہ اپنے رب کو خوف اور امید کے ساتھ پکارتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انھیں دے رکھا ہے وہ اس سے خرچ کرتے ہیں۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ نہایت ہی سادہ مزاج تھے اور فقر و درویشی میں زندگی گزارتے تھے اور شان و شوکت سے گریز کرتے تھے۔ امارت کی ذمہ داری نے بھی ان کے مزاج میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کی۔ ان کے پاس طاقت تھی، اختیار تھا، دنیا کی بڑی بڑی حکومتیں ان کے سامنے سرنگوں ہو چکی تھیں۔ ہر آدمی ان کی آنکھ کے ایک اشارے پر اپنی جان قربان کرنے کے لیے تیار تھا، لیکن اس طاقت اور اختیار کو انھوں نے کبھی اپنی ذات کے لیے استعمال نہیں کیا۔ ایک بار عید سے چند دن پہلے کسی نے ان کے کپڑوں میں پیوند دیکھے تو کہا: ''امیر المومنین، آپ دو درہم میں نیا جوڑا کیوں نہیں خرید لیتے؟''

اس کے جواب میں انھوں نے فرمایا:

''مجھے شرم آتی ہے کہ میں نئے کپڑے پہنوں اور کوفے میں ہزاروں آدمیوں نے پرانے کپڑے پہن رکھے ہوں۔''

اللہ اکبر! یہ تھے خلیفۃ المسلمین۔ انہی کے متعلق ایک بار حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت ضرار اسدی رضی اللہ عنہ سے کہا کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اوصاف بیان کریں۔ انھوں نے کہا: اللہ گواہ ہے کہ میں نے

[1] التاريخ الإسلامي للحميدي (٢٠/ ٢٧٥)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کو روتے ہوئے یہ کہتے سنا ہے:

''ارے دنیا! تو مجھے رجھانے آئی ہے، دور رہو، دور ہو جا، میرے علاوہ کسی اور کو دھوکا دے، میں نے تجھے تین طلاقیں دے دی ہیں، اب تیری طرف رجوع کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔''

آگے فرماتے ہیں: ''تیری عمر تھوڑی ہے، تیری عیش حقیر ہے، تیرے خطرات بڑے ہیں۔ ہائے زادِ راہ کی کمی، سفر کی دوری اور راستے کی وحشت انگیزی!!''

یہ بیان سن کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور حاضرینِ مجلس بھی رونے لگے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اللہ ابو الحسن رضی اللہ عنہ پر رحم فرمائے، اللہ کی قسم! وہ ایسے ہی تھے۔''

اصحابِ مالک الاشتر النخعی امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے جبکہ وہ رات کی نماز ادا کر رہے تھے اور حالتِ قیام میں تھے۔ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نماز پڑھ چکے تو اشتر نے کہا: اے امیر المومنین! دن کے وقت روزہ اور رات کو بیداری؟ اور پھر ان دونوں کے درمیان تھکاوٹ؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: آخرت کا سفر طویل ہے، لہٰذا یہ رات کے وقت چلنے ہی سے کٹے گا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اور اس کی خشیت اختیار کرنے کی ترغیب دیتے تھے۔ انھوں نے فرمایا: اے لوگو! اس اللہ سے ڈرو کہ اگر تم کچھ کہو تو وہ سنتا ہے اور اگر کچھ چھپاؤ تو وہ جانتا ہے اور موت کی تیاری کرو، اگر تم نے اس سے فرار کی راہ اختیار کی تو وہ تمھیں آلے گی اور اگر ٹھہرے رہے تو پھر بھی وہ تمھیں اچک لے گی۔[1]

امیر المومنین نے بچپن ہی سے عملی زندگی میں صبر وتحمل کو اپنایا، خفیہ اسلام قبول کرنے کے وقت بھی اور مختلف جنگوں میں بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے بھی انھوں نے بڑے حوصلے کا ثبوت دیا، خلافتِ راشدہ کے دور میں بھی انھیں بڑے بڑے حادثات کا سامنا کرنا پڑا اور خود اپنے دورِ خلافت میں بھی انھوں نے طرح طرح کے فتنوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا حتیٰ کہ وہ شہادت کے رتبے پر فائز ہو گئے۔[2]

حضرت علی رضی اللہ عنہ مستجاب الدعوات تھے:

دعا خیر و برکت کے حصول کا ایک بہت بڑا دروازہ ہے۔ بندے کے لیے یہ دروازہ کھل جائے تو

[1] أدب الدنيا والدين (ص: ١٢٣) فرائد الكلام (ص: ٣٦٩)

[2] التاريخ الإسلامي (١٢/ ٤٣٤)

خیر و بھلائی دم بدم چلی آتی ہے اور برکتیں نازل ہوتی رہتی ہیں۔ امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ تعلق باللہ کا مجسّمہ تھے۔ وہ بڑی کثرت سے دعائیں مانگا کرتے تھے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ مستجاب الدعوات تھے۔ ایک آدمی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ایک حدیث سنائی تو انھوں نے فرمایا: تم نے یہ من گھڑت حدیث سنائی ہے۔ اس شخص نے تردید کی اور کہا: ایسا نہیں ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر تم جھوٹے ہو تو میں تمھارے لیے بددعا کرتا ہوں۔ اس نے کہا: کر لیجیے! حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کے لیے بددعا کی تو وہ شخص اندھا ہو گیا۔[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دعا کی تلقین فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ کسی بھی درپیش مصیبت یا سخت حالات میں یہ دعا پڑھو:

«لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ الْحَلِيْمُ الْكَرِيْمُ، سُبْحَانَهٗ، تَبَارَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ»[2]

''اللہ کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں، جو نہایت بردبار اور بہت زیادہ سخی ہے۔ وہ پاک ہے، اللہ عرشِ عظیم کا رب ہے۔ وہ بہت بابرکت ہے۔ سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جو سب جہانوں کا پالنے والا ہے۔''

یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی وہ چند صفات ہیں جو توحید اور ایمان باللہ کا ثمر ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہونے کے لیے ان کی فکر مندی کی جھلک دکھلاتی ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دَور میں امورِ مملکت کا مرجع:

امیر المومنین کا امورِ ریاست میں مرجعِ اول و اعلیٰ کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ اس کے بعد وہ شیخین یعنی حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی سیرت کی پیروی فرماتے تھے۔

مصدرِ اول: کتاب اللہ ہے:

فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ۭ وَلَا تَكُنْ

[1] البداية و النهاية (٨/٦)

[2] فضائلِ صحابہ (٢/٨٢٠)

لِّلْخَآئِنِینَ خَصِیمًا ﴾ [النساء: ۱۰۵]

''یقیناً ہم نے تمھاری طرف حق کے ساتھ اپنی کتاب نازل فرمائی ہے تاکہ تم لوگوں میں اُس چیز کے مطابق فیصلہ کرو جس سے اللہ نے تم کو شناسا کیا ہے اور خیانت کرنے والوں کے حمایتی نہ بنو۔''

اللہ تعالیٰ کی کتاب اُن تمام شرعی احکام پر مشتمل ہے جن کا تعلق زندگی کے امور و معاملات سے ہے۔ قرآنِ کریم نے مسلمانوں کی راہنمائی کے لیے وہ تمام اصول اور مبادیات بتا دیے ہیں جن کے وہ ضرورت مند ہیں اور جن پر ان کی ریاست قائم ہوتی ہے۔ امیر المومنین حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: اپنے دین سے وابستہ رہو، اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مقدسہ پر عمل کرو، سنت کی پیروی کرو، قرآن کے خلاف آنے والے اشکالات سے اعراض کرو، جو قرآن بتائے اسے لازم پکڑو اور جس کا انکار کرے اسے مسترد کر دو۔[1]

مصدرِ ثانی: سنتِ مطہرہ:

اسلامی دستور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی سنت سے اپنے اصول اخذ کرتا ہے، اسی کے ذریعے قرآنی احکام کے انطباق اور نفاذ کے قاعدوں کی پہچان ہوتی ہے۔ امیر المومنین نے فرمایا: اپنے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کی اقتداء کرو کیوں کہ وہ بہترین سیرت ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی سنت پر عمل کرو کیوں کہ وہ افضل ترین سنّت ہے۔[2]

مصدرِ ثالث: سابق خلفائے راشدین کی پیروی:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میرے بعد حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی اقتداء کرو۔''[3]

حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اُس اللہ کی قسم جس نے دانے کو پیدا کیا اور انسانی روح کی تخلیق فرمائی! حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے متقی اور مومن ہی محبت کرتا ہے اور فاسق و فاجر شخص ہی ان دونوں حضرات سے بُغض رکھتا ہے۔

---

[1] البداية و النهاية (۷/ ۲٤٦)

[2] البداية و النهاية (۷/ ۳۱۹) فقه التمكين في القرآن الكريم للصلابي (ص: ٤٣٢)

[3] جامع الترمذي، رقم الحديث (٣٦٦٢)

حُکّام کی نگرانی امت کا حق ہے:

امت کا حق ہے کہ وہ حکمرانوں کی نگرانی کرے اور انھیں سیدھا رکھے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴾ [آل عمران: ١٠٤]

''تم میں سے ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جو بھلائی کی طرف بلائے اور نیک کاموں کا حکم دے اور بُرے کاموں سے روکے اور یہی لوگ فلاح ونجات پانے والے ہیں۔''

باہم مشاورت:

اسلامی ریاست کے اساسی قواعد وقوانین میں سے ایک اہم ترین قانون یہ ہے کہ ریاست کی قیادت اور حکمران، مسلمانوں کے ساتھ مشاورت کیا کریں۔ ان کی رائے اور مشورہ کا احترام کریں اور نظامِ حکومت اُن کے مشورے سے چلائیں۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿ وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَأَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴾ [الشوریٰ: ٣٨]

''اور وہ لوگ جو اپنے رب کے فرمان کو قبول کرتے ہیں اور نماز کی پابندی کرتے ہیں اور ان کا ہر کام آپس کے مشورے سے ہوتا ہے اور جو ہم نے انھیں دے رکھا ہے اس میں سے ہمارے نام دیتے ہیں۔''

اس آیت میں مسلمانوں کو باہم مشورہ کرنے کا حکم، نماز قائم کرنے کے حکم کے ساتھ دیا گیا ہے۔ اس سے مشورے کی زبردست اہمیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس بات سے یہ دلیل بھی ملتی ہے کہ شوریٰ کا حکم نماز کے حکم کی مانند ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ نماز شرعی طور پر فرض ہے، ٹھیک اسی طرح باہم مشورہ کرنا بھی شرعاً واجب اور فرض قرار دیا گیا ہے۔[1]

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے ہر کام اور تمام فیصلوں میں شوریٰ کے منہج کا خصوصی التزام فرمایا کرتے تھے۔ شوریٰ کے بارے میں امیر المومنین سے مروی ہے:

[1] النظام السياسي في الإسلام لأبي فارس (ص: ٩)

''مشورہ کرنا عین ہدایت ہے اور جو خود کو عقلِ کُل سمجھتا ہے وہ خطرات ہی میں گھِرا رہے گا۔''[1]

بہترین تعاون مشاورت ہے اور بُری پالیسی استبداد ہے۔[2]

انھوں نے مزید فرمایا: بزرگ کی رائے لڑکے کے مشاہدہ سے زیادہ بہتر ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ جانتے تھے کہ اگر کسی حکمران کے مخلص مشیر نہ ہوں تو وہ اپنی ریاست کی خوبیوں اور خامیوں کو نہیں جان سکتا، اس طرح ریاست کے بہت سے امور اور اہم معاملات اس کی آنکھوں سے اوجھل رہتے ہیں۔ وہ جانتے تھے کہ شوریٰ اُن بہت سے امور سے باخبر رکھتی ہے جن سے حکمران ناواقف ہوتے ہیں، مشورے سے تمام امورِ سلطنت میں شکوک وشبہات ختم ہو جاتے ہیں۔

عدل و مساوات:

اسلامی حکومت کے اہداف میں یہ امر ترجیحی طور پر شامل ہے کہ اسلامی نظام وہ قواعد قائم کرنے کی کوشش کرے جو اسلامی معاشرے کے قیام میں مددگار ثابت ہوں، ان اہم قواعد میں سے ایک نہایت اہم قاعدہ عدل و مساوات ہے۔ امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے لوگوں کے مابین پوری طرح عدل قائم کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اوصافِ حمیدہ اور عملی وفقہی کمالات و رجحانات نے ان میں یہ اہلیت پیدا کر دی کہ اپنا کردار پوری طرح ادا کر سکیں۔

امیر المومنین اپنے عدل و انصاف میں ایک درخشاں نمونے کی حیثیت رکھتے تھے، انھوں نے اپنی سیرت کے حُسن سے لوگوں کے دلوں کو اپنا اسیر اور ان کی سوچ کو اپنا حامی بنا لیا۔ امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقاماتِ عدل میں سے ایک وہ واقعہ بھی ہے جسے عاصم بن کلیب نے اپنے والد سے روایت کیا ہے، انھوں نے کہا: حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس اصفہان سے مال آیا، انھوں نے اس کے سات برابر برابر حصے کیے، اس مال میں ایک روٹی بھی تھی، اس کے بھی سات ٹکڑے کیے اور ہر حصے پر ایک ٹکڑا رکھ دیا، پھر آپ نے یہ مال لینے والے افراد کے درمیان قرعہ ڈالا کہ سب سے پہلا حصہ کسے دیا جائے۔[3]

حضرت علی رضی اللہ عنہ لوگوں کے مابین عطیات میں مساوات کا خاص اہتمام فرمایا کرتے تھے، اور اس

---

[1] أدب الدنيا و الدين للماوردي (ص: ٨٩، ٢٩١) و الادارة العسكرية (١/ ٢٧٩)

[2] نهاية الأرب (٦/ ٢١) الحكم الإسلامي (ص: ١٥١) الشوریٰ بين الاصالة و المعاصره لعز الدين التميمي (ص: ١٠٢)

[3] الكامل في التاريخ (٢/ ٤٤٢)

باب میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اقتداء کیا کرتے تھے۔ آپ کسی اشرافیہ طبقے والے کو کم تر طبقے کے انسان پر اور کسی عربی کو عجمی پر ترجیح نہیں دیتے تھے۔ انھوں نے ایک مرتبہ دو عورتوں کو کھانا اور کچھ درہم برابر برابر مرحمت فرمائے، ان میں سے ایک خاتون عربی اور دوسری عجمی تھی، ان میں سے پہلی خاتون نے احتجاج کیا اور کہا: میں عربی ہوں اور یہ عجمی ہے، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: اللہ کی قسم! میں اس مالِ فَے میں بنی اسماعیل کو بنی اسحاق پر ترجیح نہیں دے سکتا۔

جب ان سے مطالبہ کیا گیا کہ عرب کے اشرافیہ طبقہ اور قریش کو دیگر موالی اور عجمیوں پر ترجیح دی جائے تو انھوں نے فرمایا: اللہ کی قسم! اگر یہ مال میرا اپنا ہوتا تب بھی میں ان کے مابین برابری کا معاملہ کرتا، اب تو مال ان کا اپنا ہے۔[1]

آزادی کی ضمانت:

آزادی ان بنیادی اصولوں میں سے ہے جس پر خلفائے راشدین کے عہد میں حکمرانی کا نظام قائم تھا، یہ اصولِ شریعت کی حدود میں رہتے ہوئے لوگوں کو عام آزادیوں کی ضمانت دیتا ہے۔ اسلام کی دعوت کی بنیاد ہی لوگوں کی آزادی کی ضمانت تھی۔ تاریخ میں اتنی عظیم الشان اور وسیع وعریض دعوت کی مثال بہت کم ملتی ہے۔ کیونکہ اسلام کے یہ اصول جن کی دعوت پیش کی گئی ہے آزادی کے بغیر بے معنیٰ ہیں۔ خلفائے راشدین کی حکمرانی کے ابتدائی دَور خاص طور پر جس وقت اسلام کی دعوت پھیلنے لگی اور مسلمانوں کو پے در پے فتوحات حاصل ہوئیں اور ریاست کا رقبہ پھیلتا چلا گیا تو آزادی نے اپنا فعال کردار ادا کیا، کیوں کہ اسلام نے انسان کو عزت سے نوازا اور وسیع پیمانے پر آزادیوں کی ضمانت دی۔

یہ صرف اسلام ہی ہے جس کے تحت نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے دور میں انسانیت کو وہ حقیقی آزادی میسر تھی جس کے معنیٰ آج کے دور میں بڑی آسانی سے سمجھے جا سکتے ہیں۔[2] امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اقوال میں آزادیوں کا پورا دفاع کیا گیا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عملی کردار نے بھی اسلامی معاشرے میں آزادی کے اصول کو تقویت دی۔

ان کا یہ قول تو بہت مشہور ہے: ''یہ عدل نہیں کہ گمان پر اعتماد کر کے فیصلہ دے دیا جائے۔'' ان کا یہ

---

[1] تراث الخلفاء الراشدين (ص: ١٠١)

[2] نظام الحكم في عهد الخلفاء الراشدين (ص: ١٥٧، ١٥٨)

قول اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ قطعاً جائز نہیں ہے کہ لوگوں کو شبہات کی بنیاد پر پکڑ کر ان کے خلاف فیصلہ دے دیا جائے بلکہ یہ کام ایسے یقین کی بنا پر ہونا چاہیے جس کے دلائل قطعی ہوں اور بہترین دلائل و قواعد وہ ہیں جو شریعت میں بیان کر دیے گئے ہیں کہ ملزم کے خلاف جب تک ثبوت نہ ملے وہ بے گناہ تصوّر کیا جائے گا۔ اسلام نے یہ حقیقت بہت مدت پہلے عیاں کردی تھی اور اس کا اعلان کر دیا تھا۔[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں آزادی وحرمت کا اصول بہترین شکل اور مفہوم میں روشن رہا۔ ان کے عہد میں بہت سنگین حالات پیش آئے۔ فتنوں، سازشوں اور جنگوں کا ظہور ہوا اور اس بات کی شدت سے ضرورت محسوس ہوئی کہ افراد کی آزادی، ان کی نقل وحرکت اور قیام کرنے کے سلسلے میں کچھ پابندیاں لگائی جائیں۔ لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کسی کی آزادی پر کوئی قدغن نہیں لگائی، چاہے کوئی ان کا پیروکار ہو یا مخالف۔ کسی شخص نے بھی ان کی حکمرانی کے دوران اُن کے زیرِ سایہ رہنے یا باہر جانے میں کوئی دقّت محسوس نہیں کی۔

نیکی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے کا التزام:

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زندگی اللہ کی توحید، لوگوں میں ایمان کے معانی اجاگر کرنے، اللہ پر اعتماد وتوکّل اور اس کے خوف سے معمور تھی۔ انھوں نے اللہ کا تعارف اس کے اسمائے حسنیٰ اور اعلیٰ صفات بیان کر کے اور مختلف اشکال وانواع میں شرک کے خلاف جنگ کے ذریعے سے کروا دیا۔ وہ لوگوں کی جس طرح راہنمائی فرماتے، تعلیم وتربیت دیتے، جس طرح توحید کی دعوت دیتے اور شرک کے خلاف ڈٹ کر جنگ کرتے تھے، وہ بڑی ولولہ انگیز اور سبق آموز داستان ہے۔ اس کے چند امور نہایت اہم ہیں:

ان کا قول ہے:

> ''کوئی شخص اپنے رب کے سوا کسی سے کوئی امید نہ رکھے اور اپنے گناہ کے سوا کسی چیز سے نہ ڈرے۔''[2]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ چھوٹا سا جملہ کوزہ در دریا کے مترادف ہے۔ اس ننھے سے فقرے میں معانی کا ایک بہت بڑا جہاں پوشیدہ ہے۔ یہ بڑی بہترین بات ہے، یہ فصاحت و بلاغت کا مرقّع ہے۔ امید ہوتی

---

[1] نظام الحكم في عهد الخلفاء الراشدين (ص: ١٦٥)

[2] الفتاویٰ (٨/ ١٠١)

ہے تو خیر و بھلائی ہی کی ہوتی ہے اور خوف بہر حال شر اور برائی سے ہوتا ہے۔ کسی کو اگر شر کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو صرف اپنے گناہوں کی وجہ سے کرنا پڑتا ہے۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمَآ اَصٰبَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ﴾ [الشوریٰ: ۳۰]

''تمھیں جو کچھ مصیبتیں پہنچتی ہیں وہ تمھارے اپنے ہاتھوں ہی کے کرتوت کا بدلہ ہے، اور وہ تو بہت سی باتوں سے درگزر فرما لیتا ہے۔''

پُر امید شخص خیر کے حصول کا آرزو مند ہوتا ہے اور شر کو دور کرنا چاہتا ہے۔ نعمتیں تو بس اللہ ہی کی جانب سے ملتی ہیں اور مصائب کو دور کرنے والا اللہ کے سوا کوئی نہیں۔

آثارِ جاہلیت مٹانے کا حکم:

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک جنازہ میں شامل تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے کون ہے جو مدینہ جائے اور وہاں جو بھی بُت دیکھے اسے توڑ ڈالے؟ اور جو (بلند و بالا) قبر دیکھے اسے برابر کردے اور جو بھی تصویر دیکھے اسے مسخ کر دے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عرض کی: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! میں اس خدمت کے لیے حاضر ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: روانہ ہو جاؤ، لہٰذا وہ چلے گئے اور واپس آکر اطلاع دی کہ انھوں نے تمام بت پاش پاش کر دیے، ہر بلند قبر برابر کر دی اور ہر تصویر کا حلیہ بگاڑ دیا ہے۔ بعد ازاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو ان مذکورہ چیزوں کو دو بارہ بنائے تو اس نے (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر نازل ہونے والے دین سے کفر کیا۔''[1]

جب حضرت علی رضی اللہ عنہ امیر المومنین بنے تو آپ نے حضرت ابو الہیاج الاسدی رحمہ اللہ کو بلا بھیجا اور اس سے فرمایا: میں تمھیں اُس مقصد کے لیے بھیج رہا ہوں جس کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بھیجا تھا۔'' جاؤ کوئی بت باقی نہ چھوڑو، سب کو مٹا دو، اور بلند و بالا قبریں برابر کردو۔''[2]

حضرت علی رضی اللہ عنہ اکثر اوقات قبروں کی زیارت کرنے اور عبرت کے حصول کے لیے قبرستان جاتے تھے اور فرمایا کرتے تھے: اے اہلِ قبور! اپنا حال سناؤ، ہمارے پاس تمھارے لیے یہ خبر ہے کہ تمھاری عورتوں نے شادی کر لی، تمھارا مال تقسیم ہو چکا، تمھاری رہایش گاہوں میں دوسرے لوگ رہنے لگے۔ پھر فرمایا: اگر

[1] مسند أحمد (۱/ ۸۷، ۱۳۸) احمد شاکر نے اس حدیث کو حسن کہا ہے۔

[2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۹۶۹)

یہ قبروں والے بولنے کی سکت پائیں تو یہ کہیں گے: اللہ کی قسم! تقویٰ سے بہتر ہم نے کوئی چیز نہیں دیکھی۔[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ توحید کے عقیدے پر بہت زور دیتے تھے۔ ہر طرف سے شرک کے وسائل و اسباب ختم کرنے کی تاکید فرمایا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے قبروں کو سجدہ گاہ بنانے سے منع کیا۔ انھوں نے وضاحت فرمائی کہ ''جو لوگ قبروں کو سجدہ گاہ بناتے ہیں وہ بدترین لوگ ہیں۔''[2]

پکی قبروں کی تعمیر کے لیے سامراجی منصوبہ:

مغربی سامراجی طاقتوں کے مسلمانوں پر حملوں نے انھیں قبر پرستی کی لعنت میں مبتلا کرنے میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔ انگریزی اخبار ''ٹائمز'' نے برطانوی استعمار کے ایک اہم شخص کے بارے میں یہ نقل کیا ہے کہ اس نے مسلمانوں میں بدعات وخرافات، توہّم پرستی اور ضعیف الاعتقادی پھیلانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ ضعیف الاعتقادی اور قبر پرستی مسلمانوں کو اسلام سے دور کرنے کا تیر بہدف طریقہ ہے۔

شیخ احمد باقوری کا کہنا ہے کہ مستشرقین میں سے ایک بڑی شخصیت نے انھیں ایشیا میں بعض سامراجی طور طریقوں، خفیہ حکمتِ عملی اور اقدامات کے بارے میں بتایا۔ سامراجی مقاصد کا تقاضا یہ تھا کہ ہندوستان سے آنے والے قافلے بغداد سے گزر کر دیگر علاقوں کو جائیں لیکن قافلے یہ روٹ اختیار کرنے پر رضا مند نہیں تھے۔ اس سلسلے میں مختلف اقدامات پر بہت غور وفکر کے بعد بالآخر یہ طے ہوا کہ اس راستے پر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر قبے اور مزار تعمیر کر دیے جائیں۔ لہٰذا تھوڑے ہی عرصے میں ان اولیاء کے مزارات کی خبریں مشہور ہو گئیں اور پھر پروپیگنڈہ کے زور پر یہ بات عام کر دی گئی کہ ان میں فلاں فلاں اولیاء آخری آرامگاہ کے طور پر قیام پذیر ہیں اور ان کی فلاں فلاں کرامات دیکھی گئی ہیں، اس حربے کے ذریعے یہ راستے اور مقامات قبریں اور قبے لوگوں کی نظر میں مانوس ہو کر ان کا مقصود بن گئے اور آباد ہوتے چلے گئے۔

انگریز حکومت نے مصر میں لوگوں کی دینی حالت کا جائزہ لیا، دوسری طرف وہ اس علاقہ میں سوشلسٹوں کی تحریک پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ انگریزوں کو مصر میں مسلمانوں کی دینی پستی دیکھ کر بڑا اطمینان ہوا۔ خاص طور پر وہ اس بات سے بڑے خوش ہوئے کہ اسی سال طنطا میں احمد البدوی کی قبر پر تین لاکھ

[1] الاستذکار لابن عبد البر (١/ ٢٣٤)

[2] مصنف عبد الرزاق (١/ ٤٠٥) کنز العمال، رقم الحدیث (٢٢٥٢٢)

مسلمان زیارت کے لیے آئے۔ وزارتِ اوقاف کی طرف سے جو عالم وعظ کے لیے مقرر ہوئے ان کا کہنا ہے کہ میں لوگوں کی جو غیر دینی حالت اور غیر اسلامی افعال دیکھ رہا تھا وہ اس پر ڈانٹ کے نہیں بلکہ کوڑے مارے جانے کی مستحق تھے۔ اگر انھیں صحیح دینی فرائض وواجبات کی طرف دعوت دی جاتی تو وہ ضرور بھاگ جاتے۔ ان کی دینی پستی کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اس بزرگ کی قبر پر مانی ہوئی نذریں پوری کرنے اور صاحبِ قبر کے حضور گڑگڑا کر دعا کرنے کے لیے آئے تھے۔[1]

کیا مزاراتِ دین میں ترمیم واضافہ کے مترادف ہیں؟

رسولِ اکرام صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں تمام مخلوقات میں معزز ترین اور تقویٰ کے اعلیٰ مقام پر فائز تھے اور صحابہ کی طرف سے ان کا انتہائی احترام کوئی ڈھکی چھپی بات نہ تھی، انھیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے جس قدر محبت تھی اس کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبرِ مبارک آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے گھر میں تھی اور تمام صحابۂ کرام کو معلوم تھی۔ یہ قبرِ مبارک دنیا کی افضل ترین قبر تھی مگر صحابۂ کرام نے اس پر نہ کوئی عمارت بنائی، نہ کوئی قبہ بنایا۔ نہ خلفائے راشدین اور دیگر صحابہ سالانہ بنیادوں پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یاد تازہ کرنے کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبرِ مبارک پر جمع ہوئے۔ ان کا معمول یہ تھا کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبرِ مبارک کے قریب سے گزرتے تو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام بھیجتے تھے۔ صحابۂ کرام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی اطاعت کرتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے دیے گئے اوامر ونواہی پر عمل کرتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں بھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بھی ان کا یہ عمل اللہ تعالیٰ کے اس حکم کی پابندی کا آئینہ دار تھا:

﴿ وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ﴾ [الحشر: ٧]

''جو کچھ رسول تمھیں دیں وہ لے لو اور جس چیز سے روکیں، اُس سے رُک جاؤ۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نجوم پرستی کو سختی سے مسترد کر دیا:

جب امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خوارج کے خلاف لڑائی کے لیے سفر کا ارادہ کیا تو ایک نجومی آیا۔ اس نے آپ سے کہا: اس وقت سفر مت کیجیے چاند عقرب میں ہے، آپ نے اس حالت میں سفر کیا تو

[1] الغلو في الدين (ص: ١٠٥)

آپ کے ساتھیوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑے گا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ تو تم کہتے ہو، لیکن میں اللہ تعالیٰ پر اعتماد اور توکّل کی بنا پر تمھیں جھٹلانے کے لیے ضرور سفر کروں گا۔ چنانچہ آپ نے سفر کیا، اللہ نے انھیں اس سفر میں برکت عطا فرمائی۔ اکثر خارجی مارے گئے۔[1]

ایک روایت میں آیا ہے: جب آپ جنگِ نہروان سے فارغ ہوئے تو آپ نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کی اور ارشاد فرمایا: اگر ہم نجومی کے دیے گئے وقت کے مطابق چلتے تو جاہل لوگ کہتے کہ آپ نجومی کے بتائے ہوئے وقت پر چلنے کی وجہ سے کامیاب ہوئے ہیں۔[2]

اس واقعہ سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ امیر المومنین کو عقیدہ کی سلامتی کی کتنی فکر تھی، انھوں نے نجومی کے دعوے اور فاسد عقیدے کو مسترد کر دیا، حالانکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ خارجیوں کے خلاف لڑائی کے نازک معاملے اور اس معرکہ کے نتائج کے بارے میں بہت فکر مند تھے لیکن وہ نجومی کی بات کی تردید کرنا نہیں بھولے، انھوں نے فتح یاب ہونے کے بعد ایک مناسب وقت پر نجومی کے فاسد عقیدے کی پوری وضاحت سے تردید کی۔[3]

اہلِ بازار کے لیے راہنمائی:

حضرت علی رضی اللہ عنہ منڈی اور بازار کے کاروباری معاملات پر ہمیشہ نظر رکھتے تھے۔ وہ لوگوں کو شریعت کے مطابق معاملات طے کرنے کی ترغیب دیتے تھے۔ بازار کے معاملات میں وہ کڑا احتساب کرتے تھے۔ حر بن جرموز المرادی اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے بتایا: میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دیکھا۔ وہ پنڈلی تک تہبند باندھے ہوئے تھے اور اوپر کی چادر سمیٹ کر پہنے ہوئے تھے۔ ان کے ہاتھ میں درہ تھا اور وہ بازاروں کا چکر لگا رہے تھے۔ لوگوں کو اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے کی نصیحت فرما رہے تھے۔ اچھے انداز میں خرید و فروخت کا حکم دے رہے تھے۔ فرما رہے تھے: ناپ اور تول دونوں کو پورا رکھو! اور گوشت کی ہڈیوں سے مخ نہ نکالو۔[1]

---

[1] مجموع الفتاوی (۳۵/ ۱۷۹) البداية و النهاية (۷/ ۲۸۸)

[2] البداية و النهاية (۷/ ۱۸۸)

[3] منهج علي بن أبي طالب في الدعوة إلى الله (ص: ۳۲۹)

[4] فضائل الصحابة (۲/ ٦۸۸) اس کی سند صحیح ہے۔

عورتوں کے لیے مَردوں کی بھیڑ میں گُھسنے کی ممانعت:

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں کو برا بھلا کہا جو اپنی عورتوں کو کافر مردوں کے ساتھ بازار میں بھیڑ میں چلنے پھرنے سے منع نہیں کرتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا: کیا تمھیں حیا نہیں آتی؟ کیا تم غیرت سے کام نہیں لیتے؟ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمھاری عورتیں بازار جاتی ہیں اور عجمی کافر مردوں کے ساتھ بھیڑ میں گھس جاتی ہیں۔[1]

ذخیرہ اندوز گناہ گار اور ملعون ہے:

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے غذائی اجناس کی ذخیرہ اندوزی کے بارے میں فرمایا:

''غلہ اور کھانے کی اشیاء سپلائی کرنے والے کو رزق سے سرفراز کیا جاتا ہے اور ذخیرہ اندوز گناہ گار اور ملعون قرار پاتا ہے۔''[2]

امام ابن قدامہ کی یہ رائے ہے کہ حرام ذخیرہ اندوزی وہ ہے جس میں تین شرائط پائی جائیں:

1. کوئی شخص سامان خریدے اگر وہ اپنا سامان بیچنے کے لیے لایا یا اپنے ہی غلے میں سے کچھ محفوظ کرلیا تو ایسا آدمی ذخیرہ اندوز شمار نہیں ہوگا۔
2. خریدی ہوئی چیز کا تعلق کسی خوراک سے ہو۔ امام شوکانی وغیرہ بعض علماء نے انسانوں اور جانوروں کے سامانِ خورد ونوش اور دیگر اشیاء میں کوئی فرق نہیں کیا۔
3. اس خریداری سے اس کا مقصد کسی بھی غرض سے لوگوں کے لیے تنگی پیدا کرنا ہو۔

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ذخیرہ اندوزی کی ممانعت کا جو حکم جاری کیا اس کی بنیاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول پر ہے: ''گناہ گار و خطا کار ہی ذخیرہ اندوزی کرتا ہے۔''[3]

شراب فروخت ہونے پر بستی کو آگ لگا دی:

حضرت علی رضی اللہ عنہ شراب کے معاملے میں نہایت سختی سے کام لیتے تھے۔ وہ ہرگز گوارا نہیں کرتے تھے کہ کوئی شخص شراب بیچے۔ انھیں ایک بستی میں شراب بکنے کی اطلاع ملی تو انھوں نے فوراً حکم دیا کہ اس بستی

---

[1] مسند أحمد (٢/ ٢٥٤۔ ٢٥٥) علامہ احمد شاکر کرنے اس حدیث کی سند کو صحیح کہا ہے۔

[2] فقه علی لقلعجی (ص: ٢٧) و مصنف عبد الرزاق (٨/ ٢٠٤) و مسند زید (ص: ٢٤٥)

[3] مسلم مع النووي (١١/ ٤٣)

کو آگ لگا دی جائے۔ امام ابوعبید القاسم بن سلام سے روایت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے زُرارہ[1] کی طرف دیکھا اور دریافت فرمایا: یہ کون سی بستی ہے؟ لوگوں نے عرض کی کہ اس بستی کا نام زُرارہ ہے، یہاں شراب فروخت کی جاتی ہے۔ یہ سنتے ہی آپ اٹھ کھڑے ہوئے اور اس بستی میں جا پہنچے۔ فرمایا: آگ لاؤ اور اس بستی کو بھسم کر دو۔ بے شک ایک خبیث چیز دوسری خبیث شے کو کھا جائے گی۔ راوی کہتا ہے: وہ بستی آناً فاناً جل گئی۔ یہاں تک کہا گیا ہے کہ آگ خواستا بن جبرونا کے باغ تک جا پہنچی۔[2]

لباس اور وضع قطع پر احتساب کے ذریعے تہذیبی اصلاح:

ابو مطر سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں: میں مسجد سے باہر نکلا۔ اچانک میں نے سنا کہ کوئی آدمی مجھے پیچھے سے پکار رہا ہے: اپنا تہبند اوپر کر لو۔ یہ طریقہ تمھارے کپڑے کے پاک صاف رہنے کے لیے بہت بہتر ہے اور تقویٰ کے لحاظ سے زیادہ مناسب ہے۔ اور اگر تم مسلمان ہو تو اپنے بالوں کی وضع قطع ٹھیک کر لو! یہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ تھے۔[3]

حضرت علی رضی اللہ عنہ فساد پھیلانے والوں کو جیل بھیج دیتے تھے:

حضرت علی رضی اللہ عنہ فساد پھیلانے والے لوگوں کا پیچھا کرتے تھے اور جو شریر قابو آجاتا اسے قید کر دیتے تھے۔ قاضی ابو یوسف، عبد الملک بن عمیر سے روایت کرتے ہیں: حضرت علی رضی اللہ عنہ جب کسی قبیلے یا قوم میں کسی شریر، خبیث اور بدکار شخص کو دیکھتے تو اسے قید کر دیتے تھے۔ اگر وہ مالدار ہوتا تو اس کا خرچہ اسی کے مال سے کراتے تھے اور اگر مفلس ہوتا تو مسلمانوں کے بیت المال سے اس پر خرچ کرتے اور حکم دیتے تھے کہ شریروں اور فسادیوں کو قید میں رکھ کر عوام الناس کو ان کے شر سے محفوظ رکھا جائے اور بیت المال سے ان پر خرچ کیا جائے۔[4]

نماز کے لیے پکار:

حضرت علی رضی اللہ عنہ نماز کا حکم دینے کا بہت اہتمام فرمایا کرتے تھے۔ وہ کسی راستے سے گزرتے تو بلند

---

[1] کوفہ میں ایک محلے کا نام ہے جو اس کے بانی زُرارہ کے نام پر رکھا گیا۔

[2] الأموال لأبي عبيد (ص: ٩٧، ٩٨) الحسبه لابن تيمية (ص: ٦٠)

[3] البداية و النهاية (٨/٤)

[4] الخراج للإمام أبي يوسف (ص: ١٥٠)

آہنگی سے پکارتے تھے: نماز! نماز !!...وہ منہ اندھیرے اپنے گھر سے نکل آتے اور ''نماز! نماز!!'' کی صدا بلند کر کے لوگوں کو فجر کی نماز کے لیے جگاتے تھے۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جس دن وہ شہید ہوئے، اس روز وہ گھر سے نکلے، اور دروازے سے باہر قدم رکھتے ہی آواز لگائی: اے لوگو! نماز! نماز!!۔ یہی ان کا روزانہ کا معمول تھا۔ آپ کے ہاتھ میں دُرّہ ہوتا تھا۔ اس روز اُن کی راہ میں دو آدمی حائل ہوئے اور ابن ملجم نے ان کے سر پر ضرب لگائی۔[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حکیمانہ اقوال:

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زبان سے فی البدیہہ صادر ہونے والے اقوال کا ایک مجموعہ موجود ہے۔ انھیں براہِ راست رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے شرفِ تلمذ حاصل تھا۔ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے علمِ وحی حاصل کیا، جس سے ان کی زبان میں فصاحت اور بیان میں بلاغت پیدا ہوگئی۔ ان کی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ موتیوں کی مانند ہیں اور ان کے جملوں میں حکمت و دانائی کے ایسے خزانے چمک رہے ہیں جو عقل کو خیرہ کر دیتے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ملفوظات اہلِ بلاغت کا مقصود و مطلوب اور اہلِ ہدایت کے لیے بڑی قیمتی دولت ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ متقی دل اور صاف و شفاف سینے سے پھوٹنے والے گوہرِ آبدار ہیں۔

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں کچھ لوگ جمع تھے، انھوں نے نیکی کے موضوع پر باتیں کیں۔ امیر المومنین نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے فرمایا: نیکی ایک بہترین خزانہ ہے اور بہترین کھیتی ہے، اس کے انکار کرنے والے پر توجہ نہ دو، جو بھلائی حاصل نہ ہونے پر بھی شکریہ ادا کرے وہ بھلائی کے حصول پر شکریہ ادا کرنے والے سے زیادہ اونچے درجے کا آدمی ہے۔ نیکی کا برتاؤ کرتے ہوئے کسی طرف سے شکرگزاری کا انتظار نہ کرو۔ نیکی کی تکمیل تین باتوں سے ہوتی ہے:

① اپنی نیکی کو چھوٹا سمجھو۔ ② اسے چھپاؤ۔ ③ اور نیکی کرنے میں تاخیر سے کام نہ لو۔ جب اسے چھوٹا سمجھو گے تو یہ اس کے عظیم ہونے کی علامت ہوگی۔ جب نیکی چھپاؤ گے تو یہ اس کی تکمیل ہے، اور جب اس میں تاخیر سے کام نہیں لوگے تو دوسروں کے لیے اس نیکی کو خوشگوار بنا دو گے۔[2]

---

[1] البداية و النهاية (٧/ ٣٣٩)

[2] تاريخ اليعقوبي (٢/ ٢١٠) منهج علي بن أبي طالب (ص: ٢٣٠)

1 یہ نہ دیکھو کس نے کہا ہے، یہ دیکھو کہ کیا بات کہی ہے۔

2 بہترین انسان وہ ہے جو دوسروں کے لیے نفع بخش ہو۔

3 آدمی کی شخصیت اس کی زبان کے پیچھے پوشیدہ ہے۔[1]

4 زبان ایک ترازو ہے۔ اس میں جہالت بے وزن اور عقلمندی کا پلڑا بھاری ہے۔[2]

5 عاجز ہونا آفت ہے۔

6 صبر بہادری ہے۔

7 زہد بڑی دولت ہے۔

8 تقویٰ جنت میں لے جانے والی چیز ہے۔

9 غربت عقلمند کو اپنی دلیل پیش کرنے سے روک کر گونگا بنا دیتی ہے۔

10 غریب اپنے شہر میں بھی اجنبی ہوتا ہے۔

11 جب دنیا کسی کے پاس آجاتی ہے تو دوسروں کی خوبیاں بھی اسے دے دیتی ہے۔ اور جب دنیا اس سے منہ پھیر لیتی ہے تو اس کی ذاتی خوبیاں بھی اس سے چھین لیتی ہے۔

12 قدرت رکھتے ہوئے کسی غلطی کے مرتکب کو معاف کر دینا اس قدرت پر اللہ کا شکر ادا کرنے کے مترادف ہے۔[3]

یہ امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعض حکیمانہ اقوال ہیں۔ اقوال کیا ہیں، سنہرے موتیوں کی لڑی ہے۔ لگتے چھوٹے چھوٹے جملے ہیں مگر معانی کے لحاظ سے کتنے عظیم الشان ہیں۔

ان لفظوں میں ان کی زندگی کے تجربات کا نچوڑ ہے، ان کے معانی بڑے عظیم اور روشن ہیں۔ جس معاشرے میں انھوں نے زندگی بسر کی، اُس میں اور اس کے بعد کے معاشروں اور بعد ازاں آج تک ان ملفوظاتِ عالیہ کے اثرات جاری ہیں۔ یہ حکیمانہ اقوال، اسلامی معاشرے کی راہنمائی اور تعلیم و تربیت کے لیے مینارۂ نور کی حیثیت رکھتے ہیں۔

---

[1] منهج علي بن أبي طالب (ص: ٢٥٠، ٢٥٢)

[2] أدب الدنيا و الدين (ص: ٢٦٥)

[3] مطلوب كل طالب منقول از منهج على (ص: ٢٣٩)

رجال کبار کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خیالات

نیکی میں اوجِ کمال والے اعاظم رجال کی صفات:

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نیکی کے میدان میں باکمال لوگوں کی صفات کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا: جب وہ نیکی کرتے ہیں تو خوشی محسوس کرتے ہیں، بھولے چوکے برائی کر لیں تو استغفار کرتے ہیں۔ کوئی آزمایش آتی ہے تو صبر کرتے ہیں اور جب انھیں غصہ آتا ہے تو معاف کر دیتے ہیں۔[1]

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے اوصاف کی یاددہانی:

جب امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے ساتھیوں میں کچھ کوتاہی پائی اور اطاعتِ الٰہی میں کسی قدر کمی محسوس کی تو آپ نے انھیں نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کی سیرتِ مقدسہ یاد دلائی۔ ابو اراکہ راوی ہیں کہ میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ فجر کی نماز پڑھی۔ کچھ دیر کے بعد اچانک میں نے دیکھا کہ ان کے چہرے پر پریشانی کے آثار ہو یدا ہیں۔ جب دھوپ مسجد کی دیوار پر ایک نیزے کے برابر آگئی تو انھوں نے دو رکعتیں ادا کیں، پھر اپنے ہاتھ الٹ پلٹ کر فرمایا: اللہ کی قسم! میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کو دیکھا ہے۔ ان کے مقابلے میں آج لوگوں کو دیکھتا ہوں تو مجھے اِن میں اُن کے مشابہ کوئی بات نظر نہیں آتی۔ جب صحابۂ کرام کو علی الصباح دیکھا جاتا تو ان کی آنکھیں دیکھ کر یہ معلوم ہوتا تھا کہ انھوں نے ساری رات سجدے اور قیام ہی کی حالت میں گزاری ہے۔ وہ کتاب اللہ کی تلاوت کرتے تھے، طویل قیام کرتے تھے، طویل سجدے کرتے تھے۔ وہ صبح کے وقت ذکرِ الٰہی میں مشغول ہوجاتے تو یوں لگتا جیسے تیز ہوا کے جھونکوں سے درخت دائیں بائیں جھکے جا رہے ہیں۔ ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی ایسی جھڑی لگتی تھی کہ ان کے کپڑے بھیگ جاتے تھے اور وہ دنیا و ما فیہا سے غافل نظر آتے تھے۔ ان ارشادات کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ اٹھے اور خاموشی سے چلے گئے۔ پھر ان کے لبوں پر کبھی مسکراہٹ نہیں دیکھی گئی یہاں تک کہ وہ وقت آگیا کہ اللہ کے دشمن ابن ملجم نے انھیں شہید کر ڈالا۔[2]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اپنے اصحاب کو فضائلِ اعمال کے لیے توجہ دلانا:

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک خطبے میں ارشاد فرمایا: ''اے لوگو! میں تمھیں اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے

---

[1] مروج الذهب (٢/ ٤٣١)

[2] حلية الأولياء (١/ ٧٦)

کی وصیت کرتا ہوں، مسلمان کے لیے افضل کام یہ ہے کہ وہ ایمان میں محکم ہو۔ راہِ حق میں جہاد اور کلمۂ اخلاص کی پاسداری کرے۔ یہ عین فطرتِ اسلام ہے، نماز قائم کرنا ملت کی علامت ہے۔ ادائے زکات ایک فریضہ ہے، ماہِ رضان کے روزے عذابِ الٰہی سے بچاؤ کی ڈھال ہیں اور حجِ بیت اللہ گناہوں سے پاک کرنے کا سبب ہے۔ صلہ رحمی درازیِ عمر کا باعث ہے۔ اہل وعیال سے محبت اور پوشیدہ طور پر صدقہ کرنا گناہوں کا کفارہ اور رب العزت کے غصے کو ٹھنڈا کرنے والا ہے، نیکی کا رویہ اختیار کرنا بری موت سے بچنے کی یقینی تدبیر ہے، اللہ کے ذکر کی طرف لوٹ آؤ۔ یہی بہترین ذکر ہے۔

صاحبزادے کی خطابت سننے کی تمنا:

ایک دن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے صاحبزادے حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے فرمایا: میرے بیٹے! میں چاہتا ہوں کہ تمھیں خطاب کرتے ہوئے سنوں۔ انھوں نے عرض کی: مجھے آپ کے سامنے خطاب کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ ایک روز حضرت حسن رضی اللہ عنہ لوگوں سے خطاب کر رہے تھے، حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک طرف چُھپ کر بیٹھ گئے اور اپنے بیٹے کا خطاب سنا۔ ان کا خطاب فصاحت وبلاغت کا شہ پارہ تھا، خطاب سننے کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قرآنِ کریم کی آیت پڑھی:

﴿ ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ ۗ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴾ [آل عمران: ٣٤]

''یہ سب آپس میں ایک دوسرے کی نسل سے ہیں اور اللہ خوب سنتا اور جانتا ہے۔''[2]

تین مشکل ترین اعمال:

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مشکل ترین اعمال تین ہیں:

1. ایک یہ کہ دوسرے کو اس کا حق دیا جائے۔
2. دوسرا یہ کہ ہر حال میں اللہ کا ذکر کیا جائے۔
3. اور تیسرا یہ کہ مال کے ذریعے دوسروں کی غمخواری اور امداد کی جائے۔[3]

---

[1] البداية و النهاية (٧/ ٣١٩)

[2] البداية و النهاية (٨/ ٣٧)

[3] تنبيه الغافلين (ص: ٢٤٥)

لمبی امیدیں اور خواہشات کی پیروی:

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کوفہ کی جامع مسجد میں خطبہ ارشاد فرمایا: آپ نے اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء بیان کی۔ پھر فرمایا: ''اے لوگو! سب سے خوفناک چیز جس کی وجہ سے، میں تمھارے بارے میں ڈرتا رہتا ہوں وہ لمبی امید اور خواہشات کی پیروی ہے، لمبی امیدیں آخرت کو بھلا دیتی ہیں، رہا خواہشات کی پیروی کا معاملہ تو یہ راہِ حق سے روک دینے کا سبب بن جاتا ہے، یہ دنیا پیٹھ پھیر کر جا رہی ہے اور آخرت تمھارے سامنے ہے۔ ان دونوں کے اپنے اپنے بیٹے ہیں۔ تم آخرت کے بیٹے بنو، دنیا کے بیٹے نہ بنو۔ آج عمل کا وقت ہے حساب نہیں ہے۔ اور کل حساب ہوگا عمل کا وقت نہیں ہوگا۔''[1]

خواہشات کی پیروی، انسان کی زندگی کا رخ ہی بدل دیتی ہے اور اس کے ذہن میں بڑا مقصد صرف نفس کی خواہشات کی تکمیل ہوجاتا ہے۔ وہ اعلیٰ اسلامی اہداف و مقاصد بھول جاتا ہے۔ مسلمان کا اعلیٰ مقصد اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی اور جنت میں اس کے فضل کا حصول ہے۔

ریا کاری:

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: خیر و بھلائی کا کوئی کام ریا کاری سے نہ کرو، نہ شرم کی بنیاد پر خیر و بھلائی کو چھوڑو۔[2]

مزید فرمایا: ریا کاری کی تین نشانیاں ہیں:

1. جب وہ اکیلا ہوتا ہے تو اس پر کسل مندی طاری ہو جاتی ہے۔
2. جب لوگوں کے درمیان ہوتا ہے تو بڑا چاق و چوبند نظر آتا ہے۔
3. جب اس کی تعریف کی جائے تو اپنی کارکردگی میں اضافہ کر دیتا ہے اور جب اس کی مذمت کا کوئی پہلو سامنے آئے تو اس کی کارگزاری گھٹ جاتی ہے۔[3]

غرور اور خود پسندی:

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''خود پسندی عقل کے لیے آفت کا باعث ہے۔'' غرور اور

---

[1] حلية الأولياء (١/ ٧٦) وصفة الصفوة (١/ ٣٢١)

[2] أدب الدنيا و الدين (ص: ١١٠)

[3] الكبائر للإمام الذهبي (ص: ١٤٥) و فرائد الكلام (ص: ٣٣٨)

خود پسندی اُن آفات میں سے ہیں جو باعثِ ہلاکت ہیں اور انسانی اعمال کو برباد کر دیتے ہیں۔ خود پسندی کا مرض اُن بیماریوں میں سے ہے جو نیک لوگوں کو اللہ سے تعلق قائم کرتے ہوئے پیش آتی ہے، یہ ایسی مہلک بیماری ہے جو اخلاص کے منافی ہے اور اللہ تعالیٰ کے حضور عاجزی اور انکساری میں رکاوٹ بنتی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہِ عالی میں بے ادبی کے مترادف ہے۔ مزید برآں خود پسندی کا عمل انسان کو اندھا کر دیتا ہے۔[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مالیاتی پالیسی

محکمۂ خزانہ:

اسلامی ریاست کی مالیاتی پالیسی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دَور میں کوئی قابلِ ذکر تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ، مستحق لوگوں کو مال عطاء کرنے میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی برابری کے نقطۂ نگاہ پر قائم رہے۔ کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح اور فضیلت نہیں دی۔ جس طرح سادات کے لیے عطاء کرنے کا حکم تھا، اسی طرح غلاموں کے لیے بھی تھا۔[2]

آپ نے حکّام کو جو خط لکھا اس میں فرمایا: اگر لوگوں پر کوئی بوجھ ہو یا کوئی بیمار ہو، یا پانی نہ ملنے کی شکایات ہوں، یا زمین زیرِ آب آ گئی ہو یا شدید قحط سالی کے باعث زمین پانی کو ترس رہی ہو تو لوگوں سے تخفیف کا رویہ اختیار کرو تا آنکہ ان کے مسائل حل ہو جائیں۔ جتنا بھی ممکن ہو، آبادکاری کے لیے کوشش کرو۔ زمین کی خرابی اور ویرانی اہلِ زمین کو محتاج اور بدحال کر دے گی، لہٰذا حکّام کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ نگرانی کے امور پر خوب دھیان رکھیں۔ اگر حالات جوں کے توں رہے تو حکّام کے بارے میں بدگمانی کا پہلو سامنے آئے گا اور زمین کی منفعت سے زیادہ استفادہ نہیں ہو سکے گا۔[3]

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نظر خراج کے معاملات پر تھی کیوں کہ پورے اقتصادی مسئلے کا حل خراج جمع کرنے پر موقوف تھا، اس دور میں خراج، اقتصادیات کا اصل سر چشمہ تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ بات معروف ہے کہ انھوں نے تمام علاقوں میں اپنے عُمال کی نگرانی سخت کر دی تھی اور مالی امور ان اہم معاملات میں شامل تھے جن کی آپ نہایت باریک بینی سے نگرانی کر رہے تھے۔ وہ ایسے لوگوں

[1] جامع بيان العلم وفضله (١/ ٥٧١)

[2] علي بن أبي طالب للدكتور علي شرفي (ص: ٦٦)

[3] الولاية على البلدان (٢/ ١٥٣، ١٦٣)

کو تفتیشی نگران مقرر کرتے تھے جو گھات میں بیٹھ کر حالات کی خبر لاتے تھے۔[1]

مختلف علاقوں کے والیوں کو اپنی حکومت اور اس کے بیت المال میں سے خرچ کرنے کے عمومی اختیارات حاصل تھے۔ خلفائے راشدین کے دور میں جو لوگ بیت المال یا خراج جمع کرنے کے براہِ راست ذمہ دار تھے، وہ اپنے علاقے کے لوگوں کے مفاد اور ضروریات کو مدِنظر رکھتے ہوئے شرعی طریقے سے غریبوں پر مال خرچ کرتے تھے۔ سب سے زیادہ یہ مال جہاد کے امور اور فتوحات کے لیے، اسلحہ اور جانوروں کی تیاری اور فوجی لشکروں کی دیگر ضروریات کے لیے استعمال میں لاتے تھے۔ اسی طرح اعلیٰ حکّام، دیگر تمام سرکاری عُمال اور ملازمین کے اخرجات پر رقوم خرچ کرتے تھے۔ پلوں کی تعمیر، چشموں، نہروں کی کھدائی اور دیگر فلاحی اصلاحات وقدامات کی تکمیل سرانجام دیتے تھے اور یہ خراج کی وصولی ہی سے ممکن تھی۔[2]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں جس علاقے سے جو خراج وصول ہوتا، اس کا پہلا حقدار وہیں کے لوگوں کو سمجھا جاتا تھا۔ حکّام وہ مال اپنے علاقوں سے دار الخلافہ مدینہ یا کوفہ کی طرف روانہ کرنے سے گریز کرتے تھے۔ اُس علاقے کی تمام ضروریات کو پورا کرنے کے بعد اگر مال بچ جاتا تھا تو وہ مدینہ منورہ یا کوفہ بھیج دیا جاتا تھا۔[3]

اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ خلفائے راشدین کے دور میں خاص طور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں مختلف علاقوں میں خراج کی وصولی سمیت تمام مالیاتی امور کی انتہائی باریک بینی سے جانچ پڑتال کی جاتی تھی۔ آمدنی کے ذرائع اور عمومی اخراجات پر کڑی نگاہ رکھی جاتی تھی۔

انھوں نے اپنے سابقین کے تجربات سے صحیح طور پر استفادہ کیا، انھوں نے دفاتر قائم کرنے اور ان میں رجسٹر رکھنے کا نظام شروع کیا اور مختلف پہلوؤں سے تمام مالی امور منضبط کیے۔ عہدِ فاروقی میں یہ مالیاتی ادارہ زیادہ وسیع اور جامع اسلوب پر قائم ہوا۔ خلفاء اور مختلف علاقوں کے حکّام نے خراج کی وصولی، جزیہ اور ریاست کے مالی امور سے متعلق متعدد پالیسیاں بنائیں۔ داخلی جھگڑوں اور جنگوں کے باعث حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں مالی، عسکری اور دیگر متعدد ادارے متأثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے جن کے باعث خلافتِ راشدہ پر زوال آیا۔

---

[1] النظريات المالية في الإسلام (ص: ١٥٥) الولاية على البلدان (٢/ ٩٨)

[2] الولاية على البلدان (٢/ ٩٨) التراتيب الإدارية للكتاني (١/ ٣٩٣)

[3] السياسة المالية لعثمان بن عفان، لقطب إبراهيم (ص: ٩٩)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہد میں عدلیہ کا کردار:

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ جب خلافت پر متمکن ہوئے تو یہ لمحات تھے جن میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نہایت سفاکی سے شہید کر دیے گئے تھے۔ پھر اس کے نتیجے میں مسلمانوں کی صفوں میں انتشار پیدا ہو گیا تھا اور وہ افتراق کا شکار ہو گئے تھے۔ ان حادثات و واقعات کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زیادہ تر توجہ زخموں پر مرہم رکھنے کی طرف تھی۔ لیکن اس صورتحال سے نمٹنے کے ساتھ ساتھ آپ نے تمام سرکاری ذمہ داریاں نہایت خوبی اور خلوص سے انجام دیں اور عدالتی امور کی طرف بھی خاص توجہ فرمائی۔ ان کے انتظام و انصرام اور تنظیم و ترتیب کا عمل نہایت جامع پیمانے پر انجام دیا۔ ان کا ایک خط جو انھوں نے اپنے گورنرِ مصر اشتر نخعی کو لکھا۔ اس میں وہ فرماتے ہیں:

> ''لوگوں کے مابین فیصلہ کرنے کے لیے، رعیت میں سے ایسی افضل و اکمل شخصیت کا انتخاب کرو، جس کے معاملاتِ زندگی تنگی کا شکار نہ ہوں، اس کے مدِ مقابل کوئی اس سے جھگڑا کرنے والا نہ ہو۔''

مزید فرمایا:

> ''وہ خود اپنی غلطی پر اصرار کرنے والا نہ ہو، حق کو جان لینے کے بعد اس کی طرف رجوع کرنے میں اسے کوئی رکاوٹ نہ ہو، اس کے دل میں کوئی لالچ نہ ہو۔ حقیقتِ حال جاننے کے لیے وہ تھوڑی بات سمجھنے کے بجائے پوری بات کامل گہرائی سے سمجھے، مشتبہ امور میں رک جانے والا ہو، دلائل سے حقائق اخذ کرنے والا ہو، مخالفین کی بار بار کی موشگافیوں سے زِچ نہ ہو، معاملات میں انتہائی صبر کرنے والا ہو، فیصلہ واضح ہو جانے کے بعد قطعی رائے رکھنے والا ہو، مبالغہ آرائی کرنے والے کے ہاتھوں مجبور نہ ہو اور فساد پیدا کرنے والے کی بات پر برانگیختہ نہ ہو۔ تمھیں اس قسم کے لوگ کم ہی ملیں گے، بہر حال ایسا ہی جج ڈھونڈو، پھر اس پر خرچ کرنے میں فراخ دلی سے کام لو، تاکہ وہ اپنی ضرویات پوری کرنے کے لیے لوگوں کا محتاج نہ ہو، اسے اپنے ہاں وہ مقام دو جس کی تمھارے خواص میں سے کوئی اور شخص طمع نہ کرے تاکہ وہ مطمئن ہو کہ اس پر کوئی چڑھائی نہیں کر سکے گا۔''

---

[1] شرح نہج البلاغة منقول عن نظام الحکم للقاسمی (۲/ ۱۰۳) وقائع ندوة النظم الإسلامیة (۱/ ۳۷۹)

یہ جامع وصیت قاضی کی تمام صفات پر مشتمل ہے اور اُس کے حقوق و واجبات بڑی وضاحت سے بیان کرنے والی ہے، جو شخص بھی گورنرِ مصر کے نام امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس خط پر غور کرے گا تو اسے تعجب ہوگا کہ وہ وصیت جو سن ۴۰ ہجری یا اس کے قریب قریب اس وقت تحریر کی گئی جب کہ ابھی تک عربوں کا دیگر تہذیبوں سے کوئی واسطہ نہ تھا، غور کیجیے کہ اس وقت ایک سچے مسلمان کی عقل و دانش کس طرح اللہ کے نور سے منور ہو رہی تھی اور ان کے دل و دماغ پر زندگی کے مقاصد و منہج کس وضاحت سے منکشف ہو رہے تھے۔ انھوں نے ریاست کے معاملات کو کس طرح صحیح منہج پر قائم کیا، جو آج کے دَور کے دستوروں اور قوانین کے مقابلے میں بدر جہا بہتر ہے۔[1]

رعیت کے ساتھ انصاف اور اسے ظلم سے بچانے کے لیے امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے یہ نظریات بعد میں مظالم پر کنٹرول کرنے اور اس بارے میں قوانین کی ترتیب و تنظیم کے لیے بنیاد کی حیثیت اختیار کر گئے۔[2]

خلفائے راشدین کے دَور میں عدل وانصاف کے لیے قانون سازی:

قانون سازی کے اس منصوبے سے مراد وہ راستہ ہے جس پر خلفائے راشدین اور صحابۂ کرام، عملی زندگی میں پیش آمدہ واقعات و مسائل کے لیے شریعت کے احکام کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے، یہ راستہ انھیں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اور تربیت کے نتیجے میں ملا۔ خلفائے راشدین حضرت ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم اور خلیفۂ راشد حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں جب بھی کوئی نیا واقعہ ظہور میں آیا یا مسئلہ در پیش ہوا، انھوں نے اسے حل کرنے کے لیے تین مرحلے اختیار کیے:

سب سے پہلے انھوں نے کتاب اللہ سے رجوع کیا۔ اگر پیش آمدہ مسئلے کے بارے میں واضح طور پر کتاب اللہ سے راہنمائی مل گئی تو فبہا ورنہ وہ سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں ڈھونڈتے تھے۔ اگر اس میں بھی مسئلے کا حل نہ ملتا تو وسیع تر مفہوم میں رائے کی طرف منتقل ہو جاتے تھے۔ اکثر اوقات پہلے مرحلہ میں یہ رائے اجتماعی ہوتی، خاص طور پر جب وہ مسئلہ ریاست کے امور میں عمومی انداز کا ہوتا۔ انھیں اس بارے میں خصوصی مدد اس لیے ملی کہ کبار صحابہ ابھی تک مدینہ منورہ ہی میں قیام پذیر تھے۔ ان کی بیک وقت

---

[1] شرح نهج البلاغة منقول عن نظام الحكم للقاسمي (٢/ ١٠٤)

[2] نظام الحكم للقاسمي (٢/ ٥٦٠)

دستیابی آسان تھی۔ اور ان سے رائے لینا ممکن تھا۔ بعد ازاں یہی بات اصطلاحی طور پر ''اجماع'' کہلائی اور قانون سازی کی بنیاد میں قیاس اور مصلحت کی اصطلاحات کا استعمال بھی کیا گیا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت کے جج:

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بعض اُن قاضیوں کو ان کے منصب پر بحال رکھا جن کی اہلیت ثابت ہوگئی اور جو پہلے ہی سے قضاء کی ذمہ داری پر مامور تھے۔ آپ نے ان کے علاوہ بھی قاضی اور والی مقرر کیے۔ ان میں سے کچھ کی تفصیل یوں ہے:

1. حضرت شُرَیح بن الحارث رحمہ اللہ کوفہ کے قاضی تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انھیں وہیں برقرار رکھا۔ آپ انھیں ہر ماہ پانچ سو (۵۰۰) درہم تنخواہ دیتے تھے۔[1]
2. حضرت ابوموسی الاشعری رضی اللہ عنہ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کوفہ میں مقرر کیا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انھیں بھی برقرار رکھا۔ تاہم کچھ مدّت بعد انھیں معزول کردیا۔[2]
3. حضرت عبید اللہ بن مسعود رحمہ اللہ یمن کے والی اور قاضی تھے۔
4. حضرت عثمان بن حُنَیف رضی اللہ عنہ، بصرہ میں قاضی تھے۔
5. حضرت قیس بن سعد رضی اللہ عنہ، مصر میں تعینات تھے۔ وہ مصر کی فتح میں بھی شامل تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انھیں والیِ مصر مقرر کیا، انھوں نے وہاں اپنا گھر بنایا۔ آپ نے انھیں معزول کر دیا اور ان کی جگہ حضرت محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہما کو والی بنا دیا۔[3]
6. حضرت عمارہ بن شہاب رحمہ اللہ کوفہ میں تعینات تھے۔
7. حضرت تمام بن عباس رضی اللہ عنہما مدینہ منورہ میں سن ۳۷ ہجری میں اور حضرت قُثم بن عباس رضی اللہ عنہما مکہ میں اور پھر طائف میں قاضی رہے۔[4]
8. حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت محمد بن زید بن خلیدہ الشیبانی رحمہ اللہ کو کوفہ میں قاضی مقرر فرمایا، وہاں انھوں نے متعدد معروف فیصلے کیے۔[5]

---

[1] اخبار القضاۃ (۲/ ۲۲۷)

[2] تاریخ القضاء في الإسلام (ص: ۱۴۹)

[3] تاریخ الطبري (۵/ ۵۸۹)

[4] تاریخ الطبري (٦/ ۷۱)

[5] الطبقات لابن سعد (٦/ ۱۰)

بعض شہروں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقرر کردہ قاضی، ان علاقوں کے والی بھی متعین کر دیے جاتے تھے کیونکہ ان کی حکمرانی، قضاء، امامت، حدود قائم کرنے، سرکاری نظام چلانے اور زکاۃ و صدقات جمع کرنے پر مشتمل تھی۔[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ تمام صوبوں کے گورنروں کو تاکید فرمایا کرتے تھے کہ وہ قاضیوں کے تقرر میں انتہائی احتیاط سے کام لیں۔[2]

عدالتی معاملات میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا طریقِ کار

سابقہ اسلوبِ قضاء برقرار رکھنے کا حکم:

حضرت علی رضی اللہ عنہ عدالتی معاملات، قضاء کے اسلوب اور مقدمات کے ضابطوں کے سلسلے میں بعض ایسی تبدیلیاں کرنے کا ارادہ رکھتے تھے جو معاشرے کے جدید حالات اور تقاضوں سے مطابقت رکھتے ہوں۔ لیکن انھوں نے اس معاملے کو اس وقت تک مؤخر کیے رکھا جب تک کہ نظامِ حکومت میں استحکام نہ پیدا ہو جائے، ان سے منقول ہے کہ انھوں نے قاضیوں سے فرمایا:

> ''جس طرح تم پہلے فیصلے کرتے تھے اسی طرح کرتے رہو، یہ عمل اس وقت تک جاری رکھو جب تک کہ تمھاری اجتماعیت مستحکم نہ ہو جائے کیوں کہ سرِ دست مجھے اختلافات کا خطرہ ہے۔''[3]

مقامِ عدالت کا انتخاب:

قاضی کو چاہیے کہ مقدمات کی سماعت کے لیے شہر کے وسط میں جگہ کا انتخاب کرے تاکہ مقدمہ لے کر آنے والوں میں سے کسی کے لیے وہاں پہنچنا مشکل نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قاضی شُرَیح کو یہ حکم دیا تھا کہ آپ شہر کی بڑی مسجد میں عدالت لگائیں تاکہ وہاں پہنچنا آسان ہو۔[4]

---

[1] أخبار القضاة (١/ ٣٩٥)

[2] القضاء في صدر الإسلام لجبر محمود (ص: ٢٣٩)

[3] الولاية على البلدان (٢/ ٩٣) مُصَنّف عبد الرزّاق (١١/ ٣٢٩)

[4] مسند زيد (٤/ ١٣٧) موسوعة علي بن أبي طالب (ص: ٥٠٦)

قاضی کے فرائض اور ذمہ داریاں

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہد میں قاضی کو اپنے فیصلوں کو یقینی بنانے کے لیے بھرپور اہتمام کرنے کے تاکید کی جاتی تھی مثلاً:

پیش آمدہ معاملے کا گہرا مطالعہ:

قاضی کو پیشِ نظر مقدمے میں قطعی فیصلہ صادر کرنے میں جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیے، یہی وجہ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک موقع پر قاضی شُرَیح سے فرمایا: جب تک آپ بات ہی نہیں کرتے آپ کی زبان آپ کی غلام ہے، جونہی آپ بول اٹھے، آپ زبان کے غلام ہو گئے، لہٰذا یہ دیکھو کہ کیا فیصلہ کر رہے ہو؟ کس بارے میں کر رہے ہو؟ اور کس طرح کر رہے ہو؟[1]

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی فقہی بصیرت

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے احکامِ عبادت بیان کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا، وہ فہمِ دین اور اپنی علمی وسعتوں کے اعتبار سے اعلیٰ مقام پر فائز تھے، انھوں نے لوگوں کو جو احکام بتلائے وہ ایک بہت بڑی کتاب کے متقاضی ہیں۔ بطور مثال دیکھیے! موسوعۃ فقہ علی بن ابی طالب لمحمد قلعجی اور فقہ الا مام علی لاحمد طہ۔ ہم یہاں ان کے چند احکام پیش کرتے ہیں:

بے نماز، کافر ہے:

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا: امیر المومنین اس عورت کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے جو نماز نہیں پڑھتی؟ انھوں نے فرمایا: جو نماز نہ پڑھے وہ کافر ہے۔[2]

حضرت عبداللہ بن شقیق رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اعمال میں سے نماز کے سوا کسی اور عمل کے بارے میں یہ رائے نہیں رکھتے تھے کہ اسے ترک کرنا کفر ہے۔ کیوں کہ نماز ایک ایسی عبادت ہے جس کے ذریعے سے وہ اسلام کے دائرے میں داخل ہوتا ہے، اسی طرح شہادتین ہیں جن کے ترک کرنے سے وہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔[3]

---

[1] كنز العمال، رقم الحديث (١٤٤٣٣)

[2] مصنف ابن أبي شيبة (١١/ ٤٧) و حديث: ٣١٠٧٥) وكنز العمال (٨/ ١٣)

[3] المغنى (٢/ ٤٤)

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان بھی اسی کی تائید کرتا ہے۔

''بے شک آدمی اور کفر و شرک کے درمیان فرق نماز ترک کرنا ہے۔''[1]

شوہر بیوی کو غسل دے سکتا ہے:

اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نزدیک آدمی کا اپنی بیوی کو غسل دینا جائز ہے۔ انھوں نے اپنی زوجۂ محترمہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو خود ہی غسل دیا تھا۔[2] اور اس کی تائید بعض ارشاداتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور آثارِ خلفاء و صحابہ رضی اللہ عنہم سے بھی ہوتی ہے۔

والدین یا اولاد کو زکاۃ نہیں دی جاسکتی:

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: فرض زکاۃ میں والدین یا اولاد کا کوئی حق نہیں ہے جس کی کوئی اولاد ہے یا والدین ہیں، اگر وہ ان کے ساتھ صلہ رحمی نہیں کرتا تو وہ نافرمان ہے۔ اس پر علماء کا اجماع بھی منقول ہے۔

مشرکین اور مجوس کا پکایا ہوا کھانا کھانے میں کوئی حرج نہیں:

مجوس اور مشرکین کا تیار شدہ کھانا جس کا کسی ذبیحہ سے کوئی تعلق نہ ہو، کھانے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ حرمت ذبح شدہ جانور کے ساتھ مخصوص ہے۔ امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: مجوس کا پکایا ہوا کھانا کھانے میں کوئی حرج نہیں، البتہ ان کا ذبح کیا ہوا گوشت کھانے سے منع کیا گیا ہے، جمہور فقہاء کی یہی رائے ہے۔[3]

نکاحِ متعہ کی ممانعت:

امیر المومنین حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: رمضان نے ہر قسم کے روزے کی فرضیت کو منسوخ کر دیا ہے اور نکاحِ متعہ کو طلاق، عدت اور میراث نے منسوخ کر دیا ہے۔[4] حضرت علی رضی اللہ عنہ کی دلیل وہ روایت ہے جو انھوں نے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے زمانے میں نکاحِ متعہ کرنے اور پالتو گدھوں کا گوشت کھانے سے منع فرما دیا تھا۔[5]

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٢)

[2] السيل الجرّار (١/ ٣٤٤) المبسوط (٢/ ٧١)

[3] كنز العمال، رقم الحديث (٢٥٧٦) وفقه علي (١/ ٤٧٦)

[4] فقه الإمام علي (٢/ ٥٠٩)

[5] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٠٧)

عورت کے جسمانی عیوب ناگوار ہوں تو اس سے علاحدگی جائز ہے:

اگر شادی کرنے والا مرد اپنی بیوی میں کوئی عیب پائے کہ اس کے ساتھ رہنا بہت مشکل ہو جائے، تو امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے یہ ہے کہ اگر ازدواجی تعلقات ثابت ہوں تو حق مہر واجب ہے۔ اس صورت میں آدمی کو طلاق دینے یا بیوی کو ساتھ رکھنے کا اختیار ہوگا۔ اگر تعلقات ثابت نہیں تو بغیر حق مہر کے ان کے مابین علاحدگی کر دی جائے گی۔[1]

کفار کے ہاتھ مالِ غنیمت بیچنے کی ممانعت:

جنگ میں کافروں سے حاصل کیے گئے مالِ غنیمت کو پھر انہی کفار کے ہاتھ بیچ دینا جائز نہیں۔ حضرت موسیٰ کاظم رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں عجمیوں کے برتنوں میں سے سونے کا ایک مخصوص برتن لایا گیا۔ انھوں نے اسے توڑنا چاہا تاکہ اسے مسلمانوں میں تقسیم کر دیں۔ کچھ کافر سوداگروں نے آپ سے کہا: اگر آپ اسے توڑ دیں گے تو اس کی قیمت ضائع کر دیں گے، اسے ہمارے ہاتھ بیچ دیجیے، ہم آپ کو اس کی زیادہ سے زیادہ قیمت دینے کو تیار ہیں۔ یہ سن کر آپ نے فرمایا: میں تمھیں تمھاری وہ چودھراہٹ اور ملکیت واپس کرنے کو تیار نہیں جو اللہ تعالیٰ نے تم سے چھین لی ہے۔ انھوں نے اس برتن کے ٹکڑے کر ڈالے اور لوگوں میں تقسیم کر دیے۔[2]

امیر المومنین نے یہ اقدام اس لیے کیا تاکہ ان کا برتن انھیں اپنی عظمت و شوکت کی یاد نہ دلائے۔ یا یہ چیز دوبارہ ان کے لیے مفید نہ بن جائے۔

حدود وتعزیرات

مرتد کی سزا:

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: مرتد سے تین بار توبہ کرنے کا مطالبہ کیا جائے، اگر وہ توبہ کر لے تو ٹھیک ہے، بصورتِ دیگر اسے قتل کر دیا جائے۔[3] اسے قتل کرنے کے بارے میں اِس حدیث سے

---

[1] كنز العمال، رقم الحديث (٤٥٦٦٤) مصنف عبد الرزاق: ٧٧ ١٠٦)

[2] فقه الإمام علي أبي طالب (٢/ ٧٥٢)

[3] مصنف ابن أبي شيبة: ١٠/ ١٣٨)

راہنمائی ملتی ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جو اپنا دین تبدیل کر لے اسے قتل کر دو۔"[1]

شراب خانہ... شراب پینے والوں پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا زبردست غیظ و غضب

رمضان میں شراب نوشی پر اضافی کوڑے:

عطاء اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک شاعر نجاشی حارثی کو رمضان میں شراب نوشی کی پاداش میں اسّی کوڑے مارے۔ پھر اسے قید کر دیا، دوسرے دن اسے قید سے باہر نکالا اور بیس کوڑے مارے پھر فرمایا: یہ بیس کوڑے، رمضان میں روزہ نہ رکھنے اور اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں جرأت و جسارت کا رویہ اختیار کرنے پر مارے ہیں۔[2]

امیر المومنین علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے دَور میں ریاست کا ادارہ

ریاست کے صوبے... اوّل: مکہ مکرمہ:

جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت ہوئی تو حضرت خالد بن سعید العاص رضی اللہ عنہ مکہ کے والی تھے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کی معزولی کا فیصلہ صادر فرمایا اور حضرت ابو قتادہ انصاری رضی اللہ عنہ کو مکہ کا والی مقرر کر دیا۔[3]

ان کی ولایت کا دورانیہ بہت مختصر رہا، کیونکہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مدینہ سے عراق کی طرف منتقل ہونے کا ارادہ کیا تو حضرت قثم بن عباس رضی اللہ عنہما کو مکہ کا والی بنا کر بھیجا۔[4] اور حضرت ابو قتادہ انصاری رضی اللہ عنہ کو معزول کر دیا۔ اس طرح حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ کی حکمرانی تقریباً دو ماہ تک ہی جاری رہ سکی۔ اس سلسلے میں کوئی قابلِ ذکر حالات نہیں ملتے۔ حضرت قثم بن عباس رضی اللہ عنہما کے بارے میں اکثر مصادر یہ بتاتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انھیں بیک وقت مکہ، طائف اور ان کے ماتحت علاقوں کا والی مقرر کر دیا تھا۔[5]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٠١٧)

[2] مصنف عبد الرزاق، رقم الحديث (١٣٣٥٣)

[3] الولاية على البلدان (٢/ ٣) تاريخ ابن خياط (ص: ٢٠١)

[4] سير أعلام النبلاء (٣/ ٤٤٠)

[5] الكامل في التاريخ (٣/ ٣٩٨) الولاية على البلدان (٢/ ٤)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں مکہ سے متعلق اس واقعہ کے سوا دیگر ایسے حالات نہیں ملے جو موسمِ حج اور اس پر مقرر کیے جانے والے عُمال سے تعلق رکھتے ہوں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں تاریخ میں یہ بات نہیں ملتی کہ وہ اپنے دورِ خلافت میں حج کے لیے تشریف لائے ہوں کیوں کہ وہ اسلامی ریاست کے مختلف اطراف میں درپیش آنے والے فتنوں کی سرکوبی میں مصروف رہے اور اس دوران حالات پُرسکون نہ ہو سکے۔

دوم: مدینہ منورہ:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور پہلے تینوں خلفائے راشدین کے دَور میں مدینہ منورہ اسلامی ریاست کا دارالخلافہ رہا، خلفاء بھی وہیں مقیم رہے، اور اپنی موجودگی میں تمام امورِ مملکت انجام دیتے رہے، البتہ سفر کی حالت میں وہ کسی کو نائب بنا دیتے تھے جو اُن کی غیر موجودگی میں امورِ مملکت کے ذمہ دار ہوتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلافت پر متمکن ہونے کے بعد حالات یکسر بدل گئے۔ شہادتِ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خاص طور حضرت طلحہ، حضرت زبیر اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم کے عراق کی طرف روانگی کے بعد اور واقعۂ جمل سے پہلے ایسے حالات رونما ہوئے کہ امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ مدینہ منورہ سے عراق منتقل ہو گئے۔ بعض روایات کے مطابق حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مدینہ میں حضرت سہل بن حُنَیف انصاری رضی اللہ عنہ کو اپنا جانشین مقرر کیا۔[1]

یہ معلوم نہیں کہ حضرت سہل بن حُنَیف رضی اللہ عنہ کتنا عرصہ مدینہ کے والی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ یہاں ایک سال سے زیادہ ان کی حکمرانی قائم رہی، وہ سن ۳۷ میں مدینہ کے والی تھے۔[2] بعد ازاں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت سہل بن حُنَیف رضی اللہ عنہ کو معزول کر کے حضرت تمام بن عباس رضی اللہ عنہما کو مدینہ میں والی مقرر کیا۔ بعد ازاں حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کو والی مقرر کیا۔ وہ سن ۴۰ھ تک اس منصب پر فائز ہے، جب حضرت بسر بن اطارۃ رضی اللہ عنہ کی قیادت میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا لشکر مدینہ پہنچا۔ تو حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ مدینہ سے کوفہ چلے گئے۔ اس طرح مدینہ پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حکمرانی برقرار نہ رہی۔ ان کی جگہ وہاں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی حکمرانی قائم ہوگئی۔ اس طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دَور میں مدینہ منورہ خلافتِ اسلامیہ کے دار الخلافہ کے بجائے دیگر ریاستوں کی طرح ایک ریاست میں تبدیل ہوگیا، اور سیاسی واقعات وحوادث سے دور ہوتا چلا گیا۔[3]

---

[1] تاریخ خلیفه بن خیاط (ص: ۸، ۱۸۱، ۲۰۱)
[2] تاریخ الطبري (٦/ ٥٣)
[3] سیر أعلام النبلاء (٣/ ٤٠٩) والولایة علی البلدان (٢/ ٣)

سوم: بحرین اور عُمان:

شہادتِ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے وقت بحرین، بصرہ کی ریاست کے تابع تھا اور حضرت ابن عامر رضی اللہ عنہ وہاں اپنے عامل مقرر کرتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دَور میں انھوں نے بحرین پر اُمراء کی ایک جماعت مقرر کردی۔ ان میں اہم ترین شخص حضرت عُمر بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہما تھے، وہ مدینہ سے عراق کی طرف سفر کے دوران حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہی عازمِ سفر ہوگئے تھے۔ بعد ازاں امیر المؤمنین نے انھیں کچھ مدت کے لیے بحرین کا والی بنا کر بھیجا۔ پھر عراق میں اپنے پاس بلایا۔ بحرین میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عاملین میں سے حضرت قدامہ بن العجلان الانصاری، نعمان بن عجلان الانصاری اور عبیداللہ بن العباس رضی اللہ عنہم کا ذکر بھی ملتا ہے۔[1]

مؤرخین نے بعض اُن عاملین کے نام بتائے ہیں جنھیں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عُمان روانہ کیا، ان میں سے ایک کو والی کی حیثیت سے روانہ کیا اور دوسرے کو عُمان میں بغاوتوں کے خاتمے کے لیے لشکر کا سپہ سالار بنا کر بھیجا۔ ایک صاحب کو یمامہ کا عامل بنا کر بھیجا۔ شاید وہ والیِ بحرین کے زیرِ نگرانی تھا۔[2]

چہارم: یمن کی ریاست:

جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت ہوئی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت پر بیعت مکمل ہوگئی تو امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عبید اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو یمن کا والی مقرر کیا۔[3] حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مقرر کردہ والی اور جملہ حکّام حضرت عبید اللہ رضی اللہ عنہ کے پہنچنے سے پہلے ہی یمن سے جا چکے تھے۔ اُن میں سے بعض جنگِ جمل میں حضرت طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہما کے ساتھ شریک رہے۔ جمل کے لشکر کی تیاری میں بھی ان کا ہاتھ کارفرما تھا۔[4]

حضرت عبید اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما صنعاء اور اس کے مضافات میں اپنی ذمہ داریاں ادا کر رہے تھے۔ ان کے ساتھ سرکاری ذمہ داریاں ادا کرنے میں حضرت سعید بن سعد بن عبادہ الانصاری رحمہ اللہ و رضی عنہ بھی شریک تھے۔[5]

---

1. الاصابة (٣/ ٥٦٢) الولاية على البلدان (٢/ ٥) تاريخ الطبري (٦/ ٩٠)
2. الولاية على البلدان (٢/ ٦) تاريخ اليعقوبي (٢/ ٩٥)
3. تاريخ خليفه بن خياط (ص: ٦)
4. مروج الذهب للمسعودي (٢/ ٣٥٧) الولاية على البلدان (٢/ ٦)
5. الاستبصار لابن قدامة المقدسي (ص: ٩٩)

پنجم: شام کی ریاست:

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ، امیر المومنین حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کے ادوار میں شام کے والی تھے، جب حضرت علی رضی اللہ عنہ خلافت پر متمکن ہوئے تو انھوں نے انھیں معزول کرنے اور ان کی جگہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو مقرر کرنے کا ارادہ کیا۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے شام کی ولایت سے انکار کر دیا اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ قریبی رشتہ داری کے باعث معذرت پیش کی، امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انھیں مجبور نہیں کیا اور شام کی طرف نہ جانے کے سلسلے میں ان کی معذرت قبول کر لی۔

شام کی ریاست، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پورے دورِ خلافت میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے تابع رہی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس پر غلبہ نہ پا سکے۔ نہ اپنے عاملین اور امراء کا وہاں تقرّر کر سکے۔ شام کے مشرقی علاقے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے لشکروں کے درمیان مقابلہ آرائیاں ہوئیں، جن میں سے اہم ترین معرکہ جنگِ صفین ہے جو سن ۳۷ھ میں ہوئی۔ اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ دونوں مدِ مقابل تھے۔ ان معرکوں کے باوجود شام پر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا غلبہ جاری رہا۔[1]

ششم: الجزیرہ کی ریاست:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں الجزیرہ، شام کے زیرِ نگیں علاقوں میں سے ایک تھا۔ اور پھر ان کی شہادت کے بعد شام، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں اور عراق حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زیرِ نگیں رہا۔ الجزیرہ دونوں فریقوں کے مابین جھگڑے کا مقام تھا۔ اسی کے حصول کے لیے دونوں طرف کے لشکروں کے مابین متعدد معرکے ہوئے، یوں لگتا ہے کہ کچھ وقت کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے غلبہ حاصل کر لیا۔ اور وہاں ''اشتر'' کو والی مقرر کر دیا جو الجزیرہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقرر کردہ والیوں میں سے بہت مشہور شخصیت ہیں۔[2]

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انھیں سن ۳۸ھ میں مصر کا والی بنا کر مصر بھیج دیا۔ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھی وہاں غلبہ حاصل کرنے میں سرگرم ہو گئے۔ بعد ازاں متعدد معرکے ظہور پذیر ہوئے۔ ۳۹ھ کے آخر میں وہاں کسی حد تک حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے غلبہ حاصل کر لیا تھا۔[3]

---

[1] الولایة علی البلدان (۲/ ۸)

[2] تاریخ خلیفه بن خیاط (ص: ۲۰۰) الاخبار الطوال للدّینوري (ص: ۱۵٤) الولایة علی البلدان (۲/ ۸)

[3] تاریخ الطبری (٦/ ٥٤) الفتوح لابن اعثم الكوفي (٤/ ٤٥) و الكامل (۳/ ۳۷۹) الكامل (۳/ ۳۸۰)

الجزیرہ ان شخصیات کی پناہ گاہ تھی جو حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ دونوں سے کنارہ کش ہو کر بیٹھ گئے اور ان حضرات نے اس دوران جب تک نزاع چلتا رہا بیعت نہیں کی۔[1]

ہشتم: ریاست بصرہ:

بصرہ کے سابق والی حضرت عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ، جنھوں نے اپنی ذمہ داری چھوڑ کر مکہ مکرمہ کا رُخ کر لیا تھا، ان کی جگہ امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان بن حُنَیف انصاری رضی اللہ عنہ کو بصرہ کا امیر مقرر فرما کر بھیجا۔ حضرت عثمان بن حُنَیف رضی اللہ عنہ اس علاقے سے آگاہ اور تجربہ کار تھے۔ اس سے پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کو السواد کے علاقے پر پیمایش اور خراج کی مقدار کا اندازہ لگانے کے لیے عامل مقرر فرما چکے تھے۔

حضرت عثمان بن حُنَیف رضی اللہ عنہ بصرہ کی طرف چل دیے اور پُر امن ماحول میں وہاں داخل ہوئے۔ لیکن اہلِ بصرہ تین گروہوں میں بٹ چکے تھے، ایک گروہ کے لوگ وہ تھے جنھوں نے بیعت کی اور اجتماعیت کا حصہ بن گئے، دوسرے گروہ نے علاحدگی اختیار کر لی اور کہا کہ ہم اہلِ مدینہ کا ردّ عمل دیکھیں گے، جو وہ کریں گے وہی ہم بھی کریں گے۔ اور تیسرے گروہ نے بیعت میں داخل ہونے سے انکار کر دیا۔[2]

اس ریاست میں حضرت عثمان بن حُنَیف رضی اللہ عنہ زیادہ عرصہ قائم نہ رہ سکے، جمل کے معرکہ سے پہلے حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے لشکر بصرہ کی طرف آ گئے، ان کے ساتھ وہ لوگ بھی شامل تھے جو خونِ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا مطالبہ کر رہے تھے، حالات میں تبدیلی آئی اور لڑائی کی شکل پیدا ہو گئی، حضرت عثمان بن حُنَیف رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف نکل کھڑے ہوئے۔ اُدھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بصرہ کا رُخ کیا اور راستے میں اُن کی ملاقات ہو گئی۔ یہ جمل کے واقعہ سے کچھ دیر پہلے کی بات ہے۔ اس طرح حضرت عثمان بن حُنَیف رضی اللہ عنہ کی ولایت ختم ہوئی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ بصرہ پہنچ گئے۔ کچھ عرصہ وہاں رہے اور اسی دوران جمل کا واقعہ پیش آ گیا جو تفصیل کے ساتھ آگے آئے گا۔ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بصرہ سے کوچ کرنا چاہا تو وہاں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو والی مقرر کر دیا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے ساتھ ساتھ تابعی زیادہ بن ابیہ رحمہ اللہ کو خراج کی ذمہ داری پر مامور کیا، اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو حکم دیا کہ سرکاری معاملات میں ان سے مشورہ

[1] سير أعلام النبلاء (٣/ ٤١٤)

[2] خلافة علي بن أبي طالب لعبد الحميد علي (ص: ١٠٧) سير أعلام النبلاء (٢/ ٣٢٠) تاريخ الطبري (٥/ ٤٩٢)

کرتے رہیں اور ان کی رائے لیتے رہیں کیوں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کے کام میں تجربہ کاری اور سیاسی امور میں ذہانت وفطانت کی روشنی دیکھ لی تھی۔[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو کچھ نصیحتیں بھی فرمائیں، ان میں سے چند یہ ہیں: میں تمھیں اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے اور اپنے زیرِ نگیں لوگوں کے لیے انصاف کرنے کی وصیّت کرتا ہوں۔ اپنی شخصیت اور اپنے علم وحکمت سے کام لو۔ کھلے دل کا مظاہرہ کرو، کینہ سے بچو، یہ دل اور حق کی موت کا سبب ہے، خوب جان لو کہ جو بات تمھیں اللہ کے قریب کر دے گو یا اس نے تمھیں جہنم سے دور کر دیا ہے، تمھارا جہنم سے قریب ہونا اللہ سے دوری کا باعث ہوگا، بہت کثرت سے اللہ کا ذکر کرو اور کبھی غافلوں میں سے نہ ہونا۔[2]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اپنی ولایت میں سرکاری ذمہ داریاں ادا کرنی شروع کر دیں۔ وہ ایک ایسے صحابی ہیں جن کا قرآن وتفسیر میں علم بہت وسیع ہے۔ انھوں نے بصرہ کے زیرِ سایہ سجستان میں امنِ عامہ کے مسائل یقینی بنیادوں پر حل کر کے اپنی انتظامی لیاقت بھی ثابت کردی۔ صوبۂ فارس میں معروف سیاستدان تابعی زیاد بن ابی سفیان رحمہ اللہ کو والی مقرر کیا، وہ جب بھی بصرہ سے باہر جاتے تھے انہی کو اپنا نائب بنا کر جاتے تھے۔ انھوں نے امنِ عامہ کے مسائل پر خوب قابو پایا۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھیوں میں سے ممتاز ساتھی تھے۔ وہ تمام اہم واقعات میں ان کے ساتھ رہے، ان کے ساتھ خیر خواہی اور بھلائی کا سلوک کرتے رہے۔ ان کا دفاع بھی کرتے رہے۔ امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ اُن پر اعتماد کرتے تھے، ان سے مشورہ کرتے رہتے تھے۔ انتالیس (۳۹) ہجری تک، حضرت عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما بصرہ کے والی کی ذمہ داریاں ادا کرتے رہے، پولیس اور محکمہ مال کے حکّام نے ان کے ساتھ تعاون کا رویّہ رکھا۔ بعض روایات کے مطابق حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت تک بصرہ کے والی رہے۔ سن چالیس (۴۰ ہجری) کے واقعات کے حوالے سے امام طبری کہتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بصرہ سے نکلے اور مکہ چلے گئے، اور عام اہلِ سیرت کا بھی یہی قول ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما امیر المومنین کی شہادت تک بصرہ ہی میں اپنی ذمہ داریاں نبھاتے رہے، ان کی شہادت کے بعد حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے مابین صلح ہوگئی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما مکہ چلے گئے۔[3]

---

[1] تاريخ الطبري (٥/ ٥٨٠)

[2] وقعة صفين للمنقري (ص: ١٠٥) الولاية على البلدان (٢/ ١٥)

[3] تاريخ الطبري (٥/ ٥٨٠)

نہم: ولایتِ کوفہ:

جس وقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہید ہوئے اُس وقت کوفہ میں ان کے والی حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خلافت کی بیعت لینے کے بعد انھیں اسی منصب پر برقرار رکھا۔ انھوں نے اہلِ کوفہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حق میں بیعت لی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اہلِ کوفہ کا یہ موقف لکھ بھیجا کہ اکثریت نے بیعت کر لی ہے۔[1]

جب امیر المومنین مدینہ سے عراق روانہ ہوئے تو خاص طور پر حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کے بارے میں پوچھتے رہے۔ کوفہ کی طرف سفر کے دوران انھیں اہلِ کوفہ کا ایک آدمی ملا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس سے حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کے بارے میں سوال کیا تو اس نے کہا: اگر آپ کو مصالحت کا رویہ مطلوب ہے تو حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ اس کے لیے بہت مناسب آدمی ہیں اور اگر آپ کا لڑائی کا ارادہ ہے تو حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ اس کے لیے مناسب نہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ کی قسم! میں تو اصلاح ہی چاہتا ہوں، اس آدمی نے کہا: میں نے آپ کو صحیح بات بتا دی ہے۔

بعد میں یہی بات سامنے آئی کہ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ صلح پسند تھے، مفاہمت کے قائل تھے اور مسلمانوں کے مابین لڑائی کے خلاف تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت محمد بن ابی بکر، حضرت عمار بن یاسر اور حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہم وغیرہ کو مختلف وفود کی شکل میں اہلِ کوفہ کی طرف بھیجا کہ وہ میدان میں نکل آئیں۔ یہ جمل کے واقعہ سے پہلے کی بات ہے۔ اہلِ کوفہ نے حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے ان کا موقف معلوم کرنے اور میدان میں نکلنے کے بارے میں مشورہ کیا تو انھوں نے فرمایا: آخرت کا راستہ تو یہ ہے کہ تم یہیں قیام کرو (اور میدان میں نہ نکلو) اور دنیا کا راستہ یہ ہے کہ تم نکل کھڑے ہو، اب تم بہتر جانتے ہو۔[2]

اہلِ کوفہ اور حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما کے درمیان متعدد بار طویل مذاکرات ہوئے۔ بعد ازاں بہت سے اہلِ کوفہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے نکلنے کے قائل ہو گئے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے ساتھ تقریباً نو ہزار آدمی نکلے۔[3]

بہت سی روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جمل کے واقعہ سے کچھ پہلے کوفہ میں حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ

---

[1] تاريخ الطبري (٥/ ٤٦٧)

[2] تاريخ الطبري (٥/ ٥٠٨، ٥/ ٥١١)

[3] تاريخ الطبري (٥/ ٥١٧)

کی وِلایت ختم ہوگئی، بعض روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اشتر، جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جانب سے سردارانِ لشکر میں سے ایک تھا، اس نے حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ اور ان کے بچوں کو کوفہ کے محل سے نکال دیا اور خود غلبہ حاصل کرلیا۔[1]

پھر جمل کے واقعہ کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کوفہ تشریف لائے۔ اس وقت کوفہ دارالخلافہ قرار پاچکا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کوفہ اور ماتحت امارات میں براہِ راست خود ذمہ دار حکمران تھے۔ ان کی خلافت کے بقیہ دور میں کوفہ کو خاص مقام حاصل رہا۔

امیر المومنین کوفہ ہی سے مملکت کے اطراف و اکناف کی نگرانی فرما رہے تھے۔ وفود بھی یہیں آتے تھے، لشکر بھی یہیں سے روانہ ہوتے۔ خلافتِ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پورے دور میں کوفہ میں تجارتی اور آباد کاری کی نشاط کاریوں کا بڑا کردار رہا۔ امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کوفہ سے متعلقہ تمام کام بڑے اہتمام سے سرانجام دیتے تھے۔ اہلِ کوفہ کے مسائل کا جائزہ لیتے، مختلف ولایات میں والی کی عدم موجودگی کی صورت میں نائبین کا تقرر فرماتے۔ جب انھوں نے صفین کی طرف نکلنے کا ارادہ کیا تو حضرت ابومسعود البدری رضی اللہ عنہ کو کوفہ کا والی بنایا۔ جب نہروان میں خوارج سے لڑائی کا ارادہ کیا تو کوفہ کا والی ہانی بن ہوذۃ النخعی کو بنایا۔[2]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کوفہ ہی میں رہے تاآنکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے شہادت پائی۔ کوفہ کے والی اپنی ذمہ داریاں ادا کرتے رہے مگر جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسے دارالخلافہ بنایا تو وہاں کی ولاء کے وہ خود ہی ذمہ دار بن گئے۔ اپنی غیر موجودگی کے دوران وہ کسی نہ کسی کو نائب ضرور مقرر فرماتے تھے، امیر المومنین کے قیام کے باعث کوفہ کو خاص اہمیت حاصل ہوگئی۔[3]

دہم: مشرقی ریاستیں:

1 فارس: تاریخی مصادر سے پتا چلتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت سہل بن حُنَیف انصاری رضی اللہ عنہ کو فارس کا والی بنایا۔

---

[1] تاريخ الطبري (٥/ ٥١٩)

[2] سير أعلام النبلاء (٢/ ٤٩٣) الولاية على البلدان (٢/ ٢٠) و تاريخ خليفه بن خياط (ص: ١٨٧، ٢٠٢)

[3] الولاية على البلدان (٢/ ٢٠)

2 **خراسان:** خراسان وسیع ولایت شمار ہوتا ہے، خلفائے راشدین کے دَور میں یہ علاقہ براہِ راست یا بالواسطہ ولایتِ بصرہ سے مربوط تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پہلے والی حضرت عبد الرحمٰن بن ابزیٰ رضی اللہ عنہ تھے۔ اور خراسان کی طرف کے ایک والی حضرت جَعدہ بن ہُبَیرہ بن ابی وہب رضی اللہ عنہ تھے۔

آذر بائیجان:

جس وقت حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ شہید ہوئے اس وقت حضرت اشعث بن قیس رضی اللہ عنہ آذر بائیجان میں ان کے مقرر کردہ عامل تھے۔ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعتِ خلافت ہوئی تو انھوں نے حضرت اشعث بن قیس رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ وہ ان کی بیعت کریں اور ان کے لیے لوگوں سے بھی بیعت لیں۔[2]

آذر بائیجان کی ولایت کی ذمہ داریوں کے دوران حضرت اشعث رضی اللہ عنہ نے بعض اہم کام سرانجام دیے، ایک یہ کہ اردبیل[3] نامی شہر میں عرب گروہوں کو بسایا، شہر کو آباد کیا اور وہاں اسلام کی دعوت پھیلانے کے بعد مساجد تعمیر کرائیں۔[3] مشرق کی طرف بعض دیگر علاقوں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقرر کردہ والیوں کے نام بھی ملتے ہیں۔ ان میں اہواز کے کچھ والیوں کا ذکر ہے، ان میں سے ایک خِرّیت بن راشد ہیں، وہ صفین کے واقعہ سے پہلے اہواز کے بعض علاقوں میں والی تھے، جب حضرت علی رضی اللہ عنہ صفین سے واپس آئے تو خِرّیت نے لشکروں کو جمع کر کے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے علاحدگی کا اعلان کر دیا اور بعض علاقوں پر قبضہ کر لیا، حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ اطلاع ملی تو انھوں نے اس کے تعاقب میں لشکر روانہ کیا جس نے خرّیت بن راشد کی تحریک کا خاتمہ کر کے اسے قتل کر دیا۔[5]

خلیفہ بن خیاط نے سندھ کے علاقوں میں بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقرر کردہ ایک والی کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ انھوں نے سارے لوگ اکٹھے کیے اور سندھ کا رُخ کیا، لیکن ایک معرکہ میں وہ خود اور ان کے ساتھی ناکام ہو گئے، اور ان کے لشکر میں گنتی کے چند افراد ہی باقی رہ گئے۔[6]

---

1 الدراهم الإسلامية للخلفاء الراشدين لوداد القزاز (ص: ٥) فتوح البلدان (ص: ٣٩٩)

2 تاريخ الطبري (٥/ ٥٩٩)

3 اردبیل، آذربائیجان کا ایک مشہور شہر ہے جو اسلام سے پہلے وہاں کا دار الخلافہ تھا، آج کل تبریز کے مشرق میں واقع ہے۔ (معجم البلدان: ١/ ١٤٥)

4 فتوح البلدان (ص: ٣٢٤) الولاية على البلدان (٢/ ٢٥)

5 تاريخ اليعقوبی (٢/ ٩٥) تاريخ الطبری (٦/ ٢٧، ٤٧)

6 تاريخ خليفه بن خياط (ص: ٢٠٠) الولاية على البلدان (٢/ ٢٥)

مدائن میں حضرت سعد بن مسعود الثقفی رضی اللہ عنہ والی مقرر تھے۔ خوارج کا مقابلہ کرنے میں ان کا بہت بڑا کردار ہے، اس بارے میں ان کے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مابین خط و کتابت کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکروں کے سرداروں نے مدائن پہنچنے کی کوشش کی۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے بارے میں مشہور ہے کہ انھوں نے اپنی غیر موجودگی میں اپنے بھتیجے مختار بن ابی عبید الثقفی کو مدائن کا والی بنا دیا۔[1]

ان مثالوں سے یہ حقیقت اجاگر ہو جاتی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مختلف ولایات کی تنظیم و ترتیب کے لیے سخت جدو جہد کی اور اس سلسلے میں انھیں سخت مشکلات اور پیچیدگیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ یمن، حجاز اور مصر جیسی متعدد ولایات ان کے ہاتھ سے نکل گئیں۔ انھوں نے ابتدائی طور پر شام، فلسطین اور کئی پڑوسی ولایات پر قبضہ کرنے کی کوشش بھی کی، جن علاقوں اور شہروں میں ان کا حکم جاری ہوا جیسے عراق اور فارس وغیرہ تو وہاں بھی انھیں بڑی مشکلات پیش آئیں، سرِ فہرست خوارج کا مسئلہ تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حکومت کے آخری برسوں میں انہی علاقوں میں ان کا ظہور ہوا اور مشرقی علاقوں فارس، خراسان اور سجستان وغیرہ کے اصل باشندوں نے کئی مقامات پر فتنہ وفساد برپا کیا، اس کے نتیجے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعض والی بھی شہید ہو گئے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جو انتہائی سنگین دشواریاں پیش آئیں ان میں سے چند یہ ہیں:

بعض والیوں نے آپ کی مخالفت پر کمر باندھ لی، اور بعض ولایات کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو گئے جیسے ہمذان کے والی حضرت جریر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ اور اہواز کے والی مفصلہ بن ہبیرہ۔ اس طرح واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مدتِ خلافت داخلی کشمکش ہی کی نذر ہو گئی۔ اس کا نقصان یہ ہوا کہ مختلف علاقوں میں انتظامی اصلاحات خصوصاً تنظیم و تعمیر کا کام نہ ہو سکا۔ ان مشکلات نے ان کی قوت کو کمزور کر دیا، مورخین نے ان باتوں پر خوب روشنی ڈالی ہے۔[2]

جنگ، امن اور خارجہ پالیسی کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نظریات:

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے مقرر کردہ والی مالک بن اشتر سے مخاطب ہو کر فرمایا: دشمن کی

---

[1] تاريخ الطبري (٥/ ٦٩٠)

[2] الولاية على البلدان (٢/ ٢٧) اس بحث میں زیادہ تر ڈاکٹر عبد العزیز العمری کی کتاب "الفتوح الإسلامية عبر العصور" سے استفادہ کیا گیا ہے۔

طرف سے پیش کردہ ایسی صلح سے انکار نہ کرو جس سے اللہ راضی ہو، بیشک صلح میں تمھارے لشکروں کے لیے سکون واطمینان ہے۔ اس طرح تمھیں زیادہ فکر واندیشے سے نجات ملے گی اور ایسی صورتحال تمھارے ملک کے لیے باعثِ امن ہوگی۔ لیکن صلح کرنے کے بعد دشمن کی طرف سے بہت چوکس رہو۔ ہر قسم کی احتیاط سے کام لو، بسا اوقات دشمن قریب ہو کر بظاہر غافل نظر آتا ہے لیکن وہ پھر وار کر دیتا ہے۔ زیادہ حسنِ ظن سے کام نہ لو اگر تمھارے اور دشمن کے مابین کوئی پیچیدگی ہے یا تم نے اس سے کوئی عہد کیا ہے تو عہد کی پاسداری کرو۔ جدا جدا آراء اور خواہشات کے مختلف ہونے کے باوجود، اللہ تعالیٰ کے فرائض میں عہد پورا کرنے سے بڑی اور کوئی چیز نہیں۔ عہد کی پابندی مسلمان تو مسلمان مشرکوں نے بھی کی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ مشرکوں نے عہد کی پاسداری اُس وقت کی جب انھیں بدعہدی کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ لہٰذا فساد اور خیانت دونوں باتوں سے بچو۔ ایسی پیچیدگیوں سے بھی بچو جو آگے جا کر مشکلات کا باعث بنیں۔ قول وقرار کی پختگی کے بعد غلط بات کا سہارا نہ لو۔ اگر عہد کی تکمیل میں کہیں کوئی تنگی پیش آجائے تو ناحق فراخی یا آسانی کے طلبگار نہ ہو، تنگی اور مشکل پر صبر کرنے کا انجام اس فراخی سے بہتر ہے جو بدعہدی کی طرف لے جائے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو بھی مطالبہ ہو، اس پر دنیا وآخرت کا مستقبل دیکھے بغیر لبیک کہو۔[1]

داخلی امن کی حفاظت:

یہ عمل پُر امن پالیسیوں کی راہ پر گامزن ہونے کے نتیجے میں ممکن ہوگا۔ امیر المومنین نے اپنے بعض عُمال کو لکھا: آپ کے اہلِ علاقہ میں سے کچھ معززین نے آپ کی طرف سے سختی، شدت اور حقارت کے رویے کی شکایت کی ہے، ان کے ساتھ نرمی کا رویہ اختیار کرو جس میں تھوڑا سا سختی کا پہلو بھی ہو۔ یعنی شدت اور شفقت کی ملی جلی کیفیت ہو۔ انھیں کسی قدر اپنے قریب اور قدرے فاصلے پر رکھو!۔

یہ پالیسی داخلی امن کے استحکام کے لیے ضروری ہے۔ امیر المومنین نے مالک بن اشتر کے نام خط میں تحریر فرمایا: اپنے اقتدار کو تقویت دینے کے لیے وہ خون نہ بہاؤ جسے اللہ نے حرام قرار دیا ہے، یہ بات تقویت کے بجائے اقتدار کو کمزور کرنے بلکہ اُس کے زوال کا باعث بنے گی۔[2]

---

[1] نهج البلاغة (ص: ٦٢٧)

[2] الولاية على البلدان (٢/ ٣٧) منقول از شرح نهج البلاغة (ص: ٢٢٧)

مالی اخراجات:

اسلامی مملکت میں اخراجات کے لیے مال کی فراہمی کا سر چشمہ زکاۃ و صدقات، مالِ غنیمت، مالِ فَی، خراج اور عُشر وغیرہ ہیں۔ ان سب ذریعوں سے حاصل شدہ مال بیت المال میں جمع کرنا ہو گا۔ یہی مسلمانوں کا بنیادی خزانہ ہے۔ یہیں مسلمانوں کا مال جمع ہوتا ہے۔ بیت المال میں ایک عامل ہوتا ہے، وہ جمع اور خرچ ہونے والے سارے مال کا حساب رکھتا ہے۔ ادارہ کی عدم مرکزیت میں بیت المال اہم کردار کرتا ہے۔ درحقیقت بیت المال، ریاست کا وہ دل ہوتا ہے جو سرکاری ڈھانچے کی شریانوں میں خون کی تقسیم و ترسیل کرتا ہے۔ امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''کڑی نگاہ رکھو کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو مال جمع ہو، اُسے عیال داروں، بھوکوں اور ضرورت مندوں پر خرچ کرو۔''

امیر المومنین فرماتے ہیں:

''جو زائد مال بچ جائے وہ ہمارے پاس بھیج دو تاکہ ہم یہاں موجود ضرورت مند لوگوں میں تقسیم کر سکیں۔''[1]

ریاست کے اہم اخراجات کا بڑا حصہ نہروں کی کھدائی، دریاؤں کی مرمت اور بے کاشت راضی کی آباد کاری پر صرف ہوتا ہے۔

ریاست کے ماتحت عُمال:

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''اپنے عُمال کے معاملات پر نظر رکھو، ذمہ داریاں سونپنے سے پہلے ان کا امتحان لو۔ ذاتی پسند و ناپسند یا ایسی ہی کسی بنیاد پر انھیں کسی عہدے پر مامور نہ کرو، یہ ظلم وخیانت کے مترادف ہوگا۔''

طبقاتِ معاشرہ:

امیر المومنین فرماتے ہیں: خوب اچھی طرح جان لو کہ رعیت مختلف طبقات پر مشتمل ہے، ان کا ایک باہمی تعلق ہے جو ایک دوسرے کے تعاون کے بغیر صحیح نہیں رہ سکتا۔ کچھ تو اللہ کی راہ کے مجاہد ہیں، کچھ عام

[1] شرح نهج البلاغة (ص: ٦٤٨) و الإدارة و النظام، عند الإمام علي رضي الله عنه (ص: ٢٥٨)

اور خاص شعبوں میں حساب کتاب رکھنے والے ہیں، بعض عدل قائم کرنے والے قاضی ہیں، کچھ جزیہ ادا کرنے والے ذِمی ہیں، کچھ اہلِ خراج ہیں، کچھ مسلمان ہیں۔ بعض اہلِ تجارت وصنعت ہیں، اور ایک طبقہ حاجتمندوں اور مسکینوں کا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک پر ذمہ داری کا حصہ مقرر کر دیا ہے۔ اور کتاب وسنت میں ہر ایک کے فرائض بیان کر دیے گئے ہیں، ان تمام شعبوں اور طبقوں کا قیام اور بحالی تاجروں اور صنعت کاروں پر منحصر ہے۔ انہی کے ذریعے اہلِ حاجت کی مدد ہوسکتی ہے اور انھیں ان کا حق ملتا ہے۔[1]

سزا اور جزا پر مبنی تربیت:

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے والیوں اور جملہ عُمال سے فرمایا: نیکوکار اور برا شخص تمھاری نظر میں برابر نہیں ہونا چاہیے۔ حسنِ عمل والوں کی حوصلہ افزائی مطلوب ہے اور برے لوگوں کی سرزنش کے ساتھ ساتھ ان کی تربیت بھی ضروری ہے۔

جمل اور صفین کے معرکے اور قضیۂ تحکیم:

فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ وَاِنْ طَآىِٕفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ۚ فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴾ [الحجرات: ۹۔ ۱۰]

''اور اگر مومنوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو تم ان کے درمیان صلح کرادو، پھر اگر (ان) دونوں میں سے ایک گروہ دوسرے پر زیادتی کرے، تو تم اس سے لڑو جو زیادتی کرتا ہے، حتیٰ کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ آئے، پھر اگر وہ لوٹ آئے تو تم ان دونوں کے درمیان عدل (حق) کے ساتھ صلح کرادو، اور تم انصاف کرو، بلاشبہ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ مومن تو (ایک دوسرے کے) بھائی ہیں، لہٰذا تم اپنے بھائیوں کے درمیان صلح کرا دو، اور تم اللہ سے ڈرو تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔''

[1] شرح نہج البلاغة (ص: ٦١١)

حضرت حسن رضی اللہ عنہ، حضرت علی بن ابی طلحہ رضی اللہ عنہ سے اور وہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ یہ

فرمانِ الٰہی بڑا واضح ہے:

''اور اگر اہلِ ایمان میں سے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو اُن کے درمیان صلح کراؤ، پھر اگر اُن میں سے ایک گروہ دوسرے گروہ پر زیادتی کرے تو زیادتی کرنے والے سے لڑو، یہاں تک کہ اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آئے۔''

اس فرمانِ الٰہی میں اللہ تعالیٰ نے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنوں کو حکم دیا ہے کہ اگر اہلِ ایمان میں سے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو انھیں اللہ کے حکم کی طرف بلائیں اور آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ انصاف کا رویہ اختیار کریں، اگر وہ مان لیں تو اللہ کی کتاب کے مطابق ان کے مابین فیصلہ کر دیں، تا آنکہ مظلوم اور ظالم کے مابین انصاف قائم ہو جائے، اگر ان میں سے کوئی انکار کرے تو وہ باغی شمار ہو گا۔ اس صورت میں مومنوں کے امام پر لازم ہے کہ وہ ان کے خلاف جہاد اور قتال کرے، تا آنکہ وہ سب اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آئیں، اور اللہ تعالیٰ کا فیصلہ مان لیں۔[1]

امام بخاری رحمہ اللہ اور دیگر محدّثین نے یہ استدلال کیا ہے کہ معصیت چاہے کتنی ہی بڑی ہو، ایمان سے خارج نہیں کرتی، بخلاف خوارج کے جو اس بات کے قائل ہیں کہ گناہِ کبیرہ کا مرتکب کافر اور جہنمی ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے یہ ثابت ہے کہ انھوں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک روز خطاب فرمایا، اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ منبر کے اوپر حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما بھی تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی طرف دیکھتے اور پھر لوگوں کی طرف دیکھتے اور فرماتے تھے کہ میرا یہ بیٹا سردار ہو گا، اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے مسلمانوں کے دو عظیم گروہوں میں صلح کرا دے گا۔[2]

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ایک فریق زیادتی کرے اور حد سے تجاوز کرے، اللہ کا حکم اور اس کی نصیحت تسلیم نہ کرے تو مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ اس باغی گروہ کے خلاف لڑیں تا آنکہ وہ اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آئے اور بغاوت چھوڑ دے۔ اس صورت میں لڑائی اسلحہ کے ساتھ اور اسلحہ کے بغیر بھی ہو سکتی ہے۔ ثالثی کا فرض ادا کرنے والا صلح کو یقینی بنائے گا۔ اگر ہتھیار اٹھائے بغیر یہ مقصد حاصل ہو جاتا ہے تو ایسا ہی کرنا ہو گا لیکن اسلحہ کا استعمال ناگزیر ہو جائے تو باغیوں کے واپس آنے تک اس کا استعمال کرنا ہو گا۔

---

[1] التفسير الصحيح، لحكمت البشير (٤/ ٣٦٩)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧١٠٩)

اس آیت کے مفہوم میں بالا ولیٰ تمام مومنوں کے سردار صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم بھی شامل ہیں، چاہے جمل کا واقعہ ہو یا صفین کا، امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس آیت کا پورا عملی انطباق فرمایا اور فریقین کے مابین صلح کی بھرپور کوشش کی، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے ان کی آواز پر لبیک کہا، مگر عبد اللہ بن سبا کے پیروکاروں نے دونوں فریقوں کے درمیان جنگ کے حالات پیدا کر دیے۔ اس پر ان شاء اللہ آگے بات ہوگی۔

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اہلِ شام کے ساتھ صلح کی فضاء اور پرامن حالات پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ خاص طور پر ایسی اصلاحی جدو جہد مسلسل جاری رکھی جس کے زیرِ اثر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سمع وطاعت اور وحدتِ خلافتِ اسلامیہ کی طرف لوٹ آئیں لیکن اپنی مساعیِ جمیلہ میں ناکام ہونے کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مجبوراً تلوار سونت لی۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی شرط یہ تھی کہ قاتلینِ عثمان رضی اللہ عنہ ان کے حوالے کر دیے جائیں، انھوں نے اجتہادی غلطی کی اور افسوس! لڑائی ہو کر رہی۔

فرمانِ ربانی ہے:

﴿ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ ﴾ [الحجرات: ۱۰] ''مومن تو ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔''

مسلمانوں کے آپس میں لڑنے والے سب گروہوں کے بارے میں اخوتِ ایمانی ثابت ہوگئی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت طلحہ و حضرت زبیر رضی اللہ عنہما کے مابین جمل میں جو کچھ ہوا اور صفین میں ان کے اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے مابین جو کچھ پیش آیا، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جمل اور صفین دونوں سانحوں میں دونوں طرف مومن ہی تھے اور ان تاریخی حادثات کی وجہ سے صحابۂ کرام کو مطعون کرنے کی ہرگز کوئی گنجایش نہیں۔ نہ ان کے ایمان سے خارج ہونے کی کوئی بات کی جاسکتی ہے۔ نہ ان تمام حضرات کے بارے میں کوئی نامناسب اور انحراف پر مبنی کوئی عبارت نشر کرنا جائز ہے، ان سب باتوں کو رد کرنے کے لیے صرف یہی دلیل کافی ہے کہ مذکورہ آیات نے ان کے لیے اخوتِ ایمانی ثابت کی ہے۔

معرکۂ جمل سے پہلے کے واقعات:

شہادتِ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ایسا فتنۂ عظیم تھا، جس کے بطن سے دیگر بہت سے فتنے پھوٹ پڑے۔ شہادتِ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے فتنے کے اسباب میں بہت سے عوامل کام کر رہے تھے، ان میں سے چند یہ ہیں:

خوشحالی اور معاشرے پر اس کے اثرات، ان کے عہد میں اجتماعی تبدیلی کا مزاج، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بعد برسرِ اقتدار آنا، کبار صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا مدینہ سے چلے جانا، جاہلی عصبیت، فتوحات

کا رُک جانا، جہالت پر مبنی اللہ کا خوف، کینہ پرور لوگوں کی سازشیں، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بعض معاملات و مسائل بھڑکانے کی ٹھوس تدابیر، لوگوں کو اشتعال دلانے کے حربے اور فتنے میں عبداللہ بن سبا کا مذموم کردار۔

مؤرخین، محدّثین، کتب فِرق و مذاہب اور کتب طبقات و ادب وانساب میں سے جو مؤلفین بھی سبائیت کو زیرِ بحث لائے ہیں، وہ عبداللہ بن سبا کے وجود پر متفق ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ فتنے کی خبروں میں اس کا ذکر واضح طور پر موجود رہا۔ ابن سبا کے کردار کا تذکرہ صرف تاریخ طبری تک ہی نہیں بلکہ اس میں عمر بن سیف التمیمی کے حوالے سے جو روایات ہیں وہ متقدمین کی روایات میں منتشر خبروں کی صورت میں موجود ہیں۔ یہ تمام روایات اسلامی تاریخ اور فِرق و مذاہب کی کتابوں میں پائی جاتی ہیں، البتہ دوسروں پر تاریخ طبری کی امتیازی حیثیت یہ ہے کہ اس میں بھرپور واقعات اور کثرت سے تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ لہٰذا ان واقعات کے بارے میں تشکیک بلا دلیل ہے جس کی کوئی سند نہیں، جبکہ وہ واقعات صحیح روایات سے ثابت ہیں اور جن روایات میں عمر بن سیف بھی نہیں ہے، ان سے بھی عبداللہ بن سبا کا وجود ثابت ہوتا ہے۔ کثیر روایات اور نصوص کے بالمقابل عقلی استدلال کی کوئی اہمیت نہیں، نہ تاریخی حقائق کو جھٹلایا جاسکتا ہے نہ علماء ومحدّثین کو غلط کہا جاسکتا ہے۔[1]

فتنہ بھڑکانے میں عبداللہ بن سبا کا کردار:

خلافتِ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے آخری برسوں میں وہ تبدیلیاں ظہور میں آئیں جن کا ہم نے پہلے ذکر کیا ہے، ان کے نتیجے میں اسلامی معاشرے میں اضطراب کی نشانیاں نمودار ہوگئیں، بعض یہودی ظہورِ فتنہ کے مواقع کا انتظار کررہے تھے تاکہ فتنے کے عوامل کا استعمال کرسکیں، وہ خود کو مسلمان ظاہر کرتے ہوئے ''تقیہ'' کا استعمال کررہے تھے۔ ان میں سب سے نمایاں عبداللہ بن سبا ہے جسے ''ابن السوداء'' کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ فتنے کے پس منظر میں ابن سبا کے کردار کو معمولی بنا کر پیش کرنا غلط ہے، یہی شخص تھا جس نے فتنہ بھڑکایا۔ پھر دیگر عوامل نے اس کے لیے راہ ہموار کی، ابن سبا نے جو کچھ پیش کیا وہ ایسی آراء اور نظریات تھے جنھیں اس نے خود گھڑا اور خود ہی دعویٰ کیا اور کینہ پرور یہودی ذہنیت نے ان نظریات پر عمل کیا، مخصوص اہداف کے ساتھ ان کی ترویج کی، اس شخص نے اسلامی معاشرے میں انتشار پیدا کیا۔

[1] دعاوی الانقاذ للتاريخ الإسلامي للعوده، و تحقيق مواقف الصحابة (١/ ٧٠)

فتنے کی آگ بھڑ کائی۔ اس طرح معاشرے میں اختلافات کے بیج پھوٹ پڑے، یہی وہ عوامل ہیں جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کا باعث بنے، اور امت گروہوں میں بٹ گئی۔[1]

ابن سبا نے طریقِ کار یہ اختیار کیا کہ لوگوں کی نگاہوں میں کبار صحابہ میں سے دو شخصیات کے مابین اختلاف کی تشہیر کی، ایک کو غاصبِ حق اور دوسرے کو مظلوم ظاہر کیا مثلاً حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں کہا گیا کہ ان کا حق غصب کیا گیا ہے۔ خاص طور پر کوفہ میں یہ بات خوب اچھالی گئی۔ لوگوں کو امر بالعروف اور نہی عن المنکر کے نام پر ان کے امراء کے خلاف بھڑ کایا گیا، وہ معمولی سی بات پر مختلف والیانِ ریاست کے خلاف بھڑک اٹھتے تھے، اس نے اپنے اس منصوبے کی تکمیل و تنفیذ کے لیے دور دراز کے اعراب کو ورغلایا، اس نے ان کے دل میں اپنے لیے نرم گوشہ پیدا کر لیا تھا اور پڑھے لکھے لوگوں کو معروف و منکر کے زیرِ عنوان گمراہ کر رہا تھا۔

اس نے لالچی لوگوں کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف یہ کہہ کر اکسایا کہ انھوں نے اقرباء پروری کی ہے، مسلمانوں کے بیت المال میں سے بہت سا مال غلط کاموں پر ضائع کر دیا ہے، اور ایسی ایسی تہمتیں اور طعنہ زنی کی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بے گناہ ہونے کے باوجود فسادیوں کو ان کے خلاف خروج و بغاوت پر آمادہ کر لیا۔ اس ساری صورتِ حال کے پیشِ نظر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ محسوس فرماتے تھے کہ مختلف علاقوں اور شہروں میں کچھ اتھل پتھل ہو رہی ہے اور فتنے سر اُٹھا رہے ہیں۔ اس صورتِ حال پر آپ نے فرمایا: اللہ کی قسم! فتنے کی چکی چل رہی ہے، (حضرت) عثمان (رضی اللہ عنہ) کے لیے خوش بختی ہو گی کہ جان تو دے دے مگر فتنے کو نہ بھڑکنے دے۔[2]

امارتِ مصر ابن سبا کے لیے سازگار تھی، اس نے وہاں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف ترغیب و تنظیم کا کام کیا، وہ فتنہ بھڑکانے کے لیے لوگوں کو مدینہ کی طرف خروج کے لیے اُکساتا تھا۔ اور دعویٰ اور دلیل یہ پیش کرتا تھا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے خلافت پر ناحق قبضہ کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وَصی کے خلاف کود پڑا، اس کی مراد حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے۔

---

[1] تحقيق مواقف الصحابة (١/ ٣٢٧)

[2] تاريخ الطبري (٥/ ٢٥٠)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف لوگوں میں ایسے جعلی خطوط پھیلا دیے گئے جن کے بارے میں یہ دعویٰ

کیا گیا کہ یہ کبار صحابہ نے لکھے ہیں۔ تا آنکہ یہ اعراب (بدو) جب مدینہ منورہ پہنچے اور صحابۂ کرام سے ملے تو ان کی طرف سے انھوں نے مطلق کوئی تائید نہیں پائی بلکہ انھوں نے اپنی طرف منسوب ان خطوط سے بریّت اور بیزاری کا اظہار فرمایا۔[1]

بدووں نے دیکھا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تو سب لوگوں کے حقوق کی پاسداری کر رہے ہیں، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے ان لوگوں کی افتراء پر دازی کو رد کر دیا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اقوال واعمال کی سچائی ظاہر فرمائی۔ امام ذہبی رحمہ اللہ کا خیال ہے کہ عبد اللہ بن سبا نے پہلے مصر میں فتنہ بھڑکایا، پھر مختلف ولایات میں بدبختی اور انتقام کے بیج بوئے، پھر وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شخصیت پر حملہ آور ہوا۔[2]

ابن سبا اکیلا نہ تھا، اس نے سازشیوں کا جال پھیلا رکھا تھا، وہ مکر وفریب، دھوکا بازی اور حیلہ سازیوں کا پُتلا تھا۔ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ مختلف گروہوں کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف مجتمع کرنے والا درحقیقت ابن سبا ہی ہے۔ اُسی نے مصر پہنچ کر افتراء پر دازیوں کا طوفان اُٹھایا اور اہلِ مصر کی بڑی تعداد اُس کے ورغلانے میں آ گئی۔[3]

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: خوب اچھی طرح جان لو کہ ان لڑائیوں کا سبب یہ تھا کہ مسائل میں شبہات اُبھر آئے تھے، ان شبہات کی شدت کے باعث ان کے اجتماعی امور میں بھی اختلاف ہو گیا اور لوگ تین اقسام میں مُنقسم ہو گئے:

ایک قسم تو وہ تھی کہ اجتہاد کی بنا پر انھوں نے یہ سمجھا کہ حق اُن کے ساتھ ہے اور ان کا مخالف باغی ہے، انھوں نے اپنے ساتھیوں کی مدد کرنا ضروری سمجھا، ان کے خیال میں باغی سے لڑنا ضروری تھا، لہٰذا انھوں نے ایسا ہی کیا۔ ان کی نظر میں باغیوں سے لڑنا مطلوب ہے اور امامِ عادل کی مدد سے پیچھے ہٹنا جائز نہیں۔

دوسری قسم وہ تھی جو ان کے برعکس تھی، اجتہاد کی بنیاد پر انھوں نے دوسروں کو برحق سمجھا، ان کی مدد کو اپنے آپ پر واجب قرار دیا، اور جو لوگ اس سوچ کے باغی تھے ان کے خلاف لڑنا ضروری سمجھا۔

تیسری قسم ان حضرات کی تھی جو زیرِ نظر مسئلہ میں اشتباہ کا شکار ہو گئے۔ وہ حیرانی وپریشانی میں

[1] تاريخ الطبري (٥/ ٣٤٨) وتحقيق مواقف الصحابة (١/ ٣٣٠)
[2] تحقيق مواقف الصحابة (١/ ٣٣٨)
[3] البداية والنهاية (٧/ ١٦٧، ١٦٨)

پڑ گئے، کوئی ایک گروہ بھی ان کی نظر میں قابلِ ترجیح قرار نہیں پایا، لہٰذا انھوں نے دونوں سے علاحدگی اختیار کر لی۔ ان کے خیال میں معاملے سے علیحدگی اختیار کرنا ہی برحق تھا۔ کیوں کہ کسی مسلمان کے خلاف اس وقت تک لڑائی کا اقدام جائز نہیں جب تک یہ واضح نہ ہو جائے کہ وہ واقعی اس کا مستحق ہے۔ اگر ان لوگوں پر واضح ہو جاتا کہ ازروئے حق فلاں گروہ کا پلہ بھاری ہے تو ان کے لیے ان کی مدد سے گریز اور باغیوں کے خلاف لڑائی سے پیچھے ہٹے رہنا جائز نہیں تھا۔[1]

خونِ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا بدلہ لینے کا مطالبہ

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا:

مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ واپس جاتے ہوئے جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے شہادتِ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خبر سنی تو آپ مکہ لوٹ گئیں، مسجدِ حرام میں داخل ہوئیں اور پھر حطیم میں خیمہ زن ہوگئیں، لوگ آپ کے پاس جمع ہو گئے تو آپ نے فرمایا:

”اے لوگو! مختلف شہروں کے فسادی، دیہاتی اور اہلِ مدینہ کے غلاموں نے اپنی اغراض کے پیشِ نظر اس معصوم مقتول کے خلاف عیب جوئی کی اور پھر چند لونڈوں کو ان کے خلاف استعمال کیا، بغیر دلیل اور بغیر عذر کے انھوں نے اضطرابی کیفیت پیدا کی، زیادتی سے کام لیا، حرمت والا خون بہایا، بلدِ حرام کی حرمت کا لحاظ نہیں کیا، مالِ حرام لیا اور حرمت والے مہینے کی بے حرمتی کی، اللہ کی قسم! حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی ایک انگلی روئے زمین کے رہنے والے ان جیسے سب لوگوں سے بہتر ہے، تم سب متحد ہو جاؤ تو اس صورتِ حال سے نجات حاصل کر سکتے ہو۔ ان لوگوں کو عبرت کا نشان بنا دو، ان کی اجتماعیت میں پھوٹ ڈال دو۔ ہمارے لیے اس گناہ سے اسی طرح چھٹکارا ممکن ہے جس طرح سونے کو بھٹی میں جلا کر کھوٹ نکال دی جاتی ہے یا جس طرح مَیل کپڑے سے نکال دی جاتی ہے۔“[2]

ایک روایت میں آیا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جب یہ خبر سن کر واپس مکہ کی طرف لوٹیں تو ان کی

[1] شرح النووی علی صحیح مسلم (١٥/ ١٤٩)

[2] تاريخ الطبري (٥/ ٤٧٣، ٤٧٤)

خدمت میں امیر مکہ حضرت عبداللہ بن عامر الحضرمی رحمہ اللہ حاضر ہوئے، انھوں نے پوچھا: اُم المومنین! آپ کو واپس کیوں آنا پڑا؟ انھوں نے فرمایا: میں اس لیے واپس آئی ہوں کہ (حضرت) عثمان (رضی اللہ عنہ) کو مظلومیت کی حالت میں شہید کر دیا گیا ہے، اور فسادیوں کا معاملہ ٹھیک ہونے والا نہیں، (حضرت) عثمان (رضی اللہ عنہ) کے خون کا مطالبہ اور اسلام کی عزت کا سامان کرو۔[1]

کہا گیا کہ لوگوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں بہت باتیں کی ہیں ... یہ سن کر وہ کہنے لگیں: اللہ اس پر لعنت کرے جو (حضرت) عثمان (رضی اللہ عنہ) پر لعن طعن کرے، اللہ کی قسم! (حضرت) عثمان (رضی اللہ عنہ)، اللہ کے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے، نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میری طرف پیٹھ کیے ہوئے تھے، حضرت جبرائیل علیہ السلام آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کی وحی لا رہے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے: عثمان! یہ لکھ لو۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں یہ مقام و مرتبہ اس وجہ سے دیا تھا کہ وہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت عزیز تھے۔[2]

حضرت مسروق رضی اللہ عنہ، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں، انھوں نے شہادتِ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے موقع پر فرمایا: تم نے مَیل سے پاک صاف اور شفاف کپڑے کی مانند کردار والے انسان کو اس طرح ذبح کر دیا جس طرح مینڈھے کو ذبح کیا جاتا ہے۔ حضرت مسروق رحمہ اللہ کہتے ہیں: میں نے ان سے کہا: یہ تو آپ ہی کا کیا دھرا ہے، آپ ہی نے لوگوں کو خط لکھ کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت کے لیے ابھارا تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ہرگز نہیں، اُس اللہ کی قسم جس پر مومن ایمان لائے ہیں اور کافروں نے اس کا کفر کیا ہے، میں نے آج تک انھیں ایک حرف بھی نہیں لکھا۔[3]

حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما:

حضرت طلحہ، حضرت زبیر اور ان کے ساتھی صحابہ رضی اللہ عنہم نے امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں پر قصاص کی حد فوری طور پر نافذ کرنے کا مطالبہ کیا، امیر المومنین رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میرے عزیز بھائیو! میں اس معاملے سے ناواقف نہیں جس کا آپ مجھ سے مطالبہ کر رہے ہیں، لیکن میں ان لوگوں کا کیا کروں جو ابھی تک ہم پر حاوی ہیں، ہم ان پر حاوی نہیں، تمھارے غلام اور تمھارے جاہل بدو

[1] تاريخ الطبري (٥/ ٤٧٥)

[2] المسند (٦/ ٢٥٠، ٢٦٠) وتحقيق موقف الصحابة (١/ ٣٧٨)

[3] فتنة مقتل عثمان (١/ ٣٩١) وتاريخ خليفه بن خياط (ص: ١٧٦) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا تک اس حدیث کی سند صحیح ہے۔

لوگ بھی ان کے ساتھ ہیں۔ وہ ہم سے من مانا سلوک کرتے ہیں۔ کیا فی الحال آپ کا مطالبہ پورا کیا جا سکتا ہے؟ انھوں نے جواب دیا: نہیں! یہ سن کر امیر المومنین نے فرمایا کہ میری رائے بالکل وہی ہے۔ اس معاملے میں تین آراء سامنے آ چکی ہیں:

ایک گروہ کی رائے آپ کی رائے کے مطابق ہے، دوسرا گروہ آپ کی رائے کے برعکس ہے۔ اور تیسری قسم کے لوگ وہ ہیں جن کا خیال یہ کہ ماحول پر سکون ہو جائے، لوگوں کے دل صحیح رخ اختیار کر لیں، پھر حقوق کا مطالبہ کیا جائے، اب آپ اس معاملے پر غور کر لیں، اور واپس آ کر مجھے اپنی رائے بتائیں۔[1]

یہ سیاسی حکمتِ عملی بعض لوگوں کی سمجھ میں نہ آ سکی، لوگ ابھی تک غصے کی حالت میں تھے اور جذبات کی رو میں بہہ رہے تھے۔ انھیں ان معاملات کا صحیح ادراک تھا نہ ان کے اندازے صحیح تھے، وہ فوری طور پر ناممکن کو ممکن سمجھ رہے تھے، اسی لیے انھوں نے کہا: یہ فیصلہ ہو جانا چاہیے، ہم اسے مؤخر نہیں کر سکتے، اس سے ان کی مراد یہی تھی کہ قاتلین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر حد نافذ کی جائے۔[2]

حضرت علی رضی اللہ عنہ تک یہ بات پہنچی تو آپ نے انھیں سمجھانے کی کوشش کی کہ موجود حالات میں وہ کچھ نہیں کر سکتے، لہٰذا آپ نے اعلان فرمایا: ہر غلام اپنے آقا کے پاس واپس لوٹ جائے وگرنہ اس کا ذمہ ختم سمجھا جائے گا۔

یہ سن کر باغی سبائی اور دیہاتی آپس میں الجھنے لگے کہ حالات جیسے آج ہیں، کل بھی ویسے ہی رہیں گے، پھر ہم ان کے بارے میں کیا فیصلہ کر پائیں گے، گویا کہ فتنے کے سرغنے سبائی گروہ کو یہ محسوس ہوا کہ خلیفہ انھیں ان کے اعوان وانصار سے الگ کرنا چاہتے ہیں تو انھوں نے دیہاتیوں کو اپنی حالت پر برقرار رہنے کی ترغیب دی، وہ لوگ مان گئے اور اپنی اپنی جگہوں پر برقرار رہے۔ بیعت کے تیسرے روز حضرت علی رضی اللہ عنہ تشریف لائے اور ان (قاتلینِ عثمان رضی اللہ عنہ) سے کہا کہ اعراب کو اپنے ہاں سے نکال دو۔ پھر اعراب کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: تم اپنے اپنے علاقوں میں چلے جاؤ، سبائی لوگوں نے یہ بات ماننے سے انکار کیا اور اعراب بھی انہی کے کہنے پر عمل کرتے رہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے گھر تشریف لائے، ان کے ساتھ ہی حضرت طلحہ وحضرت زبیر رضی اللہ عنہما بھی دیگر صحابۂ کرام کی معیت میں ان کے گھر میں داخل ہوئے، حضرت

---

[1] تاريخ الطبري (٥/ ٤٦٠)

[2] تاريخ الطبري (٥/ ٤٦٠) الدور السياسي (ص: ٣٦٨)

علی رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا کہ انتقام کے جذبات کم کرو۔ انھوں نے کہا کہ یہ لوگ (قاتلینِ عثمان رضی اللہ عنہ) اندھے ہو گئے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ آج کے بعد یہ مزید اندھے اور نافرمان ہو جائیں گے۔ حضرت علی، حضرت طلحہ، اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہم دیگر صحابہ کی معیت میں اس پر متفق نظر آتے تھے کہ جن لوگوں نے مسلمانوں کی اجتماعیت میں تفریق ڈالی، مخالفانہ رویہ اختیار کیا اور خلیفۂ راشد کو شہید کر دیا، ان پر قصاص کی حد فوری طور پر نافذ ہونی ضروری ہو گئی ہے، تاکہ دینِ اسلام کو ان کے شر سے محفوظ رکھا جا سکے، وہ اس معاملے میں باہمی تعاون کرنے والے تھے۔ لیکن اصل مسئلہ یہ تھا کہ وہ ان فسادیوں کے ساتھ کیا معاملہ کریں جو حاوی ہو چکے تھے، وہ لوگ غلاموں اور اعراب (بدوؤں، دیہاتیوں) کو بھی متحرک کر چکے تھے، اور اہلِ مدینہ سے اپنی مرضی کا برتاؤ اختیار کیے ہوئے تھے۔ ان لوگوں کے خلاف لڑائی کی قدرت نہ تھی۔[1]

حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے ان سبائی لوگوں کے مقابلے کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ایک تجویز پیش کی۔ حضرت طلحہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہما سے کہا: میں بصرہ چلا جاتا ہوں اور وہاں سے لاؤ لشکر تیار کر کے لاتا ہوں۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے کہا: میں کوفہ چلا جاتا ہوں اور ان فسادیوں کے خلاف لڑنے کے لیے لاؤ لشکر تیار کر کے لاتا ہوں۔ لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس معاملے پر مزید انتظار کرنے کا خیال ظاہر فرمایا اور ان سے کہا کہ اس معاملے پر سوچ و بچار کرتے ہیں۔[2]

شاید حضرت علی رضی اللہ عنہ فتنہ و فساد سے خائف تھے اور یہ محسوس فرماتے تھے کہ مبادا یہ معاملہ مدینہ منورہ میں خانہ جنگی تک جا پہنچے اور اس کا انجام بُرا ہو، لہٰذا انھوں نے حضرت طلحہ و حضرت زبیر رضی اللہ عنہما کا مطالبہ قبول نہیں کیا۔[1]

حضرت طلحہ و حضرت زبیر رضی اللہ عنہما کا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں تجویز پیش کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس موقف کے قائل ہو گئے تھے کہ فسادی لوگ دیگر مسلمانوں پر حاوی ہیں، جبکہ دیگر مسلمان ان پر حاوی نہیں ہیں۔ ان دونوں کی کوشش تھی کہ حدِ شرعی کے نفاذ کے تعطّل کا وقت مزید مختصر کیا جائے، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے تقویت کا سامان پیدا کیا جائے تاکہ وہ حد قائم کر سکیں۔

صحابۂ کرام نے انتظار کیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس معاملہ پر غور و فکر کر لیں۔ وہ خود یہ رائے رکھتے تھے کہ فتنے کے مکمل خاتمے تک یہ معاملہ ممکن نہیں، اور یہ ایسا فتنہ ہے کہ جوں ہی اسے چھیڑا گیا یہ مسلسل بڑھتا چلا جائے گا۔

---

[1] فتح الباري (١٢/ ٣٦٠)

[2] تاريخ الطبري (٥/ ٣٦١)

[3] تحقيق مواقف الصحابة (٢/ ١٠٨)

جب حضرت زبیر، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہما اور ان سے متفق صحابۂ کرام نے دیکھا کہ شہادتِ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر چار ماہ بیت چکے ہیں لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ قاتلینِ عثمان رضی اللہ عنہ پر قصاص کی حد قائم نہیں کر سکے، کیونکہ جیشِ حضرت علی رضی اللہ عنہ میں انہی لوگوں کا غلغلہ اور شان و شوکت ہے، چنانچہ حضرت طلحہ و حضرت زبیر رضی اللہ عنہما نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا: ہمیں اجازت دے دیجیے کہ ہم مدینہ سے چلے جائیں، یا تو آپ حالات کو کنٹرول کر لیں یا ہمیں جانے دیں تو انھوں نے فرمایا: جس حد تک ممکن ہوگا میں معاملات کنٹرول کرنے کی کوشش کروں گا، اگر اور کوئی چارۂ کار نہ ہوگا تو آخری علاج گرم لوہے سے داغنا ہوگا۔[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ خوب سمجھتے تھے کہ ان دونوں کا مدینہ سے چلے جانا ان دونوں کی طرف سے اس مسئلہ کے حل کی ایک کوشش ہے، لہٰذا انھیں جانے سے منع نہیں کیا، کیوں کہ وہ بھی کسی حل تک پہنچنے کے آرزومند تھے بلکہ وہ اپنے مخصوص طریقے سے اس امر کی کوشش بھی کر رہے تھے۔[2]

حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما:

قدیم و جدید ادوار کے لوگوں میں یہ بات بہت مشہور ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے درمیان اختلاف کا سبب یہ تھا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اپنے دل میں خلافت کے حصول کا طمع رکھتے تھے اور ان کا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف خروج اور بیعت کرنے سے انکار کا اصل سبب یہ تھا کہ وہ ولایتِ شام سے معزول کر دیے گئے تھے۔

یہ بات امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں۔ یہ رافضیوں کی بنائی ہوئی بات ہے۔ کتبِ تاریخ وادب، اُن من گھڑت اور ضعیف روایات سے بھی بھری پڑی ہیں جن میں یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اختلاف کی اصل وجہ یہ تھی کہ وہ اقتدار، سرداری اور حکومت کے حصول کے متمنی تھے۔[3]

صحیح بات یہ ہے کہ حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کے درمیان اختلاف کی اصل وجہ، ان کی طرف سے قاتلینِ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے قصاص لینے کے ساتھ بیعت کو مشروط کرنا تھا، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ

[1] تاريخ الطبري (٥/ ٣٦٧ـ ٣٦٨) دور المرأة السياسي (ص: ٣٨٠)
[2] دور المرأة السياسي (ص: ٣٨٠، ٣٨١)
[3] تحقيق مواقف الصحابة في الفتنه (٢/ ١٤٥)

اور ان کے ساتھی اہلِ شام یہ کہتے تھے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں سے قصاص لیں تو وہ بیعت میں داخل ہو جائیں گے۔[1]

قاضی ابن العربی کہتے ہیں: اہلِ شام اور اہلِ عراق کے درمیان لڑائی کا سبب ان دونوں کے موقف میں اختلاف تھا۔ اہلِ عراق، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کی طرف بلاتے اور ان کے حق میں آواز بلند کرتے تھے، جبکہ اہلِ شام، قاتلینِ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے قصاص لینے پر اصرار کر رہے تھے اور کہتے تھے کہ جو اُن قاتلوں کو پناہ دے، ہم اس کی بیعت نہیں کر سکتے۔[2]

علامہ ابن حجر ہیتمی کہتے ہیں کہ اہل سنت کا یہ عقیدہ ہے کہ حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کے درمیان جو لڑائی تھی وہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے خلافت کے حق دار ہونے کے دعویٰ پر نہیں تھی، کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں اس پر اجماع تھا۔ فتنے کا سبب یہ نہیں تھا، فتنے کی اصل وجہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کا یہ مطالبہ تھا کہ قاتلینِ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ان کے حوالے کیا جائے کیونکہ حضرت معاویہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کے چچا زاد بھائی تھے اور ان کے وارث ہونے کی وجہ سے قصاص کا مطالبہ کر رہے تھے۔

جبکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کے مطالبے پر فوری عمل کرنے سے قاصر تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ قاتلینِ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اس وقت حاوی ہیں اور ان کے تعلقات حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر کے ساتھ بھی ہیں۔ اگر انھیں فوری طور پر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے حوالے کیا گیا تو زبردست فسادات پھوٹ پڑیں گے۔[3]

اکثر روایات اس بات کا اشارہ دیتی ہیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اطاعت کے لیے تیار تھے، وہ صرف حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خون کا مطالبہ کر رہے تھے، اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ قصاص کا مطالبہ دراصل اقتدار کی طمع کی خاطر تھا تو اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ قصاص کا حکم نافذ کر دیتے تو کیا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ان کی بیعت نہ کرتے؟ حقیقت یہ ہے کہ وہ ان کی بیعت و اطاعت کے لیے لازماً تیار ہو جاتے، کیوں کہ انھوں نے واضح طور پر اپنا یہ موقف پیش کیا تھا، ان کے ساتھی بھی بیعت کو قصاص کے ساتھ مشروط قرار دے رہے تھے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کاتبِ وحی اور افضل صحابہ میں سے تھے، ان کے لہجے میں سچائی تھی، وہ حلم اور

---

[1] البداية و النهاية (٨/ ١٢٩) وفتح الباري (١٣/ ٩٢)

[2] العواصم من القواصم (ص: ١٦٢)

[3] الصواعق المحرقه (٢/ ٦٢٢)

بردباری والے تھے۔ یہ کیسے سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ شرعی خلیفہ کے خلاف لڑائی کریں اور زوال پذیر اقتدار کے لیے مسلمانوں کا خون بہائیں، ان کا اپنا کہنا یہ ہے: مجھے جب بھی دو باتوں یعنی اللہ تعالیٰ اور غیر اللہ کے درمیان انتخاب کی بات کہی گئی تو میں نے اللہ تعالیٰ ہی کو اپنا نصب العین قرار دیا۔[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا:

''اے اللہ! اسے ہدایت یافتہ اور باعثِ ہدایت بنا دے۔''[2]

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مزید فرمایا:

''اے اللہ! اسے کتاب کا علم عطا فرما اور اسے عذاب سے بچا۔''[3]

البتہ ان کے موقف میں غلطی کی توجیہ یہ ہے کہ انھوں نے قصاص سے قبل بیعت سے انکار کر دیا کہ ان فسادیوں کے بارے میں انھیں اپنے سابقہ موقف کے باعث ڈر تھا کہ وہ انھیں قتل کر دیں گے، یہی وجہ ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے قاتلینِ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ان کے حوالے کرنے کا مطالبہ کیا، جبکہ قصاص کا طلبگار خود حکم دینے کا مجاز نہیں۔ اسے پہلے حلقۂ اطاعت میں داخل ہو جانا چاہیے پھر حاکم کی خدمت میں مقدمہ پیش کرنا اور اپنا حق مانگنا چاہیے تھا۔[4]

یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اجتہاد کیا اور وہ تاویل سے کام لے رہے تھے، انھیں گمان تھا کہ وہ حق پر ہیں، لہٰذا انھوں نے اہلِ شام کو جمع کیا، ان سے خطاب کیا اور انھیں اپنے بارے میں یاد دلایا کہ میں (حضرت) عثمان (رضی اللہ عنہ) کا وارث ہوں۔ یعنی ان کا چچا زاد ہوں اور (حضرت) عثمان (رضی اللہ عنہ) مظلومیت کی حالت میں شہید کیے گئے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ سب لوگ شہادتِ (حضرت) عثمان (رضی اللہ عنہ) کے بارے میں اپنی رائے دیں۔ یہ بات سن کر اہلِ شام اٹھ کھڑے ہوئے۔ انھوں نے خونِ (حضرت) عثمان (رضی اللہ عنہ) کا قصاص طلب کرنے کی تائید کی۔ اس بات پر ان کی بیعت کی اور عہد کیا کہ وہ اس مقصد کے حصول کے لیے مرتے دم تک اپنی جان اور مال قربان کریں گے۔[5]

---

[1] سير أعلام النبلاء (٣/ ١٥١)

[2] بخاري في التاريخ (٥/ ٢٤٠) جامع الترمذي، رقم الحديث (٣٨٤٢) مسند أحمد (١٧٩٢٤) طبقات ابن سعد (٧/ ٤١٨) شرح السنة للبغوي (٤/ ٤٩٠) مشكاة المصابيح، رقم الحديث (٦١٩٦) وصححه الألباني وغیرہ.

[3] فضائل الصحابة (٢/ ٩١٣) اس کی سند حسن ہے۔

[4] تحقيق مواقف الصحابة (٢/ ١٥١)

[5] وقعة صفين لابن مزاحم (ص: ٣٢) تحقيق مواقف الصحابة (٢/ ١٥٢)

فتنے سے کنارہ کشی کرنے والوں کا موقف:

رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان ''عنقریب فتنے برپا ہوں گے، جن میں بیٹھ جانے والا، کھڑا رہنے والے سے زیادہ بہتر ہوگا، اور اس میں کھڑا رہنے والا چلنے والے سے بہتر ہوگا، اور چلنے والا دوڑنے والے سے بہتر ہوگا، جو اس کی طرف جھانک کر دیکھے گا، تو (یہ فتنہ) اسے گلے لگا لے گا۔ ایسی صورتِ حال میں جسے جہاں بھی جائے پناہ ملے وہ وہاں پناہ حاصل کر لے۔''[1]

رسول اللہ ﷺ نے مزید فرمایا:

''قریب ہے کہ مسلمان کا بہترین مال بکریوں (کا ریوڑ) ہوگا، جنھیں لے کر وہ پہاڑوں کی گھاٹیوں اور جہاں پانی ہو وہاں چلا جائے، اپنے دین کی حفاظت کرتے ہوئے فتنوں سے دور بھاگ کھڑا ہو۔''[2]

ان کے علاوہ اور بھی بہت سی احادیث ہیں جن سے بالکل واضح طور پر یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ فتنہ وفساد اور لڑائی کے معاملات میں گھسنے سے منع کیا گیا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانے میں رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کی بہت بڑی تعداد لڑائی اور فتنے سے پیچھے ہٹی رہی، انھوں نے پر امن اور پرسکون رہنے کو ترجیح دی، وہ مصائب اور ہلاکت کے تھپیڑوں سے دور رہے، ان میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ اور حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ بھی عشرہ مبشرہ میں سے ہیں، ان کی وفات ۵۱ھ میں ہوئی۔[3]

بلکہ یہ دونوں صحابی ہی عشرہ مبشرہ میں سے تھے۔ ان فتنوں سے پیچھے رہنے والے صحابۂ کرام میں حضرت ابوموسیٰ اشعری، عبداللہ بن عمر، اسامہ بن زید اور ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہم جیسی شخصیات بھی شامل تھیں، صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی بہت بڑی تعداد نے ان کی پیروی کی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان حضرات پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔[4]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٠٨١)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٠٨٨)

[3] تهذيب التهذيب (٤/ ٣٠)

[4] غياث الأمم في التياث الظلم (ص: ٨٥، ٨٦)

امام ابن حجر رحمہ اللہ کا خیال ہے کہ وہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم جو فتنے سے الگ تھلگ رہے وہ قلیل تعداد میں تھے، اسی طرح جن صحابہ نے جمل اور صفین میں لڑائی سے توقف اختیار کیا وہ لڑنے والوں کی نسبت کم تعداد میں تھے، البتہ ان میں سے ہر ایک کے پاس اپنے موقف کی کوئی تاویل یا جواز موجود تھا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے لیے اجر ہے، برخلاف ان لوگوں کے جو بعد کے ادوار میں آئے اور انھوں نے طلبِ دنیا کی خاطر جنگ کی۔[1]

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ اکابر صحابۂ کرام کی اکثریت لڑائی میں شریک نہیں ہوئی، نہ اِس جانب سے، نہ اُس طرف سے اور قتال کو ترک کرنے والوں نے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ان احادیث سے استدلال کیا جو فتنے کے زمانے میں لڑائی نہ کرنے کے بارے میں ہیں۔ ان حضرات نے واضح کیا کہ یہ لڑائی، فتنے کا باعث ہے۔[2]

اب ان صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے کچھ اقوال، جنھوں نے فتنے سے کنارہ کشی اختیار کی:

① حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ:

صفین کے روز حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد صحابۂ کرام میں سے حضرت سعد رضی اللہ عنہ افضل ترین شخصیت تھے، جب حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا: کیا آپ لڑائی میں شریک نہیں ہوں گے، حالانکہ آپ اہلِ شوریٰ میں سے ہیں، اور دوسروں کی نسبت آپ اس کے زیادہ حق دار ہیں؟ تو انھوں نے فرمایا: میں اُس وقت تک لڑائی نہیں کروں گا جب تک مجھے ایسی تلوار نہ پیش کی جائے جس کی دو آنکھیں ہوں، ایک زبان اور دو عدد ہونٹ ہوں اور وہ مومن اور کافر کے مابین پہچان کر سکے، میں نے جہاد کیا ہے اور مجھے معلوم ہے کہ جہاد کیا ہے۔[3]

امام مسلم نے عامر کی حدیث میں بیان کیا ہے کہ انھوں نے کہا: حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ اپنے اونٹوں کے درمیان موجود تھے کہ ان کا بیٹا عمر اُن کے پاس آیا تو انھوں نے کہا: میں اس سوار کے شر سے اللہ کی پناہ میں آتا ہوں، وہ نیچے اترا اور اپنے والد سے پوچھنے لگا: کیا آپ اپنے اونٹوں اور بکریوں کے مابین موجود رہیں گے جبکہ لوگوں کو اقتدار کے تنازع میں چھوڑ دیا ہے۔ یہ سن کر حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے اس

---

① فتح الباري (١٣/ ٣٤)

② مجموع الفتاوى: ٣٥/ ٥٥)

③ مجمع الزوائد (٧/ ٢٩٩) اسے طبرانی نے روایت کیا ہے اور اس کے راوی صحیح کے راوی ہیں۔

کے سینے پر تھپڑ مارا اور فرمایا: چپ رہو! میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے، آپ فرماتے تھے: ''بیشک اللہ تعالیٰ متقی، پرہیزگار، غنی اور چھپ کر رہنے والے بندے سے محبت کرتا ہے۔''[1]

۲ حضرت ابوموسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ:

حضرت زید بن وہب رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جب ہمیں شہادتِ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خبر ملی تو لوگ انتہائی غم زدہ تھے۔ میں اپنے ایک ساتھی کے پاس گیا اور اس سے کہا کہ ہمارے درمیان صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت موجود ہے، آؤ اُن کے پاس چلتے ہیں، ہم حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے پاس آئے، وہ کوفے کے امیر تھے، ان سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے فتنے میں پڑنے سے منع کیا، اور گھروں میں بیٹھ رہنے کا حکم دیا۔[2]

اور کہا کہ تم اصل عربی بنو، تلواریں میان میں رکھو، تیروں کے پیکان زائل کر دو، تانت کاٹ دو، اور مجبور و مظلوم کو پناہ دو، تا آنکہ معاملہ ٹھنڈا پڑ جائے اور یہ فتنہ ختم ہو جائے۔ انھوں نے یہ بھی فرمایا: جب فتنہ آتا ہے تو لوگ شبہات میں پڑے ہوتے ہیں اور جب فتنہ ختم ہو جاتا ہے تو معاملہ واضح ہو جاتا ہے، فتنہ کھل جائے تو پیٹ کی بیماری کی مانند ہو جاتا ہے۔ شمال و جنوب اور مشرق و مغرب ہر طرف رخ کر لیتا ہے، بسا اوقات کچھ وقت کے لیے تھم جاتا ہے، پتا نہیں چلتا کہ یہ کدھر سے آیا ہے؟ یہ دانا انسان کو کل کے بچے کی مانند بنا دیتا ہے، اپنی تلواریں نیام میں رکھو، اپنے نیزے توڑ دو، اپنے تیر ہٹا لو، تانت توڑ دو، اور اپنے گھروں میں رہو۔[3]

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''قیامت سے پہلے فتنے رونما ہوں گے، جو اندھیری رات کے ٹکڑوں کی مانند ہوں گے، صبح کے وقت بندہ، مومن ہوگا اور شام کو کافر، شام کو مومن ہوگا اور صبح کو کافر، اس میں بیٹھنے والا کھڑا رہنے والے سے بہتر، اور چلنے والا دوڑنے والے سے بہتر ہوگا۔ کمانیں توڑ ڈالو، تانتیں کاٹ ڈالو، اپنی تلواریں پتھر پر مار کر توڑ ڈالو، اگر کوئی شخص تمھیں مارنے کے لیے آئے تو حضرت آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں میں سے اچھے بیٹے (ہابیل) کا کردار ادا کرو۔''[4]

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٩٦٥)

[2] تاريخ ابن عساكر (ص: ٤٨٧، ٤٨٨)

[3] تاريخ الطبري (٥/ ٥١٣، ٥١٥)

[4] صحيح سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٢١٥) سنن أبي داود، جامع الترمذی، رقم الحديث (٢٢٠٤) مسند أحمد، رقم الحديث (١٩٧٣٥) المستدرك للحاكم.

③ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: میں (حضرت) عبد اللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) جیسا کوئی شخص نہیں جانتی کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں لوگوں کے معاملات سے محفوظ رکھا ہو، اور وہ اپنے سے پہلوں کے طریقے پر استقامت کے ساتھ قائم ہو۔[1]

حضرت سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ہمارے پاس تشریف لائے، ہم پُر امید تھے کہ وہ ہمیں کوئی بہترین حدیث سنائیں گے، ہم سے پہلے ہی ایک شخص نے ان سے سوال کیا: اے ابو عبد الرحمٰن! فتنے کی صورتحال میں قتال کے بارے میں بتائیں جبکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ ﴾ [البقرة: ١٩٣]

''تم ان سے لڑتے رہو، یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے۔''

انھوں نے فرمایا: ''ارے بھولے آدمی! تم جانتے بھی ہو کہ فتنہ کیا ہوتا ہے؟ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو مشرکین کے خلاف لڑتے تھے، اُن کے دین میں داخل ہونا فتنہ کہلاتا تھا، تمھاری طرح اقتدار کی خاطر لڑائی کرنا (فتنہ کے خلاف لڑائی) نہیں ہے۔''[2]

حضرت نافع رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے کہا: اے ابو عبد الرحمٰن! کیا آپ نے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان سنا ہے:

﴿ وَاِنْ طَآىِٕفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ﴾ [الحجرات: ٩]

''اور اگر مومنوں کی دو جماعتیں آپس میں لڑ پڑیں تو اُن میں میل ملاپ یعنی صلح کرا دو۔''

انھوں نے فرمایا کہ میں اس آیت سے نصیحت حاصل کرتے ہوئے لڑائی کرنا پسند نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا ﴾ [النساء: ٩٣]

''اور جو کوئی کسی مومن کو قصداً قتل کر ڈالے، اس کی سزا دوزخ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔''

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے یہ بھی فرمایا کہ تم نے دیکھا نہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ ﴾ [البقرة: ١٩٣]

---

[1] مصنف ابن أبي شيبة (١٣/ ٥٠٨) رقم الحديث (٣٦٣٧٧)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٠٩٥)

''اور ان سے جنگ کرو، یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے۔''

مزید فرمایا: ''ہم نے رسول اللہ ﷺ کے دور میں اس پر عمل کیا جب کہ مسلمان کمزور تھے اور آدمی اپنے دین کے بارے میں فتنے میں مبتلا ہوتا تھا، یا لوگ اسے قتل کر دیتے تھے یا غلام بنا لیتے تھے، تا آنکہ اسلام کو قوت حاصل ہوگئی، پھر فتنہ باقی نہ رہا۔''[1]

④ حضرت عمران بن حُصَین رضی اللہ عنہ:

امام ذہبی رحمہ اللہ ان کے بارے میں کہتے ہیں، وہ ان لوگوں میں شامل ہیں جو فتنے سے کنارہ کش رہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حمایت میں لڑائی نہیں کی۔[2]

⑤ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما:

امام ذہبی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: مجھے (ایک مرتبہ) رسول اللہ ﷺ نے فوج کے ایک دستے کے ساتھ روانہ فرمایا، میں اور میرا ایک ساتھی دشمن کی طرف آگے بڑھتے چلے گئے، میں ایک آدمی پر حملہ آور ہوا، جب اس کے قریب آیا تو اس نے ''لا اِلٰہ اِلا اللہ'' کے الفاظ پڑھے، میں نے اسے نیزہ مار کر قتل کر دیا: میں یہ سمجھا کہ اس نے جان بچانے کے لیے ایسا کیا۔ پوری حدیث بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: ''اے اسامہ! تم نے اسے کلمہ پڑھنے کے بعد قتل کر ڈالا، تم (قیامت کے روز) لا اِلٰہ اِلا اللہ کا کیا جواب دو گے؟'' میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! اس نے جان کے ڈر سے ایسا کہا تھا۔ آپ ﷺ نے پھر یہی فرمایا: ''اے اسامہ! لا اِلٰہ اِلا اللہ کا کیا جواب دو گے؟'' آپ ﷺ بار بار یہی فرماتے رہے۔[3]

تا آنکہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ''میں یہ پسند کرتا ہوں کہ بحیثیت مسلمان میری جو زندگی گزری ہے، وہ نہ ہوتی۔ کاش! میں آج ہی مسلمان ہوا ہوتا اور میں نے اسے قتل نہ کیا ہوتا۔ پھر فرمایا: ''میں اللہ تعالیٰ سے عہد کرتا ہوں کہ میں کسی ایسے شخص کو کبھی قتل نہیں کروں گا جو زبان سے لا اِلٰہ اِلا اللہ پڑھتا ہو۔'' اُس وقت نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا: اے اسامہ! کیا میرے بعد بھی یہ عہد پورا کرو گے؟ انھوں نے کہا: جی ہاں! آپ ﷺ کے بعد بھی ان شاء اللہ یہ عہد پورا کروں گا۔''[4]

---

[1] سير أعلام النبلاء (٣/ ٢٢٨۔ ٢٢٩)

[2] مصنف ابن أبي شيبة (١٠/ ١٥، برقم: ٣٨٢٧٢) والمعجم الكبير للطبراني (١٨/ ١٠٥) اس کے راوی صحیح کے راوی ہیں۔

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٢٦٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٦) ودلائل النبوة للبيهقي (٤/ ٢٩٧)

[4] سير أعلام النبلاء (٢/ ٥٠٥) اس کے راوی ثقہ ہیں۔

حضرت حرملہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: مجھے حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجا اور کہا کہ وہ تم سے پوچھیں گے کہ اسامہ (رضی اللہ عنہ) کیوں پیچھے رہ گئے؟ تم کہنا کہ وہ کہہ رہے تھے: اگر آپ شیر کے جبڑوں میں ہوں تو اسامہ (رضی اللہ عنہ) چاہے گا کہ وہ بھی آپ کے ساتھ ہو، البتہ موجودہ معاملے (فتنے) میں ان سے متفق نہیں ہوں۔[1]

ابن حجر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے معذرت پیش کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی جان بچانے کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پیچھے نہیں رہے، نہ ان سے محبت میں کوئی کمی آئی۔ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کسی شدید مشکل میں ہوتے تو میں ان کے ساتھ ہوتا، میرے پیچھے رہنے کہ وجہ یہ ہے کہ میں مسلمانوں کی باہمی لڑائی کو پسند نہیں کرتا۔[2]

⑥ حضرت صہیب بن سنان الرومی رضی اللہ عنہ:

امام ذہبی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ ان لوگوں میں شامل ہیں جنھوں نے فتنے سے کنارہ کشی اختیار کی اور صرف اپنے کام سے کام رکھا۔[3]

⑦ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے جمل اور صفین میں شرکت نہیں کی۔ وہ فتنہ میں پڑنے سے ممانعت والی احادیث کے راوی بھی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''عنقریب فتنے رونما ہوں گے، بیٹھ رہنے والا ان میں سے کھڑے ہونے والے سے بہتر، اور کھڑا رہنے والا چلنے والے سے بہتر، اور چلنے والا دوڑنے والے سے بہتر ہوگا۔ اور جس نے فتنے کو جھانک کر دیکھنے کی کوشش کی وہ اس کے درپے ہو جائے گا، جہاں بھی جائے پناہ ملے وہاں پناہ لے لو۔''[4]

وہ بہت سے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم جو فتنے کے واقعات میں غیر جانبدار اور کنارہ کش رہے، یہ ان میں سے بعض کا انتہائی مختصر تذکرہ ہے۔ انھوں نے فتنے کے ان معاملات میں شرکت نہیں کی بلکہ دوسروں کو بھی اس سے منع کرتے رہے۔ اسی طرح بعد میں جونہی حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما نے خلافت سے دستبرداری کا اعلان کیا، وہ تمام صحابہ جو کنارہ کش تھے انھوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کی اور امت کے

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧١١٠)

[2] فتح الباري (١٣/ ٦٧)

[3] سير أعلام النبلاء (٢/ ١٨)

[4] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٨٦)

مابین متفقہ اجتماعیت کا مظاہرہ کیا۔ امام ابن حجر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ حضرت ابن عمر، سعد بن ابی وقاص اور محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہم جیسے اُن تمام حضرات نے جو گوشہ نشین ہو گئے تھے، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی بیعت کی۔ [1]

معاملات کے صحیح صورتِ حال اختیار کرنے تک قصاص کے نفاذ میں انتظار کا موقف

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی معاملات کے ٹھہراؤ پر آنے تک قصاص لینے میں انتظار کے قائل تھے کہ بعد ازاں قاتلینِ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا معاملہ دیکھا جائے گا۔ جب حضرت طلحہ و حضرت زبیر رضی اللہ عنہما اور ان کے ساتھیوں نے قصاص کی حد نافذ کرنے کا مطالبہ کیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قاتلینِ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے کثیر تعداد میں ہونے کا عذر پیش فرمایا کہ ان کی طاقت کو کم اہم قرار نہیں دیا جا سکتا، اس لیے ان سے حالات کی بہتری تک صبر کرنے کا کہا اور فرمایا کہ حالات جونہی سازگار ہوں گے، حق دار کو اس کا حق ملے گا، امیر المومنین رضی اللہ عنہ نے کم تر برائی، (قصاص کو مؤخر کرنے) کو اختیار کرنے کا مشورہ دیا، کیوں کہ قتال اور افتراق و انتشار زیادہ بڑی برائی ہے۔ [2]

امیر المومنین رضی اللہ عنہ کی رائے یہ تھی کہ مصلحت کا تقاضا یہ کہ قصاص کو مؤخر کر دیا جائے نہ کہ اسے ترک کر دیا جائے۔ امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ قاتلینِ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ان کے منطقی انجام تک پہنچانا چاہتے تھے، البتہ وہ امن کے قیام اور اجتماعیت واتحاد کا انتظار کر رہے تھے، ان کا خیال تھا کہ خون کے وارثین مقدمہ قائم کریں، طالب اور مطلوب دونوں عدالت میں آئیں، گواہ پیش ہوں، پھر اس پر فیصلہ دیا جائے۔ [3]

امت میں اس بات پر کوئی اختلاف نہیں ہے کہ جب قصاص، فتنے کے پھیل جانے اور امت میں انتشار کا باعث ہو تو خلیفہ کے لیے اسے مؤخر کرنا جائز ہے۔ البتہ یہ سوال کہ قاتلینِ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ امیر المومنین کے لشکر میں شامل تھے، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس بات پر رضا مند ہوں؟ [4]

امام طحاوی نے اس شبہے کا یہ جواب دیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں ایسے سرکش خوارج موجود تھے جنھوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کیا تھا، لیکن بعینہٖ ان کی ٹھیک ٹھیک پہچان مشکل تھی۔ کچھ ایسے بھی

[1] احداث و أحاديث فتنة الهرج لعبد العزيز دخان (ص: ٢١٢)

[2] تاريخ الطبري (٥/ ٤٦٠)

[3] تحقيق مواقف الصحابة (٢/ ١٥٦)

[4] أحكام القرآن لابن العربي (٢/ ١٧١٨)

تھے کہ ان کے جرم کے خلاف کوئی واضح حجت قائم نہیں ہوسکی تھی اور کچھ ایسے لوگ بھی تھے جن کے دل میں نفاق چھپا ہوا تھا مگر وہ اس کا اظہار نہیں کر سکتے تھے۔[1]

قاتلینِ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں ان کا موقف:

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے شہادتِ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ہمیشہ غلط کہا اور ان کے خون سے بریٔ الذمہ ہونے کی بات کی، ان کے حلفاء کہتے تھے کہ انھوں نے قتل کیا، نہ انھوں نے ان کے قتل کا حکم دیا، نہ وہ اس طرف کبھی مائل ہوئے اور نہ آج وہ شہادتِ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر راضی ہیں۔ یہ بات ان کی طرف سے قطعی الثبوت ہے۔[2]

امام حاکم نے اپنی سند کے ساتھ حضرت قیس بن سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے، وہ کہتے ہیں: میں نے جمل کے روز حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ کہتے ہوئے سنا: ''اے اللہ! میں تیری بارگاہ میں خونِ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے بریٔ الذمہ ہونے کا اعلان کرتا ہوں، شہادتِ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے روز میرے ہوش اڑ گئے، لوگ میرے پاس بیعت کے لیے آئے تو میں نے انھیں کہا: اللہ کی قسم! مجھے اللہ تعالیٰ سے شرم آتی ہے کہ میں ان لوگوں سے بیعت قبول کروں جنھوں نے اس شخصیت کو قتل کیا ہے جس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں اس سے حیا کیوں نہ کروں جس سے فرشتے بھی حیا کرتے ہیں۔''

مجھے اللہ سے شرم آتی ہے کہ میں اس حالت میں لوگوں سے بیعت لوں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ حالتِ شہادت میں زمین پر پڑے ہوں، ابھی تک ان کی تدفین بھی نہ ہوئی ہو۔ لوگوں نے یہ سنا تو واپس چلے گئے، جب ان کی تدفین ہو چکی تو لوگ واپس آئے اور مجھ سے بیعت لینے کا مطالبہ کیا۔ میں نے کہا: اے اللہ! میں ابھی اس بارے میں ڈرتا ہوں، بعد ازاں عزیمت کی راہ اختیار کرتے ہوئے لوگوں سے بیعت لی۔ جب انھوں نے مجھے مخاطب کیا: یا امیر المومنین! تو یوں لگا جیسے میرا دل پھٹ جائے گا، اور میں نے کہا: اے اللہ! (حضرت) عثمان (رضی اللہ عنہ) کے حوالے سے مجھے ایسی توفیق عطا فرما کہ تُو مجھ سے راضی ہو جائے۔''[3]

خونِ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مطالبے کے لیے خروج سے متعلق ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا موقف:

نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن فتنے سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہوئے اس سال حج کے

[1] شرح الطحاویہ (ص: ٥٤٦)

[2] البدایة و النهایة (١/ ٢٠٢)

[3] المستدرك للحاکم (٣/ ٩٥) شیخین کی شرط کے مطابق صحیح حدیث ہے۔

لیے چلی گئیں، جب انھیں مکہ میں معلوم ہوا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا گیا ہے تو وہیں قیام کیا۔ بعد ازاں عازمِ سفر ہو کر نکلیں لیکن دوبارہ واپس آ گئیں تاکہ جب حالات سازگار ہو جائیں تب مدینہ روانہ ہوں۔

جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت ہو گئی تو بہت سارے صحابۂ کرام نے مدینہ میں موجود، مختلف علاقوں کے فسادیوں کے باعث وہاں قیام کرنا گوارا نہ کیا، ان میں سے صحابہ کی بہت بڑی تعداد اور امہات المومنین سب مکہ میں جمع ہو گئے۔ امہات المومنین میں سے بعض نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ مدینہ جانے کی حمایت کی۔ لیکن جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور ان کے ساتھی صحابہ رضی اللہ عنہم بصرہ جانے پر متفق ہوئے تو مذکورہ امہات المومنین نے وہاں جانے سے انکار کیا اور فرمایا کہ ہم مدینے کے سوا کہیں نہیں جائیں گے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے معاملے میں خروج پر امیر المومنین کے درمیان کوئی اختلاف نہیں تھا، لیکن مدینے کی طرف رخ کرنے کے بجائے بصرہ جانے پر اختلاف ہوا۔ تاہم حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا بصرہ جانے کے لیے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ متفق تھیں لیکن ان کے بھائی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے انھیں بصرہ جانے سے روک دیا۔ ان کا اس مقصد کے لیے بصرہ جانا اپنی مرضی پر موقوف نہ تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہا: (حضرت) عبد اللہ (رضی اللہ عنہ) میرے اور میرے خروج کے مابین حائل ہو گئے ہیں۔ اس لیے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں معذرت پیش کر دی۔[1]

لوگوں کے مابین عام روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا بصرہ کی طرف خروج کے لیے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور ان کے ساتھی صحابہ کی رائے سے متفق نہیں تھیں، ان کی رائے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھی۔[2]

لیکن زیادہ صحیح روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے بیٹے حضرت عمر بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہما کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں یہ کہتے ہوئے بھیجا کہ: اللہ کی قسم! یہ بیٹا مجھے خود اپنی ذات سے بھی زیادہ عزیز ہے، یہ معرکے میں آپ کے ساتھ نکلے گا، وہ نکل کھڑا ہوا اور ہمیشہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ رہا۔[3]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا حوأب کے چشمے سے گزرنا:

صحیح روایات سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا حوأب کے چشمے کے پاس سے گزرنا ثابت ہے، یحییٰ بن سعید ابن القطان، اسماعیل بن ابی خالد سے وہ حضرت قیس بن حازم رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

[1] تاریخ الطبري (٥/ ٤٨٧)

[2] أنساب الأشراف (٤/ ٢٢٤)

[3] أسد الغابة (٤/ ١٦٩) والإصابة (٤/ ٤٨٤) ودور المرأة السياسي (ص: ٣٨٧) ومرويات أبي مخنف (ص: ٢٥٧)

نے (ازواجِ مطہرات) سے فرمایا: اُس وقت تمھارا کیا حال ہوگا، جب تم میں سے کسی ایک پر حوأب کے کتے بھونکیں گے۔ شعبہ کی اسماعیل کے واسطے سے جو روایت ہے اس میں شعبہ کے روایت کردہ الفاظ یہ ہیں: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جب حوأب پر پہنچیں تو وہاں کتوں کے بھونکنے کی آواز سنی، فرمانے لگیں: میرا خیال ہے میں واپس چلی جاؤں، کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے فرمایا تھا: ''تم میں سے کسی ایک پر حوأب کے کتے بھونکیں گے''، اس موقع پر حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے عرض کی: آپ واپس کیوں جاتی ہیں؟ ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے ذریعے سے لوگوں کی اصلاح کردے۔[1]

انہی الفاظ کے ساتھ یعلٰی بن عُبید نے اسماعیل سے روایت کیا ہے جسے امام حاکم نے نقل کیا ہے۔[2] علّامہ البانی رحمہ اللہ کہتے ہیں: اس کی سند بالکل ٹھیک ہے اور یہ کہا ہے کہ اس حدیث کو پانچ بڑے ائمہ حدیث نے صحیح قرار دیا ہے جن میں ابن حبان، ذہبی، ابن کثیر اور ابن حجر وغیرہ شامل ہیں۔[3]

حکیم بن جبلہ اور اس کے ساتھیوں کا قتل:

جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اہلِ بصرہ سے خطاب فرمایا تو حکیم بن جبلہ آیا اور اس نے لڑائی شروع کردی، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھی صحابہ اور حضرت طلحہ و حضرت زبیر رضی اللہ عنہما وغیرہ نے اپنے نیزے تان لیے۔ مقصد یہ تھا کہ فریقِ مخالف باز آکر لڑائی سے رک جائے لیکن حکیم اور اس کے ساتھی باز نہیں آئے۔ حضرت طلحہ و حضرت زبیر رضی اللہ عنہما اور اصحابِ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس کے خلاف اپنا دفاع کرنے کی حد تک لڑتے رہے۔ اُدھر حکیم اپنے گھوڑوں اور لشکر کو مہمیز دیتا رہا اور ان کی حوصلہ افزائی سے باز نہ آیا۔

ان احوال کے باوجود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی مسلسل یہی کوشش رہی کہ لڑائی شروع نہ ہو۔ لہٰذا انھوں نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا کہ وہ لڑائی کرنے والوں سے دور رہیں، وہ اسی حالت میں رہے تاآنکہ رات کی تاریکی پھیل گئی۔[4] صبح ہوئی تو حکیم بن جبلہ بڑ بڑاتا ہوا آیا، اس کے ہاتھ میں نیزہ تھا، اس کا رخ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور ان کے ساتھیوں کی طرف تھا، راستے میں وہ جس عورت یا مرد سے ملتا، اسے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو برا بھلا کہنے کے لیے اکساتا اور انکار پر اسے قتل کر دیتا تھا۔[5]

---

[1] مسند أحمد (٦/ ٩٧)

[2] المستدرك (٣/ ١٢٠)

[3] سلسلة الأحاديث الصحيحة (١/ ٧٦٧) رقم الحديث (٤٧٤)

[4] تاريخ الطبري (٥/ ٤٩٤)

[5] تاريخ الطبري (٥/ ٤٩٥)

اس صورتحال سے قبیلہ عبد القیس کے لوگ غضبناک ہو گئے، انھوں نے حکیم سے کہا: کل بھی تم نے یہی کچھ کیا۔ آج اسی عمل کو دہرا رہے ہو؟ اللہ کی قسم! ہم تمھیں اس وقت تک نہیں چھوڑیں گے جب تک اللہ کی طرف سے قصاص کا فیصلہ نہ ہو جائے۔ بعد ازاں وہ سب اسے وہیں چھوڑ کر واپس چلے گئے اور حکیم بن جبلہ اپنے ان جھگڑالو ساتھیوں کے ساتھ روانہ ہو گیا جنھوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا محاصرہ کیا تھا۔ انھوں نے سمجھ لیا کہ اب بصرہ میں ان کی دال نہیں گلے گی۔ وہ سب اکٹھے ہو کر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھیوں کے ساتھ آن کھڑے ہوئے اور شدید لڑائی کی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف سے پکارنے والا (منادی) ان کے ساتھیوں کو پکارتا رہا اور لڑائی سے باز رہنے کی تلقین کرتا رہا، لیکن انھوں نے رکنے سے انکار کر دیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرما رہی تھیں کہ اس سے لڑائی کرو جو آگے بڑھ کر تم سے لڑے، لیکن حکیم نے اس نصیحت کی پروا نہیں کی۔ وہ لڑائی کے شعلے بھڑکاتا رہا۔ جب ان لڑنے والوں کا مقصد حضرت زبیر اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہما کی سمجھ میں آ گیا کہ انھیں کسی کی پروا ہے نہ حرمت کا خیال ہے، ان کا مقصد صرف لڑائی کرنا ہے تو ان دونوں نے کہا: اللہ کا شکر ہے کہ اس نے اہلِ بصرہ میں سے ہمارے زیرِ انتظام لوگوں کو یہاں جمع کر دیا، اے اللہ! ان میں سے ایک بھی باقی نہ رہے، آج ہی ان سے قصاص لے لے اور انھیں ہلاکت کی راہ پر ڈال دے، انھوں نے پکار کر کہا: تم میں سے جو قاتلینِ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ میں سے نہیں ہے، ہماری اس سے کوئی لڑائی نہیں ہے۔ ہم ان سے لڑائی شروع نہیں کریں گے، بعد ازاں ان کے درمیان گھمسان کا رن پڑا۔[1]

اہلِ بصرہ میں موجود قاتلینِ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ میں سے ایک کے سوا وہاں سے کوئی بچ نہ سکا۔ حضرت زبیر اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہما نے پکار کر کہا کہ تمھارے قبائل میں سے جو بھی ایسا شخص ہو جس نے مدینہ کے خلاف لڑائی میں حصہ لیا ہو اسے ہمارے سامنے پیش کیا جائے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بقول ان جاہلوں اور فسادیوں میں سے ایک فریق رضی اللہ عنہ صبح کے اندھیرے میں انھیں شہید کرنے آیا۔ یہ لوگ ان کے گھر کی دہلیز تک پہنچ گئے تھے، راستہ دکھانے والا ان کے ساتھ تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی ایک جماعت کے ذریعے انھیں اس وقت پیچھے کی طرف دھکیل دیا جب کہ انھوں نے ان کے گھر کا گھیراؤ کر لیا تھا، ان کی منصوبہ بندی انھی کے گلے پڑ گئی اور مسلمانوں نے انھیں گھیر کر قتل کر ڈالا۔[2]

[1] تاريخ الطبري (٥/ ٤٩٩)

[2] تاريخ الطبري (٥/ ٥٠١،٥٠٣)

اس طرح حضرت طلحہ، حضرت زبیر رضی اللہ عنہما اور ام المومنین رضی اللہ عنہا کا بصرہ پر غلبہ مکمل ہوگیا۔ انھوں نے مدینہ پر حملہ آور لوگوں میں سے بہت سوں کو قتل کر دیا جن کی تعداد تقریباً ستر کے قریب تھی۔ ان میں بصرہ کے فسادیوں کا سرغنہ حکیم بن جبلہ بھی شامل تھا جو لڑائی چاہتا تھا اور جنگ کے شعلے بھڑکانے والا تھا، وہاں حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی کمان میں لڑائی ہوئی اور اس پر ان کی بیعت بھی کی گئی۔[1]

دیگر علاقوں کی طرف حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے خطوط:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا چاہتی تھیں کہ اہلِ بصرہ کے ساتھ جو لڑائی پیش آگئی ہے اس کی حقیقی صورتِ حال واضح کریں، لہٰذا انھوں نے شام، کوفہ اور یمامہ کی طرف خطوط بھیجے۔ اہلِ مدینہ کو بھی خط لکھا اور صورتِ حال بیان کی۔ انھوں نے اہلِ شام کو لکھا: ہم ایمرجنسی کی حالت میں نکلے تھے اور ہمارا ارادہ یہ تھا کہ کم ہوں یا زیادہ، معزز ہوں یا کم تر، بہر حال اللہ کی کتاب اور اس کی بیان کردہ حدود قائم و نافذ کی جائیں۔ اہلِ بصرہ میں سے معززین اور اچھے لوگوں نے بیعت کر لی اور ان کے بُروں اور فسادیوں نے ہماری مخالفت کی۔ انھوں نے مسلح ہو کر ہمارا راستہ روکا، انھوں نے جو کہنا تھا کہا، انھوں نے کہا کہ ہم ام المومنین کو اپنے پاس قیدی بنا کر رکھیں گے کیونکہ میں نے انھیں حق کا حکم دیا تھا اور اس کی ترغیب دلائی تھی، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ وہ سلوک کیا جو مسلمانوں کی سنت ہے۔

ہم تمھیں اللہ کی قسم دے کر کہتے ہیں کہ تم اس طرح اٹھو جس طرح ہم اٹھ کھڑے ہوئے ہیں، پھر جب ہماری اور تمھاری اللہ سے ملاقات ہوگی تو ہم اپنے خلاف ہر قسم کے عذر کا خاتمہ کر چکے ہوں گے اور اپنی ذمہ داری پوری طرح ادا کر چکے ہوں گے۔[2]

حضرت عثمان بن حُنَیف رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا:

طبری ابو مخنف سے وہ یوسف بن یزید سے اور وہ حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے کہا: جب انھوں نے حضرت عثمان بن حُنَیف رضی اللہ عنہ کو پکڑا تو صحابہ نے حضرت ابان بن عثمان بن عفان رضی اللہ عنہما کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس بھیجا کہ اس کے بارے میں مشورہ کریں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: اسے قتل کر دو، یہ سن کر اسی لمحے ایک عورت نے ان سے کہا: اے ام المومنین! میں آپ کو اللہ کی

[1] أنساب الأشراف (٢/ ٩٣) اس کی سند حسن ہے۔ وخلافة علي بن أبي طالب لعبد الحميد (ص: ١٣٩)

[2] تاريخ الطبري (٥/ ٥٠١)

قسم دے کر کہتی ہوں کہ عثمان بن حُنَیف کی رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مصاحبت کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے فیصلے پر نظر ثانی کیجیے۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فوراً کہا: حضرت ابان رضی اللہ عنہ کو واپس بلاؤ، وہ انھیں واپس لائے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: اسے قتل نہ کرو، بلکہ قید کردو (حضرت ابان رضی اللہ عنہ نے) کہا: اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ نے مجھے اس بات کے لیے بلایا ہے تو میں واپس نہ آتا۔

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کوفہ روانگی:

امیر المومنین حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ مدینہ میں تھے، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم ان کے وہاں سے کسی اور جگہ جانے کی تائید نہیں کرتے تھے، یہ بات اس وقت واضح ہوئی جب انھوں نے شام کی طرف جانے کا ارادہ کیا، تاکہ وہاں کے لوگوں سے ملیں اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی رائے معلوم کرنے کے علاوہ یہ جان سکیں کہ ان کا آگے کیا ارادہ ہے؟ ان کا خیال تھا کہ موجودہ صورتِ حال میں مدینہ میں رہتے ہوئے انھیں وہ قوت و شوکت حاصل نہیں جو بعض دیگر شہروں اور علاقوں میں ہے۔ انھوں نے فرمایا: افرادی قوت اور مال و دولت سب کچھ عراق میں ہے۔ جب حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کو ان کے اس طرف میلان و رجحان کا پتا چلا تو انھوں نے کہا: اے امیر المومنین! اگر آپ اِسی شہر میں رہیں تو یہ مضبوط مرکز ہے، رسول اللہ ﷺ کا مقامِ ہجرت ہے، یہیں آپ ﷺ کی قبر اور منبر ہے، یہ شہر اسلام کا مرکز ہے، اگر عرب آپ کے حق میں قائم رہے تو آپ اپنے آپ کو پہلے کی طرح ہی محسوس کریں گے۔ اگر قوم انتشار کا شکار ہو جائے تو اسے دشمن کے مدِ مقابل کھڑا کر دیجیے۔ اگر آپ کو جانے پر مجبور ہی کر دیا جائے تو آپ چلے جائیں، آپ کے پاس یقیناً اس کا عذر ہوگا۔ خلیفہ نے ان کا مشورہ مان لیا اور مدینہ میں ہی قیام کا عزم ظاہر کیا اور عُمال کو مختلف علاقوں کی طرف روانہ کر دیا۔[1]

لیکن بعد ازاں ایسے سیاسی واقعات پیش آئے جنھوں نے خلیفہ کو مدینہ سے رخصت ہونے پر مجبور کر دیا، انھوں نے کوفہ جانے کا فیصلہ کر لیا تاکہ وہ اہلِ شام کے قریب رہیں۔ ان کے کوفہ جانے کی تیاری کے دوران معلوم ہوا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما نے بصرہ کی طرف خروج کیا ہے۔[2]

انھوں نے اہلِ مدینہ کو نکل کھڑے ہونے کی صدا لگائی اور اپنی مدد کے لیے پکارا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ

[1] الثقات لابن حبان (٢/ ٣٨٣) والأنصار في العصر الراشدي (ص: ١٦١)

[2] استشهاد عثمان ووقعة الجمل (ص: ١٨٣) تاريخ الطبري (٥/ ٥٠٧)

کے لشکر میں فسادیوں کی موجودگی کی وجہ سے اہلِ مدینہ کے دل بوجھل تھے، وہ یہ سمجھتے تھے کہ فتنہ ابھی تک جاری ہے، معاملات واضح نہیں ہوئے، صورتِ حال کے مزید واضح ہونے کا انتظار کیا جائے۔ وہ کہتے تھے: اللہ کی قسم! ہمیں کچھ نہیں معلوم کہ ہم کیا کریں، معاملہ ہمارے لیے اشتباہ کا شکار ہے، جب تک معاملات روشن نہ ہو جائیں ہم یہیں رہیں گے۔ طَبَری روایت کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ پوری تیاری کے ساتھ شام کی طرف نکلے۔ کوفیوں اور بصریوں کے ہٹے کٹے سات سو آدمی بھی ان کے ساتھ نکل پڑے۔[1]

اہلِ مدینہ بے حد غمگین تھے، امیر المومنین نے خروج کے لیے پکارا تو انھوں نے لبیک نہ کہا۔ خلیفہ نے خطاب کیا تو اس دوران اس بات کی شکایت بھی کی۔[2] یہ پہلے ہی واضح ہو چکا ہے کہ شہادتِ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد اکثر صحابہ معاملات سے علاحدگی اختیار کر چکے تھے۔ اہلِ بدر میں سے کچھ لوگ اپنے گھروں ہی میں پناہ گزیں ہو گئے تھے۔ قبرستان کے سوا وہ کہیں نہ جاتے تھے۔[3]

حضراتِ صحابہ اس مرحلے پر مدینہ سے خروج کے متعلق یہ کہتے تھے کہ ہم بُرے انجام کے خوف سے اس فتنے کے گڑھے میں گرنا نہیں چاہتے۔

حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کی نصیحت:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے بڑی کوشش کی کہ امیر المومنین خروج کا ارادہ بدل دیں، جب حضرت علی رضی اللہ عنہ روانگی کے لیے پا بہ رکاب تھے تو وہ ان کے پاس آئے، انھیں تمام خطرات سے آگاہ کیا۔ انھیں عراق جانے سے منع کیا اور کہا: میں ڈرتا ہوں، مبادا آپ پر تلوار کی دھار چل جائے، اگر آپ نے منبرِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ دیا تو پھر اسے کبھی نہیں دیکھ سکیں گے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت کے زیرِ اثر یہ ساری باتیں خوب جانتے تھے۔ لہٰذا انھوں نے کہا: اللہ کی قسم! مجھے یہ ساری باتیں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتائی تھیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ جو بصری اور کوفی تھے، انھیں اتنی جرأت ہو گئی کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہنے لگے: ہمیں چھوڑو، ہم انھیں قتل کر دیتے ہیں۔ لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انھیں یہ کہہ کر روک دیا کہ

---

[1] تاريخ الطبري (٥/ ٣٨١)

[2] الطبقات (٣/ ٢٣٧) الأنصار في العصر الراشدي (ص: ١٦٣)

[3] تاريخ الإسلام، عهد الخلفاء الراشدين (٣/ ٤٨٠)

حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نیک آدمی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان فسادیوں کے لیے مسلمانوں کو قتل کرنا اور اپنے راستے کی ہر رکاوٹ کو دور کرنا آسان ہو گیا تھا۔ انھیں خوفِ خدا بالکل نہیں تھا۔ وہ صحابۂ کرام کو وہ مقام و مرتبہ نہیں دے رہے تھے جس کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو حکم دیا تھا۔[1]

حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما کی نصیحت:

امیر المومنین مدینہ سے روانہ ہوئے، جب وہ مقام ربذہ[2] پر پہنچے، اور اپنے لشکر کو پڑاؤ ڈالنے کو کہا تو ان کے پاس دو سو مسلمان آئے۔[3] پھر ان کے بیٹے حضرت حسن رضی اللہ عنہ ان کے سامنے آن کھڑے ہوئے۔ وہ رو رہے تھے۔

مسلمانوں کے افتراق و انتشار کی وجہ سے انھیں شدید غم لاحق تھا۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے اپنے والدِ گرامی رضی اللہ عنہ سے کہا: میں نے آپ سے عرض کی تھا، آپ نے میری بات نہیں مانی، کل کو آپ کسی ویرانے میں شہید کر دیے جائیں تو آپ کا کوئی مددگار نظر نہیں آئے گا، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تم ابھی تک لڑکیوں کی طرح آہ و بکا کر رہے ہو۔ آخر تم نے مجھ سے کیا کہا تھا، جو میں نے نہیں مانا؟ انھوں نے کہا: جس روز حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا گھیراؤ کیا گیا، میں نے آپ سے کہا تھا کہ آپ مدینہ سے باہر چلے جائیں، آپ کی موجودگی میں انھیں شہید نہ کیا جائے، پھر میں نے آپ کو ان کی شہادت کے روز کہا تھا کہ آپ لوگوں سے اس وقت تک بیعت نہ لیں جب تک تمام علاقوں سے لوگوں کے وفود نہ آ جائیں، پھر جب ان دو لوگوں (حضرت طلحہ و حضرت زبیر رضی اللہ عنہما) نے جو کچھ بھی کیا، میں نے آپ سے کہا کہ جب تک یہ لوگ آپس میں کچھ طے نہ کر لیں آپ اپنے گھر میں بیٹھے رہیں تاکہ اگر فساد ہو تو کسی اور ہی کے ہاتھوں رونما ہو۔ آپ نے ان سب مواقع پر میری بات نہیں مانی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میرے بیٹے! تمھارا یہ کہنا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا گھیراؤ کر لیا گیا ہے، آپ مدینہ سے نکل جائیں تو اللہ کی قسم! جس طرح ان کا گھیراؤ کیا گیا اسی طرح ہمارا گھیراؤ کیا گیا۔ رہا تمھارا یہ کہنا کہ تمام علاقوں کے وفود آنے تک کسی کی بیعت نہ لیں، بنیادی طور پر تو یہ معاملہ اہلِ مدینہ سے

---

[1] مسند أبي يعلیٰ (۱/ ۳۸۱) اس کے محقق کا کہنا ہے کہ اس حدیث کی سند صحیح ہے۔

[2] یہ مقام مدینہ منورہ کے مشرق کی جانب ۲۰۴ کلومیٹر دور ہے۔

[3] أنساب الأشراف (۲/ ٤٥) وخلافة علي بن أبي طالب لعبد الحميد (ص: ١٤٣)

متعلق تھا۔ ہمیں اس بات کا خطرہ تھا کہ معاملات زیادہ خرابی کی طرف رخ نہ کر لیں۔ حضرت طلحہ و حضرت زبیر رضی اللہ عنہما کے خروج سے متعلق تم نے جو کچھ کہا، اس کا جواب یہ ہے کہ اگر میں کچھ نہ کرتا تو یہ اہلِ اسلام کو کمزور کرنے کے مترادف تھا، اللہ کی قسم! جب سے خلافت کی ذمہ داری کندھوں پر آئی ہے میں مجبور و مقہور ہو گیا ہوں، اور تمھارا یہ کہنا کہ میں گھر میں بیٹھ رہوں تو میری ذمہ داریوں کی موجودگی میں بھلا یہ کیسے ممکن تھا؟ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں اس بجّو کی طرح بن جاؤں جسے گھیر لیا گیا ہو اور وہ اپنے ساتھیوں کو آواز دے رہا ہو حتیٰ کہ اس کی کھونچیں کاٹ دی جائیں، اگر میں اپنی ذمہ داریاں ادا نہ کروں گا تو پھر کون کرے گا؟ میرے بیٹے! مجھے اسی حال میں چھوڑ دو۔[1]

ان انتہائی سنگین حالات میں امیر المومنین کا موقف بڑا واضح اور دانشمندی پر مبنی تھا۔ انھیں ان کے عزم سے کوئی نہ ہٹا سکا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ربذہ سے پیغام بھیجا جس میں انھوں نے اہلِ کوفہ کو باہر نکلنے کی دعوت اور اپنی مدد کے لیے بلایا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پیامبر حضرت محمد بن ابی بکر اور حضرت محمد بن جعفر رضی اللہ عنہم تھے لیکن وہ اپنے مشن میں کامیاب نہ ہو سکے۔ کوفے میں خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقرر کردہ والی حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو روک دیا، انھوں نے خروج کی مخالفت کی اور فتنے میں لڑائی لڑنے کی ممانعت کر دی اور انھیں وہی بات سنائی جو انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فتنے میں شرکت سے اجتناب کے بارے میں سنی تھی۔[2]

ذی قار مقام سے امیر المومنین کا اہلِ کوفہ کو (میدانِ جنگ میں) نکلنے کے لیے کہنا:

حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے لشکر کو لے کر مقامِ ذی قار[3] پر خیمہ زن ہوئے تو مدینہ سے روانگی کے بعد آٹھ راتیں بیت چکی تھیں، تقریباً نو سو آدمی آپ کے ساتھ تھے۔[4] اس مرتبہ آپ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو کوفہ بھیجا، مگر اہلِ کوفہ نے دیر کر دی تو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے پیچھے حضرت عمار بن یاسر اور حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہم کو بھیجا، اور حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو معزول کر کے ان کی جگہ حضرت

[1] تاریخ الطبري (٥/ ٤٨٢)

[2] تاریخ الطبري (٥/ ٥١٤) ومصنف ابن أبي شیبة (١٢/ ١٥) اس کی سند حسن ہے۔

[3] یہ کوفہ کے قریب بکر بن وائل کا چشمہ ہے۔ (معجم البلدان: ٤/ ٣٩٣)

[4] تاریخ الطبري (٥/ ٥١٩، ٥٢١)

قُر ظَہ بن کعب رضی اللہ عنہ کو والی مقرر کر دیا۔[1]

اہلِ کوفہ کو قائل کرنے میں حضرت قعقاع بن عَمر و تمیمی رضی اللہ عنہ کا بہت بڑا کر دار تھا، وہ لوگوں سے خطاب کے لیے کھڑے ہو گئے اور کہا: بے شک میں تمھارا خیر خواہ ہوں، تم پر شفیق ہوں، میں چاہتا ہوں کہ تم لوگ عقلمندی سے کام لو، میں تم سے ایک بات کہتا ہوں، وہ حق بات ہے اور وہ یہ ہے کہ موجودہ حالات میں ایسی امارت و قیادت کی اشد ضرورت ہے جو لوگوں کو منظّم کرے، ظالم کو نکال باہر کرے، مظلوم کو عزت بخشے۔ یہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ہیں، یہ خلافت پر متمکن ہیں، انھوں نے جس طرف پکارا ہے اور جو دعوت دی ہے وہ اصلاح کی راہ ہے، فوراً نکل پڑو اور اس معاملے میں اپنے کان اور آنکھیں کھلی رکھو۔[2]

حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما کا لوگوں پر واضح اثر تھا، انھوں نے لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: اے لوگو! اپنے امیر کی پکار پر لبیک کہو، اپنے بھائی بندوں کی طرف نکلو! عقلمند لوگ اس معاملے میں ان کا ساتھ دیں، یہ دنیا میں بہتری اور آخرت میں خیر و بھلائی کا موجب ہوگا، ہم اور تم سب آزمایش کا شکار ہیں، اس میں ہماری مدد کرو، ہمارا ساتھ دو۔[3]

اہلِ کوفہ کا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مکالمہ:

1 جب اہلِ کوفہ مقامِ ذی قار پر امیر المومنین رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور ان سے ان کی آمد کا سبب پوچھا تو ان میں اعور بن بنان المنقری بھی موجود تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا: میرا ذمہ اصلاح کرنا اور دشمنی کی آگ بجھانا ہے، ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس امت کو اجتماعیت پر قائم کردے اور جنگ برپا نہ ہو۔ اس نے کہا: اگر وہ آپ کی بات نہ مانیں تو پھر؟ انھوں نے فرمایا: اگر وہ ہمیں چھوڑ دیں تو ہم بھی انھیں چھوڑ دیں گے۔ اس نے کہا: اگر وہ ہمیں نہ چھوڑیں؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہم اپنا دفاع کریں گے۔ اعور بن بنان نے پوچھا: ان کی ذمہ داری کے ساتھ ساتھ کیا ان کا کوئی حق بھی ہے؟ انھوں نے فرمایا: جی ہاں، ہے۔[4]

---

[1] فتح الباري (١٣/ ٥٤) والتاريخ الصغير: ١/ ١٠٩)

[2] تاريخ الطبري (٥/ ٥١٦)

[3] تاريخ الطبري (٥/ ٥١٦)

[4] البداية والنهاية (٧/ ٢٥٠) تاريخ الطبري (٥/ ٥٢٩)

2 امیر المومنین رضی اللہ عنہ سے سوال کرنے والوں میں سے ایک شخص ابو سلامہ الدالانی بھی ہے۔ اس نے پوچھا: امیر المومنین! یہ لوگ جو خون کے بدلے کا مطالبہ کر رہے ہیں، اگر ان کا مطالبہ اللہ کی رضا کے لیے ہے تو کیا ان کے پاس کوئی دلیل بھی ہے؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جی ہاں، ہے۔ اس نے کہا: بہت اچھا، کیا آپ کے پاس بھی تاخیر کی کوئی دلیل ہے؟ انھوں نے فرمایا: جی ہاں، اگر ایک چیز کا حصول ممکن نہ ہو تو اس کے بارے میں حکم یہ ہے کہ زیادہ محتاط پہلو اور عمومی طور پر لوگوں کے لیے زیادہ نفع بخش راستہ اختیار کیا جائے۔ اس نے کہا: اگر آزمائش آ ہی جائے تو کل ہمارا اور ان کا کیا حال ہو گا؟ امیر المومنین نے فرمایا: میں پُر امید ہوں کہ اگر ہم میں سے یا ان میں سے کوئی صاف دل اور نیک نیت آدمی شہید ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اسے یقیناً جنت میں داخل فرمائے گا۔[1]

امیر المومنین رضی اللہ عنہ کا اصل ہدف اصلاح تھا۔ وہ فتنے کو ختم کرنے کے متمنی تھے۔ ان کی تدابیر میں قتال نہیں تھا کیونکہ اگر یہ شروع ہو جائے تو یہ ایک ایسی بیماری ہے جس سے شفا کی کوئی امید نہیں۔ دونوں جانب سے جو بھی قتل ہو جائے وہ اپنی نیت کے ساتھ مرہون ہے، چاہے وہ امیر المومنین کا ساتھی ہو یا ان کا مخالف، یہی وجہ ہے کہ امیر المومنین نے فرمایا: شہادتِ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد جو لوگ گھروں سے نکل کھڑے ہوئے ہیں، وہ اصلاح ہی چاہتے ہیں اور فتنے کو ختم کرنے کے خواہش مند ہیں۔ ان کا اجر ان کی نیتوں کے اخلاص اور دلوں کی صفائی کے مطابق ہو گا۔[2]

صلح کے لیے کوششیں:

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بصرہ کی طرف اپنے لشکر کو متحرک کرنے سے پہلے چند روز ذی قار میں قیام کیا، ان کا قصد یہ تھا کہ امن کے ذرائع اختیار کرتے ہوئے اس فتنے کا خاتمہ کیا جائے اور انتہائی کوشش کر کے مسلمانوں کو باہم قتال کی برائی اور مسلح تصادم سے بچایا جائے۔ ادھر حضرت طلحہ و حضرت زبیر رضی اللہ عنہما کے سامنے بھی یہی معاملات تھے۔ صلح کی کوششوں میں متعدد صحابۂ کرام اور کبار تابعین میں سے وہ حضرات شریک ہوئے جو پہلے ان امور و معاملات سے بالکل علاحدہ تھے۔ ان میں سے چند یہ تھے:

---

[1] البداية و النهاية (٧/ ٢٥٠)

[2] الانصاف للدكتور حامد (ص: ٤٠٦)

① حضرت عمران بن حُصَین رضی اللہ عنہ:

انھوں نے متعدد مرتبہ پیغام بھی بھیجے جو لوگوں کو دونوں فریقوں سے الگ ہونے پر آمادہ کرتے تھے۔ پھر بنی عدی قبیلہ کے لوگوں کی طرف سے جن کی بڑی اکثریت حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کا ساتھ دے رہی تھی، ایک ایلچی بھیجا۔ اس نے مسجد میں آ کر کہا: صحابیِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عمران بن حُصَین رضی اللہ عنہ نے مجھے آپ کی طرف خیر خواہی کے پیغام کے ساتھ بھیجا ہے۔ وہ معبودِ حقیقی کی قسم اٹھا کر کہہ رہے تھے کہ مجھے ایک کان کٹے حبشی غلام کی طرح موت آ جائے جو کسی پہاڑ کی چوٹی پر بکریاں چرا رہا ہو، تو مجھے یہ حالت اس صورتِ حال سے زیادہ پسند ہے کہ میں دونوں فریقوں میں سے کسی ایک کا ساتھ دیتے ہوئے تیر اندازی کروں۔ میرا تیر نشانے پر لگے یا خطا جائے۔ میرے ماں باپ تم پر قربان ہو جائیں تم سب قتال سے باز رہو۔ لوگوں نے جواب دیا: ہمیں اسی حالت میں چھوڑ دو، ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان کی مدد کسی صورت چھوڑنے کو تیار نہیں۔[1]

② حضرت کعب بن سُور رحمہ اللہ:

یہ کبار تابعین میں سے ہیں، انھوں نے اس مقصد کے لیے پوری کوشش کی، اپنی استطاعت سے زیادہ تکلیف اٹھائی اور وہ کردار ادا کیا جو بہت سارے لوگ اجتماعی طور پر بھی ادا نہیں کر سکتے۔ وہ صلح کی کوششوں میں لگے رہے حتی کہ یہ الم انگیز سانحہ پیش آ گیا کہ وہ دونوں فریقوں کے مابین کھڑے ہو کر سب کو ہتھیار رکھ دینے اور کتاب اللہ کی طرف رجوع کرنے کی نصیحت کر رہے تھے کہ اسی دوران شہید کر دیے گئے۔[1]

③ حضرت القعقاع بن عَمرو التمیمی رضی اللہ عنہ:

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت قعقاع بن عَمرو التمیمی رضی اللہ عنہ کو حضرت طلحہ و حضرت زبیر رضی اللہ عنہما کی جانب صلح کے مشن پر روانہ کیا اور فرمایا: ان دونوں سے جا کر ملو، انھیں الفت و محبت اور اجتماعیت کی دعوت دو، اور افتراق و انتشار کی سنگینی کا احساس دلاؤ۔ حضرت قعقاع رضی اللہ عنہ بصرہ گئے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں پہنچے اور ان سے اس سلسلے کی ابتداء کی۔ انھوں نے عرض کی: اماں جان! آپ یہاں کیوں تشریف لائی ہیں؟ انھوں نے جواب دیا: میں لوگوں کے مابین صلح اور اصلاح کی خاطر آئی ہوں۔ حضرت

---

[1] الطبقات لابن سعد (٤/ ٨٧) خلافة علي لعبد الحميد (ص: ١٤٨)

[2] الطبقات لابن سعد (٧/ ٩٢) دونوں سندوں سے یہ صحیح روایت ہے۔ خلافة علی لعبد الحميد (ص: ١٩٤)

قعقاع رضی اللہ عنہ نے ان سے درخواست کی کہ آپ پیغام بھجوا کر حضرت طلحہ و حضرت زبیر رضی اللہ عنہما کو بلوالیں، میں آپ کی موجودگی میں ان سے بات کرنا چاہتا ہوں۔

④، ⑤ حضرت طلحہ و حضرت زبیر رضی اللہ عنہما کے ساتھ حضرت قعقاع رضی اللہ عنہ کی گفتگو:

جب وہ دونوں آگئے تو حضرت قعقاع رضی اللہ عنہ نے ان سے بصرہ آنے کا سبب پوچھا۔ انھوں نے بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرح کہا کہ ہم لوگوں کے مابین اصلاح کی خاطر آئے ہیں۔ پھر انھوں نے پوچھا: آپ دونوں حضرات بتائیں کہ اصلاح کی کیا صورت ہونی چاہیے؟ اللہ کی قسم! اگر آپ ہمیں اصلاح کی کوئی صورت بتائیں گے تو ہم اسے ماننے کے لیے تیار ہیں۔ ان دونوں حضرات نے حضرت قعقاع رضی اللہ عنہ سے کہا: قاتلینِ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کیا جائے، اگر انھیں بغیر قصاص چھوڑ دیا گیا تو یہ بات قرآن کو چھوڑ دینے اور اللہ کے احکام کو معطل کر دینے کے مترادف ہوگی۔ اگر ان سے قصاص لیا گیا تو یہ قرآن کو زندہ کرنا ہوگا۔

حضرت قعقاع رضی اللہ عنہ کی نظر میں مسئلے کا حل:

ام المومنین رضی اللہ عنہا اور ان کے ساتھی صحابہ حضرت قعقاع رضی اللہ عنہ کی گفتگو اور دلیل سے متاثر ہوئے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان سے فرمایا: اے قعقاع (رضی اللہ عنہ)! اب آپ ہی بتایئے، آپ کیا کہتے ہیں؟ انھوں نے کہا: میرا خیال یہ ہے کہ اس مسئلے کا حل قرار وسکون اور قاتلینِ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں انتظار کی پالیسی ہے۔ جب اختلافات ختم ہو جائیں گے اور امتِ اسلامیہ امیر المومنین پر متحد ہو جائے گی تو ان کے لیے قاتلینِ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف توجہ کرنا آسان ہو جائے گا۔ ایسا اس وقت ہوگا جب آپ لوگ قاتلینِ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حوالے سے معاملات میں امیر المومنین کی بیعت کر لیں اور ان کی پالیسی پر چلیں گے، اور ان سے متفق ہوں گے تو یہ بات خیر و خوبی کی نشانی اور باعثِ رحمت خوش خبری ہوگی۔ اس طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ان سے انتقام لینے کی قدرت حاصل ہو جائے گی۔

فریقین کے مابین اتفاق کے خوشگوار آثار:

جب حضرت قعقاع رضی اللہ عنہ واپس آئے اور انھوں نے اپنی کارروائی بیان کر دی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کے پاس دو ایلچی بھیجے۔ تا کہ حضرت قعقاع بن عَمر و رضی اللہ عنہ کی کارروائی کی تصدیق ہوسکے۔ ان دونوں ایلچیوں نے واپسی پر اس کی تصدیق کر دی، چنانچہ

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے وہاں سے کوچ کیا اور ان کے سامنے پہنچ کر پڑاؤ ڈالا، ہر قبیلے کے لوگ اپنے قبیلے کے سامنے اترے، مضر، مضر کے سامنے، ربیعہ، ربیعہ کے سامنے اور یمنی، یمنیوں کے سامنے، انھیں صلح کے اقدامات میں کوئی شک نہیں تھا، وہ سب خاموش تھے کچھ نہیں بول رہے تھے، ان کی نیت صلح کے سوا اور کچھ نہ تھی۔[1]

امیر المومنین رضی اللہ عنہ نے جب وہاں سے کوچ کا ارادہ کیا تو اپنے اہم فیصلے کا اعلان بھی کر دیا: اے لوگو! سنو! کل میں یہاں سے کوچ کرنے والا ہوں، ان کی مراد بصرہ کی جانب جانے کی تھی۔ انھوں نے خبر دار فرمایا کہ کل کوچ کرتے ہوئے ہمارے ساتھ کوئی ایسا شخص نہ آئے جس نے کسی بھی سطح پر شہادتِ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ میں کوئی مدد دی ہو۔[2]

جنگِ جمل میں قتال کی ابتداء

جنگ شروع کرنے میں سبائیوں کا کردار:

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں وہ سرکش خوارج موجود تھے جو شہادتِ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا باعث بنے تھے، مگر واضح طور پر ان کی اور ان کے قبیلے کی پہچان نہیں ہوسکی تھی، ان کے خلاف کوئی دلیل اور حجت بھی قائم نہیں ہوسکی تھی، ان میں سے کچھ ایسے تھے جن کے دل میں نفاق تھا، جو ظاہر نہیں تھا۔ ابن سبا کے پیروکار فتنہ کی آگ بھڑکانے پر تُلے بیٹھے تھے تاکہ وہ قصاص سے چھوٹ جائیں۔[3]

جب لوگوں نے وہاں پڑاؤ ڈالا اور آرام کرنے لگے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ باہر نکلے، حضرت طلحہ وحضرت زبیر رضی اللہ عنہما بھی آگئے۔ ان سے ان حضرات نے اختلافی امور میں کھل کر گفتگو کی اور باہم اس بات پر اتفاق کیا کہ جنگ ترک کرنے اور صلح اختیار کرنے سے زیادہ اچھی اور کوئی بات نہیں۔ خاص بات یہ تھی کہ بے یقینی کے بادل چھٹ رہے تھے۔ اسی اتفاقِ رائے پر جب یہ اکابر وہاں سے اٹھے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے لشکر کی طرف چلے گئے اور حضرت طلحہ وحضرت زبیر رضی اللہ عنہما اپنے لشکر کی طرف لوٹ گئے۔ حضرت طلحہ وحضرت زبیر رضی اللہ عنہما نے اپنے سرکردہ ساتھیوں کو بلا بھیجا، ادھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی اپنے خصوصی مشیروں کو بلا لیا۔ انھوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا محاصرہ کرنے والوں میں سے کسی کو بھی نہیں بلایا۔ لوگوں نے صلح و عافیت کی

---

[1] تاريخ الطبري (٥/ ٥٢١، ٥٣٩)

[2] تاريخ الطبري (٥/ ٥٢٥)

[3] تاريخ الطبري (٥/ ٥٢٦، ٥٢٧) تحقيق مواقف الصحابة (٢/ ١٢٠)

نیت کے ساتھ رات بسر کی، انھیں صلح کے معاملات میں اب کوئی شک نہ تھا، لوگ ایک دوسرے کے قریب خیمہ زن تھے اور ایک دوسرے سے ملاقاتیں کر رہے تھے۔ صرف صلح ہی کے متعلق گفتگو ہو رہی تھی۔ جبکہ ادھر فتنہ بھڑ کانے والوں نے رات گزاری، یہ لوگ ہلاکت و بربادی کے خوف سے ساری رات مشورے کرتے رہے، ان میں سے ایک آدمی نے کہا: حضرت طلحہ و حضرت زبیر رضی اللہ عنہما کو تو ہم خوب اچھی طرح جانتے ہیں، البتہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے معاملات واضح نہیں۔ انھوں نے لوگوں کو بصرہ کی طرف کوچ کرنے کا حکم دیا ہے اور قاتلینِ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو منع کر دیا ہے۔ اور دونوں گروہوں کی ہمارے بارے میں رائے ایک ہوگئی ہے۔ لہٰذا اب اگر وہ لوگ (حضرت طلحہ و حضرت زبیر رضی اللہ عنہما) حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ صلح کر لیتے ہیں تو ایسا ہماری لاشوں ہی پر ممکن ہوگا۔[1]

ان کے مابین سیاہ عورت کا بیٹا عبداللہ بن سبا کھڑا ہوگیا اور وہی ان کا مشیرِ خاص تھا۔ وہ کہنے لگا: اے لوگو! تمھاری عزت اسی میں ہے کہ تم لوگوں کے اندر گھس کر گڈمڈ ہو جاؤ اور کل جب لوگ آپس میں ملیں تو تم اچانک لڑائی شروع کر دو۔ انھیں کچھ سوچنے کا موقع ہی نہ دو، اس طرح تم جن کا ساتھ دے رہے ہو، وہ خود بخود رک جائیں گے۔ ان سب کو اپنی پڑ جائے گی اور تم صاف بچ جاؤ گے۔ خوب دھیان سے بات سمجھو، لوگوں کے مابین اس طرح پھیل جاؤ کہ کسی کو کچھ پتا ہی نہ چلے۔[2]

یوں انھوں نے خفیہ طور پر جنگ کے شعلے بھڑکانے کا مقصد پورا کر لیا۔ پھر وہ صبح سویرے منہ اندھیرے ہی نکل پڑے۔ ان کے ہمسایوں کو بھی ان کی نقل و حرکت کا پتا نہ چلا، ان میں سے مضر، مضروں کے سامنے، ربیعہ، اپنے ربیعہ قبیلے کے سامنے اور یمانی، یمانیوں کے بالمقابل آگئے اور تلوار چلانے لگے، یہ دیکھ کر اہلِ بصرہ بھڑک اٹھے۔ حملہ آوروں کے مدِ مقابل وہ لوگ نکل آئے۔

حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما نے کچھ ساتھیوں کو دائیں جانب (میمنہ) کی طرف مقرر کیا، وہ ربیعہ سے تھے، ان کی قیادت حضرت عبدالرحمٰن بن حارث بن ہشام رحمہ اللہ نے کی اور میسرہ (بائیں جانب) کی قیادت حضرت عبدالرحمٰن بن عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ کر رہے تھے۔ وہ دونوں خود درمیان (قلب) میں ثابت قدم رہے۔

---

[1] تاريخ الطبري (٥/ ٥٢٦)

[2] تاريخ الطبري (٥/ ٥٢٧)

انھوں نے پوچھا کہ یہ لڑائی کیسی ہے؟ لوگوں نے کہا: اہلِ کوفہ نے ہم پر شب خون مارا ہے، ان دونوں حضرات نے کہا: معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ خون بہا کر ہی دم لیں گے، لگتا ہے انھوں نے ہماری بات نہیں مانی، پھر وہ اہلِ بصرہ کو ساتھ لے کر آگے بڑھے اور اہلِ بصرہ نے اہلِ کوفہ کو واپس ان کے معسکر میں پہنچا دیا۔ ادھر حضرت علی رضی اللہ عنہ اور اہلِ کوفہ نے آوازیں سنیں۔

سبائیوں نے اپنے ایک آدمی کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قریب رکھا تا کہ وہ وہاں کے حالات کی خبر دے۔ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آواز سنی تو پوچھا کہ یہ کیا ہوا ہے؟ اس آدمی نے کہا: رات کو اچانک کچھ لوگوں نے ہم پر حملہ کر دیا تھا۔ ہم نے انھیں پیچھے دھکیل دیا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے میمنہ پر مقرر آدمی سے کہا کہ اپنی جگہ پہنچو اور میسرہ والے سے کہا کہ تم اپنی جگہ پہنچ جاؤ۔

جنگ کے ان ابتدائی حالات کے باوجود دونوں فریق انتظار کی پالیسی اختیار کیے ہوئے تھے، تا کہ حقیقت واضح ہو جائے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی اس بات پر متفق تھے کہ اس وقت تک جنگ کی ابتداء نہ کی جائے جب تک کوئی دلیل واضح ہو کر سامنے نہ آجائے لیکن سبائی جنگ شروع کرنے سے پیچھے ہٹنے والے نہ تھے۔[1]

دوسری جانب حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اپنی سواری پر سوار لوگوں کے مابین یہ پکار لگانے لگے: خاموش ہو جاؤ، چپ ہوجاؤ۔ جبکہ لوگ ان کے گرد ہجوم کیے ہوئے تھے اور خاموش ہو کر ان کی بات نہیں سنتے تھے۔ انھوں نے فرمایا: ہائے! ہائے یہ جہنمی پتنگے اور لالچ و ہوس کی پروردہ مکھیاں۔ یہ آگ بھڑکانے اور فتنے جگانے والے لوگ، سبائیوں کے سوا کون ہوسکتے ہیں؟[2]

جنگ کے آخری لمحوں تک صلح کی کوششیں جاری رہیں۔ اس ساری صورتحال میں ابن سبا اور اس کے مددگار سبائیوں کا جنگ میں کردار اور ان کے اثرات کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ اس حقیقت میں کوئی شک نہیں کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم صلح وآشتی اور اتحاد واتفاق کے خوگر تھے، نصوص سے یہی ثابت ہوتا ہے اور مومنوں کے دل بھی اسی بات پر مطمئن تھے۔ جنگ کے مختلف حالات وواقعات پر گفتگو کرنے سے پہلے ہم یہ واضح کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ جمل کے معرکہ میں سبائیوں کے اثرات وکردار پر تقریباً تمام علماء کا اتفاق

---

[1] تاریخ الطبري (٥/ ٥٤١)

[2] تاریخ خلیفه بن خیاط (ص: ١٨٢)

ہے، چاہے آپ ان کا نام فسادی رکھیں یا انھیں ان کے اصل نام سبائی کی معرفت سے پکاریں، یہی لوگ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتل تھے اور جمل میں جنگ کی آگ انہی سفاک لوگوں نے بھڑکائی تھی۔[1]

دلائل صداقت:

اب ہم آپ کی خدمت میں بعض ایسے دلائل پیش کرتے ہیں جو مذکورہ گفتگو کی سچائی کی گواہی دیتے ہیں:

(۱) عمر بن شبہ کی تالیف "أخبار البصرة" میں ہے کہ جن لوگوں کو قاتلینِ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کہا گیا وہ ڈرتے تھے کہ مبادا دونوں فریق صلح کر کے اس بات پر اتفاق کرلیں کہ انھیں قتل کر دیا جائے، لہٰذا انھوں نے جنگ کے شعلے بھڑکا دیے حتیٰ کہ وہ کچھ ہو کر رہا جو اب تاریخ کا حصہ ہے۔[2]

(۲) امام طحاوی کہتے ہیں: جمل کا فتنہ حضرت علی اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہما کی خواہش کے خلاف پھوٹ پڑا۔ ان دونوں بزرگوں کی رائے کے برعکس فسادیوں نے جنگ بھڑکا دی۔[3]

(۳) قاتلینِ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ڈر تھا کہ اب انھیں دھر لیا جائے گا اور ان کا گھیراؤ کرنے کی کوشش کی جائے گی، وہ چپکے سے اکٹھے ہوئے، باہم مشورہ کیا، شروع میں کچھ اختلاف ہوا، پھر انھوں نے اس بات پر اتفاق کیا کہ وہ دو گروہوں میں بٹ جائیں۔ پھر دونوں فریقوں میں گھس کر گڈ مڈ ہو جائیں، پھر ان کی ایک ٹولی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں کھڑے ہو کر پکارے کہ حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما نے غداری کی ہے (نعوذ باللہ) اور دوسری ٹولی حضرت طلحہ وحضرت زبیر رضی اللہ عنہما کے لشکر میں کھڑی ہو کر پکارے کہ (نعوذ باللہ) حضرت علی رضی اللہ عنہ نے غداری کی ہے، ان کی تدبیر کا تیر نشانے پر بیٹھا اور جنگ شروع ہوگئی جبکہ دونوں فریق اپنا دفاع کرنے اور خون ریزی سے بچنے کے لیے کوشاں تھے۔

(۴) قاضی ابوبکر ابن العربی رحمہ اللہ کا کہنا ہے: حضرت علی رضی اللہ عنہ بصرہ تشریف لے گئے تو فریقین باہم قریب ہوئے اور سوچ بچار کرنے لگے، لیکن خواہشات کے پجاریوں نے انھیں کچھ نہ کرنے دیا، اور وہ خون بہانے پر اتر آئے۔ جنگ چھڑ گئی، سبائیوں نے یہ سب کچھ اس لیے کیا تاکہ قاتلینِ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر پردہ پڑا رہے، لشکر میں ایک آدمی بھی اپنی سازشی تدبیر سے فساد برپا کرسکتا ہے، کجا یہ کہ یہاں

---

[1] عبد الله بن سبا وأثره في احداث الفتنة في صدر الإسلام (ص: ١٩٢،١٩٤)

[2] فتح الباري (١٣/ ٥٦)

[3] شرح العقيدة الطحاوية (ص: ٥٤٦)

ایک ہزار سے زیادہ فتنہ پرور لوگ سبائیوں کی شکل میں موجود تھے۔[1]

اگر یہ کہا جائے کہ ان فسادیوں کا سبائیوں سے براہِ راست کوئی تعلق نہ تھا تب بھی اس قسم کے موقع پر سبائیوں جیسے سازشی لوگ موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنا مقصد حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اس قسم کے حوادث میں فتنہ جُو قسم کے لوگ اپنا حصہ ضرور ڈالتے ہیں اور اس قسم کے فتنوں میں بعض اوقات حقیقی صورتِ حال پر پردہ پڑ جاتا ہے۔[1]

جنگِ جمل:

سبائیوں نے دونوں لشکروں سے لڑائی شروع کرنے کے لیے اپنی کوششوں میں اضافہ کر دیا، وہ ہر فریق کو اس کے مخالف کے بالمقابل لڑائی کے لیے برانگیختہ کر رہے تھے، معرکہ شدید تر ہوتا چلا گیا، اسے جمل کے نام سے موسوم کیا گیا، اس کی وجہ یہ تھی کہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس جنگ کے دوسرے مرحلے میں بصرہ کے لشکر کے درمیان اس اونٹ پر سوار تھیں جو حضرت یعلیٰ بن امیہ رضی اللہ عنہ نے انھیں مکہ میں پیش کیا تھا، اسے انھوں نے یمن سے خریدا تھا۔ مکہ سے بصرہ تک وہ اسی اونٹ پر سوار ہو کر آئی تھیں، پھر جنگ کے دوران اس پر سوار ہوگئیں۔ اس جنگ کا واقعہ بروز جمعہ سولہ جمادیٰ الثانیہ سَن چھتیس ہجری کو بصرہ کے قریب ''زابوقہ'' نامی علاقے میں پیش آیا، جو کچھ بھی ہوا حضرت علی رضی اللہ عنہ اس پر سخت غم زدہ تھے۔ ان کی طرف سے ایک منادی نے کہا: اے لوگو! لڑائی سے رک جاؤ، لیکن کسی نے بھی اس کی پکار نہیں سنی، ہر شخص اپنے مدِمقابل کے خلاف قتال میں مشغول رہا۔[3]

جمل کا معرکہ دو مرحلوں میں ہوا

پہلا مرحلہ:

بصرہ کے لشکر کی قیادت حضرت طلحہ و حضرت زبیر رضی اللہ عنہما کر رہے تھے۔ لڑائی فجر کے بعد سے دوپہر تک جاری رہی۔[4] حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے لشکر میں اور حضرت طلحہ و حضرت زبیر رضی اللہ عنہما اپنے حامیوں کو پکار پکار

---

[1] العواصم من القواصم (ص: ١٥٦، ١٥٧)

[2] عبد اللّٰه بن سبا (ص: ١٩٥، ١٩٦)

[3] تاريخ الطبري (٥/ ٥٤١)

[4] تاريخ الطبري (٥/ ٥٤١، ٥٤٣) الخلفاء الراشدون للخالدي (ص: ٢٤٥)

کر یہ کہہ رہے تھے کہ جو شخص پیٹھ دکھا کر واپس جا رہا ہو اسے قتل نہ کرو، کسی زخمی کو موت سے ہمکنار نہ کرو اور جو شخص جنگ کو چھوڑ کر باہر جا رہا ہو اس کا پیچھا نہ کرو۔[1]

حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کو اپنے ذمے قرض ادا کرنے کی وصیت کی اور فرمایا: آج ظالم قتل ہوگا یا مظلوم اور میرا خیال ہے کہ میں مظلومیت کی حالت میں قتل کر دیا جاؤں گا لیکن مجھے زیادہ فکر اپنے ذمے قرض کی ادائیگی کی ہے۔[2]

بعض روایات میں حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے معرکے سے پیچھے ہٹ جانے کا سبب یہ بیان کیا گیا ہے کہ معرکے سے کچھ دیر پہلے انھیں معلوم ہوا کہ مخالف سمت میں حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ ''عمار رضی اللہ عنہ کو ایک باغی گروہ قتل کرے گا۔''[3]

یہ حدیث انھوں نے چاہے خود براہِ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ سنی ہو، مگر اس حدیث کی شہرت کے سبب صحابہ میں سے کسی اور سے سنی ہوگی۔[4] بعض روایات میں ان کے جنگ سے پیچھے ہٹنے کا سبب یہ بیان کیا گیا ہے کہ اس فتنے میں انھیں، جیسا کہ خود انھوں نے اسے فتنے سے موسوم کیا ہے، اپنے موقف کی صحت پر شک ہو گیا تھا۔[5]

لہٰذا حضرت زبیر رضی اللہ عنہ سے اس بات کی توقع کس طرح کی جا سکتی تھی؟ جبکہ مکہ سے بصرہ کی طرف روانگی کے وقت ہی ان کا مقصود لوگوں کے مابین اصلاح کے سوا کچھ نہ تھا۔ اور آخری لمحے تک ان کا موقف یہی رہا۔ انتہائی کوشش کے باوجود اختلافات قائم رہے اور جنگ شروع ہوگئی، آخر کار حضرت زبیر رضی اللہ عنہ قتال کو چھوڑ کر چلے گئے۔ اسی طرح حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ بھی اصلاح ہی کے لیے آئے تھے اور ان کی شہادت بھی قتال کے ابتدائی مرحلہ ہی میں ہوگئی تھی۔[6]

حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے میدانِ جنگ سے چلے جانے، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کی شہادت اور دونوں جانب

---

[1] تاريخ الطبري (٥/ ٥٤١)

[2] مصنف ابن أبي شيبة (١٥/ ٢٧٩) والطبقات (٣/ ١٠٨) اس کی سند صحیح ہے۔

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٧) مسند أحمد (٣/ ١٩٠) احمد شاکر کی تحقیق کے مطابق اس کی سند صحیح ہے۔

[4] خلافة علي بن أبي طالب (ص: ١٥٤)

[5] خلافة علي بن أبي طالب (ص: ١٥٤) تاريخ الطبري (٥/ ٥٠٦)

[6] المستدرك للحاكم (٣/ ٣٦٦) تاريخ خليفه بن خياط (ص: ١٨٥) واستشهاد عثمان (ص: ٢٠٠، ٢٠٢)

سے مرنے والوں اور زخمیوں کے گر جانے کے ساتھ جنگِ جمل کا پہلا مرحلہ ختم ہوا، اس میں غلبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر کو ملا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ جنگ کے حالات و واقعات پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ دونوں طرف کے مقتولین اور زخمیوں کا جائزہ لے رہے تھے اور اپنے شدید رنج وغم کا اظہار بھی فرما رہے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے بیٹے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی طرف متوجہ ہوئے، انھیں اپنے سینے سے لگایا اور رونے لگے، وہ فرما رہے تھے: میرے بیٹے! کاش تمھارے والد آج سے بیس برس پہلے وفات پا چکے ہوتے۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے کہا: ابا حضور! میں نے تو آپ کو پہلے ہی اس سے منع کیا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: مجھے تو گمان بھی نہ تھا کہ معاملہ اس حد تک پہنچے گا، آج کے بعد زندگی کا کوئی مزہ نہیں۔ بھلا اب کس خیر کی امید رکھی جائے؟[1]

دوسرا مرحلہ:

قتال سے متعلق تمام خبریں ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا تک پہنچیں وہ اپنے اونٹ پر باہر نکل کر کھڑی ہوگئیں۔ ازدی قبائل نے آپ کو گھیر رکھا تھا۔ آپ کے ساتھ حضرت کرب رضی اللہ عنہ بھی تھے جن کے ہاتھ میں آپ نے قرآن پاک کا ایک نسخہ دیا تھا تاکہ وہ لوگوں کو جنگ بندی کی دعوت دیں۔ ام المومنین رضی اللہ عنہا آگے بڑھیں۔ سیدہ پُر امید تھیں کہ لوگ ان کے مقام و مرتبہ کا لحاظ کرتے ہوئے ان کی بات سنیں گے، اور شعلہ زن ہونے والا یہ فتنہ بجھ جائے گا۔[2]

سبائی لڑنے سے باز نہیں آئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ پیچھے موجود تھے اور جنگ سے باز رہنے اور بصریوں پر حملہ نہ کرنے کی تلقین کر رہے تھے لیکن سبائی آگے تھے وہ نہیں مانے اور آگے بڑھ بڑھ کر حملے کرتے رہے۔ جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے دیکھا کہ وہ لوگ ان کی بات نہیں مان رہے اور کعب بن سور کا قتل بھی ان کے سامنے ہوا تھا تو وہ فرمانے لگیں: اے لوگو! قاتلینِ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور ان کے گروہ پر لعنت بھیجو۔ پھر وہ قاتلینِ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بددعائیں دینے لگیں، اور انھیں لعنت ملامت کرنے لگیں، پھر تمام اہلِ بصرہ بیک آواز بہت بلند آہنگی سے قاتلینِ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور ان ساتھیوں کے خلاف بددعا کرنے لگے۔

لشکرِ بصرہ کی طرف سے یہ بلند آواز حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی سنی۔ انھوں نے پوچھا: یہ کیا بات ہے؟

---

[1] البداية و النهاية (٧/ ٥٢١)

[2] مصنف عبد الرزاق (٥/ ٤٥٦) امام زہری تک اس کی سند صحیح ہے۔

لوگوں نے کہا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا قاتلینِ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بددعا کر رہی ہیں اور لوگ ان کے ساتھ ہم آواز ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے لوگو! تم بھی میرے ساتھ قاتلینِ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے لیے بددعا کرو، ان پر لعنت بھیجو، پھر لشکرِ حضرت علی رضی اللہ عنہ میں بھی لعنت اور بددعا کے یہ الفاظ گونج اٹھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے اللہ! قاتلینِ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ میدانوں میں ہوں یا چٹانوں میں، ان پر لعنت نازل فرما۔[1]

اس کے نتیجے میں لڑائی میں شدت پیدا ہوگئی اور جنگ کے شعلے بھڑ کنے لگے، نیزوں کی بوچھاڑ شروع ہوگئی۔ پھر لوگ تلواریں سونت کر ایک دوسرے کے مدِ مقابل آگئے، پہلے نیزے ٹوٹے، پھر تلواریں چمکنے لگیں۔ اور لوگ ایک دوسرے کے بالکل روبرو آگئے۔[2]

ان سبائیوں نے اپنی تمام کوششوں کا رخ اونٹ کی کھونچیں کاٹنے اور ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو شہید کرنے کی طرف پھیر دیا۔ لشکرِ بصرہ نے تیزی سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور ان کے اونٹ کی حفاظت کا بندو بست کیا، وہ اونٹ کے آگے ڈھال بن کر لڑتے رہے، جو بھی اونٹ کی نکیل پکڑتا تھا قتل کر دیا جاتا تھا۔ اونٹ کے بالکل آگے جنگ میں بڑی شدت آگئی، ہودج کی شکل مسخ ہوگئی، کیونکہ اس پر مسلسل تیر برسائے جارہے تھے جو اس میں پیوست ہو گئے تھے۔ اونٹ کے اردگرد ازد، بنی ضبہ اور قریشی قبائل کے بہت سے نوجوان شجاعت کے جوہر دکھانے کے بعد شہید ہو گئے۔[3]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو اس امر پر شدید حیرانی اور پریشانی ہوئی کہ وہ ہرگز جنگ نہیں چاہتیں اور یہ سب کچھ ان کی خواہش کے خلاف ہو رہا ہے۔ وہ لڑائی ختم کرنے کی تاکید کر رہی تھیں مگر کوئی ان کی بات سننے والا تھا نہ ماننے والا، جو بھی ان کے اونٹ کی نکیل پکڑتا تھا مارا جاتا تھا۔

حضرت محمد بن طلحہ (السجاد) رحمہ اللہ آئے اور اونٹ کی نکیل تھام کر ام المومنین رضی اللہ عنہا سے کہا: اماں جان! آپ کیا حکم دیتی ہیں؟ انھوں نے فرمایا: تم آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں میں سے اچھے بیٹے کی طرح بن جاؤ۔ یعنی اپنا ہاتھ روکے رکھو۔ انھوں نے تلوار کو سونت لینے کے بعد اسے میان میں ڈالا اور پھر شہید کر دیے گئے، اللہ

[1] مصنف ابن أبي شيبة (٢٦٨١٥) اس کی سند صحیح ہے، سنن سعيد بن منصور (٢/ ٢٣٦) اس کی سند بھی صحیح ہے۔ البداية و النهاية (٧/ ٢٥٣)

[2] مصنف ابن أبي شيبة (١٥/ ٢٥٨) اس کے راوی صحیح کے راوی ہیں۔ الطبقات (٥/ ٩٢) اس کی سند حسن ہے۔

[3] البداية و النهاية (٧/ ٢٥٤)

ان پر رحم فرمائے۔ البتہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے ایسی لڑائی لڑی کہ جس کی نظیر نہیں ملتی گویا انھوں نے اپنے آپ کو تلواروں کی چھاؤں میں پھینک دیا، جب مقتولین میں انھیں اٹھایا گیا تو ان کے جسم پر چالیس سے زیادہ زخم پائے گئے، ان میں شدید ترین زخم وہ تھا جو اشتر نے اپنی تلوار کی ضرب سے لگایا تھا۔ اس کے دل میں حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے خلاف شدید کینے کا زہر بھرا ہوا تھا۔ وہ گھوڑے پر سوار تھا، اس نے بیٹھے ہوئے وار کرنا کافی نہ سمجھا حتیٰ کہ رکاب میں کھڑے ہو کر اس نے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے سر پر ایسی کاری ضرب لگائی کہ اسے یہ یقین ہو گیا کہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کا کام تمام ہو گیا ہے۔[1]

بنی عدی، بنی ضبہ اور ازد قبیلوں میں بھی بہت لوگ قتل ہوئے۔ بنو ضبہ نے بہادری کے جوہر دکھائے ام المومنین رضی اللہ عنہا کے لیے اپنی فدا کاری کا ثبوت دیا۔[2]

امیر المومنین رضی اللہ عنہ نے اپنی بصیرت، اور بے مثل عسکری مہارت سے اس بات کا ادراک کر لیا کہ جمل کی جنگ جاری رکھنا لوگوں کی ہلاکت کا باعث ہے اور جب تک حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا میدان میں رہیں گی اصحابِ جمل شکست تسلیم کریں گے نہ جنگ سے پیچھے ہٹیں گے، پھر یہاں موجود رہنے میں خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی زندگی کو بھی خطرہ ہے، وہ ہودج جس میں وہ بیٹھی ہیں، تیروں کی کثرت کے باعث چھلنی ہو گیا تھا۔[3] حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے لشکر کے چند افراد کو، جن میں ام المومنین کے بھائی حضرت محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہما اور حضرت عبد اللہ بن بدیل رضی اللہ عنہ شامل تھے، حکم دیا کہ اونٹ کی کھونچیں کاٹ دیں اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو ان کے ہودج سے نکال کر نیچے لے آئیں۔[4]

ان کے بھائی حضرت محمد بن ابی بکر اور حضرت عبد اللہ بن بدیل رضی اللہ عنہم نے ہودج اٹھایا اور آرام سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے رکھ دیا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو حضرت عبد اللہ بن بدیل رضی اللہ عنہ کے گھر لے جایا گیا۔[5] حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عسکری تدبیر (ذہانت) صحیح ثابت ہوئی۔ جونہی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو میدانِ جنگ سے نکالا گیا، لشکرِ بصرہ واپس چلا گیا۔ وہ سبب ختم کر دیا گیا جس کی بنیاد پر بصری، پورے حوصلے اور ولولے کے

---

[1] مصنف ابن أبي شيبة (١٥/ ٢٢٨) امام ابن حجر رحمہ اللہ نے "فتح الباري" (١٣/ ٥٧، ٥٨) میں اس کی سند کو صحیح کہا ہے۔
[2] تاريخ خليفه (ص: ١٩٠) اس کی سند حسن ہے۔ خلافة على لعبر الحميد (ص: ١٥٩)
[3] أنساب الأشراف للبلاذري (٢/ ٤٣) اس کی سند متصل ہے۔
[4] أعلام الحديث للخطابي (٣/ ١٦١١)
[5] مصنف ابن أبي شيبة (١٥/ ٢٨٦، ٢٨٧) اس کی سند جید ہے۔ فتح الباري (١٣/ ٥٧)

ساتھ موت کو گلے لگا رہے تھے۔ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ یہ اقدامات نہ کرتے تو جنگ جاری رہتی، یوں سارا لشکرِ بصرہ ختم ہو جاتا یا لشکرِ حضرت علی رضی اللہ عنہ شکست کھا جاتا۔

مقتولین کی تعداد:

اس جنگ میں مقتولین کی تعداد کے بارے میں مختلف اندازوں پر مبنی روایات بیان کی جاتی ہیں۔ امتِ اسلامیہ، جس کے دل میں صحابہ کی محبت اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کے جذبات موجزن ہیں، صحابہ کے دشمن سبائیوں اور ان کے متبعین کی طرف سے اس امت کے مابین اختلافات کا دائرہ وسیع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بعض شاعروں اور قبائل کے بعض جاہلوں کی طرف سے واقعات کو بہت بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا، جس میں اپنے بعض لیڈروں اور شہ سواروں کی بہادری کو شاعری میں ڈھال کر مبالغہ آرائی کا رویہ اختیار کیا گیا، مزید برآں قصہ گوئی کے شوقین اپنی بات کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کے لیے مقتولین کو زیادہ تعداد میں پیش کرتے ہیں۔ جنگ جمل کے مقتولین کی حقیقی تعداد کیا تھی؟ وہ درجِ ذیل اسباب کے باعث بہت کم تھی:

1. لڑائی کی مدت بہت مختصر تھی۔ ابن ابی شیبہ نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ لڑائی ظہر کے بعد شروع ہوئی اور سورج غروب ہونے کے وقت وہاں کوئی موجود نہ تھا۔[1]
2. لڑائی کی نوعیت دفاعی رہی، یعنی ہر فریق صرف اپنا دفاع کر رہا تھا۔
3. دونوں فریق لڑائی سے گریزاں تھے کیونکہ وہ مسلمانوں کا خون بہانے کی حرمت اور سنگینی سے صحیح طور پر واقف تھے۔
4. اگر یرموک اور قادسیہ کے معرکوں میں مسلمان شہداء کی تعداد دیکھی جائے تو وہ بالترتیب تین ہزار اور ساڑھے آٹھ ہزار شہید تھے۔ اور یہ معرکے کئی روز تک جاری رہے تھے، لہٰذا ان کے مقابلے میں جنگِ جمل کے مقتولین کی تعداد بہت کم ہونی چاہیے۔ اور خصوصاً جبکہ اول الذکر معرکے اپنی شدت کے باعث امتوں کی تاریخ میں فیصلہ کن معرکے تھے۔
5. خلیفہ بن خیاط نے جمل کے مقتولین میں سے جن کے نام محفوظ ہو سکے ہیں ان کی تعداد تقریباً ایک سو بیان کی ہے۔[2]

---

[1] مصنف ابن أبي شيبة (٧/ ٥٤٦) فتح الباري (١٣/ ٦٢)

[2] تاريخ خليفه بن خياط (ص: ١٨٧، ١٩٠)

اگر ہم فرض کر لیں کہ ان کی تعداد ایک سو نہیں دو سو تھی، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ان کی تعداد دو سو سے زائد نہیں تھی۔ ڈاکٹر خالد بن محمد الغیث نے اپنے رسالے "استشهاد عثمان ووقعة الجمل في مرويات سيف بن عمر في تاريخ الطبرى،دراسة نقديه" میں ترجیحاً یہی تعداد بیان کی ہے۔[1]

مقتولین کی تلاش اور ان کے لیے دعائے رحمت:

جنگ کے اختتام پر امیر المومنین رضی اللہ عنہ اپنے کچھ ساتھیوں کے ساتھ مقتولین کی تلاش میں نکلے، انھوں نے حضرت محمد بن طلحہ (السجاد) رحمہ اللہ کو دیکھا تو فرمایا: "اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَيهِ رَاجِعُونَ" یہ تو بڑا صالح نوجوان تھا، پھر غم زدہ ہو کر بیٹھ گئے .... اور مقتولین کے لیے مغفرت اور رحمت کی دعا کی۔ ان میں سے متعدد افراد کی خیر و بھلائی کے الفاظ کے ساتھ تعریف کی اور پھر واپس چلے گئے۔[2]

ان کی اہلیہ اور دونوں بیٹیاں، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، ان کے قریبی رشتہ داروں اور حضرت زبیر و حضرت طلحہ رضی اللہ عنہما اور ان کے قریبی قریشی رشتہ داروں پر رو رہی تھیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انھیں مخاطب کیا اور فرمایا: مجھے امید ہے کہ ہم اُن لوگوں میں شمار ہوں گے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِم مِّنْ غِلٍّ إِخْوَانًا عَلَىٰ سُرُرٍ مُّتَقَابِلِينَ ﴾ [الحجر: ٤٧]

"اور ان کے سینوں میں جو کینہ و حسد ہوگا ہم نکال دیں گے، (وہ تختوں پر آمنے سامنے (بیٹھے) بھائی بھائی ہوں گے۔"

پھر فرمایا: "اگر ہم وہ نہیں ہوں گے تو پھر اور کون لوگ ہوں گے؟ وہ یہی بات بار بار دہراتے رہے۔" (راوی کہتے ہیں) میرا دل چاہا کہ کاش! وہ خاموش ہو جائیں۔[3]

اہلِ بصرہ کی مبایعت:

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ وحدتِ امت، رعایا کے احترام اور عام لوگوں کے ساتھ کریمانہ سلوک کے خواہش مند تھے، ان کے اس سلوک سے اہلِ بصرہ کے دل بہت متاثر ہوئے اور امیر المومنین کی بیعت

---

[1] استشهاد عثمان ووقعه الجمل (ص: ٢١٥)

[2] مصنف ابن أبي شيبة (١٥/ ٢٦١) المستدرك (١٠٤، ٣٧٥) اس کی سند حسن لغیرہ ہے، خلافة على بن أبي طالب (ص: ١٦٩)

[3] مصنف ابن أبي شيبة (٢٦٨١٥، ٢٦٩) وخلافة علي رضي الله عنه لعبد الحميد (ص: ١٦٩)

کرنے کے سلسلے میں بہت اچھا اثر مرتب ہوا۔جمل والے روز امیر المومنین نے قیدیوں کو ایک خاص جگہ پر رکھا، پھر جب فجر کی نماز پڑھی تو حضرت موسی بن طلحہ بن عبید اللہ رحمہ اللہ کو بلایا: انھیں خوش آمدید کہا اور اپنے قریب بٹھایا، ان سے ان کے اور ان کے بھائیوں کے حال احوال معلوم کیے، پھر کہا: میرے بھتیجے! جب بھی تمھیں کسی قسم کی کوئی ضرورت ہو میرے پاس آجانا، ان کے بھائی حضرت عمران بن طلحہ رحمہ اللہ کے ساتھ بھی اچھا معاملہ کیا تو ان دونوں نے امیر المومنین کی بیعت کر لی، جب قیدیوں نے یہ سارا منظر دیکھا تو وہ بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں ان کی بیعت کے لیے آگئے، انھوں نے اور بعد ازاں دیگر قبائل نے اپنے اپنے قبیلے کے جھنڈے تلے آکر ان کی بیعت کی۔[1]

اس طرح اہلِ بصرہ کی امیر المومنین کے حق میں بیعت مکمل ہوئی، اور انھوں نے وہاں اپنے چچا زاد بھائی حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو والی مقرر کیا، اور زیادہ بن ابیہ رحمہ اللہ کو وہاں کے خراج کی ذمہ داری سونپی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ وہاں طویل مدت تک قیام فرمانا چاہتے تھے لیکن مالک (الاشتر) کی وجہ سے جلدی روانگی اختیار فرمائی، کیونکہ اشتر والی بننا چاہتا تھا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بصرہ کے والی بنا دیے گئے ہیں تو وہ غضبناک ہوا، اپنی قوم کی طرف چل دیا اور خوب چلت پھرت دکھائی، حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اندیشہ ہوا کہ مبادا وہ شر اور فتنہ پھیلائے، چنانچہ وہ باقی ماندہ لشکر لے کر فوراً روانہ ہوئے اور مالک الاشتر تک پہنچ گئے۔ اسے ڈانٹ پلائی کہ تم کیوں چلے آئے؟ پھر ایسا رویہ اختیار فرمایا جیسے اس کے متعلق انھوں نے کوئی بات ہی نہیں سنی۔[2]

مسلمان عورتوں کا احترام:

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ اس گھر میں تشریف لائے جہاں ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا تشریف فرما تھیں۔ آپ نے حاضری کی اجازت طلب کی اور سیدہ کو سلام کیا، انھوں نے آپ کو خوش آمدید کہا۔ بنی خلف کے گھر میں عورتیں مقتولین پر آہ و بکا کر رہی تھیں، ان میں خلف کے دو بیٹے عبد اللہ اور عثمان رحمہما اللہ بھی تھے، عبد اللہ رحمہ اللہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے لشکر میں تھے۔ جبکہ عثمان رحمہ اللہ لشکرِ حضرت علی رضی اللہ عنہ میں شہید ہوئے، جب حضرت علی رضی اللہ عنہ تشریف لائے تو عبد اللہ رحمہ اللہ کی بیوی صفیہ نے کہا: اللہ تمھاری اولاد کو اسی طرح یتیم

[1] الطبقات (٣/ ٢٢٤) اس کی سند حسن ہے۔ المستدرك للحاكم (٣/ ٣٧٦، ٣٧٧)

[2] فتح الباري (١٣/ ٥٧) و خلافة علي رضي الله عنه لعبد الحميد (ص: ١٧٤)

کر دے جس طرح تم نے ہماری اولاد کو یتیم کر دیا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ خاموش رہے۔ انھیں کوئی جواب نہ دیا، جب آپ باہر نکلنے لگے تو اس خاتون نے پھر یہی بات دہرائی۔ آپ بدستور خاموش رہے تو ایک آدمی نے کہا: امیر المومنین رضی اللہ عنہ! اس عورت کی بات پر خاموش ہیں، وہ جو کچھ کہہ رہی ہے آپ چپ چاپ سن رہے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تم پر رحم کرے، ہمیں تو یہ حکم ہے کہ ہم مشرک عورتوں کی بات پر بھی چپ رہیں تو کیا ہم ان عورتوں کی بات پر چپ نہ رہیں جو مسلمان ہیں۔[1]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو مطعون کرنے والوں کے متعلق امیر المومنین کا موقف:

ایک آدمی نے کہا: امیر المومنین! دروازے پر دو آدمی ہیں، وہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی عیب جوئی کررہے ہیں۔ حضرت علی نے حضرت قعقاع بن عَمرو رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ ان دونوں میں سے ہر ایک کو ایک ایک سو کوڑے لگائیں اور کپڑوں سے پکڑ کر گھسیٹیں۔ حضرت قعقاع رضی اللہ عنہ نے اس حکم پر عمل کیا۔[2]

صِفین کی جنگ میں قیدیوں کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حسنِ سلوک:

لڑائی کے دوران صِفین میں فریقین نے نہایت شریفانہ اور کریمانہ رویہ اختیار کیا۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ نکلا کہ قیدیوں کے ساتھ بھی اچھے سلوک اور اکرام کا معاملہ کیا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیدیوں کا احترام ملحوظ رکھنے کی ترغیب دی اور تاکید فرمائی ہے کہ جو کھانا میسر ہو اس میں سے بہتر کھانا قیدیوں کو کھلایا جائے۔ غیر مسلموں کے ساتھ یہ سلوک روا رکھا جاتا تھا تو مسلمانوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کیوں نہ کیا جاتا؟ تاہم قیدی کو اس جنگ میں اپنے گروہ کی طاقت سمجھا جاتا تھا۔[3]

لہٰذا حضرت علی رضی اللہ عنہ حریف کے قیدی کو حفاظت سے قید میں رکھنے کا حکم دیتے تھے، اگر وہ بیعت کر لیتا تھا تو اسے چھوڑ دیتے تھے، انکار کرتا تھا، تو اس کے ہتھیار اور سواری لے لیتے تھے یا یہ چیزیں واپس کر کے اس سے لڑائی نہ کرنے کا حلف لیتے تھے۔ ایک روایت کے مطابق اسے چار درہم مرحمت فرماتے تھے۔[4]

اس عمل کا مقصد باغیوں کو کمزور کرنا تھا۔ صفین کے دن حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں ایک قیدی

[1] البداية و النهاية (٧/ ٣٥٧)

[2] البداية و النهاية (٧/ ٢٥٧)

[3] الحاوي الكبير، كتاب قتال أهل البغى (ص: ١٣٣، ١٣٤)

[4] خلافة علي بن أبي طالب لعبد الحميد (ص: ٤٢٤)

لایا گیا، قیدی نے کہا: مجھے باندھ کر قتل نہ کیجیے گا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں اللہ رب العالمین سے ڈرتا ہوں، تمھیں باندھ کر قتل نہیں کروں گا۔ پھر اسے چھوڑ دیا اور فرمایا: کیا تم میں کوئی بھلائی موجود ہے؟ کیا تم بیعت کرو گے؟[1]

ایک مرتبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس پندرہ قیدی لائے گئے، وہ زخمی تھے، ان میں سے دو زخموں کی وجہ سے فوت ہو گئے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انھیں غسل دیا، کفن پہنایا، اور ان کی نمازِ جنازہ ادا کی۔ محبّ الدین خطیب اس جنگ پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں: انتہائی المناک ہونے کے باوجود یہ ایک مثالی جنگ تھی، انسانی تاریخ میں اپنی نوعیت کی یہ پہلی جنگ تھی جس میں دونوں طرف سے لڑنے والے اعلیٰ فضائلِ اخلاق کا نمونہ تھے۔[2]

آج غیر مسلم بھی اسلامی قوانین کے آرزومند ہیں:

آج دنیا کے بہت سے انسان دوست غیر مسلم بھی آرزومند ہیں کہ جنگوں میں انسانی حقوق ملحوظ رکھے جائیں اور اسلامی اخلاق کا اطلاق کیا جائے۔ اگر جمل وصفین جیسی جنگیں نہ ہوتیں تو دنیا کو اسلام کے جنگی قوانین کا علم ہی نہ ہو پاتا۔ یقیناً ہر معاملے میں اللہ کی بے پایاں حکمتیں کارفرما ہوتی ہیں۔[3]

اپنے اور لشکرِ معاویہ رضی اللہ عنہ کے مقتولوں کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی دعا:

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ جنگی دورے ختم کرنے کے بعد مقتولین کو تلاش کرتے اور ان کے حالات معلوم کرتے تھے، ایک عینی شاہد کا بیان ہے: میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے شہباء نامی خچر پر بیٹھے ہوئے دیکھا، وہ مقتولین کا جائزہ لے رہے تھے۔[4]

حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے مقتولین کے قریب کھڑے ہو کر دونوں اطراف کے مقتولین کے لیے یہ دعا کرتے رہے: اللہ تعالیٰ تمھاری بخشش فرمائے، اللہ تمھاری بخشش فرمائے۔ حضرت یزید بن اصم رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: جب حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے مابین صلح ہوگئی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ

[1] كتاب الأم للإمام الشافعي (٤/ ٢٢٤، ٨/ ٢٥٦)

[2] تاريخ دمشق، تحقيق المنجد (١/ ٣٣١) خليفة علي بن أبي طالب (ص: ٢٤٣)

[3] العواصم من القواصم (ص: ١٦٨، ١٦٩)

[4] خلافة علي رضي الله عنه لعبد الحميد (ص: ٢٥٠) تنزيه خال المؤمنين (ص: ١٤٨)

باہر نکلے، وہ اپنے مقتولین کے درمیان چل رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ یہ جنت میں ہیں پھر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے مقتولین کی طرف گئے اور فرمایا: یہ بھی جنت میں ہیں معاملہ میرے اور (حضرت) معاویہ (رضی اللہ عنہ) کے ذمے ہے۔ پھر آپ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے مقتولین کے بارے میں فرمایا: وہ مومن ہیں۔[1]

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے مابین جنگوں پر اہلِ سنت کا موقف:

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے مابین جو جنگیں وقوع پذیر ہوئیں، ان کے بارے میں اہلِ سنت کا موقف یہ ہے کہ ان کے باہمی اختلافی معاملات پر تبصرے سے گریز کیا جائے، طرفین میں سے کسی کی نسبت دشمنی، بُغض اور کینہ پروری کے عنوان سے ہرگز کوئی گفتگو نہ کی جائے، صرف ان کے شایانِ شان بات کی جائے۔ ہر مسلمان پر واجب ہے کہ ان سب سے محبت رکھے، ان کے لیے دعا کرے کہ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو اور ان پر رحم فرمائے، ہر مسلمان ان کے فضائل یاد رکھے اور ان کے مناقب کا دل سے اعتراف کرے۔ اور جو کچھ ان کے مابین رونما ہوا، وہ محض اجتہاد کی بنیاد پر تھا، صحیح یا غلط نقطۂ نگاہ دونوں حالتوں میں ان کے لیے اجر وثواب ہے، البتہ اجتہاد میں صحیح رائے قائم کرنے والے کا ثواب غلطی کرنے والے کے اجر سے دُگنا ہے۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں سے قاتل ومقتول دونوں جنت میں جائیں گے۔ علمائے اہلِ سنت نے ان اختلافی امور میں زیادہ بات کرنے کی ممانعت فرمائی ہے۔[2]

جن نصوص سے صحابہ کے مابین لڑائی کی راہنمائی ملتی ہے، وہ نصوص یہ ہیں:

1 فرمانِ ربانی ہے:

﴿ وَاِنْ طَآىِٕفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ۚ فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝ ﴾ [الحجرات: ٩]

’’اور اگر اہلِ ایمان میں سے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان صلح کراؤ پھر ان دونوں گروہوں میں سے ایک دوسرے پر زیادتی کرے تو تم اس زیادتی کرنے والے گروہ سے لڑو،

---

[1] مصنف ابن أبي شيبة (١٥/ ٣٠٣) اس کی سند حسن ہے۔ تاریخ دمشق (١/ ٣٢٩، ٣٣١) خلافة علي رضي الله عنه (ص: ٢٥١)

[2] عقيدة أهل السنة و الجاعة في الصحابة الكرام (٢/ ٤٢٧) تنزيه خال المومنين معاوية بن أبي سفيان رضي الله عنهما من الظلم و الفسق.

یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آئے، پھر اگر وہ پلٹ آئے، تو ان کے درمیان عدل کے ساتھ صلح کرا دو، اور انصاف کرو کہ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔''

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کا حکم یہ ہے کہ جب مومنوں کے درمیان لڑائی کے حالات پیدا ہو جائیں تو ان کے مابین صلح کرائی جائے، کیوں کہ وہ سب آپس میں بھائی بھائی ہیں، اور یہ لڑائی انھیں ایمان کی صفت سے خارج نہیں کرتی، جبکہ اس صفت کی مناسبت سے خود اللہ تعالیٰ نے ان کا نام مومنین رکھا ہے، اور ان کے مابین اصلاح کا حکم دیا ہے۔ اللہ نہ کرے جب بھی مومنوں کے درمیان لڑائی ہو تو وہ ایمان سے خارج نہیں ہوتے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب جنھوں نے جمل کے واقعہ میں آپس میں لڑائی کی، وہ اپنے رب کی نگاہ میں حقیقی ایمان پر قائم ہیں، اختلافِ رائے کا ان کے ایمان پر کوئی منفی اثر نہیں پڑا کیونکہ یہ سب کچھ اجتہاد کی بنیاد پر رونما ہوا۔[1]

2 حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''مسلمانوں کے ایک گروہ میں دین سے نکلنے کی شکل پیدا ہوگی، انھیں وہ قتل کرے گا جو زیادہ حق پر ہوگا۔''[2]

جس گروہ کی جانب اوپر اشارہ کیا گیا ہے وہ درحقیقت حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے درمیان اختلاف کا بیان ہے، دونوں گروہوں کو مسلمان کے عنوان سے موسوم کیا گیا ہے اور ان دونوں کا تعلق حق سے ہے، یہ حدیث نبوت کی علامات میں سے ایک بہت بڑی نشانی ہے، کہ جو کچھ بھی ہوا، جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئی کے مطابق ہوا، اس میں اہلِ شام اور اہلِ عراق دونوں کے مسلم ہونے کا حکم بھی ملتا ہے بخلاف رافضی فرقہ اور دیگر جاہل لوگوں کے جو اہلِ شام کی تکفیر کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی زیادہ برحق تھے۔ اہلِ سنت والجماعت کا یہی مسلک ہے اور یہی موقف صحیح ہے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اجتہاد کیا، ان شاء اللہ وہ اس پر اجر کے مستحق ہیں، لیکن ان کے برعکس حضرت علی رضی اللہ عنہ امامت و خلافت کے منصب پر فائز تھے، ان کے لیے دگنا اجر ہے، جیسا کہ صحیح بخاری کی اس حدیث سے ثابت ہے:

---

[1] العواصم من القواصم (ص: ١٦٩۔ ١٧٠) أحكام القرآن (٤/ ١٧١٧)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٦٤)

''جب حاکم اجتہاد کرے اگر وہ صحیح ہوتو دگنا اجر ملے گا اور اگر غلطی پر ہوتو ایک اجر کا مستحق ہوگا۔''[1]

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ایک روز نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خطاب فرما رہے تھے کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ آگئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''میرا یہ بیٹا سیادت کے مقام پر فائز ہوگا اور ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے مسلمانوں کے دو گروہوں میں صلح کرا دے۔''[2]

اس حدیث میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یہ گواہی ملتی ہے کہ اہلِ عراق اور اہلِ شام دونوں مسلمان ہیں، اور اس حدیث میں واضح طور پر ان خوارج کی تردید کی گئی ہے جنھوں نے ایک طرف حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں پر اور دوسری طرف حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں پر تکفیر کا فتوی لگایا، مزید برآں یہ حدیث ان دونوں فریقوں کے مسلمان ہونے پر گواہ بھی ہے، یہی وجہ ہے کہ امام سفیان ابن عیینہ فرمایا کرتے تھے کہ اس حدیث میں ''دو مسلمان گروہ'' کے الفاظ مجھے بہت پسند ہیں۔ امام بیہقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: انھیں یہ بات اس لیے پسند آئی کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب کو مسلمین کے نام سے موسوم فرمایا، اس حدیث کے مصداق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئی کے مطابق حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما ہیں۔ انھوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد امورِ خلافت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے سپرد کر دیے۔[3]

امام ابن حجر فرماتے ہیں: اہلِ سنت کا اس پر اتفاق ہے کہ صحابہ کی طرف سے جو کچھ ہوتا رہا اس پر طعن و تشنیع کی ممانعت ہے، کیوں کہ ان کی یہ باہمی جنگیں اجتہاد کی بنیاد پر تھیں اور یہ ثابت ہو چکا ہے کہ صحیح رائے اختیار کرنے پر دہرا اجر اور اس سے مختلف رائے پر بھی اکہرا اجر ملنے والا ہے۔ اہلِ سنت کا اس پر اجماع ہے۔ شہادتِ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد مذکورہ امور پر زبان کھولنے سے اجتناب کیا جائے، ان کے لیے رحمت کی دعا کی جائے، صحابہ کے فضائل ہمیشہ یاد رکھے جائیں مختلف پہلوؤں سے ان کی سبقت کا اعتراف کیا جائے، ان کے محاسن کا تذکرہ عام کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو اور انھیں بھی راضی کر دے۔[4]

---

[1] صحیح بخاری مع شرحہ فتح الباری (١٢/ ٣١٨)

[2] صحيح البخاري، كتاب الفتن، رقم الحديث (٣٦٢٩)

[3] الاعتقاد للإمام البيهقي (ص: ١٩٨) فتح الباري (١٣/ ٦٦)

[4] فتح الباري (١٣/ ٣٤) عقيدة أهل السنة (٢/ ٧٤٠)

فتنۂ خوارج:

امام ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: خوارج سے مراد وہ لوگ ہیں جنھوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے تحکیم کا انکار، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور ان کی اولاد سے براءت کا اظہار کیا، ان کے خلاف جنگ کی اور ان میں سے غالی لوگوں نے ان کی مطلقاً تکفیر کی۔[1]

امام موصوف ایک اور جگہ ان کا تعارف کرواتے ہوئے کہتے ہیں: خوارج خروج و بغاوت اختیار کرنے والا ایک گروہ ہے، یہ بدعتی لوگ ہیں، انھیں خوارج کے نام سے اس لیے موسوم کیا گیا کہ انھوں نے دین اور بہت اچھے مسلمانوں کے خلاف خروج کیا۔ فی الحقیقت خوارج وہ لوگ ہیں جنھوں نے صِفین کے موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے تحکیم کا فیصلہ قبول کرنے پر ان کے خلاف خروج کیا۔ ''خوارج'' کے سوا ان کے اور القاب بھی ہیں، مثلاً: ① الحروریہ، ② الشراہ، ③ المارقہ ④ المحکمہ وغیرہ۔ وہ ''المارقہ'' کے سوا تمام القاب پر خوش ہوتے ہیں کیونکہ انھیں یہ بات پسند نہیں کہ ان کے بارے میں یہ کہا جائے کہ ''وہ دین سے اس طرح نکل گئے جیسے شکار سے تیر پار نکل گیا۔''[2]

اہلِ علم میں سے کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو خوارج کی ابتداء کو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے جوڑتے ہیں۔

خوارج کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات:

حضرت ابو سلمہ اور حضرت عطاء بن یسار رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ وہ دونوں، حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حروریہ کے بارے میں پوچھا۔ کیا آپ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کے بارے میں کچھ سنا ہے؟ انھوں نے فرمایا: جی ہاں! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا: ''اس امت میں سے ایسے لوگ نکلیں گے جن کی نماز کے سامنے تم اپنی نماز کو کم تر سمجھو گے، وہ قرآن پڑھیں گے، جو ان کے حلق سے نیچے نہیں اترے گا، وہ دین سے یوں پار نکلیں گے جیسے شکار سے تیر نکل جاتا ہے، چنانچہ تیر انداز اپنے تیر کا جائزہ لیتا ہے، اس کی اَنی اور لکڑی کو بغور دیکھتا ہے اور پھر اسے سوفار کے متعلق شک ہونے لگتا ہے کہ شاید یہاں خون لگا ہوا ہو۔''[3]

---

[1] هدي الساري في مقدمة فتح الباري (ص: ٤٥٩، ٢/ ٢٨٣)

[2] مقالات الإسلاميين (١/ ٢٠٧)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٦٧)

امام بخاری نے حضرت یسیر بن عمرو رحمہ اللہ کی روایت نقل کی ہے کہ انھوں نے کہا: میں نے حضرت سہل بن حُنَیف رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ کیا آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خوارج کے بارے میں کوئی بات سنی ہے؟ انھوں نے کہا: ہاں! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دستِ مبارک سے عراق کی طرف اشارہ کیا تھا اور فرمایا تھا: ''وہاں سے ایک قوم نکلے گی۔ وہ لوگ قرآن پڑھیں گے لیکن قرآن ان کے حلق سے نیچے نہیں اترے گا، وہ دینِ اسلام سے ایسے پار نکلیں گے، جیسے تیر شکار سے نکل جاتا ہے۔''[1]

ان احادیث میں فرقۂ خوارج کی مذمت بالکل صاف نظر آ رہی ہیں ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بارے میں فرمایا کہ: دین سے نکل جانے والا ایک گروہ ہے۔ یہ لوگ غیر ضروری طور پر دین کی نسبت سے شدت پسندی کا مظاہرہ کریں گے اور دین سے اسی تیزی سے نکل جائیں گے جس تیزی اور جلد بازی سے دین میں داخل ہوئے تھے، وہ دین کو مضبوطی سے نہیں تھامیں گے ....

ان احادیث میں سے پہلی حدیث میں یہ بھی بیان ہوا ہے کہ وہ اہلِ حق کے خلاف لڑیں گے۔ اہلِ حق انھیں قتل کریں گے۔ ان میں ایک آدمی ایسا ہوگا جس میں فلاں فلاں صفات ہوں گی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئی کے عین مطابق یہ ساری باتیں ظہور میں آئیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ کہ ''قرآن ان کے حلق سے نیچے نہیں اترے گا'' اس کے کئی معانی ہوسکتے ہیں:

1. ایک یہ احتمال ہے کہ ان کے دل قرآن کا اصل مطلب نہیں سمجھیں گے بلکہ اس سے غیر متعلق بات مراد لیں گے۔
2. اور یہ بھی احتمال ہے کہ ان کی تلاوت اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قبول نہیں ہوگی۔[2]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زندگی کے آخری ایام

جنگِ نہروان کے بعد:

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دین سے خارج ہوجانے والے فرقۂ خوارج کے خلاف قتال اس بات پر بڑی قوی اور واضح دلیل ہے کہ انھوں نے اہلِ شام کے خلاف جو قتال کیا اس میں وہ بالکل صحیح

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٩٣٤)
[2] فتح الباري (٦/ ٦١٨) یہ بات قاضی عیاض سے ''شرح النووي'' (٧/ ١٥٩) میں منقول ہے۔

رائے پر تھے اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں اقرب الی الحق تھے، رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے:
''مسلمانوں کا ایک فرقہ دین سے نکل جائے گا، اسے وہ لوگ قتل کریں گے جو دو گروہوں میں سے حق کے زیادہ قریب ہوں گے۔''[1]

اس پر ایک اور دلیل حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما کی شہادت بھی ہے۔ وہ منصوبہ جو امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بنایا تھا وہ یہ تھا کہ خوارج کے ساتھ قتال کے بعد فوجوں کا رخ شام کی طرف پھیر دیا جائے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود شام کو اپنی خلافت کے زیرِ نگیں لانا اور وحدتِ امت کو ایک ٹھوس حقیقت بنانا تھا اور خوارج کے خلاف آپ کی جنگِ کا مقصد یہ تھا کہ داخلی سرحدیں محفوظ ہو جائیں لیکن اکثر ہواؤں کا رُخ پھر جاتا ہے۔ جنگِ نہروان کے بعد امیر المومنین شام کے خلاف لڑائی نہ لڑ سکے اور شہادت کے درجے پر فائز ہوگئے۔

خوارج کا خروج امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فوج کو کمزور کرنے کا باعث بنا، مزید برآں جمل، صِفین اور نہروان کی لڑائیاں، اہلِ عراق کے جنگِ ...... سے اکتا جانے کا بہت بڑا سبب بن گئیں۔ وہ جنگ سے نفرت کرنے لگے، خاص طور پر صِفین میں اہلِ شام کے خلاف جنگ بھی عام جنگوں کی طرح نہیں تھی، صِفین کا معرکہ پیس دینے والی جنگ ثابت ہوا، بہت سے بچے یتیم ہو گئے، عورتیں بیوہ ہوگئیں اور کوئی مقصد بھی حاصل نہ ہو سکا۔ اگر صلح تحکیم، جسے امیر المومنین رضی اللہ عنہ اور کثیر صحابۂ کرام نے خوش آمدید کہا تھا، کا معاملہ نہ ہوتا تو عالمِ اسلام پر ایسی زبردست مصیبت ٹوٹ پڑتی جس کے مہلک نتائج کا اندازہ بھی نہیں کیا جاسکتا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ شام کی طرف دوسری بار روانگی نہ ہوسکی۔ لوگوں کو یہ ناکامی پسند تھی کیوں کہ وہ جنگ سے گریزاں تھے، ہر چند کہ وہ خوب جانتے تھے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ حق پر ہیں۔[2]

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مشکلات میں ایک اور اضافہ ہو گیا۔ ایک فرقہ ظاہر ہوا، وہ غلو کی حد تک ان کی تعظیم کرنے لگا، انھیں الوہیت کے مقام پر فائز کر دیا۔ اس بارے میں ایک رائے یہ سامنے آئی کہ یہ ان خوارج کا ردِعمل ہے جو ان سے براءت کا اظہار کرتے اور ان کی تکفیر کرتے ہیں۔[3] لیکن ان کا

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٠٦٤)

[2] خلافة علي بن أبي طالب لعبد الحميد (ص: ٣٤٥)

[3] نظام الخلافة في الفكر الإسلامي لمصطفىٰ حلمى (ص: ١٥/ ١٦)

مقصد بہت بُرا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ صرف جیشِ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی نہیں بلکہ تمام مسلمانوں کو کمزور کیا جائے اور مسلمانوں کے دین کی عمارت میں فاسد عقائد داخل کر کے اسے ڈھادیا جائے۔[1]

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بڑی دانشمندی اور قوت سے ان کا مقابلہ کیا۔ اس میں شک نہیں کہ خوارج کے قتل کی وجہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فوجی قوت کمزور پڑ گئی، بعد ازاں کچھ اور مشکلات پے در پے پیش آتی چلی گئیں۔ حضرت خِریت بن راشد رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حارث بن راشد اہواز میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مقرر کردہ امیر تھا، اس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بغاوت کر دی، لوگوں کی بہت بڑی تعداد اس کے ساتھ ہو گئی، وہ اپنے علاقے پر چھا گیا اور محصولات بٹورنے لگا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت معقل بن قیس الریاحی رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں اس کی سرکوبی کے لیے ایک لشکر روانہ کیا جس نے اسے شکست دے کر قتل کر دیا۔[2]

اہلِ اہواز بگڑ گئے، انھوں نے خَراج میں کمی کا مطالبہ کیا، اس سلسلے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بعض مالی اور عسکری مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ امام شعبی رحمہ اللہ سے اس بارے میں مروی ہے: ''جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اہلِ نہروان کو قتل کر دیا تو بہت سے لوگ ان کے خلاف ہو گئے، مختلف اطراف میں بغاوتیں پھوٹ پڑیں، ابن الحضرمی بصرہ پہنچ گیا، اہلِ اہواز بگڑ گئے اور اہلِ خراج نے حضرت سہل بن حُنَیف رضی اللہ عنہ کو فارس سے نکال دیا جو وہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے عامل مقرر تھے۔''[3]

دوسری طرح حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ طرح طرح کے خفیہ اور اعلانیہ وسائل عمل میں لاتے ہوئے امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کمزور کرنے کا سبب بن رہے تھے، امیر المومنین کے لشکر کو بہت سی مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا، اس میں بہت ٹوٹ پھوٹ ہوئی۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھایا۔ حضرت عَمر و بن العاص رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں اپنا لشکر مصر روانہ کیا جو وہاں غالب رہا اور مصر پر قابض ہو گیا۔ متعدد عوامل ان کے مددگار ثابت ہوئے جن میں سے کچھ یہ ہیں:

- امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کا خوارج کے ساتھ مصروفِ جنگ ہونا۔
- مصر پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقرر کردہ عامل حضرت محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہما سابق عامل حضرت قیس بن سعد بن عبادہ الساعدی الانصاری رضی اللہ عنہ جیسے مدبر نہیں تھے۔ وہ چالاکی اور ہوشیاری سے خالی تھے، وہ غیر

[1] خلافة علي بن أبي طالب لعبد الحميد على (ص: ٣٥٠)
[2] تاريخ الطبري (٦/ ٢٧، ٤٧)
[3] تاريخ الطبري (٦/ ٥٣)

ضروری طور پر خونِ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا مطالبہ کرنے والوں سے جنگ میں الجھ گئے، انھوں نے سابق عامل کی طرح سیاسی حکمتِ عملی اختیار نہ کی، لہٰذا شکست کھا گئے۔

- حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے مصر میں خونِ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا مطالبہ کرنے والوں کی ہاں میں ہاں ملائی، یوں انھیں وہاں غلبہ حاصل ہوگیا۔[1]
- مصر امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مرکز سے دور اور شام کے قریب تھا۔ اس جغرافیائی حالت سے بھی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فائدہ اٹھایا۔
- مصر جغرافیائی اعتبار سے براستہ سیناء شام سے متصل تھا۔

بعد ازاں اہلِ مصر نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو اضافی قوت سے سرفراز کیا۔ اقتصادی طور پر ان کی مدد کی، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے جزیرۂ عرب کے شمال، مکہ اور مدینہ اور یمن کی طرف وفود روانہ کیے لیکن یہ وفود اپنی منزل تک پہنچنے سے پہلے ہی واپس کر دیے گئے کیوں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کی راہیں مسدود کر دی تھیں۔[2]

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ مختلف علاقوں کے والیوں اور اہم شخصیتوں پر مسلسل اثر ڈالتے رہے، چنانچہ ان لوگوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے غلبہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مسائل میں انتشار محسوس کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک خطبے میں فرمایا:

''میں ان لوگوں کو دیکھ رہا ہوں کہ یہ تم پر غالب آجائیں گے، وہ باطل پر مجتمع ہیں اور تم حق پر ہوتے ہوئے بھی انتشار کا شکار ہو۔ وہ لوگ اپنے امیر کی اطاعت کرتے ہیں اور تم اپنے امیر کی نافرمانی کرتے ہو، وہ امانت ادا کرتے ہیں اور تم خیانت پر کمر بستہ ہو، میں نے فلاں شخص کو عامل بنایا اس نے غداری کی، مال اٹھایا اور (حضرت) معاویہ (رضی اللہ عنہ) کے پاس لے گیا، اے اللہ! میں ان سے ناراض ہوں، وہ مجھ سے ناراض ہیں، میری طرف سے ان پر رحم فرما اور ان سے میری جان چھڑا دے۔''[3]

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی صلح:

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ ان حالات و حوادث کا پامردی سے مقابلہ کرتے رہے، انھوں نے

---

[1] مصنف عبد الرزاق، الطبقات لابن سعد (٣/ ٨٣)

[2] تاريخ خليفة (ص: ١٩٨) بغیر سند کے۔

[3] التاريخ الصغير للإمام بخاري (١/ ١٢٥) اس کی سند منقطع ہے لیکن اس کے دیگر شواہد موجود ہیں۔

مصائب پر ہار نہیں مانی، اپنے لشکر کی ہمت بڑھانے کے لیے تمام کوششیں بروئے کار لائے۔ علم، دلیل اور فصاحت و بلاغت سے کام لیا۔ دلیری اور غیرت کے جذبات جگائے۔ ان کا ایک مشہور خطبہ اس کی بہترین مثال ہے جو درجِ ذیل ہے اور دلائل سے بھرپور اور علم وبصیرت کا مرقّع ہے۔ انھوں نے فرمایا: ''اما بعد: جہاد، جنت کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے، اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے خاص دوستوں (اولیاء) کے لیے کھول رکھا ہے، تقویٰ کا لباس اللہ کی طرف سے بہت مضبوط اور محفوظ زرہ اور قابلِ اعتماد ڈھال ہے جس نے اس سے بے رغبتی کی اور اسے چھوڑ دیا اللہ تعالیٰ اسے ذلت کا لباس پہنا دے گا، اس پر آزمائش چھا جائے گی، وہ ذلت وخواری سے ہم کنار ہوگا، اس کے دل پر پردے تن جائیں گے۔ جہاد کو ضائع کرنے کی وجہ سے اس کا معاملہ حق کی طرف منتقل ہو جائے گا، وہ توہین وتذلیل کا شکار ہوگا اور انصاف سے محروم ہو جائے گا۔

سنو! میں نے تمھیں دن، رات سمجھایا، خفیہ اور علانیہ ہر طرح قتال کی دعوت دی، میں نے تم سے کہا کہ ان کی طرف سے لڑائی شروع ہونے سے پہلے تم ان سے لڑو، اللہ کی قسم! جس قوم سے اس کے گھر کے بیچ لڑائی کی جائے وہ ذلیل ہو کر رہتی ہے۔ تم کیسے لوگ ہو؟ تم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر سہارے ٹٹولنے شروع کر دیے، تم نے کمزوری کا مظاہرہ کیا، نتیجہ یہ نکلا کہ چاروں طرف سے لوگ تم پر ٹوٹ پڑے۔ تم پر تیر برسائے جاتے ہیں، تم پر غارت گری ہوتی ہے مگر تم ان پر حملہ نہیں کر سکتے، تم سے لڑنے والے تیار کھڑے ہیں اور تم اس کے لیے تیار نہیں ہو۔ اللہ کی نافرمانی ہو رہی اور تم چپ ہو، تم اس پر راضی دکھائی دیتے ہو۔ دشمن کی طرف رخ کرنے کو کہتا ہوں تو تم کہتے ہو، بڑی گرمی ہے۔ اگر میں سردی کے دنوں میں دشمن کی طرف رخ کرنے کا کہتا ہوں تو تم کہتے ہو، بڑی سردی ہے، ہمیں مہلت دیجیے، بس یہ سردی نکل جائے، یہ ساری باتیں جہاد سے روگردانی کا بہانہ ہیں۔ جب تم سردی اور گرمی سے بھاگتے ہو تو تلوار کا مقابلہ کیسے کرو گے؟ تم تو تلوار سے بھی بھاگو گے۔ اے مردوں جیسی شکل والو! درحقیقت تم مردِ میدان نہیں ہو، اے وہ لوگو! جن کی عقل بچوں والی اور پازیب پہننے والیوں جیسی ہے، کاش! میں نے تمھیں نہ دیکھا ہوتا، نہ میں تمھیں جانتا، تمھیں جاننا بھی میرے لیے موجبِ ملال ہے۔ تم سے ملنا میرے لیے غم و غصے کی ملی جلی کیفیت کا نام ہے۔ اللہ تمھیں برباد کرے! تم نے میرا دل چھلنی کر دیا اور میرا سینہ غیظ وغضب سے بھر دیا ہے۔ تم مجھے غم کے گھونٹ پلاتے رہے، تم نے میری نافرمانی کی، تم نے میری رائے کو بے وقعت کر دیا۔ اب قریشی یہ کہنے لگے ہیں کہ ابو طالب کا بیٹا بڑا بہادر ہے لیکن اسے جنگ کا کوئی علم اور تجربہ نہیں۔''

انھوں نے ایک بات ینبُع کے مقام پر خلافت پر متمکن ہونے سے پہلے بھی بیان کی تھی، پھر اپنی بیماری کی حالت میں بیمار پرسی کرنے والے بدری صحابی حضرت فضالہ انصاری رضی اللہ عنہ کو بھی یہ حدیث سنائی، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: مجھے اپنی اس بیماری میں موت نہیں آئے گی، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا تھا کہ مجھے اُس وقت تک موت نہیں آئے گی جب تک میری داڑھی، میرے سر کے زخم کی وجہ سے خون سے رنگین نہ ہو جائے۔[1]

ان لوگوں نے کہا: آپ ہمیں اپنے قاتل کا نام بتا دیجیے تاکہ ہم اس کی نسل ہی ختم کر ڈالیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں قسم دے کر تمھیں اس بات سے منع کرتا ہوں کہ مبادا میرے قاتل کے بجائے کوئی اور شخص قتل ہو جائے۔[2]

صلۂ شہید کیا ہے، تب و تابِ جاودانہ

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ شہید کر دیے گئے:

نہروان کے معرکے کی وجہ سے خوارج کے دل و دماغ پر بڑی ضرب لگی، ہر آنے والا دن ان کے الم وحسرت میں اضافے کا موجب تھا، ان میں سے ایک شقی القلب گروہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جان لینے پر متفق ہو چکا تھا، وہ کہتے تھے کہ ہمارے جو بھائی نہروان میں قتل ہوئے ہیں ان کا انتقام لیا جائے۔ اہلِ سیرت اور مؤرخین کا اس مشہور روایت کے بیان پر تقریباً اجماع ہے۔[3]

تاہم یہ روایت تنقیدی آراء سے محفوظ نہیں ہے کیونکہ یہ مختلف اور متضاد عناصر پر مشتمل ہے۔ یوں لگتا ہے کہ یہ روایت بھی بعض دیگر روایات کی طرح غیر متعلق اضافوں پر مشتمل ہے۔ اس کے تفصیلی مطالعہ کے نتیجے میں معلوم ہوتا ہے کہ اس بات پر اجماع ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت خارجیوں کے ہاتھوں ہوئی اور ان کا مقصود یہ تھا کہ نہروان کے معرکہ میں قتل ہو جانے والے خوارج کا انتقام لیا جائے۔

---

[1] خلافة علي بن أبي طالب لعبد الحميد (ص: ٤٣٣) اس روایت کی تمام اسناد صحیح ہیں جو حافظ ابن کثیر نے اپنی کتاب "البداية و النهاية" (٧/ ٣٢٣، ٣٢٥) میں درج کی ہیں۔

[2] كتاب الشريعة للآجري (٤/ ٢١٠٥) اس کی سند حسن ہے۔

[3] الطبقات لابن سعد (٣/ ٣٥) تاريخ الطبرى (٦/ ٥٨، ٦٦) اس کی سند منقطع ہے۔ البداية و النهاية (٧/ ٣٢٥)

روداد شہادت اور سازشی ٹولے کا اجتماع:

ابن ملجم اور اس کے ساتھیوں کی داستان یہ ہے کہ ابن ملجم، بُرک بن عبد اللہ اور عَمرو بن بکر التمیمی ایک جگہ اکٹھے ہوئے، انھوں نے آپس میں بحث کی کہ حکمران اچھے نہیں ہیں، پھر انھوں نے اہل نہروان کا ذکر کیا، ان کے لیے رحمت کی دعا کی اور کہنے لگے:

ان لوگوں کے بعد اب ہمارے زندہ رہنے کا کیا فائدہ؟ ہمارے بھائی تو لوگوں کو اپنے رب کی عبادت کی دعوت دیتے تھے، اللہ کے بارے میں کسی ملامت کرنے والے سے نہیں ڈرتے تھے، اگر ہم اپنی جان قربان کر دیں، گمراہی کے ائمہ کو قتل کر دیں اور اہل وطن کی ان سے جان چھوٹ جائے تو اچھا ہوگا۔ اس طرح ہم اپنے بھائیوں کا انتقام بھی لے لیں گے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کا زمانہ چار سال نو ماہ پر محیط تھا۔ یہ سارا عرصہ کم وبیش آپس کی لڑائیوں اور خارجیوں سے مقابلہ کرنے میں گزر گیا۔ خارجیوں کا فتنہ اُس دور کا سب سے بڑا فتنہ تھا۔ یہ متشدد گروہ اپنے علاوہ کسی کو مسلمان ہی نہیں سمجھتا تھا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت:

اپنی انتہاء پسندی کی تحریک میں یہ خارجی لوگ سب سے بڑی رکاوٹ تین اشخاص کو سمجھتے تھے۔ حضرت علی، حضرت امیر معاویہ اور حضرت عَمرو بن العاص رضی اللہ عنہم۔ ایک دن اس قوم کے مذکورہ سابقہ تین بدبخت اکٹھے ہوئے۔ انھوں نے طے کیا کہ ان تینوں کو ایک ہی دن فجر کی نماز کے وقت مسجد میں شہید کر دیا جائے۔

اس موقع پر ابن ملجم[1] نے کہا: میں (حضرت) علی (رضی اللہ عنہ) بن ابی طالب کے سلسلے میں اپنی خدمات پیش کرتا ہوں۔ بُرک بن عبد اللہ نے کہا: (حضرت) معاویہ (رضی اللہ عنہ) کی ذمہ داری میں اٹھاتا ہوں۔ اور عَمرو بن بکر نے کہا: (حضرت) عَمرو بن العاص (رضی اللہ عنہ) کو ٹھکانے لگانے کے لیے میں حاضر ہوں۔ انھوں نے پکا معاہدہ کیا کہ ہم میں سے ہر ایک اپنے اپنے مطلوب کو قتل کرے گا یا خود مر جائے گا۔ انھوں نے اپنی تلواریں سنبھالیں اور سترہ رمضان کو ہر شخص اپنے مطلوبہ مقام کی طرف چل دیا۔[2]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کوفہ میں تھے، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ دمشق میں اور حضرت عَمرو بن العاص رضی اللہ عنہ مصر

[1] ابن ملجم مراد الیمانی قبیلہ سے تعلق رکھتا ہے، یہ قبیلہ کندہ کی ایک شاخ ہے۔

[2] تاريخ الطبري (٦/ ٥٩)

میں تھے۔ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ اس دن بیماری کی وجہ سے فجر کی نماز کے لیے نہ جا سکے۔ ان کی جگہ حضرت خارجہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ نے نماز پڑھائی، انھیں شہید کر دیا گیا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نماز پڑھانے کے لیے آئے تو ان پر قاتلانہ حملہ کیا گیا مگر زخم کاری نہ تھا، اس لیے وہ بچ گئے۔

مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قاتل عبد الرحمٰن بن ملجم نے، جو دنیا کا سب سے بد بخت اور شقی القلب انسان تھا، فجر کی نماز کے وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ پر تلوار کا وار کیا۔ آپ شدید زخمی ہو گئے۔ ابن ملجم کو وہیں گرفتار کر لیا گیا۔ ہمدان کے ایک آدمی نے، جس کی کنیت ابو اَدماء تھی، ابن ملجم کی تلوار پکڑی اور اس کی ٹانگ پر ماری، ابن ملجم لڑکھڑا کر گر گیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہٹ گئے، حضرت جعدہ بن ہبیرہ بن ابی وہب رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو نماز پڑھائی۔ بعد ازاں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس آدمی کو میرے پاس لاؤ، اسے لایا گیا تو فرمایا: اے اللہ کے دشمن! کیا میں نے تمھارے ساتھ حسنِ سلوک نہیں کیا تھا؟ اس نے اعتراف کیا: جی ہاں! آپ نے اچھا سلوک کیا تھا۔ انھوں نے پوچھا: تم نے یہ اقدام کیوں کیا؟ اس نے کہا: میں نے یہ تلوار چالیس دن تک تیز کی اور اللہ سے دعا کی کہ میں اس کے ذریعے اس کی مخلوق میں سے بدترین (نعوذ باللہ) شخص کو قتل کروں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میرا خیال ہے کہ تم اسی تلوار سے مارے جاؤ گے اور میرا خیال ہے کہ وہ تمھی ہو جو اللہ کی مخلوق میں سے بدترین شخص ہے۔[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما کو وصیّت:

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو بلایا اور فرمایا: میں تم دونوں کو تقویٰ اختیار کرنے کی وصیّت کرتا ہوں۔ کبھی دنیا کے طلبگار نہ بنو، ہر چند دنیا تمھیں چاہتی رہے، نہ ملنے والی چیز کا کبھی غم نہ کرو، حق پر قائم رہو، یتیم پر رحم کرو، لاچار کی مدد کرو، آخرت کے لیے عمل کرو، ظالم کا مقابلہ کرو، مظلوم کے مددگار بنو، جو کچھ اللہ کی کتاب میں ہے اس پر عمل کرو، تم پر اللہ کے بارے میں ملامت کرنے والے کی ملامت اثر انداز نہ ہو، پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت محمد بن الحنفیہ رحمہ اللہ کی طرف دیکھا اور فرمایا: کیا تم نے وہ باتیں یاد کر لی ہیں جو میں نے تمھارے دونوں بھائیوں کو وصیّت کی ہیں؟

انھوں نے کہا: جی ہاں! پھر فرمایا: میں تمھیں بھی ان سب باتوں کی وصیّت کرتا ہوں اور تمھیں ان دونوں بھائیوں کی تکریم و تعظیم کی وصیّت کرتا ہوں کیوں کہ ان دونوں کا تم پر عظیم حق ہے۔ ان دونوں کا کہنا

[1] تاريخ الطبري (٦/ ٦٢)

ماننا، کبھی نافرمانی نہ کرنا۔ پھر حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے فرمایا: میں تم دونوں کو بھی وصیّت کرتا ہوں کہ اپنے اس بھائی سے اچھا سلوک کرنا، بے شک یہ تمھارے باپ کا بیٹا ہے اور تمھیں معلوم ہے کہ تمھارے والد اس سے محبت کرتے ہیں اور پھر حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہو کر فرمایا: میرے بیٹے! میں تمھیں اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے کی وصیّت کرتا ہوں۔

بروقت نماز قائم کرنے، برمحل زکات ادا کرنے اور احسن طریقے سے وضو کرنے کی تاکید کرتا ہوں، کیونکہ طہارت کے بغیر نماز نہیں ہوتی اور مانع زکاۃ کی نماز قبول نہیں ہوتی۔ تمھیں یہ بھی وصیّت کرتا ہوں کہ دوسروں کی غلطی معاف کردو، غصہ پی جاؤ، صلہ رحمی سے کام لو، جہالت کے مقابلے میں بردباری، دین میں تفقُّہ، معاملات میں ثابت قدمی، تلاوتِ قرآن میں باقاعدگی اور پڑوسیوں سے حسنِ سلوک کا طریقہ اختیار کرو، نیکی کا حکم دو، برائی سے روکو اور فواحش سے دور بھاگو۔ قطع تعلقی اور فرقہ واریت سے اجتناب کرو، نیکی اور تقویٰ کے کام میں ایک دوسرے کے مددگار بنو، گناہ اور زیادتی میں ہرگز تعاون نہ کرو، اللہ سے ڈرتے رہو، وہ سخت سزا دینے والا ہے۔[1]

قاتل کا مُثلہ کرنے کی ممانعت:

آپ نے اپنے دونوں بیٹوں حضرت حسن اور حسین رضی اللہ عنہما کو بلا کر اپنے قاتل کے بارے میں فرمایا کہ اسے کھانا کھلاؤ، پانی پلاؤ اور اچھی طرح رکھو مگر اذیت نہ دو۔ اگر میں زندہ رہا تو خود دیکھوں گا کہ معاف کروں یا کوئی سزا دوں۔ ہاں اگر میں فوت ہو جاؤں تو اس کو مار ڈالنا۔ پھر آپ نے فرمایا: اے بنی عبدالمطلب! میں مسلمانوں کا خون نہیں بہانا چاہتا۔ خبردار! بجز میرے قاتل کے اور کسی کو نہ مارنا۔ اے حسن (رضی اللہ عنہ)! آگاہ رہو کہ میرے قاتل کے ٹکڑے ٹکڑے نہ کرنا۔ اسے صرف اتنی ہی ضرب لگاؤ جتنی اس نے لگائی ہے۔ اس کا مُثلہ نہ کیا جائے یعنی اس کی ناک اور کان وغیرہ نہ کاٹنا۔ اللہ تعالیٰ تمھارے اہلِ بیت رضی اللہ عنہم کی حفاظت فرمائے اور تمھارے مابین تمھارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کو سدا بہار بنا دے، اب میں تم سے رخصت ہوتا ہوں اور تم سب کے لیے سلامتی اور رحمت کی دعا کرتا ہوں اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ صرف ''لا الٰه الّا اللّٰه'' ہی کے الفاظ پڑھ سکے۔ یہی مقدّس کلمہ پڑھتے پڑھتے اسلام کے اُس عظیم الشان سپوت کی زندگی کا آفتاب غروب ہوگیا۔ رضي الله عنه ورحمه رحمة واسعة.

[1] تاريخ الطبري (٦/ ٦٣)

ابن ملجم کی تلوار زہر میں بجھی ہوئی تھی۔ جس سے اس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر وار کیا تھا اور اس تلوار کے زخم کے راستے زہر پورے جسم میں پھیل گیا تھا، حملے کے بعد وہ صرف تین دن تک زندہ رہے۔[1]

یہ سانحہ سن چالیس (۴۰) ہجری میں رمضان المبارک کے مہینہ میں پیش آیا۔ یوں ۴۰ ہجری ۲۱ رمضان المبارک کو عمزاد و دامادِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے چوتھے خلیفہ شہید ہو گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡن. ایک روایت کے مطابق وہ اکیس رمضان کی صبح شہادت سے سرفراز ہوئے۔[2]

شہادت کے وقت آپ کی عمر ۶۳ سال تھی اور شہادت کے بعد حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے مجرم کو جیل سے نکالا اور اسے قتل کر دیا۔[3]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مدتِ خلافت، اور ان کی قبر:

خلیفہ بن خیاط کے بیان کے مطابق آپ کی مدتِ خلافت چار سال نو مہینے اور چھے دن ہے، بعض نے تین دن اور بعض نے چودہ (۱۴) دن لکھا ہے۔[4] شہادت کے بعد حضرت حسن وحضرت حسین اور حضرت عبد اللہ بن جعفر رضی اللہ عنہم نے امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کو غسل دیا، تین کپڑوں میں آپ کی تکفین ہوئی۔ حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی۔[5]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قبر کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے کہ ان کو کس جگہ دفن کیا گیا۔ امام ابن الجوزی نے اس بارے میں متعدد روایات نقل کرنے کے بعد کہا ہے: اللہ تعالیٰ ہی زیادہ بہتر جانتا ہے کہ ان میں سے کون سا قول زیادہ صحیح ہے۔ اس سلسلے میں جو روایات منقول ہیں، وہ یہ ہیں:

- حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ نے انھیں جامع مسجد کے نزدیک کھلی جگہ پر نمازِ فجر کے بعد دفن کر دیا۔ یہ جگہ کِندہ کے ابواب کے قریب ہے، وہاں لوگوں نے فجر کی نماز پڑھی، پھر ان کے واپس جانے سے پہلے تدفین عمل میں آئی۔[6]

---

[1] التاريخ الكبير للبخاري (١/ ٩٩) اس کی سند صحیح ہے۔
[2] تاريخ الطبري (٦/ ٦٤)
[3] المعجم الكبير للطبراني (١/ ٩٦، ١٠٥) رقم الحديث (١٦٨)
[4] تاريخ خليفه (١/ ٤٧)
[5] المنتظم (٥/ ١٧٥) الطبقات (٣/ ٣٧، ٦/ ٦٥)
[6] الطبقات (٣/ ٣٨) وخلافة علي بن أبي طالب لعبد الحميد (ص: ٤٤١)

- اسی جیسی دوسری روایت میں ہے کہ انھیں کوفہ میں قصرِ امارت کے قریب جامع مسجد کے پاس رات کو دفن کیا گیا۔ ان کی قبر کا مقام عام لوگوں کو معلوم نہیں۔[1]
- ایک روایت میں یہ ذکر ملتا ہے کہ ان کے صاحبزادے حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے انھیں مدینہ منتقل کر دیا تھا۔[2]
- ایک روایت میں یہ ہے کہ کوفہ سے باہر نجف میں مشہد کے نام سے ایک مشہور جگہ ہے۔ وہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قبر ہے۔ بعض اہلِ علم نے اس کا انکار کیا ہے، ان میں کوفہ کے قاضی شریک بن عبد اللہ النخعی (وفات ۱۷۸ھ) اور محمد بن سلیمان الحضرمی (وفات ۲۹۷ھ) شامل ہیں۔[3]

اصل حقیقت یہ ہے کہ نجف میں ''مشہدِ علی رضی اللہ عنہ'' کے نام سے کچھ لوگوں نے خلافتِ بنو عباس کے دوران ایک مقام کا تعین کیا اور اسے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قبر کا مقام قرار دے دیا۔ وہ لوگ شیعہ روافض تھے۔ شیعہ نے حسبِ عادت چوتھی صدی ہجری میں یہ کام کیا۔ اہلِ علم اس بات پر متفق ہیں کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قبر نہیں ہے بلکہ کہا جاتا ہے کہ وہ حضرت مغیرہ بن شُعبہ رضی اللہ عنہ کی قبر ہے۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: نجف میں مشہد کے نام سے جو مقام ہے، اہلِ علم اس پر متفق ہیں کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قبر کا مقام نہیں ہے بلکہ وہ حضرت مغیرہ بن شُعبہ رضی اللہ عنہ کی قبر ہے۔ اہلِ بیت رضی اللہ عنہم، شیعہ اور دیگر بے شمار مسلمانوں نے کوفہ میں ان کی حکومت اور تین سو سال سے زیادہ کے لیل ونہار بیت جانے کے باوجود کبھی اس بات کا ذکر نہیں کیا کہ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قبر ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے تین سو سال بعد بَنی بُوَیہ کے دورِ حکومت میں اس جگہ کو مشہدِ علی رضی اللہ عنہ کا نام دیا گیا۔[4]

والدِ گرامی کی شہادت کے بعد حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا خطبہ:

شہادتِ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما نے خطبہ دیا۔ انھوں نے فرمایا: ''گزشتہ کل تم سے ایک عظیم شخصیت جدا ہو گئی ہے، علم و ادراک میں وہ اوّلین و آخرین پر سبقت لے جانے والے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انھیں جھنڈا دے کر روانہ فرماتے تھے کہ وہ فتح حاصل کیے بغیر واپس نہیں آئیں گے۔

[1] المنتظم (٥/ ١٧٧) وتاريخ الإسلام عهد الخلفاء الراشدين (ص: ٦٥١)
[2] تاريخ بغداد (١/ ١٣٧)
[3] خلافة علي بن أبي طالب لعبد الحميد (ص: ٤٤١)
[4] الفتاویٰ (٤/ ٥٠٢) دراسات في الاهواء و الفرق و البدع (ص: ٢٨٠)

انھوں نے کوئی سونا چاندی پیچھے نہیں چھوڑا۔ صرف سات سو (۷۰۰) درہم ہیں، یہ انھوں نے اپنے گھر کے خادم کے لیے محفوظ فرمائے تھے۔‘‘[1]

شہادتِ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خبر سن کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ رو پڑے:

جب شہادتِ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اطلاع حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو ملی تو رونے لگے، ان کی بیوی نے کہا: آپ ان کی شہادت پر رو رہے ہیں حالانکہ آپ ان کے خلاف لڑتے رہے ہیں؟ انھوں نے کہا: اللہ تمھارا بھلا کرے، تم جانتی ہی نہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت سے لوگ کتنے بڑے صاحبِ علم و فضل اور فقیہ سے محروم ہو گئے ہیں۔[2]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے خلافت کانٹوں کی سیج ثابت ہوئی۔ انھیں اپنے دورِ خلافت میں سکون کا سانس لینا نصیب نہ ہو سکا۔ پھر بھی انھوں نے ملکی انتظامات کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کی۔ ملک کے اندر کی مشکلات کی وجہ سے انھیں اسلامی فتوحات کو پھیلانے کا موقع نہ مل سکا۔ پھر بھی ۳۵ ہجری میں انھوں نے بحری راستے سے ہندوستان پر حملے کی اجازت دی، چنانچہ اس زمانہ میں کوکن بمبئی پر کامیاب حملہ کیا گیا۔ یہ علاقہ اس وقت سندھ میں شامل تھا۔ ملک کی حفاظت کے لیے آپ نے فوجی چھاؤنیاں قائم کیں۔ کئی مضبوط قلعے تعمیر کروائے، اور دریائے فرات پر پل تعمیر کروایا۔

بعض جگہوں پر مسجدیں بھی بنوائیں۔ پوری عمر آپ نے کسی نہ کسی صورت میں دین کی خدمت کرتے ہوئے گزار دی۔ یمن کے سینکڑوں لوگ آپ کی کوششوں سے اسلام کی دائرے میں داخل ہوئے۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ لوگوں کو دعا کے لیے کہنے سے زیادہ بہتر ہے کہ تم ایسا عمل کرو کہ لوگوں کے دل سے تمھارے لیے دعا نکلے، حضرت علی رضی اللہ عنہ (۱۵۸۶) احادیث کے راوی ہیں۔

خلیفۂ وقت کا کھانا اور لباس:

حضرت زریر رحمہ اللہ نامی ایک شخص نے آپ کے دسترخوان پر سادہ کھانا دیکھ کر کہا: ’’آپ کو پرندوں کا گوشت پسند نہیں؟‘‘ آپ نے فرمایا:

---

[1] تاریخ الطبري (٦/ ٦٧) فضائل الصحابة (٢/ ٧٣٧) اس کی سند صحیح ہے۔

[2] البداية و النهاية (٨/ ١٣٣)

''خلیفہ کو مسلمانوں کے مال میں سے صرف دو پیالوں کا حق ہے۔ ایک خود کھائے یا اپنے بچوں کو کھلائے۔ دوسرا اللہ کی مخلوق کے سامنے پیش کر دے۔''

عید سے چند دن پہلے کسی نے آپ کے کپڑوں میں پیوند لگے دیکھے تو اس نے کہا: ''امیر المومنین! آپ دو درہم میں نیا جوڑا کیوں نہیں خرید لیتے۔'' اس پر آپ نے جو بات کہی ہے، اُسے سونے کے پانی سے لکھا جائے تو بھی کم ہے۔آپ نے فرمایا:

''مجھے شرم آتی ہے کہ میں نئے کپڑے پہنوں اور کوفے میں ہزاروں آدمیوں نے پرانے کپڑے پہن رکھے ہوں۔''

دنیا کے مال ودولت سے کوئی غرض نہیں تھی۔ انھوں نے پوری زندگی ایسے گزاری کہ جنگ کے میدان سے لیکر زندگی کے ہر امتحان تک ہر جگہ کامیاب و کامران رہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا زیادہ تر وقت اللہ تعالیٰ کی عبادت میں گزرتا تھا۔ نماز پڑھتے تو اللہ کی ذات کے سوا اور کسی غیر کا ہوش نہ رہتا۔ شجاعت ان کی پہچان تھی۔ اتنے بہادر اور دلیر تھے کہ زندگی بھر کبھی بڑے سے بڑے شہ زور کی بھی پروا نھیں کی۔ کافروں کے ساتھ بڑی بڑی لڑائیوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے۔ تبوک کے علاوہ انھوں نے تقریباً ہر جنگ میں شرکت کی۔ انھیں اسد اللہ (اللہ کے شیر) کا لقب ملا۔ نہتے آدمی پر کبھی وار نہیں کرتے تھے۔

اولادِ حضرت علی رضی اللہ عنہ:

سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے ان کے تین بیٹے حضرت حسن، حضرت حسین، اور حضرت محسن رضی اللہ عنہم پیدا ہوئے اور دو بیٹیاں حضرت زینب اور حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا پیدا ہوئیں۔ حضرت محسن رضی اللہ عنہ بچپن میں ہی فوت ہو گئے۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا جب تک زندہ رہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دوسری شادی نہیں کی۔ لیکن آپ کی وفات کے بعد متعدد شادیاں کیں۔ ان ازواج سے اولاد بھی ہوئی۔ آپ کی اولاد کی تعداد گیارہ بیٹے اور سترہ بیٹیاں ہے۔ مؤرخین نے اولاد کی تعداد مختلف لکھی ہے۔ ابن کثیر رحمہ اللہ کے مطابق ۱۴ بیٹے اور ۱۷ بیٹیاں اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے قول کے مطابق ۲۱ بیٹے اور ۱۸ بیٹیاں تھیں۔ ان کے خاندان میں ایک سندھی لڑکی بھی آئی جس سے حضرت زید بن علی رحمہ اللہ پیدا ہوئے۔

مومنین صادقین کے خلاف خوارج کا کینہ وبُغض:

ابنِ ملجم کے ان الفاظ سے سچے مسلمانوں کے بارے میں خوارج کے کینہ وبُغض کا اندازہ کیا جاسکتا

ہے جو اس نے اپنی تلوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہے: ''میں نے اسے ایک ہزار میں خریدا اور ایک ہزار خرچ کر کے اسے زہر آلود کرایا، اگر پورے شہر والوں کو اس کی ایک ہی ضرب لگ جائے تو ان میں سے ایک بھی زندہ باقی نہ بچے۔''[1]

اُس کے اِن الفاظ سے دلوں میں چھپی ہوئی وہ دشمنی عیاں ہوتی ہے جو خوارج کے دلوں میں تھی اور یہ کینہ و بُغض صرف عام مومنوں ہی کے لیے نہ تھا بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ابن ابی طالب جیسے جلیل القدر امیر المومنین کے لیے بھی تھا جو عظیم مناقب، اعلیٰ علمی اور اخلاقی خوبیوں اور دینی دنیوی وجاہتوں کے حامل تھے، ذرا غور کیجیے کہ باطل فرقے بدبختی کے کس مقام پر ہوتے ہیں کہ اعلیٰ درجے کے اہلِ ایمان کو قتل کرتے ہیں اور بڑے بڑے بتوں کو چھوڑ دیتے ہیں۔[2]

اختتام:

الغرض یہ اصل میں سلامی حکومت کے خلاف سازش تھی، جس کے اصل ذمے دار دشمنانِ اسلام ہی تھے، جنھوں نے مسلمانوں کو آپس میں لڑایا اور بعد میں اس کی جھوٹی داستان اپنی طرف سے وضع کر کے لوگوں میں پھیلا دی۔ یہ بالخصوص بنو اُمیہ کے خلاف سازش تھی۔ یہ مدینے کا کوئی پہلا واقعہ نہیں ہے، بلکہ اس سے قبل اسی مدینے میں بنو اُمیہ کے پہلے خلیفہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی مخالفت کی گئی اور صرف مخالفت ہی نہیں، بلکہ انھیں قتل تک کر دیا گیا۔

قتلِ عثمان رضی اللہ عنہ کے وقت بھی اصل سازشی سبائی درندے ہی تھے اور انہی سازشی درندوں کی ذریت تاریخی روایات وضع کر کے اُمتِ مسلمہ کی اگلی نسل کو یہ بتلانے کی کوشش کر رہی ہے کہ مدینے میں (حضرت) عثمان (رضی اللہ عنہ) کی مخالفت بالکل بجا تھی، انھوں نے عہدۂ خلافت کا ناجائز استعمال کیا، بدعتیں ایجاد کیں اور دینِ اسلام اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کو بدل ڈالا اور اَن گنت گھناؤنے جرائم کا ارتکاب کیا تو (حضرت) عثمان (رضی اللہ عنہ) کی اس بے دینی اور بے راہ روی کی وجہ سے مدینہ کی بزرگ شخصیات، حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ، حضرت اُم المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے دین بچانے کی خاطر (حضرت) عثمان (رضی اللہ عنہ) کی زبردستی مخالفت کی۔ لہٰذا مدینے کی ان مقدس ہستیوں نے مدینے کو

[1] تاريخ الطبري (٦/ ٦٢)

[2] سير الشهداء: دروس و عبر (ص: ٧٨)

(حضرت) عثمان (رضی اللہ عنہ) کے شر سے بچانے اور دینِ اسلام کے تحفظ کی خاطر (حضرت) عثمان (رضی اللہ عنہ) کو خلافت چھوڑنے کے لیے کہا اور جب وہ نہ مانے تو انھوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے قتال کیا اور اللہ نے دین وسنت کے بدلنے والے (حضرت) عثمان (رضی اللہ عنہ) کو ہلاک کیا۔ نعوذ باللّٰه من هذه الأكاذيب.

اسلامی تاریخ شاہد ہے کہ شروع ہی سے ایک گروہ ہمیشہ مسلمانوں کو آپس میں لڑاتا رہا ہے۔ قتلِ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، جنگِ جمل، جنگِ صفین، شہادتِ حضرت حسین رضی اللہ عنہ ان سب کے پیچھے انھیں کا ہاتھ تھا۔

خلیفۂ چہارم امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ اللہ کی بندگی اور دینِ حنیف کی تبلیغ واشاعت کے لیے جیئے اور اسی نصب العین کے لیے مر مٹے۔ ان کی پوری زندگی جہادِ عظیم میں بسر ہوئی، وہ زندگی کی آخری ہچکی تک قرآن و سنت کو مضبوطی سے تھامے رہنے کی تلقین وتاکید فرماتے رہے، اور اپنے رب کے حضور بہت منور اعمال نامہ لے کر گئے، جب تک افق پر سورج چمکے گا، ان کی عظمت و برگزیدگی کا آفتاب نصف النہار پر رہے گا۔ اس دنیا سے تو رخصت ہو گئے، لیکن تاریخ کے صفحات ہمیشہ ان کی سیرت کی درخشندگی کی گواہی دیتے رہیں گے، وہ اپنی مثال آپ تھے، وہ یکتائے روزگار تھے، وہ ہر دم اللہ کی رضا کے طلبگار رہے، اسلام کی فتح وکامرانی کے لیے کوشاں رہے، ان کی سب سے بڑی تڑپ وطلب یہ تھی کہ دنیا میں اللہ کے احکام غالب آجائیں اور ان کی کوشش ہمیشہ یہی رہی کہ ریاست کے تمام افراد کے لیے عدل وانصاف کو یقینی بنا دیا جائے۔

خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے سنہرے دور کا مطالعہ نئی نسل کے عزم و ہمت کو فروغ دینے والا اور ماضی کے حکمت ودانائی سے بھرپور لیل ونہار کی یاد دلانے والا ہے۔ یہ مطالعہ نئی نسل کو یہ راہنمائی دیتا ہے کہ اس امت کے آخر میں آنے والے لوگوں کی اصلاح بھی اسی راستے پر چل کر ہوگی جس پر اوّلین لوگ چلتے رہے۔ آج کے طالب علم کو خلافتِ راشدہ کا عہد سامنے رکھنا چاہیے اور اس کی خصوصیات اور اس کے نظامِ حکومت کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے، کیوں کہ وہی چراغ جلیں گے تو روشنی ہوگی۔

الحمد للہ اس کتاب کی تالیف کی تکمیل آج بروز بدھ رات ۱۰ بجے، ۲/ رمضان ۱۴۴۲ ہجری بمطابق ۱۴/ اپریل ۲۰۲۱ عیسوی کو ہوئی ہے۔ اول وآخر بس اللہ تعالیٰ ہی کا فضل وکرم ہے۔ سیرتِ خلفاء رضی اللہ عنہم کی تکمیل ہونے پر میں یہی کہوں گی کہ اس میں جو بھی تفصیلات بیان کی گئی ہیں، اگر ان میں مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہو تو میں اس پر اللہ تعالیٰ سے معافی کی طلب گار ہوں۔ لہٰذا:

"اِنْ تَجِدُ عَيْباً فَسُدَّ الْخَلَلَاءَ، جَلَّ مَنْ لَّا عَيْبَ فِيْهِ وَ عَلَا"

’’اگر آپ اس میں کوئی نقص دیکھیں تو اسے پورا کر دیں (کیونکہ) عیوب سے پاک ہستی تو صرف اللہ جل جلالہ کی ہے۔‘‘

آخر میں ربِ ذوالجلال کی بارگاہ میں خشوع وخضوع کے ساتھ عرض گزار ہوں کہ وہ میری اس چھوٹی سی کاوش کو خالص اپنی خوشنودی کے لیے قبول فرمائے۔ اور میں اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ وہ اس کتاب کو میرے اور تمام مسلمانوں کے لیے نفع بخش بنائے۔ اور آپ سے خصوصی گزارش ہے کہ آپ اسے پڑھتے وقت مجھے اپنی دعاؤں میں ضرور یاد رکھیں، کیونکہ مسلمان کی کسی مسلمان کے لیے اس کی عدم موجودگی میں کی گئی دعا قبول ہوتی ہے۔

میں اس کتاب کا اختتام اس دعا پر کرتی ہوں:

﴿ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًّا لِّلَّذِينَ آمَنُوا رَبَّنَا إِنَّكَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ ﴾ [الحشر: ١٠]

’’اے ہمارے رب! ہمیں اور ہمارے ان بھائیوں کو بخش دے جنھوں نے ایمان لانے میں ہم سے پہل کی، اور ہمارے دلوں میں اہلِ ایمان کے لیے کوئی کینہ نہ رکھ۔ اے ہمارے رب! بے شک تو بہت نرمی والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔‘‘

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ، أَشْهَدُ أَنَّ لَّا اِلٰه اِلَّا أَنْتَ، أَسْتَغْفِرَكَ وَأَتُوبُ اِلَيْكَ، وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

مصادر و مراجع

سیرت سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ

- تفسیر ابن کثیر، تفسیر حافظ صلاح الدین یوسف
- صحیح بخاری
- صحیح مسلم
- جامع الترمذی
- سنن ابن ماجہ
- سیرتِ نبوی، تالیف: ڈاکٹر مہدی رزق اللہ احمد۔ ترجمہ: شیخ الحدیث حافظ محمد امین
- سیرہ امام الانبیاء، تالیف: شیخ ابو عدنان محمد منیر قمر
- سیرتِ حضرت علی رضی اللہ عنہ، تالیف: ڈاکٹر علی محمد الصلابی۔ ترجمہ: مولانا محمد اجمل بھٹی
- یزید بن معاویہ رضی اللہ عنہ پر الزامات کا تحقیقی جائزہ، تالیف: الشیخ ابو فوزان کفایت اللہ سنابلی
- فضائلِ صحابہ، تالیف: مولانا اقبال کیلانی
- روشنی کے مینار، تالیف: شیخ عبدالمالک مجاہد
- سیدنا علی المرتضیٰ، تالیف: جناب اشفاق احمد خان
- تاریخ اسلام، تالیف: محمد اکبر شاہ نجیب آبادی رحمہ اللہ
- متعدد علمی ویب سائٹس

سیرۃ امام الانبیاء ﷺ

تالیف

فضیلۃ الشیخ مولانا محمد منیر قمر حفظہ اللہ

مکتبہ کتاب و سنت
ریحان چیمہ۔ ڈسکہ

